

# یادوں کی برکت

[www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)



یادوں کی برات ایک عظیم شاعر کی آپ بیتی اور ایک تاریخ ساز عہد کی تہذیبی زندگی کا دلکش مرقع ہے۔ اس مرقعے میں آپ کو وادی گنگ و جمن اور سرزمینِ دکن کے قدیم و جدید معاشرے کی خوشنما جھلکیاں نظر آئیں گی۔ مصنف نے اپنے ایامِ طفلی و جوانی کے خوشحال طبقوں کی سماجی قدروں پر، ان طبقوں کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز پر، ان کے عقیدوں اور وہموں پر، ان کے شوق اور مشغلوں پر، ان کے تیوہاروں اور تقریبوں پر، ان کے رہن سہن اور رسوم و رواج پر روزمرہ کے واقعات کے حوالے سے بڑے دلچسپ تبصرے کیے ہیں۔

یادوں کی برات جوش ملیح آبادی کے ستر سال کے تجربوں اور مشاہدوں کی برات ہے۔ اس برات میں فکر و نشاط کی شہنائیاں بجتی ہیں۔ جنون و حکمت کے زمزمے گونجتے ہیں۔ رامش و رنگ کی محفلیں سجتی ہیں۔ لالہ رخوں کے لب و عارض کی دل نشیں حکایتیں بیان ہوتی ہیں۔ یاراںِ میکدہ کی محبتوں اور بے مہریوں کے قصے سنائے جاتے ہیں اور اربابِ ثروت و سیاست کی تنگ حوصلگیوں کے تذکرے چھڑتے ہیں۔ شاعرِ امروز و فردا کی یادوں کا یہ قافلہ کبھی کہکشاں سے ہو کر گزرتا ہے اور کبھی بحرِ ظلمات سے، لیکن مسرت کی خیرہ سامانیوں سے اُن کے ایمان و یقین میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ طوفانِ حوادث کی تیرگیوں سے اُن کے پائے صداقت ڈگمگاتے ہیں۔ اُن کا کاروانِ حیات خرد کی مشعل لیے اور انسان دوستی کے رجز پڑھتا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

سعید خان

www.pdfbooksfree.pk

saeedk86@gmail.com Cell# 03459404940

## انتساب

میں اپنی اس کتاب کو اپنے محسن اور دوست روشن علی بھیم جی کی ذات گرامی سے  
منسوب کرتا ہوں۔





## چند ابتدائی باتیں

سب سے پہلے یہ باتیں سن لیجئے۔ ان سے آگے چل کر، میرے سمجھنے میں آپ کو مدد ملے گی۔

(۱)

میں نے اپنے حالات زندگی قلم بند کرنے کے سلسلے میں کامل چھ برس تک، زیادہ تر مسلسل اور گاہ گاہ غیر مسلسل عرق ریزی کی ہے۔ ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا۔ اسے روی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ پھر ڈیڑھ برس میں دوسرا مسودہ مکمل کیا، اس پر بھی تنسیخ کا خط کھینچ دیا۔ پھر ڈیڑھ پونے دو برس صرف کر کے نو سو صفحوں کا تیسرا مسودہ تحریر کیا اور تین ہزار میں اس کی کتابت بھی مکمل کرائی۔ مگر جب اس پر غائر نظر دالی تو پتا چلا کہ اس مسودے کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے، جو صبح کو بیدار ہو کر رات کے خواب کو، اس خوف سے جلدی جلدی الٹا سیدھا لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ اس کے ذہن کی گرفت سے نہ نکل جائے۔

اور خدا خدا کر کے اب یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اور میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ میں اس چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم باقی نہیں رہا کہ مزید عرق ریزی کر کے پانچواں مسودہ لکھوں اور اسے بھی قلم زد کروں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا ہوں کہ اب میرے چل چلاؤ کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور ”جرس فریادی دارد کہ بر بندید محمل ہا“ کی آوازیں برابر کانوں میں چلی آرہی ہیں۔ اور یہ مصرعہ کہ: نسیم جاگو کمر کو باندھو۔ اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے:-

دل میں گونجتا رہتا ہے۔ اور دل میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔ کہ تحریر ہی میں خدا کے فضل سے موت آجائے، اور مسودہ نا تمام پڑا رہے۔ اس لئے اب جیسا بھی ہے۔ یہ چوتھا مسودہ پیش کر رہا ہوں۔۔۔



## حافظے کا ضعف

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی۔ صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لئے اٹکا تھا، والپسی میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ تو کہیئے کہ ایک میرے ہم عمر ٹہلتے ہوئے مل گئے، میں نے ان سے پوچھا کہ یہیں کہیں ایک برساتی نالے کے قریب جو ایک گنبد والا مکان ہے۔ کیا آپ اس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں، اور ان نیک مرد نے مجھ کو میرے گھر پہنچا دیا۔ اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا آج سے چالیس بیالس برس پیشتر میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا۔ میرا نام نصیر احمد ہے۔ جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ میں نے فرط شرم سے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں۔

اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد جب دست خط کرنے کی باری آئی تو اپنا تخلص بھول گیا، چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص یاد نہ آ جاتا تو یقین فرمائیے کہ میرا دم نکل جاتا۔

میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی ہے کہ اگر میری زندگی میں کسی واقعے کی کمی بیشی یا تقدم و تاخر نظر آئے تو اسے آپ میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر اسے معاف کر دیں۔

## حالات قلم بند کرنے کی جگر کاویاں

”چھتر برس کی پہاڑی زندگی کا احاطہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ میں نے بجھے ہوئے حافظے کے تہہ در تہہ پیچیدہ اور گھور اندھیروں میں ٹٹول ٹٹول کر یہ سفر طے کیا ہے۔ ان اندھیاریوں میں میرے حالات اس قدر الجھے اور ایک دوسرے پر چڑے ہوئے ملے کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سا واقعہ مقدم ہے اور کون موخر۔ اور نسیان کا غول بیابانی مجھے کس طرف لیے جا رہا ہے۔ پھونک پھونک کر، قدم رکھتا آگے بڑھتا رہا۔ اپنی پیری کو لڑکپن کی سرحدوں تک کھینچ کر لے گیا۔ لڑکپن سے ریعان شباب کی جانب باگ موڑی، ریعان شباب سے بھرپور جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر کے کوہ و بیابان طے کرتا ہوا بڑھاپے کی اس بٹیر تک آ گیا۔ کیا بتاؤں اس جان کاہ سفر میں کیا کیا جتن کرنا پڑے۔ میں نے اپنے بڑھاپے کو بچہ بنا کر اپنے ماں باپ کی آغوش میں بٹھایا۔ اپنے گھر کی انگنائی میں کلیں کیں، پرانی برساتوں کو جگایا، اپنے مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں گیا، اپنے لنگوٹیا یاروں کو پکارا اور اپنے موت کی نیند سوئے مور خان شباب کے شانے ہلائے۔ اور اپنے دور افتاد دوستوں کو اشاروں سے قریب بلایا۔ اور اپنی جوانی کے شبستانوں میں پہنچا۔ جہاں زلفوں کی شمیم اب تک مچل رہی ہے۔ اور ٹوٹے پیانوں اور بجھی شمعوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اور گیسوؤں سے گری ہوئی افشاں کے ذرے اب تک دمک رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر اپنے کچھڑے ہوئے معشوقوں کو اس مسند پر بٹھایا تو س قزح اور کاکشاں کے رنگ جس کا طواف کیا کرتے تھے۔ اور ماضی سے جب اپنے کو ڈسوا چکا تو قلم کو خون میں ڈبو ڈبو کر سب کچھ قلم بند کر لیا۔ اور آپ کو سنانے بیٹھ گیا۔

کہتے ہیں لکھنؤ میں ایک بوڑھے میرزا صاحب رہتے تھے۔ جنہوں نے حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ایک بار چند نو جوانوں نے اصرار کیا کہ

میرزا صاحب قبلہ کچھ پرانے حالات سنائیے۔ انہوں نے سینہ پیٹ کر کہا لڑکوں کو مجھ سے وہ داستان نہ سنو، ورنہ میری چھاتی شق ہو جائے گی۔ تمہاری تھوڑی دیر کی دل چسپی ہو جائے گی اور میں پہروں کے لئے بے کار ہو کر رہ جاؤں گا۔ لیکن جب ان نوجوانوں نے ان کے قدم پکڑ لیے تو ماضی کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو گئے۔ اور حالات سناتے سناتے تھوڑی دیر میں ان کا یہ عالم ہو گیا کہ گلا رندھ گیا۔ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے ”اور ہائے جان عالم کہہ کر بے ہوش ہو گئے“۔ سو بندہ پرور اپنا حال سنا کر میں بھی اس طرح ہچکیاں لے کر رو رہا ہوں۔ ہائے ماضی کے ڈنک،

اپنے کبھی کے رنگ محل میں جو ہم گئے  
آنسو ٹپک پڑے در و دیوار دیکھ کر

(۴)

## خود کشائی

میری زندگی کے چار بنیادی میلانات ہیں، شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی۔ ان سب کو سلسلہ وارد کیجئے تاکہ آپ سمجھ لیں کہ میں کیا ہوں؟

## ۱۔ شعر گوئی

میں نے شاعر بننے کی تمنا کبھی نہیں کی، بلکہ شعر خود خواہش آں کر دکہ گرد فن ما، میں شاعری کے پیچھے کبھی نہیں دوڑا بلکہ شاعری نے خود میرا تقاب کیا۔ اور نو برس کی عمر میں ہی مجھ کو پکڑ لیا۔ اگر شاعری کوئی اچھی شے ہے تو واللہ میں کسی آفرین کا مستحق نہیں ہوں۔ اور اگر وہ کوئی بری چیز ہے تو خدا کی قسم میں کسی ملامت کا بھی سزاوار نہیں۔

بار بار ہا گفتم و بار دیگر می گویم  
کہ من دل شدہ، ایں راہ نہ خود می پویم  
در پس آئینہ، طوطی صفت داشته اند  
آنچہ استاد ازل گفت، بگو، می گویم



شاعری میری حاکم ہے۔ میں محکوم ہوں۔ وہ جابر ہے میں مجبور، وہ قاہر ہے میں مقہور وہ آمر ہے اور میں مامور۔ شاعری کے باب میں بعض بزرگوں نے ایک کاص دینی مصلحت کی بنا پر جس کی شرح کا یہاں موقع نہیں، یہ عجیب کلیہ وضع فرمایا ہے کہ صرف اس موزوں کلام پر شعر کا اطلاق ہوگا جو بالقصد کہا گیا ہو۔ اگر یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائے تو میں نے آج کی تاریخ تک ایک مصرع بھی بالقصد موزوں کرنے کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ اس لئے آپ کو اختیار کامل حاصل ہے کہ میرے تمام کلام کو شاعری سے کلیۃً خارج فرما کر میرے غیر شاعر ہونے کا اعلان فرمادیں۔ میں خوش، میرا خدا خوش۔

آپ نے مجھے شاعر ہونے کا انعام ہی کب دیا تھا کہ اب مجھے نا شاعر تسلیم فرما کر، اس انعام سے محروم فرمادیں گے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سن لیجئے۔ کہ شاعری وہ بد بلا ہے کہ ہر موزوں طبع تخلص دار کے کان میں یہ افسوں پھونک دیتی ہے کہ بیٹا تم اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہو۔ اس لئے باورچی ٹولے کا ہر لونڈا، اپنے کو نعمت خان عالی سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔

جھوٹ کیوں بولوں میرے گوش مبارک میں بھی شاعری یہ افسوں پھونک چکی ہے کہ حضور اقدس و اعلیٰ اس بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی اشعر اشعراء ہیں۔۔۔ لیکن قوت و حیات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عقل بیمار نہیں ہے۔ اور وہ مجھ سے نہایت سنجیدگی اور دیانت سے کہتی ہے کہ خاں صاحب بہادر انائے شاعری کے فریب میں نہ آجائیے۔ اور وہ جو کچھ کان میں پھونک رہی ہے۔ اس سے پھول نہ جائیے۔ ہاں بے شک یہ ہو سکتا ہے کہ آپ شاعر یا بہت بڑے شاعر ہوں۔ لیکن اس طرح اس کا بھی مساوی امکان ہے کہ آپ معمولی شاعر، برے شاعر یا سرے سے شاعر ہی نہ ہوں۔ اس لئے دانائی یہی ہے کہ آپ ابھی اپنے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کریں۔

ذہن انسانی میں عمل ارتقا برابر جاری ہے۔ اور آپ کی موت کے سو ڈیڑھ سو برس بعد بھی نقادان ادب کا ذہن اس سطح پر آجائے گا کہ وہ آپ کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔ اس لئے سر دست دانش مندی یہی ہے کہ آپ گوگامو میں رہیں۔ عقل کا مشورہ باون تولے پاؤرتی کا ہے۔ اس کی معقولیت میں شک کرنا حماقت ہے۔ لیکن میں اس وقت اعراف میں بیٹھا ہوا ہوں، ایک طرف کھوکھلا انائے شعرانہ ہے، ایک طرف ٹھوس عقل سلیم۔ جب انا کی طرف سے ہوا آتی ہے تو اکڑ کر باون گز کا ہو جاتا ہوں اور جب عقل کی جانب سے ڈانٹ پڑتی ہے تو سکڑ کر بالشتیا بن جاتا ہوں۔ دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے۔

## ۶۔ عشق بازی

ہوش آتے ہی اچھی صورتیں میری نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھیں۔ اور یہ شعر سب سے زیادہ مجھ پر صادق آتا ہے کہ،  
ہوئے جوان، تو مرنے لگے حسینوں پر  
ہمیں تو موت، ہی آئی شباب کے بدلے

یہ سچ ہے کہ عشق فطرت کا بہت بڑا فریب ہے۔ جو اس لئے دیا جاتا ہے کہ انسان، افزائش نسل کے توسط سے موت کے مقابلے میں حیات پیدا کرتا رہے۔ اپنے وجود میں کمی اور آبادی کے تن و توش میں اضافہ کرے۔ اپنی جوانی گھالے۔ اور فطرت کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھ کر پالے۔ اپنا جو ہر گھٹائے دنیا کی رونق بڑھائے، اور جب تک جوان رہے۔

مرا مہر سیہ چشماں، ز سر بیروں نہ خواہد شد  
قضائے آسمانست ایں ودیگر گوں نہ خواہد شد  
کے نعرے لگاتا رہے اور پھر مرتے دم تک شیرہ ٹپکتی ہوئی جلیبی کی طرح پڑا رہے۔  
لیکن یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ کل دور عشق میں روتا تھا اور اب عہد عقل

میں اپنے پر ہنستا ہوں۔ لیکن اب کیا فائدہ جب چڑیاں چک گئیں کھیت، چالاک فطرت دھوکا دے کر مسکرا رہی ہے۔ اور میں ایک فریب خوردہ انسان کی مانند جھینپا ہوا بیٹھا ہوں:-

پر جھڑ گئے، دم گر گئی، پھرتے ہیں لندورے  
لیکن ماہِ رخوں کی ناشکری اور سلونیوں کی نمک حرامی ہوگی کہ اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ ان کے عشق کے بغیر میں آدمی نہیں بن سکتا تھا۔ میرا تمام کلام اور بالخصوص شاعری کی کج کلاہی انہیں متوالیوں اور مدھمانیوں کی جوتیوں کا تصدق ہے۔ اگر ان کی نظروں کے بان میرے دل کو چھلنی کر کے، گداختگی نہ پیدا کر دیتے تو خدا کی قسم مرتے دم تک میں گنگوہ شریف کا مولوی عبدالصمد بنا رہتا۔

میں نے کوئے بتاں میں جس قدر بھی اپنی صحت، جوانی، دولت اور زندگانی مٹھیاں بھر بھر کر لوٹائی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ذہنی کمائی کر چکا ہوں۔ اور مکھڑوں کے خدو خال چن چن کر میں نے اپنے گرد و پیش اس قدر عظیم سرمایہ جمع کر لیا ہے۔ جسے آج تک گھر بیٹھے کھا رہا ہوں۔ اور مرتے دم تک کھاتا رہوں گا۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم  
رب شباب کی قسم آج بھی جب کبھی کسی نو کیلے مکھڑے کو دیکھ لیتا ہوں، وہ مکھڑا بن کر کچھ سے میرے سینے میں چبھ جاتا ہے۔

جانتا ہوں کہ بد توفیق صالحین میری بات سن کر منہ بنا لیں گے۔ لیکن میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ ہر چند میرے بال سفید ہو چکے ہیں۔ لیکن بحمد اللہ میرا نامہ اعمال ابھی تک سیاہ ہے۔ اور آج بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ:

گر چہ پیرم تو چناں تنگ در آغوشم گیر  
کہ سحر گہ، زکنار تو، جواں بر خیزم  
۳۔ علم طلبی عشق کی طرح، مجھ کو حصول علم کو چسکا بھی لڑکپن سے ہی تھا۔ میرے



باپ چاہتے تھے کہ مجھ کو گھر کے مکتب میں ہی پڑھائیں اور نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ لیکن میں نے اتنا مہنہ مت مچایا کہ وہ مجھ کو باہر بھیج کر پڑھانے پر مجبور ہو گئے۔ اگر میرے دل میں علم کی لگن نہ ہوتی تو دوسرے رئیس زادوں کی طرح جاہل رہ جاتا۔ میں بچپن میں کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ اور ہوش آتے ہی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔

جوانی کی اندھیری برساتوں میں بھی ہر چند میری جھنجھاتی راتیں، سارنگیوں کی رُؤں رُؤں، مجیروں کی کھن کھن، طبلوں کی ٹکوروں اور گھنی زلفوں کی چھاؤں میں پینگ لیا کرتی تھی۔ لیکن میرے دن کتابوں کے مطالعے، شعروں کی تخلیق اور علماء و شعراء کی صحبتوں میں بسر ہوا کرتے تھے۔ اور جب دن کے وقت میرے من چلے دوست راہش و رنگ کی دعوت دیتے تھے تو میں ان سے کہا کرتا تھا کہ یاروں کا تو یہ اٹل اصول ہے کہ دن کو سو بھر (سپاہی) بنے رہو۔ اور رات کو لوہر (اوباش)۔

میرے دل میں، جوانی آتے ہی، دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا تھا۔ اور میرے راسخ العقیدہ باپ تک جب یہ خبر پہنچی تھی کہ میں بعض مسلمات کا مذاق اڑاتا ہوں تو انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر فرمایا تھا کہ مجھے اس کا خوف پیدا ہو گیا ہے کہ تو، آگے چل کر گم راہ ہو جائے گا۔ ”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے باپ کا خیال درست نکلا، اور میں ”گم راہ“ ہو گیا اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار)۔

ستاروں کے مشاہدے سے میرے تفکر کی ابتدا ہوئی تھی۔ تارے دیکھ کر میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ میں کیا ان کی چمک دمک کا راز کیا ہے انہیں کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے۔ شاید یہ تارے ہی ہیں جو سب سے پہلے بچوں کا دل موہ کر ان سے پوچھتے ہیں ننھے بھلا بتاؤ تو ہم کیا ہیں۔

جب سن آگے بڑھا فکر کا میدان بھی وسیع ہو گیا پورے نظام شمسی پر نظر پڑنے لگی۔ اور اس بات کی لگن لگ گئی کہ علت العلل کا سراغ لگاؤں۔ ذات و صفات کے تمام

مسائل کو الٹوں پلٹوں، پگھلاؤں، کھرچوں، کریدوں، ناپوں، تولوں، جانچوں، پرکھوں، ٹھونکوں، بجاؤں، کوٹوں، چھانوں، پھنکوں، اساؤں، چھوؤں، چکھوں، سونگھوں، بلواؤں، سنوں اور دیکھوں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اندھیری راتوں کو جب تاروں بھرے آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا تو بار بار یہ سوال پیدا دل کو برمانے لگتا تھا کہ ارے یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ ارادی ہے کہ اتفاقی؟ یہ سب کچھ کسی حکیم و عادل کا کارخانہ ہے یا کسی اندھی توانائی کی فقط اچھل کود؟ اور یہ سب آخر ہے کیوں اس کی پشت پر آخر کوئی مقصد ہے کہ نہیں؟ اور اپنے رب کی موجودگی میں یہ بے چارہ مرطوب اس قدر پائے مال و معتبوب کیوں ہے؟

میں نے ان مسائل پر غور کیا بار بار غور کیا، دم گھٹنے کی حد تک غور کیا..... اس کو چے میں برسوں پا پڑے نیلے کتابوں پر کتابیں پڑھیں ہندو مسلم یہودی، زرتشتی، بدھی، جینی اور عیسائی علماء کے سامنے برسوں دیورزہ گروں کے مانند کاسہ گدائی بڑھایا، علم کی بھیک مانگی، آگاہی کے واسطے ان کے آستانوں پر ناک رگڑی، گڑ گڑا گڑا گڑا کر دامن پھیلا یا لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔

اس کے بعد مدعیان معرفت یعنی صوفیا و مشائخ کے دروازے کھٹکھٹائے ان کی جوتیاں سیدھی کیں لیکن چند اشراقی اشاروں کے سوا کچھ بھی پلے نہ پڑا۔ اور وہ اشارے بھی کیا سارے کے سارے وجدانی فریب۔

اس طرح عمر گزرتی اور جوانی ڈھلتی گئی اور آخر کار پیری آگئی۔ پیری آتے ہی سر کے بال گر گئے اور کھوپڑی میں آگاہی کا اکھوا پھوٹ آیا نا توانی نے توانائی پیدا کر دی، اور بالآخر میں نے علم کے قلعے کو فتح کر لیا۔ آپ سمجھے کیوں کر؟ یعنی مجھے اس بات کا پورا پورا علم حاصل ہو گیا کہ میں جاہل نرا کاہل اور بے پناہ جاہل ہوں۔

بندہ نواز ارتقاء کی اس ابتدائی طفلانہ و تاریک منزل میں ایک نیم وحشی انسان کو اپنے جہل کا پتا چل جانا ہی سب سے بڑی سعادت ہے۔

سن ہو گئے کان تو سماعت پائی  
آنکھیں پتھرائیں تو بصارت پائی  
جب علم کے سب کھنگال ڈالے قلم  
تب ، دولت عرفان جہالت پائی

گواہ رہنا اے زمین و آسمان کہ میں نے علم کو ڈھونڈا لیکن پایا نہیں میں جاہل پیدا  
ہوا تھا۔ اور جاہل ہی مروں گا۔ تجھ پر ہزار افسوس اے ”خلیفہ رحمن“ اے ظلوم جہول  
انسان!!

۴۔ انسان دوستی..... (الف) ہاں انسان کرہ ارض کی جان..... انسان دشمنی  
عظیم عدوان..... حب انسانی، عین ایمان، انسان کا چہرہ، گیتا اور قرآن۔ اور اس سلطان  
الانسان!

اے مجھے ”کافر باللہ“ کہنے والو تم کو معلوم نہیں کہ کافر مومن بالانسان ہے۔ خود  
تمہارا دین کہتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے یہ بعید نہیں کہ وہ کافروں کو معاف کر دے، لیکن  
حقوق العباد کے پامال کرنے والے یعنی کافر بالانسان کی بخشش کے بارے میں خدا  
نے اپنا اقتدار بندوں کو بخش دیا ہے۔ اور جب تک مظلوم، اپنے ظالم کو معاف نہیں  
کرے گا اسے بخشا نہیں جائے گا۔ کافر باللہ کے لیے تو۔

شنیدم کہ درد و امید و بیم  
بداں را ، بینکاں بہ بخشد کریم

کاسہارا موجود ہے مگر کافر بالانسان کے واسطے جب تک کہ انسان اس کو معاف نہ  
کر دے، بخشش کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ دوستو! انسان دوستی، کوئی ہنسی کھیل نہیں۔  
اس کو چے میں ہر قدم پر خون تھوکنا پڑتا ہے۔

رہ رو راہ محبت کا خدا حافظ ہے  
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں



تمہاری نیت مجاہدات نفس کے سامنے حور و قصور اور کوثر و طہور کے پرے جے ہوئے ہیں۔ لیکن میرے جذبہ حب انسانی کی گلی حوران مقصورات کے خیموں کی طرف نہیں مڑتی، براہ راست دار کی طرف لے جاتی ہے۔

جی ہاں میں خود اپنے تجربوں کی بنا پر اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ عشق شہوانی! بھی ایک ایسی بلائے بد ہے کہ انسان بلبلا اٹھتا ہے اور کہتا پھرتا ہے۔

وہ نہیں بھولتا جدھر جاؤں  
ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں  
اور ایک عشق کی ماری نعرہ زن ہوتی ہے۔

جو سکھی ہیں جانتی کہ پیت ۛ کرے دکھ ہوئے  
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے

لیکن عشق شہوانی اور حب انسانی کے شدائد کو جب تولا جائے تو عشق کا پلا آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور حب کا پلہ زمین سے جنبش نہیں کرتا۔ عشق ایک آنی تشخ ہے جسم کا۔ اور حب ایک ابدی اضطراب ہے روح کا..... عشق کا تعلق ہوتا ہے صرف ایک ذات یعنی محبوب سے اور حب کا تعلق ہوتا ہے۔

ۛ شہوانی کے علاوہ عشق اور کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور جسے ”پاک عشق“ کہا جاتا ہے وہ بھی جذبہ شہوانی کا ایک ایسا شدید تموج ہوتا ہے کہ آدمی سن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ ۛ اے سکھی اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ عشق کرنے سے دکھ ہوتا ہے تو میں سارے شہر میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دیتی کہ کوئی عشق نہ کرے (میرا بانی)۔

روئے زمین کے اربوں انسانوں سے..... عاشق اپنی جنسی تسکین چاہتا ہے۔ اور محبت انسان، تمام دنیا کے افراد کی تسکین کا طلب گار بھی ہوتا ہے۔ عاشق پر جب معشوق مہربان ہو جاتا ہے تو اس کے دل کی آگ بجھ جاتی ہے لیکن محبت انسانیت کو روزگار مہربان ہو کر جب کسی نعمت خاص سے نوازتا ہے تو وہ چاروں طرف گھبرا کر

دیکھتا ہے کہ دوسروں تک بھی وہ نعمت پہنچی کہ نہیں اور جب اوروں کو اس سے محروم دیکھتا ہے تو عین محل شکر میں وہ شکایت کرتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے:

صد رفیق و صد ہمد پر شکستہ و دل تنگ  
داورا نہ می زبید ، بال و پر بمن تنہا  
اور خوب کان کھول کر یہ بھی سن لیجیے کہ عشق کا عقاب اڑتا ہے قیس و فرہاد کے  
سروں پر اور حب انسانی کا قرآن نازل ہوتا ہے رحمۃ اللعالمین کے دھڑکتے ہوئے  
دل پر نہیں تفاوت رہ از کجاست تا کجا۔ پہلے میں عشق کے موذی مرض میں گرفتار تھا  
اب حب انسانی کے مہلک مرض کا صید زبوں ہوں کل محبوب کی مفارقت میں تکیے  
بھگویا کرتا تھا۔ اب انسان کے مصائب پر رویا کرتا ہوں۔

ہرچند مستقبل انسانی بے حد روشن ہے۔ اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین  
ایک دن جنت بن جائے گی۔ یہ درندہ آدمی انسان کے مرتبے پر فائز ہو کر دم لے گا نہ  
عدالتیں ہی رہیں گی۔ نہ فوجیں نہ پولیس نہ اسلحہ سازی کے کارخانے پیری، مستقل  
جوانی بن جائے گی۔ اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا زندگی کی پیشانی پر حیات ابدی  
کا تاج رکھ دیا جائے گا شمس و قمر ہمارے پاؤں چومیں گے۔ ہم مشتری میں اگر ناشتہ  
کریں گے تو زہرا میں رات کا کھانا کھائیں گے۔ اور قوائے کائنات خدمت گاروں  
کے مانند ہمارے برآمدوں میں کھڑے رہا کریں گے لیکن اس میں لگیں گے بھی  
لاکھوں سال جب کہ میری ہڈیاں تک باقی نہیں رہیں گی۔

اس تصور سے جو ایک دن ایک ٹھوس حقیقت بننے والا ہے۔ ہرچند میرے دل کو  
بری تسکین ہوتی ہے پھر بھی یہ خلش رہ جاتی ہے کہ:

م نے مانا کہ کل وہ آئیں گے  
عقل حیراں ہے آج کیا کیجیے  
آج تو انسان اس قدر آفات میں گھرا ہوا ہے کہ دل چٹکیوں میں ملا کرتا ہے۔

چھوٹے کنبے والے کے مصائب بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور کنبہ جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے مصائب میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اور مجھ نامراد کا کنبہ تو ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے غور فرمائیے کہ میرے مصائب کیا ہوں گے۔

جب کسی مفلس کے گھر کے چولہے میں آگ روشن نہیں ہوتی میرے سینے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ جب کسی یتیم کی پسلیاں نکلی نظر آتی ہیں۔ میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چھنے لگتی ہیں جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں اور جب کسی گھر سے بھی جنازہ نکلتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔

ہر چند امریکہ ظالم ہے اور ویٹ نام مظلوم، لیکن ویٹ نام کے مظلوم شہیدوں پر ہی نہیں امریکہ کے ظالم مقتولوں پر بھی ماتم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اللہ نہ کرے کہ کسی بد بخت کے سینے میں ابوالانسان کا دل دھڑکنے لگے۔

خنجر چلے کسی پہ ترپتے ہیں ہم امیر  
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

(ب) اس درد مندی کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

یہ ایک ناقابل ابطال حقیقت ہے کہ انفس و آفاق یعنی تمام ذی حیات و غیر ذی حیات واحد العناصر، واحد الخیر، واحد القوام، واحد العلت، واحد النسل، اور واحد الاصل ہیں۔ اور اس طرح واحد النسل ہیں جس طرح پلاسٹک کے کھلونے اور پلاسٹک کے پھول ہر چند اسماء اشکال اور اجسام کے اعتبار سے تمام کھلونے اور تمام پھول، ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف و متضاد نظر آتے ہیں لیکن اگر انہیں پگھلا دیں گے تو پلاسٹک کے سوا اور کچھ باقی ہی نہیں رہ جائے گا۔

اور سب سے بڑی قیامت تو یہ ہے کہ جاہل ہوس پرور اور لئیم سیاست نے اپنے شیطانی جذبات کی آسودگی کی خاطر انفس و آفاق کی اس وحدت کو ایک دوسرے سے



نفرت کرنے والی کثرت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

فوجی درندگی کے بل بوتے پر فتنے برپا کرنے والے ارباب سیاست کا یہ خیال ہے کہ دانائی اسی میں ہے کہ نادانوں کو، ثقافت، لسان، اوطان اور ادیان میں الجھا کر چھوٹی چھوٹی برسر جنگ ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ ان پر فرماں روائی کی جائے۔

انہوں نے انتہائی بددیانتی کے ساتھ بین الاقوام کی ترکیب تراشی ہے اور نوع انسانی کو جو مشرق سے لے کر مغرب تک صرف ایک قوم ہے۔ زبانوں، وطنوں، دینوں اور رنگوں کی آویزشوں میں مبتلا کر کے پوری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ان ظالم مسخروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ:

لفظ اقوام میں کوئی جان نہیں  
اک نوع میں ہو ویں یہ امکان نہیں  
جو مشرک یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط  
جو مشرک انساں ہے وہ انسان نہیں

لطف تو یہ ہے کہ وہ بانیاں فساد، خود تو سلامتی کے گوشوں میں دجے بیٹھے ہیں۔ اور روٹی کی خاطر اپنے بھائیوں کی جانیں لینے والی فوجوں کو لٹکا دیا ہے کہ وہ خون کی ہولی کھیلتے پھریں۔

منہ پیٹنے کی بات تو یہ ہے کہ ان روٹی کے مارے ہوئے اور حب وطن کے فریب کھائے ہوئے سپاہیوں کو جن کی کہنیوں سے ان کے بھائیوں کا تازہ خون ٹپک رہا ہے فیلڈ مارشل قومی ہیرو اور غازی اعظم جیسے خطابات مرحمت فرمائے جا رہے ہیں۔ جہالت کی لے اس قدر بڑھ چکی ہے کہ خود بڑے بڑے تعلیم یافتہ افراد بھی اس دھوکے میں آچکے ہیں کہ ہم پاکستانی، ہندوستانی، افغانستانی، ترکستانی اور انگلستانی ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ میں ہندو ہوں، مسلمان ہوں، عیسائی ہوں، زرتشتی

ہوں، یہودی ہوں لیکن ان سادہ لوحوں کے ذہنوں میں یہ تصور جاگ رہا نہیں ہوتا کہ میں انسان ہوں سب سے پہلے انسان ہوں اور اس کے بعد کچھ اور۔

پروپیگنڈے کی طاقت تو دیکھیے کہ دین و ملک کے چکر میں آکر ہم اپنی انسانیت کو قطعاً فراموش کر چکے ہیں، اور یہ دیکھ کر بڑی بے پایاں حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کی اس اکائی میں سے اعداد کا یہ جراثیم کہاں سے نکل پڑا، عینیت کے اس چشمہ شیریں میں یہ غیریت کا زہر کس نے ملا دیا، اور اس کعبہ وحدت میں یہ خنزیر شرک کیوں کر داخل ہو گیا..... بسوخت عقل ز حیرت، کہ اس چہ بولالہ جی!

(ج) اب دیکھیے تیسرا رخ..... سرمایہ داری کا نظام، ایک زبردست تن و توش کی جونک کے مانند، علامۃ الناس کی گردن میں منہ گارے بڑے مزے لے لے کر ان کا خون چوس رہا ہے۔

اس منحوس نظام نے آنکھوں سے مروت لہجے سے نرمی خیالات سے ہمدردی اور دلوں کی دھڑکنیں چھین لی ہیں، اور ہوس کاروں کو ٹھوس چٹانوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ یقین فرمائیے کہ جب تک آدمی حجاج، ہلاکو، چنگیز، نادر، نیر و، ابن زیاد اور یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا سرمایہ دار صنعت کار بن ہی نہیں سکتا۔

اس فریب میں نہ آجائے گا کہ مزدوروں، کسانوں، مفلسوں اور اس قبیل کے کروڑوں انسانوں پر جو بیت رہی ہے اس سے وہ بے خبر ہیں۔ جی نہیں ان کو سب کی دردمندیوں کا علم ہے، اور یہ بھی سن لیجیے کہ وہ اس علم سے ترس کھانے کے بدلے، اٹلے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

جب ان کے دسترخوان پر مرغ و ماہی کی قابیں چنی جاتی ہیں تو وہ اس تصور کی چٹنی چاٹ چاٹ کر اپنے کھانوں کی لذت اور بھی بڑھا لیتے ہیں کہ اس وقت لاکھوں آدمی روکھے سوکھے ٹکڑے کھا رہے ہوں گے اور راتوں کو جب وہ اپنے گرم ریشمی لحافوں میں دبک کر یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت اللہ کے لاکھوں بندے، فٹ پاتھوں پر سردی

سے اکڑ رہے ہوں گے، تو ان کے لحافوں کی گرمی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ ناداروں کو موٹے جھوٹے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں، تو ان کے حریر دپرناں کے لباس کی نرمی ہزار چند بڑھ جاتی ہے لیکن روزگار کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس سے ان کی نیندیں بھی حرام ہو کر رہ گئی ہیں وہ اپنے بینکوں میں رکھے ہوئے سکوں اور اپنے کارخانوں کی چلتی ہوئی مشینوں کے ناقابل برداشت وزن کے نیچے دبے پڑے ہوتے ہیں بری طرح کراہ رہے ہیں۔ ایک بار دہلی کے ایک بہت بڑے سرمایہ دارو صنعت کار نے اپنے چاندی کے سے سفید بالوں کو نوچ نوچ کر مجھ سے کہا تھا جوش صاحب آپ کوئی (شاعر) ہمیں کو یوں کے سر پر بھگو ان کا ہاتھ ہوتا ہے آپ میرے مرجانے کی دعا کریں، اور جب میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ اس ہندوستان کے کروڑوں آدمی اس آرزو میں گھلے جا رہے ہیں کہ آپ کی دولت کا دسواں حصہ ہی ان کو مل جائے تو انہوں نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو میری پتا نہیں معلوم، نہیں تو وہ میرا سا بننے کا کبھی خواب بھی نہ دیکھتے۔ اور جب میں نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کی پتا کیا ہے تو آنکھوں میں آنسو بھر کے انہوں نے جواب دیا تھا کہ جوش صاحب آپ دیکھتے ہیں کہ میرے چاروں طرف سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، مگر من کو چین نہیں ہر روز جب صبح کو جاگتا ہوں تو میرا دل گر گر گر گر کر مجھ سے کہتا ہے کہ

لالہ جی آج دو پیسے اور کمالو.....!!

دیکھا آپ نے اس فراوانی دولت کا انجام۔ اور افراط زر کی ناداری؟

زر دار کا خناس نہیں جاتا ہے  
 ہر آن کا وسواس نہیں جاتا ہے  
 ہوتا ہے جو شدت ہوس پر مبنی  
 تارگ وہ افلاس نہیں جاتا ہے

ہاں بہت جلد وہ ساعت آنے والی ہے کہ سوشلزم کے تند جھونکے ان کے چراغوں



کو بجھا کر آواز بلند کریں گے:

دیدی؟ کہ خون ناحق پروانہ ..... شمع را  
چنداں اماں نہ داد کہ شب را ' سحر کن!  
(د) اب چوتھا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے..... اور وہ ہے موت کا یقین کامل۔  
چو ' پردہ دار' بشمشیری زند ہمہ را  
کسے مقیم حریم حرم نہ خواہد ماند

گدا سے لے کر شاہ تک اور خرابات سے لے کا خانقاہ تک دنیا کے ہر سر اور ہر در پر  
موت کا خونی گدھ منڈلا رہا ہے۔ اور مہر کوچے سے رام رام ست ہے اور انا اللہ وانا الیہ  
راجعون کی صدائیں چلی آرہی ہیں۔ انسان بنفس مطمئنہ کا طلب گار ہے، تسکین خاطر  
پر جان دیتا ہے۔ لیکن اس کو یہ دولت کہیں بھی نہیں ملتی اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ:  
بقدر ہر سکون، راحت بود، بگر مرانب را  
دویدن، رفتن، استادان، نشستن، خفتن و مردن  
تو اس کی سانس رکنے لگتی ہے۔ اور مضیں ڈوبنے کے قریب ہو جاتی ہیں۔ اور  
جب اس کے کانوں میں یہ آواز بھی گونج اٹھتی ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے  
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟  
تو وہ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

ایسی زندگی کس کام کی جس کے ایک سیکنڈ کے کروڑوں حصے میں بھی یہ اطمینان  
نہیں ہوتا کہ ابھی ہم کو موت نہیں آئے گی۔  
موت ایسی حیات سے اچھی۔

(س) اور ان تمام بے شمار آفات کے ساتھ ساتھ..... اللہ اللہ یہ نوجوان بیواؤں  
کی ٹوٹی چوڑیاں یتیم بچوں کی یہ کچھ ڈھونڈنے والی آنکھیں، نادار بیماروں کی یہ ابھری

ہوئی پسلیاں، دو لھاؤں کے زانوں پر یہ چوتھی کہ لکھنوں کی آخری ہچکیاں..... براتوں  
 کی یہ بھری ہوئی ڈوبتی کشتیاں عاشقوں کے سامنے معشوقوں کی یہ الٹی پتلیاں  
 ..... ماؤں کے آغوش میں یہ پھول سے بچوں کے ڈھلتے ہوئے منکے..... اور بوڑھے  
 باپوں کے کاندھوں پر یہ جوانا مرگ بیٹوں کے کچھلتے جنازے.....

اور اس کے دوش بدوش یہ جراثیم یہ بچھو یہ سانپ، یہ بستیوں کو بھسم کر دینے والی  
 آتش زدگیاں یہ قحط، یہ کال، یہ سیلاب، یہ طوفان، یہ وباں۔ یہ زمہریری وجہنمی ہوائیں۔  
 یہ آتش فشاں پہاڑ اور شہروں کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دینے والے یہ بھیا نک زلزلے،  
 الامان والحفیظ..... فطری طور پر دل میں یہ سوال بار بار مچلتا ہے کہ باوا ان آفات ارضی و  
 سماوی کی پشت پر کوئی معقول برہان اور کوئی حکیم نہ عادل اور رحمن کا فرما ہے کہ نہیں؟  
 ارے اس زمین اور اس آسمان پر ہے کوئی جو دکھیا انسان قدرت کے سوتیلے بیٹے،  
 انسان کو اپنی پناہ میں لے لے؟ یہ گرگڑاتی آواز، لاکھوں برس سے اس بوڑھے آسمان  
 کی بوسیدہ ڈاٹ کے نیچے گونج رہی ہے لیکن ایک ابدی سناٹا چھایا ہوا ہے کسی طرف  
 سے بھی کوئی آواز نہیں آتی۔

میر درد نے تڑپ کر باد صبا سے کہا تھا۔

یہی	احوال	درد	کا	کہو
گر	صبا	کوئے	یار	میں
کون	سی	رات	آن	میلے
دن	بہت	انتظار	میں	گزرے

میرا بھی یہی عالم ہے مدت سے کسی مددگار کا انتظار کر رہا ہوں لیکن کسی مددگار کی  
 چاپ سنائی نہیں دے رہی ہے قدموں کی چاپ تو بڑی چیز ہے کوئی آواز پر آواز بھی  
 نہیں دے رہا ہوں اے اتھاہ سناٹے ہاں تو ضرور کچھ بول رہا ہے اور میں سن رہا ہوں  
 ۔ لیکن اسے زبان تک لانے کی جرات نہیں کر سکتا..... احمقانہ شہادت پر میں تیار نہیں۔

اور گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ چیخ رہا ہوں کہ

ایں میر سید کہ ہر غالب ناکام چہ رفت  
می نواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت  
ارے میں نامراد اپنا درود کس سے کہوں؟  
داوری دارم بے یارب کراؤ اور کنم!

☆☆☆



## بنام قوت و حیات!

میرا حاشہ ولادت

میں اس بوند بھر زندگی کو بھو گئے اور اس بظاہر رنگین و باطن خون آلودہ زندان کون و فساد میں او بھنے کے واسطے کب لایا گیا ہوں اس امر کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا

البتہ میری دادی جان نے جو خاندان کی مورخ تھیں مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا وہ سن عیسوی کے حساب سے سنہ ۱۸۹۶ء تھا یا سنہ ۱۸۹۸ء یہ بھی یاد نہیں رہا۔ بہر حال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے۔ اس لیے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں سنہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا..... (دو برس اور بوڑھا ہو گیا ہو جانے دیجیے جو قی کی نوک سے)۔

البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے فرمایا تھا کہ بیٹا تو صبح چار بجے پیدا ہوا تھا۔

### میرا وطن

آم کے باغوں کی رومانی اور گھنیری چھاؤں میں جھومتا بورکی بوئے مستانہ سے مہکتا کونلوں کی کوکو اور پیپیوں کی پی ہو پی ہو سے چہکتا ملیح آباد ہندوستان کی تہذیبی جنت یعنی لکھنؤ سے فقط تیرہ میل کی مسافت پر واقع ہے۔

اِشاید یہی علت ہو میری سحر پرستی کی۔

یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے جس کے ایک گوشے میں ہم لوگ یعنی درہ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی اور دوسرے گوشے میں قندھار سے آئے ہوئے قندھاری آباد ہیں۔

ہندوستان میں آکر بھی اور جوار لکھنؤ میں رہنے کے باوجود ہم نے اپنی جنگ جوئی کی عادت نہیں چھوڑی اور آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین ایک مدت دراز



تک تلوار چلتی رہی۔ اور فرنگیوں نے آکر جب تلوار چھین لی تو لٹھ پونگا ہونے لگا۔  
ہندوستان آکر اور خصوصاً لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر ہو کر ہم لوگ ایک عجیب گنگا  
جمنی قوم بن گئے۔

ہمارے خون میں درہ خیبر کی شعلہ بار دو پہر مچلتی رہی اور ہمارے سروں پر اودھ کی  
سلونی شام گل باریاں کرنے لگی..... اور یلح آباد لکھنؤ کی شائستگی و تہذیب اور قبائلی  
علاقوں کی بربریت و وحشت کا ایک عجیب نقطہ اتصال بن گیا۔

ہمارے یہاں ایک طرف تو لکھنؤ کی دپلی ٹوپیاں ململ اور ریشم کے کڑھے ہوتے  
شرہتی انگرکھے، سلمی ستاری کی رضائیاں مخمل کے لحاف چوک کا عطر قنوج کا تیل پھلیل  
اور مشروئے کے پایجامے راہ پاگئے۔ اور پتنگ بازیاں مرغ بازیاں بتیر بازیاں اور  
ان کی پالیاں ہونے لگیں..... اور ہم نے اسلام علیکم کے بجائے آداب تسلیمات کورنش،  
اور بندگی کو اختیار کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بہت بازیاں اور مشاعرے بھی ہونے  
لگے۔ اور صحت زبان کے تصور نے بھی آنکھیں کھول دیں.....

اور دوسری طرف اللہ دے اور بندہ لے قسم کے ہنگامے بھی جارے رہے اور آئے  
دن فوج داریاں اور خوں خواریاں بھی برابر ہوتی رہیں۔

---

۱۔ ہم لوگ آفریدی آدم خیل اور آدم خیلوں کی ایک شاخ ”علی خیل“ سے تعلق  
رکھتے ہیں۔

---

مدتوں تک ہمارا یہ عالم رہا کہ اگر کسی راہ رو کو اتفاقاً کھانسی آجاتی تھی اور وہ کسی کے  
دروازے کے سامنے جھوک دیتا تھا تو صاحب خانہ صاحب لٹھ لے کر گلی میں آجاتے  
تھے کہ خان صاحب آپ ہمارے دروازے پر جھوک رہے ہیں اور جھوکنے والے خان  
صاحب اکڑ کر یہ جواب دیتے تھے کہ جب نہیں جھوکا تھا تو اب جھوک رہے ہیں آخ جھو  
آخ جھو اور دونوں کے درمیان بڑے زور شور سے لٹھ چلنے لگتا۔ اور اگر کسی کی شادی بیاہ  
میں حریف گروہ آئے سامنے کھڑوں پر بیٹھے حقہ پیتے تھے۔ تو ان میں سے جب ایک

گروہ کا آدمی کڑکڑکڑاک کی آواز نکال کر حقہ پیتا تھا تو دوسرے گروہ کے تمام آدمی اس کو اعلان جنگ سمجھ کر اس سے بھی کہیں زیادہ زور سے کڑکڑکڑاک کڑکڑاک کڑکڑاک کی آوازیں نکال کر اس قدر زور سے حقے پیتے تھے کہ چلموں سے آنچیں نکل آتی تھیں اور اس ضد ضد کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا تھا کہ پل بھر میں فریقین کے سر لہو لہان ہو کر رہ جاتے تھے۔

لکھنؤ کے کمشنر یا گورنر نے ملیح آباد کے باب میں یہ جملہ نہایت ہی خوب لکھا تھا کہ ملیح آباد درہ خیبر کا ایک ایسا جزو ہے جس کا ہندوستان سے ابھی تک الحاق نہیں ہو سکا ہے۔

میرے خاندان کے انحطاط کے بعد ملیح آباد کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہے تینوں ڈیوڑھیوں میں سے اب ایک ڈیوڑھی بھی باقی نہیں رہی ہے..... اور ملیح آبادی کی دھاک دم توڑ چکی ہے۔

پھر بھی میرے ملیح آباد کے تیور ابھی تک کلیہً بچھنے نہیں پا رہے ہیں۔ ہر چند زمینداری اور تعلقہ داری کی تنسیخ فضا پر ایک عبرت ناک سناٹے کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ مگر لوگوں میں ٹھنولی کا دم خم اور سپہ گری کا ططنہ آج تک باقی ہے۔

اب ملیح آباد کی حالت لکھنؤ کے ان میر صاحب کی سی ہے جو شباب میں اس قدر خوب رو اور گھبروتھے کہ بڑی بڑی نک چڑھی پری جمالوں تک کے غرور جمال کی پنڈلیاں ان کے روبرو کانپنے لگتی تھیں۔

---

۱۔ اونچی اور چوڑی چارپائی ۲۔ میرے باپ اور میرے دونوں چچاؤں کی ڈیوڑھیاں۔

---

لیکن شباب دھلنے کے بعد جب وہ کسی شہر کی سرائے میں جا کر ٹھہرے اور برآمدے میں بیٹھ کر حقہ پینے لگے اور بھکاری کی لڑکیاں ان کے حقہ پینے کے انداز پر ہر کش پر ان کے گالوں کے نشیب و فراز پر ہنسنے لگیں تو انہوں نے جھلا کر کہا کہ ہنس لو

کالی کلوٹی چھو کر یو جی بھر کے ہنس لو اگر جوانی میں تم مجھے دیکھ لیتیں تو ہائے مرے اللہ  
ہائے مرے اللہ کہہ کر زمین پر بیٹھ جاتیں اور پھلچھلانے لگتیں۔  
اس طرح میرٹھ آباد بھی زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

یاراں کہ سرکشند زخوت بر آسماں  
بر آستان مے کدہ ، شام ، نہ دیدہ اند  
آں ہا کہ آؤ رند سبک در نظر مرا  
بے چارگاں بکوائے مغام نہ دیدہ اند!

### میری حویلی کی اندرونی فضا

ہر طرف روشنی تھی رنگینی تھی چہل پہل تھی..... لونڈیاں، باندیاں، ماماں اسیلیں  
مغلانیاں اناکیں روائیں کھلائیاں..... استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے اور راتوں  
کو کہانیاں سنانے والیاں چاروں طرف چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی تھیں۔  
اس مستقل آبادی کے علاوہ شریف گھرانوں کی غریب عورتیں بھی چندے اچھے  
دن گزارنے کے لیے آئے دن بطور مہمان آتیں ایک ایک دو دو مہینے رہتیں اور جب  
چلی جاتیں تو نئی مہمان عورتیں اُن کی جگہ آ کر پر کر لیتی تھیں۔

### بیرونی فضا

خدمت گاروں، رکاب داروں فراشو سپاہیوں مولویوں، ماسٹروں مصاحبوں  
داستان گوئیوں منشیوں ضلع داروں، اور کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔  
ان کے علاوہ بیرونی و لکھنوی شاعروں میں سے دو چار ہمیشہ بطور مہمان رہتے اور  
آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

اور ہم بچے مزا لیا کرتے تھے اپنے گھر کی ہتھی سے جس کو ہم گنے کھلاتے تو وہ  
جھومتی اور جب ہم اس کو نوری انڈا کہہ کہہ کر چڑھاتے تھے تو وہ غصے کے مارے  
زنجیریں تڑانے لگتی تھی۔

## میرا مجموعہ اضداد مزاج

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بچپن میں تھا کیا؟ شعلہ تھا کہ شبِ نمِ حدید تھا کہ حریر  
نوکِ خاردار تھا کہ برگِ گلِ خنجر تھا کہ ہلالِ چنگیز خان کا علم بردار تھا کہ رحمۃ اللعالمین کا  
پرستار؟

ایک رخ سے تو میں اس بلا کا سرلیج الاشتعال تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں جامے  
سے باہر ہو جاتا اور جو بھی سامنے آتا اس کو پھاڑ کھایا کرتا تھا۔  
اور ایک رخ سے اس قدر بے پناہ صاحبِ مہر و وفا اور اس حد کا سرچشمہ لطف و عطا  
تھا کہ دوسروں کے واسطے بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ رہا کرتا تھا۔  
میرے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے اگر کسی بات پر بگڑ  
جاتا تو بید مار مار کر ان بے چاروں کی کھال کھینچ لیا کرتا تھا.....

اور جب ماسٹر بن کر اپنا پڑھا ہوا سبق ساتھ کے بچوں کو پڑھاتا اور دوسرے دن  
ان سے آموختہ دہراتا اور وہ دہرانہ سکتے تو ان کو ڈنڈوں سے پیٹتا اور ان کے کاندھوں  
پر سوار ہو کر ان کو خچروں کی طرح اس قدر سرپٹ دوڑایا کرتا تھا کہ ان کی جانوں پر بن  
جایا کرتی تھی.....

اپنی چھوٹی بہن انیس جہاں سے تو میرے ایسے ایسے زبردست ہنگامے ہوا کرتے  
تھے کہ اللہ کی پناہ وہ بھی بچپن میں میری طرح اس قدر بد مزاج و غضب اور چڑچڑی  
تھی کہ ہنگامِ جنگ میں وہ میرا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتی اور میں اس کے جھونٹے  
نوح کر پھینک دیا کرتا تھا۔

---

۱۔ اور اب وہی انیس مجھے سب سے زیادہ چاہتی ہے۔ اور جب لکھنوجا کر اس  
سے ملتا ہوں تو وہ میرے گلے لگ کر جل تھل بھر دیتی ہے اور ٹکلی باندھ کر مجھ کو اس  
طرح دیر تک دیکھتی رہتی ہے کہ گویا اپنے دل کے زخموں میں ٹانکے لگا رہی ہے۔

---

ہر تیسرے چوتھے روز انیس ۱ سے میری مہا بھارت ہوا کرتی تھی اور انگنائی میں



کنویں کے گرد و پیش کا حصہ ہمارا پانی پت کا میدان تھا۔ اور ایسا میدان کہ اگر مائیں، اسیلیں آ کر ہمیں چھیڑا نہ دیتیں تو ہم ایک دوسرے کو ہلاک کر کے رکھ دیتے۔

میری ماں اپنے تمام بچوں میں سب سے زیادہ مجھ کو چاہتی تھیں، اور دودھ اور شہد کا پیالہ روز صبح کو مجھے اپنے ہات سے پلایا کرتی تھیں اور اگر کسی دن دودھ کے پیالے میں کوئی ذرہ نظر آ جاتا تھا تو میں کم بخت پیالے کو تڑ سے زمین پر پٹک دیا کرتا تھا اور وہ روئے نلگتی تھی۔

میں اپنے باپ سے بے حد ڈرتا تھا اور اس قدر کہ جب ان کے سامنے جاتا تھا تو میری چال بدل جایا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب ایک روز میں خرپرے کی قاشمیں چو کو کی نوک سے اٹھا تھا کر کھا رہا تھا اور انہوں نے ڈانٹ کر یہ کہا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہے گدھے چا کو کی نوک اگر تلو میں چبھ گئی تو ناچتا پھرے گا سارے گھر میں..... تو مجھے اس قدر غصہ آ گیا تھا کہ میں نے باپ کی طرف چاقو اس طرح نشانہ باندھ کر پھینک مارا تھا کہ اگر وہ ان کے سینے میں چبھ جاتا تو لہو لہان ہو جاتے۔

اسی طرح میں نے ایک بار اور بھی اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کی تھی۔

میرے باپ کا سختی کے ساتھ یہ حکم تھا کہ بچوں میں سے کوئی بھی ان کی اجازت کے بغیر پھانک سے باہر قدم نہ رکھے۔ اور جب وہ ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دیتے تو چار پانچ سپاہی ہمارے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ باغ تشریف لے جا چکے تھے ان کی غیبت سے فائدہ اٹھا کر میں مشیر احمد خاں رام پوری کے گھر جو بالکل ہمارے پھانک کے سامنے تھا چلا گیا مشیر خاں کی ماں اپنے پوتے یعنی میرے دوست مختار کو کھانا کھلا رہی تھیں مجھے بھی انہوں نے دسترخوان پر بٹھالیا۔ اور اپنے ہاتھ سے لقمے بنا بنا کر مجھے بھنڈی کھلائی۔

۱۔ اس بھنڈی کا مزاج اب تک زبان پر تازہ اور حافظے میں محفوظ ہے اور اب جب کبھی

بھنڈی کھاتا ہوں تو میرے منہ سے نکل جاتا ہے بے ساختہ ”ہائے مشیر خاں کی ماں“۔

جب مزے کی بھنڈی کھلا کر گھر آیا دیکھا کہ میرے باپ باغ سے آگے اور آرام کرسی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بڑی خشونت کے ساتھ پوچھا کہاں گئے تھے میں نے کہا مشیر خاں کے گھر انہوں نے پوچھا اور میری اجازت کے بغیر میں نے کہا آپ یہاں تھے کہاں انہوں نے فرمایا میرے آنے کا انتظار کرتے اور گئے بھی تھے تو سپاہیوں کو ساتھ کیوں نہیں لیا۔ میں نے کہا میاں دو قدم کے لیے سپاہی لے کر جا کر کیا کرتا انہوں نے برا فروختہ ہو کر مجھے فرمایا مجھ سے منطق بگھار رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور ہروقی کی پتلی سی جریب اس زور سے میری پیٹ میں ماری کہ میں بلبلا گیا۔ اور انتہائی تیسے کے عالم میں مجھ نالائق کی زبان سے بے ارادہ نکل گیا کہ اللہ کرے مرجائیں میاں۔

یہ سنتے ہی میرے باپ غصے کے مارے دیوانے ہو گئے کھر کھراتے مجھے اندر لے گئے اور جریبوں پر جریبیں مارنے لگے۔ وہ تو کہیے میری دادی جان آگئیں اور انہوں نے میرے اپ کی پشت پر لکڑی مار کر کہا کیا ماڑ ڈالے گانچے کو۔ اور میرے باپ نے فوراً ہاتھ روک لیا۔

معلوم نہیں کیوں مگر میاں بسنت میری چڑھ گئی.....

ایک روز میرے باپ ے کمرے میں ایک بڑی خوفناک ڈاڑھی والے مولانا اونچا سا عمامہ باندھے اور مولے تال کی عینک لگائے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ میں ادھر آ نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی مشیر خاں نے ان مولانا کے کان میں کچھ کہہ کر میری جانب اشارہ کیا مولانا نے جھپٹ کر مجھے گود میں بٹھالیا۔ اور میرے سر پر بڑی شفقت کے ساتھ یہ بات پھیر کر کہا ”کہو میاں بسنت کیا کھاؤ گے“ یہ سنتے ہی میں نے ان کی داڑھی پکڑ لی اور ابے ماڈالوں کا کانعرہ لگا کر اس زور سے ان کی داڑھی کو جھٹکا دیا کہ ان کا عمامہ عینک سمیت فرش پر گر پڑا۔ ان کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔ مشیر خاں ہنستے ہنستے بے دم ہو گئے اور میرے باپ نے زور لگا کر ان کی داڑھی میری

گرفت سے چھڑادی اور میں اوف اوف اوف کرتا باہر نکل گیا۔

ایک روز میں اپنے پھانک پر بڑی سی ہوائی بندوق بھر کے کھڑا ہوا تھا کہ ایک دائی کا لڑکا میرے سامنے سے گزرا لیکن مجھے سلام نہیں کیا اس کی اس گستاخی پر مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے اس پر دن سے فائر کر دیا۔ بڑا سا چھرا اس بچارے کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ اور وہ گر کر ترپنے لگا۔ اور مجھ شقی نے اس کے ترپنے پر رحم کھانے کے عوض اس کی پسلی پر زور سے ٹھوکر مار کر کہا ابے دو کوری کے دائی اتھ اور سلام کر اور جب وہ غریب کراہتا اٹھا اور جھک کر مجھے سلام کیا تو میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

ایک روز یاد نہیں کسی خطا پر میں نے اپنے غلام حسین بخشا کو زنا نے مکان کے صحن میں کھڑا مار رہا تھا کہ چھڑیوں سے تراڑ تراڑ کر ڈیوڑھی میں دادامیاں تشریف لے آئے۔ دم نکل گیا ان کو دیکھ کر کہ اب وہ مجھے ماریں گے۔ یا ڈانٹیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ دادامیاں مسکراتے آئے اور میرا ہاتھ پکڑا مجھے باپ کے کمرے میں لے گئے اور میرے باپ سے کہا بشیر میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ تمہارا یہ منجھلا بیٹا بڑا سورمانکلے گا۔ اور بادشاہوں تک سے ٹکر لے گا۔ اور جب میرے باپ نے پوچھا باوا یہ اندازہ کیسے ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ غلام کو مار رہا تھا۔ اور ایسے تیوروں سے ہو رہا تھا کہ سورماؤں کے سوا ایسے تیور کسی کو میسر ہی نہیں ہو سکتے۔

بشیر ہم پٹھان ہیں سورماؤں اور بزدلوں کے تیوروں کو ہم سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے کہ سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری

ارپھر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ برب کعبہ میں گوگاؤں اور وہ باغ تیرے نام براہ راست لکھ دوں گا۔ اور لے یہ دو گنیاں اس کی مٹھائی کھانا اور اس میں سے پانچ روپے اس غلام زادے کو دے دینا جس کو تو ابھی مار رہا تھا۔

آپ نے میرا غیظ و غضب دیکھ لیا۔ اب میری مہر و وفا اور جو دو سخا کارخ بھی دیکھ

لیجیے۔

میرے بچپن تک میرے گھر میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ ناشتے میں ہم نہایت خستہ روغنی روٹیاں بالائی اور انڈے کھاتے اور شہد آمیز خالص دودھ پیا کرتے تھے اور جاڑوں کے زمانے میں ناشتیکے بعد جب ہماری جیبوں میں چھلے چلغوزے اخروٹ کی گری کشمش باداموں کا مغز اور صاف کیے ہوئے پستے بھر دیے جاتے تھے تو میں باہر آ کر آواز دیا کرتا تھا کہ رف کے چھڑو یو چلو..... پہلے اس نعرے کو سمجھ لیجیے۔

ان کی یہ مخصوص قسم تھی ۲ موت نے ان کو ایفائے عہد کی فرصت نہیں دی۔

میرے دادا کے برف خانے کی چھت پر مٹی کے کورے ظروف کا مسالا لگا کر رکھ دیے جاتے تھے جن میں پچھلے پہر تک برف جم جاتی تھی اور منہ اندھیرے برف خانے کے آدمی پکارتے تھے مزدوروں کو اے برف کے چھڑو یو چلو (اے برف کے چھڑا نے والو آؤ) اور وہ مزدور آ کر برتنوں سے برف کھرچ کھرچ کر چھڑاتے وارکتوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا کرتے تھے۔ اور ان کھنوں میں جست کی صراحیاں دبا دی جاتی تھیں..... اور یہ تجھلینے کے بعد اب یہ سینے کہ جیسے ہی میں برف کے چھڑو یو چلو کا نعرہ لگاتا تھا لونڈوں اور ماماؤں کے تمام بچے دو دو کر میرے پاس آ جایا کرتے تھے اور میں یہ کہہ کہہ کر اے میرے تانگھنوں چنے چباؤ اپنا سارا میوہ انہیں کھلا دیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی سدا تالاب کی جوگی منہ اندھیرے

قفس کا نا چمن بویا تیری رحمت کا ہوں جو یا محمد یا رسول اللہ  
جوانی میں بہت سویا بڑھاپا دیکھ کر رو یا محمد یا رسول اللہ  
دھواں پایا دیا کھویا..... محمد یا رسول اللہ

گائے ہوئے میرے دروازے پر آتے تھے میں چکارے کے سے ترارے بھرتا تھا گھر جاتا اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہتا کہ اماں ہمارے دروازے پر جوگی کھڑے ہوئے ہیں۔ انہیں بھیک دے دو۔ میری اماں کو میری اس ادا پر بہت پیارا تھا اور وہ بوئے سے نکال کر دو روپے میرے حوالے کر دیا کرتی تھیں۔



ایک تھے ہمارے سپاہیوں میں ساٹھ پینسٹھ سال کے بوڑھے حیدر خاں..... ایک روز میں نے دیکھا کہ ان کے چولھے پر دودھ کی پتیلی کڑکڑا رہی ہے۔ اور وہ کوئی کالی کالی گولی پیالی میں گھول رہے ہیں میں نے پوچھا حیدر خاں یہ کیا چیز ہے انہوں نے کہا افیم گھول رہا ہوں میں نے پوچھا افیم کیا چیز ہوتی ہے انہوں نے کہا یہ دوا ہے۔

### ایلیح آباد کا ایک تالاب

مگر بچلے بھیا یہ چیز امیروں کی ہے یہ روزِ پاؤ بھر ملائی بالائی مانگتی ہے۔ میں غریب آدمی ہوں بھلا ملائی کہاں سے لاؤں..... حیدر خاں کی اس بے کسی پر مجھے بڑا ترس آیا ان سے کچھ نہیں کہا سیدھا گھر کے اندر گیا اور گل زار بو اوا کی نظر بچا کر پیالہ بھر بالائی چرا کر باہر لے آیا۔ بالائی کا پیالہ بھرا دیکھ کر حیدر خاں افسردہ لیکن سرخ و سفید چہرے کی جھریوں کے اندر شگفتگی و تشکر کی جولہریں دوڑنے لگیں تھیں۔ وہ میرے حافظے کے افق سے آج تک رنگ برسا رہی ہیں۔ اس روز سے یہ میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں ہر صبح حیدر خاں کو بالائی دے کر گھر پہنچا تو دیکھا گل زار بو امیری ماں سے کہہ رہی ہیں کہ بی بی مین دیکھ رہی ہوں کہ روز ملائی کم ہو جایا کرتی ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ظہورن کے سوا اور کسی کی ہمت پھیری نہیں ہو سکتی۔ وہمردار بڑی چٹوری ہے بی بی کل میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ہے کہ وہ اپنا کھیر کا تھلوا چٹ کر کے نصیبن کا تھلوا بھی ہبک ہبک کر زہر مار کر رہی تھی.....

میری ماں نے ظہورن کو بلایا وہ دوڑی آئی اور میری ماں کے بگرے ہوئے تیور دیکھ کر سہم گئی۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا ماں ظہورن نہیں میں بالائی اڑا کر لے جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر مس نے سارا ماجرا بیان کر دیا گل زاد بو انے سنا تو بگڑ کر کہا کہ بھاڑ میں جائیں حیدر خاں بچے کو پھسلا کر روز ملائی چاٹتے ہیں۔ خاک کھائیں، انگارے کھائیں حیدر خاں علی کی تیغ ٹوٹے ان پر۔

میری ماں نے فرمایا اے ہے گل زاراتی سی ملائی کے چلتوں اس قدر کٹے کٹے  
کو سنے دے رہی ہو ایک پیالہ ملائی کی حقیقت ہی کیا ہے تم ی نہیں سوچتیں کہ اتنی سی  
ملائی دے کر تنہا کادل ہات بھر کا ہوا جاتا ہے۔

ماں کی یہ بات سن کر میں ہٹاش ہو گیا۔ اور اب کھلے بندوں بالائی لے جانے لگا۔  
ابا و رچی خانے کی نگراں تھیں۔

حیدر خاں اب تم اس ترسانے والی دنیا میں نہیں ہو مگر تمہاری دعاؤں کی چاندنی  
آج تک میرے دل میں چھٹکی ہوئی ہے۔

جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا تو میں اسے کو دیکھتے ہی میرے دل میں اس کی  
محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں نے اس کا نام للو رکھ دیا تھا.....

ایک روز میں بڑے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ دیکھا آب رسانی کی نالی کی کچڑ میں  
ایک جوتہ دھنسا پڑا ہے اسے اپنے مالی براجی سے دھلوا کر میں نے اپنے مخملی کوٹ کی  
جیب میں رکھ لیا۔ براجی نے کہا ”ارے بھیا یو کا گرت ہو جیب کھراب ہو جیے  
(ارے بھیا یہ کیا کر رہے ہو جیب خراب ہو جائے گی) میں نے کہا میں یہ جوتا اپنے للو  
کو پہناؤں گا..... وہ ہنسنے لگا۔

اور جب میں اپنی ماں کے زچہ خانے میں پہنچ گیا۔ میں نے وہ جوتا جیب سے نکالا  
اور چاہا کہ اسے للو کے پاؤں میں پہنا دوں ت و میری پھٹی زاد بہن امی نے چنچ مار کر  
کہا اری ممانی غضب خدا کا یہ مخمل کا کوٹ اور اس کی جیب میں یہ چمڑ و دھا جوتا اور پھر  
اس کو منجھلا بھائی اپنے بھائی کے پاؤں میں پہنانا چاہ رہا ہے یہ سن کر میری ماں ہنسنے  
لگیں۔ ساری عورتوں نے مجھ کو گھیر لیا۔ سب بے مجھ پر قہقہے مارے..... لیکن کسی نے  
میرے اس درد دل کی داد نہیں دی جو میں اس جوتے کو للو کے پاؤں میں نہ پہنا سکا۔

میرے دل میں اس قدر گداختگی اور اتنی زور اشنائی تھی کہ جب گھر سے کوئی  
مہمان رخصت ہونے لگتا تھا میری آنکھیں آنسو برسانے لگتی تھیں۔

مجھے آج کی تاریخ تک وہ بے انتہا قلق یاد ہے کہ میرے نانا جان جب میری بڑی بہن کی شادی میں شرکت کے بعد آگرے جا رہے تھے تو میں ان کے ریزرو کمپارٹمنٹ میں گھس کر بیٹھ گیا تھا۔ اور جس وقت ایک زنبوری ہات نے مجھ کو وہاں سے دیوار میں ٹھنکی ہوئی کیل کے مانند جھٹکا دے کر باہر کھینچا تھا تو مجھ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔

ایرکس احمد

ایک روز ہماری ڈیوڑھی میں ایک بیڑ پالنے پر مامور سپاہی بندہ علی خاں اپنے بیڑے کے دوسرے سپاہی سے یہ کہہ رہے تھے بھائی صاحب محمد خاں میری لڑکی کے بیاہ کے واسطے صاحب (یعنی میرے باپ) نے جو چھ سو روپے مجھ کو دیے تھے۔ وہ میں جوئے میں ہار گیا۔ اور اب میرے واسطے سرف یہی ایک بات رہ گئی ہے کہ اس شرمندگی میں کچھ کھا کر سو جاؤں۔

بندے علی خاں کی زبان سے جب میں نے یہ بات سنی تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ ان میں سے ایک حرف بھی نہیں کہا منہ لٹکائے زنان خانے میں چلا گیا۔ اور بستر پر دراز ہو کر سو چنے لگا کہ ان کی جان کیوں کر بچاؤں دیر تک سوچتا رہا کچھ بھی کچھ میں نہیں آیا کہ اتنے میں ایک چھپکلی میری ماں کے تکیے پر سپٹ سے آگری میں نے اس کو مارنے کے لیے تکیے پر جوتا کھینچ مارا تکیہ نیچے گر گیا۔ چھپکلی بھاگ گئی اور یہ دیکھ کر میری نبضیں تیز ہو گئیں کہ ما کے سر ہانے سونے کی جڑاؤ چمپا کلی جگ جگ ہو رہی ہے۔ میں نے چھپکلی کی دکھائی ہوئی چمپا کلی جھٹ سے اٹھا کر نینے میں ٹوم لی۔ اور ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے بندے علی خاں کو دے آؤں کہ یکا یک سہ دری سے میری ماں آگئیں اپنا تکیہ زمین پر اور چمپا کلی غائب دیکھ کر انہوں نے مجھ سے پوچھا ننھے تو یہاں کب سے ہے۔ میں نے کہا بڑی دیر سے انہوں نے دریافت فرمایا ادھر کوئی لونڈی تو نہیں آئی تھی۔ میری چمپا کلی غائب ہو گئی ہے میں نے کہا کوئی نہیں وہ سر جھکا کر بیٹھ گئیں ماں کا یوں سر جھکا کر بیٹھ جانا مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنے

نیمے مین سے نکال کر چمپا کلی ان کے حوالے کر دی اور انہوں نے کہا تو نے اچھا کیا جو چمپا کلی اپنے پاس رکھ لی نہیں تو کوئی لونڈی باندی اڑا کر لے جاتی۔

میں نے بندے علی خان کی ساری داستان سنا کر کہا کہ اس لیے اٹھائی تھی کہ بندے علی خاں کو دے دوں گا۔ میری ماں نے کہا کہ ان کو تو صرف چھ سو روپے کی ضرورت ہے اور یہ چمپا کلی تو تین سو تین ہزار کی ہے..... یہ کہہ کر میری ماں سوچنے لگیں اور پھر بڑے ولولے کے ساتھ سراٹھا کر کہا کوئی بات نہیں یہ چمپا کلی انہیں کی تقدیر کی تھی جادے آ۔ اور جب میں کوشی سے بھرا ہوا دوڑتا باہر جانے لگا تو میری ماں نے کہا مجھے آدھے راستے سے بلا کر کہا کہ ننھے تو نے میری چمپا کلی مجھ سے مانگے بغیر اپنے پاس رکھ لی اسی کا نام ہے چوری۔ شریف بچے کبھی چوری نہیں کرتے۔ میرے سر پر ہات رکھ کر قسم کھا کہ اب کبھی ایسی گھٹیا بات نہیں کرے گا۔ میں نے ماں کے سر پر ہات رکھ کر قسم کھالی اور یہ سوچ کر کہ میں چور ہوں میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

جب باہر جا کر سب کی نظر بچا کر میں نے وہ چمپا کلی بندے علی خاں کے حوالے کی تو ان کے دل کی کلی کھل گئی۔ ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر انہوں نے مجھے دعائیں دینا شروع کر دیں کہ الہی منجھے بھیا کی عمر دراز ہو یہ درد بار میں سرخرو ہوں۔ اور ان کے دروازے پر ہاتھی جھوٹیں۔ یہ سچ ہے کہ بندے علی خاں کی خدمت کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ لیکن اگر دل میں یہ کانٹا نہ کھٹکتا کہ میں چور ہوں تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

میری انا لکھنؤ کی سیدانی تھیں اور مجھ کو ان سے بے حد محبت تھی کہ میری دودھ بڑھائی کے بعد جب وہ لکھنؤ چلی گئی تھیں۔ تو میری آنکھوں میں دنیا ویران ہو گئی تھی اور میں مکان کے گوشے پر انا جان انا جان کہتا پھرنے لگا۔ اور آخر کار اتنا ہرک گیا کہ مجھے بخار آنے لگا..... میرے باپ نے لکھنؤ آدمی بھیج کر کئی بار انا کو ڈھنڈوایا لیکن ان کا پتا کہیں چلا ہی نہیں۔



میری پچاسی برسکی کھلائی ہوئی عباسی خانم جو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں روئی  
کی ایک بڑی سی گڑیا بنا کر میرے پہلو میں لٹا دیتی کہ لے بیٹا تیری انا آگئی اور میں اس  
گڑیا سے چمٹ کر سو جایا کرتا تھا.....

نہ جانے مجھ میں یہ بات کیوں تھی کہ جو لوگ ریل میں میرے ہم سفر یا گانے  
بجانے کی محفلوں میں میرے ندیم یا موسلا دھار پانی برسنے کے وقت میرے ہم نشین  
ہوتے تھے مجھے ان تمام لوگوں سے محبت ہو جایا کرتی تھی۔

چنانچہ ایک روز جب کہ بڑے دھوم دھڑکے سے رگرم جھوم پانی برس رہا تھا  
اولتیاں ٹپک رہی تھیں۔ پرنا لے دھڑا دھڑ چل رہے تھے انگنائی کے بھرے ہوئے پانی  
میں جا بجا بھنور پڑ رہے تھے شیر خاں سپاہی نے لہک لہک کر ملھا رگنا شروع کر دیا۔ مدنا  
اموہن بن کل نا پرے گااری اوسکھی اری اوسکھی۔“

ہائے بھیلے درو دیا رستانہ بو چھاڑ جھڑی کا ستار پی ہو کی پکار رہا کی جھنکار اور محمد  
شیر خاں کا ملھا ر..... خدا ہی جانے کیا چوٹ لگ گئی میرے معصوم دل پر کہ میں رونے  
لگا زار و قطار۔

ابھی میں برکھا کی جھڑی اور ملھا ر کے جھولے میں جھول رہی تھی کہ سا رامزہ خاک  
میں ملا کر رکھ دیا ظہور غل خاں نے یہ کہہ کہ کہ محمد شیر خاں تم کو خاں صاحب بہادر  
(میرے باپ) یا فرما رہے ہیں میں ہائے کر کے رہ گیا۔ کھن سے چکنا چور ہو گیا ہیرا  
ساغر سرشار اور چٹ سے ٹوٹ گیا میرا جھما جھم کا تار۔

اور جب میں نے یہ سنا کہ میرے باپ محمد شیر خاں وک زور زور سے ڈانٹ رہے  
ہیں کہ میں نے کہا تھا ر بلا لاؤ اور تم ابھی تک نہیں گئے تو چھتریلگا کر میں اپنے باپ  
کے کمرے میں جا کر بے اختیار رونے لگا۔ میرے باپ میرے اس گریہ بے اختیار  
سے بے چین ہو گئے اور بڑی حیرت سے پوچھا بیٹے کس بات پر رو رہے ہو۔ میں نے  
رک رک کر کہا میاں یہ محمد شیر خاں یہ کہتے ہی میری آواز رندھ گئی میری باپ نے

چارپائی سے اٹھ کر مجھے زانو پر بٹھالیا۔ ار بہت چمکار کر پوچھا بیٹا جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔

میں نے روہانسی آواز میں کہامیاں پیٹے کاپانی برس رہا ہے۔ یہ ابھی مجھ کو ملہا رسنا رہے تھے کہ اب ان پر ڈانٹ پھٹکار ہو رہی ہے۔

یہ سنتے ہی میاں نے مجھ کو چھاتی سے لگالیا اور کہا بیٹا تو آگے چل کر شاعر ہو جائے گا اور ہمارے خاندان کا نام تجھ سے روشن ہوگا..... محمد شیر جاؤ اس کو ملہا رسناؤ اور ظہور علی خاں کو بھیج دو کہار بلانے کے لیے۔

---

ملن موہن کے بغیر اے سکھی مجھے قرار نہیں ہے۔

---

آپنے میرے دل کی سختی اور نرمی یعنی میری حدیدیت اور حریریت اور میری شعلہ افشانی و شبنم چکانی یہ دونوں چیزیں دیکھ لیں..... اب میرے محبت و غضب کے مرکب جذبے کو بھی دیکھ لیجیے۔ جو ایک بڑی انوکھی سی بات ہے۔ آب و آتش ہم آمیختہ از لب لعل۔

میں اپنی پچاسی برس کی کھلائی عباسی خانم کا ذکر کر چکا ہوں جنکو میں بڑی بی کہا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے مجھ کو برنی بے حد پسند تھی۔ اور کنجا یا لند حلوائی کی دکان سے ہر صبح کو برنی کا ایک دونا ااجایا کرتا تھا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ میں برنی کھاؤں اور بڑی بی کو نہ کھلاؤں..... اور یہی نہیں میری یہ تمنا ہوتی تھی کہ آدھا دونا مس کھاؤں اور آدھا دونا اپنی بڑی بی کو کھلاؤں لیکن میری الٹی کھوپری میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بڑی بی کی سی پھونس بو رہی عورت آدھا دونا کیوں کر کھا سکتی ہیں اور جب برنی کی دو چار ڈلیاں کھا چکنے کے بعد وہ مزید کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیتیں کہ ننھے اب مٹھائی نہیں کھائی جا رہی ہے تو فرط محنت کے باعث مجھ کو ان پر اس قدر غصہ آجاتا کہ ان بے چاری کے روئی کے سے بال پکڑ کر ان کا سر زمین سے ملا دیا کرتا تھا۔ اور وہ چیخیں مار مار کر کہتی تھیں کہ ار خدا کا واسطہ کوئی اللہ کا بندہ مجھ کو بچالے

ارے ننھا مجھ کو مارے ڈال رہا ہے۔ اور مائیں اسیلیں دوڑ کر میرے پنچے سے ان کو چھڑا لیتیں..... غز ارسانی کے سلسلے میں اللہ کے متعلق فقط سنا ہی تھا کہ ورنہ ستانی بسم می دہد اور ننھے کو اس پر عمل کرتے دیکھ لیا۔ واہ رے ننھے اخلاق الہی کا پورا اتباع کر کے دکھا دیا۔ ایں کارا زت آید و مرداں چنین کنند!

## میرے کھیل

کوئی ایک کھیل بھی جم کر میں نے کبھی نہیں کھیلا یوں تو دوسروں سے چھڑیا دلا کر پتنگ بازی بھی کی۔ بھدے طور سے گویاں بھی کھیلیں آنکھ مچولی میں بھی حصہ لیا۔ فٹ بال اور ٹینس بھی برا بھلا کھیلا اور ست گھرے کے خانوں میں بھی اچھلا کودا مگر دو چار بار کھیل کر ہر کھیل ترک کر دیا۔ اپنا پڑھا ہوا سبق اپنے ہم عمروں کو پڑھانا داغ و امیر کے دیوان پڑھنا اور اپنے کمرے کو سجانا۔

ایڑی بی بی تم مٹی کے نیچے دبی پڑی ہو اور تمہارا ننھا ابھی تک زندگی کو بھوک رہا ہے زندگی کے بوجھ تمہارے ننھے کے شانے ٹوٹے جا رہے ہیں میری اچھی بی بی اپنے بوڑھے ننھے کو بدلا لو اب تو بدلا اپنے پاس۔

یہ تھے میرے محبوب کھیل..... پڑھاتا تھا میز کرس پر بیٹھ کر میز پر بید رکھا۔ اور میز کے سامنے دادا میاں کی عدالت کا کٹھن لگا رہتا تھا..... داغ و امیر کے دیوان لچکاٹکے ہوئے مخمل کے جزدان میں رکھتا تھا اور میرے کمرے کی سجاوٹ ایسی تھی کہ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے..... میرے خاصے چورے لیکن چوڑے سے زیادہ لانے کمرے میں ایک جانب تو تختوں کا چوکا تھا چوکے پر گدا گدے پر سفید چاندنی چاندنی پر زرین قالین مخمل کے گاؤتکے سنگ مرمر کے مری فرش داہنے بائیں سیاہ پالش اور سنہری دھاریوں کی پتلی پتلی کرسیاں کرسیوں کے سامنے چھوٹی میزیں میزوں پر گل دان ادھرا دھرا چاندی کے اگال دان پختہ فرش پر گراموفون دوسرے پر آگے کے سنگ تراشوں کا بنایا ہوا تاج محل ایک ایسی نہایت خوب صورت زرین و مخملی کرسی جس

پر بیٹھے ہی بلجہ بنجے لگتا تھا۔ دروازوں پر چکیں سامنے چاندی کے فریم میں جبراقدم آدم آئینہ آئینے کے تختے پر ارگن بجانے والی ٹائم پیس۔ پیتل کا عود دان لکھنے کی میز پر بلوریں دوات قلم ایک بڑا خوبصورت لیمپ جس کے گلوب میں جھاڑوں کے سے رنگین قلم، دیواروں پر بڑی بھڑکیلی دیوار گیریاں الماری میں شعرا کے دیوان الماری کے دروازے پر گوند سے چپکائی اور کپڑوں کے تھانوں سے چھڑائی ہوئی سنہری چٹھیاں..... یہ تھی میرے کمرے کی آرائش۔

۱۔ دادامیاں آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ ۲۔ ایک چٹھی کا آدھا حصہ الماری کے دروازے پر آج تک چسپاں ہے اب اس کمرے میں میرا چھوٹا بھائی رئیس احمد رہتا ہے جس نے اپنی بے پروائی کے ہاتھوں اسے اجاڑ کر رکھ دیا ہے..... اب جب کبھی ملیج آباد جا کر اس کمرے میں قدم رکھتا ہوں تو اس کے ذرات چیخ اٹھتے ہیں۔ میں ارے ہمارے منگلے بھیا آگئے۔ اور جب الماری کے پٹ پر جھجکی ہوئی دھندلی سی چٹھی کے آدھے ٹکڑے کو دیکھتا ہوں تو اس چٹھی کے اندر سے بالکل میری صورت کا ایک لڑکا جرنیلی ٹوپی پہنے برآمد ہو جاتا ہے اور اس لڑکے کو دیکھ کر میری ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ اور اس عالم میں رئیس کا خوب صورت کوکانا در حسین روتا ہوا میرے سامنے آکھڑا ہو جاتا ہے۔ جس کے رخسار میرے لبوں نے اس کمرے میں بوسے کا اولین تجربہ حاصل کیا تھا اور کھڑکی سے بڑی بی بی تھر تھراتی آواز آنے لگتی ہے کہ ننھے آواں دودھ کا پیالہ بھرے بیٹھی ہیں“..... ہائے ہائے ہائے ہائے۔

### میرے زمانے کے اوہام

میرے خاندان کی خواتین پر خوف ناک تصورات منڈلایا کرتے تھے۔ یوں تو ہر محل میں ارواح خبیثہ کی عمل داری تھی۔ لیکن وہ محل جس میں دادامیاں رہتے تھے جس کا نام تھا بڑا محل وہ تو خصوصیت کے ساتھ..... دنیا بھر کے شہید مردوں ہنگامہ سنہ ۱۸۵ء کے تمام مقتول گوروں..... بھوتوں پریتوں پلیدوں دیوؤں چڑیلوں بھتینیوں پچھلی



پائیوں بڑسروں خبیثوں اور جنوں کی راج دھانی سمجھا جاتا تھا..... ار تمام خواتین کو اس امر کا یقین تھا کہ آدھی رات کے اندھیا رے میں اس محل کے تمام گوشوں کو نوں، کھتروں، کوٹھریوں، مچانوں، طاقتوں، ٹمچنیوں، سہ دریوں، زینوں، کلیوں، نالیوں اور ناغولوں سے نکل نکل کر خبیث روحمیں دھماچو کڑی کیا کرتی ہیں مہیب آوازیں نکال نکال کر سونے والیوں کی چارپائیاں الٹی ہیں ان کے گلے گھونٹی، دانت کٹکٹاتی اور جڑے ہلاتی پھرا کرتی ہیں..... اور لطف یہ کہ یہ تمام باتیں سنی سنائی اور قیاسی نہیں بلکہ بڑی بوڑھیاں بڑے خوفناک تیوروں سے اس کا دعویٰ کرتی تھیں کہ وہ ان تمام کرشموں کی عینی شاہد بھی ہیں..... اور ایک دفعہ ہی نہیں وہ بارہا ان خبیث روحوں سے دو چار اور نگار ہو چکی ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد اکثر بھوتوں اور چریلوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اور خواتین کے ساتھ ساتھ تمام لونڈیاں باندیاں اور مائیں اصلیں بھی، اپنے اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتی تھیں۔

ایک دن بہت تر کے جب کہ دادی جان اپنے کھٹے پر بیٹھی حقہ پی رہی تھیں کہ ایک نوخیز چھو کڑی ہانپتی کانپتی ان کے پاس آئی اور سہمی آوازیں کہنے لگی بری بی بی آدھی رات کو جب گھنٹہ بارہ بجا رہا تھا تو ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن کیا دیکھتی ہوں کہ انگاروں کے سے دیدوں ار بڑے بڑے دانتوں والی ایک کالی کلونی بیٹنگن لوٹی دھم دھوسر چڑیل انگنائی میں کھڑی اپنے جھونٹے نوچ رہی ہے چہ چہ..... اور پھر جھونٹے نوچتی ہوئی مرمے بھرے تھیلے کی طرح ہائے اللہ میری طرف مسماتی اور منمناتی چلی آرہی ہے اے بڑی بی بی میری چھاتی دھک دھک کرنے لگی اور جیسے ہی وہ ہتھپولے پولے قدم رکھتی ہوئی میرے پلنگ کے قریب آ کر کھڑی ہوئی۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے ہو کر رہ گئی جی میں آیا کہ چیخ مار کر گھر بھرک و جگا دوں مگر ڈر کے مارے گلے میں گونجے سے اٹک گئے کتا کتا زور لگایا آواز نہیں نکلی۔ دانت بیٹھے گئے گھگھکی بندھ گئی۔ اور میرا دم نکل جانے میں بس ذرا ہی سی کسرباتی تھی کہ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جو

جو سہ دری کے سبز عمامے اور لال جریب والے شہید مرد ہیں۔ وہ سہ دری سے نکل کر کھڑاویں کھٹ کھٹ کرتے آگئے اور آتے ہی انہوں نے اس مردار کی کھوپڑی پر ایسی کس کے جریب ماری کہ بہ بھتنی بلبلاتا تھی۔ اور اچھا آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی۔ کہتی ہوئی بھاگی اور دھواں بن کر پائے خانے کی نالی کے اندر غائب ہو گئی۔ دوی جان نے یہ ماجرا سن کر چھو کری سے کہا سہ دری والے شہید مرد اس محل میں بہت سی جانیں بچا چکے ہیں دیکھ آج ان کی نیاز دلا کر ان کا طاق بھر دینا.....

اری تو تو کل کی چھو کری ہے میں تو اس محل کے سینکڑوں کرشمے دیکھ چکی ہوں جب میں یہاں نئی نئی بیاہ کر آئی تھی تو اس محل کے کوٹھے سے کبھی کبھی رات گئے لف رائی لف رائی (لفٹ رائٹ) کی آوازیں بڑے زور سے آتی تھیں اور جب سپاہی بندوق بھر کر ادھر ادھر جاتے تھے تو وہاں کوئی بھی نہ ہوتا تھا۔ وران کے اترتے ہی پھر وہی ادھم ہونے لگتا تھا۔ ایک عامل کہتے تھے کہ غدر کے زمانے میں جن گوروں کو یہاں مارا گیا تھا کبھی کبھی ان کی روحیں لف رائی لف رائی کیا کرتی ہیں۔

ایک رات کو جب کہ محرم کی نویں تاریخ کو ہمارے امام باڑے میں چراغاں ہو رہا تھا کہ ہمارے گھر کی لونڈی سکونت نے انگنائی میں چھت کی طرف دیکھ کر چیخیں مار مار کر کہنا شروع کر دیا اری تو تو کون ہے اری تو کون ہے اری تو کون ہے؟

گھر بھر میں ہلچل مچ گئی تمام عورتیں آنگن میں جمع ہو گئیں۔ اور پوچھنے لگیں اری سکونت یہ تو کس سے باتیں کر رہی تھی اس نے کہا بیبیو میں نے دیکھا ایک بڑے برے دانتوں والی بھتنی اوپر کی منڈیر سے جھک جھک کر تعزیہ دیکھ رہی ہے۔ اور جب میں نے اس سے پوچھا اری تو تو کون ہے تو اس نے منمنا کر کہا دور ہواے شفتل ہم زیارت کرنے آئے ہیں اور یہ کہتے ہی وہ غائب ہو گئی۔

یہ سننے کے بعد ہر عورت کے چہرے پر سے خوف ٹپکنے لگا۔ اور گھر بھر میں سناٹا چھا گیا.....

## میرا ڈریوک پن

یہ باتیں سن سن کر میں اس قدر سہم گیا تھا کہ رات کو گھر سے باہر قدم رکھنا تو درکنار جب شام کا وقت، مردانے مکان میں جانا تھا تو ڈیوڑھی کے اس دروازے سے لے کر اس دروازے تک کوئی نہ کوئی ماما مجھ کو پہنچانے جایا کرتی اور غسل خانے جاتا تھا تو ماما دروازے پر سے بار بار آواز دیا کرتی تھی کہ بھیا، ہم دروازے پر کھڑے ہیں ڈرنا مت۔

تقریباً دس گیارہ سال کی عمر تک میری بزدلی کا یہ عالم رہا کہ جب تک بری بی گڑ مڑا کر میری پابنتی لیٹ نہیں جاتی تھیں۔ میں سو ہی نہیں سکتا تھا۔ اور جب کبھی رات کے وقت چڑیل والی کلیا کی طرف آنکھ اٹھ جاتی تھی تو میں تھرا جاتا تھا اور کچکا کر فوراً آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

دادی جان کا یہ ایک بندھاٹکا اصول تھا کہ وہ ہر رات کو سوتے وقت بلاناغہ کچھ پڑھ کر اور دور دور ت حصار کھینچ کر تین بار تالی بجایا کرتی تھیں۔ اور جب کبھی اس تالی کی آواز میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی تو میرا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اور چڑیلوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی تھیں۔

اور اناج بھی جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ارواح خبیثہ کو وہم کی خلاقی کے سوا اور کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ پھر بھی میرا یہ عالم ہے کہ ابھی سال گزشتہ جب علیح آباد میں دادا میاں کا محل دیکھنے کو گیا تو ہر چند دن کا وقت تھا لیکن دو چار آدمیوں کو ساتھ لیے بغیر میں اندر قدم ہی نہ رکھ سکا..... اللہ اکبر کس قدر ان مٹ ہوتے ہیں بچپن کے اثرات۔

۱۔ ہمارے گھر کے ایک گوشے میں ایک کلیا (پتلی سی جگہ) تھی کہا جاتا تھا کہ اس میں چڑیل رہتی ہے۔ ۲۔ میرے نزدیک یہ بچپن کے کبھی نہ مٹ سکنے والے اثرات ہی ہیں جو نوع انسانی کو ہندو مسلم عیسائی بدھ زرتشتی یہودی جینی اور سکھ بنائے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ دادا میاں کے محل سے نکلنا آدمی کا نہیں دیوکا کام ہے۔



## میری بسم اللہ

ارے میں اپنی بسم اللہ کا حال لکھنا تو بھول ہی گیا، اسے پہلے ہی آنا چاہیے تھا۔ خیر اب سن لیجیے ذرا سی تو بات ہے..... اس موقع پر کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں بالتفصیل یاد نہیں ہیں۔ بس اسی قدر خیال ہے کہ کم عمری میں میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ چاندی کی تھالی میں سونے کی دوات۔ سونے کے خول کا قلم اور قرآن مجید میرے سامنے رکھا گیا تھا اور میرے اولین معلم مولوی نیاز علی خاں نے مجھ سے کہا تھا میاں صاحب زادے کہیے بسم اللہ کے بعد حاضرین کے گلوں میں ہار ڈالے گئے تھے۔ اور مٹھائی تقسیم کی گئی تھی..... دادامیاں بھی موجود تھے جنہوں نے با آواز بلند یہ مصرع پڑھا تھا۔ قلم گوید کہ من شاہ جہانم..... اسی رات کو زمانے میں ڈومنیوں کا گنا اور مردانے میں طوائفوں کا مجرا ہوا تھا..... اور میں دو لہا بنا کر بیچ میں بٹھا دیا گیا تھا۔

## میرے معلم

میرے فارسی کے معلم تھے مولوی نیاز علی خاں اردو کے معلم تھے مولانا طاہر عربی کے معلم تھے مولوی قدرت اللہ بیگ اور انگریزی کے معلم تھے ماسٹر گوتمی پرشاد۔ مولوی نیاز علی خاں ایک روکھے سے خشک مزاج آدمی تھے۔ مولانا طاہر بڑے ہی شگفتہ مزاج تھے اور شاعر بھی ان کا ایک شعر اب تک یاد ہے۔

شہرہ جو سنا حسن کا طاہر کی زبانی  
نادیدہ میں عاشق ہوا تجھ پر مری جانی

مولوی قدرت اللہ بیگ فارسی اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ میرے پاس ان کی ایک مثنوی موجود ہے جو غالباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس مثنوی کے تمام اشعار ایسے ہیں کہ ان میں ایک لفظ بھی نقطہ دار موجود نہیں ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے بے پایاں ذخیرہ الفاظ اور فرماں روائی

لغات کا



اب رہے ماسٹر گوشتی پر شاد سو وہ برے ہی مسکین اور خاموش طبع آدمی تھے۔ لیکن اس اسلوب سے پڑھاتے تھے کہ حرف حرف دل نشین ہو جاتا تھا۔ اس کے بہت دن کے بعد میرے باپ نے حضرت مانی جانیسی کو میرا ٹیوٹر مقرر فرمایا تھا۔

### طلوع صبح کا اولین دیدار

ہمارے گھر کے اندر لطیفوں [نقلوں اور کہانیوں کی بنا پر دن رہتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے تک اور رات رہتی تھی دن کے بارہ بجے تک ایک بجے تک..... اس لیے اس غیر فطری ماحول میں پلا ہوا بچہ واقف ہی کیوں ہو سکتا ہے صبح کی رنگینیوں سے۔

کیوں کر مالا مال ہوا میں اس دولت بیدار سے اور کیوں کر یہ قرآن اترا میری آنکھوں پر اس کی روداد بھی سن لیجیے۔ میرے باپ ربیع و خریف کے زمانے میں دربار اپنے علاقے کے دورے پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور ان مواقع پر وہ سو رہتے تھے آٹھ نو بجے رات کو اور جاگ اٹھتے تھے صبح تین چار بجے۔

ایک بار جب وہ دورے پر جانے لگے تو میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ میاں ہمیں بھی اپنے ساتھ لیتے چلیے گا۔ تو انہوں نے میری یہ درخواست منظور کر کے بوالحاظن کو مامور فرما دیا تھا کہ مجھ کو بہت تر کے جگا دیں۔

ایک مدت دراز سے میں سو رہتا ہوں رات کے آٹھ نو بجے اور جاگ اٹھتا ہوں صبح کو تین چار بجے جس کے یہ معنی ہیں کہ میرے گھر میں ربیع و خریف کی فصل ہمیشہ رہتی ہے اور میں ہر روز اپنے علاقے کے دورے پر جاتا رہتا ہوں بات کا علاقہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دریائے سخن سدا ہے جاری۔

اب سنیے اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے..... جب لجاظن بوانے بہت تر کے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگایا کہ بھیا اٹھ بیٹھو میاں کے ساتھ گاؤں میں جانا ہے تو میں اٹھ بیٹھا..... اور آنکھیں مل کر نگاہ اٹھائی تو بڑی حیرت کے ساتھ جب یہ دیکھا کہ دھندلے سنگ مرمر کی تراشیدہ اور دھوپ چھاؤں کی پروردہ نیم پیداو نیم پنہاں گنگا جمنی پر یاں نقابوں

کے سہروں کو چٹکیوں میں تولے رسمساتے آسمانی سے کسمساتی زمین کی طرف اڑتی چلی آرہی تھیں تو میرے دلے پوچھا ارے یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ ہوا کیا جا رہا ہے؟..... دن ہے نہ رات اندھیرا ہے نہ اجالا اندھیرے میں اجالا..... اجالے میں اندھیرا..... صباحت میں ملاحت ملاحت میں صباحت سرمئی نقاب کی کندنی مکھڑا..... سرخی میں گدرائی فضا کی انگڑائیاں آدھے جلوے آدھی جھائیاں..... ظلمات میں آب حیات کا آب ار آب نوس کے شہر میں، مصر کا بازار..... ایک طرف مخمل کم خواب، سرمہ، کاجل، گیسو، ململ، کریب، اور رسم اور ایک طرف افشاں، سلما، ستارہ، قشقہ، غازہ، گونا، کناری، سونا، چاندی، مرمر، لچکا، پٹھا، ابیر اور گلال فضا پر سنہرے تاروں کا جال اور بڑی آہستگی کے ساتھ ابھرتا ہوا کندن کا تھال۔

شلنگیں بھرتا ہوا نیم کے نیچے گیا۔ شاخ پر چھپھاتی چڑیاں بھرا مار کراڑ گئیں ہات پھیلا کر نیم کو چھاتی سے لگالیا۔ ڈالی کو جھکا کر اس کی پتیوں کو چوم لیا۔ مرغان سحری کی بانگ لے خون کو گرما دیا..... دیوانہ و وار مردانے میں پہنچا۔ دیکھا کہ میاں صحن میں رکھا ہوا ہے میانہ محل نظر آیا کہا چلمیں پی پی کر کھانس رہے ہیں ان کی کھانسی بھی اچھی لگی سپاہی لا الہ الا اللہ کہہ کہہ کر منہ دھورہے ہیں ان کے چھپکوں کی آواز نے دل موہ لای۔ پھاٹک کے قریب گھوڑے دیں مار رہے ہیں کنویں کے پاس کھڑی ہوئی ہتھنی جھوم ہری ہے۔ الاؤ کے گرد پاسی بیٹھے تاپ رہے ہیں الاؤ کی اچھلنی آنچ میں زہرا کی کمر لچک رہی ہے۔ اور یہ سارا آسماں اندر کے اکھارے میں تبدیل ہو گیا ہے..... میں وحشی چکا ورے کے مانند دوڑ کر سامنے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کی سموئی ہوئی گرمی سردی سے جی خوش ہو گیا۔ میں ذرا سامڑ کر ایک اور قد آدم آنینے کے سامنے جا کر اپنا منہ دیکھنے لگا۔ گالوں پر سرخی کے ہلکورے آنکھوں میں گلابی ڈورے..... چھریا بدن پتلی کمر گھنیرے بال، پتلے پتلے ہونٹ لانی لانی پلکیں..... بر میں ریشمی کرتہ پر روئی بھری مخملی صدری سر پر آڑی جرنیلی ٹوپی ٹوپی کے گرد آگرے کا

سنہرافیتہ اور واسنے کان میں ہلتا ہوا سونے کا جھلا جھل دراف میں کس قدر حسین ہوں  
زندگی میں پہلی بار اس کا پتا چلا اللہ بھلا کرے طلوع آفتاب کی رنگینی کا جس نے میرا  
پوشیدہ جمال مجھ پر آشکارا کر دیا۔

ایک ادنیٰ قوم جس سے زمیندار پولیس کا کام لیتا ہے۔

وہ جمال جو آگے چل کر زمین پر پاؤں نہ رکھنے والے مغرور حسینوں کو اپنے سروں  
میں جھکا لینے اور ایک دن پر یاں حاضرنازا تھا نے ہائے جوانی ہائے زمانے۔ کانعرہ  
لگانے والا تھا اور کوہ وہ آنی وفانی جمال کہ اب اس ارزل عمر میں جب کبھی وہ یاد آتا ہے  
تو ہر چند میرے مفکر شبیر حسن خاں پر قطعی ملال طاری نہیں ہوتا۔ لیکن میرے شاعر جوش  
ملیح آبادی کے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ اور وہ چیخ اٹھتا ہے کہ:

ہم پر بھی حسینوں کا کرم تھا اک روز  
اس قوم میں اپنا بھی بھرم تھا اک روز  
بے زار نگاہوں کی گزر گاہ ہے اب  
وہ چہرہ کہ نظروں کا حرم تھا اک روز  
کردگار پھول سے چہروں کو بتوؤں کی شکل میں تبدیل کر دینے سے آخر تجھے کیا  
مزا آتا ہے؟

### گاؤں کا پہلا نظارہ.....

کرن پھوٹتے ہی ہمارا قافلہ چل کھڑا ہوا۔ میرے باپ آتھ کھاروں والے  
میانے میں ضلع دار اور اقربا گھوروں پر میرے برے بھائی مشیر احمد خاں رام پوری اور  
میں ہتھی پر اور باقی تمام خدمت گار سپاہی اور گڑیے پیدل۔

پانچ چھ میل کی مسافت طے کر کے جب ہمارا قافلہ حدود سیداپور میں داخل ہوا تو  
چوں کہ اس سے پیش تر میں نے کبھی گاؤں دیکھا ہی نہیں تھا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی  
رہ گئیں۔

۱۔ زمیندار کا مقرر کردہ تحصیلدار ۲۔ وہ پاسی جو گاؤں میں پولیس کے فرائض انجام دیتے تھے ۳۔ ہمارے علاقے کا سب سے بڑا تخت گاؤں جس کا منصب تھا چاندی کا پر خالہ۔

اللہ اللہ تا حد نظر جھومتے لہہاتے اور گنگناتے کھیت کھیتوں میں دھرتی ماتا۔ کی اگی ہوئی تمنائیں اور مستجاب دعائیں بیچ بیچ میں مانند زلف بتاں بیچ و خم کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں چلتی بیڑیوں اور پرابیوں کی بدولت گہری گہری نالیوں میں شہر کے چولہوں کو آگ بخشنے والے بہتے پانی کی کڑ بڑ کڑ برسنہری اور ملائم کرنوں سے جھیل کی موجوں کی جھلمل جھلمل ساحل پر خوب صورت مرغابیوں کی قطاریں فرفشاں اور موجوں میں ان کی رہ رہ کر ڈبکیاں اور ملائم دوش پر کھیتوں کی تراوٹ اور بالیوں کی خوش بوا تھاے ہوئے ٹھنڈے جھونکوں کی پاکیزگی و لطافت..... اور کھیتوں سے دور کچے کچے لپے تپے مکانوں کے چھپر اونچے اونچے کھلیان نکا نیکرنے والی جوان جوان عورتیں، اور لدر گدر چھو کریاں ادھر طوفان ادھر اٹھان۔ ان کے لال پیلے لہنگے اودی اودی چندریاں ان کے خالص ہا اور مسلسل محنت کے پروردہ چھلکتے شاداب چہرے اور گٹھے گتھے چٹکتے بدن ایسے بدن کی پوری کسمسا کر انگڑائی آئے تو جلد مسک کر رہ جائے اور دیکھنے والے کے دل میں یہ آرزو دھو میں مچائے کہ انہیں چھو کر بھد دیکھا جائے کہ یہ بنی ہیں کن عناصر سے یہ سماں دیکھ کر میرے سینے کی تمام کھڑکیاں کھل گئیں رگ رگ میں بشاشت کے فوارے چھوٹنے لگے۔ نچلے پوٹوں کے نیچے خنکی دوڑ گئی آنکھیں جیسے ایک دم سے بری ہو گئیں نگاہیں جھکیں تو اپنے چہرے کی سرخی نظر آ گئی۔ پور پور میں تازگی انگلیاں چٹکانے لگی۔ سانس لینے کا غیر محسوس عمل ایک محسوس عیاشی بن گیا۔ اور میرے جسم کے اندر پوپھٹنے لگی سویرا ہو گیا۔

اسی عالم میں ہمارا قافلہ کھیتوں کے بیچ و خم سے گزرتا..... صدا ہاز میں بوس سلاموں کا صرف ایک سر کی جنبش سے جواب دیتا..... ہتھنی کی بار بار بڑھتی ہوئی سوئٹ



میں ٹوٹے گنوں کی چٹاخ چٹاخ سنتا کورے پنڈوں کی کچی کچی لپٹوں میں جھومتا.....  
اور پیتل کی جھلکتی چھلکتی گاکروں کے نیچے صراحی دار گردنوں اور پتلی پتلی کمروں کی لچک  
دیکھتا ہوا بالآخر تھانے پہنچ گیا۔

### العلقہ داروں اور زمین داروں کی قیام گاہ

ہمارے تھانے پہنچتے ہی رعایا جوق در جوق آنے اور ہم دونوں بھائیوں کے پاؤں  
چھو چھو کر نذرانے دینے لگی۔ اور ہم نذر کے روپوں کو سامنے کے کھرے تخت پر بری  
بے پروائی کے ساتھ کھنا کھن اور چھنا چھن پھینکتے جاتے۔..... اور تھوڑی دیر میں پیاز  
کے قفلوں کے سے چمتے سکوں کا تخت پر انبار لگ گیا پہاڑی سی بن گئی۔

رعایا جب روپیہ برسا چکی تو سیداپور کے پستہ قدمہا جن بھلو شاہ ہاتوں میں سونے  
کی انگوٹھیاں پہنے اور چاندی کی شام اور لوہے کے گولے کی ہر وتی باندھے جھکے جھکے  
آئے..... اپنے خادم کے سر سے روپوں کا بھرا ہوا چوٹی دار تھال اتارا..... اسے ہم  
دونوں بھائیوں کے سر پر تین بار بطور صدقہ گھمایا گیا اور پھر ایک برے کھنا کے سے  
تھال کا تمام روپیہ فرش پر گرا دیا خالص چاندی کے کھنکھتے روپے فرش پر ادھر ادھرنا چنے  
اور دوڑنے لگے..... اور ہمارے خدام نے حسب دستور وہ تمام روپے لوٹ لیے۔ اس  
ہنگامہ رقص طلا کے بلع داب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔..... جبر علی فقیر دسترخوان  
پر اپنے ہات کا پکایا کھانا چنے لگا۔ اور دم بھر میں ہمارے مراد ابیر اور برہمن کاشت کار  
اپنے اپنے سروں پر پکوان اٹھائے ہوئے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سامنے  
پوریوں کچوریوں بھانت بھانت ترکاریوں تلی مچھلی کے ٹکروں گالگوں پھلیوں دودھ  
دہی کی ہانڈیوں مٹھائیوں اور رساول کی بڑی بڑی لیٹوں کا ایک انبار لگ گیا۔

خاصہ تناول فرما کر میرے باپ نے حسب معمول اندر کے کمرے میں جا کر سو  
گئے..... میں بھی تکان محسوس کرنے کی بنا پر چاہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے واسطے لیٹ  
جاؤں کہ باہر سے علام گیر پھپھاس کی گرجتی آواز سنائی دی۔ باہر گیا تو دیکھا کہ ایک سر

سے پاؤں تک جھریوں میں لپٹا ہوا کاشت کار اپنے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے پھپھا سے اپنی زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ خان بہادر صاحب آپ خود میری سامنے کھڑی ہوئی بیوی کو دیکھ لیں اس کو سوکھے کاروگ لگ گیا تھا۔ اس کی دادارو نے مجھ کو کھک کر دیا ہے آدھا لگان اب لے لیجیے آدھا دوسری فصل پر ادا کر دوں گا۔

آکاشمی دیوی اپنی اس اہانت کا مجھ سے اب انتقام لے رہی ہے۔ لیکن یاد رکھو دیوی جی میری پیشانی تمہاری چوکھٹ پر کبھی جھکی ہے نہ جھک سکے گی۔ وہ ہمارے دس پانچ معلم کاشت کاروں میں سے ایک تھا جو بہت اچھا کھانا پکانا جانتا تھا۔ پھپھا ہمارے پورے علاقے کے صدر ضلع دار بے حد شعلہ خود شنام کار انسان تھے۔

اس کا یہ عذر سن کر پھپا نے اس کو ایک موٹی سی گالی دے کر کہا اے ایک آنہ بھی کم نہیں لوں گا پورا لگان ادا کرو پورا..... اس بوڑھے پھوس نے تھر تھراتی ہوئی آواز میں کہا بھگوان کی قسم آدھے لگان سے زیادہ پرے پاس ایک جھنجی کوڑی بھی نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی پھپا اٹھے اور ایک تھپڑ اس کے منہ پر اس زنا تے کا مارا کہ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور اس کی مرجھائی ہوئی بیوی کی آنکھوں سے دھل دھل آنسو بہنے لگے۔ اس کے بیٹے نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔ گرے ہوئے بوڑھے نے اپنی روتی ہوئی بیوی اور اپنے جھینپے ہوئے بیٹے کو ایسی نظر سے دیکھا کہ میری سانس میرے گلے میں الجھ گئی اور پھر ایک دردناک چیخ مار کر میں تھانے میں داخل ہو کر اپنے سوتے ہوئے باپ کے سر ہانے جا کھڑا ہوا۔ اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا..... میری ہچکیوں سے ان کی آنکھ کھل گئی اور انتہائی گھبراہٹ کے ساتھ انہوں نے مجھ سے پوچھا ارے کیا ہوا ارے کیا ہوا۔

میں نے اس بوڑھے کسان کی حالت اور پھپا کی شہادت کا سارا ماجرا بیان کر دیا..... میرے باپ کی آنکھیں نمناک ہو گئیں صالح محمد خاں کو حک دیا کہ اس بوڑھے کسان کو میرے پاس بلا لاؤ وہ بوڑھا میرے باپ کے قدموں میں گر کر کہنے لگا وہانی

خاں صاحب بہادر کی۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی اپنے فرزند کے ساتھ آگئی۔ اور وہ دونوں بھی زار قطار رونے لگے۔ میرے باپ نے انہیں تسلی دے کر گڑیتے کو حکم دیا کہ ماتا دین پٹواری کو بلا لاؤ پٹواری آگیا تو انہوں نے فرمایا ماتا دین سیاہے میں اس مراد کے لگان کی پوری پیمانی درج کر لو اور اسی وقت رسید اس کے حوالے کر دو..... میرے باپ کے ترحم آمیز برتاؤ کو دیکھ کر بوڑھے کسان اس کی لاغر بیوی اور اس کے بیٹے کی آنکھیں شکرِ بے کے آنسوؤں کی جھڑی برسانے لگیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کے زخم پر مرہ رکھا دیا ہے اور جب وہ تینوں آدمی جے کھان صاحب بہادر کی اے بھگوان کھان صاحب بہادر کا راج گنگا دھار تک رہے کہتے چلے گئے میرے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے مجھے اپنے باپ کی صورت اور بھی اچھی لگنے لگی اور عالم گیر پچپا سے ایسی نفرت ہوئی کہ جب میرا زمانہ آیا تو بڑے لطیف حیلے کے ساتھ میں نے ان سے ضلع داری نکال کر اپنی پھٹی زاد بہن کے فرزند خواجہ احسن خاں کے سپرد کر دی لیکن خواجہ احسن خاں بھی برے ثابت ہوئے پچپانگی تلوار تھے تو وہ تھکی چھری نکلے۔ غرض کہ..... رعایا کو آرام نہیں مل سکا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا..... جب رات کا وقت آیا تو میں کھانا کھا کر چارپائی پر دراز ہو گیا اور کہانیاں سنانے والے کہانیاں سنانے لگے۔

میرزا ایوب بیگ اور بنو خاں کے بعد جب رجب علی ظہور علی خاں کی باری آئی وہ انہوں نے ایسی دلچسپ کہانی سنا جس کے بعض حصے اب تک یاد ہیں۔ آپ بھی سن لیں:

”ایک بار اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک خوبصورت گھرو جوان تاروں کی چھاؤں میں نوکری کی تلاش کرنے کے واسطے اپنے گاؤں سے ایک شہر کی طرف روانہ ہوا.....

لق و دق میدانوں گہری ندیوں اور گھنے جنگلوں کو طے کرتا وہ اس وقت شہر کے کنارے پہنچا جب کی چیل انڈا چھوڑ دیتی ہے۔ تو دیکھا کہ حاشیہ شہر کے ایک چھوٹے

سے مکان کی دیوار پر ایک کبوتر بیٹھا دم ہلا رہا تھا بھوکا پیاسا تو تھا ہی جی میں آیا کہ کبوتر کو مار کر بھونوں اور کھا جاؤں۔ اس تمنا میں دن سے فیر کر دیا..... مقدر کی بات ہے کہ گولی کھا کر کبوتر ادھر نہیں ادھر مکان کے اندر گر گیا۔ سپاہی نے آؤدیکھانتاؤ بندوق کا کندہ لگا کر دیوار پر چڑھ گیا دیوار سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کوئی نظر نہیں آیا دھم سے کود پڑا۔ کودتے ہی دیکھا کہ ایک خوب صورت جوان پٹاخاسی عورت، دالان سے نکل کر بال بکھرائے اس کی طرف چلی آرہی ہے سپاہی سٹی بھول گیا۔

۱۔ دراصل وہ تمام نظام ہی اس قدر ظالمانہ تھا کہ اس سے کسی نوع کی شرافت کا تصور ہی وابستہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خدا بھلا کرے حکومت ہندو کا کہ اس نے ہرپٹی دار ہرنمبردار اور ہر تعلقہ دار ہر جاگیر دار اور دیسی ریاستوں کے ہر تاج دار کو دار پر چڑھا کر اللہ کے کروڑوں بندوں کی گلی خلاصی کر دی۔ ہر چند تنہیخ جاگیر داری سے تباہی مجھ پر بھی آئی۔ لیکن کوئی پروا نہیں ایک میری بربادی سے نئے بے شمار انسانوں کو آباد کیا۔ جی ہاں آنکھ گئی پیر گئی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

زمین نے قدم پکڑ لیے۔ بھاگنے کی طاقت سلب ہو گئی کبوتر کو بھول گیا اور اس مورتی کو دیکھنے لگا..... عورت ڈھیٹ تھی ڈری نہیں اور بانکے سپہیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی ”پرائے گھر میں کود پڑے دھم سے یہ کون سی بھل مفسی ہے ت کوئی چور ہوا ٹھانی گیرے ہو مت پھیرے ہو ڈاکو ہوا چھا چھکا ہوا یا دیوانے؟“..... سپاہی نے سر جھکا کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ اور کہا جو چاہو سزا دے لو۔ بھوک میں مجھ سے بڑی بھول ہو گئی..... عورت نے کہا میں نے تمہاری سزا سوچ لی ہے ادھر آؤ میرے پیچھے پیچھے دالان میں سپاہی نے دل میں کہا کہ اس کی مار میں بھی مزا آئے گا۔ سکے پیچھے گردن ڈال کر روانہ ہو گیا..... دالان میں پہنچ کر عورت نے کہا چٹائی پر بیٹھ جاؤ۔ سپاہی چٹائی پر بیٹھ گیا تو اس نے یہ کہہ کر اس کے سامنے کھانا رکھ دیا کہ پہلے کھانا کھاؤں گی پھر تمہیں اس گھر میں کودنے کا مزا چکھاؤں گی۔ جب سپاہی کھانا کھا کر



ہاتھ دھو چکا تو عورت نے کہا اب میں تمہاری ناک چھیدوں گی اور اس میں نیل ڈال دوں گی سپاہی اس کا منہ دیکھنے لگا اس نے گردن جھکا دی..... پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس عورت نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر پوچھا تم کون ہو گھرو کی سانس تیز تیز چلنے لگی اس نے اپنا نام بتایا عورت نے پوچھا کہ کس کام کے لیے یہاں آئے ہو اس نے کہا میں سپاہی ہوں کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں نوکری کروں گا۔ عورت اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے منہ سے نکل گیا ارے عورت نے مسکرا کر کہا تمہاری سزا یہ ہے کہ تم آج سے میرے نوکر ہو گئے ہو کھانا پینا کپڑا تانیرے ذمے رہے گا..... تنخواہ تمہاری ایک روپیہ روز ہوگی تم کو منظور ہے سپاہی نے ریشہ ختمی ہو کر کہا جان و دل سے منظور..... عورت نے کہا لیکن ایک شرط یہ ہے کہ جب میرے میاں کے آنے کا وقت ہو گا اس سے آدھے گھنٹے سے پیش تر ہی تم میری سہیلی کے گھر جا کر ایک کوٹھری میں سو جانا جب وہ چلا جائے گا تو میں تمہیں بلا لیا کروں گی..... یہ دیکھو کونے میں سہیلی کے گھر کی کھڑکی ہے..... یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اپنی سہیلی کو بلالائی اور ساری بات اس کو سمجھا دی..... اور پھر اس نے سپاہی سے کہا کہ شام ہوتے ہی نہا دھو کر میری سہیلی کے ساتھ ایک تنبولی کی دکان پر جانا اور ایک روپ کی گلوری مانگنا..... اور گھوم پھر کر پھر گھر چلے آنا..... چنانچہ شام ہوتے ہی سپاہی نہایا دھویا عورت نے اس کو ایک ریشمی لنگی اور ململ کا دھلا ہوا ایک کرتا دیا اور ایک حریب اس کے سر میں تیل ڈالا کنگھی کرنے میں عطر ملا اور اپنی سہیلی کے ساتھ بازار روانہ کر دیا۔ سہیلی نے دور اشارہ کر کے تنبولی کی دکان بتا دی سپاہی عطر کی مہک میں ڈوبا گیا اور ایک تو پیاس کے تھال میں پھینک کر کہا اے تنبولی ایک روپے کی گلوری۔

اس زمانے میں ایک پیسے کی گلوری ملا کرتی تھی اس لیے تنبولی ایک روپی کی ایک گلوری سن کر بھونچکا رہ گیا دل میں سوچنے لگا ہونہ ہو یہ کوئی بھولا بھالا رئیس زادہ ہے۔ لیکن اس نے سوچا رئیس زادے بازاروں میں لنگی باندھے کہاں پھرتے ہیں۔ سپاہی

نے تنبولی کو سوچتے دیکھا تو گرج کر کہا اے تنبولی ایک روپے کی ایک گلوری جلدی کر..... تنبولی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا میاں تم کون ہو اور اس نے کہا ہم سپاہی ہیں سپاہی تنبولی نے دریافت کیا میاں کس ڈیوڑھی پر نوکر ہو؟ سپاہی نے کہا پورب کی طرف سے آتے ہوئے جو سب سے پہلا لال اینٹوں کا مکان ہے اس مکان کی مالکن کا سپاہی ہوں..... تنبولی نے گلوری تو اس کو دے دی مگر دل میں سوچنے لگا کہ یہ سپاہی جو مکان بتا رہا ہے وہ تو میرا ہی مکان ہے کیا میری عورت بگڑ گئی ہے لوگوں نے سچ کہا تھا کہ تم ادھیڑ ہو کر جوان عورت سے شادی نہ کرو نہیں تو دھوکا کھاؤ گے۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے تنبولی نے وقت سے پہلے ہی اپنی دکان بند کر دی اور افٹاں و خیزاں جا کر اپنا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

میاں کے قبل از وقت آنے پر تنبولن گھبرا گئی۔ سپاہی نے بندوق اٹھالی تنبولن نے بندوق چھین لی اور کہا جلدی سے بندوق سمیت اس سامنے والی کھٹیا میں جا کر کود پڑو..... سپاہی کھٹیا میں کود پڑا۔ تنبولن نے سر میں پٹی باندھی اور دروازہ کھول کر کراہنے لگی تنبولی نے پوچھا دروازہ کھولنے میں دیر کیوں کی تنبولن نے کہا اردیکھ میرے سر کی پٹی درد کے مارے سر پھٹنا جا رہا ہے۔ گڑ مڑائی پڑی تھی کھٹ کھٹ سن کر بڑے جتن کر کے اٹھی ہوں تنبولی چپ منہ گھر میں گھسا اور چراغ ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ تنبولن نے کہا یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے کہ سارے گھر میں چراغ چھوچھو کرتا پھر رہا ہے تنبولی نے بگڑ کر کہا تیرے یار کو ڈھونڈ رہا ہوں..... یہ سنتے ہی تنبولن نے آنکھیں پھاڑ کر اور چھاتی پر گھونسا مار کر کہا یا اللہ یہ بھی سنتا تھا مجھ کو جلی کو۔ ارے میں اور یار اگر میں ایسی ہوں تو بجلی گر پڑے مجھ پر۔ علی کی تیغ ٹوتے مجھ گلوری پر..... تنبولی نے کڑک کر کہا اگر تیرا کوئی بیار نہیں تو پھر میری دکان پر ایک روپے کی گلوری کھانے والا کون آیا تھا۔ اور میرے مکان کا پتہ یہ کس نے بتایا تھا؟ تنبولن نے سر پیٹ کر کہا ارے مورکھ اب میں بات کی تہہ کو پہنچ گئی تو یہ سارا سوانگس مورے ابھرا ہوا ہے جو چاہتا

ہے مجھ سے تجھ سے چھٹم چھٹا ہو جائے تو مجھے فارغی دے دے اور تھو تھوسات سمندر پار پھر وہ مجھ سے بیاہر چالے۔ ارے اس موئے کے منہ کو لو کا۔ اگر تو کدانہ کرے شیطان کے کان بہرے مجھے چھوڑ بھی دے گا تو پھر بھی اس اٹھائی گیر کے منہ پر نہیں تھوکوں گی۔ وہ تو دو کوڑیکا بچوڑا ہے میں تو کان پکڑ کے اور تو بہ تو بہ کر کے کہتی ہوں کہ تیرا منہ دیکھ کر اب کسی ہفت اقلیم کے بادشاہ کا منہ بھی نہیں دیکھوں گی۔

تنبولی نے کہا بتا وہ ہے کون بد معاش؟ تنبولی نے منہ پر انگلی مار کر کہا میرے قریب کان لا۔ اور پڑوس کے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ سارا بس اسی بد معاش کا بویا ہوا ہے۔ اس کے گھر والی تو جانتا ہے کہ میری بڑی اچھی سہیلی ہے۔ خود اس نے میرے کان میں کہا تھا کہ میرے خصم کا جھ پر دانت ہے ہشیار رہنا۔ سدا تو ابھی چپ رہنا میں اپنے چاروں بھائیوں کو بلا کر اس کی ایسی مرمت کروادوں گی کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔

تنبولی کو یقین آ گیا کہ بس یہی بات ہے۔ اور اسی بد ذات نے یہ شوشہ چھوڑا ہے اس نے پشیمان ہو کر سر جھکا لیا اور جب تنبولن نے دیکھ لیا کہ اس کا جادو چل گیا ہے تو وہ امٹھ ڈھانپ کر رونے لگی۔ اور تنبولی کہنے لگا کہ اری مجھ سے بڑی چوک ہو گئی کہ اول فول بکنے لگا۔ ماف کر دے مجھے تنبولن نے ڈھیلے ہاتھ سے اس کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا جا برے پیر کی نیاز دلاؤں گی بزاز سے لڈو لے آ..... یہ انہیں کی برکت ہے کہ میری بات تجھ مورکھ کی سمجھ میں آ گئی۔

تنبولی جب باہر چلا گیا تو لڈو لانے تنبولن نے کھٹیا میں منہ ڈال کر کہا ہوڑی دیر سیٹھا بیٹھا رہ ابھی تجھے تازے تازے لڈو کھلاؤں گی اور جب مو ابڈھا چلا جائے گا تو تجھے باہر نکالوں گی۔ اسکے بعد کھڑکی میں منہ ڈال کر اپنی رازدار سہیلی کو بھی اس نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور یہ سارا ماجرا اس کو سنا دیا سب سے پہلے اس کی سہیلی نے اس پر بڑے پیر صاحب کی نیاز دی پھر تینوں نے مل کر لڈو کھائے۔ اور جب آدھے سے کچھ



کم لڈورہ گئے تو اس نے اپنے میاں سے کہا کہ تو بڑا نشانہ باز بنتا ہے۔ تو سہی کھٹیا کے اندر لڈو پھینک، اگر ایک لڈو بھی نیچے گر گیا تو ہار جائے گا۔ اور سانولیا اتے ہی لڈو تو پھر لائے گا۔

تنبولی نے ایک ایک کر کے تمام لڈو کھٹیا کے اندر اتار دیے اور قہقہہ مار کر کہا دیکھا میرا نشانہ تنبولن نے اٹھ کر تنبولی کی پیٹھ ٹھونکی اور پڑوسن کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

جب دوسری شام آئی تو سپاہی نہا دھو کر پھر تنبولی کی دکان پر پہنچا سپاہی کو دیکھ کر تنبولی کی آنکھوں میں خون اتر آیا مگر وہ غصہ پی گیا..... سپاہی نے دو روپے جیب سے نکال کر اس کے تختے پر پھینک دیے اور کہا اے تنبولی دو روپے کی ایک گلوری..... تنبولی نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا دو روپے کی ایک گلوری!..... سپاہی نے کہا ہاں ہاں دو روپے کی ایک گلوری..... تنبولی نے گلوری دے کر کہا میاں سپاہی یہ تم کو یہاں روپے دے کر کون بھیجتا ہے سپاہی نے کہا ارے وہی لال اینٹوں کے مکان والی جس نے ہم کو نوکر رکھا ہے تنبولی نے پوچھا میاں سپاہی کل بھی وہاں گئے تھے؟ اس نے کہا گئے کیوں نہیں تھے ہم تو نوکر ہی اس بات کے ہیں اور یہ کہ کر اس نے گزشتہ رات کا سارا ماجرا اس کو سنایا اور پھر قہقہہ مار کر کہا عورت وہ تو ایسی ہو اس نے اس سالے کے ہاتھوں سے مجھے کھٹیا میں لڈو بھی کھلوا دیے..... تنبولی کا خون کھولنے لگا اور سپاہی جانے لگا تو اسنے دانت پیس کر کہا میاں سپاہی آج بھی وہاں جاؤ گے؟ سپاہی نے بکر کر کہا یہ بیر بیر (بار بار) کا پوچھنا کیا بے کہہ تو دیا کہ ہم تو نوکر ہی اسی بات کے ہیں۔

تنبولی کے تن بدن میں آگ لگ گئی جلدی جلدی دوکان بند کی راستے میں مٹی کے تیل کا پھیلا لیا۔ دیا سلائی جیب میں رکھ لی گھر آتے ہی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا تنبولن نے یار کو صندوق میں چھپا کر دروازہ کھول دیا اسنے گھر میں قدم رکھتے ہی تنبولن کو گالیوں پر دھریا۔ تنبولن نے کہا ارے کیا آج چرس پی کر آیا ہے۔ تنبولی نے کہا تیرا خون پینے آیا ہوں۔ کل تو نے اپنے دھکڑے کو کھٹیا میں چھپا کر میرے ہات سے اس



حرامی کو لڈو کھلوائے۔ لے چھنال آج میں دربار ہی پھونکے دیتا ہوں ی کہہ کر اس نے ہر طرف تیل چھڑک کر مکان کو آگ لگا دی۔ اور گھر دھڑ دھڑ جلنے لگا پڑوسن بھی آگئی دو ایک پڑوسی بھی دوڑ کر آگئے تنبولن نے ان سب سے کہا کہ ارے لوگو یہ تو دوانا ہو گیا ہے ارے جس صندوق میں اس موئے کے باپ دادا کے کاغذات گھر کا سارا زیور اور مال تال رکھا ہوا ہے اس تو ہاتھ لگا کر نکال لاؤ ابھی ادھر آگ نہیں گئی اگر وہ صندوق بھی جل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ پڑوسیوں نے مل کر وہ صندوق باہر نکال کر انگنائی میں رکھ دیا۔ اور جب صندوق باہر آ گیا تو بی تنبولن نے اپنے بال نوچ نوچ کر اپنی چھائی کوٹ کوٹ کہنے لگی ارے خدائی خوار سنے پورے ہو گئے اس بد معاش کے ارے میری سہیلی سے پوچھ کر اس کی تہہ میں کیا بات تھی تنبولی دوڑا ہوا سہیلی کے پاس گیا۔ اس نے اس کے کان میں کہا کہ جب تو کھٹیا میں لڈو پھینک رہا تھا تو میرا پانی خصم موکھے سے جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھا۔ اور اپنے گھر گے کو تیرے پاس بھیج دیا کہ وہ تیرے سامنے رات کی ساری بات دہرا دے اور تجھ کو یقین آ جائے کہ تیری بیوی بگڑ چکی ہے اور دھگر اپالے ہوئے ہے اور آخر کو تو اس کو فار خلی دے دے اور وہ گل چھڑے اڑانے لگے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بات پاچھ پتار کے تو نے ٹھنڈے دل سے بات نہیں سنی اور تیسے میں آ کر لاکھ کا گھر خاک میں ملا دیا..... تنبولی سر پکڑ کر خاک پر بیٹھ گیا۔ اور ندامت کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ اتنے میں تنبولن آئی اور کہا اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چک گئیں کھیت دیکھ یا تو نے اگر میرا دھگر ایہاں ہوتا تو اس کی جلی ہوئی لاش تو تیرے سامنے آ جاتی۔

سہیلی نے آ کر کہا کہ ارے دیر نہ کر یہ سامنے موڑ پر ٹیٹوں اور ٹھاٹھروں کی دکان ہے جا کر کچھ ٹٹیاں اور ٹھاٹھر لے آجسے مکان کے چاروں طرف لگا دیں اور جو ایک کوٹھری جلنے سے رہ گئی ہے اس کو بھی رہنے کے لیے اچھی طرح گھیر لیں..... نہیں تو رہے گا کہاں۔

تنبولی ٹٹیاں اور ٹٹھاٹھر لینے کے لیے جب چلا تنبولن نے جھٹ صندوق کھول کر  
 پسینے سے تر بتر سپاہی کو باہر نکالا اور گوپھے میں لے کر سہیلی کے گھر پہنچا دیا  
 بھیا ایسی ہوتی ہیں چلتے باز عورتیں یہ کہہ کر ظہور علی خاں نے کہانی ختم کر دی۔

### چوتھی کی دہن یعنی طلوع سحر کا دوسرا دیدار

چوکی دار کی آواز سے جب منہ اندھیرے آنکھ کھلی تو دیر تک یہ بات سمجھ میں ہی  
 نہیں آئی کہ آ کر میں ہوں کہاں..... آنکھیں مل مل کر بڑی حیرانی کے ساتھ بدلے  
 ہوئے ماحول کو دیکھنے لگا۔ اور دس پندرہ منٹ کی حیرت کے بعد حافظے کا مطلع صاف  
 ہو گیا تو یاد آ گیا کہ میاں کے ساتھ سیدا پورا آیا ہوں..... طلوع سحر کا مزا تو منہ کو لگ ہی  
 چکا تھا۔ میں بستر سے اٹھا اور تھانے ک چھت پر چڑھ گیا۔ تھانہ سطح مرتفع پر بنا ہوا تھا  
 جس کی چھت سے تمام گاؤں نظر آ رہا تھا.....

چھت پر گیا تو نسیم صبح میری رضائی میں آ کر مچلنے لگی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔  
 سردی زیادہ تھی نہ کم ایک طرب انگیز جھرجھری سے غپہ خاطر چٹک گیا..... دل میں وہ  
 راگنی چھڑ گئی جس کو انسانوں کے گلے یا ساز کے تار گرفت میں نہیں لاسکتے۔ دھندلکے  
 نے اپنے گھونگھٹ کے پٹ کھول دیے۔ آسمان نے زمین پر موتی رول دیے.....  
 ولولہ نشاط نے مور کی طرح ناچنا شروع کر دیا..... آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دیکھا  
 کہ فضا کی محل سرا کے سیاہ پردے ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں۔ لیائے شب مستی کی  
 دھڑی اور افشاں چھڑا کر اور رنگین آنچل سے کا جل پونچھ کر سرخ شلو کا پہن رہی ہے۔  
 سری وادیوں میں متعیش کے خیمے نصب ہو رہے ہیں۔ تارے کانپ کانپ کر  
 کجائے جا رہے ہیں۔ افق کے تلکے پردوں کے پیچھے ایک نیم روشن نور کا دائرہ گھوم رہا  
 ہے۔ اور اس کے گرد ایک سنہرا حالہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ اور چند لمحوں کے بعد پھر یہ دیکھا  
 کہ مشرق کا گریبان مسکنے لگا ہے۔ اور مسکتے مسکتے چر سے پھٹ گیا..... ہر وہ دائرہ نور  
 سونے کا تھال بننے لگا۔ تھال کا ایک سرا کسی غرنے سے جھانکنے والی پیشانی کے مانند

دور سے دکنے لگا۔ پھر اس کو ایک سیاہ جونا صاف کرنے لگا..... پھر وہ جانا غائب ہو گیا..... آدھا تھال سامنے آ گیا..... اور ایسا نظر آیا کہ ماہ کنعاں کا ماتھا کنویں سے نکل کر جگمگا رہا ہے پھر کیا تھا چڑیاں چہکنے ڈالیاں کچلنے اور مرغان سحر بانگ دینے لگے۔ کعبہ نور میں ازاں ہونے لگی آسمان دائرہ بجانے لگا۔ زمین چوڑیاں کھنکانے لگی۔ جھیل نے انگڑائی لی پانی میں سونا پہنے لگا دولہا گھوڑے پر سوار ہو گیا براتی دھوئیں مچانے لگے اور کڑم کڑم کڑم کی زمین پر شہناہوں کی پھوار پڑنے لگی..... اری آج آئے سیاں..... مرے آج آئے سیاں سکھی سوئے بھاگ جاگے..... مرے تن میں راگ جاگے..... مری تھا منے کو پہاں مرے آج آئے سیاں مرے آج آئے سیاں!!

### میرا ختنہ

لیجیے اپنی بسم اللہ کی طرح اپنے ختنے کا ذکر کرنا بھی بھول گیا۔ آگے بہت آگے نکل گیا کیا کروں اب سنائے دیتا ہوں کوئی پتہ تو ہے نہیں..... میرا ختنہ کم سنی میں ہوا تھا۔ اور خوب یاد ہے کہ دادامیاں نے فرمایا تھا کہ دیکھ بیٹا رونے کی آواز منہ سے نہ نکلنے پائے..... لیکن لال داڑھی کے جاں علی حجام نے گھوڑی چڑھا کر جب گھٹ سے میرا ختنہ کر دیا..... میری چیخ نکل گئی۔ دادامیاں کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے..... اور میں فرط شرمندگی سے گڑ کر رہ گیا..... اور آج بھی دادامیاں کی پیشانی کے بل جب یاد آتے ہیں تو دل پر کٹاریاں سی چلنے لگتی ہیں۔

ہر چند میرے ختنے کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی..... دیکھیں چڑھی تھیں طوائفوں کے بحرے ہوئے تھے کشمیریوں نے نقلیں کی تھیں مگر میرے دل کی کلی مرجھائی سی رہی تھی۔ اسی مرجھاؤ کے دو اسباب تھے پہلا سبب تو وہی میری ختنے کے وقت کی چیخ تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے ختنے کی خوشی میں جس بوقت ملیح آباد کے ایک لہار نے ایک بڑی خوبصورت اور جھلجھلاتی کرچ بطور نذر پیش کی تھی تو اس کرچ کو ہات میں لیتے ہی مجھ پر ایسا جنون طاری ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے غلام

زادے حسین بخش کے ننگے سر پر وہ کرچ کھچ سے ماردی تھی اور اس بے چارے کے سر سے دھل دھل خون بہنے لگا تھا خیر اس کی تو فوراً مرہم پٹی اور اس کے باپ کی منہ بھرائی کر دی گئی تھی۔ لیکن میرے دل کا زخم بھر نہیں سکا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کاشمیریوں کی ہنسانے والی نقلیں بھی مجھ کو ہنسانہ سکیں تھیں۔ دل ہی تو ہے۔





## موسموں کے تاثرات اور میرے زمانے کے تہوار

### موسم گرما

ارے پھٹے سے منہ کا موسم گرما..... دھوپ پاند کیا، دھکارتا..... پسینا نچوڑیا، بھاڑیا،  
بھنھوڑیا، تنوریا، چنگیزیا، چنگاریا..... اکل کھرا جل لکڑا گھنٹا..... دورھا، بردتا، سبرا،  
ہبڑا، بھینگا، بڑوتا، شیاطین کی آنکھ کا تارالو کا راج دلارالو کا گہوارہ، اور شعلوں کا فوارہ  
..... خونی ریچھ، لاگو بھیڑیا اور بندیل سور۔

نفرت ہے مجھ کو اس محروم راج مغضوب، معتب اور مردود شہدے سے..... اس  
کی صجس بھی چنگاریاں اس کی شامیں بھی کٹاریاں..... اس ک شعلہ خوافتاب  
دریچہ افق سے ایک بدتمیز گنور کے مانند بھق سے نکلتا ہے اور نکل کر فوراً آگ برسانے  
لگتا ہے..... اس کی بے مہر کرنیں عیاذ اللہ..... گویا جلمی پانی اور بوڑھے سود خوار لالہ  
رام لال کی نگاہ۔

اس کٹنے چمار موسم میں جس حرام زادی لو کے جھکڑ غاؤں غاؤں، اور ہو ہو ہو  
کرتے چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساتویں جہنم کے گندے فرشتے آتشیں  
گرز مار مار کر زمین کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں۔

جب یہ خبیث موسم آ جاتا ہے تو دوپہر سے تپش تر ہی ہم سب بچوں کو مرغیوں کی  
طرح کڑی کڑی کر کے خس خانے میں بند کر دیا جاتا تھا.....

سقفی پنکھے کی سریلی چوچوں کا ریٹوں پر پانی چھڑکے جانے کی جھنکار نہی نہی  
بوندیوں کی پڑکار..... خس کی سوندھی سوندھی، اور عطر خس کی بھینی بھینی مہکار..... ان سحر  
کاریوں کے آغوش میں ایسی ٹھنڈی بیٹھی مہکتی اور گہری نیند آ جاتی تھی کہ شام سے پہلے  
ہم میں سے کسی کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔

اور جب شام کو ہم خس خانے سے نکلتے تھے تو انگنائی کے چھڑکاؤ کی سوندھی سوندھی  
خوش بو ہمارا استقبال کرتی تھی۔ ہم سب بھائی بہن تختوں کے چوکوں اور آرام کرسیوں

پر آ کر بیٹھ جاتے اور تاڑ کے بڑے بڑے پنکھے حرکت کرنے لگتے تھے..... تر بوزوں اور خرپڑوں کی قاشوں بالائی کی قفللیوں اور آب خوروں نمش کے تھلوں اور فالودے کے برف میں جھلے گلاسوں سے ہم سب کی ضیافت کی جاتی تھی۔ اور رات کو بڑے سے آنگن میں ہم سب کے پلنگ اونچے اونچے کھمبوں پر لٹکے ہوئے جھالردار پنکھوں کے نیچے بچھا دیے جاتے اور علاقے سے باری باری آنے والی عورتیں صبح تک پنکھوں کی ڈوریاں کھینچا کرتی تھیں۔

### موسم سرما

آیا میرا کنورا جاڑے کا دوار!

آہا..... جاڑا..... چمپی شرتی گلابی جاڑا..... کندن سی دکتی انگلیٹھیوں کا گلزار

یہ بات مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک بار پچھلے پہر دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی تھی اور یہ دیکھ کر میرے دل پر سانپ لوت گیا تھا کہ ہمارے گھر کی مغلانی حیدری خانم نوخیز پنکھا جھلنے والی کی پیٹ پر یہ کہہ کر گھونسے مار رہی ہے کہ مردار پنکھا جھلکے آئی ہے کہ پاؤں سپار کے خراٹے لینے کے لیے بوڑھی حیدری خانم کی بے مہری اور نوخیز پاسن کی بے کسی دیکھ کر میرے دل پر اسی چوٹ لگی تھی کہ پھر میں سو ہی نہیں سکا تھا۔ اس واقعے کے بہت دن بعد ہمارے گھر کی کسی تقریب میں جب ایک طوائف نے یہ ٹھمری شروع کی تاری جیہو ڈلاے جاگہ بنیا ڈلاے جاو بنیا ماری جیہو ڈلاے جاو بنیا (پنکھا جھلتی رہو ورنہ ماری جاو گی) تو اس گد بدی نوخیز پاسن کی پیٹ پر حیدری خانم کے دھما دھم گھونسوں کی یاد نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہائے پرانی یادیں ہائے پرانی چوٹیں۔

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا

جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا!

لچکے پٹھے کی رضائیوں میں لپٹا ہوا دل دار..... دل کا سرور آنکھوں کا

نور..... دھندلکے کا راگ..... جھٹپٹے کا سہاگ..... زلیخا کا خواب یوسف کا شباب  
..... خدیو بربط و چنگ شاہ زادہ رامش و رنگ روئی دوئی کا سیتا۔ مسلم کا قرآن ہندو کی  
گیتا..... اور صبح کو سونے کا جال۔ رات کو چاندی کا تھال.....

قصیر النہار طویل الیل..... تنگ آستین دراز گیسو..... موتی کی آب موتی کی اوس  
..... رگوں میں چٹکیاں لیتی سردی چہروں پر انگڑائیاں لیتی سرخی..... مہکتے لحافوں کی  
نیند چٹکتے انگاروں کا ناچ..... شمس در آستین قمر جہیں..... ٹھڈی تا راما تھے چاند..... ماہ  
روسوسن خوب گھرو چکیلا چھوہرا چٹکتا مدھ بھرا، بانکا تر چھا، نکلیا، لپیٹا، رسیا، چھبلیا، بھلیا،  
سانولا، سلونا، اور سہانا جاڑا۔

ہائے وہ ماہ پوس کی کالی کالی زلفوں والی تخ میں جھلی انگلیٹھیوں کی سموٹی ہوئی جادو  
بھری خاموش لمبی لمبی راتیں..... وہ اونچے اونچے دروں کے بھاری بھاری پردے  
مسہریوں کے سامنے وہ تختوں کے چوکچوں پر وہ مخمل کے گدے اور گاؤ تکیے اور تکیوں  
پر ٹیک لگائے اور پاؤں پر دوشالے ڈالے وہ گھر کی بڑی بوڑھیاں..... دائیں بائیں  
چاندی کے اونچے اونچے اگال دان۔ رہ رہ کر کھلتے اور بند ہوتے پاندان اروہ ڈلی کے  
کٹنے کی کٹاکٹ آوازیں دوسرے تخت پر وہ رضائیاں اوڑھے ہوئے کہانی کہنے  
والیاں۔ ان کے پیچھے اونچے اونچے موبافوں کی ماماں اسیلیں، اور لونڈیاں باندیاں  
پشت پر اگر دان پیچوں بیچ انگلیٹھی انگلیٹھی میں چٹکتے کونکوں کی چٹکا راور سنہری آنچ کا  
ناچ۔

اور ہائے مواقع و مناظر کا بیان کرتے وقت کہانیاں کہنے والیوں کے وہ بار بار نئے  
نئے روپوں میں ڈھلتے چہرے، آنکھوں کے بار بار بدلتے اشاروں، اور حسب حال  
بڑھتے گھٹتے ابھرتے ڈوبتے لہجوں کے کٹاؤ اور ٹھہراؤ کے ساتھ وہ کہانیوں کا ان الفاظ  
میں آغاز۔

”کہانی سی جھوتی کوئی بات نہیں کہانی سی میٹھی کوئی چیز نہیں۔ جھوٹ سچ کہانی

بنانے والے کی گردن پر کہانی بنانے والے پر عذاب سننے والوں کو ثواب..... آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار..... ایک تھا بادشاہ..... ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ اس بادشاہ کی ایک چاند سی بیٹی۔ سو اللہ کا کیا کرنا ہوتا ہے کہ وہ شاہزادی ایک دن سہیلیوں کے ساتھ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ.....“۔

ہر چند اب وہ دن ہیں نہ وہ راتیں لد چکے ہیں وہ زمانے بیت چکی ہیں وہ گھڑیاں، اور روت کی نیند سو چکی ہیں وہ کہانی کہنے والیاں۔ اور قبر کی جانب مڑ چکی ہیں میری عمر لیکن ان کہانیوں کے بھوتوں کے نل غپارے۔ ان کے اندر کے اکھاڑے۔ ان کی پریوں کے غول، ان کے گل فاموں کی ٹھول ان کے آگیا بیتالوں کے اشارے، ان کی راگنیوں کے مڑتے دھارے۔ ان کے طوفان میں پھنسے بیڑے ان کی برساتوں کے دریڑے ان کے موتی برساتے سویرے ان کے ہونکتے جنگلوں کے اندھیرے۔ ان کے شاہوں کا جلال، ان کی شاہزادیوں کا جمال ان کا فراق و وصال ان کی آہیں اور کراہیں، ان کے گانے اور شادیاں۔ میرے دل میں ٹوتے ہوئے شیشوں کے ٹکیلے ٹکڑوں کے مانند آج بھی چھتے اور کھٹکتے رہتے ہیں۔ یا اللہ کیا کروں اے میرے بچپن کی اداس انگلی ٹھھی۔

جن کو بھلا چکی ہیں ہماری جوانیاں  
اب ان میں تجھ کو یاد ہیں کتنی کہانیاں؟



## موسم برشگال

روم جھوم بدرو ابر سے پی درشن کو جی ترے  
رو م جھوم بدرو ابر سے

امیری اظم انگلیٹھی ملاحظہ فرمائیے۔ جو میرے کسی مجموعے میں چھپ چکی ہے۔

اوہو جھومتی جھکتی، جھولتی، جھرجھراتی، جھم جھماتی، جھم جھم برستی، جو بن والی، جوتی  
برسات۔ گھپ اندھیروں اور گھنگھور گھٹاؤں کی چھاؤں میں گھرتی گھومتی گھمرتی  
گنگناتی گمکتی، گاتی، گونجتی، گھر گھڑاتی، گھونگر والی برکھا۔

آسمان کو گھماتی زمین کو نچاتی، فضا کو چلاتی، شمس و قمر کو گھماتی، چوبای کو تھپتھپاتی،  
طوفان پر طوفان اٹھاتی زلفیں چھٹکتی، کجریاں سناتی، کھیتیاں لہلہاتی، زمین کی پوریں  
چٹھاتی، اور چھڑے کو کڑے سے لجاتی برکھا۔ ابر سیاہ بیاباں در بیاباں گلستاں در گلستاں،  
گل چکاں، گوہر نشاں، رقصاں، پراں، غلطاں، رواں، رواں دواں، آسماں پابجولاں،  
زمین کشاں کشاں لکے بال کشاں نعرہ زناں، اور سر سے پاؤں تک دھواں ہی دھواں۔  
اف وہ بجلیوں کی کڑک وہ بدلیوں کی لٹک اور وہ بانگی دھنک۔ وہ مینڈکوں کا شور اور وہ  
پروا کا زور اور وہ گھٹائیں گھنگھور..... وہ جھینگروں کی جھنکار، وہ موروں کی پکار اور نہروں  
پر وہ مرغابیوں کی قطار اندر قطار..... وہ شاخ شاخوں کی گلچپ وہ انبیوں کی ٹپاٹپ.....  
وہ امیروں کے جھومتے جھولے، وہ لہڑوں کے گھومتے کولے..... وہ برستے گیت پر  
گیت، وہ مچلتی پیت کی ریت۔ وہ یاروں کے چہچہے وہ نگاروں کے تھہہے..... وہ آڑی  
ترچھی پھواریں وہ ستاروں کی آریں آریں..... وہ ہوا کی گھوم وہ بوچھاڑ کی چھوم  
..... وہ متوالی پی ہو..... وہ نشلی کو کو..... وہ جگنوؤں کے غول وہ بارہ ماسوں کے  
بول..... وہ دوب کا مٹل وہ بیر بہوٹیوں کی ہلچل..... وہ جل تھل میدان وہ پرنا لوں کا  
ہیجان۔ وہ موجوں کی روانی وہ دھرتی بورانی..... وہ ماچھا جوں یانی وہ چھو کریوں سے  
چھیڑ خانی اور وہ ہا، زما، نے ہائے جوانی۔

اللہ اللہ وہ مچلتی گھٹائیں وہ چڑھتے دریا وہ گرجتے نالے وہ تھرکتے ولولے وہ کوکتی ترنگیں، وہ ابلتی انگلیں، وہ چہکتے رنگ..... اور وہ زبردست و پرشور دونگرے، اور ایسی گرجتی پروائی کی دھرتی بولے رام دھائی! جب موسلا دھار پانی برستے لگتا تھا میں رسیاں تڑا کر انگنائی میں آجاتا تھا عورتیں چیختی تھیں کہ ارے نہ بھیگ بخار آجائے گا۔ میں کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ صحن کے گوشے گوشے میں قلقاریاں مارتا، دھو میں مچاتا اچھلتا کودتا، دندان تالیاں بجا بجا کر، بر سورام دھڑاکے سے اور کوڑی گئی ریت میں پانی گیا کھیت میں کے نعرے لگاتا پھرتا تھا۔

جب پانی برس کر کھل جاتا تو، باورچی خانے سے برآمدے میں کڑھائیاں چڑھ جاتیں اور برساتی پکوان یعنی پوریاں کچوریاں، اردیاں، پھلکیاں وہی بڑے برہیاں چنے کا بھرتا، اندر سے گلگلے چل دندان مصری اور مولی کے پتے پکنے لگتے تھے۔ اور انگنائی کی نہاء ہوئی کڑوی کڑوی خوشبو والی نیم کی بھیگی شاخوں میں جھولے دال دیے جاتے تھے۔ اور ہم سب لودیتی شوخیوں کے ساتھ جھولنے لگتے تھے۔ جن میں کچھ منہ بند کلیوں کے مانند کچی کچھ گدراور کچھ ایسی جوالا مکھی کی سی جوانیوں والی ہوتی تھیں کہ اگر بھرپور انگنائی لے لیں تو انگلیا کے بند ٹوٹ جائیں اور وہ مسک کر پارہ پارہ ہو جائے۔

ہائے وہ پانی برکھا کے نکلیے کافر گیت..... جو ٹھنڈی ہوا اور رنگین فضا سے تیرتے میرے کانوں تک آتے اور میرے ملائم سینے میں کھچ سے چبھ جایا کرتے تھے۔ اور جب ان بولوں کے کٹاؤ ان دیکھے منظروں اور اجنبی مکھڑوں میں تبدیل ہو کر میری نظروں کے سامنے بڑی تیزی کے ساتھ گزرنے لگتے تھے تو حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ ان دیکھے پر بت، یہ کھیت، یہ جل تھل میدان اور یہ اجنبی جگر جگر مکھڑے کس دیس کے ہیں۔ اور آخر اس وقت مجھ کو یہ رونا کیوں آرہا ہے۔

ایسی برکھارت میں ہماری انگنائی کے بچوں بیچ ایک روز آنسوؤں اور ہچکیوں کا ایسا

موسلا دھار پانی برساتا تھا کہ ہمارا گھر اس میں ڈوب گیا تھا۔

## سنیے اس کی داستان۔

ایک دن جس وقت کہ ہم لوگ جھول جھول کر کجریاں سن رہے تھے اور باورچی خانے کے برساتی پکوانوں کا نمکین دھواں نیم کی شاخوں کے نیچے چل رہا تھا کہ میری کھلائی ہانپتی کانپتی لکڑی تیکتی آئیں گانے والیوں سے کہا بچیو ذرا ٹھہر جاؤ آج یہ پھوس بڑھیا گائے گی۔ وہ سب کی سب پیچھے سرک سرک کر بیٹھ گئیں۔ بڑی بی نے اپنے سر کی چادر پھینک دی اور ان کے سفید بال اڑنے لگے۔ اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دردناک لہجے میں گانا شروع کر دیا۔ گانا نہیں یہ نوحہ شروع کر دیا ہائے تمرے پنا برکھا ما سہائے ارے مورے کلکتے اے کے جویا اللہ تمہیں لائے ہائے اللہ تمہیں لائے۔

اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے۔ بڑی بی کو گاتے اور روتے دیکھ کر میں جھولے سے کود پڑا ان کے سینے سے جا کر لپٹ گیا اور پھوت پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے روتے ہی تمام گانے والی چھو کجریاں بھی منہ پر پلور کھ رکھ کر رونے لگیں۔ گھر کی تمام خواتین انتہائی سراسیمگی کے ساتھ دوڑ پریں اور پوچھنے لگیں۔ ارے خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کیا ہو گیا ہے بڑی بی کوئی جواب بھی نہیں دے سکی تھیں کہ رونے کا شور سن کر میری انتہائی مغلوب الغضب پھٹی نواب بیگم بھی دوڑی ہوئی وہاں آ گئیں۔ اور بے حد غصے کے عالم میں کہنے لگیں بھاڑی میں جائے موا ایسا گیت ارے بڑی بی یہ نہیں دیکھتیں کہ منجھلا کس قدر چہکوں پہکوں رو رہا ہے۔ اے آگ لگے ایسے گیت کو۔ بڑی بی جب یہ ڈانٹ پری تو ان کا لٹا پتادل جو پچاسی برس سے مسلسل دھڑک رہا تھا۔ بری طرح زخمی ہو گیا۔ انہوں نے اپنی بیٹھے ہوئے کنوؤں کی سی خوں بار آنکھیں

لے ہائے تمہارے بغیر برکھا اچھی نہیں لگتی اے میرے کلکتے جانے والے اللہ تمہیں لائے۔ یہ گیت حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی یاد میں کہا گیا تھا۔ اور میرے بچپن

میں جب برسات آتی تھی تو اودھ کی گلی گلی میں یہ گیت گایا اور دھوم سے ماتم کیا جاتا تھا۔ کیا انسانی تاریخ پیش کر سکتی ہے۔ حضرت جان عالم کا سا کوئی محبوب بادشاہ جس پر پون صدی تک اس قدر آنسو بہائے گئے ہوں اے جان عالم فرنگی نے آ کو بھی تباہ کیا۔ اور بدنام بھی۔ آپ جتنے اچھے تھے اتنے ہی برے بنا دیے گئے۔

آسماں را حق بود گر خوں بارو ، بر زمیں  
 اے میرے فرض شناس جفاکش عدالت پناہ فقیر منش بادشاہ اے میرے شرافت  
 سنج ہنر و نکتہ رس علم نواز ارادب پرست شاعر۔ اور اے میرے صبح کے سپاہی و شہریار  
 اور اے میرے شام کے موسیقار فن کار مالک! آپ کے سپہ سالار اور گورنر فقیر محمد خاں  
 گویا کا یہ پر پوتا جوش ملیح آبادی آپ کے آستان عالی پر سر رکھ رہا ہے اس بندہ درگاہ کا  
 ناچیز سلام قبول فرمائیے اے فرشتہ حسلت و مظلوم آقا شاہاں چہ عجب گریہ تو از گدارا!!  
 ۲۷ ہائے بڑی بی بی کی آواز کا درد جب وہ اللہ کہیں تو اللہ کے لام کی آواز کو بلند نہیں  
 ہونے دیتیں اور ایسے دے اور دردناک کھٹکے کے ساتھ اللہ کہتی تھیں کہ گویا وہ اپنے  
 کلیجے سے چبھا ہوا نیزہ نکال رہی ہیں۔

۳۸ ان کو ہم لوگ آپا اور ماماں وغیرہ بنن بی بی کہتی تھی۔ بڑی بی بی کے اس درد دل  
 نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا، سب کی آنکھوں میں بیران جاری ہو گئے میری ماں نے  
 چیخ ماری میری غضب ناک پھٹی کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں دادی جان بھی منہ پر آنچل  
 لے کر رونے لگیں اور گانے والی چھو کر یوں کا تو بڑا حال ہو گیا، اور گھر کا ذرہ ذرہ چیخنے  
 لگا۔ ”اللہ تمہیں لائے ہائے اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے.....“

اٹھائیں اور تھراتی آواز میں کہا بنن بی بی میں سر جھکائے دیتی ہوں چاہو تو مجھ کو  
 آج نہیں تو کل مری بڑھیا کو جی بھر کے مار لو۔ میں تو آدھی سے زیادہ قبر میں اتر چکی  
 ہوں۔ لیکن بنن بی بی ہات جوڑ کر کہتی ہوں زرا انصاف سے کام لو اپنی چھاتی پر ہاتھ  
 رکھ کر سوچو کہ برکھارت مینہ برسائے ار جان عالم پیا کی یاد نہ آئے۔ ہائے قیصر باغ



میں برکھا کے جھولے میں خود دیکھے ہوئے ہوں میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں وہ  
بہاریں..... ہاے میرے جان عالم پیاموئے فرنگیوں نے گلا گھونٹ کر تم کو مار  
ڈالا..... ہائے لکھنوکا سہاگ اجڑ گیا ہائے قیصر باغ کی بارہ دری اندھیرے میں ڈوب  
گئی ہائے شاہ زادیاں ٹھوکریں کھاتی پھر نے لگیں..... اتنا کہہ کر بری بی نے اپنی  
آنکھوں پر دو بارہ پلو رکھ لیا۔ اور رو رو کر گانے لگیں ہائے تمرے بنا ہائے تمرے بنا برکھا  
ناسہائے ناسہائے ارے مورے کلکتے کے جو یا اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے۔“

---



## ہولی

یادش بخیر ایک زمانہ تھا کہ ہولی دوالی فقط ہندوؤں ہی کے نہیں ہمارے بھی تہوار تھے۔ ہولی کھیلنے کا بہت پہلے سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہر سال نئی پچکاریاں بنوائی جاتی تھیں بڑی بڑی دیگوں میں رنگ بھرا جاتا تھا۔ اور ایسی پچکاریاں چلتی تھیں کہ ہم سب کے کپڑے شور بورا اور گھر کے تمام در و بام رنگین ہو جایا کرتے تھے۔

ہولی کھیلنے کی ابتدا یوں ہوتی تھی کہ ہماری رعایا میں سے دس بیس اونچے طبقے کی ہنوعورتیں صبح نو دس بجے ابیر گلال کے جھل جھل تھل تھل سروس پراٹھائے ہمارے گھر میں گاتی ہوئی آتی تھیں۔ میری دادی اور میری ماں کے ماتھوں پر رنگین ٹیکا لگا کر ان دو پٹوں کے پلوؤں پر رنگ چھڑک کر ہماری انگنائی میں حلقہ باندھ کر ہوری آج جلے چاہے کال جلے مورا کنور کنھنا، مو سے آن ملے ہوری آج جل چاہے کال جلے۔ گانا شروع کر دیا کرتی تھیں۔ اور اس گانے کی گونج میں ایسی دھوم سے پچکاریاں چلنے لگتی تھیں کہ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور چراگ بتی پڑتے ہی ملیح آباد کے تمام ہلیارے پوریاں کچوریاں اور مٹھائیاں سروس پراٹھائے گانے بجانے ناچنے اور ہڑک بجاتے ہمارے مردانے احاطے میں نذر کے واسطے آیا کرتے تھے۔ اور بڑی دیر تک بڑا چکلس رہا کرتا تھا۔

ایک دور وہ بھی تھا کہ ہندو مسلم شیر و شکر تھے رام رام اور اسلام علیکم نے آداب عرض کا لباس زیب تن کر لیا تھا۔ کعبہ و کاشی نے ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ کوٹو گنگا کو ملا کر ایک گنگا جمنی عظیم لسانی تہذیبی اور ثقافتی سنگم تعمیر کر دیا گیا تھا مسلمان ہندوؤں کے اور ہندو مسلمانوں کے تہوار (صفحہ ۷ پر)

عام ہلیاروں کے بعد قرب و جوار کے ہندو زمین دار جن میں لالہ صاحب مادھو پور کی شخصیت بہت نمایاں تھی اپنی اپنی رعایا کے ساتھ آتے ان کا گانا سنوارتے اور مٹھائیوں کے تھال پیش کی کرتے تھے۔ اور اس کے بعد ہمارے وہاں ان کی دعوت

ہوتی تھی جس میں ایک دو بجے رات تک طوائفوں کا ناچ گانا ہوتا رہتا تھا۔

## دوالی

دوالی میں ہولی سے زیادہ دھوم دھڑکا ہوا کرتا تھا..... آگن کے ایک گوشے میں برے برے رنگین گھروندے بنائے جاتے تھے۔ ان بلند و خوبصورت گھروندوں کو شیشوں اور چینی کے ٹکڑوں سے سجایا جاتا تھا۔ جن میں مرمرے چڑوے کھٹیاں گئے اور مٹھائی۔ کے حسین اور باریک کھلونے بڑے سلیقے کے ساتھ ہر طرف چن دیے جاتے تھے۔ شام ہوتے ہی پہلے ان گھروندوں اور پھر پورے مکان میں چراغاں کیا جاتا تھا اور ہر گوشہ جگر جگر کرنے لگتا..... اور عین اس وقت جب کہ چراغاں کی پلکیں جھپکاتی روشنی میں خالص گھی کے چراغوں کے رقصاں دھوئیں کی خوش بو ہوا میں تیرنے لگتی۔ عین اس وقت ہمارے بڑے دالان میں ڈھولک پر تھاپ پڑتی تھی اور ڈونیاں اور مراٹھیں گانا شروع کر دیا کرتی تھیں..... آئی دوالی آئی دوالی مدھ ماتى جو بن والی آئی دوالی۔ آئی دوالی۔ آہا سر پر تھالی منہ پر لالی آئی دوالی آئی دوالی جگمگ جگمگ کرتی دیک والی آئی دوالی آئی دوالی آہا ہا۔ آئی دوالی اوہو ہو ہو آئی دوالی ڈھولک دھم دھم پائل چھم چھم بھولی بھالی آئی دوالی آہا ہا۔ آئی دوالی اوہو ہو ہو آئی دوالی۔“

مناتے تھے او ردونوں نے انتہائی وسعت قلب کے ساتھ اپنی اپنی زبانوں میں خربونت کر کے ایک ہندوستان گیر زبان یعنی اردو کی طرح ڈال دی تھی اور آج یہ عالم ہے کہ ہندو مسلمان جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ صدحیف کہ خبیث فرنگی نے جو ہندو مسلم نفرت کا پودا بویا تھا ہم آج اس کے پھل کھا کھا کر پاگل ہو چکے ہیں اور اس قدر پاگل کہ اب ہم ایک دوسرے سے یہ پوچھ بھی نہیں رہے ہیں کہ:

کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ادھر ڈونیوں کا تال سم ادھر مٹھائیوں کی چرندم خوردم..... منہ میں مٹھائی

کانوں میں گیت زبان و گوش دونوں شیرینی میں غرق.....

ایک بار جب ادھر ڈونیاں گارہی تھیں اور ادھر میرے دانتوں کے نیچے مٹھائی کے کھلونے ٹوٹ ٹوٹ کر کرم کرم کی آواز پیدا کر رہے تھے تو ایک بات یاد آ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی تھی۔ اور وہ بات یہ تھی کہ ایک روز جب بڑی دھوم دھام کے ساتھ پانی برس رہا اور بڑے انداز بے پروائی سنک رہی تھی تو میرے ایک ملازم سالک رام حضرت امیر مینائی کا یہ شعر لہک لہک کر گارہے تھے۔

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی  
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ بلبلا جاتا رہا

ابہولی آج جلے یا کل جلے پروا نہیں مگر میرا کنور کنھالی مجھ سے ان ملے جگھر  
ودوں کی تعمیر کا کام ایک ہفتے پیش ر شروع ہو جایا کرتا تھا۔

اس پر میں نے پوچھا تھا کہ سالک رام یہ بلبلا جاتا رہا۔ کیا کہہ رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا تھا بھیا جب ہم بلبلا کہتے ہیں (کہتے ہیں) تو منہ کے اندر بڑا مجا آوت ہے (مزا آتا ہے)۔

سو میرا بھی اس وقت یہی عالم تھا کہ گانا سننے کے ساتھ ساتھ میں جب مٹھائی کے کھلونے میرے منہ میں ٹوٹ ٹوٹ کر گھل رہے تھے تو مجھے اپنے منہ کے اندر بڑا مجا آ رہا تھا۔



## شب برات

شب برات س ایک مہنہ لیش تر ہی لیح آباد کاسب سے بڑا آتش باز جس کو بارود سے ایک ہاتھ اڑ جانے کی بنا پر ٹنڈا آتش باز کہا جاتا تھا۔ ہمارے واسطے آتش بازی تیار کرنا شروع کر دیا کرتا تھا۔ اور شب برات سے دو روز قبل ہی تمام آتش بازی ہمارے گھر میں پہنچ جاتی تھی۔ اور اس کے سارے ساتھ مروانے احاطے کے ایک گوشے میں ایک لمبی چوڑی اور گہری سرنگ کھود کر وہ اس میں بارود بھر دیتا تھا۔ اور سرنگ پر ایک قلعہ تعمیر کر دیتا تھا۔ اور شب رات کے دن غروب کے بعد جب تاریکیوں کا دامن ذرا بوجھل ہو جاتا تھا تو نوکروں چاکروں کی کڑی نگرانی میں کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آجائے..... پھلجھڑیوں گھن چکروں [گولوں، اناروں، پٹاخوں، ہوائیوں ٹونٹوں اور اناروں کی رنگین اور طلسمی جگمگاہٹوں کے ساتھ ساتھ شائیں شائیں غنائیں غنائیں غوں غوں سرسراہٹ دھم دھم دھماک، ترتر تر تراق اور شر شر شر اق سے دور دور تک ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا.....

شروع شروع میں آتش بازی کی روشنی پھیکی پھیکی سی نظر آتی تھی۔ لیکن جب اندھیر بہت زیادہ گاڑھا ہو جاتا تھا تو آتش بازی کا رنگ نکھر اور ابھرا جاتا تھا۔

امیر نے تو یوں کہا تھا وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا۔ کوسا لک رام بلبلا جاتا رہا کہہ رہے تھے آتش بازی اور عقائد میں بلا کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح آتش بازی اور روشنی میں زرد اور پھیکی پھیکی نظر آتی ہے۔ اور تاریکی بڑھ جانے تو اس کا جو بن ابھر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح عقائد علم و فکر کی روشنی میں جھینپے جھینپے اور مدھم مدھم نظر آتے ہیں اور جہل کی تیرگی میں جگمگانے اور مونچھوں پر تاؤ دینے لگتے ہیں۔

اس کے بعد کھانا چن دیا جاتا تھا۔ کھانا وانا کون کھاتا تھا بس ذرا سامنے جھٹال کر ہم لوگ نیاز کے حلوے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

رمضان

جہاں تک کہ روزہ رکھنے کا تعلق ہے۔ رمضان ہمارے گھر آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک کہ افطار کا تعلق ہے رمضان ہمارے گھر میں دھوم دھام سے آتا تھا کہ اور کہیں آتا ہی نہ ہوگا۔ عقائد کے اعتبار سے میرے آباؤ اجداد اس قدر پکے مسلمان تھے کہ تمام دینی انجمنوں کو جی کھول کر ہر ماہ چندے دیا کرتے تھے اور قاسلام کے نام پر تن من دھن قربان کر دینے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ لیکن اعمال کے اعتبار سے رئیس زیادہ اور مسلمان بہت ہی کم تھے..... اور اسی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کے باوجود ہمارے گھر میں دس بارہ قسم کی افطاری پکا رہی جاتی تھی۔ اور ازان سے پیش تر مردانے صحن کے تختوں کے چوکوں پر چن دی جایا کرتی تھی اور کم و بیش سو ڈیڑھ سو اقربا و احباب اور ملازمین ہمارے یہاں روزہ افطار کیا کرتے تھے۔ اقرباء و احباب میں اکثریت ہوتی تھی روزہ خوروں کی البتہ نوے فی صد ملازم روہ رکھتے تھے۔ اور افطار کے بعد شاعری کا محفل گرم ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے سپاہیوں اور خدمت گاروں کے افطار کا انداز ساری دنیا سے نرالا تھا..... ایک بڑی سی چٹائی پر ان کی افطاری چن دی جاتی تھی۔ اور ان کے سامنے کچھواتنبا کو کے چالیں پچاس ڈیڑھ خمے حقے رکھ دیے جاتے تھے۔ اور ان کی پشت پر چھ سات بھشتی بھری ہوئی مشکوں کے ساتھ کھڑے کر دیے جاتے تھے..... اور جب اذان ہوتی تھی تو وہ افطاری کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور حقوں پر ٹوٹ پڑا کرتے تھے اور اس قدر کھینچ کھینچ کر وہ کڑکڑکڑاک کڑکڑکڑاک حقے پیتے تھے کہ بوڑھے تو بورھے جوانوں تک کے گالوں میں گڑھے پڑ جایا کرتے تھے۔ چلموں سے بالشت بالشت بھر کی لوئیں نکلنے لگتی تھیں بسا اوقات چلمیں پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جایا کرتی تھیں ان ے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے اور آخر کار وہ بے ہوش ہو کر گر جایا کرتے تھے اور اس عالم میں بھشتی اپنی اپنی مشکوں کے دہانے کھول کر ان کے منہ پر پانی چھڑکنے لگتے تھے

میرے باپ رمضان بھر میں کبھی پہلا اور کبھی منجھلا روزہ رکھتے تھے۔

میرے لڑکپن میں رمضان گرمیوں میں آیا کرتا تھا اور روزے کے دن میرے باپ سہ پہر تک خس خانے میں سوتے رہتے تھے۔ جس دن ان کا روزہ ہوتا تھا خدا جانے گھر والوں کو کیا کیا تلخ تجربے ہو چکے تھے۔ کہ اس دن صبح شام تک تمام گھر پر ایک دہشت ناک سناٹا چھایا رہتا تھا..... کسی کے منہ سے بھاپ تک نہیں نکلتی تھی اشاروں اشاروں میں باتیں ہوا کرتی تھیں..... اور لونڈیاں باندیاں نیم کے نیچے لگھے لیے کھڑی رہتی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیا اس کی شاخوں پر بیٹھ کر آواز نکالنے لگے۔

---

صرف رمضان کے مہینے میں ان کو میرے باپ کے سامنے حقہ پینے کی اجازت مل جایا کرتی تھی۔

---

## عید

آہا عید..... اللہ اللہ رمضان کی انیسویں تا تیسویں شام..... صبح عید کا پیغام اور رویت ہلال کا اہتمام۔ ایک بلند چبوترے پر گھر کی تمام بیبیاں چاند دیکھنے کی تمنائیں جمع ہو جاتی تھیں اور چاند نظر آتے ہی سب کی سب جھٹ سے آنکھیں بند کر لیتیں اور درود پڑھتیں ہات اٹھا تھا کر زریں دعا میں مانگتیں اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرتیں اور پھر ایک دوسرے کے منہ پر چاند دیکھا کرتی تھیں!

اس رسم کی پشت پر یہ واہمہ تھا کہ چاند دیکھنے کے فوراً بعد جس کے چہرے پر نگاہ پڑ جائے وہ عورت بھاگوان ہو جاتی ہے اور پورا سال خوشی سے گزرے اور اس وقت اگر کوئی بھاگوان عورت موجود نہیں ہوتی تھی تو پھر کسی ہرے بھرے درخت یا پھول پر نگاہ جمالی جاتی تھی یا آرسی میں خود اپنے ہی منہ پر چاند دیکھ لیا جاتا تھا منہ عورتوں کی طرح بچوں کے منہ پر بھی اس واسطے کی بنا پر چاند نہیں دیکھا جاتا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ سلا بھر تک ٹھوکریں کھاتے اور گرتے رہیں گے۔ اگر انیس کا چاند نظر نہ آتا تو اس خیال سے عورتیں افسردہ پڑ جاتیں کہ ہونہ ہو چاند کسی بلا میں پھنس گیا ہے۔ اور جب تیسویں کو نظر آتا تھا تو سب کی سب بڑی سریلی آواز میں یہ کہنے لگتی تھیں کہ آج کی رات کا چاند صاحب کے گریبان میں چھپا آستین سے نکلا، آستین میں چھپا، گریبان سے نکلا۔ جیسے چاند کی بلا ٹلی ویسی ہی سب کی بلا ٹلے آئیں“ (چاند دیکھنے کے فوراً بعد کسی رفیق کے چہرے کی طرف نظر اٹھانے کو) (کسی کے) منہ پر چاند دیکھنا کہتے ہیں) حضرت اکبر الہ آبادی کے اس شعر سے دائن کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد ”عید مبارک عید مبارک“ نے نعروں سے درود یوار گو نچتے چوڑیاں کھنکنے اور چہروں کے رنگ چہکنے لگتے تھے۔ اور مردانے میں گولے چھوٹنے اور بندوقین دغنے لگتی تھیں اور مرد تلواروں میں اپنا منہ دیکھنے لگتے تھے۔ اور دروازے پر نوبت بجنے اور شہنائی کی آوازیں ہوا پر مچلنے لگتی تھیں۔



چاند دیکھ چکنے کے بعد میرے سرہانے کے اسٹول پر سنہری جرنیلی ٹوپی جھمکتا  
ریشمی جوڑا اور پائنتی کے ستول پر روئی کا سا ڈاسن کا چمکیلا جوتہ رکھ دیا جاتا تھا۔

عید کی خوشی میں نیند کسے آتی ہے۔ بس ایک ذرا سی جھپکی سی آتی اور بار بار آنکھ کھل  
جایا کرتی تھی..... بار بار اپنی سنہری ٹوپی کے ایک ایک پھول کو دیکھتا جی میں آتا کہ  
ابھی ٹوپی پہن لوں خیال آتا کہ جھوٹی ہو جائے گی۔ پھر تہ کیے جوڑے پر بری آہستگی  
سے بار بار ہاتھ پھیرتا اکی نرمی کا لمس تمام بدن میں جھرجھری بن کر دوڑ جاتا پھر جوتے  
کی نظر کو پھسلا دینے والی چکنائی پر انگلیاں دوڑاتا۔ اور اس کو سونگھ بھی لیا کرتا تھا۔

اور جب دھند لکے کا چمپئی رنگ فضا پر کروٹیں لے لے کر میرے خون گردش میں  
شریک ہو جاتا تھا۔ تو سینے میں نشا ط کی گھنٹیاں اٹن اٹن اٹن بجنے لگتی تھیں۔ اور میں بستر  
سے جست کر کے انگنائی میں اس طرح آ جاتا تھا کہ جیسے اسپرنگ دار گڈا بیا کا ڈھکن  
کھلتے ہی شن سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

---

بوٹ ڈاسن نے بتایا ہم نے ایک مضمون لکھا

---

ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتہ چل گیا

---

آپ نے کبھی اس مسئلے پر بھی غور کیا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ بچوں کو عید کی  
خوشی کیوں ہوتی ہے۔ مر یا تو نا چیز خیال ہے کہ چوں کہ بچے ماں باپ کی زبان سے  
تو اتر کے ساتھ یہ سنتے رہتے ہیں کہ عید کا دن بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے (صفحہ پر)

ہائے دل میں وہ صبح عید کی دھوئیں انگنائی میں وہ رنگوں کی گھوئیں۔ وہ سقف و بام  
کے قہقہے وہ زمین و آسمان کے چہچہے..... وہ رگ و پے میں خوشی کی سرسراہٹیں وہ سینے  
میں کسی کی اٹھڑی آہٹیں وہ لبوں پر بے اختیار مسکراہٹیں..... وہ فواروں کی سی اچھلتی  
انگلیں وہ ترنگوں کی غزالان رمیدہ کی سی شلنگلیں..... سانس اندر کھینچتا تو جگر تک ٹھنڈ  
ک جاتی اور سانس باہر لاتا تو کڑم کڑم کڑم دھم کی صدا آتی۔

حمام سے بالیدہ روح اور بے وزن جسم کے ساتھ جب نکلتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا

تھا کہ میں کسی مثنوی کا شاہ زادہ گل فام ہوں جس کو پریاں اڑا کر پرستان لے آئی ہیں  
اور تیلیوں کے پروں کی کشتی میں بٹھا کر پنکھڑیوں کے دریا کی سیر کر رہی ہیں۔

عید گاہ جاتا تو خوشی اس حیرت ناک منزل تک پہنچ جاتی کہ عید گاہ کے ملاؤں کے  
ترشے لب اور جلاہوں کی کچی ڈاڑھیاں تک اچھی لگتی تھیں عید گاہ سے پلٹتا تو یہ دیکھتا  
کہ بڑی سریلی آواز میں میرے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے۔ میرے باپ کا دربار  
جما ہوا۔ احاطے میں وہ ہجوم ہے کہ تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں ہے۔ صحن کے ایک  
گوشے میں گوتے پٹھے کے انکر کھے پہنے اور سروں پر گول گول قندیلیں رکھے ہوئے  
چھلب داروں بجا بجا کر

بر تو ایں محفل شاہانہ مبارک باشد

گار ہے ہیں۔ اور چاندی کے ورق سے ڈھکے ہوئے سویوں اور شیر خر مے کے  
تھال حاضرین کے درمیان رکھے ہوئے ہیں۔ اور خاص دان و عطر دان گردش کر رہے  
ہیں، چومرے کی تنباکو کے ہاروں میں لپٹے ہوئے حقوں اور عطر خس کی لپٹوں سے تمام  
احاطہ بھرا ہوا ہے..... اور سپاہی برہنہ تلواریں ہاتھ میں لیے سلامیاں دے کر انعام  
لے رہے ہیں۔

تو اسی حدیث متواتر سے متاثر ہو کر کہ وہ بے سمجھے بوجھے عید کے دن خوشیاں  
منانے لگتے ہیں۔ اور یہ بات صرف عید ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کی بے شمار  
باتیں جن کو ہم حقیقت کبریٰ سمجھے بیٹھے ہیں وہ اسی اجائی پروپیگنڈے کے بطن سے  
پیدا ہوتی ہیں اور ہمارا ایمان بن جایا کرتی تھیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ انسانوں کی ایک  
جماعت کثیر ایمان لے آئے ہوئے ہو ان باتوں پر جو کھوپڑی یعنی فکر پر نہیں فقط  
کانوں یعنی اقوال پر مبنی ہوتی ہے۔ اے بھولے جذباتی انسان تیرے یہ کان تیری  
کھوپڑی پر کب تک حکومت کرتے رہیں گے۔

## بقر عید

اللہ اکبر چلتی چھریوں ترپتے جان داروں اور بہتے خون میں ڈوبا ہوا یہ تہوار..... جب موت کے کوف سے لرزتے اور چیختے بیکس و معصوم بکروں میمنوں و دنبوں اور کچھڑوں کو کان پکڑ پکڑ کر ایک دوسرے کے سامنے ہی بڑی سختی کے ساتھ کھینچا جاتا ہے اور پھر انہیں چت لٹا کر ان کی گردنوں پر انتہائی صالح شقاوت کے ساتھ اللہ کا نام لے لے کر چھری چلائی جاتی ہے خون کا فواہ ان کی گردنوں سے پھوت نکلتا ہے ان کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں اور پھر وہ اپنے ہی خون میں تڑپ تڑپ کر دم توڑنے لگتے ہیں۔ میں لڑکپن میں سوچا کرتا تھا کہ یہ سارا ظلم اللہ میاں کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور پھر بھی وہ ان ظالموں کو کوئی سزا نہیں دے رہے ہیں..... ایک دن ڈرتے ڈرتے میں نے اپنے باپ سے پوچھا تھا میاں ہمارے گھر میں بقر عید کے دن یہ کیا ہونے لگتا ہے؟..... میاں نے آنکھیں نکال کر ارشاد فرمایا تھا کہ خاموش رہو یہ اللہ کا حکم ہے..... اور میں سوچنے لگا تھا کہ میرا اللہ ایسے حکم بھی دیتا ہے۔

ہر چند جہاں تک کہ زبان کے چٹخارے کا تعلق ہے یہ تہوار بڑا ہی لذیذ ہوتا ہے اور ہم کو ان کی ماؤں کے سامنے ذبح ہونے والے حلوانوں کی چوکور بوٹیوں کا پلاؤ خوب گلے ہوئے گوشت سفوف کی حد تک پسے ہوئے بوتیوں کے تیخ کباب اور انگروں پر بھنی ہوئی رانیں کھانا ہے..... مگر کیا کروں جب یہ ساری چیزیں دسترخوان پر آتی تھیں تو زبان کے مزوں کے تصور پر آنکھوں دیکھی لاشوں کا منظر غالب آ جاتا تھا اور میری آنکھیں نم ناک ہو کر رہ جاتی تھیں۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا!

## محرم

اس کو تہوار نہیں مارہ عزا کہنا چاہیے..... میرا پورا خاندان سنی ہے..... ہر چند میرے پردادا ہی کے زمانے سے ہم لوگوں میں شدید قسم کی فضیلتیت راہ پا چکی تھی لیکن میری دادی کے آنے سے پیش تر ہمارے گھر میں عزا داری کا مطلق رواج نہیں تھا۔ اور یہ میری شیعہ دادی تھیں جنہوں نے امام باڑہ تعمیر کرا کے ہمارے گھر میں عزا داری کی طرح ڈالی تھی۔

ہر چند وہ اپنے بچوں کو شیعہ نہیں بنا سکی تھیں پھر بھی انہوں نے ان کو اور ان کے ساتھ گھر کے تمام عورتوں کو حسین کا سوگ وار ضرور بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ خود دارمیاں بھی امام باڑے میں آنے سے سن سن کر آنسو بہانے لگے..... اور انہوں نے پورے گھر کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی تمام بہو بیٹیاں اور مائیں اسیلیں تک زیور بڑھا دیتیں پانے کھانا ترک کر دیتیں اور سیاہ لباس پہن لیا کرتی تھیں۔

ہمارے امام باڑے میں رات کے نو بجے دادی کی قیادت میں ماتم ہوتا تھا۔ جس میں میری ماں بہنیں وغیرہ کے علاوہ ملیح آباد کی شیعہ سیدانیاں ۲ اور مغلانیوں بھی شریک ہوا کرتی تھیں۔

پہلی محرم کا ماتم اس نوے سے شروع ہوتا تھا ”پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے سر پٹو“

اور نویں محرم کے ماتم کا آغاز اس نوے سے ہوتا تھا ”آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے“ اور محرم کی گیارہویں تاریخ کو ہماری ضرتح تین بجے سہ پہر کو اٹھتی تھیں اور اس آخری نوے پر بری پٹس کا ماتم ہوا کرتا تھا ”اے مومنو اٹھاؤ جنازہ حسینؑ کا“۔

۱۔ لالچئی لانگ کتھا چونا اور زردہ ملا کر کھایا جاتا تھا ۲۔ ملیح آباد میں آنے گئے چنے چند شیعہ خاندان بھی تھے۔ ۳۔ لکھنؤ کے مرثیہ خواں جوں کے شرے کے دن ملیح آباد نہیں آ



سکتے تھے اس لیے ہماری ضرب گیارھویں تاریخ کو اٹھائی جاتی تھی۔

اور جب ماتم و شیو کی گونج میں ہم لوگ ضرب کو باہر نکالتے اور زمانے کے آخری پھاٹک کے سامنے بچے ہوئے تخت پر لا کر رکھ دیتے تھے تو لکھن کے ایک مانے ہوئے مرثیہ خواں ضرب کے سامنے سر کھول کر ”جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا“ پڑھتے تو ڈیوڑھی میں خاک نشیں و برہنہ سر خواتین پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ درو دیوار سے رونے کی صدا آتی تھی۔

اس کے بعد کوئی چار بجے ضرب اٹھتی۔ اور بازار سے گزرتی ہوئی رات کے دو یا تین بجے ڈاک بنگلے کے بالمقابل میدان میں ٹھنڈی کر دی جاتی تھی۔ ضرب کے ٹھنڈے کرتے وقت ظہور علی خاں سپاہی کی سرکردگی میں بڑے زور و شور سے حسین حسین کے دروناک نعروں کے ساتھ سینہ زنی ہوا کرتی تھی جس میں مقامی و بیرونی سینکڑوں شیعہ سنی اور ہندو شریک ہوا کرتے تھے۔

اس گیارھویں محرم کے جلوس میں ایک بار جو ایک انقلاب انگیز ہنگامہ برپا ہو گیا تھا وہ بھی سن لیجیے۔

یہ غالباً سنہ ۱۹۱۲ء کی بات ہے کہ ہماری ضرب جب بازار کے چوراہے تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ مولوی عبدالشکور کے چند گرگے ضرب کے سامنے جھنڈا پڑھنا چاہتے ہیں۔ اورو ہمارے خاندان کے کچھ افراد بھی ان کی پشت پناہی پر آمادہ ہیں میں بھی لونڈا تھا یہ سن کر میرا خون کھول گیا۔ اور میں نے بڑے طنطنے سے پکار کر کہا کس کے منہ کے اتنے دانت ہیں کہ وہ ہماری ضرب کے سامنے جھنڈا پڑھے۔ اگر ایسا کوئی سو رہا ہے تو سامنے آئے اور اپنے حمایتیوں کو بھی ساتھ لائے۔

اس فعل کو اس بنا پر بھی جھنڈا کہا جاتا تھا کہ چار سو جھنڈا گڑا ہے چار یا رپاک کا اس کا آغاز ہوتا تھا اور یہ شوشہ چھوڑا تھا فرنگی نے تا کہ شیعہ سنی لڑتے رہیں حکومت نے ایک طرف تو دہلی کے ایک شیعہ مولوی مقبول احمد کو تیرہ بازی اور دوسری طرف لکھنؤ

کے ایک سنی مولو عبدالشکور کو جھنڈا بازی پر مامور کر دیا تھا۔ وہ شیعوں کو تبرے پر اکساتے یہ سینوں کو جھنڈے پر ابھارتے اور اس غداری کے صلے میں دونوں گھر بیٹھے وطن سے کھاتے تھے۔ فرنگی فقط ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو نہیں لڑاتا تھا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے بھی ٹکراتا تھا۔ ادھر آریہ سماجیوں اور سناٹن دھرمیوں ادھر سنیوں اور شیعوں کو ایک دوسرے کی خوں ریزی پر لکرا کرتا تھا۔ ارے فرنگی کا رونا کیوں روئیں اپنے ہی دام کھوٹے ہوں تو پر کھنے والے کو کیا دوش۔ یہ مان لیا کہ وہ لڑواتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم لڑتے کیوں تھے۔

میری اس للکار سے چند افراد کے شانوں میں جنبش پیدا ہو گئی۔ اور غضب کی شکلیں ماتھوں پر ابھر آئیں اور ایک کم روسا آدمی ایک صاحب کا اشارہ پا کر جھنڈا پڑھنے کو ضرتح کے سامنے آ گیا۔ میں نے ابرا کو اشارہ کیا۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کی بوکڑ کی سی داڑھی پکڑ لی اور اس کے کالے سے منہ پر تراق سے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

اس کے حملتیوں میں کھلبلی مچ گئی اور شور برپا ہو گیا کہ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ کہ اتنے میں عالم گیر پھپھا جن کی دور دور تک دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ مجمع کو چیرتے ہوئے ضرتح کے سامنے آ گئے انہوں نے اپنے ڈنڈے کو زمین پر کھٹکھٹا کر کہا۔ آپ لوگ لڑکوں سے جھگڑا کر رہے ہیں بشیر احمد خاں (میرے باپ) کے پاس جائے ضرتح ان کی ہے وہ اگر اجازت دے دیں تو جھنڈا پڑھے۔ لوگوں نے پھپھا کی بات مان لی۔ اور سیدھے میرے باپ کے پاس چلے گئے۔

تھوڑی دیر میرے باپ نے سپاہی بھیج کر جب مجھے طلب فرمایا تو میں نے ضرتح کے ارد گرد سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ جب تک میں نہ آ جاؤں ضرتح یہاں سے جنبش نہ کرے اور کسی کو جھنڈا پڑھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اپنے باپ کی جناب میں سر جھکائے پہنچ گیا۔

انہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم نے جھنڈا روک دیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں میاں! انہوں نے فرمایا کیوں؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ میاں پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے حسین آباد سکول کے ہم جماعت شیعہ لڑکے میرے بلانے سے یہاں شریک ہونے آرہے ہیں اگر ان کے منہ پر جھنڈا پڑھا گیا تو ان مہمانوں کی دل شکنی ہو گی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ دادی جان شیعہ ہیں جب وہ سنیں گی کہ ان کی ضرتح کے سامنے جھنڈا بازی ہوئی ہے تو ان کے دل کو دھکا لگے گا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ میاں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ امام حسینؑ کی شہادت سے جھنڈے کا کیا تعلق ہے۔ جنازے کے ساتھ رونا پیٹنا ہوتا ہے یا لوگوں کی تعریف کے جھنڈے پڑھے جاتے ہیں؟

میاں نے سیدھے ہو کر ان لوگوں کے چہروں کی جانب نگاہ اٹھائی جو میری شکایت لے کر آئے تھے۔ اور مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا شبیر تم معقول بات کہہ رہے ہو۔ یہ فرما کر میاں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اٹھتے ہی تمام حاضرین اور سپاہی بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے نکلتے ہی ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ ایسا کون ساونت ہے جو ضرتح کے سامنے کھڑا ہو کر جھنڈا پڑھنے کی جسارت کر سکے۔

اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ میرے باپ کے سامنے جھنڈا پڑھتا..... جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جھنڈا تو نہیں پڑھا جاسکا لیکن میری رافضیت جھنڈے پر چڑھ گئی..... اور پیش خیمہ بن گئی میرے تنہی نکاح کے مقدمے کا جس کا ذکر آگے آئے گا۔



## لکھنؤ کا پہلا سفر

لکھنؤ جانے کے واسطے جب ہم سب ایلیچ آباد اسٹیشن پر پہنچے۔ ریلوے کے عملے میں ہلچل مچ گئی۔ اسٹیشن ماسٹر دوڑا آیا میرے باپ کو جھک کر سلام کیا اور ویٹنگ روم نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر کرسیاں بنچیں اور سٹول رکھ دیے گئے اور ہم سب حسب مرتبہ ان پر بیٹھ کر ریل کا انتظار کرنے لگے۔

گاڑی کا انتظار الامان والحفیظ ایک ایک دقیقے میں لاکھوں صدیوں کا فشار اعصاب میں رہ رہ کر اٹھن سی ہو رہی تھی۔ کوئی متھے ڈال رہا تھا کلیجے کو۔ جدھر سے گاری آنے والی تھادھر گھبرا گھبرا کر دیکھتا۔ بار بار مشیر احمد خاں سے پوچھتا اب گاڑی کب آئے گی اور وہ مسکرا ہر بار جواب دیتے کہ بس ابھی رہی ہے۔ میں بھی اوبھ رہا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے ایک بنگالی ملازم نے ٹن ٹن ٹن گھنٹی بجا کر نعرہ مارا کہ رجیم سے آباد سے گاری چھوڑا..... میں نے مشیر خان سے پوچھا یہ گاڑی چھوڑا کیا کہہ رہا ہے۔ انہوں نے ہنس کر کہا کہ یہ آدمی بنگالی ہے۔ بنگالی اسی طرح بولتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اب گاڑی میں کتنی دیر ہے انہوں نے کہا کہ بس پانچ منٹ کی دیر ہے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

۱۔ میرے باپ کے ہمسفر تھے مشیر احمد خاں رام پوری عبدالغفور خاں صفدر حسین خاں بنی احمد خاں، محمد متیم خان داروغہ شیخ امید علی، سپاہیوں میں محمد شیر خاں، صالح محمد خاں میرزا ایوب بیگ ابو خاں، نجو خاں دو تین خدمت گار اور ایک باورچی ۲۔ پرانے لوگ ریل کے وقت سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہی اسٹیشن پر آ جایا کرتے تھے ۳۔ ایلیچ آباد اور سندیلے کے درمیان کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک اسٹیشن ہے۔

تھوڑی دیر میں دیکھا کہ گاڑی کمر پچکاتی اور دھواں اڑاتی گھر گھر گھر چلی آ رہی ہے مجھے اس کے دھوئیں میں گلستاں سے ناچتے نظر آنے لگیا اور جب وہ عین پلیٹ فارم سے دھن دھن دھڑ دھڑ دھڑ کرتی گزرنے لگی تو پلیٹ فارم تھرانے لگا



پلیٹ فارم کی تھر تھراہت میرے خون میں دور نے لگی۔ ارد گرد کے ذرے اچھلنے کو دے لگے۔ اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جب ہم سب اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے گاڑی نے جھنڈی ہلائی اس کی جھنڈی کو دیکھ کر میری امنگیں کروانا چنے لگیں۔ جھنڈی ہلا کر گاڑی نے سیٹی بجائی ہائے کیا سریلی سیٹی تھی۔ اس کے جواب میں انجن نے سیٹی دی۔ چوں چوں کے ساتھ پہیوں میں ہرکت ہوئی اور گاڑی بڑے ٹھے کے ساتھ چلنے لگی۔ چھک چھک چھک..... اور دل سے آواز آنے لگی کہ بھک بھک بھک..... اور جب گاری کی رفتار میں تیزی آگئی تو ہوا کے ٹھنڈے جھونکے میرے چہرے سے یوں ٹکرانے لگے کہ میرے دل میں ایک انوکھا سرور سرسرا نے لگا۔ اور جب رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ تو پٹری کے کھمبے اور آموں کے باگ گھومنے جھومنے اور ناچنے لگے۔ اور پٹری کے نیچے کی نالی اس قدر تیزی سے دوڑنے لگی کہ گویا ریل سے ریس کر رہی ہے۔ یہ سماں دیکھ کر میرے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی میں زیر لب گنگنا نے لگا چھک چھک چھک چھک گانے دو گانے دو۔ چھک چھک چھک چھک جانے دو، جانے دو، بھی جانے دو۔ آہا ہا گانے دو اوہ اوہ ہو جانے دو!

اور جب گاڑی کا کوری کے پل سے گرم گرم گرم کرتی گزرنے لگی تو میرے دانتوں کے نیچے دوالی کی مٹھائی کے کھلونے ٹوٹنے لگے کرم کرم کرم..... ملیح آباد اور لکھنؤ کے مابین فاصلہ ہی کیا ہے لے دے کر صرف تیرہ میل اور اس قرب کی بنا پر ہماری گاڑی سینکڑوں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار کے درمیان گھڑم گھڑم شائیں شائیں کرتی اور صد ہا لائن بدلنے والی اتصالی پٹریوں کو تچ تچا ک کچھ کچھ کچھ اور کٹ کٹ کٹا کٹا کٹا اور تراشتی ہوئی کوئی تیس منٹ کے اندر ہی چار باغ لکھنؤ جنشن پہنچ گئی.....

---

اوہ میرے آغاز شاعری کا اولین لمحہ تھا۔

الامان الحفیظ! چار باگ کی طوفان بدوش قیامت در آغوش ہلچل گہما گہما دھکا پیل  
 افراتفری نفسی نفسی چیخ پکار گاؤں گہرا لہر ہٹیں [گہرا ہٹیں، ریل پیل، شائیں شائیں  
 غائیں غائیں دھڑام دھڑام اور ڈھوم ڈھوم ڈھائیں ڈھائیں..... پھر اس پر دوڑتے  
 ٹھیلوں کی جگر فراش گھر گھڑا ہتیں قلیوں کی قلی قلی کے نعروں کے ساتھ لنکوری جستیں  
 بدحواس مسافروں کے ارائے خوانچے والوں کا شور و غوغا ٹکٹ چکروں پولیس والوں،  
 ریلوے افسروں بوجھاٹھائے قلیوں، اور بچوں کو کاندھوں پر بٹھائے بدحواس مسافروں  
 کے مابین دھکم دھکا شننگ کے دھماکے ہزاروں سیٹیوں کی آوازیں دھویں کے لچھے لچھو  
 ں میں گھسے ہوئے تر پتر پر زوں اور جلے ہوئے تیل کی بدبو فرنگیوں کے چھچھورے غرور  
 میں ڈھلے ہوئے روکھے پھکے چنگیزی چہرے اور میموں کی سایہ شاخ گل میں پلی ہوئی  
 چھلاسی کمریں..... میں تو دیوانہ ہو گیا پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی فرنگیوں کی اکڑفوں  
 دیکھتا تھا تو میری ٹھنولی کی زبان پر موٹی سی گالی آ جاتی تھی اور میموں کی طرف نگاہ  
 اٹھاتا تھا تو میرے ننھے سے شاعر کے منہ سے ”ہائے جانی“ نکل جاتا تھا۔

اور جب سٹیشن کا شور و نسل حواس پر دباؤ ڈالتا تھا تو میموں کی کمریں نگاہوں سے  
 اوجھل ہو جاتیں اور دہشت تیرا احاطہ کر لیتی تھی۔ اور میرا عالم کہ یا راں فراموش کردند  
 عشق کا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ میں ابھی اس شیرانگن شور و غوغا اور اس حرارت شکن بھیڑ  
 بھار میں گھرا ہوا کھڑا تھا کہ مشیر احمد خاں نے دوڑ کر میری انگلی پکڑ لی۔ اور ہمارا قافلہ  
 اپنے سپاہیوں کے سنگین حلقے میں باہر جانے کے واسطے ریگنے لگا۔ ہم بھی چند قدم ہی  
 چلے ہوں گے کہ حامد علی خاں بیرسٹر دوڑ کر میرے باپ سے ہم آغوش ہو گئے.....

تعجب نہ فرمائیں قاری صاحب یہ سب اور ہائے جانی کا ولولہ جی ہاں خاک سار  
 مادر زاد عاشق تھا۔

۲۔ امر ہے کے باشندے ہونے کے باوجود ایک مخلص انسان تھے۔

اتنے میں ایک نہایت چمکیلے سائن بورڈ نے میری آنکھوں میں زنجیر ڈال دی۔

میں نظر جما کر اسے دیکھنے لگا۔ باپ سے کہا میاں ہم کو یہ بوتل لے دیجیے..... میاں انگریزی نہیں جانتے تھے انہوں نے خالد علی خاں سے پوچھا یہ کس چیز کا اشتہار ہے انہوں نے زوردار قہقہہ مار کر کہا ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مبارک ہو خاں صاحب کہ صاحب زادے بفضل خدا ابھی سے شراب کی بوتل مانگ رہے ہیں۔!

الغرض بصد ہزار دشواری ہم باہر آئے۔ ہم لوگ متعدد گھوڑا گاڑیوں اور ملازمین اکوٹ میں اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہو گئے..... میاں کی گاڑی میں مشیر احمد خاں تھے اور میں میاں سمنے کی سیٹ پر اور ہم دونوں کوچ وان کی طرف کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

چلم کی آگ سے مجھے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ مگر لکھنؤ آنے کی خوشی میں اس قدر فراوانی تھی کہ مجھ کو اس تکلیف میں بھی مزا آ رہا تھا۔ اور جب سڑک کے نشیب و فراز سے لوٹے پر ڈھکا ہوا کٹورا کھنکھنا اٹھتا تھا تو میرے دل میں گھنگھرو سے بجنے لگتے تھے۔

جب ہماری گاڑی عیش باغ کے موڑ سے گزرنے لگی تو سامنے کو ایک بہت بڑے تالاب کو دیکھ کر میں نے پوچھا میاں اگر ہم اس میں کود پڑیں تو کیا ڈوب جائیں گے؟ یہ سنتا تھا کہ ان کے چہرے کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا۔ اور فرمایا بیٹا بد شگون کی بات کبھی زبان پر نہ لانا چاہیے۔ اللہ تمہاری عمر دراز سے کرے۔ اب ہماری گاری اکبری دروازے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور ہمارا سامان بانس والی سرائے میں جانے لگا۔ اور باپ لکھنؤ ہمارے افغانی خط و خال ہمارے قد و قامت ہمارے سپاہیوں کی سبج دھج ان کے بڑے بڑے پکڑ ان کے موٹ موٹے لٹھ دیکھنے کے لیے ٹھٹ لگا کر ہمارے گرد و پیش جمع ہو گئے۔

! اور کیوں نہ مانگتا مجھے دیکھ کر کہتی تھی میری دایا یہ لڑکا طرح دار پیدا ہوا ہے۔

ہائے کم بخت حافظ نے کیا خوب کہا ہے۔

دوش دیدم کہ ملائک درمے خانہی زند

اس بد شگونى كے باعث ميرے صدقہ اتارا گيا سہ ميائں كاش آپ كى دعا قبول نہ ہوتى اور ميں جوانى ہى ميں رخصت ہو جاتا۔ آپ خوش سمت تھے كہ آپ كو جوانى ہى ميں موت آگئى ميں بدنصيب ہوں كہ بوڑھا ہو كر بے شمار روح فرسايا دوں كا كا ڈسا اوہ زندگى كے تپتے ريگستان ميں پڑا۔ ايك مدت سے ايڑياں رگڑ رہا ہوں اور ميرى ناقدر شاح سوم ميرے احاطہ وجود كے گرد اسحاف فيل كے مانند گھيرا ڈالے پڑى ہوئى ہے۔ ليكن اے قوت و حيات كے مالك ميرے اصحاب فيل كو حملہ ابابيل سے محفوظ ركھنا كہ يہ سراسر نادان ہيں سچوك كے ايك دروازے كا نام۔

ميں نے اكبرى دروازے ميں جيسے ہى قدم ركھا تو يہ ديكا كہ اس چوڑے چكّے دروازے كے دائيں بائیں لكڑى كے تختوں پر مٹى كے اس قدر سجل حسين سبك اور نازك كھلونے اوپر تلے ركھے ہوئے ہيں كہ بايد و شايد..... انہيں ديكا كہ يہ خيال ہونے لگا كہ قريب جاؤں گا تو ہر كھلونا پلكيں جھپكانے اور باتيں كرنے لگے گا۔ اور كجريا بھاؤ بتانے لگے گى۔ اور سقوں كو اگر ذرا سا بھى چھوليا تو ان كى بھرى مشكوں سے دھل دھل پانى مچھيے جائے گا۔

كھلونے خريد كر جب ميں نے چوك ميں قدم ركھا تو عوداگر اور لوبان كى لپٹوں نے ميرے استقبال كيا۔ آگے بڑھا تو سونے چاندى كے ورق كٹنے كى نپى تلى كٹا كٹ نے ميرے پاؤں ميں زنجير ڈال دى۔ وہ مرتب و منظم كٹا كٹ ايسى معلوم ہوئى كہ گويا طبلے پر بول كٹ رہے ہيں۔ پھر ہاروالے كى سريلى آواز آئى ”ہار..... بيلے كے پھول چمپا كے“ وہاں سے آگے بڑھا تو كيا بتاؤں كيا كيا ديكا۔ ہائے تنبوليوں كى وہ جھلجھلتى تترى كلا ہيں وہ دپلى ٹوپياں وہ شرتى انگر كھے وہ گھنے گھنے پٹے..... وہ چوڑى دار پانچا مے شانوں پر وہ ريشمى بڑے بڑے رومال آڑھى تر چھى مانگيں۔ كلوں ميں دہلى ہوئى معطر گلورياں ساقيوں اور ساقنوں كے ہاتھوں ميں وہ خوشبودار تنباكو كے حق حقوں



اے وہ سرائے جواب ڈھادی جا چکی ہے لکھنؤ کی درجہ اول کی پختہ اور صاف ستھری سرائے تھی۔ جس کے تین بالائی کمروں کو میرے باپ نے مستقل کرایے پر لے کر ریز رو کر لیا اور وہاں ایک چوکیدار کو مامور فرما دیا تھا۔ اس وقت تک لکھنؤ میں برٹش اور امپیریل ہوٹل کے سوا اور کوئی ہوٹل تھا ہی نہیں۔ اور چوں کہ وہ دونوں ہوٹل بدنام تھے کہ وہاں شراب پی جاتی ہے اور سو رکی چربی کا کھان کھایا جاتا ہے اس بنا پر قرب جوار کی تمام شرفا کی طرح میرے باپ بھی ان ہوٹلوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

اب رہا احباب کے وہاں قیام کا مسئلہ سو میرے باپ کے ساتھ چوں کہ ایک لاؤ اشکر لکھنؤ آیا کرتا تھا۔ اس لیے وہ کسی دوست پر اس قدر بار ڈالنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

۲۔ اب نہ وہ قدر دان ہیں نہ وہ کاری گر اور نہ وہ کھلونے لٹ گئی ساری بہار۔

وہ لپٹے ہار ہاروں سے پانی کے قطروں کا وہ ترشحہ بچتے کٹورے وہ سارنگیوں کی تھر تھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے وہ گمکتے ہوئے طبلے بالا خانوں کے چھجوں سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی۔ اور زلفوں کے گرتے ہوئے سیاہ آبشار کو ٹھے والیوں میں کوئی گوری کوئی چمپئی اور کوئی سانولی سلونی..... خدو خال اس قدر باریک گویا کہ ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے کوئی کڑیل جوان کوئی نوجوان اور کوئی ان دونوں کے درمیان گویا ہمکتی ہوئی اٹھان کوئی گٹھے جسم کی اور کوئی دھان پان..... کسی کی ناک میں نتھ کسی کی ناک میں نیم کا تنکا..... تماشا نیوں کا ہجوم شانے سے شانے پھلتے رہے۔ اور کوٹھوں پر نظر جمائے ہوئے مخالف سمتوں سے آنے جانے والوں کے سینوں کا ٹکراؤ اور ٹکراؤ پر وہ عذر خواہیاں میں ابھی اس دریائے ظلم میں غوطے کھا رہا تھا کہ مشیر خاں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ میں ساحل پر آ گیا..... سارا ظلم

ٹوٹ گیا۔ اور میں سب کے ساتھ میاں کے پیچھے پیچھے سر جھکا کر سرائے پر آ گیا۔ سرائے میں قدم رکھتے ہی دم سا گھٹنے لگا۔ میں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ میاں ہم سپاہیوں..... کو ساتھ لے کر نیچے گھوم آئیں؟ مشیر خاں مسکرائے اور میاں نے بڑی خوف آمیز سنجیدگی سے کہا چوک بچوں کے ٹہلنے کی جگہ نہیں ہے۔ میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

اتنے میں صالح محمد خاں ڈھورے لے ساتھ لیے آ گئے۔ اس نے جست کی بڑی بڑی قفلوں کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر ماہرانہ انداز سے گھما گھما کر اور بالائی کے کاغذی آب خوروں کو مٹی کی سوندھی سوندھی رکابیوں میں کھول کھول کر پیش کیا۔ اور مٹی کے کورے کورے چمچے بھی سامنے رکھ دیے..... کیا بتاؤں ان قفلوں اور ان آب خوروں کی لذت و ملائمت زبان نے اس سے پیش تر کبھی کوئی ایسی چیز چکھی ہی نہیں تھی۔ ان کے مزے کو بیان کروں تو کیونکر اور تشبیہ دوں تو کس سے..... اور ملائمت کا تو یہ عالم تھا کہ ان کو صرف ہونٹوں اور تالو سے کھایا اور نظر کی حرارت سے پگھلایا جاسکتا تھا۔ رات ہوتے ہی ہمارے باورچی کے پکائے ہوئے کھانوں کے ساتھ ساتھ۔

لکھنؤ کا سب سے بہتر قفلی والا جو لیفٹیننٹ گورنر تک کی پارٹیوں میں بلایا جاتا تھا۔

عبداللہ کی دکان کی پوریاں کچوریاں احمد کی باقر خوانیاں سعادت کی شیرمالیں شہزادی کے اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پر اٹھے جھمن رکاب دار کے بھنے ہوئے مرگ شاہد کا بیروں کا پلاؤ حیدر حسین خاں کے پھانک کی گلی کا انناس کا مزعزر غلام حسین خاں کے پل کے کباب، کپتان کے کنویں کے پستے بادام کی مٹھائی، اور حسین آباد کی بالائی اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں ہمارے دسترخوان پر چن دی گئیں..... اور میں کھاپی کر سو رہا۔ بھور درشن کی چاٹ تو پڑ ہی چکی تھی۔ میں سب سے پہلے بیدار ہو کر بالا خانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ صبح کا استقبال کرنے کو جب آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو شہر کی

اونچی اونچی عمارتوں کے باعث طلوع کی رنگینی دور دور بھی نظر نہیں آئی۔ آنکھیں مرجھا گئیں میں نے دیکھا تو پو ضرور پھٹ رہی ہے۔ ورم مرغ بھی بانگ دے دے ہیں لیکن پو پھٹنے میں سہانا پن ہے اور نہ مرغوں کی بانگ میں توانائی..... زمین سے آسمان تک ایک پھیکا پن چھایا ہوا ہے۔ سانس لیتا ہوں تو دھانس بھری موٹی موٹی ہوا، سینے کو کھرچ اور دل رپ بوجھ ڈال رہی ہے۔ نسیم صبح چل رہی ہے مگر اس کے جھونکوں میں بالکل دھار ہی نہیں ہے۔ عروس قدرت کے پاؤں میں نہ چاندی کے گھنگھرو ہیں نہ سر پر چھپکا۔ میرے ولولے ایسی ملگجی ملگجی کھوئی کھوئی پھیلکی پھیلکی، ابلی ابلی، سیٹی سیٹی، روڑھی روڑھی، اوندھی اوندھی، گونگی گونگی، بھنجی بھنجی اور بھنجی بھنجی سی صبح کو دیکھ کر گل ہو گئے اور دھواں دینے لگے۔ اور میں اس نامراد عاشق کی طرح جس کا معشوق اس کو دغا دے کر غائب ہو گیا ہو بھاری دل کے ساتھ نیچے آیا اور منہ ہاتھ دھونے لگا..... منہ پر بار بار چھپکے مارے دل کی کلی نہیں کھلی۔

اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ روغنی روٹی انڈوں کے ستارے بالائی شیرمال اور نمش کا ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو میرے باپ نے دو سپاہیوں اور مشیر خاں کو ساتھ کر کے مجھے لکھنؤ کی سیر کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

میں نے لکھنؤ کے ہفتے عشرے کے قیام میں مندرجہ ذیل مقامات دیکھے۔ حسین آباد کی شاہی کوٹھی، اس کا کلاک تاوڑ، حسین آباد کا امام باڑہ، اس کی بھول بھلیاں، آصف الدولہ کا امام باڑہ، رومی دروازہ، حضرت عباس کی درگاہ، نجف اشرف، تال کٹورے اور بھول کٹورے کی کربلائیں، بلی گارو، عجائب خانہ شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد، شاہ مینا کا مزار اور موتی محل، حضرت گنج، چنیا بازار، میں آباد، گومتی ٹھنڈی سڑک، لوہے کا پل، لال باغ، سکندر باغ، بندریا باغ، کٹوریہ باغ اور بنارس باغ، اور چھتر منزل کا فقط وہ حصہ جو سڑکوں سے نظر آتا ہے۔ ہر چند میری لڑکپن کی نگاہوں میں یہ تمام مقامات بڑے عجیب تھے..... لیکن ان تمام عجیب مقامات سے بمراحل عجیب تر

نظر آئے لکھنؤ کے وہ روسا علماء ادباء اور شرفاء اور شعراء جو میرے باپ کے پاس آتے جاتے تھے یا وہ ان کے وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ وہ ان کے لچیلے سلام وہ انکی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز وہ انکی تہذیب میں ڈوبی وضع و قطع وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش وہ مسال علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ وہ ان کے لہجوں کے کٹاؤ، اثنائے غزل خوانی میں وہ حسب مفہوم شعر ان کی آنکھوں کا رنگ ان کے چہروں کا اتار چڑھاؤ۔ وہ قہقہوں سے دامن کش ان کا ہلکا ہلکا تبسم وہ ان کا انکسار کے سانچے میں ڈھلا ہوا وقار اور باوجود کمال وہ ان کا ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی چیچ مدنی کا اعتراف یہ ساری باتیں دیکھ کر میں نقش بدیوار ہو کر رہ گیا..... وہ تمام لوگ اس قدر شائستہ شستہ اور گداختہ تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرہ خاک کے نہیں کسی کرہ نور کے باشندے ہیں۔

انہیں بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر کے میں نے شائستگی سیکھی ادب اور زبان میں نظر پیدا کی اور یہ ذرا سی شد بد جو آج مجھے ادب و زبان پر حاصل ہے یہ انہیں کی صحبت کا اثر ہے۔

اب وہ لکھنؤ ہے نہ لکھنؤ والے۔ ایک ایک کر کے چلے گئے سب خاک کے نیچے کھا گئی مٹی ان کے جوہروں کو۔ بہت دن ہوئے میں نے ایک رباعی کہی تھی۔

جلتی	ہوئی	شمعوں	کے	بجھانے	والے
جیتا	نہیں	چھوڑیں	گے	زمانے	والے
لاش	دہلی	پہ	لکھنؤ	نے	یہ
اب	ہم	بھی	ہیں	کچھ	روز
				میں	آنے
				والے	

۱۔ وہ عمارت جس میں بلی صاحب نے پناہ لی تھی اور ۱۸۵۷ء کی سپاہ نے اس کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

۲۔ اس وقت امین آباد کا پارک معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔



سو جو میں نے کہا تھا وہی ہو گیا۔ گزشتہ سال جب میں لکھنؤ گیا تو لکھنؤ کی اداسی دیکھ کر دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں..... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ کوئی جانی پہچانی صورت نظر نہیں آئی۔ اور ان کی جگہ ی دیکھا کہ ناتراشیدہ کندوں کے سے کھر درے اور تنکو نے چہروں کے وحشی افراد بار بار اپنے الجھے ہوئے بال کھجاتے اور دائیں بائیں گھومتے چلے آ رہے ہیں..... نہ وہ شان دار فتنیں ہیں نہ عمدہ قدم کی بند گھوڑا گاڑیاں نہ اعلیٰ درجے کے تانگے..... لے دے کر چند گھٹیا قسم کے اکے اور بے رنگ و روغن کے چوں چوں کرتے تانگے ہیں جن میں گھوڑوں کے عوض چوہے جتے ہوئے ہیں اور چند کھڑکھڑ کرتی رکشائیں ہیں۔ جن کو نہ جانے کس سرزمین کے ہوش لوٹے چلا رہے ہیں۔ اور وہ تمام اس قدر ذلیل ہیں کہ ان پر اگر سکندر اعظم کو بٹھا دیا جائے تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کا بھڑوانظر آنے لگے۔

سہ پہر کے وقت نخاس لگیا۔ نخاس کی وہ سرک جو لکھنؤی تہذیب کا گہوارہ تھی۔ اداس اداس نظر آئی۔ حکیم صاحب عالم کے مطب کے بالا خانے کی طرف نگاہ اٹھائی جیسے دل پر کسی نے گھونسا مار دیا ایک ایک کر کے وہ تمام یارانِ جشن آنکھوں سے گزرنے لگے..... جنھوں نے وہاں میرے ساتھ راتیں جگائیں اور دھوئیں مچائی تھیں..... اور دیکھا کہ یگانہ چنگیزی، حکیم صاحب عالم، مجاز، حکیم مخمور، اور عطا حسین قزلباش کفن اور ہسے زینے سے اترے چلے آ رہے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے آنسو پونچھتا بانس والی سرائے کی جانب مڑا۔..... پرانی یادیں سرپٹنے لگیں۔ اور جب اس نئی سڑک سے گزر کر جو سرائے کو شہید کر کے اس کی قبر پر بنائی گئی تھی چوک میں قدم رکھا تو کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

کوتاہ اندیش معلمان اخلاق کے اجاڑے ہوئے چوک نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے سلام کیا۔ ہائے وہ چوک جو شبستان رنگ و بو تھا اب بھائیں بھائیں کر رہا

ہے۔ جن کمروں میں پریاں رہتی تھیں کالے دیوؤں کو وہاں آباد کر دیا گیا ہے۔ جو فضا سارے گاما کے جھولوں میں جھولا کرتی تھی۔ اب اس پر ”اے پائی (اے بھائی) جلد ہر سنگھا“ اور اے ہاتج (حافظ) کھدائی بکس (خدا بخش) کے نعروں کو سوار کر دیا گیا ہے۔ ہائے جن چھجوں پر زلفیں لہرایا کرتی تھیں وہاں داڑھے پھٹکارے جا رہے ہیں۔ جہاں طبلے گمکتے ہیں وہاں خار شے کتے بھونک رہے ہیں۔ اور جہاں چاندنی رہا کرتی تھی وہاں دھوپ بسادہی گئی ہے۔

۱۔ حقیقی لکھنؤ نخاس تک ہے۔ امین آباد اور حضرت گنج والوں کو بیرونی سمجھا جاتا ہے۔

### ایک جملہ معترضہ

اس کج اندیش دور میں ہر طرف ایک شور برپا ہے کہ نکال دو، شہر سے طوائفوں کو، مسمار کر ڈالو مے خانوں کو اور اجار کر رکھ دو شہستانوں کو..... اور یہ فتنہ اٹھایا ہوا ہے مہاتما گاندھی کا بے شک گاندھی جی میں تمام خوبیاں تھیں۔ وہ ہندوستان کے عظیم محسن اور سب سے بڑے دوست تھے..... لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انسانی شادمانی کے بدترین دشمن تھے۔

انہوں نے جب بازار حسن و خرابات مغاں کے خلاف غیر عاقلانہ آواز اٹھائی اور انسانی مسرتوں کا گلا گھونٹ دینے کی مجرمانہ تحریک چلائی تو لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر دوڑ پڑے۔ ان کی آواز پر وہ تمام گریدگان اخلاق تختہ نشین کرام جو قطعی طور پر توفیق گناہ سے یکسر محروم تھے اور جن کے دلوں میں اس بات کی لگن لگی ہوئی تھی کہ وہ صالحین کا روپ بھر بھر کر گاندھی جی کو رجھائیں۔ جاہل عوام کے ووت اڑائیں اقتدار کی گدیوں پر براجمان ہو جائیں اور دولت کے دریا میں غوطے لگائیں۔

نیک نفس مہاتما اور ان کے ہوس پرور چیلوں کی سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آئی کہ مسرت کی تمنا اور حسن کی آرزو، نوع انسانی کی جبلت میں داخل ہے۔ اور فطرت نے

تولید و تناسل کا سلسلہ قائم رکھنے کے واسطے انسانی جوانی کو مست و سرشار رہنے اور بوس و کنار کی موجوں میں بہنے پر اس استحکام کے ساتھ مامور و مجبور کر دیا ہے کہ اگر تمام قوائے کائنات خم ٹھونک کر اس کے سامنے آجائیں تو وہ لنگڑی مار کر انہیں چاروں شانے چیت گرتا ہوا آگے بڑھ جائے۔

نوع انسانی کے اس جلی میلان مسکرات و مستورات کے ہونکتے ہوئے طوفانی دریا پر بندھ باندھنے کے ارادے سے اس دنیا میں کتنے اولیا اور اوصیاء اقطاب ابدال، امام اوتاد اور انبیاء..... کتنے معلم، مجدد، مفسر، مجتہد، متقن، مبلغ، محتسب مصلح اور ملا اور کتنے پادری پاپا، پوپ، پروٹ پینڈت، پانڈے، پوگی، پیر اور پیغام بر..... ازل سے لے کر آج تک آچکے ہیں۔ لیک تاریخ انسانی شہادت دے رہی ہے کہ جس نے بھی انسان کے اس بے پایاں تند و شدید ولولے سے ٹکر لی ہے خود اس کا ماتھا لہو لہان ہو کر رہ گیا ہے۔ آسمان کی ڈاٹ کے نیچے یہ آواز بڑے طنطنے کے ساتھ آج بھی گونج رہی ہے کہ

ہاں سلسلہ جام و سبو جاری ہے  
اب تک وہی شغل ہاؤ ہو جاری ہے  
کھائی ہے کچھ انسان سے فکر ایسی  
ادیان کے ماتھے سے لہو جاری ہے  
اور تمام مصلحین کرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان آج بھی یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ

مرا مہر سیہ پشماں زمر بیروں نہ خواہد شد  
قضائے آسمان است این و دیگر گوں نہ خواہد شد  
اور جب یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ اس جذبہ قوی کا فنا کر دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اور کیوں نہ باہر ہو جب کہ حامیاں ادیان سے لے کر مسجد کے نابینا حافظ جی تک بفضلہ اس چوں خلوت می روند کے کاروبار میں ازل کے دن سے آج تک

مشغول ہیں۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے یا اس پر چند قیود عائد کر دیے جائیں؟ چوں کہ آدمی ابھی تک حیوانی سطح سے فقط ایک باشت بلند ہوا ہے اس لیے ہم اپنے کو اس امر پر مجبور پاتے ہیں کہ جب تک نوع انسانی بالغ نہ ہو جائے۔ اس جذبے پر چند قیود ضرور عائد کر دی جائیں لیکن وہ اس قدر سخت نہ ہو کہ آدمی بلبلا اٹھے۔

۱۔ ہر چند اسلام نے زانی کے واسطے سنگ ساری کی سی انتہائی سزا مقرر کر دی ہے۔ لیکن اس ناقابل برداشت جنسی ہیجان کے ساتھ بڑی حکیمانہ اور بڑی شریفانہ مروت سے بھی کام لیا ہے۔ یعنی دیگر جرائم کا انحصار مرد و گواہوں پر کیا گیا ہے۔ لیکن اس معاملے میں چار گواہوں کی شرط لگا دی گئی ہے۔ پچاس فیصد رعایت تو پہلے ہی قدم پر کر دی گئی ہے اور مجرم کو اشتباہ کا فائدہ پہنانے کی خاطر اس پچاس فی صد رعایت کے حدود کو وسیع کر کے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ کہیں انہوں نے مرد کو اوپر اور عورت کو نیچے دیکھا تھا تو اس شہادت سے زنا ثابت نہیں ہو سکے گا۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر وہ یہ شہادت بھی دیں گے کہ ہم نے مرد کی کمر کے متواتر حرکات کو بھی دیکھا تھا پھر بھی زنا ثابت نہیں ہوگا البتہ اگر وہ یہ شہادت دیں گے کہ ہم نے دیکھا تھا کہ مرد وزن کے مابین سلائی اور سرمے دانی کا سا معاملہ ہو رہا تھا تب جا کر زنا ثابت ہوگا۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کریں گے کہ ایک ایسے مزاج کا زانی جو ایک کو نہیں چار چار آدمیوں کو اپنی طرف آتا دیکھے اور اس کے باوجود وہ عورت سے فوراً جدا ہو جانے کے بدلے اس سے چمٹا رہے..... اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے جسمانی حرکات کی وساطت سے اس کا بھی موقع دے کہ چاروں گواہ فریقین کی برہنگی کا تفصیلی مطالعہ کر کے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیں کہ ایک سلائی دوسرے کی سرمہ دانی میں آ جا رہی ہے۔

وہ قیود اور ان کے حدود دوسرے دست کیا ہوں اور آگے چل کر ان کو کس رفتار کے ساتھ ختم کیا جائے۔ اس سلسلے میں چند بنیادی حقائق زبان پر لے آؤں تو ہر طرف تھپڑی



بچنے لگے اور میں دیکھتے ہی دیکھتے نکوبن کر رہ جاؤں۔

میں جس ماحول میں زندہ رہنے کا ارتکاب کر رہا ہوں وہاں حقائق سے دامن بچانے اور حقائق سے آنکھیں چرانے ہی میں ایمان کی خیر سمجھی جاتی ہے اور نجات کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ میرے معاشرے کو اناج تک یہ علم ہی نہیں ہے کہ ہمارے عقائد و مسلمات ہمارے آبائی اقوال و روایات ہمارے خیر و رے کے تصورات ہمارے مرغوبات و مکروہات اور ہمارے ذہنی تعصبات فکری ہیں کہ سماعی نیز جس ماحول کو اس بات کی بھی خبر نہ ہو کہ پاکی و ناپاکی گناہ گاری و اطاعت شعاری جواز و عدم جواز اور حرام و حلال کی وقت نوزایدی، اسطلاحیں، معقولات نے وضع کی ہیں یا منقولات نے؟ یا مردوں کی پاکیزگی و پارسائی کے ضوابط، عورتوں کی عصمت و عفت کے قواعد، جنسی تعلقات کی حد بندی اور ازدواج کا رواج قدرت کا عطیہ ہے یا پنچوں کی ایجاد ہے؟ ایسے ماحول میں چہرہ حقائق سے پردہ اٹھانے والے کو نکوبن کر رہ جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ اس لیے اب میرے واسطے صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ امور گفتنی کو ناگفتنی کے زمرے میں لے آؤں اور

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی

خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

پرنگاہ کر کے میں نے اپنے دور کی ذہنی سطح پر آ جاؤں سب کی ہاں میں ہاں ملاؤں  
اور کو چہ بتاؤں مغاں دونوں کو بد اخلاقی کا مرکز ٹھہراؤں۔

بہت اچھا تسلیم کر لیا میں نے ان دونوں اداروں کا بد اخلاقی کا مرکز لیکن دیکھنا یہ  
ہے کہ یہ ادارے جو اتنے ہی قدیم ہیں جتنی انسانی تمدن کی تاریخ..... معرض وجود  
میں آئے ہیں،

آسودگی تمنا کی بازی گاہ دنیا میں ان اداروں کو جنہیں تنج بستہ پیران فرقت مادر  
زاد پر شکستہ جوانان صالح اور گرگان باران دیدہ سیاسی افراد بد اخلاقی کے اڈے کہہ کر

اپنا جی خوش کرتے ہیں) معرض وجود میں لایا جائے نوع انسانی کا پیدائشی ذوق مسکرات اور مستورات کیوں کر؟ اس مسئلے پر غور کرتا ہوں تو پتا چل جاتا ہے کہ اس مطالبہ در رسد اور تمنا اور یہ ہیجانی ذوق برا بیچتہ ہوا ہے۔ اس ناقابل مقابلہ تند اور شدید حیوانی جبلت کا جو انسان کو اکسا کر وجد میں لاتی ہے اور اس کی نسل بڑھاتی ہے۔ اور جس کی ناقابل فتح شدت کا یہ عالم ہے کہ تاریخ تمدن سے لے کر آج تک ہزاروں ارضی و سماوی طاقتوں کے دانت کھٹے کر کے اور کسی مادی یا روحانی طاقت کو اپنی پشت پر کاٹھی رکھنے کی اجازت نہ دے کر مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔

اور جب نگاہ کرتا ہوں اس جذبہ گرم کی صلاحیت و حرارت پر تو یہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ آج کل کے ڈسٹرکٹ بورڈوں میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے ان ووٹوں کی بھیک پر جینے والے بونے اور اوچھے ارکان پر جو اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ وہ ان بد اخلاقی کے اداروں کو بند فرما دیں گے۔ نیولے ڈھال تلوار باندھ کر نام خدا شیر کا شکار کرنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔

پرانے زمانے کو چھوڑیے اس دور میں بھی پاک و ہند کے بڑے بڑے شہروں میں طوائفوں کے اڈوں کو ڈھایا اور مے خانوں کے دروازوں کو قفل لگایا جا چکا ہے پھر بھی طوائفیں معدوم اور مے خوار مفتوز نہیں ہو سکے ہیں کوچہ خواہاں و کوئے مغاں کو ایک محلے سے نکال کر دوسرے محلے میں آباد کرنا بالکل اسی نوعیت کی حماقت ہے کہ کہنی کے پھوڑے کو گھٹنے پر منتقل فرما کر اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ پھوڑا باقی نہیں رہا۔

لوگ مسکرات کو شراب وغیرہ سے مختص کرتے ہیں حالانکہ سکر کے دائرے میں دنیا کی ہر چیز داخل ہے جو خون میں ہیجان اور دل میں نشاط کا طوفان برپا کرتی ہے۔ بچے کو پیار کرنا، چاندنی سے لطف اٹھانا پھول سو گھنا، پیٹ بھر کر کھانا کھانا حسینوں کو آغوش میں لینا یاروں کی صحبت میں بیٹھنا مختلف کھیل کھیلنا عبادت کرنا وظیفہ پڑھنا گانا سننا، تماشا دیکھنا، صحائف پڑھ کر جھومنا، اور رو دینا۔ یہ بھی سکر ہی کی شاخیں

ہیں۔ اس کے معنی ہی ہیں کہ ذوق سکر ہمارے وجود کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور سکر کے بغیر درووسیدہ انسان کا زندہ رہنا امکان سے باہر ہے۔

اس لیے دانش مندی اور انسانی فلاح اسی میں نظر آتی ہے کہ جہاں تک بازار حسن کا تعلق ہے۔ ماہر دین رسیدہ ڈاکٹروں کے ہفتہ وار معائنے کی وساطت سے اس ادارے کی تہذیب و تطہیر کا سائنٹفک بندوبست کیا جائے۔ اور ایسے ضابطے وضع کیے جائیں کہ امن عامہ اور صحت جسمانی میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔

اب رہا مسکرات کا مسئلہ سو حکومت کا یہ فرض ہے کہ اعلیٰ قسم کی اور پختہ لیکن سستی شراب کشید کرنے کے واسطے بھٹیاں قائم اور ایسے افراد کے نام اجازت نامے جاری کر دے جو صحت جسمانی سلامتی عقل اور شرافت نفس کی بنا پر بادہ خواری کی اہلیت رکھتے ہیں۔

اگر اس برسوں کے سوچے سمجھے مشورے پر عمل نہیں کیا گیا تو یاد رکھیے اور کان کھول کر سن لیجیے کہ ایک طرف تو انسانی فطرت بغاوت پر کمر باندھے گی۔ گھر گھر بھٹیاں قائم ہو جائیں گی اور اناڑیوں کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی شراب یعنی اسپرٹ پی پی کر لوگ جرائم پر اتر آئیں گے اور دھڑا دھڑا مرنے لگیں گے۔

اور دوسری طرف جب طوائفوں کے اڈے بند کر دیے جائیں گے تو ان کے پاؤں کی زنجیر کھل جائے گی اور وہ اڈے شہر کا رخ کر کے گلی گلی میں پھیل جائیں گے۔ شہر کا ہر مکان بازار حسن میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔ اور شہر کی ہر شریف زادی خانگی کا روپ بھر کر طوائف سے بھی دو قدم آگے نکل جائے گی اور عصمت فروشی کا پانی اس قدر ٹوٹ ٹوٹ کر بر سے گا کہ کالجوں کے احاطوں اور گھروں کی انگنائیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہو جائے گا۔



## فرنگی سے نفرت

ایک روز میں لکھنؤ کے نحاس والے مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں اپنی کھلائی بڑی بی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک سے دفعۃً تڑاق تڑاق کی آوازیں آئیں۔ بڑی بی نے جھک کر دیکھا تو زار زار رونے لگیں۔ میں نے پوچھا یہ بیٹھے بٹھائے رونے کیوں لگیں بڑی بی..... انہوں نے روتے ہوئے کہا بیٹا موا گاڑی والا گھوڑے کو چابک سے مار رہا ہے تڑاق تڑاق..... ہائے ہمارے جان علم پیا کے زمانے میں ان گھوڑوں کو رئیسوں کی آبرو سمجھا جاتا تھا۔ ان کو دودھ جلیبی اور مٹھائی کھلائی جاتی تھی۔ جب سے ان بند فرنگیوں کا راج ہوا ہے ان غازی مردوں کو چابکوں سے مارا جانے لگا ہے۔ بیٹا یہ غازی مرد کس قطار میں شمار ہیں ان بندروں کا جب سے دور دورا ہوا ہے۔ بڑے بڑے شریف زادے گلیوں میں جوتیاں چٹختے پھرتے ہیں۔ انہوں نے یہ کہتے کہتے اپنے بے بوٹی کے کھل سینے پر ہات مار کر کہا ”ہائے ہمارے جان عالم پیا اب کبھی نہیں پلٹیں گے“ بڑی بی کی یہ بات سن کر میں بلبل گیا اور فرنگی سے نفرت ہو گئی۔ اور وہی لڑکپن کی نفرت آگے چل کر میری سیاہی نظموں کے روپ میں شعلہ افشانی کرنے لگی۔

میری مونچھوں کے کونڈے! الحفیظ والامان..... ہائے جوانی کا وہ عاصیانہ ریعان..... پیرانہ سر خواتین میں اس کی وہ معصومانہ مان دان..... وہ ہر طرف سے آئے میں صدقے میں قربان..... وہ رنگوں کے پیہم گھلتے سینکڑوں نشان..... وہ کل یوم ہوائی الشان وہ جھمکتی زمین جھلجتا آسمان وہ مشک وہ زعفران..... وہ عود وہ لوبان وہ ریحان وہ رمان وہ عطر پھول اور پان..... وہ امنگوں کی پور پور کی گمکتی چٹان..... وہ ترنگوں کے رگ رگ میں کٹتے دھان..... وہ جھولتی گلیاں وہ جھومتے میدان..... وہ امریوں کی کجریاں وہ برکھا کے پکوان..... وہ پی ہو کو کو دے سلوں کے شیشوں کی درکان..... وہ گھپ راتیں وہ گل اوسان وہ گوگل بن کے جھپٹے وہ بانسری



کے سریلے بان..... وہ رادھا جی کی مسکان..... وہ ہلالوں کا بازار وہ خنجروں کی  
 دکان..... گاہے گل پوش گاہے لہو لہان..... وہ کاہ پر قدم کا ہکشاں پر گریبان..... وہ  
 عشوؤں کے گرداب وہ عربدوں کے طوفان..... وہ نرالے ہانکے انوکھے مچان..... وہ  
 جھوٹے وعدے سچے پیان..... وہ پہاڑوں کی تول پلکوں کی میزان..... وہ کانٹوں  
 کے حصار پھولوں کے ایوان..... وہ شیشوں کے دروہ پتھر کے دربان..... وہ ادھر سے  
 سوال ہے کوئی امکان..... وہ ادھر سے جواب الہا بالسلطان..... وہ تو اتر خطا و  
 نسیان..... وہ تسلسل عدوان..... وہ سلسلہ انتقام بالاحسان..... وہ قلم حسن و عشق کا  
 طغیان وہ پنھما برزخ لا بخیان..... وہ بیاہیاں طرار وہ کنواریاں نادان..... وہ لہجوں  
 کی مرکیاں وہ بولوں کیلچکان..... وہ انکڑیوں کے ڈوروں کی گویا زبان..... وہ حورانی  
 مقصورات فی الخیام کی شرمیلی آن بان..... وہ صراحی دار گردنوں کے ڈوروں کی لچک  
 میں ارجن کمان..... وہ بوجھل پوٹے وہ نیندوں کے جھپان..... وہ یخرج منھما  
 الولو والمرجان..... وہ چاہوں بانہوں کا مرج البحرین یلتقیان..... وہ رامش و رنگ  
 کے بوستان وہ فیہا عینان تجریان وہ ہر الھڑ حور وہ ہر امر و غلمان..... کافر زلفوں کی  
 چھاؤں میں وہ مکھڑوں کے قرآن..... اور دھانوں میں رہ رہ کر وہ نعرہ فباہی آلاء ربکما  
 تکذبان !!

امیرے اودھ میں یہ رسم جاری تھی کہ جب لڑکوں کی میس بھگنے لگتیں تھیں تو مٹی  
 کے کورے کونڈوں میں چوٹی دار جلیبیاں بھر کر حضرت یوسفؑ کی نیاز دلائی جاتی تھی۔

اب ذرا میری مونچھوں کے کونڈوں کا دھوم دھڑکا بھی دیکھ لیجیے..... ادھر زمانے  
 مکان کے چورے چوڑے دروں اور اونچی اونچی محرابوں کے طویل و عریض دالان  
 میں چاندنی کافر ش بچھا ہوا تھا۔ دیوار گیریاں اکے اور گیس کے ہنڈے جل رہے  
 ہیں..... خواتین گاؤتکیوں پر ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ ادھر ادھر فرشی اگال دان اور بڑے  
 بڑے چاندی کے پان دان رکھے ہوئے ہیں اور ان کے مقابل ڈونیاں ڈھار میں

سرورنیاں اور میراثیں نقلیں کر رہی ہیں۔ اور نقلوں کے بعد ڈھولک پر گانا ہو رہا ہے۔  
اور گانے والیوں کو بیل اُدی جا رہی ہے۔

ادھر مردانے صحن میں دل بادل شامیانہ لگا ہوا ہے۔ شامیانے کے گرد نوکر چاکر  
وغیرہ پرے جمائے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف گیس کے بڑے بڑے ہنڈے سننا  
رہے ہیں۔ مشعلی مشعلیں اٹھائے ہوئے ہمہ تن انتظار بنے بیچ میں کھڑے ہوئے  
ہیں..... شامیانے کے نیچے شرکائے جشن اونچے اونچے گاؤ تکیوں پر کہنیاں ٹیکے  
بڑے وقار کے ساتھ قالینوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور وہ دیکھیے اپنے کاشمیریوں کے  
طائفے کے ساتھ پندرہ سولہ برس کا خوبو اور شیریں حرکات علی جان ۲ جس کے حسین  
چہرے پر شکر پر ہلکا سا نمک چھڑکا ہوا ہے۔ چلا آ رہا ہے۔ بڑی لٹک کے ساتھ چھم چھم  
کرتا ہوا۔ شامیانے میں قدم رکھتے ہی اس نے بڑے لوج کے ساتھ فرشی سلام کیا  
ارباب محفل کو..... سلام کرنے میں اس کی کلائی اس قدر لچکی کہ ڈر لگنے لگا کہ کہیں ٹوٹ  
نہ جائے اور مظہر کا مصرعہ

آہ مظہر خم سلام کسے

۱۔ اس انعام کو بیل کہتے ہیں جو شادی میں خصوصاً اور دیگر تقریبات میں بالعموم  
گانے والیوں کو دیا جاتا ہے۔ اور اس کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی خاتون ان کو انعام  
دیتی تھی تو ڈھولک بجانے والی اس کے عطا کردہ روپوں کو ڈھولک کے حاشیے پر تین بار  
کھٹکھٹاتی تھی۔ اور اس خاتون کے شوہر کا نام لے کر با آواز کہتی تھی کہ فلاں خاں  
صاحب کی بیل یعنی اگر انعام دینے والی کے شوہر کا نام نواب احمد خاں ہوتا تو ڈومنی  
پکار کر کہتی تھی نواب احمد خاں کی بیل)۔

۲۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جان علی حجام نے میرا ختنہ اور علی جان کاشمیری نے  
میرے ختنے کے جشن پر مجرا کیا۔ خان علی نے خون بہایا اور علی جان نے رنگینیوں کے  
دریا بہا دیے۔

یاد آگیا..... سلام کر کے وہ اپنے سازندوں کے آگے ایسے دل فریب گھماؤ سے بیٹھ گیا کہ جیسے اڑتا ہوا کبوتر اپنی چھتری پر آ کر بیٹھ جاتا ہے..... اس کے بیٹھتے ہی۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

کی طرح سازندے اپنے اپنے ازملانے لگے۔ سازوں کا ملایا جانا ایک صبر آزما عمل ہوتا ہے یعنی

ہرچند سریلے نغموں کے جذبات جگائے جاتے ہیں

اس وقت کی تلخی یاد کرو جب ساز ملائے جاتے ہیں

لیکن کاشمیریوں (بھانڈوں) نے اپنی اچھل کود اپنے تو او او او کے نعروں اور اپنی پیٹ میں بل ڈال دینے والی نفلوں سے اس تلخی کو ڈھانپ لیا اور اس قدر ہنایا کہ لوگ لوٹنے لگے..... اور جب ساز مل گئے اور ہنسی کے دو گمرے رک گئے..... تو علی جان پھر ہری لے کر یوں کھڑا ہو گیا کہ بھاؤ بتانے جیسے پہلی کرن پھوٹتے ہی دریا سانس لے کر مچلنے لگتا ہے۔ پل بھر میں اچھی طرح ملے ہوئے ساز بجنے لگے۔ سارنگی کی روں روں..... جوڑی کی دوں دوں اور مجیرے کی کھن کھن کی نی تلی اور گھلی ملی آوازوں پر فسوں دائرے میں علی جان نے بھاؤ بتانے کے واسطے جب اپنے پچیلے ہات یعنی چپو اٹھائے اپنے چہرہ ہرے جسم کی کشتی کھین کے لیے تو کاشمیریوں نے اسے حلقے میں لے لیا۔ اور بڑی سریلی آواز میں کہنے لگے ادھر دیکھو خوش وقتی ادھر دیکھو خوش وقتی۔ اللہ نے یہ دن دکھایا کہ خاں صاحب بہادر کی ڈیوڑھی پر علی جان کا طائفہ آیا..... وہ محفل ویران جہاں بھانڈ نہ باشد اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔

اس کے بعد سازوں کی منظم گونج میں علی جان کاشمیریوں کا حلقہ توڑ کر یوں اپنا چہرہ سامنے لایا گویا کالی بدلی سے چاند نکل آیا..... سامنے آتے ہی اس نے چھلاوے نے فرش پر یوں چھم سے پاؤں مارا کہ ابل پڑا زمین سے رقص کا فوارہ..... اور دابھنے بائیں کھڑے ہوئے کاشمیریوں نے اس رقص کے ہرسم پر تالیاں بجا بجا کر کہنا شروع

کر دیا۔ تاتا تانا تھی تھی تھی۔ اے تاتا تاتا تھی اور جب اس کے ناچ میں تیزی آئی تو کاشمیریوں نے آہا ہا ہا۔ اہڑھ کے اے بڑھ کے بیٹا بڑھ کے۔ ہاں بڑھ کے بیٹا بڑھ کے۔ تھی تھی تھی تھی تاتا تاتا۔ کے نعرے لگانا شروع کر دیے اور بھاؤ بتانے اور ناچنے کے بعد جب اس نے بن پانی کا چلا جا رہے۔ بجرا لگانا شروع کر دیا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک بجرا ہے اور فرش پر ہچکولے کھا کھا کر بہتا چھا جا رہا ہے۔ اور ساز اس کے بولوں سے اس قدر دست و گریباں اور ہم آہنگ ہیں گویا سونے کی اڑتی ہوئی سویوں میں جھلکتے متیش کے ڈورے پروئے جا رہے ہیں۔

علی جان کے دل نشین مجرے کے بعد شامیا نے پر ایک سناٹا چھا گیا ایک کھنکھناتا سناٹا چھا گیا..... اس کے بعد چار طوائفیں تابتوڑ آئیں لیکن ان کے مجرے کا رنگ جما ہی نہیں..... اور ایسا لگا کہ جیسے حافظ شیرازی کے کلام کے بعد ذوق کی غزل پڑھی جا رہی ہو۔ یا شراب کے بغیر خالی سوڈا پیا جا رہا ہو۔ یا لیلیٰ کی محمل کے بغیر بلبلاتا اونت شتر غمزے کرتا پھر رہا ہے نجد کے میدان میں۔

خدا خدا کر کے اب پچھلے پہر کوئی چودہ برس کی پانچویں طوائف آئی مجرے کے واسطے العظمتہ اللہ اس کا چمپی مکھڑا گویا سر کوہ سارا غار بہار کی صبح طالع ہو رہی ہے..... اور اس کے شرتی رخساروں کی سرخ و کاغذی جلد کے نیچے سے یوں صباحت پھوٹ رہی ہے گویا غرنے کے رنگین شیشے سے چاندنی چھن چھن کر آرہی ہے..... جب اس قتالہ عالم نے رقص کرنے کے لیے اپنے ترشے ہوئے کولھے کے دل فریب کٹاؤ پر بایاں ہاتھ رکھ کر چھاسی کمر لچکائی تو ایسا نظر آیا کہ گویا رقص کی دیوی سنہری رتھ کا رھرا بڑی لچک کے ساتھ گھوم رہا ہے..... اور کرہ ارض کی گردش اس کا طواف کر رہی ہے۔ یا مصر کے بازار میں یوسف کا بانکپن دیکھ کر زلیخا کے غرور کی کمان ٹوٹی جا رہی ہے۔

اور ہنگام رقص جب اس کافر نے ایک قیامت انگیز جھانولی کے ساتھ اپنی آنکھوں کے پٹ ادھے بھیڑ لیے تو ایسا معلوم ہوا گویا خرابات ک انگنائی میں دفعۃً جھپٹا ہو گیا



ہے اور رطل گراں پر ہلکا سا دھواں مچلنے لگا ہے..... اور جب اس ظالم نے اپنی گردن کے باریک ڈورے کو راگنی کے بہاؤ کی طرف موڑ کر ذرا سی جنبش دی تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا نسیم سحر کی مضرا ب نہیٹا بیض بجا رہی ہے۔

اے بے پانی کے بحرے چلا جا (چلتا رہ)

اس کی جوانی کا سبب ہنوز پال سے باہر نہیں نکالا گیا تھا۔ اس کے مکھڑے پر جوانی اور بانک پن گلے مل رہے تھے۔ اس کا وجود ایک ایسا جھٹپٹا تھا جس کی چھاؤں میں دھندلا کاہمک رہا تھا..... اس کی ناک کی نتھ گواہی دے رہی تھی کہ اس کا پنڈا ابھی تک کورا ہے۔ اور سینے پر اس کے آبی آنچل کے نیچے گویا ایک بلو اسسا ہو رہا ہے۔

وہ بہت کم سن تھی اور موسیقی میں خام ہونے کی وجہ سے اس کے گلے میں پتی لگتی تھی۔ لیکن اس کی نیم پختہ جوانی کی وحشی آنکھوں کے شربتی ڈوروں اور وہ انوکھی راگنی چھڑی ہوئی تھی جس کو دنیا کے کسی ساز پر نہیں بجایا جاسکتا اور جو کونوں سے نہیں آنکھوں سے سنا جاسکتا ہے۔

اور آخر کار ڈوبتے ستاروں کی چھاؤں میں اس دختر قمر نے جب یہ غزل بھیرویں میں چھیڑی۔

نسیم ، جاگو ، کمر باندھو اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے  
تو راگنی کی چلت پھرت اس کے نیم رواں اور کچے گلے میں یوں گھومنے لگی گویا  
پروا کے ملائم جھونکوں میں پٹے سے کٹا ہوا چاند تارا فضا میں پتا رہا ہے۔

اور جب ناچتے ناچتے انعام کی خاطر وہ ہچکولے کھاتی کشتی کی مانند آہستہ آہستہ  
میری طرف بڑھنے لگی تو میرا گلا رندھنے لگا۔ میری گردن کے ہاروں کی خوش بوتیز ہو  
گئی اور جب وہ ایک گھٹنا ٹیک کر چھم سے میرے سامنے بیٹھ گئی تو اس کے کم سنی کے  
انفاس کی خوش بو کھج سے میرے سینے میں چھب گئی۔ اور اس کی پیشواز کا سرا جب میرے  
ہات کی پشت سے مس ہو گیا تو میرے بدن میں پوسی پھٹنے لگی۔

میری زندگی کے اٹھارہ معاشقوں میں وہ میرا مبہم سا معاشقہ اولیس تھا..... جو عالم خواب میں شبہ نام کی مانند مجھ پر گرا اور میرے تن بدن میں جذب ہو کر گم ہو گیا۔

اپتنگ بازی کے ایک بیچ کا نام ۱۲ ایک قسم کا پتنگ

اب اگر وہ زندہ بھی ہوگی تو میری طرح بوڑھی ہو چکی ہوگی۔ اور ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں سکیں گے۔..... ہائے ظالم وقت کا دھارا کتنے چاندوں کو غرق کر چکا ہے۔

لیکن اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی جب اس بحرے کی یاد آتی ہے تو میرے جھریوں بھرے ہاتھ کی پشت پر اس کی پیشواز کا دامن سرسرا نے اور کروٹیں سی لینے لگتا ہے۔ ہائے کیا کروں میرے اللہ!

کانوں سے سنا تھا کہ پشت رسالت پر مہر نبوت ثبت ہوا کرتی ہے اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میری پشت دست پر اس پیشواز کی مہر لمس آج تک دمک رہی ہے۔

### میرا آگرے کا پہلا سفر

آگرے سے مانا جان کا دعوت نامہ آیا، میری ماں کی باچھیں کھل گئیں..... سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اور پورے ایک ہفتے کے بعد جب رخت سفر تیار ہو گیا تو لکھنؤ اادی بھیج کر دین کمپارٹ منت یعنی ایک فرسٹ کلاس ایک سیکنڈ اور ملازموں کے واسطے ایک تھرڈ کلاس بوگی ریز رو ہو کر چوبیس گھنٹے سے پیش تر ملیح آباد اسٹیشن پہنچ گئی۔ اور وہ تینوں ڈبے ماں گودام کے پلیٹ فارم پر لگا دیے گئے۔

پردے کا یہاں تک اہتمام کیا گیا کہ زنا نے کمپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیاں پہلے ہی سے بند کر دی گئیں اور صرف یہی نہیں ان پر کو کا کیلوں سے ٹھونک ٹھونک کر اندر سے چادریں بھی جڑ دی گئیں۔ دن بھر ان میں سامان لا دا جاتا رہا۔ اور رات کو پہرہ بٹھا دیا گیا۔

ہماری گاڑی صبح نو بجے جانے والی تھی۔ گھر بھر میں تڑکے سے ایک ہنگامہ برپا ہو

گیا۔ اور باقی سامان بھی سٹیشن پر پہنچا دیا گیا..... گھر سے چلتے وقت دادی جان نے ہم سب کے بازوؤں پر امام ضامن باندھے حیدری خانم قمر ان کو ہاتھوں میں بلند کر کے انگنائی کے کنوئیں کی چھت پر جا کھڑی ہو گئیں۔ جس کے نیچے سے ہم سب ایک ایک کر کے گزرے اماؤں اسیلوں نے وہی مچھلی کی آوازیں بلند کیں اور ہم سب سٹیشن کی جانب تاج محل کو جب قریب سے دیکھا تو یہ کلیہ ٹوٹ گیا اور قریب سے وہ اس قدر حسین نظر آیا کہ جی چاہا اس دوالی کے سفید کھلونے کو دانتوں کے نیچے کرم کرم چبا کر کھا جاؤں۔

اس کو آغاز سفر کا نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔ یعنی جس طرح وہی اور مچھلی میں ساز گاری ہوتی ہے وہی سفر میں شامل حال رہے۔

اللہ اکبر تاج محل کا پھاٹک..... آسمان سے باتیں کرتا پھاٹک..... جب خدام تاج میں سے کسی نے اس کی محراب کے نیچے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا تو محراب میں سے ایسی عظیم گونج پیدا ہو گئی کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ گونج دیر تک باقی رہی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ گوش رسالت میں وحی کی جھنکار گونج رہی ہے۔

اس الوہی جھنکار میں ڈوبا ہوا جب اندر گیا تو تاج پر تفصیلی نگاہ ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ خواب میں جنت دیکھ رہا ہوں..... فواروں کی کھنک سبزے کی لہک اور تاج کی چمک دمک نے دیوانہ کر دیا..... میں یہ سوچنے لگا کہ وہ کیسے نیچے تلے چوم لینے کے قابل ہاتھ ہوں گے جن کی فن کاری نے حیطہ انبض خواب زلیخا تاب مرمر، سپیدہ سحری، اور جلوہ کنعان کو چاندی کی دیگ میں ڈال کر ستاروں کے انگاروں پر پگھلایا۔ موسم بہار کے سرشار جھونکوں میں سکھایا اور ہیرے کی نازک نازک چھینوں سے تراش تراش کر درو بام کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

خدا کی قسم بے ساختہ جی میں آیا کہ پھاڑ ڈالوں گریبان چر سے۔ اور ناخن لگوں تھرک تھرک..... لیکن جب کن انکھیوں سے باپ کی طرف دیکھا ڈر کے مارے کلیجہ

مسوس کر رہ گیا کہ ناچوں گا تو باپ اس طرح عاق کر دیں گے جیسے میرے پردادانے اپنے ایک لڑکے کو جو لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا یہ سن کر عاق کر دیا تھا کہ وہ گاتا اور بھاؤ بتاتا ہے۔

اپنے ولولہ قس کا گلا گھونٹ کر جب میں نے تاج محل کے دوسرے تماشاخیوں کی طرف نگاہ اٹھائی تو یہ دیکھ کر حیرت میں غرق ہو گیا کہ وہ لوگ بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ ثبات عقل و ہوش تاج کا نظارہ کر رہے ہیں۔ اور ان میں سے ایک فرد بھی ناچ نہیں رہا ہے۔ تو میں سوچنے لگا کہ یہ سب کے سب کیا پتھر کے بنے ہوئے ہیں یا یہ تمام لوگ بھی اپنے اپنے پٹھان باپوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔

گاڑیوں اور فینسوں میں روانہ ہو گئے..... زمانے ڈبے کے تینوں طرف قناتیں کھڑی کر دی گئیں خواتین اپنے اپنے درجے میں اور ہم سب اپنے ڈبے میں بیٹھ گئے۔

لکھنؤ اور کان پور ہوتی ہوئی جب ہماری گاڑی ٹونڈا جنکشن پہنچی تو دودھ گرام..... دودھ گرام..... پوری کا چوڑی (دودھ گرم پوری کچوری) کے نعروں نے بوکھلادیا۔ اور کانوں کو ان بگرے ہوئے لہجوں سے پتا چل گیا کہ ہمارا قافلہ اودھ سے بہت دور آچکا ہے۔

وہاں ہمارے ڈبے کاٹ کر آگرے جانے والی گاڑی کے بریک کے پیچھے جوڑ دیے گئے۔ گاڑی آگے بڑھ کر جب آگرے کی طرف مرنے لگی تو میرے باپ نے اشارہ کر کے بتایا دیکھو یہ تاج محل ہے میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو حیران ہو گیا۔ جلال و جمال کی ایسی متناسب ہم آہنگی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا..... یہاں تک کہ گاڑی ایک طرف مڑ گئی۔ تاج اوجھل ہو گیا۔ اور گویا دودھ سا گیس کا ہنڈا چٹ سے ٹوٹ گیا۔ آگرہ فورت سٹیشن پر گاڑی رک گئی۔ مامنوں نے جھپٹ کر مجھے گلے لگالیا۔ زمانے ڈبے کے گرد قناتیں



کھینچ دی گئیں اور ہم سب گزری منصور خان کی طرف جہاں مانا رہتے تھے روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے مانا جان کے محل کو جسے کسی فرانسیسی رئیس نے بنوایا تھا اپنے آبائی محلوں سے مختلف پایا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے محل دو منزلہ ہیں یہ سہہ منزل ہے۔ ان میں برے بڑے در اور دالان ہیں یہ ایک دوسرے سے پیوستہ کمروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں فقط روشن دان ہیں۔ اس میں جا بجا کھڑکیاں ہیں۔ ان کے صحن کشادہ ہیں۔ اس کا صحن نسبتہ چھوٹا ہے۔ ان میں سوڈیٹھ سو آدمی رہ سکتے ہیں۔ اس میں چھ سات سو آدمیوں کی گنجائش ہے اور ہر چند یہ گزری منصور خاں کی ڈھال پر واقع ہے مگر اس قدر بلند ہے کہ گرد و پیش کے تمام مکان اس کے آگے پست دکھائی دیتے ہیں اور اس کی مہتابی سے تاج محل نظر آتا ہے۔

### تاج محل کا قریب سے دیدار

ہر مادی و ذہنی چیز میں بعد اضافہ اور قرب خفت پیدا کرتا ہے..... بعد اجمال ہوتا ہے اور قرب تفصیل اور اجمال تفصیل سے زیادہ حسین ہوتی ہے..... لیکن خدا گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس وقت میں اپنے باپ کے ساتھ نہ ہوتا تو گریبان کے پرزے اڑا کر ایسا ایسا اچھلتا کودتا، ناچتا، قلابازیاں لگاتا شلنگیں بھرتا اور ایسے ایسے شندے اور دیوانے چارے کرتا کہ فوراً آگرے کے پاگل خانے بھیج دیا جاتا۔ اور وہاں جب کوئی پوچھتا کہ یہ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ تو اچک کر کسی درخت پر چڑھ جاتا اور اس کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر یہ نعرہ لگاتا۔

با حسنش ایں جنوں کہ تو ، بنی ..... تخیل است  
 ناصح ، ملائے مکن ، ایں نا شکیب را !!



## لولہ تعلیم

میرے ولولہ تعلیم کے ساتھ میرے باپ نے وہ سلوک کیا جو بکلی خرمن سے کرتی ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ مجھ کو جاہل رکھنا چاہتے تھے۔ مگر سارا کھیل بگاڑے ہوئے تھے۔ ان کی غیر معمولی محبت بے حد و حساب محبت وہ دل سے چاہتے تھے..... کہ میں پڑھوں تو ضرور مگر ان کی آنکھوں سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہ ہونے پاؤں..... اور اس بے کراں محبت کی بنا پر جب میں دانت نکال نکال کر ان کی خدمت میں عرض کرتا تھا کہ میاں مجھ کو پڑھنے کے لیے کہیں باہر بھیج دیجیے میں گھر پر نہیں پڑھ سکوں گا مولوی اٹھے مجھ سے ڈرتے ہیں..... ڈرنے والے مولوی پڑھانہیں سکتے۔ تو ان کے چہرے پر ایک شدید قسم کا کرب کا رنگ دوڑ جایا کرتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے گھر کی تمام دیواریں کونکے سے تعلیم کا بھوکا شیر لکھ لکھ کر سیاہ کر ڈالیں۔ میاں نوکروں سے ان تحریروں کو مٹوا دیتے تھے۔ اور میں پھر لکھ دیتا تھا۔

آخر کار میں نے اپنی پھٹی زاد بھائی اور تعلیم کے شیدائی صفدر حسین خاں کو پکڑا کہ آپ میاں سے میری سفارش کر دیں..... صفدر بھائی مسدس حالی کی نسل میں سے تھے انہوں نے میری امداد کا وعدہ کیا۔ ان کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ انہوں نے میری تعلیم کے بارے میں میرے باپ سے بار بار کہا اور بڑے اصرار کے ساتھ کہا لیکن میاں نے اس کان سے سنا اور اس کان سے اڑا دیا۔

لیکن صفدر بھائی دھن کے پکے تھے۔ ہمت نہیں ہارے۔ ایک روز شام کے وقت میاں کو بڑے اچھے مود میں پا کر انہوں نے بڑی جسارت کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا کہ مانموں اب زمانہ بدل چکا ہے..... جو بچہ گھر کے رئیسانہ ماحول سے باہر نکل کر نہیں پڑھے گا وہ شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے۔ کے زمرے میں آ کر تباہ ہو جائے گا۔ مانموں آپ خاندان بھر میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور عقل مند آدمی ہیں۔ اور پھر بھی تعلیم سے اس قدر غفلت برت رہے ہیں۔

یہ سن کر میاں بگڑ گئے اور ارشاد فرمایا صفدر..... ایک چھوڑ چار چار معلم اس کو پڑھا رہے ہیں یہ اس عمر میں گلستان اور بوستان، سکندر نامہ اور دیوان حافظ چاٹ چکا ہے اور گوشتی پر شاد سے انگریزی بھی پڑھ رہا ہے کیا اسی کا نام ہے تعلیم سے غفلت.....! صفدر بھائی نے بات جوڑ کر کہا میں سر جھکائے لیتا ہوں آپ چاہیں تو مجھ کو مار لیں مگر اس قدر ضرور عرض کروں گا چار کیا دس استاد بھی ایسے ماحول میں بے کار ہیں مانمیں رئیسوں کے بچے مولویوں سے نہیں ڈر سکتے۔ بلکہ اٹے مولوی ان سے خوف کھاتے ہیں۔ مانمیں..... یہ تو آپ کے سامنے کی بات ہے کہ نسیم مانان کے ایک بچے کو باہر سے آئے ہوئے ایک استاد نے ہلکا سا تھپڑ مار دیا تھا تو انہوں نے اس کا ہاتھ فوراً اڑوا دیا تھا..... اس دن سے یہاں کے تمام استاد اور بھی ڈر گئے ہیں اور اپنے شاگردوں کو گھر کی تک دینے کی جرات نہیں کرتے۔“ یہ سن کر میاں کچھ سوچنے لگے۔ صفدر بھائی نے اشارے سے بتایا کہ آثار اچھے ہیں۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد میاں نے کہا کہ صفدر یہ تو بتاؤ شبیر کو بھیجوں تو بھیجوں کہاں لکھنؤ ہر چند قریب ہے مگر وہاں کے رنگین ماحول میں یہ

اے میاں کو یہ کب معلوم تھا کہ وہ جس شبیر کو مرد صالح بنانا اور بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں وہ بگڑے ہوئے بغیر مانے گا نہیں۔ اور اس کا اگر بسم اللہ کے گنبد میں بند کر کے اس کے پاؤں میں اخلاقی جلالی کی زنجیریں بھی ڈال دی جائیں گی پھر بھی یہ شبیر اس گنبد اور ان زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر حریم بتاں و بارگاہ مغاں میں پہنچ جائے گا۔ کاش میاں ہی کو نہیں دنیا کے تمام باپوں کو یہ معلوم ہوتا کہ اپنے بیٹے اور اس کے فطری میلان کے بیچ میں آ کر کوئی باپ تا دیر ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ داخلی تقاضوں کو خارجی احکام نیچا نہیں دکھا سکتے۔ اگر کروڑوں انبیاء پانی کو یہ حکم دیں کہ وہ نشیب کی طرف نہیں فراز کی طرف بہنے لگے پانی ان کا حکم نہیں مانے گا اور نشیب کی جانب ہی بہتا رہے گا۔ اگر یہ سن کر کوئی انسان کے ذی شعور اور پانی کے بے شعور ہونے کی بات

کرے گا تو غور کرنے کے بعد اس کو پتا چل جائے گا کہ شعور بھی فطری تقاضوں اور جہلتوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔

بگڑ جائے گا۔ صفر بھائی نے کہا مائموں یہ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ ان کی تعلیم لکھنؤ میں ہو میں اپنے بیٹے اسرار حسن کو سیتا پور میں پڑھا رہا ہوں آپ شبیر میاں کو سیتا پور بھیج دیں وہاں ملیح آباد کے بہت سے لڑکے یعنی عبدالباری عبدالعزیز فخر الحسن پڑھ رہے ہیں اور شبیر میاں کالنگوٹیا یا رابر بھی وہیں تعلیم پا رہا ہے۔

میاں نے یہ سن کر ارشاد فرمایا اچھا صفر..... ایک مہینے کے بعد شبیر کو سیتا پور لے جانا میں اس ایک مہینے میں اپنے دل کو بھی سمجھا لوں گا..... یہ سنتے ہی میرا دل قلقاریاں مارنے لگا۔

لیکن جب پورا مہینہ گزر جانے کے باوجود میاں کا وعدہ ایفا نہیں ہوا تو میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اسی اثناء میں جب لفٹیننٹ گورنر سے ملنے کے لیے میاں لکھنؤ جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہولیا۔ اور جب وہ لاٹ صاحب س مل کر رخصت ہونے لگے تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لاٹ صاحب نے میرے باپ سے پوچھا آپ کا یہ لڑکا رو کیوں رہا ہے؟ تو میں نے ان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ لاٹ صاحب نے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور میرے باپ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا اس کا مفہوم یہ تھا کہ خاں صاحب آپ بڑے خوش قسمت ہیں ایسے علم کے شوقین لڑکے کو تو ولایت میں بھی نہیں ہیں۔ آپ اس کو ایک مہینے کے اندر اندر کسی سکول میں داخل کر کے مجھے مطلع کریں۔ اتنا کہہ کر اس نے بڑے پیار سے میرے گال تھپتھپائے اور کہا اگر خاں صاحب نے میری بات نہیں مانی تو میں سرکاری وظیفہ دلا کر تم کو تعلیم کے واسطے لندن بھیج دوں گا۔“

گورنمنٹ ہاؤس سے نکل کر جب میاں گاڑی میں بیٹھے تو مجھ پر برس پڑے۔



مردود تو نے لفٹیٹ سے میری شکایت کیوں کی اور وہ بھی میرے منہ پر..... کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں اس لال منہ والے بندر سے ڈر جاؤں گا؟ خوب کان کھول کر سن لو کہ اگر لفٹیٹ گورنر کے باپ بھی کہیں گے پھر بھی میں تجھ کو گھر سے باہر بھیج کر نہیں پڑھانے کا..... ایسی تیشی لاٹ صاحب کی..... یہ سنتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا بچکیاں بندھ گئیں روتے روتے..... اور دوران گریہ فرط قلق سے میری سانس میرے گلے میں گھوم پھر کر کچھ ایسے زبردست جھٹکے سے نکلی کہ میرے عاشق باپ کا منہ فٹ ہو گیا فرط محبت سے ان کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ میرا دل بیٹھ جائے گا۔ انہوں نے دیوانہ وار دونوں ہاتھ بڑھا کر مجھ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور انتہائی عجلت کے ساتھ کہا تیرے سر کی قسم ایک مہینے کے اندر میں تجھ کو سیتاپور بھیج دوں گا..... میری سانس ٹھہر گئی بچکیاں رک گئیں۔ آنسو ہٹ گئے۔ میرے باپ نے مجھ کو بہت غور سے دیکھ کر پوچھا بیٹا اب طبیعت کیسی ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا اچھا ہوں میاں۔ ان کے چہرے پر بحالی آ گئی۔ اور میں دل ہی دل میں سیتاپور جانے کے دن گننے لگا۔

ملیح آباد آتے ہی میاں نے صفدر بھائی کو بلا بھیجا اور کہا صفدر تم شبیر کو جمعہ کے دن سیتاپور لے جاؤ میرا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔

دو دن کے اندر اندر میرے ساتھ جانے والی باورچی کا جس کو سید کے نام سے پکارا جاتا تھا تقرر کر دیا گیا اور صفدر بھائی نے چار پانچ دن کے اندر اندر میرے تمام زریں اور بھڑکیلے کپڑے نظری کر کے سادہ جوڑے سلوا دیے۔

خدا خدا کر کے جمعہ آیا۔ میرا تمام سامان گاڑی میں رکھوا دیا گیا۔ لیکن بڑی بی دادی ماں اور سب سے زیادہ میرے باپ کی رخصتی آنسوؤں میں گاڑی کا وقت بہہ گیا اور میں کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

دوسرا جمعہ آیا..... میں گاڑی کے وقت سے دو گھنٹے پیش تر ہی تیار ہو گیا..... دادی

اور ماں نے میرے بازو پر امام ضامن باندھے سب نے یکے بعد دیگرے مجھے گلے سے لگایا۔ بڑی بی بی نے بھی مجھ کو سینے سے چمٹالیا۔ میاں نے اس قدر پہنچ کر مجھے سینے سے لگایا کہ میری پسلیاں کچک گئیں۔ اور میرے سینے پر ان کے دھڑکتے دل کی ضربیں پڑنے لگیں..... آنکھن میں پہنچ کر جب حسب دستور قرآن کے نیچے سے نکلے تو میاں نے بھرائی ہوئے آواز میں حکم دیا کہ ادھر آؤ بیٹا میں ان کے پاس پہنچا انہوں نے ارشاد فرمایا تھوری دیر کے واسطے بیٹھ جاؤ۔ اور دو چار منٹ کے بعد جب میں نے گھڑی پر نظر جمائی اور فرط اضطراب سے کسمسانے لگا تو میاں نے بری درد بھری آواز میں فرمایا

می      روی      دگریہ      می      آید      مرا  
ساعتے      منشیں      کہ      باراں      بگورو

اتنے میں صفدر بھائی آگئے اور ہات جوڑ کر کہا مائموں گاری چھوٹ جائے گی۔ میاں نے میرے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔ اور پھر اشارے سے مجھ کو رخصت کی اجازت دے کر سر جھکا لیا۔ میاں کے ساتھ پورا گھر رونے لگا۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے سب کو جھک جھک کر سلام کیا۔ اور جب باہر جانے کے واسطے ڈیورھی سے گزرنے لگا تو بچکیاں میرا تعاقب کرنے لگیں..... اور میاں کی آواز سنائی دی۔

سرو      سیمینا      بصحرا      می      روی  
سخت      بے      مہری      کہ      بے      مامی      روی  
الغرض گھر سے باہر اس طرح آیا جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

### تھرڈ کلاس اورا کے کا پہلا تجربہ

صفدر بھائی نے سٹیشن جاتے ہوئے مجھ کو ایک لمبا لیکچر پلایا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اب زمانہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے امیری کی بواپنے سر سے نکال دوں مائموں نے مجھ کو فرسٹ کلاس کا کرایہ دیا ہے مگر میں تم کو لے جاؤں گا تھرڈ کلاس میں..... منظور

ہے تمہیں۔ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ تھرڈ کے مسافروں کو کن کن بلاؤں سے دو چار ہونا پڑتا ہے میں نے ان کی تجویز منظور کر لی۔

لیکن تھرڈ کلاس میں قدم رکھا تو جی سن سے ہو کے رہ گیا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سب سے پہلے اس ڈبے کی اس بدبو نے میرے دل پر گھونسا مارا جس سے میں کبھی دو چار نہیں ہوا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ڈبہ اوندھا اوندھا سا ہے..... اور بے گدوں کی کھروری ذلیل بچیں میرا منہ چڑھا رہی ہیں..... اور ایک بچہ پر چند گنوار بچھو مار کہ تنباکو کی چلمیں پی پی کر بری طرح..... کھانس رہے ہیں۔ ناک میں ڈنگ مارنے لگی گڑ کی بدبو..... مرتا کیا نہ کرتا سر جھکا کر کھری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سیٹ چھینے لگی..... سانس میرے سینے میں الجھ گئی اور امام ضامن گرم ہو کر میرے بازو پر چر کے لگانے لگے اور میں کھڑکی سے منہ نکال کر بیٹھ گیا..... اور چار باغ سے نکل کر صفدر بھائی نے دو خبیث اکے والوں کو اشارے سے بلایا۔ اور دو دو کوڑی کے ذلیل اکے اپنے گدھوں کے سے ایفونی گھوڑوں کے ساتھ چوں چوں کرتے جب میری طرف ریٹنے لگے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے منہ کالا کر کے مجھے گدھے پر بٹھایا جا رہا ہے۔ صفدر بھاء نے میری حالت کا اندازہ لگا کر قہقہہ مارا اور ان کا وہ قہقہہ اضافہ ہانت بر جرات کی طرح مجھے بہت برا لگا۔ انہوں نے مجھ کو جزبہ دیکھ کر کہا شبیر میاں یہ آپریشن نہایت مفید ہے اس سے تمہارے دل میں جو غرور کا مادہ فاسد ہے وہ خارج ہو جائے گا۔ میں چپ ہو گیا۔

اکا میرے قریب آیا تو میں نے کہا صفدر بھائی اس پر بیٹھو کیوں کر..... انہوں نے میری بغلوں میں ہات دے کر مجھے بہرا دقت بٹھا دیا اور دوسرے اکے پر سید باورچی سامان سمیت سوار ہو گیا۔

اکے کے چکنے گدے کی بو سے مجھے متلی ہونے لگی۔ اور یاد آ گیا حافظ کا یہ مصرع۔

صد منزل است و منزل اول قیامت است

اب چار باغ سے ہمارے ذلیل اکے انامیر کی ڈیوڑھی کی طرف رسان رسان  
رینگنے لگے۔

جب ہمارا اکا جھاؤ لال کے پل پر سے گزرنے لگا تو میری نظروں کے سامنے  
سے اپنے پردادا کا محلہ گزرنے لگا۔ جس کے نکلے کے پتھر پر احاطہ فقیر محمد خاں جلی حروف  
میں کندہ تھا۔ اس بورڈ کو دیکھ کر میرے تمام روٹے جھن سے ہو گئے۔ خیال آیا کہ ادھر  
سے دادا جان ہاتھی پر گزرتے اور ان کی سواری کے آگے نقیب بولا کرتے تھے۔ آج  
اسی طرف سے ان کا پوتا ایک حقیر طوطہ بنا ہوا کے میں بیٹھا ٹرخ ٹرخ ٹوں گز رہا  
ہے شرم کے مارے میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔

اس زمانے میں سیتا پور جانے والی چھوٹی لائن کی گاڑی کے واسطے سٹی اسٹیشن  
جانا پڑتا تھا۔ جو انامیر کی ڈیوڑھی میں واقع تھا۔

الغرض بہراؤ کوٹ و ذلت سیتا پور پہنچ گیا۔ ملیح آباد کے تمام لڑکے نہال ہو گئے۔  
اور ابرار نے دوڑ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

دوسرے ہی دن میرا نام برانچ کے سکول میں لکھا دیا گیا۔ صدر بھائی نے ہائی  
سکول کے فرشتہ سیرت ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال اور بورڈنگ کے ہنس مکھ انچارج  
گھوش بابو سے بھی مجھے ملا دیا اور میں ہزاروں ولولوں کے ساتھ باقاعدہ سکول آنے  
جانے اور جی لگا کے لکھنے پڑھنے میں سرگرم ہو گیا۔

ابھی سیتا پور آئے بمشکل پندرہ بیس دن ہی گزرے ہوں گے ایک روز شام کو کیا  
دیکھتا ہوں کہ ہمارے گھر کے داروغہ شیخ امید علی چلے آتے ہیں شیخ صاحب کو دیکھ کر میں  
سمجھا کہ میاں سیتا پور تشریف لائے ہیں لیکن جب داروغہ صاحب نے میاں کا خط  
دکھایا تو معلوم ہوا کہ میاں نے فقط دو روز کے لیے ملیح آباد دبایا ہے..... دو دن کی چھٹی  
لے کر جب رات کی گیارہ بجے والی گاڑی سے ملیح آباد آیا اور اپنے مکان کی گلی میں  
پہنچا تو یہ دبھکا کہ میاں ڈاکٹر عبدالکریم اور چند سپاہیوں کو لیے خلاف معمول اچکن اور



ٹوپی کے بغیر پھاٹک سے برآمد ہو رہے ہیں..... اور جیسے ہی مجھ پر ان کی نظر پڑی ہائے میرا بیٹا کہہ کر وہ جھپٹ پڑے۔ اور مجھ کو سینے سے لگا کر رونے لگے۔ ڈاکٹر عبدالکریم نے فرمایا خان صاحب آپ خوش ہونے کے عوض رو رہے ہیں۔ میرے باپ نے ارشاد فرمایا ڈاکٹر صاحب کا کوری کے پل سے گزرتے ہی یہ ایک سنت جاری ہے کہ ریل ہمیشہ سیٹی دیتی ہیل لیکن آج اسنے سیٹی نہیں دی۔ اور میں یہ خیال کر کے دیوانہ ہو گیا کہ کہیں خدا نخواستہ پل تو نہیں ٹوٹ گیا ہے ڈاکٹر صاحب جس کا بیٹا ریل سے آ رہا ہو اس کے جی سے پوچھیے کہ وقت مقرر پر ریل کا سیٹی نہ دینا کتنے واہموں کو برا بیگتہ کر سکتا ہے ڈاکٹر صاحب نے کہا خاں صاحب سچ کہا ہے کسی نے

عشق است و ہزار بدگمانی

سیتاپور میں میری تعلیم کا سلسلہ ڈیڑھ سال سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ اور میری مفارقت کی تاب نہ لا کر غالباً سنہ ۱۹۰۸ء میں میرے باپ نے مجھ کو لکھنؤ طلب فرما کر حسین آباد کے ہائی سکول میں داخل کرادیا اور میرے قیام کے واسطے نخاس (چڑیا بازار) میں سید اعجاز حسین صاحب کے مکان کا بالائی اور کشادہ حصہ کرائے پر لے لیا گیا۔ میرے مکان کے نیچے ایک منشی واحد علی نوادر کی دکان تھی اس کی دکان کے سامنے کسی بزرگ کا مزار تھا جس پر ہر جمعہ رات کو چراغاں ہوا کرتا تھا اور اس کے اطراف میں ہر اتوار کو چڑیوں کا بازار لگا کرتا تھا اور میرے مکان کے عین سامنے حضرت ریاض خیر آبادی رہتے تھے۔

میں اس واقعے کو آج تک نہیں بھولا۔ کہ جس روز میں نے اس مکان کے چوڑے چکے سینے میں جس کے دونوں طرف نیچے سے اوپر تک بڑے شاداب گملے رکھے ہوئے تھے پہلا قدم رکھا تھا تو ہوائے سرد کے ایک تیز اور معطر جھونکے نے میرا اس دل نوازی سے استقبال کیا تھا کہ میرے سینے کی تمام کھڑکیاں تڑا تر کھل گئی تھیں اور جگر میں ایک ایسی نشہ آور خنکی محسوس ہوئی تھی کہ میں جھومنے لگا تھا۔

خدا گواہ ہوا رہے سر دوشکریں کا وہ پھولوں میں بسا باریک دھار والا جھونکا میرے سال خوردہ ارگرم و سرد کشیدہ سینے میں آج کی تاریخ تک محفوظ ہے اور رسا بسا ہا ہے اور میرے تھکے ہوئے پھیپھڑے اس کی تازگی کو اس تحریر کے وقت تک فراموش نہیں کر سکے ہیں۔

اس سکول میں آغا ئی صاحب کے پوتے اور میرے ساتھ میرزا حبیب حسین صاحب ہیڈ ماسٹر کے حکم سے یہ امتیازی برتاؤ کیا گیا تھا کہ تمام لڑکے تو بچوں پر بٹھائے جاتے تھے لیکن ہم دونوں کو کلاس ٹیچر کی میز کے داہنے بائیں کرسیوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اور وہیں میں چھٹے اور ساتویں درجے کا امتحان پاس کر کے آٹھویں درجے میں آ گیا تھا سید محمد جواد صاحب جو ہمارے دینیات کے معلم تھے۔ ہر چند مجھے دینیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر سید صاحب کے کلاس میں بڑے شوق سے جاتا تھا اور ان کی عربی و فارسی کی غیر معمولی قابلیت سے فیض یاب ہوا کرتا تھا۔ میرزا حبیب حسین صاحب اور سید محمد جواد صاحب کی شخصیتوں اور شفقتوں کو میں عمر بھر یاد رکھوں گا۔ اور اللہ جنت نصیب کرے مجھ میں اگر معصومیت ہوتی تو میں ان دونوں بزرگوں کے واسطے تمام عمر یہی دعا کرتا رہتا۔

۲۰ وہ مکان شہید کر ڈالا گیا ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر ایک نیا مکان تعمیر کرا کے اب وہاں ایک مطرب رہتے رہے آ کے سجادہ نشین قیس ہو امیرے بعد۔

اب کبھی جب کبھی پاکستان سے لکھنؤ جاتا ہوں اور اپنے وطن میں ایک پر دیسی کے مانند گھومتا ہوں جب نخاس کی طرف نکل جاتا ہوں وہ سب سے پہلا جھونکا چڑیا گھر کے درختوں سے اتر کر نیچے آتا ہے اور ہائے میرے شبیر کا دردناک نعرہ لگ کر میری گردن میں بانہیں ڈال دیتا ہے اور ہچکیوں پر ہچکیاں لینے لگتا ہے۔ جرنیلی ٹوپی اور سونے کے درکا وہ لڑکا جو وہاں سے حسین آباد سکول جایا کرتا تھا۔ میرے وجود کے احاطے سے نکل کر میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور بڑی رقت کے ساتھ پوچھتا ہے

کہ میں اب یہ ہو کر رہ گیا ہوں۔ اور اسی لمحے کے اندر میرا محبوب عطا حسین قزلباش جو اب اس دنیا میں نہیں ہے اور ہر روز مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ سیاہ شیروانی پہنے اور آنکھوں میں آنسو بھرے اس درد انگیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف آنکھیں اٹھا کر اپنا سر جھکا لیتا ہے جس مسکراہٹ کی دھاریوں میں کروڑوں نوے کروٹیں لیتے رہتے ہیں ہائے کھائے جارہی ہیں مجھ کو پرانی یادیں دل پھٹا جا رہا ہے میرا اے میرے اللہ!

اس زمانے میں میرے مکان کے سامنے اور حضرت ریاض خیر آبادی کے مکان کی دیوار کے نیچے دور تک گھوڑا گاڑیوں کا اڈہ تھا۔ جہاں پچیس تیس گاڑی والے رہتے تھے۔ اور ہر روز بلاناغہ صبح سے چارپانچ بجے۔ ایک صاحب و کٹوریہ روڈ کی طرف سے مولیٰ اعلیٰ امام علی مرتضیٰ علی گاتے ہوئے جیسے ہی میرے مکان کے سامنے سے گزرتے تھے تو گاڑی والے غمکی دار آواز میں نعرہ لگایا کرتے تھے۔ نواب صاحب بکرا حاضر ہے۔ اور وہ نواب صاحب ان کو گالیوں پر دھریا کرتے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی فحش لفظ زبان پر آجائے۔

جیسے ہی گاڑی والوں کی آواز بلند ہوتی تھی کہ نواب صاحب بکرا حاضر ہے ویسے ہی وہ بڑی سریلی اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہتے تھے اے آل رسول کے دشمنو اے معاویہ کے دنبو اے ابن زیاد کے اونٹو تم پر لعنت تم پر آخ تھو اے یزید کے پلو اے ابن ملجم کے بوکڑو۔ اے ہند جگر خوار کے پڑو۔ تم پر لعنت ہزار بار لعنت اے کنواریوں کے جنو لعنت لعنت ہزار بار لعنت آخ تھو آخ تھو اور ان گالیوں پر گاڑی والوں کے قہقہے بلند ہو جاتے تھے اور جب وہ گالیاں دیتے ہوئے گڑھے والی سرائے کی طرف مڑنے لگتے تھے تو گاڑی والوں کی آواز پھر بلند ہو جاتی تھی نواب صاحب بکرا حاضر ہے..... نواب صاحب بکرا حاضر ہے اور وہ اسی نوع کی گالیاں دیتے ہوئے مڑ جایا کرتے تھے اور اس طرف میرے گونڈے کے باشندے میاں نوروز باورچی کا بھی یہ معمول تھا کہ جب وہ نواب صاحب بکرا حاضر ہے کی آوازیں سنتے تھے..... تو

چارپائی پر اٹھ بیٹھ جاتے اور بڑبڑانے لگتے تھے کہ ان سالے گاڑے والوں پر نالت  
(لعنت) روج روج (روز روز) بکرا حاجر بکرا حاجر (بکرا حاضر) بیکھا کرت ہیں  
(چینا کرتے ہیں) یو (یہ) کا (کیا) وارے ہات (واہیات) پنا (پن) ہے سالے  
سویرے سویرے اللہ رسول کا نام تولیت (لیتے) ناہیں (نہیں) بکرا حاجر بکرا حاجر کا  
گل (نل) مچائے رہت (رہتے) ہیں تھوک ہے ان کی اوقات پر۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ اس نواب صاحب بکرا حاضر ہے کے ہنگامے میں کوئی گھنٹے  
دو گھنٹے بیشتر میں اپنا سبق یاد کرنے کے بعد دیوان حافظ کے مطالعے میں غرق تھا۔  
چاندنی چھٹکی ہوئی تھی تارے جھلملا رہے تھے۔ کہ سڑک پر میرے مکان کے نیچے سے  
بھیروں میں ڈھلی ایک تان لرزتی آئی۔

سحر بابادی گفتم حدیث آرزو مندی  
خطاب آمد کہ واثق شو بالطف خداوندی  
اور یہ بھی عجیب اتفاقیہ بت تھی کہ میں بھی اس وقت یہی غزل پڑھ رہا تھا صبح کا  
سہانا وقت نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے..... دھندلکے میں طلسمی شان اور اس پر یہ درد  
بھری تان..... میرے تمام بدن میں راگنی دوڑنے لگی۔

ابھی میرا تمام بدن گنگنا رہا تھا کہ اسی کوچ کے ساتھ دوسری تان سنی۔  
دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است  
بایں راہ و روش می رو کہ بادل دار پیوندی  
اور اصل وہ سرائے نہیں تھی بلکہ ٹکھائیوں کا چھوٹا اس محلہ تھا جواب سڑک میں آ  
چکا ہے۔

اب مجھ سے رہا نہیں گیا ایک ایک چھلانگ میں دو دو تین تین سیڑھیاں طے کرتا  
سڑک پر آ گیا۔ اور دیکھا کہ ایک گورے چٹے سفید داڑھی کے دراز قامت بزرگ  
میرے مکان کے نیچے والی قبر کی طرف منہ کیے دھیمے سروں میں گارہے ہیں۔



بایں راہ و روش می رو کہ بادل دار پیوندی  
 نہ جانے میرے دل پر کیا بیت گئی کہ میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ ان  
 بزرگ نے بڑی حیرت کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو مجھے موجود پایا۔ اور زیر لب کہا اللہ اللہ  
 یہ عمر اور اس قدر دردمندی..... میاں صاحب زادے تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں  
 طالب علم ہوں۔ وہ میرے قریب آ گئے اور کہا ”صاحب زادے ذرا ادھر سڑک کی  
 روشنی کے نیچے تو آ جاؤ“ میں روشنی کے کھمبے کے نیچے آ گیا۔ انہوں نے مجھے بڑے غور  
 سے دیکھا بار بار دیکھا..... اور اس طرح دیکھا جیسے کوئی چیز ان کی جاتی ہے..... اور پھر  
 کانپتی آواز میں دوبارہ پوچھا۔ صاحب زادے تم کون ہو؟..... میں نے پھر وہی کہا  
 طالب علم ہوں۔ انہوں نے یہ سن کر آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بڑی آہستگی  
 سے کہا صاحب زادے تم طالب علم نہیں مطلوب علم ہو۔ مطلوب علم ہو۔ ان کی آنکھوں  
 میں آنسو بھر آئے اور

در خرابات مغاں نور خدا می بینم  
 دیں عجب کہ چہ نورے زکجا می بینم  
 کہتے ہوئے کڑھ ابوتراب خاں کی ڈھال کی جانب مڑ گئے..... اور میں تا دیر اس  
 طرح مبہوت کھڑا رہا گویا میں اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوں۔ اور اس وقت بھی  
 جب کہ میں اس واقعے کو قلم بند کر رہا ہوں میرے رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ  
 چاندنی رات مجھ پر چھائی ہوئی ہے۔ اور ان بزرگ کی آواز کڑھ نواب ابوتراب خاں  
 کے موڑ سے اس وقت بھی میرے کانوں میں آرہی ہے۔

دیں عجب ہیں کہ چہ نورے نہ کجا می بینم!!



## میرا نکاح

میرا نکاح ایسا ویسا نہیں بڑی ضد م ضد اور بڑی چوٹ م چاٹا کا نکاح تھا۔ اس صورت حال کی تھوڑی سی تفصیل بھی سن لیجیے۔ میرے دادا نواب محمد احمد خاں کے مختلف البطن بھائی تھے نواب محمد نسیم خاں..... ان دونوں بھائیوں کے مابین حسب دستور خاندان بنی امیہ اور بنی ہاشم کے مانند بڑی ان بن اور بڑی تن پھن رہا کرتی تھی۔ میرے خسر نواب محمد نسیم خاں کے بیٹے تھے اور میں نواب محمد احمد خاں کا پوتا تھا اس لیے میرے خسر کے بڑے بھائی نواب محمد علی خاں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی کی لڑکی سے میرا نکاح ہو، لیکن چوں کہ میرے خسر اور میرے باپ کے درمیان دستور خاندان کے خلاف بڑی گہری محبت تھی اس لیے میرے باپ نے جب میرا پیام دیا تو انہوں نے منظور فرمالیا۔ اور ان کی منظوری سے میرے خسر کا تمام قبیلہ بگڑ گیا اور میرے چچا نواب محمد علی خاں کو خصوصیت کے ساتھ بے حد ملال ہوا..... اور اس بنا پر میرے نکاح کے موقع پر میرے نکاح کو خوشی کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرمائی کر رہا تھا کہ میرے خسر کے تمام قبیلے کے علی الرغم میرا نکاح ہو رہا ہے۔ اللہ اللہ میرے نکاح کا دھوم دھڑکا..... بڑی دھوم سے مچرے ہوئے دعوتیں ہوئیں، اور عین نکاح کے دن دشمنوں کو جلانے کے لیے اس قدر زور زور سے ڈھول پیٹے گئے اور اس قدر شدت سے تاشے بجائے گئے اور اتنے بڑے بڑے ہودزر گولے چھوڑے گئے کہ ان کی دوں دوں دناؤن دناؤن سے دور دور تک زمین ہلنے لگی۔ ہائے پٹھانوں کا مزاج!

اس وقت میری عمر ہوگی مشکل سے گیارہ بارہ برس کی۔

لیکن یہ نکاح آگے چل کر کیا رنگ لایا کتنا بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے بعد۔ اور میرے سہرے کے پھولوں نے کتنے کانٹے بودیے میرے باپ کی رہ گزار حیات میں اس کا ذکر آگے آئے گا۔

یوں تو نو برس کی عمر سے ہی شعر کی دیوی نے مجھ کو آغوش میں لے کر مجھ سے شعر

کہانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آگے چل کر جب شاعری سے میرا نہاک بڑھنے لگا تو شاید اس خیال سے کہ اگر میں شاعری میں ڈوب گیا تو میری تعلیم ناقص رہ جائے گی میرے باپ کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ خبردار اب اگر تم نے شاعری کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ اور اس کے ساتھ انہوں نے زنا نے میں بوا گلزار اور مردانے میں دارو گہ امید علی کو مامور فرمایا کہ وہ جب مجھے شعر کہتے دیکھیں تو ان کی جناب میں رپورٹ پیش کریں۔ باپ کے اس حکم امتناعی اور زنا نہ و مردانہ خفیہ پولیس کے تقرر نے مجھ کو بوکھلا دیا۔

۱۔ میری تو نو برس کی جان اور شاعری کے میلان پر تعجب نہ فرمائیے۔ ذرا سوچیے کہ وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو دادا بھی شاعر ہو دوسو تیلے چچا بھی شاعر ہوں بڑی کچھتی بڑی بہن اور بڑا بھائی بھی شاعر ہو جس کا حقیقی ماموں بھی شاعر ہو۔ جس کے باپ کا ماموں بھی شاعر ہو جس کی دادی میرزا غالب کی قرابت دار ہو اور اردو فارسی کے اشعار بر محل سناتی ہو جس کی انا خالص لکھنوی ہو اور رات کے وقت کھلی ہے کنج قفس میں مری زبان صیاد کی لوری دے دے کر اس کو سلاتی ہو جس کے گھر میں آئے دن لکھنو کے شاعر آتے جاتے اور تیسرے چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعراء کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا؟..... بوا گلزار اور دارو غہ امید علی جب مجھے شعر کہتے پکڑ لیتے تھے تو میں دانت نکال نکال کر استدعا کرتا تھا کہ خدا کے لیے میاں تک یہ بات نہ پہنچانا۔ لیکن وہ دونوں اس قدر بے مروت اور بے درد تھے کہ میری رپورٹ کرنے سے چوکتے ہی نہ تھے۔ بوا گلزار نے میری چغلیاں کھا کھا کر اس قدر روپیہ جمع کر لیا تھا کہ سونے جھونے سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا اور دارو غہ امید علی نے اس قدر انعام پایا کہ ایک آم کا باغ لگا لیا اور بہت سی زمینیں بھی خرید لیں۔ شاعری نے مجھ کو تو برباد کر ڈالا تھا مگر میرے مخبروں کے گھر بھر دیے

آپ	کو	سوخت	غیر	کو	لذت
یہ	مزا	ہم	کباب	میں	دیکھا

مشیت کا یہ فرمان کہ شاعری کر، شریعت کا یہ حکم کہ خبردار شاعری کے قریب بھی نہ پھٹک۔ اس میں کشمکش میں پڑ گیا کہ اپنی فطرت کا حکم مانوں اور کہ اپنے باپ کا خارجی فرمان قبول کروں۔

سوچنے لگا، میں اپنی ذات سے جدا کیوں کر ہو جاؤں۔ شعر کہتا ہوں تو باپ بگڑتے ہیں میں نہیں کہتا تو دل پر بگاڑ آتے ہیں۔ ادھر باپ کا حکم واجب الاذعان ہے ادھر فطرت کا ناقابل تسخیر میلان..... ادھر منشاء پدرا دھر تقاضائے قضا و قدر۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟ شعر کہوں تو باپ ڈانٹ پلائیں اپنے دسترخوان پر کھانا نہ کھلائیں اور شعر نہ کہوں تو دماغ کے پر خچے اڑ جائیں۔

میری حالت آدم و ابلیس کی سی ہو گئی..... آدم کو ممانعت ی گ، تھی کہ خبردار شجر ممنوعہ کے قریب بھی نہ پھٹکنا لیکن مشیت الہی کا تقاضا تھا کہ آدم لوٹ جی بھر کے مزے لوت شجر ممنوعہ کے اور ابلیس کو حکم دیا گیا تھا کہ جھک جا سجودے میں آدم کے روبرو۔ لیکن مشیت نے آنکھ دکھادی تھی کہ اگر بے اگر سجدی کر دیا تو ناک کاٹ ڈالی جائے گی جڑ سے۔

سو جس طرح آدم و ابلیس ممانعت و حکم سے روگردانی کر کے مشیت کے سامنے جھک گئے اور مجال نہیں تھی کہ منہ جھکتے اسی طرح میں حکم پدر سے روگردانی کر کے فرمان قضا و قدر کے آستان پر سربسجود ہو گیا۔

اس لیے میں شاعری ترک نہیں کر سکا۔ لیکن چوری چھپے شعر کہتا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا کسی گوشے میں جا کر ان کو لکھتا اور پرچے اپنے صندوقچے کے اندر مقفل کر دیتا۔ اور قاقا قیوں (سمگلروں) کی طرح اس صندوقچے کو اپنی ماں کے حوالے کر دیتا تھا کہ وہ اس کو چھپا کر رکھ دیں میری ماں کو میری اس حالت پر بڑا ترس آتا تھا مگر وہ اداس ہو جانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھیں۔



لیکن اس قدر مجرموں کی سی احتیاط کے باوجود میں اندر اور باہر کئی بار عین موقع پر شعر کہتا پکڑا گیا۔ میرا جیب خرچ بند ہوا، باپ نے اپنے ساتھ کھانا کھانا ترک کر دیا، اور اکثر تھپڑ بھی مارے اپنی ہر ذلت کے بعد میں نے بارہا اپنے کان پکڑ کر قسمیں کھائیں کہ اب کبھی شعر نہیں کہوں گا۔ اب کھائی سو کھائی اب کھاؤں تو رام دہائی۔ لیکن جیسے ہی میرے دل میں شاعری کی رگر گاہت ہونے لگتی تھی میری تمام قسمیں چور چور ہو کر رہ جاتا کرتی تھیں اور حضرت وحشت کا یہ شعر مجھ پر صادق آجایا کرتا تھا۔

مجال ترک محبت نہ ایک بار ہوئی  
خیال ترک محبت تو بار بار آیا

### شعر گوئی کی اجازت

ایک بار میں اپنی صندوقچے میں جیب سے پرزے نکال نکال کر رکھ رہا تھا کہ بوا گلزار نے دیکھ لیا اور وہ بھانپ گئیں..... میاں کو خبر کر دی۔ میاں آئے دن میری ماں سے کہا شبیر کا صندوقچہ کہاں ہے؟ میری ماں کا رنگ ہلکی سا ہو گیا۔ میاں کا خوف اس قدر تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکیں اور میرا صندوقچہ ان کے سامنے رکھ دیا میاں نے مجھ سے کنجی مانگی کانپتے لرزتے ہاتھوں سے میں نے کنجی دے دی انہوں نے صندوقچہ کھولا میرے پرزے ایک ایک کر کے نکالے..... میں اپنے گاپ کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے گائے اپنے کچھڑے کو چھری کے نیچے دیکھ کر کانپنے لگتی ہے۔ اور جب انہوں نے میرے تمام پرزے چرچر پھاڑ کر پھینک دیے تو میرے منہ سے ایک بڑی دردناک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا میری ماں دیوانہ وار مجھ سے چمٹ کر رونے لگیں۔ میاں کے حواس اڑ گئے دادی جان نے آ کر میرے باپ کو ڈانٹا کہ کیا بچے کو مار ڈالے گا۔

ڈاکٹر عبدالکریم کو میرے بے ہوش ہو جانے کی خبر کی گئی۔ انہوں نے میری نبض دیکھی اور کہا خان صاحب گھبرا ئے نہیں میں دوا ساتھ لایا ہوں۔ انہوں نے میرا منہ چیر کر دوا پلائی رئیس کی انا نے منہ پر چھینٹے مارے اور دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے ہوش

آگیا..... مجھے ہوش آتے ہی میرے باپ نے مجھ کو سینے سے لگا کر ارشاد فرمایا کہ بیٹا میں نے شعر کہنے کی تجھ کو اجازت دے دی..... میں تجھے خود اصلاح دیا کروں گا۔ ادھر آ کر دھم بھر کے لیے اس پلنگڑی پر لیٹ جائیں لیٹ گیا تو میرا جی بہلانے کے لیے انہوں نے مجھ سے کہا بیٹا اس شعر کے معنی بیان کر۔

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں شب وعدہ  
میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر  
اب شعر کی اجازت مل جانے کے بعد میری طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ میں نے ذرا اس کے دوست نے وعدہ کیا ہے کہ آج میں آؤں گا۔ اب شاعر اس شش و پنج میں ہے کہ میں گل بچھاؤں کہ کلیاں۔ اگر وہ ٹھیک وقت پر آنے والا ہے تو میں کھلے ہوئے پھول اور اگر وہ دیر سے آنے والا ہے تو میں بے کھلی کلیاں بچھا دوں؟

میاں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب معنی صحیح بیان کیے ہیں شبیر نے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا اس سے زیادہ صحیح معنی بیان ہی نہیں کیے جاسکتے۔ میاں نے کہا مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ لیکن طرز بیان میں اس نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ صاحب زادے پھر تشریح کر دیجیے۔ میں نے پھر ایک ایک لفظ دہرا دیا..... ڈاکٹر نے کہا۔ میرے نزدیک تو آپ کے صاحب زادے نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی ہے میاں نے ہنس کر کہا۔ آپ لاکھ ٹخن سنج اور حالی کے ہم وطن سہی پھر بھی جائے استاد خلیست سنیے اس کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اس نے کھلے ہوئے پھول کہا ہے کلی جب چٹک کر کھل جاتی ہے تو اس کو پھول کہا جاتا ہے۔ کھلاوٹ تو پھول کی عین ذات ہے اس لیے کھلے ہوئے پھول کہنا خوشو زوائد میں داخل ہے اور دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے کلی کے متعلق بے کھلی کلیاں کہا ہے حالانکہ کلی کو تو اسی لیے کلی کہتے ہیں کہ وہ ہنوز چٹک کر کھلی نہیں ہے اور بے کھلا پن اس کی عین ذات ہے۔ اس لیے بے کھلی کلیاں کہنا صرف اسراف الفاظ ہی نہیں ایک مہمل سی بات بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے

کہا بے شک آپ کا خیال درست ہے۔ پھول اور کلی کے ساتھ ان تو صیفی سابقوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد میاں نے ارشاد فرمایا اچھا ایک اور شعر کے معنی بھی بتا دو تو میں تمہاری شعر فہمی کو مان جاؤں گا۔

آ رہے ہیں لاش کے وہ ساتھ ساتھ  
اب ہماری قبر کتنی دور ہے  
یہ شعر سن کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط ہی نظر نہیں آیا اور سوچنے لگا۔ اور دس پندرہ منٹ سوچنے کے بعد میں خوشی سے اچھل گیا بستر سے اٹھ بیٹھا میں نے کہا شاعر کے جنازے کے جلوس میں اس کا دوست شریک ہے۔ شاعر کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ اس کے دوست کو پیدل چلتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہوگی اس لیے وہ سا غور کر کے عرض کیا میاں یہ شعر تو بہت آسان ہے..... اکتا کر پوچھ رہا ہے کہ اب ہمارے قبر کس قدر فاصلے پر رہ گئی ہے میاں نے جھک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ کو بہت داد دی اور اس امر کا اعتراف کر لیا کہ ان کو یہ شعر مہمل معلوم ہو رہا تھا میاں نے مجھ سے کہا تمہیں اس شعر میں فن کے نقطہ نظر سے کوئی عیب تو نظر نہیں آرہا ہے۔ میں بے چارہ فن سے واقف ہی کہاں تھا۔ میں نے کہا کوئی عیب نہیں ہے۔ میاں نے فرمایا اس کے پہلے مصرع میں تعقید ہے اور پھر مثالیں دے کر سمجھایا کہ تعقید کیا چیز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا خان صاحب آپ صاحب زادے کو شاعری سے باز تو نہیں رکھ سکتے۔ لیکن یہ بات ضرور سمجھا دیجیے کہ تکمیل تعلیم سے پیش تر اس مشغلے پر زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔

میاں نے فرمایا ڈاکٹر صاحب میں تعلیم سے بھی آگے کی بات سوچ رہا ہوں..... یعنی شاعری وہ چیز ہے جو شارع کو اس امر کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ وہ شعر کہنے اور شاعرانہ زندگی بسر کرنے کے علاوہ دنیا کا کوئی اور کام بھی کر سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ وہ بد بلا ہے کہ شاعر کے دل میں دولت کو اس قدر حقیر کر دیتی ہے کہ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مفلسی کا صید زبوں ہو کر رہ جاتا

ہے..... ڈاکٹر صاحب جی باوا کے پاس جس قدر جائے داد اور دولت تھی وہ میرے پاس نہیں ہے۔ اور میرے پاس جو جائے داد اور دولت ہے وہ میرے بعد اس کے سات بھائی بہنوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور اس کے پاس جائے داد کا جو حصہ آئے گا وہ اس قدر بڑا نہیں ہوگا کہ شاعر کی بے نیازی کو تا دیر برداشت کر سکے۔ اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھا کر کے دعا کے لیے ہاتھ بلند فرما دیے کہ اے اللہ میرے شبیر کو تباہی سے بچانا اور اس پر ایسی کرم کی نگاہ رکھنا کہ معاش کی خاطر اس کو دوسروں کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

۱۔ میرے باپ کے دادا یعنی حضرت گویا کو جی باوا کہتے تھے..... ۲۔ میاں آپ کی دعا قبول نہیں ہوئی آپ نے دعا مانگی تھی اس بارگاہ میں جہاں عمر خضر کی درازی کے علاوہ کوئی دعا قبول ہی نہیں فرمائی جاتی..... آپ کو خبر نہیں کہ آپ کی آنکھوں کا تارا شبیر ایک کثیر العیال و فقید المعاش بوڑھے کی صورت میں دادی غربت میں ٹھوکریں کھا رہا ہے وہ پاکستان آ کر ایک معمولی سی تنخواہ پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن اس جرم پر ملازمت اور دیگر وسائل معاش سے محروم کر دیا گیا ہے کہ وہ عزت نفس کے مرض میں مبتلا ہے (۲) کسی کے اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکاتا (۳) وہ اپنے ضمیر اور قلم کو فروخت نہیں کرتا (۴) اسے اپنے آبائی وطن سے نفرت نہیں ہے (۵) اور اس کا سب سے بڑا قصور جس سے بغاوت کی بو آتی ہے یہ ہے کہ وہ فقط پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو ہی نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام باشندوں کو وحدت کی زنجیر میں جکڑ کر ایک مستحکم اکائی اور ایک آفاقی ریاست بنانے کے شیطانی خواب دیکھتا رہتا ہے۔

میاں کاش میں آپ کی زندگی ہی میں مرجاتا اور آپ میرا جنازہ اٹھاتے اور مجھ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ مگر کیا کیا جائے قضا و قدر کی ستم ظریفی کو

طغیان	ناز	ہیں	کہ	جگر	گوشہ	خلیل
آرد	بز	بر	تیغ	و	شیہ	ش
					نہ	می
						کند



## پہلا مشاعرہ

یہ غالباً سنہ ۱۹۱۰ء یا سنہ ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ میں اپنے باپ کی معیت میں حضرت مولانا رضا فرنگی کے محلی کے مشاعرے میں پہلی بار شریک ہوا اور دنگ ہو کر رہ گیا۔

آئیے آپ کو اس مشاعرے میں لے چلوں تاکہ آپ خود دیکھ لیں کہ شفاف چاندنی کچھی ہوئی ہے چاندنی پر قالین ہیں گاؤں تکیے دیواروں سے لگے ہوئے..... ادھر ادھر صاف ستھرے اگالداں نیچوں میں ہار لپٹے حقے شال بانف سے منڈھی ہوئی چھوٹی چھوٹی کوری ہانڈیاں ہانڈیوں میں چاندی کے ورق کی معطر گلوریاں اور لالچئی دانے تنبا کو اور قوام کی ڈبیاں رکھی ہوئی ہیں شعراء زیادہ تر انگرکھے اور کم تر شیروانیاں پہنے اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں سب کے سروں پر ٹوپیاں ہیں سامعین میں سے کوئی بھی ننگے سر نہیں ہے۔ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی ہیں گلوریاں کھائی جا رہی ہیں اور حقے پیے جا رہے ہیں..... اور جو شاعر مشاعرے کے فرش پر قدم رکھتا ہے۔ وہ حاضرین کو جھک جھک کر غیر ملفوظ سلام کر رہا ہے حاضرین اس کے حسب مرتبہ نیم قد یا سرو قد جو ابی سلاموں سے اس کا خیر مقدم کر رہے ہیں..... لیجیے اب میر مشاعرہ کے سامنے شمع آگنی ہے اور مولانا رضا کی غزل سے حسب دستور مشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور داد سے چھت گونجنے لگی ہے کس کی یہ مجال ہے کہ اثنائے غزل خوانی میں کوئی مصرع نہ اٹھائے حقہ پی لے پان کھالے آپس میں سرگوشی کرنے لگے یا کوئی ادھر سے اٹھ کر ادھر بیٹھ جانے کی جسارت کر سکے۔

میر مشاعرہ کے بعد اب شمع گردش کر رہی ہے۔ نو مشتق نو جوانوں کی صفوں میں اور کمی بیشی کے ساتھ سب کو داخل رہی ہے۔ اور معمولی اشعار کے سروں پر بھی ماشاء اللہ کے سہرے باندھے جا رہے ہیں۔ لیجیے نو مشتقوں میں میری باری بھی آگئی۔ ارے غضب ہو گیا شمع سامنے رکھی ہوئی ہے رعب محفل سے میں کانپ رہا ہوں شعرا کی صفوں سے آوازیں آرہی ہیں بسم اللہ صاحب زادے بسم اللہ لیکن صاحب زادے کا

دم نکلا ہوا ہے کیا مجال کہ منہ سے ایک حرف بھی نکل سکے..... اب میرے باپ مجھ سے فرما رہے ہیں پڑھتے کیوں نہیں پڑھان کا بیٹا تو بارہ برس کی عمر سے ہی رن میں تلوار چلانے لگتا ہے..... اور ایک تم ہو کہ تم سے ایک غزل بھی نہیں پڑھی جارہی۔ اب میرزا محمد ہادی صاحب رسوا اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پہلو میں آگئے اور میری پیٹھ ٹھونک کر فرما رہے ہیں۔ صاحب زادے آپ تو شاعر شاعر کے بیٹے شاعر کے پوتے اور شاعر کے پڑپوتے ہیں۔ پڑھیے اور گرج کر پڑھیے..... اب بڑی ہمت کر کے میں مطلع پڑھ رہا ہوں مطلع پر داخل رہی ہے اور داد کے نشے میں شعر پڑھ رہا ہوں۔

اے نسیم صبح کے جھونکو یہ تم نے کیا کیا  
میرے مست خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں  
اس شعر پر مطلع سے زیادہ داد پارہا ہوں..... اور ولولے کے ساتھ دوسرا شعر سن رہا ہوں۔

میری آنکھیں جانتی ہیں کرب افراط خوشی  
خندہ زن دیکھا کسی کو اور گریاں ہو گئیں  
اب داد کا غلغلہ زیادہ بلند ہو رہا ہے۔ اور سبحان اللہ ماشاء اللہ سے مشاعرہ گونج رہا ہے۔ اور میرزا محمد ہادی رسوا حضرت صفی سے کہہ رہے ہیں مولانا دیکھیے آپ نے اس شعر کے تیور یہ عمر اور اتنی گہری بات..... اور اب میں آخری شعر پڑھ رہا ہوں۔  
ہائے میری مشکو، تم نے بھی کیا دھوکا دیا  
عین دل چسپی کا عالم تھا کہ آساں ہو گئیں  
دیکھیے چھتیس اڑ رہی ہیں اور دھویں پار ہو رہے ہیں اس شعر کی داد سے..... اور فرما رہے ہیں اللہ نظر بد سے بچائے۔

مشاعرے سے داد کے رطل ہائے گراں پی کر جھومتا جھومتا گھر آیا خوشی کے مارے دیر تک نیند نہیں آئی..... اور سو گیا تو خواب میں رات کو یہ دیکھتا رہا کہ پریاں

بھینچ بھینچ کر مجھے گلے لگا رہی ہیں۔

غسل مجھ پر واجب ہو گیا..... صبح اٹھتے ہی حمام کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر جب اپنے باپ کی خواب گاہ کے برآمدے سے ہو کر گزرنے لگا تو باپ کی آواز آئی ادھر آئیے جناب ادم نکل گیا اس آواز غضب سے..... اور جب لرزتا ہوا..... ان کی خواب گاہ میں گیا تو انہوں نے بڑی بھاری آوازیں ارشاد فرمایا دیکھیے صاحب! یہ میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس دنیا میں پھلیں پھولیں عمر مسیح و خضر پائیں آپ کی دولت میری دولت سے بڑھ جائے آپ کا مرتبہ مجھ سے ہزار گنا فزوں ہو جائے آپ زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لے جائیں مجھ سے..... مگر کان کھول کر سن لیجے کہ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ خاں صاحب آپ مجھ سے شاعری میں بھی بڑھ جائیں۔ رات کے مشاعرے میں آپ کو مجھ سے زیادہ داد ملی اب آپ کا میرے ساتھ مشاعرے جانا بند..... قطعی بند..... غضب خدا کا باپ سے زیادہ بیٹے کو داد ملے میں یہ الٹی گنگا بہنے کا موقع نہیں دینے کا..... سنا خاں صاحب آپ نے؟؟

میرے باپ میر کو غالب پر ترجیح دیتے ہلکی پھلکی زبان میں شعر کہتے اور داغ کے اس شعر پر عامل تھے۔

کہتے ہیں اسے زبان اردو

جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

ایک روز میں نے ان کی خدمت میں اپنی ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی جس میں جا بجا فارسی کی ترکیبیں تھیں۔ اور ایک مصرع تھا۔

ہماری زندگی یعنی وفائے رازداں تک ہے

اغصے کے وقت یہی ان کا لہجہ ہو جایا کرتا تھا۔ غالباً سچ کہا گیا ہے کہ Artis

selfish

انہوں نے تیوریوں پر ڈال کر ارشاد فرمایا سبحان اللہ یعنی وفائے رازداں تک اس

یعنی کی داؤ نہیں دی جاسکتی..... مجھے اس بات کا شدید خوف ہے کہ آٹھ دن میں..... شمار سبھ مرغوب بت مشکل پسند آیا تک آ جاؤ گے۔ نا صاحب میں تمہیں اصلاح نہیں دوں گا۔ اور تمہیں عزیز صاحب کے سپرد کروں گا۔ وہ بھی یعنی وفائے رازداں اور شمار سبھ کے برتن والوں میں سے ہیں دونوں میں خوب نباہ ہو جائے گا..... یہ فرما کر انہوں نے عزیز صاحب کو بلا کر مجھے ان کا شاگرد بنا دیا..... اور یہ سلسلہ تلمذ پانچ چھ برس کے اندر ہی منقطع ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عزیز بہت ہی اچھے استاد اور بہت ذی علم بزرگ تھے..... اور جہاں تک کہ زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے ان کی ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا لیکن جب مجھ کو واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ میری فکر کا جادہ ان سے مختلف ہے اور ہم دونوں کی تخیل ایک ہی سمت پر سفر نہیں کر رہی ہے اور ان کی اصلاحوں سے اشعار کا لفظی رنگ و روغن تو ضرور ابھر آتا ہے لیکن معنویت دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تو میں نے اصلاح لینا ترک کر دیا۔

لیکن اسے سے میرے اور ان کے تعلقات میں کسی قسم کی تلخی راہ نہیں پاسکی۔ میں ہمیشہ ان کے روبرو سر جھکاتا اور وہ ہمیشہ میرے سر پر ہات پھیرتے رہے۔

ایک دن جب کہ میں بڑے دن کی تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔ میری ماں نے برے درد بھرے لہجے میں مجھ سے ارشاد فرمایا ننھے تمہارے باپ میرٹھ والی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں میں سو تیا ڈاہ نہ نہیں سکوں گی۔ مجھے میرے باپ کے گھر پہنچا دو۔ ورنہ میں سنکھیا کھا کر سو جاؤں گی۔ ماں کی یہ بات سن کر میرا دل کانپ گیا۔ میں نے عرض کیا اماں آپ گھبرائیں نہیں میں آپ کو چھ سات دن کے اندر ہی مانا جان کے وہاں پہنچا دوں گا

اس کے بعد میں نے بڑے بھائی شفیق احمد خاں اور ابرار حسن سے مشورہ کیا اور بات بٹانے کو کہا..... وہ دونوں آمادہ ہو گئے..... لیکن سوال یہ تھا کہ اتنے بڑے اور وہ



بھی ریز رو کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔

ہم دو روز تک یہی سوچتے رہے کہ روپیہ کیونکر فراہم کیا جائے لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی۔ تیسرے دن ابرار آئے اور کہنے لگے کیا کہیں گے آپ بھی روپے کی ایسی تدبیر سوچ کر آیا ہوں کہ پٹہ نہیں سکتی۔ آپ جانتے ہیں کہ بشیر مانموں (میرے باپ) اور محمد علی چچا کے درمیان آج کل ان بن ہے آپ اسی وقت ان کے پاس چلے جائیں اور ساری داستان سنائیں۔ اور مجھ کو یقین ہے کہ بشیر مانموں کی دل آزاری کے واسطے وہ کھٹ دے ڈیڑھ دو ہزار روپے دے دیں گے۔

مجھے ابرار کی یہ تدبیر پسند آئی اور جی کڑا کر کے محمد علی چچا کی طرف روانہ ہو گیا اور جب ان کی کوٹھی کے لکڑی کے زینے پر پہنچا تو یہ دیکھا کہ وہ ایک جڑواں صوفے پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ اور ان کے پہلو میں ایک بلا کی نوخیز طوائف بیٹھی گنگنا رہی ہے۔ اور سامن صوفے پر چچا کے مصاحب سکندر میرزا صاحب اس کے گلے کی داد دینے میں سرگرم ہیں۔

یہ سوچ کر کہ میں بے موقع آ گیا ہوں میرا دل چاہا کہ اٹے پاؤں چلا جاؤں لیکن اس نوخیز طوائف کی صورت اور اس کی آواز نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ اور میں نظر جمائے اور طاقت سماعت کو حاضر کیے اس کی صورت دیکھنے اور اس کا ترنم سننے لگا کہ اتنے میں چچا نے حقہ کا ایک لمبا سا کش لے کر دروازے کی جانب نظر اٹھائی تو دیکھا میں کھڑا ہوا ہوں اور حیرت و شرم کے ساتھ ان کے منہ سے نکل گیا..... ارے غلام شبیر! میں نے سلام کیا۔

وہ طوائف اچھل کر کھڑی ہو گئی اور میرے دل پر شہاب ثاقب کی سی لکیر ڈالتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور سکندر مرزا صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلے گئے۔

چچا سے میں نے تمام ماجرا بیان کر کے دو ہزار طلب کیے۔ انہوں نے زبان سے

ایک حرف بھی نہیں کہا اٹھے اور الماری سے دو ہزار کے نوٹ نکال کر میرے حوالے کر دیے میں نے چچا کو جھک کر سلام کیا۔ اور اس طوائف کو پھر ایک نظر دیکھنے کی تمنا لیے ہوئے گھر آ گیا۔

امیرا پہلا نام غلام شبیر تھا پھر شبیر احمد ہو گیا اور بعد میں میں نے اس کو شبیر حسن سے تبدیل کر دیا لیکن چچا مجھ کو ہمیشہ میرے پہلے نام سے ہی پکارتے رہے۔

روپیہ آ گیا تو ابرا کو لکھنور روانہ کر کے ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کوریئر روکرا کے ملیج آباد منگا لیا۔ اور شام ہوتے ہی مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم سب اپنے کمپارٹمنٹ میں آ گئے۔ اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند کر کے روشنی گل کر دی۔ تھوڑی دیر میں لکھنؤ جانے والی گاڑی آ گئی۔ اور ہمارا درجہ بریک کے پیچھے لگا دیا گیا۔

ابھی گاڑی چھوٹنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ پلیٹ فارم پر میرے باپ کی آواز گونج اٹھی ”اسٹیشن ماسٹر صاحب کیا اس گاڑی میں لڑکے سفر کر رہے ہیں؟“ اسٹیشن ماسٹر کو رشوت دے کر ہم اپنا چکے تھے۔ اس نے کہا ”خاں صاحب آپ کے صاحب زادوں میں سے اس گاڑی میں کوئی سفر نہیں کر رہا ہے۔“

میرے باپ کو اطمینان نہیں ہوا۔ اسٹیشن ماسٹر سے فرمایا دو چار منٹ گاڑی رکوا لیجئے تاکہ میرے آدمی ایک ایک درجے کو دیکھ لیں ممکن ہے آپ کی نظر نہ پڑی ہو“ گاری رکوا دی گئی..... اور نوکر چاکر اور اقرانے پوری گاڑی کھنگال ڈالی ہم نہیں ملے ہم تو اندھیرے درجے میں بریک کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ کسی ڈھونڈنے والے اور خود میاں نے بھی ہمارے ڈبے کی طرف اس خیال سے نظر بھی نہیں اٹھائی کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ ڈبہ خالی جا رہا ہے۔

گاڑی تقریباً پانچ چھ منٹ تک ملیج آباد اسٹیشن پر کھڑی رہی اور ان چند لمحوں کے اندر ہزاروں صدیوں کا مجموعی خوف ہمارا احاطہ کیے رہا..... ہم سب اتنی دیر تک سولی پر

لٹکے رہے میاں کی آواز بجلی کی طرح ہمارے دلوں پر گر رہی تھی۔ اور میں اندر سے چٹخنی لگی کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اب ٹوٹیں اور اب ٹوٹیں۔ مجھ کو اپنے انفاس کی آمد و شد سے ڈر لگ رہا ہے۔ پسینے پر پسینے آرہے تھے تمام جسم برابر بھیکتا چلا جا رہا تھا۔ اور دل یوں کھٹ کھٹ کھٹ دھڑک رہا تھا کہ ہر بار یہ گمان ہوتا تھا کہ سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

خدا جانے کس نے مخبریٰ کر دی تھی یہ بات آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔

خدا کی قسم اس وقت اگر ڈائن موت جبر اکھول کر سامنے آ جاتی کہ میرے جبروں میں آؤ گے یا باپ کے قبضے میں جاؤ گے۔ تو میں فوراً اس کے جبروں میں گھس جاتا کہ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی سیٹی کی آواز سے میں دہل گیا پیہوں میں چوں چوں شروع ہوئی گاڑی ریگنے لگی۔ اوپر کی سانس نیچے آئی کھڑے روٹنے بیٹھنے لگے۔ سانس کا نظام درست ہونے لگا اور جب کاکوری کے پل پر گاڑی پہنچ گئی تو میں نے جیسے ہی درجے کی روشنی کھولی تو یہ دیکھا کہ میری ماں سجدے میں ہیں۔ عباسی خانم مغلائی فرش پر اونڈھی پڑی ہوئی آہستہ آہستہ نادعلی پڑھ رہی ہیں۔ اور ابرار اور بڑے بھائی سیٹوں کے نیچے سے برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ سماں دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی ابرار نے قہقہہ لگایا اور بھائی صاحب کے تیوروں پر بل پڑ گئے..... اماں میری بلائیں لینے لگیں..... لیکن عباسی خانم بدستور اونڈھی پڑی رہیں..... یہاں تک کہ چار باغ آ گیا۔

ٹوئڈلہ جنکشن پر گاڑی رکی تو ایک لمبے تڑنگے بڑی بڑی گیسے دار مونچھوں کے تھانہ دار صاحب آٹھ پولیس والوں کے ساتھ آئے اور بڑے تحکمانہ انداز میں پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟..... میں نے بگڑ کر کہا رستم دوراں شبیر حسن خاں، سر سے لے کر پاؤں تک اس نے مجھ کو دیکھا اور کہا ”میں آپ سب کو یہاں اتار لینے کے واسطے آیا ہوں“ میں نے بھنا کر جواب دیا ”کس کی مجال ہے جو ہم کو اتار لے؟“ اس نے حکم دیا سپاہیوں کو

کہ ان کا سامان اتار لو۔ میں میرے بھائی اور برابر ڈنڈے لے لے کر پلیٹ فارم پر کود پڑے۔ اور میں نے پولیس والوں کو ڈانٹ کر کہا۔ خبردار ہمارے درجے میں قدم نہ رکھنا۔ نہ اتنے میں ہمارے درجے کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے تھانہ دار نے انگلی بلند کر کے کہا میں اسباب اتروائے بغیر نہیں مانوں گا۔ میں نے ڈنڈا زمین پر مار کر کہا اگر ہمت ہے تو سامان اتار کر دیکھ لو تھانہ دار نہیں کہا آپ نہیں مانیں گے میں نے کہا جب تک زندہ ہوں میں نہیں مانوں گا۔ لوگوں کا ہجوم اور ہماری آوازوں کا شور سن کر سٹیشن کے انگریز سپرنٹنڈنٹ کو ہمارے درجے کی طرف کھینچ لایا آتے ہی اس نے تھانہ دار سے انگریزی میں پوچھا ”معاملہ کیا ہے.....؟“ تھانہ دار نے بڑی نرم آواز میں جواب دیا کہ ”میں ان لڑکوں کے باپ اور نانا کا ملنے والا ہوں ان کے باپ نے مجھے تار دیا ہیکہ وہ دوسری گاڑی سے یہاں آ رہے ہیں مں ان کے خاندان کو یہاں اتار لوں“ ریلوے سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا ”گرفتاری کا وارنٹ ہے آپ کے پاس؟“ تھانہ دار نے جھینپ کر اور ڈر کر کہا کہ یہ باپ اور بیٹوں کا پرائیویٹ معاملہ ہے اس میں وارنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کے بگڑ کر کہا آپ قانون کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ پولیس افسر ہو کر آپ ایسی خلاف قانون باتیں کر رہے ہیں اور وہ بھی ریلوے پلیٹ فارم کے سے پبلک مقام پر..... آئیے میرے دفتر میں۔

اس کے بعد ہمارا درجہ آگرے جانے والی گاڑی سے جوڑ دیا گیا۔ اور ہم آگے اور آگرے سے دھول پور پہنچ گئے۔ اور نانا جان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ ہماری داستان سن کر میری سوتیلی نانی ہنے نانا جان سے کہا تم بشیر احمد کے غصے کو نہیں جانتے۔ وہ بڑا غضب ناک پٹھان ہے۔ اسی وقت مہاراجہ کے پاس جاؤ اور ان سے پورا حال کہہ کے حویلی کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ بٹھا دو۔ نانا جان اسی وقت مہاراجہ کے پاس گئے اور حویلی کے گرد پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔

دوسری گاڑی سے میرے باپ دھول پور آ گئے لیکن انتہائی دانش مندی کی بناء پر



ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے اور اپنے بہنوئی نواب احمد خان کو جو میرے بڑے بھائی کے خسر تھے مانا جان کی حویلی سن گن لینے کے لیے روانہ کر دیا۔

نواب پھپانے آکر جب پہرے دار چوکی کا حال بتایا تو میرے باپ نے نواب پھپا سے کہا میں آپ کے ساتھ گاڑی میں چلتا ہوں گاڑی کو باہر روک دوں گا آپ نواب صاحب کے پاس چلے جائیں میرا سلام کہیں اگر وہ مجھے بلائے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میرے بلائے سے ابا کریں تو آپ حویلی سے نکل کر ڈیوڑھی کے چبوترے پر کھڑے ہو جائیں اور کسی نوکر سے کہیں کہ نواب صاحب نے اپنے داماد کو بلایا ہے وہ پھاٹک پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں انہیں بلا لاؤ..... یہ جادو چل گیا میرے باپ مانا کی حویلی میں پہرے داروں کا سلام لیتے ہوئے داخل ہو گئے۔

مانا جان سنگ مرمر کی چوکی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ کہ کھلے ہوئے زینے پر میرے باپ کی پیشانی نمودار ہوئی۔ نانی نے چیخ مار کر کہا ارے بشیر احمد مانا نانی کی چیخ سن کر گھبرا گئے۔ بات لگا تو حقا گر گیا اور چلم ٹوٹ گئی۔ ہم سب لوگ گدا گدا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور سامنے کے سنگین کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈیاں لگالیں۔ حواس غائب ہو گئے۔ اور عباسی خانم کے پاس سے کھراہند کے بھکے آنے لگے۔

لیکن یہ دیکھ کر کہ میاں نے مانا جان کو جھک کر سلام کیا۔ اور ان کا ہات اپنے سینے سے لگا کر روتے ہوئے کہا کہ بابا آپ کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے عقد ثانی کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا۔ نہ جانے کس نے ان کے کان بھر دیے ہیں کہ یہ لوگ مجھ سے بگڑ کر یہاں آ گئے۔ میں اپنے والد مرحوم کی روح کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر عقد ثانی نہیں کروں گا۔ اور سچے دل سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کی صاحبزادی اور اپنے بچوں سے مجھے یہ شکایت مطلق نہیں ہے کہ وہ سب یہاں کیوں چلے آئے ہیں۔ اگر ایسی افواہ سنا کہ وہ اپنی ماں کی مدد نہ کرتے اور ان کو آپ کے قدموں تک نہ

پہنچا دیتے تو میں ان کی شرافت سے مایوس ہو جاتا۔ اور یہ سمجھ لیتا کہ جو بچے اپنی ماں کے ساتھ وفا نہیں وہ میرے کیا ہو سکتے ہیں۔

یہ سن کر مانا کا چہرہ بحال ہو گیا۔ میری ماں کو آواز دی کہ اپنے بچوں کو لے کر یہاں آ جا۔ ہم آئے تو میاں نے ہم سب کو گلے سے لگالیا۔ اور فرمایا میرے گھر کے ڈوبے آفتاب یہاں مل گئے خدا کی قسم میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ اور تم نے اپنی ماں کو ریز رو گاڑی میں لا کر میری لاج رکھ لی ہے..... اگر خدا نہ خواستہ تم عام درجے میں لاتے تو میں زندگی بھر کسی کو منہ نہ دکھا سکتا۔

جب ہم سب ملیں آباؤا گئے تو میرے باپ نے میری ماں سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپ کے یہ بڑے صاحب زادے یہاں کس شرط پر تشریف لائے ہیں میری ماں نے پوچھا کس شرط پر میرے باپ نے فرمایا اس شرط پر کہ میں امانی گنج کا پورا باغ ان کے نام لکھ دوں۔ میری ماں نے چھاتی پیٹ کر کہا ہے ہے شفیع احمد شریف بیٹے باپ سے یہی برتاؤ کرتے ہیں؟؟

میرے باپ قول کے دھنی تھے دوسرے ہی روز امانی گنج کا باغ بھائی صاحب کے نام لکھ دیا، اور فرمایا شبیر کل اس کے جواب میں بڑا باغ، جو اس سے آٹھ گنا بڑا ہے تیرے نام لکھ دوں گا۔ میں نے کہا ”میاں آپ مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں تو میرے نام نہیں اماں کے نام لکھ دیجیے۔“ میاں نے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا ”شباباش شباباش تو بڑے دل کا آدمی ہے۔ اور دوسرے دن بڑا باغ میری ماں کے نام لکھ دیا۔

۱۔ میاں کے انتقال کے بعد جب میری ماں بڑا باغ میرے نام منتقل کرنے لگیں تو میں نے کہا اماں رئیس احمد کو بھی شریک کر لیجیے میری ماں نے ہم دونوں کے نام باغ لکھ دیا۔ اور ہم کو ہماری نیت کا پھل مل گیا۔



## ایم اے اور کالج میں میرا داخلہ

میرا غالباً سنہ ۱۹۱۲ء میں وہاں کے سکول میں داخلہ ہوا تھا اور مجھے ممتاز ہاؤس کے نمبر ۴۲ کمرے میں جگہ دی گئی تھی اس کمرے میں کاکوری کے دو سگے بھائی ثابت علی اور ثامن علی پہلے سے موجود تھے۔ اور میرے قیام سے تثلیث پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان دونوں بھائیوں کے چلے جانے کے بعد رام پور کے دو سگے بھائی برکت اللہ خاں اور محسن اللہ خاں میرے کمرے میں آ گئے..... ہمارا وہ دو سگے بھائیوں اور ایک دوسرے خاندان کے طالب علم والا کمرہ بورڈنگ ہاؤس کے سب پراکٹر مظہر علیم صاحب فرید آبادی کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ ہر چند مظہر علیم صاحب مہربان استاد تھے مگر ایک ناگفتنی علت کی بنا پر ہمارے مابین رقابت پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ محسن اللہ خاں عبد الجلیل خاں اور مجھ سے ناخوش رہا کرتے تھے۔

میرے زمانے میں قدیم وضع داری کے مکمل علم بردار نواب وقار الملک سیکرٹری سید احمد کی آنکھیں دیکھے ہوئے میر ولایت حسین صاحب پراکٹر جن کا تمام کالج احترام کرتا تھا اور جن کی شفقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا سب کے دلوں پر

۲ یعنی محمدن اینگلو اور سنل کالج یہ مسلمانوں کو غیر اسلامی خطاب دینے والا غلامانہ انگریزی نام اس کالج کے بانی ان سید احمد نے (جن کے کاسہ سر میں سر کے خطاب کا ہندوستان شکار عقاب اپنا آشیاں بنا چکا تھا) اپنی ذہنیت کے اس تیشہ زبوں سے تراشا تھا۔ جس سے حب وطن کے پہاڑ کاٹے جاتے تھے اور عشرت کدہ پرویز کی جانب جوئے شیر لائی جاتی ہے۔ اور یہ خدا بخشے انہیں خویش دشمن و بیگانہ دوست بزرگ کا موروثی اثر یہ کہ جو آج تک ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور جس کے باعث ہم آزاد ہو جانے کے باوجود آج بھی اپنے سرکاری محکموں تہذیبی اداروں اور اپنے شہر کے محلوں کو پی آئی ڈی سی رائٹرز گلڈ اور پی ای سی ایچ سوسائٹی کے انگریزی نام عطا فرما کر

فخر محسوس کر رہے ہیں اور یہاں تک کہ اپنے ناموں کے سروں پر ٹی پی  
 عبداللہ..... اے ڈی اظہر..... وائی ایف مجیب..... اور ڈبلو ڈبلو رحمن کے گندے  
 تو کرے لادلا دکر اس آرزو میں مرے جا رہے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ہم غلاموں کو فرنگی یا  
 کم سے کم کرستان ہی سمجھ لے اور ہماری کالی نیٹویت پر انگلستان کا گورا پن چھا  
 جائے۔ دراصل علی گڑھ تحریک اٹھائی ہی گئی تھی اس غرض سے کہ (۱) مسلمانوں کو  
 ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بے تعلق ثابت کر کے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کر دی  
 جائے کہ مسلمان کا دل محبت وطن کی سی ذلیل چیز سے قطعی آلودہ نہیں ہے۔ (۲)  
 مسلمان کو پیٹ پالنے کی خاطر فقط اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ بابویا ڈپٹی کلکٹر بن کر  
 بڑا بابو بن سکے (۳) اپنی زبان کو فراموش کر کے انگریزی میں اس قدر غرق ہو جائے  
 کہ وہ انگریزی میں سوچے اور انگریزی میں خواب دیکھے (۴) وہ مغربیت اختیار کر  
 کے مشرق سے اس قدر بیزار ہو جائے کہ اپنی معاشرت اپنی زبان اپنے ادب اپنے  
 روایات اپنی ثقافتی وراثت کو ذلیل اور یہاں تک کہ اپنے باپ دادا تک کو احمق سمجھنے  
 لگے (۵) اور اس کا نتیجہ ہو کہ حکومت برطانیہ کو دوام حاصل ہو جائے۔ اس میں کوئی  
 شک نہیں کہ مزاج روزگار کی کارفرمائی کی بدولت اس شر سے خیر اور اس نقصان سے  
 کچھ فائدے کے پہلو بھی نکل آئے لیکن جب آخری حساب کتاب کے بعد میزان کل  
 کی نوبت آئی تو پتا چلا کہ اس کاروبار میں نفع بہ کم اور گھانا بہت زیادہ ہوا..... اور قلیل  
 سود کا کثیر زیاں احاطہ کیے ہوئے ہے۔

ہمارے دور کالج کے ڈاکٹر تھے شفاعت اللہ صاحب جن کو ہماری شریر پارٹی نے  
 یہ دھمکی دے کر ہموار کر لای تھا کہ اگر آپ ہم لوگوں کو ہمارے مطالبے پر فرضی بیماری  
 کی چھٹیاں نہیں دلائیں گے اور ہماری فرضی بیماری کے موقع پر ہمارے پرہیزی  
 کھانوں میں کباب پراٹھے اور مرغ مسلم تجویز نہیں کریں گے تو ہم آپ کا نام ہلاکت  
 اللہ رکھ کر اس نام کو اس قدر شہرت دیں گے کہ معائنے کے ہنگام آپ جس بورڈنگ



ہاؤس میں بھی داخل ہوں گے وہاں کے درودیوار ہلاکت اللہ ہلاکت اللہ نے نعروں سے گونجنے لگیں گے۔

اسی طرح ہماری پارٹی نے ڈاک خانے والوں کو بھی اس قدر ڈرا دیا تھا کہ جب ہم علی گڑھ سے باہر سیر کرنا چاہتے تھے تو وہ ہمارے گھروں سے بلاوے کے فرضی تار ہمارے نام بھیج دیا کرتے تھے۔

ہمارے خاص معلم تھے واجد علی صاحب شیدا اور قاضی عبدالجلیل صاحب مراد آبادی واجد علی صاحب بڑے بڑے مزے کے آدمی تھے وہ جب کسی حسین طالب علم کو دھیلے سے تھپڑ مارتے تو اس یک گالوں پر آہستہ آہستہ ہات پھسلا کر دونوں آنکھیں میچ لیا کرتے تھے انہیں کی فرمائش پر میں نے ایک انگریزی فلم لارڈ یونس ڈائر کا اردو انظم میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ میری غالباً پہلی یا دوسری انظم تھی جو تلف ہو چکی ہے۔ اور ہمارے دوسرے معلم قاضی صاحب بلا کے ظریف انسان تھے اور ان کا یہ مزاحیہ دعویٰ تھا کہ انگریزی زبان اردو کے بطن سے پیدا ہوئی ہے..... اور ابتدا میں ایک بوڑھا انگریز تھا جو اردو بولنے والوں کے الفاظ اپنے لہجے میں لکھ لیا کرتا تھا اور اس کی وہی بیاض انگریزی زبان کا سرمایہ بن گئی۔

وہ کہتے تھے کہ یہ ڈائر فادر منڈر اور ڈیکوریشن کے الفاظ دراصل دختر پدما در سراندر اور دیکھو رے شان سے بنائے گئے ہیں جن کا تلفظ بگڑ گیا ہے۔ اور انگریزی میں طوائف کے لیے جو پراسٹیٹیوٹ کا لفظ ہے وہ ہماری اردو پرانے واسطے کی کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔

میرے دور کا علی گڑھ ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کا علی گڑھ ہے۔ اس زمانے کے طالب علموں میں کوئی اودھی تھا۔ نہ پنجابی نہ بنگالی تھا نہ بہاری۔ صوبوں کے تعصبات کی کسی کو خبر ہی نہ تھی اور جتنے بچے تھے وہ سارے ایم اے او کالج کے بچے اور آپس میں شیر و شکر تھے اور ان کے مابین اس قدر مضبوط اتحاد تھا کہ سارے شہر پر دھاک بیٹھی ہو

ی تھی ہماری۔ اور یہاں کی پولیس بھی لرزہ بر اندام رہتی تھی۔ ہم سے اور اگر کسی لڑکے پر کوئی آنچ آجاتی تھی تو سارا کالج دوڑ پڑتا تھا اس کی امداد کے واسطے۔

اپنی پارٹی کے تمام ارکان کے نام مجھ کو یاد نہیں رہے ہیں۔ پٹنہ کے سید عباس علی سید مبارک علی رام پور کے محسن اللہ خان جوار علی گڑھ کے عبد الجلیل خاں کے نام فراموش نہیں ہوئے۔ اور یہ بھی حافظے میں محفوظ ہے کہ اس پندرہ بیس لڑکوں کی ٹولی کے سردار تھے عبد الجلیل خاں اور ان کے نائب تھے محسن اللہ خاں۔

ایک بار جب ہم پانچوں لڑکے یعنی عباس علی مبارک علی محسن اللہ عبد الجلیل، اور میں سالانہ امتحان میں پاس ہو گئے تو ہم لوگوں میں اہ مسکوٹ ہوئی کہ پاس ہونے کی خوشی میں آگرے جا کر دوا لی دیکھیں۔

لیکن اس عیاشی کے واسطے روپیہ کہاں سے آئے اور چھٹی کیونکر ملے؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ عباس علی نے یہ مشورہ دیا کہ ہم سب اپنے اپنے باپوں کو خط لکھ کر اپنے اپنے پاس ہونے کی خوشخبری سنائیں اور نئے کورس کی کتابوں کی غلط سلط لمبی چوڑی فہرست بھیج بھیج کر اپنے اپنے گھروں سے پان پان سو روپے منگائیں۔ یہ تجویز پنچوں نے بہت ہی پسند کی۔ سب نے اپنے باپوں کو اسی مضمون سے خط بھیجے۔ میں نے بھی اپنے باپ کی خدمت میں خط روانہ کر دیا۔

مجھے خط لکھے چھ سات روز ہو چکے تھے تو ایک دن دیکھا کہ داروغہ امید علی خاں چلے آ رہے ہیں انہیں دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ ہونہ ہو دال میں ضرور کچھ کالا ہے داروغہ صاحب کمرے میں آئے میں نے سلام کیا۔ سب کی خیریت پوچھی اور ان کے آنے کا سبب بھی دریافت کیا۔ انہوں نے کہا خان صاحب منی آرڈر کر رہے تھے مگر بڑا بھیا (میرے برادر بزرگ) نے کہا رقم کسی کے ہاتھ براہ راست ہیڈ ماسٹر کے پاس بھیج دی جائے مین سن سے ہو کر رہ گیا۔ لیکن چہرے سے پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ اور محسن اللہ کے پاس جا کر جو اس وقت جلیل کے کمرے میں گئے ہوئے تھے سارا

ماجرا بیان کر دیا محسن تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد آئینہ دیکھنے لگے میں نے کہا ماشاء اللہ مصیبت میں گھرا ہوا ہوں اور تم آئینہ دیکھ رہے ہو۔ انہوں نے مسکرا کر کہا تمہاری مشکل حل کرنے کے لیے ہی آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ ..... انہوں نے کہا یہ تم تو چغد ہو میری بات سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔ میں آئینے میں دیکھ رہا ہوں کہ میں انگریزوں کی طرح خوب گورا چٹا ہوں اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میری آنکھیں بھی انگریزوں کی طرح کرنچی ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا گھانس کھا چکے ہو؟ انہوں نے کہا تم بھی کتنی موٹی عقل کے آدمی ہو..... جاؤ کمرے میں سے میرا کالا سوٹ میرا بوٹ، ٹائی اور ہیٹ لے آؤ مگر اس طرح کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ میں نے ان سے پوچھا کیوں؟ انہوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا خاموش وقت ضائع نہ کرو اور جو چیزیں میں نے کہی ہیں جلدی سے لا دو میں ان کا سب سامان لے آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی سوٹ پہنا۔ سر پر ہیٹ لگا کر کہا آؤ میرے ساتھ۔ میں سٹیٹا گیا۔ اور ان کے ساتھ ہولیا..... وہ سیدھے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے برآمدے میں داخل ہو گئے اور ہیڈ ماسٹر کے چیراسی سے کہا ہم اس وقت ایک مذاق کرنے آئے ہیں ابھی ہیڈ ماسٹر کے آنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے تم مجھ کو اجازت دے دو کہ میں ان کی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔ اور جب شبیر اپنے ساتھ ایک آدمی کو لے کر یہاں آئے تو اس کے دروازے پر روک کر میرے پاس لاؤ اور پھر کمرے کے باہر نکل کر اس آدمی سے کہو چلیے صاحب بہادر کے پاس یہ کہہ کر محسن نے چیراسی کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھ دیے چیراسی نے بات مان لی اور محسن ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور میں دور تا ہوا ممتاز ہاؤس چلا گیا اور داروغہ صاحب کو لے کر آ گیا۔ چیراسی نے حسب ہدایت اندر جا کر اطلاع کی اور باہر نکل کر داروغہ صاحب سے کہا چلیے صاحب بہادر کے پاس۔

داروغہ نے ہیڈ ماسٹر کو سلام کیا۔ اور جیب سے میری فرستادہ فہرست کتب اور پان

سو کے مات نکال کر ہیٹ ماسٹر کی میز پر رکھ دیے اور پوچھا حضور اس رقم میں کوئی کمی بیشی تو نہیں ہوگی؟..... ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا دل یہ رقم ایک دم (بالکل) برابر (صحیح) ہے۔ اچھا کھان صاحب سے ہمارا سلام بولنا..... اب آپ جائیے۔

داروغہ امید علی سلام کر کے میرے ساتھ باہر نکل آئے اور جیسے ہی میں برآمدے کی سیڑھیوں سے اترنے لگا تو یہ دیکھا کہ سچ مچ ہیڈ ماسٹر صاحب تیز تیز قدم رکھتا چلا آ رہا ہے۔ اور چھوٹا ہیڈ ماسٹر غسل خانے کے دروازے سے نکل کر منہ پر رومال سے ڈھانکے انتہائی بزدلی سے دوستی طرف بھاگتا چلا جا رہا ہے تڑا تڑا اڑ۔

ہماری چند گفتنی شرارتیں بھی سن لیجے۔ ناگفتنی شرارتیں لکھ دوں تو کتاب ہی ضبط ہو جائے گی۔

(۱) ایک بار مجھے اور محسن کو یہ شرارت سوچھی کہ چھت کے روشن دان سے منظر علیم صاحب پر پیشاب کیا جائے چنانچہ رات کے بارہ بجے ہم دونوں چھت پر چڑھ گئے ان کے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا ہم نے جب دیکھا کہ عین روشندان کے نیچے ان کی چارپائی بچھی ہوئی ہے تو ہم دونوں نے بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے اپنے پائے جامے کھولے اور نشانہ باندھ کر شرثران کے منہ پر دھاریں مارنے لگے۔ سویت میں ان کے منہ پر جب گرم پیشاب کی دھاریں پڑنے لگیں تو وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑے ہوئے اور روشن دان سے سر اٹھا کر چیخنے لگے۔ ارے یہ کون بد معاش ہے ارے یہ کون بد معاش ہے..... چوکی دار چوکی دار وہ درواہ کھول کر باہر آ گئے اور پھر اسی طرح چیخنے لگے چوکی دار چوکی دار دور آیا تو انہوں نے کہا یہ کون بد معاش چھت پر چڑھا ہوا ہے..... جاؤ اوپر جا کر دیکھو۔ یہ شون سن کر ہم دونوں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گئے اور اپنے صید زبوں سے بڑی معصومیت کے ساتھ ہم نے پوچھا کیا ہوا ماسٹر صاحب؟ انہوں نے دانت پیس کر کہا اس کیا ہوا صبح کو مزا چکھا دوں گا۔

صبح سید ولایت حسین صاحب پراکٹر کے سامنے ہماری پیشی ہوئی پراکٹر صاحب



نے بڑی خشونت کے ساتھ بیداٹھا کر پوچھا صاف صاف بتا دو یہ حرکت تم نے کی تھی؟  
 یا کسی اور نے اگر جھوٹ بولے تو خدا کی قسم کھال کھینچ لوں گا نہ محسن نے کہا خدا کی قسم  
 ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم کہ یہ شرارت تھی کس کی ہم دونوں بے خبر پڑے سو رہے تھے کہ  
 شور ہوا اور ہماری آنکھ کھل گئی باہر آ کر ماسٹر صاحب سے پوچھا کیا ہوا؟ تو وہ الٹا ہم پر  
 برس پڑے۔ آپ ہم کو چاہیں تو مار لیں۔ آپ ہمارے باپ کے برابر ہیں۔ مگر قصور  
 ہمارا کچھ بھی نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ سب پراکٹر صاحب ہم پر مفت کا الزام لگا کر ہم کو  
 پٹوانا چاہ رہے ہیں۔“

میر صاحب بڑی کشمکش میں پڑ گئے سر جھکا کر سوچنے لگے اور کہا اچھا تم دونوں جاؤ  
 میں پوری تحقیقات کروں گا۔ اور اگر تمہاری خطا ثابت ہو جائے گی تو اس قدر ماروں  
 گا کہ تم دونوں عمر بھر یاد رکھو گے۔ اور ہم دونوں دل ہی دل میں رسیدہ ہو دبلائے سے  
 بخیر گزشت کہتے اپنے کمرے میں آ رہے اور ایک دوسرے کے گلے مل کر خوب  
 ہنسے..... یہ خبر نس کر شام کو جلیل ہمارے کمرے میں آئے ہم دونوں کو مبارک باد  
 دی..... ہم سے کہا تم دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاؤ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو انہوں نے  
 ہماری کرسیوں کے عین نیچے لوہان سلگا کر ہماری گردنوں میں ہار ڈال دیے اور ہپ  
 ہپ ہرا کہنے لگے۔

(۲) ناشتے اور دونوں وقت کے کھانے کے وقت ہم لوگوں کو بلانے کے واسطے  
 ڈانگ ہال کے دروازے پر گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔ ایک روز جب رات کے آٹھ بج گئے اور  
 ڈانگ ہال کا گھنٹہ نہیں بجا تو تمام لڑکے پریشان ہو گئے۔ اور ڈانگ ہال کے  
 برآمدے اور صحن میں جمع ہو کر شور مچانے لگے اور عرب لڑکے روتی روتی (روٹی  
 روٹی روٹی) کے نعرے لگانے لگے۔

اس ہنگامے کو سن کر ہمارے اور درمیانی گوشے کے دونوں سب پراکٹر مظہر علیم صاحب  
 اور فیح الدین صاحب بھی وہاں آ گئے اور چوکی دار سے پوچھنے لگے گھنٹہ کہاں ہے؟ چوکی دار

نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے کہا صاحب گھنٹہ یہاں لٹکا رہتا تھا نہ جانے کون اڑا لے گیا۔ اس پر فصیح الدین نے مظہر علیم صاحب سے کہا یا مظہر العجائب گھنٹہ غائب“  
مظہر علیم صاحب نے چونک کر کہا جلیل کہاں ہے؟ ہر طرف جلیل جلیل کی  
آوازیں بلند ہو گئیں۔ جلیل ہوتے تو بولتے۔ مظہر علیم صاحب نے چوکی دور کو کہا جلیل  
کو ڈھونڈ کر لاؤ۔

چوکی دار نے آ کر کہا ”وہ تو نماز کے ہال میں بیٹھ نماز پڑھ رہے ہیں“ مظہر علیم اور  
فصیح الدین وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جلیل سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اسی عالم میں  
کوئی چیز اپنے کمرے میں لپیٹ رہے ہیں۔ مظہر علیم نے کمرے کا سراپکڑا کر زور سے جھٹکا  
دیا اور گھنٹہ بڑی جھنکار کے ساتھ فرش پر گر گیا۔ یہ دیکھتے ہی مظہر علیم نے سر سنجو جلیل  
کے سر پر تڑاق سے ایک ٹیپ مار کر کہا اٹھ کھڑا ہو مردود..... جلیل نے دفعہ کھڑے ہو  
کر چیخ ماری کہ یہ یہ اسلامی سکول جہاں عین سجدے کے وقت نمازی لڑکوں کے سروں  
پر ٹیپیں ماری جاتی ہیں۔ یہ سنتے ہی مظہر علیم چائنا تان کر جلیل کی طرف لپکے اور عرب  
لڑکے بھی آگئے مارنے کے واسطے جلیل نے یہ رنگ دیکھا تو لا الہ الا اللہ کہہ کر ایک لانی  
جست لگائی اور چکارے کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہال سے اس طرح بھاگ کھڑے  
ہوئے کہ انہیں کوئی پکڑ ہی نہیں سکا۔

(۳) علی گڑھ میں بڑی دھوم دھام سے ہر سال نمائش ہوا کرتی تھی۔ ایک رات کو  
جب ہم پیشاوری پر اٹھے کباب اور خورجے کی چٹنی کھا رہے تھے تو ہماری جنڈال  
چوکڑی ایک چاقو چھری بیچنے والے کی دکان پر جا کھڑی ہوئی۔ نمائش کی تیز روشنی میں  
چھریاں اور چاوا ایسے جگمگ جگمگ ہو رہے تھے کہ میرا جی چاہا میں انہیں بڑھ کر سینے  
سے لگا لوں۔ میں نے پٹھان دکان دار سے پوچھا تو اس نے کہا ایک روپیا چار آنہ محسن  
نے کہا نہیں دس آنہ پٹھان نے کہا نائیں ایک روپیا چار آنہ خوشی چاہے ٹیک  
(Take) خوشی چاہے تو نہ ٹیک (Take)۔

ان آوازوں کو سن کر کالج کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرف آگئے۔ اور ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے دکان کے سامنے..... محسن نے پھر کہا دس آنا پٹھان نے پھر وہی جواب دیا نائیں نائیں ایک روپیہ چار آنا ایک روپیہ چار آنا خوشی چاہے ٹیک خوشی چاہے نہ ٹیک۔ یہ سن کر محسن برا فروختہ ہو گئے۔ تمام لڑکوں سے اشارہ کر کے کہا غازیو بڑھو اور ٹوٹ پڑو اور لوٹ لو مال غنیمت کو یہ دعوت عام سن کر ٹوٹ پڑے تمام لڑکے چھریوں چاقوؤں پر پٹھان جھپٹا لڑکوں نے اسے دبوتج لیا۔ اور لٹنے لگی دکان دھڑا دھڑا۔ پٹھان نے پولیس پولیس پولیس کے نعرے لگانے شروع کر دیے..... پولیس والے جھپٹ پڑے۔ ہم نے چھریاں تان لیں وہ ٹھٹک گئے اتنے میں ایک شامت کا مارا انگریز پولیس افسر موٹر سائیکل پر بیٹھا ادھر آ نکلا..... اور جب اس نے موٹر سائیکل سے ایک پاؤں اتار کر ہمیں ڈانٹنا شروع کیا تو ٹوٹ پڑے ہم سب اس پر اور اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا اور ہم سب کے سب مال غنیمت لیے اور خوشی چاہے ٹیک خوشی چاہے نہ ٹیک کے نعرے لگاتے وہاں سے کالج بھاگ آئے۔

(۴) ایک روز میرے ایک لکھنوی دوست اور میرے دوست پرنس میرزا عالم گیر قدر کا بھائی جہاں گیر قدر ہمارے پاس آیا فریادی بن کر اور کہنے لگا شبیر ایک فرسٹ ایئر فوٹ لڑکا فضل الہی ہے وہ سالا اپنے حسن پر اس قدر مغرور ہے کہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا پٹے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا۔ تمہاری پارٹی ماشاء اللہ بڑی تگڑی ہے اس کو نیچا دکھاؤ تو میں تمہارا غلام ہو جاؤں۔

ہماری پارٹی لنگر لنگوٹ کس کر جہاں گیر قدر کی مدد کے واسطے آمادہ وہ گئی۔ اتوار کے دن جہاں گیر قدر کو دو لہا بنا کر اور ہار پھول ڈوپٹہ مصنوعی داڑھی اور ڈھولک لے کر ہم دس پندرہ لڑکے براتیوں کی طرح کچی بارک پہنچ کر فضل الہی کے کمرے میں مبارک باد مبارک باد کے نعروں کے ساتھ درانہ گھس پڑے۔ فضل الہی نے جس کے متعلق ساری دنیا میں ایک طرف فضل الہی کا غلغلہ ایک طرف بلند تھا تیوریوں پر بل

ڈال کر کہا۔ میں نے تو آپ لوگوں کو نہیں بلایا تھا؟..... جلیل نے کہا لھنئیں کسی کو بلایا نہیں کرتیں جنیا ہم جہاں گیر قدر سے تمہارا نکاح پڑھانے آئے ہیں۔

اس لڑکے نے کوشش کی بھاگ نکلنے کی ہمارے ساتھیوں نے پکڑ لیا ڈو پٹہ اس کے سر پر ڈال دیا۔ جہاں گیر قدر کو ہار پھول پہنائے جلیل نے جیب سے مصنوعی داڑھی نکال کر منہ پر لگائی اور قاضی بن کر اس لونڈے کا جہاں گیر قدر سے نکاح پڑھوا دیا۔ اور نکاح پڑھا دینے کے بعد ساتھیوں نے ڈھولک بجا بجا کر نیچے سروں میں شادیاں گانا شروع کر دیے۔ برآمدے میں لڑکوں کا میل لگ گیا اور ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔

اتنے میں کسی نے یہ دیکھ کر کہ ہیڈ ماسٹر راؤنڈ لگاتا چلا آ رہا ہے۔ ہم کو آگاہ کر دیا ہم سب خوف زدہ ہرنوں کے مانند بھاگ کھڑے ہوئے..... اور دولہا میاں بھی اٹھ ہی رہے تھے کہ ماسٹر سر پر آن پہنچا..... فضل الہی نے اس سے فریاد کی۔ اس نے جہاں گیر قدر سے پوچھا تم کون ہو؟..... جہاں گیر قدر کی زبان سے گھبراہٹ میں نکل گیا Sir I am Bride Groom (جناب میں دولہا میاں ہوں)..... ہیڈ ماسٹر نے ول ماسٹر برائڈ گروم ول ماسٹر برائڈ گروم کہہ کہہ کر بیدوں پر دھڑلایا۔

براتی تو صاف بچ کر نکل گئے۔ اور بے چارے برائڈ گروم! صاحب پٹ گئے۔ اور اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر ہم تینوں لڑکوں یعنی محسن اللہ خان عبد الجلیل خاں اور آگے چل کر حضرت جوش ملیح آبادی بننے والے شبیر حسن خاں کو بھی سکول سے نکال دیا گیا۔

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

۱۔ میرزا جہاں گیر قدر کراچی میں رہتے تھے صد حیف کہ دو مہینے ہوئے پچاسی چھپاسی برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کم بخت دنیا میں دولہا بھی مرجاتے ہیں اور لھنئیں بھی سدھا ر جایا کرتی ہیں۔





## لکھنؤ میں دوبارہ آمد

علی گڑھ سے نکلتا تو پھر لکھنؤ آ گیا۔ ہانہ ٹوٹتی ہے تو گلے میں آتی ہے۔ لکھنؤ آ کر برابر اور رئیس کی معیت حاصل ہو گئی جو بی ہائی سکول میں داخلہ ہو گیا۔ وہاں سے چرچ مشن سکول و رچرچ مشن سکول سے نکل کر ریڈ کرسچین کالجینڈیٹ سکول میں داخلہ لے لیا۔

کچھ روز تک تو ہم لوگ لاٹوش روڈ کے اس دو منزلہ مکان میں رہے جس کو بڑھیا والا مکان کہا جاتا تھا۔ پھر چلے گئے راجہ ابو جعفر صاحب کی کونٹس روڈ والی کوٹھی میں اور وہاں سے منتقل ہو کر پھر پنچ گئے کھجورے کے باغ کی کوٹھی میں۔

کھجورے کے قیام سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ایک طرف تو نارنگی کے باغ میں دوڑ لگاتے رہنے سے میری صحت بہت اچھی ہو گئی دوسری طرف مولانا سید ناصر حسین قبلہ اور سکول آتے جاتے حضرت پیارے رشید صاحب کی صحبت سے نہایت علمی و ادبی فائدہ پہنا اور تیسری طرف میرزا محمد ہادی صاحب رسوا لکھنؤی (صاحب امرا و جان ادا) سے میں نے باقاعدہ فارسی و عربی پڑھنا شروع کر دی۔ عربی تو آنہ سکی لیکن فارسی میں کسی قدر نظر پیدا ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میری اردو بھی خوب منجھ گئی۔

کھجورے میں آگائی صاحب کا ایک بہت بڑا نارنگیوں کا باغ تھا۔ اس میں قدیم وضع کی دو کوٹھیاں تھیں ایک کوٹھی میں ہم لوگ رہتے تھے۔ دوسری کوٹھی میں ناصر حسین صاحب قبلہ کا وسیع کتب خانہ تھا اور ہماری کوٹھی کے نیچے والے حصے میں آغائی صاحب کی لاش رکھی ہوئی تھی جو ایک متعین مدت کے بعد کر بلا بھیجی جانے والی تھی۔

اور لکھنؤ آ کر میرا کچھڑا محبوب عطا حسین قزلباش بھی مجھ کو دوبارہ مل گیا۔ عطا حسین کی صحبت میں میری دادی نے جو شیعیت کے نقوش میرے بل پر بنائے تھے وہ اور بھی ابھر گئے اور جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں ناصر حسین صاحب قبلہ کی صحبت نے میری شیعیت میں پختگی پیدا کر دی۔

اب میں برابر مجلسوں میں جانے اور ماتم کرنے لگا..... اور میرے خاندان کی اصطلاح میں میری رافضیت مسلم ہو گئی پھر بھی میرے باپ نے مجھ سے ناخوشی کا مطلق اظہار نہیں فرمایا تھا۔

### میرے تبرائی شیعہ ہونے کا تيقن

ليكن جب ميرے باپ کے کان تک یہ خبر پہنچی کہ میں مقبرہ جناب عاليہ کے جشن تبرائیں بھی شریک ہوا تھا تو یہ بات ان کو نہایت ناگوار گزری۔ انہوں نے میرے چھٹی زاد بھائی امیر حسن خاں کی معرفت یہ پیغام بھیجا کہ میں تبرات ترک کر دوں انہوں نے کہا ماموں نے یہ فرمایا ہے کہ جہاں تک حب آل رسول کا تعلق ہے۔ میں اس کو جزو ایمان ہی نہیں اصل ایمان سمجھتا اور رسول اللہ کے بعد حضرت علیؑ کو سب سے افضل مانتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اصحاب ثلاثہ پر سب و شتم کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس فعل بد سے فقط خلفاء ہی کی توہین نہیں ہوتی بلکہ رسالت مآب کے فیضان صحبت پر بھی آنچ آتی ہے۔ اور جب میں تبرے سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوا تو میرے باپ نے وصیت نامے کی رو سے مجھ کو جائیداد سے محروم فرما کر فقط سو روپے ماہانہ کا گزارہ دار بنا دیا۔

اتنی بڑی جائیداد سے محروم ہو جانے کا میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور اس کے برعکس میں نے یہ سوچا کہ ناخوش ہو جانے کے بعد بھی میرے باپ نے میرے نام سو روپے ماہانہ لکھ دیے۔ اگر وہ یہ بھی نہ کرتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے باپ میں کس قدر شفقت کا جوہر ہے۔

۱۔ یہ مقبرہ گولانج میں ہے جہاں تبرہ بازی کا ایک سالانہ جشن کیا جاتا ہے۔ اور اکابر لکھنؤ شریک ہوتے ہیں۔

### سیا خواب میرے تحت شعور کا فعال اضطراب ::

اس محروم الارث ہو جانے کے کوئی چھ سات مہینے کے بعد ایک روز دوپہر کے

وقت جب کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ اور میں کڑھ ابتراب خاں (لکھنؤ) کے مکان کے ایک ٹھنڈے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اللہ سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں نے کہا سنتا ہوں اے اللہ میاں جب کوئی تمہاری طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو تم اس کی جانب سو قدم اٹھاتے ہو۔ لیکن میرے ساتھ تمہارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں تمہاری طرف بڑھتا ہوں اور تم ہو کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتے ہو تمہیں خوش کرنے کے لیے میں نے اپنے باپ کو ناخوش کیا ہے۔ جائیداد سے محروم ہو گیا اب تم مجھ سے یہ بتاتے ہی نہیں کہ میں راہ راست پر ہوں یا گم راہ ہو گیا ہوں اے اللہ میاں کچھ تو منہ سے ولوسر سے کھیلو.....“ دل ہی دل میں یہ باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

سوتے ہی خواب دیکھا کہ صبح کی گلابی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ آسمان سے سونا برس رہا ہے۔ اور میں کسی سواری پر بیٹھا ایسی راہ سے گزر رہا ہوں جس کے دونوں طرف بڑے گھنے اور شاداب درخت نسیم سحر سے جھوم رہے ہیں اور ہزارں چڑیاں ان کی شاخوں پر بیٹھی چچہا رہی ہیں۔ کہ مشرق کی سمت سے ایک جلوس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نمودار ہوا..... میرا نظریں اس جلوس پر جم کر رہ گئیں..... اور جب وہ قریب آ گیا تو رئیس جلوس کے چہرے کی تاب ناکی دیکھ کر میرے دل پر اس قدر اثر پڑا کہ میں اپنی سواری سے ایک دم کود پڑا اور جھک کر سلام کیا..... رئیس جلوس نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں ان کی آنکھوں سے کرنیں قطار در قطار نکلیں جو میرے دل میں پیوست ہو گئیں اور وہ مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک سمت مڑ گئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیس غیر معمولی مقناطیسی شخصیت تھی کہ بے جانے پہچانے مجھ کو اس نے اس قدر متاثر کر دیا..... کہ اتنے میں ایک دوسرا جلوس نمودار ہوا اور اس عجیب صاحب جلوس کا بھی مجھ پر ویسا ہی اثر پڑا اور وہ بھی میرے سلام کا جواب دیتا ہوا اسی طرف روانہ ہو گا جس طرف پہلا جلوس مڑ گیا تھا۔

جب دونوں جلوس نگا ہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں یہ بات سوچنے لگا کہ میں ان

سے متعارف کیسے ہو سکتا ہوں؟ اور کیوں نہ ادھر مڑ جاؤں جدھر یہ دونوں جلوس مڑ گئے ہیں۔ کہ دفعۃً میری پشت پر کسی نے ہاتھ مارا میں اچھل را۔ اور مڑ کر دیکھا وایک نورانی چہرہ کے بزرگ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کون ہیں..... انہوں نے کہا ابو ذر غفاری۔ میں نے سلام کر کے ان کے ہاتھ چوم لیے اور ان کے سامنے سر جھکا لیا۔ انہوں نے کہا سر اٹھاؤ یہ سر جھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تم کو سرور کونین محمد رسول اللہؐ اور ان کے جانشین مشکل کشا علی ابن ابوطالب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

یہ سن کر میرے دل میں فخر کے فوارے چھوٹنے لگے۔ اور آنکھوں میں مسرت کے آنسو برسنے لگے۔ اور میں نے پوچھا۔ ”میں اپنے رسول اور امام کو ڈھونڈنے کدھر جاؤ؟ انہوں نے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا دیکھو وہ جو مسجد کا منارہ نظر آ رہا ہے اسی طرف چلے جاؤ اللہ کا جواب تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئے۔ اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ ادھر روانہ ہو گیا۔ اور جب مسجد کے دروازے کی پہلی سیڑھی میں قدم رکھا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چبوترے کے کنارے آستینیں چڑھائے بیٹھے ہیں۔ اور علی مرتضیٰ پانی کا ظرف ان کے پاس رکھ رہے ہیں۔ میری آہٹ سن کر رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے کچھ اشارہ فرمایا۔ (جسے میں سن نہیں سکا) رسالت مآب کا ارشاد سن کر وہ میری طرف اس طرح چلے جیسے کوئی مژدہ سنانے والا آتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہ میرے پاس تشریف لائے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر ارشاد فرمایا جو ہم سے محبت کرتا ہے نہ تو اس کی دنیا خراب ہوتی ہے اور نہ ہی عقبی۔ جاؤ بلندیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ خواب سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کہ بوالحاظن نے آکر کہا مجھے بھیامیاں بلارہے ہیں۔ میں دھڑکتے دل کو سنبھال کر اٹھا۔ جلدی جلدی منہ دھویا اور اپنے باپ کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے باپ



کچھ لکھنے میں مشغول تھے۔ قلم روک کر انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی ان کی بڑی بڑی گلانی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مجھ سے ارشاد فرمایا بیٹھ جاؤ میں بیٹھ گیا اور وہ پھر کہنے لگے میں حیران ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ ان کا قلم بڑی تیزی اور انتہائی ولولے کے ساتھ دس پندرہ منٹ تک چلتا رہا اور جب عبارت مکمل ہو گئی تو انہوں نے کہا بیٹا یہ جائیداد کمبخت ایسی چیز ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے بھائی بھائی کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ میں نے تجھ کو جائیداد سے محروم کر دیا اور دیکھا کہ تیرے ماتھے پر شکن تک نہ آئی اور تیری اطاعت شعاری میں بھی یک سر مو فرق نہیں آیا۔ لے یہ دوسرا وصیت نامہ ہے جس کی رو سے میری جائیداد میں سے تجھ کو تیرا پورا حق مل جائے گا۔ تو بڑے کردار کا آدمی ہے۔ اس کردار کا آدمی اگر یہودی یا مجوسی بھی ہو جائے تو بھی وہ اس امر کا مستحق ہے کہ اس کو سر آنکھوں پر جگہ دی جائے۔ یہ کہہ کر میرے باپ پر رقت طاری ہو گئی اور رندھی ہوئی آواز میں فرمایا بیٹا میں تیرے کردار کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ یہ کہتے ہی میرے انسان باپ نے میرے سامنے سر جھکا دیا۔..... میرے منہ سے دفعۃً چیخ نکل گئی۔ ارے میرا باپ کتنا بڑا آدمی ہے اور جھپٹ کر میں نے ان کے دونوں جوتے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیے سر سے اتار کر سینے سے لگا لیے۔ پھر باپ کے قدموں سے منہ رگڑنے لگا اور میرے باپ نے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگے۔

### میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ

جب میری شیعیت یا یوں کہیے کہ میری رافضیت کا غلغلہ بلند ہو گیا تو میرے چچا نواب محمد علی خاں نے جن پر میرا نکاح نہایت شاق گزرا تھا اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے خسر کو طلب فرما کر کہا۔

غلام شبیر پکا رافضی بن چکا ہے۔ تم نکاح کی تنسیخ کا دعویٰ دائر کر دو میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گا..... اور میرے حقیقی چچا نواب محمد اسحاق خان نے بھی میرے خسر سے

کہا۔ دیکھو مقیم اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ جب شبیر نے ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھنا رکھ دیا تھا تو اسی دن میرا تھا ٹھنکا تھا کہ آج نہیں تو کل یہ ضرور رافضی ہو جائے گا۔ اور اب تو وہ کھلم کھلا رافضی ہو چکا ہے تم تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر دو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔

میرے خسر بھولے بھالے پٹھان تھے۔ آگئے بھڑی میں اور دائرہ کر دیا مقدمہ دن سے..... مقدمہ دائرہ ہوتے ہی ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اور بیچ آباد سے لے کر لکھنوتک گونجنے لگا۔ اس کے چرچوں سے۔ میرے باپ نے اپنی سنت جاریہ پر عمل کرتے ہوئے پہلا کام یہ کیا کہ تمام درجہ اول کے وکلاء یعنی شیخ علی عباس ظہور احمد میرزا سمیع اللہ بیگ سر وزیر حسن اور الہ آباد کے سر تیج بہادر سپرو۔ اور سر جان جیکسن کو پہلے ہی سے اپنا لیا تا کہ فریق ثانی کو درجہ اول کا کوئی وکیل میسر نہ آ سکے۔

وہ مقدمہ پورے چھ برس تک مسٹر شرغا منصب شمالی کے اجلاس پر بڑے زور و شور سے چلتا رہا۔ میرے خسر کی جانب سے علمائے اہل سنت کے فتوے پیش کیے گئے تھے کہ رافضی کافر ہوتا ہے۔ اس لیے کسی مسلمان لڑکی سے اس کا عقد ایک ناجائز امر ہے اور خلاف شریعت۔

ہماری طرف سے اس کی نظریں بھی پیش کی گئیں تھیں کہ زمانہ قدیم سے لے کر اب تک سینکڑوں شیعہ لڑکوں نے سنی لڑکیوں کے ساتھ نکاح ہو چکے ہیں۔ اور انکی اولادیں ورثہ پا چکی ہیں۔ اور کیا ان تمام شیعہ لڑکوں اور سنی لڑکیوں کے سابق نکاحوں کا ناجائز قرار دے کر آج یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس نوعیت کے نکاحوں سے جو بچے پیدا ہو کر اپنے اپنے باپوں سے وراثت پا چکے ہیں ان کو اولاد ناجائز ٹھہرا کر وراثت سے محروم کر دیا جائے؟ اور ان سابق نکاحوں کے مواقع پر علمائے اہل سنت کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس وقت بالکل خاموش رہے اور اس نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ دائرہ ہوتے ہی وہ اسلامی شریعت میں کیا بنیادی انقلاب آ گیا ہے کہ آج اس کے خلاف فتوے جاری

کیے جا رہے ہیں؟ اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مولوی عبدالشکور صاحب نے سنیوں اور شیعوں کے درمیان جو منافرت پیدا کرنے کی تحریک چلائی ہے یہ تمام غلط فتوے اسی تحریک کے لٹن سے پیدا ہوئے ہیں؟؟

اچھا مجھے شبیر حسن کی بجائے ہمیشہ غلام شبیر کہا کرتے تھے اس لیے کہ وہی میرا پہلا نام تھا۔

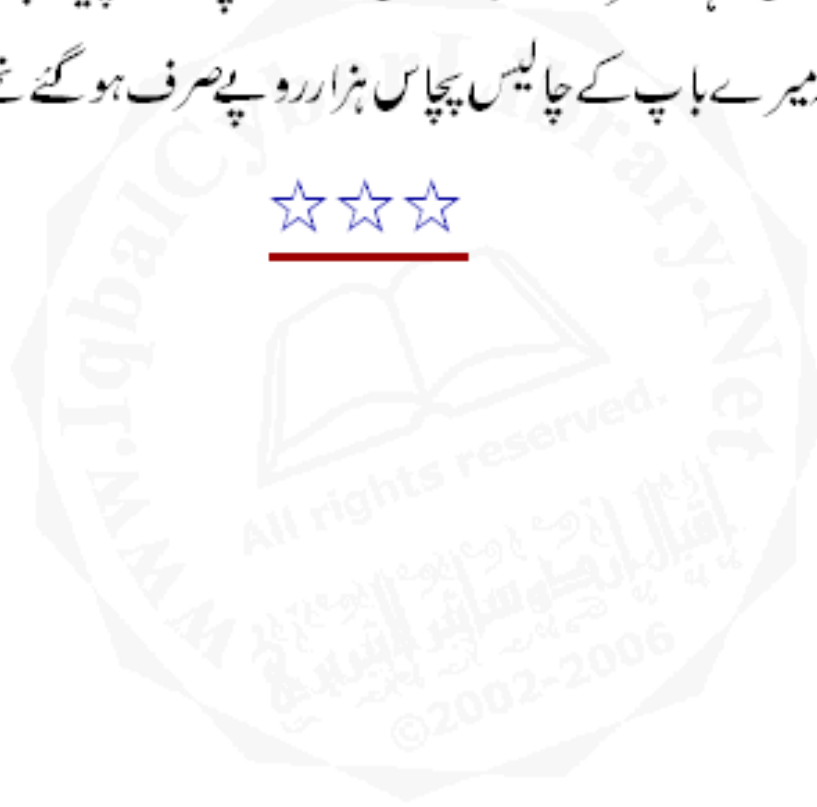
حیرت کی بات یہ ہے کہ تین پشتوں کے دیرینہ مراسم کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل نے بھی ان فتوؤں کی تصدیق فرمادی تھی..... لیکن میں آج تک شکر گزار ہوں کہ مولانا عبدالباری صاحب کے چچا شمس العماء مولانا عبدالحمید صاحب اور نامی پریس لکھنؤ کے مالک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے میری موافقت میں گواہی دی تھی۔

جس روز میرے مقدمے کی پیشی ہوئی تھی تمام لکھنؤ ٹوٹ پڑتا تھا سننے کے واسطے..... اور میرے باپ اور میرے خسر کے ہمراہ جو تین تین چار چار سو جاں نثاروں حامیوں اور گواہوں کا لشکر آتا تھا۔ اس سے عدالت کے برآمدے اور صحن میں ایک میلہ سا لگ جاتا تھا چاروں طرف سے خوانچے اور قفلی والے لٹوٹ پڑا کرتے تھے اور ہر پیش پر تقریباً دو تین سو روپے چرندم خوردم پر اٹھ جایا کرتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جس روز میرے باپ عدالت میں بیان دینے کے واسطے اپنی کرسی سے کھڑے ہوئے تھے مخالف فریق کے وکیل شیشیر ناتھ صاحب نے عدالت سے کہا تھا کہ خاں صاحب کے بیان سے بیش تر میں یہ بات عدالت کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ان کا قدیم نیاز مند ہوں اس لیے مجھ کو معلوم ہے کہ وہ کس قدر شیریں بیان آدمی ہیں کہ سننے والوں پر جادو کر دیتے ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ عدالت ان کی جادو بیانی سے متاثر نہ ہو۔ اور وہ تاثر قانون پر حاوی نہ ہونے پائے۔ یہ سن کر شرعاً صاحب ہنس پڑے تھے اور یہ کہا تھا کہ اب ت میں

بڑے شوق سے خاں صاحب کا بیان سنوں گا۔ اور میرے باپ کے بیان کے اختتام کے بعد شرعاً صاحب کے چہرے پر جو تاثرات نمودار ہوئے تھے ان کو دیکھ کر شیشر ناتھ نے میرے خسر کے کان میں کہا تھا کہ خاں صاحب اب آپ مقدمہ ہار جائیں گے بہتر ہے کہ صلح کر لیجیے۔

مجھے پتا نہیں ہے کہ میرے خسر نے اس مقدمے پر کتنا روپیہ برباد کیا تھا لیکن یہ معلوم ہے کہ میرے باپ کے چالیس پچاس ہزار روپے صرف ہو گئے تھے۔





## سینٹ پیٹرز کالج آگرہ

ابھی وہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ میرے ریڈ کرپشن کالج کے ہیڈ ماسٹر نے یہ مشورہ دیا کہ میں آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہو جاؤں اور وہاں سے سینئر کیمبرج پاس کروں اور سیدھا لندن چلا جاؤں۔

یہ بات میرے دل میں اتر گئی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں حساب اور جغرافیہ میں کمزور ہوں یہاں پنپ نہیں پاؤں گا۔ اس لیے سینئر کیمبرج کا پاس کر لینا میرے لیے آسان ہوگا اور ولایت جانے کا راستہ نکل آئے گا۔

رئیس اور ابرار نے بھی اس مشورے کو پسند کیا۔ اور کہا ہم بھی آپ کے ساتھ آگرے چلیں گے۔ جب یہ بات طے ہو گئی تو ابرار نے کہا بشیر مانموں کے پاس چلنے سے بیشتر آئیے اس سامنے والی جنات کی کوٹھری میں چل کر دعا مانگیں کہ بشیر مانموں ہم کو آگرے بھیجنے پر تیار ہو جائیں۔

جوتے اتار اتار کر آگے آگے ابرار اور پیچھے پیچھے میں اور رئیس اس کوٹھری میں داخل ہو گئے۔ ابرار نے کہا میں دعا مانگوں گا آپ لوگ آمین کہیں گے اس کے بعد ابرار نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ اے اللہ ہم سب کے اچھے اللہ میں اور شبیر خاں اب تک جو گناہ کر چکے ہیں ان سب کو معاف کر ہم تیرے سامنے توبہ کرتے ہیں۔ ابرار نے یہ کہہ کر اپنے منہ پر اور ان کو دیکھ کر ہم دونوں بھی اپنے منہ پر ترترترترتر تھپڑ مارنے لگے۔ اور تھپڑ مار چکنے کے بعد ابرار نے بڑی لجاجت سے کہا اے میرے معاف کر دینے والے اللہ بشیر مانموں کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ ہم تینوں کو آگرے بھیج دے ہم دونوں نے آمین الین کے نعرے لگائے اپنے اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرے اور پہنچ گئے۔ میاں کے کمرے میں میاں علیل تھے بستر پر لیتے لیٹے انہوں نے ابرار کی طرف آنکھیں اٹھا کر فرمایا کرو گھنٹال کیا کرنے آئے ہو؟..... ابرار نے ہاتھ جوڑ کر سینٹ پیٹرز کالج کے تمام محاسن اور وہاں کا آخری امتحان پاس کرنے

کے بعد تمام مفید نتائج اور پھر ولایت سے بیرسٹری کی سند لے کر آنے کے درخشاں امکانات پر دل نشیں تقریر کر کے کہا۔ یہ ہماری آخری درخواست ہے اسے مان لیجیے اور ہم کو آگرے بھیج دیجیے..... تو ان مجیدہ کی قسم ہم بیرسٹر بن کر آئیں گے آپ کا دل باگ باغ ہو جائے گا۔

ہماری خوش قسمتی کہ میاں نے یہ درخواست قبول کر لی اور ہماری آگرے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن دو چار دن بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ خالصتہ فرنگی کالج ہے جہاں ہندوستانیوں کو داخلہ نہیں ملتا تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور ہم سب حامد علی خاں بیرسٹر کے پاس پہنچے کہ وہ شاید کوئی تدبیر نکال دیں۔ حامد علی خاں نے کہا اگر ہمارا لیفٹیننٹ گورنر سفارش کر دے تو وہاں داخلہ ہو جائے گا۔

میاں نے لیفٹیننٹ گورنر سے سفارشی خط لے کر ہم تینوں کو آگرے بھیج دیا اور ہمارے ساتھ انہیں گونڈے والے نوروز باورچی اور علی شیر خاں کو سپاہی کے طور پر ہمارے ساتھ کر دیا۔

---

ابراہیم کی زبان سے قرآن مجید کے عوض ہمیشہ تو ان مجیدہ نکالا کرتا تھا۔

---

آگرے پہنچتے ہی کالج میں ہمارا داخلہ ہو گیا..... نانا کا محل چوں کہ کالج سے بہت دور تھا اس لیے محلہ گھیا اعظم خاں میں ہم نے ایک دو منزلہ مکان کرائے پر لے لیا۔ اور جی لگا کے پڑھنے لگے۔ ہمارے کورس میں شیکسپیر کا ڈرامہ جولیوس سیزر داخل تھا۔ اور میں اس ڈرامے پر اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ میرا پروفیسر یورپین طالب علموں سے کہا کرتا تھا کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ یہ لڑکا ہندوستانی ہو کر جولیوس سیزر کے مطالب تم سے کہیں بہتر سمجھتا ہے۔ اور جب اس کے متعلق اس سے کوئی سوال کرتا ہوں تو یہ اس کی ایسی اچھی شرح پیش کرتا ہے کہ گویا اس کے سینے میں شیکسپیر کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس کالج کے ایک بوڑھے انگریز پروفیسر مسٹر گرین وڈ کو میں نے پرائیویٹ ٹیوٹر کے طور پر رکھ لیا تھا جو ہر شا کو بیرپیلا کرتے تھے اور دو گھنٹے تک اس خوبی اور ایسی دلچسپی سے پڑھایا کرتے

تھے کہ ان کا ایک ایک حرف میرے دماغ کا جزو بن جایا کرتا تھا۔

اس دور کی ایک بات مجھ کو آج تک یاد ہے کہ وہ عجیب بات یہ کہ مجھ پر اس زمانے میں وہ چیز طاری ہو گئی تھی جس کو دینی اصطلاح میں نیک چلنی اور شاعرانہ اصطلاح میں بد چلنی کہا جاتا ہے اور تو اور میں سینما تک سے مجتنب ہو گیا تھا۔

میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ صبح سے پیش تر اپنے پڑوس کے ایڈورڈ پارک میں جاتا موذن کے حجرے سے اپنا مکدر نکالتا دیر تک انہیں ہلاتا اور دیر تک دوڑ لگاتا رہتا۔

اس پارک میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی چھرہری انگریز لڑکی بھی آیا کرتی تھی اور کن آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی اور اکثر پگڈنڈی کے موڑوں پر اس طرح ابداء کر دوڑ لگاتی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جایا کرتے تھے۔ لیکن میں اس قدر پارسا ہو چکا تھا کہ اس کی جانب ملتفت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور جب وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر سر جھکا لیا کرتی تھی..... تو وہ زاہد خبیث جس نے میرے دل پر قبضہ کر کے میرے شاعرانہ جمال پرست کو کان پکڑ کر باہر نکال دیا تھا..... میری پیٹ ٹھونکنے لگتا تھا۔

۱۔ ان کے منہ سے پڑھاتے وقت جب ہلکی شراب کی خوشبو آتی تھی میری طبیعت بگڑ جایا کرتی تھی اور یہ اسی کا آج تک اثر ہے کہ بادہ خواری کے وقت جب کوئی بے توفیق میرے پاس آتا ہے تو منہ اس سے دور رہتا اور منہ قریب لا کر بات نہیں کرتا.....

۲۔ میرا یہ بد چلنی کا دور جب ڈیرھ برس کے بعد ختم ہو گیا تو میرے شاعر نے واپس آ کر اور میرے منہ پر طمانچے مار کر یہ کہا تھا کہ اے مردود تو نے جس لڑکی کا دل توڑا تھا حشر کے دن اس کا ہات ہوگا اور تیرا گریبان۔

## ایک خوف ناک پیش بینی

اس اثناء میں میرے باپ جب ہم لوگوں کو دیکھنے آگرے تشریف لائے اور تین چار دن قیام فرما کر لکھنؤ جانے لگے تو ہم لوگ اگرہ سٹی تک انہیں رخصت کرنے گئے

اور جب وہ گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی ریٹگنے لگی تو دفعۃً میرے دل سے یہ صدا آئی کہ  
 میاں کو جی بھر کے دیکھ لو کہ اب انہیں کبھی نہ دیکھ سکو گے..... یہ خیال آتے ہی میرا سر  
 چکرانے لگا۔ اور دل تھام کر ایک قریب کی بنچ پر بیٹھ گیا..... رئیس و ابراہیم گئے نوروز  
 دوڑتا گیا اور پانی لے آیا۔ میں نے پانی کے دو گھونٹ پیے اچھولگ گیا اور ابراہیم نے  
 میری پیٹھ پر گھونسنے مارے اور رئیس میرا سینہ سہلانے لگا اچھو سے تو نجات مل گئی لیکن  
 اس خیال نے جو کانٹا چھو دیا تھا دل سے نہیں نکلا۔ رئیس و ابراہیم نے پوچھا کیا ماجرا ہے  
 میں نے اصلی بات نہیں بتائی نال دیا۔

اس واقعے کے بعد میں اداس اداس رہنے لگا..... اور اس کے چھ سات دن کے  
 بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے باپ کی لاش محمد علی چچا کی موٹر میں لکھنؤ سے  
 ملیج آباد جا رہی ہے۔

میرا دل اس قدر زور سے دھڑکا کہ آنکھ کھل گئی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے  
 میں نے گھڑی دیکھی صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نیچے آیا ابراہیم اور رئیس کو جگایا ابراہیم  
 سے کہا تم پہلی ہی گاری سے لکھنؤ چلے جاؤ اور میاں کی خیریت بذریعہ تار مطلع کرو۔

## میرے باپ کا انتقال ۲

دوسرے دن تارا گیا میرے باپ کے انتقال کا..... تار بجلی کی طرح مجھ پر گرا.....  
 چنچیں مار مار کر میں رونے لگا۔ رئیس نیچے سے دوڑا آیا پوچھا کیا ہوا؟ میں نے تار کی  
 طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے فرش سے تارا اٹھایا ہم دونوں بھائی لپٹ کر دیوانہ وار  
 رونے لگے۔ اور پہلی گاری سے ملیج آباد روانہ ہو گئے..... راستے میں ہمارا کیا عالم رہا  
 کس کی مجال ہے کہ اسے بیان کر سکے۔ کان پورا سٹیشن پر جب ٹکٹ چیکر نے آکر ٹکٹ  
 مانگا اس وقت پتا چلا کہ فرط سراسیمگی میں ہم نے ٹکٹ ہی نہیں لیا۔

اس کے بعد پتا چلا کہ بالکل یہی صورت حال پیش آئی تھی..... میرے باپ کا  
 انتقال بیالیس سال کی عمر میں سنہ ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا۔



اور پاؤں کی طرف نظر جھکی تو معلوم ہوا کہ پاؤں میں جوتا بھی نہیں ہے۔ ٹکٹ چیکر نے ہم کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور کہا صورتوں سے تو آپ لوگ شریف معلوم ہو رہے ہیں لیکن..... میں نے اس کی بات کاٹ کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ کسے اچھے خاندان کا آدمی تھا اس نے کہا کوئی بات نہیں آپ لکھنو چل کر کیا ٹکٹ کے دام دے دیں گے؟ میں نے کہا یقیناً..... لکھنو پہنچ کر ٹکٹ چیکر میرے ساتھ ہولیا..... میں سیدھا اپنے مقدمے کے وکیل ظہور احمد کے پاس پہنچا انہوں نے ٹکٹ کے دام دے دیے۔ ٹکٹ چیکر نے رسید دیے بغیر دام اپنی جیب میں رکھ لیے اور ظہور احمد صاحب سے مزید دس روپے کے قرض لے کر ہم رات کی گاری سے ملیح آباد روانہ ہو گئے۔



## برہنہ پائنتیموں کی طرح

اللہ اکبر وہ رات وہ نالوں سے گونجتی اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی رات..... وہ صاحب خانہ کے سدھار جانے کے بعد کی سرپیٹتی رات۔ وہ ایک لٹے ہوئے قافلے کی بے قافلہ سالار رات!

جب اپنے گھر کے اداس پھاٹک پر نظر پڑی اور ہر آن شادیانوں سے گونجتے ہوئے صحن سے جب نالہ وشیون کی ملی جلی آوازیں سنیں دل پر گھن چلنے لگے..... اور جب اس صحن میں کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ قدم رکھا جہاں شفقت پدری کی گھنیری چھاؤں میں میرا بچپن کھیلا کرتا تھا۔ تو ایک بہت بڑے کھرام نے میری پیشوائی کی..... داروغہ امید علی دوڑتے اور چیختے آئے اور مجھ سے چمٹ کر رونے لگے..... اور ہماری چیخوں نے بام و در میں زلزلہ پیدا کر دیا مکان کے اندر سے بھی ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں..... دادی جان کی آواز آئی بشیر جاگ اٹھ تیرے بچے آگرے سے آئے ہیں سلام کرنے کو۔ دادی کی یہ آواز سن کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا ذروں سے لے کرتاروں تک ایک عظیم ماتم برپا ہے۔ اور اس کرہ ارض کے تمام پہاڑ میرے سینے پر رکھ دیے گئے ہیں۔ اور اس آسمان کی ڈاٹ کے نیچے تمام ادنیا کے رونے والوں کے آنسو میری آنکھوں میں بھر دیے ہیں۔ اتنے میں رئیس کی انا دوڑی آئیں ہم دونوں کو سہارا دے کر گھر لے گئیں۔ دادی اور ماں سوگ واری دیکھ کر دل پر ایسا ناقابل برداشت وزن پڑا کہ میں زمین پر گر پڑا۔ ایڑیاں رگڑنے لگا۔ گریبان پھاڑ دیا..... اور چیخ چیخ کر ہائے میاں ہائے میاں ہائے میاں ارے میں کیا کروں کدھر چلا جاؤں؟ ارے کوئی اللہ کا بندہ مجھ پر ترس کھائے اور مجھ کو میرے میاں کی قبر میں لے جا کر دفن کر دے یہ کہتے کہتے میں بے ہوش ہو گیا۔

## میرے مقدمہ تنسیخ نکاح کا فیصلہ

میرے باپ کی موت کو غالباً ایک ہفتے کے بعد مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا اور

میرے نکاح کو جائز قرار دیتے ہوئے عدالت نے مجھ کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ میں چاہوں تو اپنے خسر اور ان کے گواہوں پر حلف دروغی کا مقدمہ بھی چلا سکتا ہوں۔

۱۔ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے لیکن میرے باپ کی رحلت پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لیکن میرا زخم دل مندمل نہیں ہو سکا ہے شرمزاج زندگی کے شدائد و مکروہات کی یورش پیہم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس غم کو بھول چکا ہوں۔ لیکن جب کبھی عمیق تنہائیاں میرے سینے پر زور سے ہات رکھ دیتی ہیں تو میں درد سے تڑپ جاتا ہوں اور سینے کے زخ کی موجودگی کا پتا چل جاتا ہے۔

کئی مہینے کی بات ہے کہ اخبار نے بتایا تھا کہ ایک مقام پر ایک سو ساٹھ برس کا کوئی آدمی موجود ہے اس وقت میں نے دل ہی دل میں کہا تھا کاش میاں کو بھی اتنی ہی طویل زندگی ملتی اور وہ اپنے گودوں کے پالے ہوئے اس بچے کو بھی بوڑھا دیکھ لیتے اگر مسیح مل جائیں تو میں بچوں کی طرح بلک بلک کر ان سے کہوں اے میرے اچھے حضرت مسیح میرے باپ کو زندہ کر دیجیے:

اگر	آں	طار	قدسی	زورم	باز	آید
عمر	بگوشہ	پیرا	نہ	سرم	باز	آید

ارے کوئی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے جو محبت کے جکڑے ہوئے بے چارے انسانوں پر موت کو مسلط فرما کر اور ہمارے آنسوؤں کو موتیوں کی طرح پرو پر و کر اپنی گردن میں ہار ڈال رہا ہے۔ لاکھوں گھروں کے چراغ بجھا کر جشن چراغاں منا رہا ہے..... اور ہماری آہوں کو مضراب بنا کر اپنا ستار بجا رہا ہے؟

بزم	ترا	شمع	و	گل	خستگی	بو تراب
ساز	ترا	زیر	و	بم	واقعہ	کربلا

فیصلہ سنانے کے وقت عدالت کا کمرہ کچھ کھچ بھرا ہوا تھا یہی نہیں کہ ہم لوگ ہی آب دیدہ تھے میرے مخالفین اور خود میرے خسر بھی بے حد مغموں و پریشان نظر آ رہے

تھے۔

مسٹر شرعاً حکم سنانے بیٹھے تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے خاں صاحب کو اس مقدمے کے جیتنے کی بڑی تمنا تھی کاش میں ان کی زندگی میں ہی فیصلہ سنا دیتا..... یہ سن کر اپنے تو اپنے غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے..... اور مجھ نامراد کو اپنی یہ فتح مندی لاکھوں شکستوں کے پہاڑوں کے نیچے دبی ہوئی محسوس ہونے لگی..... میں نے لاکھ لاکھ ضبط کرنا چاہا مگر ایک دردناک چیخ میرے منہ سے نکل گئی۔..... میرے خسر نے جھپٹ کر مجھے سینے سے لگالیا اور عدالت کا کمرہ مجلس عزا میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

### میری شادی بعد از خانہ بربادی

اس فیصلے کے دوسرے دن حضرت مولانا عبدالباری صاحب قبلہ فرنگی محلی میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھ کو آپ کے والد گرامی کی ناوقت موت کا بے حد افسوس ہے اور اس بات کا بھی ملال ہے کہ میں نے مقدمے میں آپ کی مخالفت کی تھی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ فرنگی محل پر آپ کے جد امجد نواب فقیر محمد خاں بہادر کے جو احسانات ہیں میں انہیں بھول گیا ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ محمد متیم خاں (میرے خسر) اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلائیں گے یا نہیں..... میں نے کہا مولانا اس دن کے لیے مجھے خدا نہ رکھے کہ میں متیم چچا اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلا کر انہیں جیل بھیجنے کی سعی کروں۔ مولانا میری یہ بات سن کر خوش ہو گئے۔ مجھے سینے سے لگالیا اور کہا آپ کی شرافت سے مجھے اسی جواب کی امید تھی..... اس کے بعد بڑی بزرگانہ ملائمت کے ساتھ مسکرا کر انہوں نے یہ فرمایا کہ آپ کیا یہ وعدہ بھی کریں گے کہ اپنی بیوی کو شیعہ نہیں بنائیں گے۔ میں نے کہا مولانا دین میں اکراہ کو دخل نہیں ہے۔ میں کبھی ان کو شیعہ ہو جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔



چاہیے تو یہ تھا کہ باپ کی موت پر میں کم سے کم پانچ برس تک سوگ مناتا لیکن حالات کی نوعیت اس قدر پیچیدہ اور اس قدر عجلت طلب تھی کہ مجبوراً یہ طے کرنا پڑا کہ جلد سے جلد رخصت کی رسم ادا کر دی جائے۔ اس لیے دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کے آخری ہفتے میں میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔

میرا سابد بخت و بد نصیب دولہا اور کون ہو گا شادی کا جوڑا مجھے اس وقت پہنایا گیا جب کہ میرے باپ کا کفن بھی میلانہیں ہوا تھا۔ اور میرے سر پر اس وقت سہرا باندھا گیا جب کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برس رہی تھیں..... میرے پھاٹک کی شنائیوں کی آوازوں میں نوحے تیر رہے تھے..... میری ہتھیلی کی مہندی کے رنگ سے میرے دل کا خون ابل رہا تھا..... تاشوں کی جھنکار کف افسوس مل رہی تھی۔ اور مجھ نامراد کی شادی کے دوش پر میرے باپ کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔

میں جب ہاتی پر بیٹھ کر براتیوں کے ساتھ اپنی سسرال کی جانب روانہ ہوا تو یہ دیکھا کہ میرے باپ سامنے کھڑے ہوئے کہہ رہے ہیں بیٹا شادی مبارک ہو میں نے جان دے کر تیرا سہرا دیکھا ہے اس وقت میں نے اس طرح ہچکیاں روکیں کہ میری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اور دل سے آواز آنے لگی ہائے میرے باپ ہائے میرے باپ اور میرے سہرے کی مہکیں میرے سینے پر ڈنک مارنے لگیں۔

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ  
گوہر ہر سود در جیب زیاں انداختہ

۱۔ میری بیوی آج تک سنی ہیں اور میں نہ شیعہ رہا نہ سنی اور اب مسلمان بھی ہوں کہ نہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے!!

### تقسیم جائیداد

میری اس تجویز سے میرے بڑے اور چھوٹے بھائی نے اتفاق کیا کہ سرکاری طور پر نہیں نجی طور پر جائے داد تقسیم کی جائے۔ اور ماتا دین پٹواری کو حکم دیا گیا کہ وہ مساوی

قسم کی تین چٹھیاں بنا دے۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو پٹواری وہ چٹھیاں لے کر آیا، اور ان کو تہ کر کے ایک صندوق میں بند کر دیا۔ اور ہم تینوں بھائیوں نے آنکھیں بند کر کے ایک ایک چٹھی اٹھالی۔

میں نے اپنی چٹھی کھولی تو سمجھ میں نہیں آئی ابرار کے حوالے کر دی اور جب انہوں نے وہ چٹھی پڑھی تو خوشی سے اچھل کر کہنے لگے مبارک ہو شبیر حسن خاں آپ کی چٹھی سب سے بڑھیا ہے۔ میں نے پوچھا کس اعتبار سے انہوں نے کہا آپ کے حصے میں قلمی باغ آیا ہے۔ میں نے پوچھا میری چٹھی میں تھانہ بھی ہے؟ ابرار نے کہا ارے یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ اس باغ کی ایک ایک پتی پر ہزاروں تھانے قربان کیے جاسکتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں باغ کی فصیل دس دس بیس بیس ہزار روپے کی ہر سال فروخت ہوتی ہے۔ تھانے میں رکھا ہی کیا ہے۔ اس کی سالانہ مرمت میں اٹھ آپ کی جب سے ہر سال پانچ سو روپے جایا کریں گے۔ میں نے کہا ارے تھانے کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اس کی چھت سے ایسے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں کہ آدمی وجد کرنے لگے یہ سن کر بڑے بھائی صاحب نے کہا میں تم کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں اپنا دل میلانا کرو تھانہ میری چٹھی میں آیا ہے لو بدل لو یہ سن کر ابرار نے چیخ مار کر کہا شبیر حسن خاں ارے ایسا غضب نہ کر بیٹھے گا تو ان مجید کی قسم بڑا غضب ناک قسم کا دھوکا کھا جائے گا۔ اس بات پر بڑے بھائی صاحب نے ابرار سے ڈانت کر کہا کہ تم کون ہوتے ہو ہم بھائیوں کے درمیان ٹانگہ اڑانے والے یہ کہہ کر بھائی صاحب نے اپنی چٹھی میری چٹھی سے بدل لی اور ابرار غصے کے مارے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

تھپڑی بج گئی ملیح آباد میں میری اس حماقت کی۔ لوگوں نے آ کر کہا ارے ہزاروں کی سالانہ آمدنی پر لات مار کے سالے تھانے کو ترجیح دی۔ تم کیسے آدمی ہو میں نے کہا بھائی صاحب باغ لے کر نہال ہو گئے ار میں تھانے کے مناظر پا کر باغ باغ ہو گیا۔ ان کو باغ کی چاندی ملی اور مناظر کا سونا میرے ہاتھ لگا۔ جب میری یہ بات سنی

تو میرے ایک قرابت دار محمد غنی خاں نے جل کر جواب دیا کہ بھائی شبیر حسن خاں شعر ویر ہیں تو خیر باقی تمام باتوں میں تم مہاتمم کے چوتھے ہو۔

### سرکاری ملازمت کی پیش کش

یوپی کے گورنر سر ہارکوٹ بٹلر میرے باپ کے بڑے دوست تھے۔ انہوں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو تازہ کج کر مجھ کو نمینی تال ایلا بھیجا۔ اور تعزیت کے بعد مجھ سے کہا کہ میں آپ کو بی اے سے مستثنیٰ کر کے سرکاری ملازمت دینا چاہتا ہوں آپ ڈپٹی کلکٹر بنیں گے یا سپیشل میجر کورٹ وارڈ میں نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش ہو گیا۔ بٹلر صاحب نے گھڑی دیکھ کر کہا وقت کم ہے آپ جلدی انتخاب کریں میں نے کہا آپ میرے باپ کے دوست ہیں اس لیے میرے چچا ہیں میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ کو نوکری دینا چاہتے ہیں۔ مگر میں کوئی سرکاری نوکری قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ بٹلر صاحب نے کہا آپ سینئر کیمر ج تک پڑھے ہوئے ہیں انگریزی بھی اچھی بولتے اور جانتے ہیں آپ اس کی پروا نہ کریں کہ آپ بخوبی کام چلا سکتے ہیں جلدی بتائیے آپ ان دو پیش کشوں میں کس کو ترجیح دیتے ہیں میں نے کہا جناب والا آپ میرے بزرگ ہیں میں آپ کی پیش کش کو سر آنکھوں سے قبول کرتا ہوں مگر آپ کی حکومت غاصبانہ ہے۔ اس لیے آپ کی نوکری کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں۔ میرا یہ فقرہ سن کر بٹلر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تننٹا کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہا باہر آئیے۔ میں سمجھا کہ باہر جا کر وہ مجھ پر حملہ کریں گے اور حملہ کیا تو میں پٹھان ہوں ڈروں گا نہیں۔ ترکی بتر کی جواب دوں گا۔

کمرے سے نکل کر وہ مجھے لان پر لے گئے اور انگلی اٹھا کر کہا۔ دیکھو یہ یونین جیک جو اس چھت پر لہرا رہا ہے جب اس پہرے کے اوپر سے خون کا دھارا گزر جائے گا اس وقت ہندوستان آزاد ہونے کا خواب دیکھ سکے گا۔ میں نے کہا جناب والا کو میں اپنا چچا سمجھتا ہوں اگر گستاخی نہ سمجھے تو جواب دوں بٹلر نے کہا دیجیے جواب میں نے کہا ہندوستان کی

رگوں میں اس قدر خون ہے کہ اس کے صرف ایک صوبے کا نہیں فقط ایک ضلع کا خون اس پہریرے کو آسانی کے ساتھ غرق کر کے رکھ دے گا۔

اس شعرویر میں تو خیر کی داد نہیں دی جاسکتی خدا بخشے محمد غنی خاں نے کتنی سچی بات کہی تھی۔ ۲۰ یوپی کے موسم گرما کا پائے تخت۔

یہ سن کروہ اور بھی سرخ ہو گئے۔ اور کہا آپ میرے دوست کے لڑکے ہیں اور نوجوان آدمی ہیں۔ اس لیے میں آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں برت سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی قوم کو ہر فرد ایک جنب فروختی ہے۔ ہ جس کو چاہتے ہیں پل بھر میں خرید لیتے ہیں۔ میں نے کہا میں اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں انہوں نے غصے میں آ کر میرے صوبے کے تین نہایت مقتدر آدمیوں کے نام لے کر مجھ سے کہا ہم آپ کی قوم کے ان تین بڑے آدمیوں کو خرید چکے ہیں۔ آپ ہیں کس خیال میں؟

ان تین اکابر کے نام سن کر مجھ کو پسینہ آ گیا میں گھبرا گیا کہ اب کیا کہوں لیکن پھر سنبھل کر جواب دیا کہ کم سے کم مجھے خرید نہیں جاسکتا۔ بلکہ یہ سن کر غصے میں بھرے اور مجھ کو غور سے دیکھتے ہوئے کمرے میں چلے گئے اور میں ان سے رخصت ہوئے بغیر گورنمنٹ ہاؤس سے باہر نکل گیا۔

### گم نام خطوں کی بھرمار

نئی تال سے میں سیدھا لیج آباد گیا۔ اپنی اور رئیس احمد کی جائے داد..... بھائی صاحب کی سپردگی میں دے کر رئیس و ابراہیمیت پھر آگرے چلا گیا کہ تعلیم کی تکمیل ہو جائے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد گم نام خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ کہ آپ اپنی جائیداد اپنے بھائی کے سپرد کر کے بڑی خطرناک غلطی کی ہے۔ وہ آپ کی جائیداد کو خرد برد کر رہے ہیں آپ کے حصے کے درخت کٹوا کر اپنے کام میں لا رہے ہیں اور آپ کے اچھے



اچھے کاشت کاروں کے اپنے محال میں بسا رہے ہیں۔ اور آپ کی آمدنی جو ان کے پاس بطور امانت جمع ہو رہی ہے اس سے ہات اٹھا لیجیے وہ آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔ اول اول تو میں نے ان خطوط کو کوئی اہمیت نہ دی اور یہ سمجھتا رہا کہ جیسی ملیج آباد کے پٹھانوں کی عادت ہے وہ ہم بھائیوں کو لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہ رہے ہیں۔

لیکن مقیم چچا نے بھی جب اسی نوعیت کا خط لکھا ان گم نام خطوں کی تصدیق کر دی تو مجھے بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔ اور مقیم چچا کے خط کے ساتھ تمام گم نام خط بھی ابرار کو دکھا دیے۔

خطوں کو پڑھ کر ابرار نے کہا قرآن مجید کی قسم ان خطوں کا ایک ایک حرف صحیح ہے اتنا کہہ کر ابرار اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگے۔ میں نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا اپنے پر لعنت بھیج رہا ہوں کہ جب آپ شفیع احمد خاں کے سپرد اپنی جائیداد کر رہے تھے تو اس وقت میں نہ جانے میرا جی کس کوٹھے میں تھا۔ اور میری عقل کس پھٹکی میں بند ہو گئی تھی کہ میں اس وقت آپ کو اس فعل سے نہیں روکا اپنی اس کوتاہی پر مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ سنتے میں کوء طوائف کسی شادی کی محفل میں گارہی تھی کہ:

مجھ کو جنگل میں اکیلا چھوڑ کر  
قافلہ مضطر روانہ ہو گیا

تو یہ شعر سن کر ایک ہنگ بیچنے والا کالپی پٹھان دھاڑیں مار مار کر رونے اور رو کر یہ کہنے لگا کہ جب یہ عورت اتنا زیور پہنے جنگل میں اکیلا رہ گیا تھا اس درخت ہم کہا جا کر مر گیا تھا اس عورت کو نہیں لوٹ سکا۔

### ملیج آباد کا قیام اور جائیداد کا انتظام

اس کے بعد میں رئیس و ابرار سمیت ملیج آباد پہنچ گیا۔ رئیس و ابرار نے پڑھنے لکھنے کی طرف کبھی مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ رئیس موسیقی میں غرق ہو گئے۔ ابرار کورٹ آف وارڈ

کے مینجر ہو گئے۔ میں نے ابرار کے بڑے بھائی خولجہ احسن خان کو ضلع دار بنا کر اپنی جائیداد ان کی نگرانی میں دے دی۔ مولانا قدرت اللہ بیگ سے دوبارہ فارسی پڑھنا شروع کر دی۔ اور شاعری کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا بطور خود مطالعہ کرنے لگا اسی اثنا میں ایک روز میرے برادر بزرگ تشریف لائے اور تین دستاویزوں پر مجھ سے دستخط کر دینے کی فرمائش کی۔ میں نے ان پر پڑے بغیر دستخط کر دیے تاکہ بھائی صاحب کو یہ گمان نہ ہو کہ مجھے ان پر اعتماد نہیں ہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز یہ معلوم کر کے حیرت و عبرت نے میرا احاطہ کر لیا کہ ان دستاویزوں میں دو رسیدیں تھیں اور ایک ہبہ نامہ۔ پہلی رسید تھی میری جائے داد کے ان باون ہزار روپیوں کی جو ان کے پاس جمع اور ان کے ذمے واجب الادا تھے۔ دوسری رسید تھی ان بہتر ہزار روپیوں کی جو میرے باپ نے لالہ مادھوپور کو بطور قرض دیے اور لالہ صاحب اب ان کو ادا کر کے بھائی صاحب سے رسید لے چکے تھے۔ اور تیسری چیز وہ ہبہ نامہ تھا جس کی رو سے میں نے تقریباً آدھی جائے داد بھائی صاحب کے نام لکھ دی تھی۔

مقیم چچا اور ابرار نے جب یہ ہولناک خبر سنی تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی وہ لکھنؤ چلے گئے اور جب وکیلوں سے مشورہ کر کے آئے تو انہوں نے کہا کہ تم یہ حلف نامہ لگا کر کہ بڑے بھائی کی مروت کے دباؤ میں آ کر تم نے ان رسیدوں اور اس ہبہ نامے پر دستخط نہیں پڑھے بغیر کر دیے تھے مقدمہ دائر کر دو اور مادھوپور کو بھی نوٹس بھیج دو کہ انہوں نے کل روپیہ بھائی صاحب کے حوالے کیوں کیا جب کہ وہ صرف ایک تہائی کے حق دار تھے..... میں نے مقیم چچا اور ابرار کو ہر چند کا سا جواب تو نہیں دیا۔ لیکن اس قدر نال مٹول کی کہ آخر کار وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں اس اقدام پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

## قصر سحر کی تعمیر

اپنے سوتیلے چچا آصف خاں سے میں نے امانی گنج کے میدان میں غالباً دو بیگھے

زمین خرید کر ایک نہایت خوبصورت دو منزلہ کوٹھی بنوائی چوں کہ یہ کوٹھی صرف اس لیے بنوائی گئی تھی کہ اس سے طلوع سحر کا جمال دیکھوں اس لیے اس کا نام قصر سحر رکھ دیا۔ وہ کوٹھی ملیح آباد اسٹیشن کے قریب تھی۔ اس کے دائیں بائیں طرف ایک بڑا خوب صورت تالاب تھا اور دابنے طرف ذرا سا ہٹ کر ریلوے لائن تھی۔

ابھائی صاحب میری فطرت سے واقف تھے کہ میں فرط سعادت مندی سے اور اظہار عقیدت میں آنکھیں بند کر کے دست خط کر دوں گا..... ۲ صد حیف کہ میری نادان بیٹی نے اس کوٹھی کو شہید کرا کے میرے دل کے ایوان کو ڈھا دیا۔ میری ایک بہت بڑی یادگار مٹوا ڈالی اب میں اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اور اپنے عنفوان شباب کی وارداتوں کو کس جتن سے جگاؤں۔ اے میری بیٹی سعیدہ تو نے میرے دل کو تباہ کر ڈالا

کرم کردی الہی زندہ باشی!!

### میرے نقشب کا آغاز

یہ دنیا فت عجائب سے زیادہ حیرت ناک اور اس کم بخت کے امکانات کا دائرہ کائنات کے دائرے سے بھی وسیع تر ہے۔

ارے ذرا خیال تو کیجیے کہ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں قصر سحر آتے ہی خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سے مادر زاد معصیت کا پر دورہ پڑ گیا اور اس چیز کو جس کو نادان تقویٰ اور دانا بزدلی کا نام سے پکارتے ہیں۔

اس تقوے کا ہلکا سا دورہ سینٹ پیٹرز کالج میں بھی پڑا تھا۔ لیکن اس مرتبہ تو اس میں اس قدر شدت آگئی تھی کہ میں بڑی سختی کے ساتھ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگا۔

نمازوں کے وقت میں کمرہ بند کر کے عود اور اگر سلگاتا اور اس قدر طویل رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا کہ قرون اولیٰ کے سچے مسلمانوں کی روح وجد کرنے

لگتی تھی۔ اور پرہیزگاری کی یہ لے یہاں تک بڑھ گئی کہ قیمتی لباس ترک کر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہننے لگا۔ گوشت کھانا اور چارپائی پر سونا ترک کر دیا۔ اور مجھ پر اس حد تک خدا کا قہر نازل ہوا کہ میں نے ڈاڑھی کی سی چیز بھی رکھ لی۔ اور بالکل مولوی خدا بخش نظر آنے لگا۔

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا  
 کہا حیرت سے اس نے یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں  
 ارے کس بے پایاں حیرت کی بات تھی کہ میرا سادہ یوانہ کا کل ورخسار اور سجدہ و سجادہ  
 میں گرفتار۔ میرا سفر یافتہ چنگ و عود اور شوق رکوع و سجود..... مجھ سامر دخواہش اوقات  
 اور گرفتار صوم و صلوة..... میرا سا میر کاخ و کو اور اسیر مسواک و وضو! تفتو بر تو اے چرخ  
 گرداں تفتو۔

کس قدر سچ کہا ہے میر تقی میر نے  
 دیر سے اٹھ کے کعبے آیا میر  
 جس کو چاہے خدا خراب کرے  
 میں اس زمانے میں پو پھٹنے سے بہت پہلے بیدار ہوا کرتا تھا۔ حافظ کا دیوان گنگنا  
 گنگنا کر پڑھتا پھر نماز فجر ادا کرتا اور تاروں کی سہانی چھاؤں میں نکل جاتا امانی گنج  
 کے لق و دق میدان میں وہاں پہنچ کر چکاروں کی طرح چٹختا چھلانگیں مارتا، صدر پورے  
 کے پودوں کو گلے لگاتا۔ حافظ کے اشعار گنگناتا۔ درختوں پر چڑھ جاتا۔ اور پھر ان  
 سے یہ کہہ کر اتر آتا کہ معاف کرنا میں نے بڑی تکلیف پہنچائی تم کو۔ اور اسی عالم میں  
 گل رنگ آسمان کی جانب جب نظر اٹھاتا تو کیا دیکھتا کہ بڑی لانی لانی داڑھیوں  
 کے فرشتے میرے سر پر منڈ لا منڈ لا کر اسلام علیکم یا لسان الصباح سلام علیکم یا لسان  
 الصباح کے نعرے لگا رہے ہیں۔

اور فرشتے جب سلام کر کر کے بلند یوں کی طرف اڑنے لگتے تھے تو عجیب قسم کی



گھنٹیاں سی بجنے لگتی تھیں چاروں طرف اور فضا میں تیرنے لگتی تھیں یہ آواز۔  
دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است  
بایں راہ و روش می رو کہ بادل دار پیوندی!

### بیعت

اسی زمانے میں کاکوری کے فرشتہ صورت سجادہ نشین حضرت حبیبؑ حیدر شاہ کے ہاتھ پر میں نے بیعت بھی کر لی تھی..... سالانہ عرس کے زمانے میں وہاں بڑی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ دور دور سے مرید اور قوام آتے تھے۔ اور کنھیا قوال جب

۱۔ اور یہ رسم اب بھی جاری ہے ایک مولہ جو میرے مکان سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہے۔ ۲۔ شاہ صاحب آل رسول کے علاوہ اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

گاتا تھا تو درود یوار جھومنے لگتے تھے۔ اور تاروں کی ہلکی روشنی اور رات کی چھٹی ہوئی تاریکی میں جس وقت آزادوں کی ٹولی اونچی اونچی ٹوپیاں اور لانبی عبائیں پہنے حضرت تراب علی شاہ کے مزار پر روبرو صفیں باندھ کر حضرت علی کی منقبت میں

اے بادشاہ اولیاء مستان سلامت می کنند  
گانا شروع کر دیتے تھے تو ایسا نظر آتا تھا کہ حجتہ الوداع کے موقع پر رسالت مآب حضرت علی کی مولائی کا اعلان فرما رہے ہیں۔

۱۔ فقراء کا ایک گروہ جو تمام قیود سے آزاد رہ کر مستانہ زندگی بسر کرتا ہے۔



## روح ادب

اسی دور میں تصوف و تقشف میں میری سب سے پلی سترہ تصویروں والی مصور تصنیف روح ادب غالباً میتھیو ڈسٹ پریس لکھنؤ سے رفیع احمد خاں کے مقدمے اور حضرت اکبر کی رائے کے ساتھ سنہ ۱۹۲۱ء یا سنہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور ہاتوں ہات فروخت ہو گئی۔

روح اب پر سب سے پہلے تعریفی تبصرہ کیا تھا میرے اس دور کے اجنبی اور اس دور کے دوست اسرائیل احمد خاں اور میرے اس دور کے مداح اور اس دور کے معترض حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی نے..... اور سب سے پہلے اعتراض کیا تھا سجاد انصاری مرحوم نے اس وقت مسٹر عبدالماجد مولانا عبدالماجد کی جانب سفر کر رہے تھے۔ اور کفر سے منہ موڑ کر اسلام کی جانب آچکے تھے۔ اور سجاد انصاری ۲ حلقہ اسلام سے بھاگ کر کفر کی جانب افتاں و خیزاں چلے جا رہے تھے اور فریقین کے مابین یہ غیر تحریری و غیر ملفوظی معاہدہ ہو چکا تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف لکھیں اور ایک دوسرے کے مدد و ح پر سب و شتم کریں گے۔

اور چوں کہ مولانا عبدالماجد نے اپنی محبت کی بنا پر مجھ کو غالب و یگور کی صف

---

۱۔ اس کتاب پر لاگت آئی تھی چار روپے فی جلد اور فروخت کی گئی تھی تین روپے فی جلد میں نئی قسم کا تھا بیو پاری۔

۲۔ میں نے کبھی ان کو دیکھا ہی نہیں حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کے مضامین سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اور زندہ رہتے تو اردو کے فکری ادب میں بہت اچھا اضافہ ہو جاتا۔

---

میں بٹھا دیا تھا۔ اس لیے سجاد انصاری پر یہ فرض ہو گیا کہ وہ مجھے شیاطین کے

زمرے میں شامل کر دیں۔

اسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال نے بھی ایک طویل خط لکھ کر میری شاعری کی مدح سرائی کی تھی ورنہ کھول کر داد دی تھی۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے روح ادب کے تین سو نسخوں کا آرڈر بھی بھجوایا تھا..... اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ہر چند میرے ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ انہیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے لیکن ان میں شراب بھری ہوئی ہے وہی پرانی اس لیے مجھ کو چاہیے کہ حافظ اور ٹیگور کی پیروی ترک کر کے فکری شاعری کی طرف آ جاؤں اور حافظ اور خیام کی طرح تھپک تھپک کر سامانے کے عوض انسان کو جگانے کی جانب مائل ہو جاؤں۔

لیکن اس وقت میری تخیل کا دھارا بڑے زور و شور سے تصوف کی پراسرار وادیوں کی جانب دھڑا دھڑا بہہ رہا تھا۔ ان کی نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن شنیدہ اترے وارد کے طور پر ان کی نصیحت غیر محسوس طریقے سے مجھ پر اثر کرتی رہی اور جب چند ماہ و سال کے بعد میری طبیعت روح ادب کے مزاج سے مختلف ہونے لگی تو تصوف سے روگردانی کر کے میں سیاسی شاعری کرنے لگا۔ اور سیاست سے مڑ کر جس وقت میری شاعری تجسس و تشکک کی جانب گام زن ہو گئی تو میرے ناصح حضرت اقبال کی شاعری اقوال روایات اور عقائد کی طرف چل پڑی..... اور یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ جس تصوف اور مابعد الطبیعیات سے انہوں نے مجھے روکا تھا۔ اس پر حرکی کا لیبل لگا کروہ خود ہی اس کی طرف چلے گئے۔ اور عقل کو بولہب اور عشق کو مصطفیٰ کا خطاب دینے لگے اور

السلام اے عشق خوش سودائے ما  
کے نعرے لگانے لگے۔

چوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے تھے۔ اور بلا کے ذہین انسان تھے۔ اس لیے شروع شروع میں انہوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے مابین مصالحت کی

بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی۔ لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تھی تو انہوں نے  
 نیٹسے کے مافوق البشر کو شرف باسلام کر کے شاہین بچہ بنادیا قرآن کے مردود لفظ عشق  
 کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام انسانی شرف و مجد کا مرکز تسلیم کیا اور قرآن کے محبوب  
 لفظ عقل کو خاک میں ملا کر اس کو تمام مفاسد کا سرچشمہ ٹھہرا دیا۔ اور میں چیخ اٹھا

چست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

### میرے نقشف کا انجام

میں نے نقشف سے روگردانی کیوں کی؟ اگر آپ یہ ماجرا ایک کٹھ ملا کی طرح سنیں  
 گے تو مجھ پر ہزار صلو تیں بھیجے لگیں گے۔ اور اگر ایک انسان دوست آدمی کی طرح سنیں  
 گے تو مجھے امید ہے کہ کم از کم میرے دل کی گداختگی کی داد دینے پر ضرور مجبور ہو جائیں  
 گے۔

وہ ماجرا سن کر آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جذبات کی رو میں بہہ کر اور مصلحت  
 خداوندی پر نگاہ نہ کر کے میں نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ پرائے شگون پر خاک  
 کٹائی اور اپنی عاقبت خراب کر لی ہے، لیکن اگر آپ کے سینے میں دل ہے۔ اور دل  
 میں درو مندا انسانوں کی محبت ہے تو آپ یہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکیں گے کہ ترک عبادت  
 میں میری نیت کا فتوہ میرے عدوان کا مادہ کارفرما تھا۔ اب وہ ماجرا سنئے۔

میں ایک روز حسب معمول امانی گنج کے میدان میں ٹہل رہا تھا..... دسمبر کی برفانی  
 ہوائیں اونی واسکٹ کو توڑ کر سینے میں چھ رہی تھیں۔ فضا اپنی کالی کملی کو اوڑھ لینے کے  
 واسطے جھٹک رہی تھی۔ تھکی ماندی چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں دور دور تک اداسی چھائی  
 ہوئی تھی۔ اور آفتاب کے ڈوب جانے کی کراہ فضا پر تھر تھرا رہی تھی۔ کہ میں نے دیکھا  
 کہ ایک کوزہ پشت بڑی بی، لکڑی ٹیکتی اور ریلوے لائن عبور کرتی ہوئی انتہائی درو مندی  
 کے ساتھ میری طرف ریٹکتی چلی آرہی ہے۔

ان کا یہ عالم دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... سوچنے لگا کہ یہ چلے کے



جاڑے یہ برف میں جھلا جھٹپٹا یہ ہڈیوں کو تراشنے والی ٹھنڈی ہوا یہ اونگھتا چٹیل میدان اور یہ ضعیفہ؟..... آخر کیا پتا پڑی ہے ان پر کہ یہ اس وقت گرم سفر ہیں..... اس وقت تو کتے بھی گھر سے باہر نکلنے کی جرات نہیں کرتے۔ تیز تیز قدم رکھتا میں ان کے قریب گیا تو دیکھا کہ جس لکڑی کے سہارے وہ چل رہی ہیں اس پر ان کا ہات کانپ رہا ہے اور ان کے ہاتھ کی لٹکتی ہوئی کھال چلنے میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا بڑی بی بی سلام انہوں نے میرا سلام سن کر جھکے جھکے جیتے رہو بیٹا کہا اور بڑی دشواری کے ساتھ کمر سیدھی کر کے پوچھا بیٹا تم کون ہو؟ میں نے اپنا نام بتایا انہوں نے میرے نام کو اپنے حافظے میں ٹٹول کر پوچھا بیٹا اپنے باپ کا نام بتاؤ؟ اور جیسے ہی میں نے اپنے باپ کا نام بتایا ان کی بے نور و خشک آنکھوں سے دفعۃً نمی آگئی۔ انہوں نے اپنے دونوں کانپتے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹھا کر دور سے میری بلائیں لیں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھرا ائے اور میں نے دردناک آواز میں پوچھا آپ رونے کیوں لگیں؟ انہوں نے کہا بیٹا کیسے نہ روؤں اللہ بخشے میرے خاوند تمہاری دیوڑھی کے سپاہی تھے..... اللہ کرے خاں بہادر (میرے باپ) کی کروٹ کروٹ حوریں ہوں ان کی سرکار سے عید بقر عید اور شبرات کے انعام و اکرام کے ساتھ ساتھ جڑواں کے نام سے اتامل جاتا تھا کہ ہم سب چین سے رہتے تھے۔ ہائے خاں بہادر صاحب کے چھ مہینے کے بعد میرے سر تاج بھی سدھا رگئے اور لے دے کے ایک جوان جہان بیٹا تھا وہ بھی خالی کے مہینے میں دغا دے گیا..... بڑی بی بی سینے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگیں اور ان کے چہرے کی جھریوں میں آنسو دوڑنے لگے۔

میں نے کہا بڑی بی بی آپ میرے گھر چلیں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا آپ کی خدمت کروں گا۔ اور ہر مہینے خدمت کرتا رہوں گا۔ انہوں نے کہا نہیں بیٹا بختیار نگر! میں میری چھوٹی بہن رہتی ہے۔ وہ ہر مہینے مجھے سات روپے دیتی ہے۔ ان روپوں سے

## ایلیح آباد کے ایک محلے کا نام

خرچ پانی چل جاتا ہے۔ ایک بوڑھی جان کا پالنا ہی کیا وہ غیور بڑی بی جب کانپتے ہاتھوں سے دعائیں دے کر چلی گئیں تو میرے ایمان کی پنڈلیاں کانپنے لگیں اور یہ سوچ کر کہ یہ ہڈیوں کی مالا بڑھیا فقط سات پلیوں کی خاطر مہینے ڈگ ڈگ کرتی بختیار نگر جاتی ہے میری سانس گلی میں الجھنے لگی۔ اور اس درد انگیز لمحے میں میری نظر دوڑ گئی اس طرف اللہ کے کروڑوں بندے درد کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے یتیم بچے ایک ایک کا منہ دیکھتے رہتے، بوڑھے باپ جوان بیٹوں کے جنازوں اٹھاتے کم سن بیواؤں کو رنڈ سالے پہنائے جاتے۔ بوڑھی اور بے آسرا بیواؤں کے جوان اور کماؤ بچے ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے سانپ انسانوں کو ڈستے درندے ان کی ہڈیاں بھنبھوڑتے سیلابوں میں شہر کے شہر بہہ جاتے، قحط کی شدت سے مائیں جانے بچوں کو بھون بھون کر کھا جاتیں و بائیں سینکڑوں گھروں کو بے چراغ کر دیتیں، زلزلوں کی کرفتوں میں ہزاروں شہر دب دب کر رہ جاتے۔ اور آتش فشاں پہاڑ بے شمار آبادیوں کو رکھ میں تبدیل کر کے رکھ دیا کرتے ہیں۔ اور پھر یہ خیال! اگر میرا سر چکرانے لگا کہ اللہ کی بنائی ہوئی اس دنیا کا یہ عالم ہے کہ یہاں قدرت نے طاقت کو یہ لائسنس دے رکھا ہے کہ وہ نا طاقتی کو کچل ڈالے۔ میری چشم تصور نے یکا یک پھر یہ تماشا دیکھنا شروع کر دیا کہ یزید، شمر، نادر، بیرو، چنگیز، ہلاکو، مسولینی، اور ہتلر خون انسانی کے دریاؤں میں اپنی رنگینیوں کے جہاز چلا رہے ہیں فاتح اپنے مفتوحوں کی لاشوں پر قالین بچھا بچھا کر فتح کے جشن منا رہے ہیں۔ جواں مرد احتیاط سے تنگ آ کر بزدلوں کے روبرو جھک رہے ہیں۔ اور بڑے بڑے

اکا طر کو دن سلاطین کے درباروں میں پیٹیاں باندھے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جاہلوں کے دروازوں پر بڑے بڑے علماء بھیک مانگ رہے ہیں..... سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جا رہا ہے مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا گیا ہے..... محمدؐ کے دانت شہید ہو جانے کے بعد خون بہہ رہا ہے اور محمدؐ کے نواسے حسینؑ کو اس کے بچوں اور ساتھیوں سمیت تپتی زمین پر لٹا لٹا کر پیا سا ذبح کیا جا رہا ہے..... اور یہ سارے تماشے ہو رہے ہیں اس خدائے بزرگ و برتر کی آنکھوں کے سامنے..... جو عادل ہے حکیم ہے رحیم ہے رؤف ہے رب ہے اور رزاق ہے۔ اور جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے..... اور اس کے باوجود اس سے مس نہیں ہوتا، اور ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم کے فشار میں گرفتار ہے.....؟؟ اور ان تمام باتوں پر ایک سانس میں غور کرنے کے بعد زندگی میں وہ پہلا دن تھا کہ خدا کے عادل و حکیم اور رب و رزاق و ہنے سے میرے دل میں شدید بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اور جھوٹ کیوں بولوں مجھ کو خدا پر اس قدر گہرے بھی آگیا کہ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ اگر آس پاس کوئی مسجد ہو تو اسے آگ لگا دوں..... مسجد وہاں تھی ہی نہیں ریلوے لائن کے شوالے پر نظر پڑ گئی۔ میں غصے سے بھرا اُدھر گیا اور شوالے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اول فول بکنے لگا۔

اسی عالم میں گھر آیا نماز مغرب کا وقت قضا ہو چکا تھا۔ نماز کی عادت نے دل میں انگرائی لی میں نے کہنی مار کر اس کی انگرائی توڑ دی۔ اتنے میں باپ کا ایمان لاٹھی چارج کرنے لگا۔ برے جی سے وضو کیا، مصلے پر نظر ڈالی دل نے کہا اٹھا کر پھینک دے اس کو اب باپ اور دادا دونوں مل کر مجھ پر لاٹھی چارج کرنے لگے..... مین ں بادل نا خواستہ نماز شروع کر دی۔ رکوع میں خم ہوا تو وہ کوزہ پشت بڑھیا سامنے آ کر کھری ہو گئی۔ اب خوب خدا نے دانٹ پلائی کہ جھک جا مردود میں جھک گیا اور جوں توں کر کے بوجھل دل کے ساتھ آسمان کو دیکھنے لگا۔

کیا میرا دماغ کفر کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر لرز گیا پھر میں نے

اپنے دل سے پوچھا کیا میں نعوذ باللہ خدا کے وجود سے انکار کر سکتا ہوں؟ دل نے کہا  
نہیں ہرگز نہیں۔

اسی کشمکش کے عالم میں کئی مہینھے تک اپنے دل و دماغ کو ایک اڑیل ٹٹو کی طرح  
ڈنڈے مار مار کر نمازیں پڑھتا لیکن ع حالتے رقت کہ محراب بفریاد آمد کی سی کیفیت  
مفقود ہو گئی۔

بندوں کی دردمندی اور اللہ کی بے مہری کا تصور قومی سے قوی ہوتا چلا گیا۔ اور اسی  
تناسب سے میری نمازیں بے لطف بے خضوع اور کھوکھلی ہوتی چلی گئیں..... اور  
میرے ایمان میں اس طرح تنزل ہونے لگا جس طرح رات کی تیرگی منہ اندھیرے  
کی روشنی میں اہستہ آہستہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس عالم میں جب نماز پڑھتا تو بے شمار انسانوں کی آہیں میرے کانوں میں  
گو نجنے لگتی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آوازیں آنے لگتی تھیں۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی  
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

☆☆☆

یا خداوند کارے افتاد دست  
کہ سر بندہ پروریدن نیست

☆☆☆

زندگی اپنی جو اس طور سے گزرے غالب  
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

☆☆☆

اس میر سید کہ بر غالب ناکام چہ رفت؟  
می تو آں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت





کفن بیا در و تابوت و جامہ نیلی کن  
کہ روزگار طیب است و عافیت بیمار  
مرا زمانہ طناز دست بستہ و تیغ  
زند بفرقم و ..... گوید کہ ہاں سرے می خوار



رونا تو اپنی آنکھوں کا دستور ہو گیا  
حق نے تو دی تھی آنکھ پہ ناسور ہو گیا



زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے  
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے



چنداں کہ خدا غنیمت مامتا جیم

اور ہر بار میرا جی چاہتا تھا کہ احتجاج کے طور پر نماز توڑ دوں..... مگر ہمت نہیں پڑتی  
تھی آخر کار کہاں تک اپنے سے لڑنا..... ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ خیال آیا..... ایسی  
نمازیں جن میں لب پر آستیں ہوں اور دل میں شکایتیں کس مرض کی دوا ہو سکتی ہیں۔ یہ  
خیال آتے ہی ایک توپ سی چلی میرے دل پر دھائیں سے۔ میری کھوپڑی میں ایک  
چٹا خاپید ابا۔ میری عقل میرے سر سے نکل کر پڑی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھ کو  
چونچ دکھانے لگی..... اور میں نے چٹ سے نماز توڑ دالی۔ حجرہ نماز سے دیوانہ وار باہر  
آیا۔ حجام کو فوراً بلایا داڑھی منڈوا دی۔ موٹے جھوٹے کپڑے اتار کر پھیک دیے اچھا  
لباس پہن لیا ٹمٹم منگائی اور آدھ گھٹنے میں لکھنؤ پہنچ گیا لکھنؤ پہنچتے ہی دن دھاڑے ایک

نازنین کے کمرے میں چلا گیا اور گانا سننے لگا۔ گانا سن کر کھانا کھایا..... ٹنڈے کبابی  
کے کباب نوش فرمائے وہیں پڑ کر سو گیا..... شام کے قریب حمام کیا گویا عقل کا غسل  
صحت ہو گیا..... اور آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔

لو بندگی، کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم  
اور رات کے گیارہ بجے جب اس نازنین کی گدگدی مسہری پر لیٹا تو وہ کچھ داری کا  
کہیں ترش ملا جو میرے جملہ دل میں آ کر بس گیا تھا اپنا مصلے اور اپنے وضو کو بدھنا بغل  
میں داب کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے تجھ پر خدا کی ماراے مردود کہتا ہوا چلا گیا۔ اور اس ملا  
کے جاتے ہی میری خواب گاہ میں میرا گم کردہ شاعر

پس از مدت گزر افتاد بر ما کاروانے را  
کے مانند ہنستا ہوا ایا اور آتے ہی اس نے دور کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں  
اور گانے لگا

مرده اے دل کہ مسیحا نفسے می آید  
کہ ز انفس خوش بورے کسے می آید

### آغاز بادہ خواری

دنیا کی تمام باتوں میں سے دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ایسی تھیں کہ لڑکپن ہی  
سے مجھ کو ان سے شدید نفرت تھی۔ ایک تو ان میں سے تھی بادہ خواری دوسری تھی دروغ  
گفتاری..... دروغ گفتاری سے اب تک نفرت ہے لیکن بادہ خواری اختیار کر چکا  
ہوں۔

اس سے پیش تر کہ میں اپنے آغاز بادہ خواری کا ماجرا بیان کروں مناسب یہ معلوم  
ہوتا ہے کہ بادہ خواری اور دروغ گفتاری کے باب میں چند نکات پیش کر دوں تاکہ  
آپ کو میرے نظریات کا علم ہو جائے۔

جہاں تک کہ بادہ خواری کا تعلق ہے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر چند بادہ

خواری اب میری زندگی کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔ لیکن اگر بد قسمتی سے میں کسی ریاست کا آمر ہو جاؤں تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر شراب کا سا جو ہر ناب عوام کے لیے زہر اور خواص اور وہ بھی دیوتا قسم کے خواص کے واسطے اب حیات ہے، میں اس پر اسلحہ کے لائسنس کے مانند یہ کڑی شرط عاید کر دوں کہ جب تک درخواست گزار.....

(۱) اس نوعیت کا میڈیکل سٹیفلیٹ پیش نہ کر دے کہ اس کی صحت میں اس قدر دم خم ہے کہ وہ شراب کی ایک مقدار معین کا بار کا تحمل ہو سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی ماہر نفسیات کا اس مضمون کا صداقت نامہ بھی حاصل نہ کر لے درخواست گزار کے مزاج میں ہوگا ارحد سے متضاد ہو جانے کا میلان نہیں ہے۔ اور وہ اس قدر دانا پاکیزہ نفس اور شریف انسان ہے کہ پینے کے بعد وہ سخت کی پارے داری اپنی اخلاقی و معاشی حالت کی استواری، اپنی خانگی زندگی کی خوش گواری، اپنے ذہن کی سلالت کی بیداری، اپنے حقوق نفس (مع حقوق عباد) کی آب یاری، اور اپنے معاشرے کی پرسکون ہمواری کو باحسن الوجہ قائم رکھنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتا ہے۔ اس وقت تک اس کے نام بادہ خواری کا لائسنس منظور نہ کیا جائے۔

اب رہی دروغ گفتاری سو اس کے باب میں بڑی جسارت سے کام لے کر یہ عرض کرتا ہوں کہ جو لوگ حقیقت کذب سے واقف نہیں۔ وہ ہر خلاف واقعہ بیان پر کذب کا لیبل لگا دیا کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر دانا انسان کو میرے اس خیال سے اتفاق ہوگا کہ ہر خلاف واقعہ بیان کو جھوٹ کے زمرے میں شمار نہیں کیا جاسکتا اور کلمات حکمت آمیز کو حرف دروغ کا خطاب دینا انسانیت پر بڑا ظلم دھانا ہے میرے نزدیک جھوٹ فقط اسے کہا جائے گا جو سامعین کو دھوکا دے کر کسی شخصیت یا جماعت کو بے جا نقصان یا اپنے ناروا فائدہ پہنچانے یا زیٹ کا مزا اڑانے کے واسطے بولا جاتا ہے۔

لیکن اگر ایسے خلاف واقعہ بیانات پر ہم دروغ گفتاری کا لیبل چسپاں کر دیں

گے تو بڑی احتیاط آمیز نیک نیتی اور انتہائی جذبہ حب انسانی کے ساتھ اس غرض سے زبان پر لائے جاتے ہیں کہ (۱) نادان اور ضدی کی بیماریوں کو موت کے چنگل سے بچا لیں..... (۲) فتنوں کا سد باب کر دیں..... (۳) گم راہ یا معاشرے کو صراطِ مستقیم پر لے آئیں۔ اور (۴) کسی معصوم کے دل کو ٹوٹنے سے بچالیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم تمام محسنانِ انسانیت اور تمام مصلحینِ عالم کے تمام عظیم کارناموں پر پانی پھیر دیں گے اور یہ ایک ایسی خطا ہوگی کہ جس کو خیر کی تاریخ اور مصلحین و مبلغین کی روح کبھی معاف نہیں کر سکے گی۔

سو اگر میری جھوٹ کی یہ تعریف تسلیم کر لی جائے تو میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی ایک بار بھی دروغ بانی کا ارتکاب نہیں کیا اور اگر غیر مفکر عوام میں جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے۔ اس کو مان لے تو مجھے اعتراف ہے کہ اپنے اٹھارہ معاشقوں کے دورِ متلاطم میں اپنی بیوی کے دل کو ٹوٹ جانے سے بچالینے کی خاطر میں نے اپنے سر پر قرآن رکھ رکھ کر ایک بار نہیں اٹھارہ ہزار بار جھوٹ بولا اور بڑے دھڑلے کے ساتھ بولا۔

اور لوگوں کے معمولی اشعار پر سبحان اللہ ماشاء اللہ کیا خوب فرمایا ہے آپ نے کے نعرے لگا لگا کر اور احباب کی مروت کے دباؤ میں ان کے کلام پر مبالغہ آمیز تبصرے لکھ لکھ کر بڑے زمانے کے ساتھ آج بھی جھوٹ بولتا رہتا ہوں۔

ہاں تو میں اس توضیحی عبارت آیا اس جملہ معترضہ کے بعد اب سنیے کہ میری بادہ خواری کا آغاز کیوں کر ہوا..... یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۱۸ء یا سنہ ۱۹۱۹ء کا ہے کہ میں اپنی نانہال دھول پور گیا ہوا تھا اور وہاں میرے ایک دوست سردار مہابیر سنگھ نے میری دعوت کی تھی اور کہا تھا کہ میں چراغ میں جی پڑتے ہی وہاں پہنچ جاؤں۔

وقت مقررہ پر میں وہاں پہنچ گیا۔ اپنے دوست سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن کو وہاں موجود پایا۔ میرے آتے ہی بوتل کھول دی گئی۔ اور پیانے بھر بھر کے سب



کے سامنے رکھ دیے گئے۔

چوں کہ مجھ نا فہم کو شراب سے سخت نفرت تھی میں پینے کی میز سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سب نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور صوفے پر جا کر بیٹھ جانے کی علت دریافت کی۔ میں نے کہا میں شراب نہیں پیتا۔ تینوں دوستوں کے منہ سے بیک وقت ایک طویل ارے کی آواز نکل گئی۔ رن بیر نے کہا ”ارے شاعر ہو کر تم شراب نہیں پیتے“ می نے کہا شاعر کے واسطے شراب پینا کوئی لازمی امر نہیں میرے اس جواب سے سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

روپ سنگھ نے اپنی ناک میں انگلی رکھ کر کہا۔ جمیری جان تم کو یہ بھی آج تک خبر نہیں کہ دیوتاؤں نے سمندروں کو متھ کر یہ سوم رس نکالا تھا۔ فقط کو یوں شاعروں کے لیے۔ ارے کوئی ہو کر شراب نہ پینا پاپ بلکہ مہا پاپ ہے۔ تم کو پینا پرے گی۔ میں انکار اور وہ تینوں اصرار کرنے لگے۔ بڑی دیر تک جھک جھک ہوتی رہی۔ شور رہا ملتیں رہیں ہاتھ جوڑے گئے لیکن جب میں پینے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوا تو میرے میزبان مہا بیر سنگھ نے جلدی جلدی بڑے بڑے چار پانچ گھونٹ پی کر سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن سے کہا تم لوگ شبیر کی چوتیا پٹختی میں وقت برباد نہ کرو اٹھاؤ اپنے جام اور میں ابھی ان کو مہاراج کا تیا پانچا کیے دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا گلاس خالی کر دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی دھمکی دے کر پوچھا کیوں جھوٹے کوی صاحب نہیں پیو گے۔ میں نے کہا مہا بیر تیرے سر کی قسم مر جاؤں گا پیوں گا نہیں۔ انہوں نے بڑے زعم کے ساتھ اپنے سر کو جھٹکا دے کر کہا اچھا بچا جی ابھی مزا چکھا دیدیتا ہوں تم کو..... یہ کہا اور کسی بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ وہ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے سامنے کے کمرے میں داخل ہو گئے..... ان کے جانے کے بعد روپ سنگھ نے میری طرف اشارہ کر کے تارا چرن سے کہا پارٹنر! دیکھ لو گاؤ دی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے ان کو گالی دی وہ ہنسنے لگے۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد مہابیر کمرے سے نکلے انہوں نے لپک کر دو جام بنائے  
ایک جام آدھا ختم کر رکھے وہ اپنے کمرے کی طرف دیکھنے لگے اور جب چھم کی آواز سنی  
تو انہوں نے پردہ اٹھایا اور ایک سیکنڈ کے اندر پردے کے تانے بانے سے ایک روشنی  
سی پھوٹنے لگی اور دوسرے سیکنڈ میں کیا دیکھتا ہوں کہ پیکر انسانی میں ڈھلی ہوئی ایک  
کڑکتی ہزاروں انوٹوں کے ساتھ جم چھم کرتی اور پتلی کمریا لچکاتی چلی آ رہی ہے..... اور  
میرے دل میں فسح الرعد و بجدہ کی صدا گونج رہی ہے۔

اف..... وہ سولہ سترہ برس کا سن۔ وہ مرادوں کی راتیں مرادوں کے دن۔ وہ چھلا  
سی کمرہ صراحی دار گردن، وہ کسمسا تابدن، وہ کھد بذا تا جو بن..... وہ سینے کا پانی ابھار وہ  
ریشمی پلو کی سطح ناہموار..... گالوں کی وہ کندنی کاغذی جلد، جلد کے نیچے چھنتا اور چہکتا  
ہوا گلابی رنگ وہ ستواں ناک سجل نقشہ..... دکتی پیشانی دکتی پیشانی پروہ بولتا  
قشہ..... نکلتا قد چختا پنڈا..... سرخ انکھڑیوں سے وہ اٹھتی رنگین گھٹائیں۔ لانی نیکیلی  
پلکوں کی جھپک میں وہ کجری کے کٹتے بول..... سرے کے دنبالے میں وہ کجائی ہوئی  
دھنک..... سانسوں کی موجوں میں وہ کوکتی جوانی..... بکھری زلفوں میں وہ جھولتی ہوئی،  
بند را بن کی برکھاراتیں..... ہیرے کے باریک قلم سے ترشے ہوئے لب لبوں میں وہ  
چوم لیے جانے کی تمنا کا ابھار..... اور جھل جھل کرتی چست انگیا کی کٹوریوں میں وہ  
زیر تعمیر تاج محل کی ہمار..... ارے دہائی گنبد گردوں کے پروردگار..... اس کو دیکھ کر  
زلزلہ آ گیا میرے دیا روجود میں..... خون کی گردش میں ایسا جوار بھانا آیا کہ کانوں  
میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ بھاپ سی اٹھنے لگی میرے مسامات سے اور

اتاش کے رفیق

سر پر آواز منڈ لانے لگی اڑ بھنیری ساون آیا اڑ بھنیری ساون آیا۔

اتنے میں وہ بھرے ہوئے ساغر کی طرف گئی پتلی پتلی اور لانی لانی سرخ انگلیوں سے اس نے ساغر اٹھایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا بلوریں جھاڑ کے قلموں کے حلقے میں قلمہ روشن ہو گیا۔ ساغر کے خطوں کی نبض چلنے لگی اور صہبا کی موجوں میں بھنور پڑنے لگے۔

پیانے سے منہ لگا کر اس نے دو چار گھونٹ پیے اور اس کے بعد اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اس کی مدبھری آنکھیاں میرے سینے کو توڑ کر میرے دل میں تیر گئیں۔ اور اسیا لگا کہ کوئی چیز میرے گلے سے اتر رہی ہے پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں میرے دل میں دونوں وقت گلے ملنے لگے۔ اس نے اپنا ساغر خالی کر کے دوسرا ساغر لب ریز کر لیا۔ اس لب ریز ساغر سے چند قطرے پیے۔ کن آنکھیوں سے مجھ کو انکا آنک کرشکاری نظر سے دیکھا اور پیانا نہ ہاتھ میں اتھا کر بڑھنے لگی اس کے قدم میرے سینے میں بجنے لگے..... میرے دل میں ٹن ٹن خطرے کی گھنٹی بجی اور آواز آئی ارے بڑا زبردست طوفان اارہا ہے..... خاں صاحب ہوشیار سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے گانا بھی شروع کر دیا۔

اری میں تو لٹ گئی بیچ بچار..... ترکوالے نے لوٹ لیا۔ اس کے گاتے ہی تارا چرن نے ستار چھیڑ دیا۔ جھنن جھنن جھن جھن جھان عود کی لپٹوں ستار کے جھالوں اور اس فتنہ دوراں کی تانوں سے درود یو اور جھومنے لگے۔ اور وہ ظالم مجھ سے قریب سے قریب تر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ جھالوں اور تانوں میں پیرتی ہوئی وہ بالکل میرے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اس قدر قریب آ گئی کہ اس کی ابلتی ہوئی جوانی کی آنچ مجھ کو چھونے لگی اور اس کی کچی عمر کی مہکتی سانس میرے سینے میں چھنے لگی..... میرے دل سے پھر آواز آئی خاں صاحب..... ہوشیار ہوشیار دشمن سر پر آ پہنچا بغلی ڈوب جاؤ۔ میرے ہاتھ پیر سنسانے لگے چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں کہ یکا یک وہ ظالم چھپ سے میرے زانو پر آ کر بیٹھ گئی..... ستار پر اور بھی تیزی کے ساتھ جھالا بننے لگا۔ اور اس

نے جھوٹی شراب کے ساغر کو میرے لبوں سے پیوست کر کے پھر گانا شروع کر دیا  
 ارے پی لے ترکو شراب میری جھوٹی شراب میری جھوٹی شراب میری جھوٹی شراب  
 ۔ اور میں نے آؤ دیکھانے تاؤ لا اللہ کا نعرہ مار کر پورا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا  
 میرے ہاتھ سے گلاس سے کرچو ما اور پھر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔  
 اور اپنے لب میرے لب سے چسپاں کر کے اس طرح الٹی سانسیں لینے لگی گویا وہ  
 میرے تمام وجود کو پی جائے گی۔

جھر جھر جھرتا لیاں بجانے لگے تارا چرن، روپ سنگھ، اور مہابیر سنگھ..... ہپ ہپ ہرا  
 کرتے سب میری طرف دوڑ پڑے۔ رن میر نے سر جھکا کر کہا خاں صاحب بہادر  
 آداب بس رہ گئی ساری شیخی اور پھر دور شروع ہو گیا ستار کے جھالوں میں۔

بالا	بلند	سرو	قدے	سرو	نازمن
کوتاہ	کرد	قصہ	زہد	دراز	من!

ارے میں تو بازار کے بچوں کی لٹ گئی۔ ترک نے لوٹ لیا مسلمان کو ترک کہا  
 جاتا پھر لفظ معشوق کے معنی میں مستقل ہو گیا۔





## میرے عنقوان شباب تک کا ہندوستان

میرے حالات کے ساتھ ساتھ میرے اس ہندوستان کے تہذیبی و معاشرتی حالات بھی سن لیجیے جس نے مجھ کو متاثر کیا اور سانچے میں ڈھالا تھا۔

تہذیبی اعتبار سے اس وقت ہندوستان کے دورا ہے پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ مشرقیت پر قائم رہے یا مغربیت کی طرف مڑ جائے؟ ملک اس وقت خالص مشرقی نیم مشرقی اور مغربی ان تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔

خالص مشرقی گروہ کی اکثریت تھی نیم مشرقی گروہ کی تعداد کم تھی اور مغربی گروہ اقلیت میں تھا۔

خالص مشرقی گروہ کے چہروں پر لانی یا خشکی داڑھیاں تھیں اور سروں پر پٹے پٹوں پر عمامے دستاریں شملے یا دوپلی اور چوگوشیا ٹوپیاں۔ پاؤں میں گھٹلے یا سلیم شاہی جوتے۔ بڑے پانچوں کے پائے جامے یا اور پی گھٹنے۔ عبائیں قبائیں انگرکھے دگلے شانوں اور کمروں پر بڑے بڑے رومال چکن کے کرتے روئی کی صدریاں اور ہاتوں میں خاک شفا کی تسبیحیں انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں ہولا اور شام لگی جری ہیں۔

نیم مشرقی گروہ داڑھی منڈاتا شیروانیاں چست پائے جامے پمپ جوتے استعمال کرتا اور جیبوں میں گھڑیاں رکھتا تھا جن کی زنجیریں دونوں جیبوں کے درمیان میں لٹکتی رہتی تھیں۔

اور مغربی گروہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ میں غرق رہتا تھا۔ لیکن داڑھی کے ساتھ مونچھیں نہیں منڈاتا تھا۔

فرنگیوں کے نقیب پنڈت مدن موہن مالویہ اور سرسید احمد خان اپنے اپنے چہلی چاپڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کے لیے سعی کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہر چند ابھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار

رہی تھی۔ مگر قومی مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئے تھی۔ اور سوٹ پہنے جوانوں کو پہلی صاحب کہا جاتا تھا۔

کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھیل یعنی گلی ڈنڈا، پتنگ، آتی پاتی، چھلچلی کبڈی، آنکھ مچولی، ست گھڑا، گپل، گولیاں، اندھا مرغ، للی گھوڑی، شطرنج اور چومر..... تیراکی، بانک، بنوت، پٹا کشتی ڈنڈ، اور مگدر..... مرگ بازی اور بیڑ بازی اور تیتز بازی کا عام رواج تھا۔ اور فٹ بال ہاکی ٹینس، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، تاش اور کرکٹ کو کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔

اسی طرح ڈولیموں، پالکیوں، نالکیوں، فنسوں، میانوں، ہواداروں، گھوڑوں، بند گھوڑا گاڑیوں اور ہاتیوں کی سواریوں کے آگے لیندوئیں، ٹمٹمیں، فٹنیں، موٹریں اور سائیکلیں وغیرہ غیر ثقہ سواریاں سمجھی جاتی تھیں مشرقی و مغربی لوگوں کی راتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں..... ادھر شام ہوتے ہی نوابوں اور رئیسوں کے محلوں میں جھاڑ فانوس شمعیں اورا کے روشن کر دیے جاتے تھے۔ عود سلگتا، عطر دان کھلتے خاص دانوں میں گلوریاں آتیں چاندی سونے کی چمٹیوں سے اتھا اتھا کر پان کھائے جاتے معطر حقے اور سٹکیں گرگڑا تیں..... علمی مباحث، مشاعرے اور مجرے ہوا کرتے تھے۔

ادھر کلبوں میں تاش کھیلے جاتے بیڈمنٹن کی اچھل کود ہوتی پیانو بجتا گراموفون کھڑکھڑاتا۔ سگرتوں کی بواڑتی..... کالی پیلی، مس سکورا یا مسز لچر مغربی دھنوں میں شور و غوغا کیا کرتی تھیں۔ اور جب پیڑوں سے پیڑ و رگڑ و اتا ڈانس شروع ہوتا تو بینڈ چیخنے لگتا تھا اور عمدہ بجانے والوں کو زور زور سے تالیاں بجا کر داد دی جاتی تھی۔ اور ہماری زبان میں وہ سب تالی پٹے ہوئے لونڈے گھیرے بن جایا کرتے تھے ادھر فرش یا چوکیوں پر دسترخوان بچھا کر ہاتھوں سے اور ادھر میزوں پر کانٹے اور چھری رکھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھایا جاتا تھا۔ چوں کہ فرنگی تہذیب اس وقت تک مغرب پسندوں کو ہضم نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے چھری کانٹوں سے برابر کھٹ کھٹ کی آوازیں

آتی رہتی تھیں گاہ گاہ وہ آلات خوراک تڑ سے فرش پر بھی گر جایا کرتے تھے۔ یا بے گلی مرغ کی ٹانگ اڑ کر کسی کی ناک سے ٹکرا جایا کرتی تھی۔ دونوں کھانوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا ادھر کے کھانے تھے (۱) 'قورمہ'، 'قلیا'، 'کو فٹے'، 'شامی کباب'، 'تیخ کباب'، 'بوٹی کباب'، 'لگن کباب'، 'آنت کباب'، 'مچھلی کباب'، 'دم پخت کباب'، 'زرگسی کباب'، 'ران کباب'، 'مرغ تیتڑ'، 'کبوتر'، 'بٹیر'، 'شب دیگ'، 'کلے پارے'، 'کھیری سری'، 'بھيجا'، 'کلیجی'، 'گردے'، 'دم پخت بکرے'، 'قیمہ'، 'قیمہ بھرے کریلے'، 'دھونی ماش کی دال کھڑے مسور کی دال'، 'خاگینہ'، 'چلے ستارے'، 'بھنی رانیں'، 'بریانی'، 'پلاؤ'، 'مرغ پلاؤ'، 'تیتڑ پلاؤ'، 'بٹیر پلاؤ'، 'بوٹ پلاؤ' اور چکتی پلاؤ وغیرہ۔

۱۔ انگریز ہندوستانیوں کے کلبوں میں آنا توہین سمجھتے تھے اور اپنے کلبوں میں ہندوستانیوں کے داخلے کو خلاف شان خیال کرتے تھے۔ اس لیے دیسی انگریزی کے کلبوں میں اینگلو انڈین لڑکیاں اور عورتیں ہی شریک ہوتی تھیں۔

(۲) مٹھائیوں میں حبشی حلو، سوہن پڑی حلو، سوہن، زردہ، انار کا زردہ، پستے بادام کا زردہ، مزعفر، کھیر، شیر خرما، کچھے، بالائی، میٹھے سموے، قفلیاں، بالائی کے آب خورے، نمش، پنیدیاں، رساؤل، گڑمبا، پیوسی، برنی جلیبیاں، امرتیاں، لڈو، باجرے کا ملیدہ، قلاقند، گلاب جامن، پیڑے، پیٹھا، اندرے، دندان مصری، شکر پارے، لوز، چٹنیاں اور مربے (۳) وہی رائیتا، پھلکیاں، دھی وہی بڑے، تلی دالیں..... چلے، تگونے، سموے، سہال، پاپڑ، نمک پارے، کھجڑیاں، دال موٹ، سیوتلی، اروی، بھرتے، ساگ، تھری، قبولی، خشکہ، گوجھے، منگییاں اور کھولے، چپاتی ورتی چپاتی، دھری چپاتی، پھلکے گردے، خمیری، شیر مال، دو سے لے کر اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، روغنی روٹی، بیسنی روٹی باقر خوانی۔

اور ادھر کا کھانا تھا سوپ، چاپ، کھلت، ابلی، مچھلی، ابلا مرغ، ابلے آلو، ابلا متر، ابلی ترکاریاں، ڈبل روٹی، مکھن پڈنگ، پیستری، آئیس کریم، جیلی، ساس، اور کیک بس اللہ

ہر چند سرسید گریزہ انگریزی خوانوں میں فرنگی کی نقالی اور پرستاری کا ذوق رو بترقی تھا۔ مگر ان کی عورتیں ٹھیٹ ہندوستانی تھیں اور مورے کالا پانی پینے والوں سے ان کو شدید نفرت تھی۔

گھروں میں مغربی فرنیچر کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔ وہی پرانے زمانے کی مسہریاں وہی چھپرکٹ وہی نیچے پایوں کے تختوں کے چوکے چوکوں پر مسدیں، قالین، چاندنیاں، گاؤتیکے میرفرش اگالداں، الاپچی دان، پان دان، اور خاص دان، لباس میں بھی وہی قدیم تراش خراش قائم رہی۔ وہ پانچوں کے کلی دار پاجامے جن کے گوشے چلتے وقت خادماں اٹھالیتی تھیں۔ وہی انگیا وہی کرتی وہی انگیاؤں کی چڑیاں وہی شلو کے وہی دوپٹے وہی دلائییاں اور وہی رضائیاں وہی پرانا تیل پھیل تھا، وہی کاجل وہی مسی، وہی سرمیہ، وہی مہندی، اور وہی افشاں دچلی آ رہی تھی..... صابون کا رواج بہت کم تھا کھلی بیسن اور ابٹن سے کام لیا جاتا تھا۔

کنوار یوں کو بے کلیوں کے سیدھے پاجامے پہنچائے جاتے تھے۔ ان کی ناک میں ایک موتی کی چھوٹی سی نتھنی ہوتی یا نیم کاتنکا۔ اور ان کو پان کھانے مسی لگانے اور افشاں چھڑکنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور مانگ نکالنے کے بدلے، ان کے سروں پر مینڈھیاں گوندھی جاتی تھیں۔ جس سے چوخانہ سا بن جاتا تھا۔ اس دور کے زیوروں کے نام بھی سن لیجیے۔

۱۔ شراب کو عورتیں کالا پانی کہتی تھیں۔

(۱) سر پر چھپکا (۲) ماتھے پر سراسری ٹیکا سمیت (۳) کانوں میں پتے بالیاں، جھمکے، بالے، بجلی، مگر بندے، جھالے، انتیاں اور کرن پھول (۴) ناک میں نتھنی بلاق اور کیل (۵) گلے میں طوق گلوبند بدھی زنجیر چنن ہار، دھکد کی، چمپا کلی اور ہیکل (۶) ہانہوں میں جوشن نوگے، بازو بنداکا، اور چھوٹا ساعطردان (۷) کلائیوں میں کڑے،



چوہے، دیتیاں، بانکلیں، چوریاں، کرلیاں، پنچیاں، سمرنیں، کنگن، اور جہاں گیریاں (۸) انگلیوں میں چھلے انگوٹھیاں آرسی اور علی بند (جس میں سونے چاندی کی زنجیریں ہوتی تھیں) (۹) پاؤں میں چھاگل، جھانجھیں، رام جھول، کچھوے، کڑے، چھلے، لچھے اور پازیب (۱۰) پاؤں کی انگلیوں میں چھلے (جن میں انگوٹھے سے لے کر چھنگلیا تک سونے یا چاندی کی زنجیر ہوتی تھی)۔

نواب صاحب کی بیگم ہوں یا بیرسٹر صاحب کی بیٹر ہاف (Better Half) دونوں بڑی سختی سے پردے کی پابند تھیں۔ ڈولی اور پالکی کے سوا کوئی بی بی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ اورتو اور عورتوں کی آوازیں اور انکا وزن بھی پردہ نشین تھا۔ یعنی کوئی بی بی اس قدر زور سے نہیں بولتی تھی کہ مردانے تک اس کی آواز جاسکے۔ اور جب کوئی خاتون پالکی میں سوار ہوتی تھیں تو پتھر کا ٹکڑا یا سل، پالکی میں رکھ دی جاتی تھی کہ کہاروں کو اس کے جسم کا صحیح انداز ہو سکے اور پیمیاں تو پیمیاں ماماں اور اسیلیں اور لونڈیاں باندیاں تک پردے کی پابند تھیں۔

زنانے میں آنھے جانے والے بیرونی بچوں سے بھی جب کہ وہ دس گیارہ سال کے ہو جاتے تھے پردہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ اور مشکوک چال چلن کی عورتوں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا۔ اورتو اور باپ دادا مانا چچا اور پھپا کے سامنے بھی عورتیں سروں پر پلو ڈال کر جایا کرتی تھیں اور کسی عورت کی یہ مجال نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کی موجودگی میں اپنے بچے کو گود میں لے لے۔

زنانے مکان کی فضا کو مقدس رکھنے کا یہاں تک اہتمام کیا جاتا تھا کہ کسی ترکاری والی عورت کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ لانی لانی ترکاریوں مثلاً لوکی، ترئی، کریلے، چچینڈے وغیرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کیے بغیر سالم حالت میں اندر لے جائے اس لیے کہ صورت کے لحاظ سے ان ترکاریوں کو فحش ترکاری خیال کیا جاتا تھا۔

اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ملیح آباد کے ایک صاحب کے لڑکے کی

شادی پر ناچ ہو رہا تھا کہ بالا خانے سے ایک عورت جھانک کر ادھر دیکھنے لگی۔ اور صاحبان محفل میں سے ایک صاحب نے اس کو بندوق مار دی۔ صاحب خانہ دیگوں کے حلقے میں کھڑے تھے کہ انہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور دوڑے ہوئے محف میں آئے۔ گولی مارنے والے خاں صاحب نے ان سے کہا ”بھائی آپ کی بیوی اوپر سے جھانک رہی تھی۔ مجھ سے یہ بے حیائی برداشت نہیں ہوئی میں نے گولی مار دی“ صاحب خانہ نے ان کی پیٹھ ٹھونک کر کہا بہت اچھا کیا آپ نے۔ اور فوراً اندر چلے گئے تھوڑی دیر میں ایک لاش گھسیٹتے ہوئے آئے اور کہا بھائیوں دیکھ لیجے میری بیوی نہیں لونڈی جھانک رہی تھی۔ اللہ نے میری آبرو اور میری جان دونوں چیزیں بچالیں۔

۲۔ سیاسی اعتبار سے اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پو پھٹنے میں بہت دیر تھی رات کے دوایا تین بجے کا وقت تھا لوگوں کی اکثریت خراٹے لے رہی تھ کچھ بستروں پر پڑے کروٹیں لے اور کمنا رہے تھے اور بہت تھوڑے لوگ تلک اور گھوکھلے کے کجر سن کر بیدار ہو گئے اور دھیمے سروں میں آزادی کے چرچے کر رہے تھے اور بھارت ماتا چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھ کر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ

از کجائی آید اس آواز دوست

فرنگی کے کان تک بھی وہ آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ اس کا غور کہہ رہا تھا کہ

یہ ہوا میرے چراغوں کو بجھا نہیں سکتی

لیکن مہاتما گاندھی جس وقت لنگوٹا باندھ کر میدان میں کود پڑے تو پو پھٹ گئی۔

اور ہر طرف سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ تخت یا تختہ..... آزادی یا موت..... یا ایوان فرنگی مسار یا تختہ دار۔

گاندھی کی اندھی نے حکومت کے اوسان اڑا دیے۔ حکومت یہ سوچ کر ہاتھ ملنے

لگی کہ ہم نے مسلمانوں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور ہندوؤں کے ایک

فرقے کو دوسرے فرقے اور پھر بحیثیت مجموعی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے

سے ٹکرا دینے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا وہ بے کار گیا، اور سارے مسلمان اور ہندو مل کر آج ہمارے مقابلے کے واسطے آگئے۔ یہ علامت نہایت خطرناک ہے کیا تدارک کی اجائے اس فتنہ عظیم کا؟

آخر حکومت نے ایک منصوبہ تیار کر لیا..... پولیس اور فوج کے حلقے میں بگل بجا دیا گیا۔ ایک طرف تو جیلوں کے دروازے کھول دیے گئے لاکھیاں برسنے اور گولیاں چلنے لگیں۔ اور دوسری طرف پکڑ بلوایا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دینی رہنماؤں یعنی مہا مہوپدھیائوں اور شمس العلماءوں کو جن کو ہندو مسلم فسادات برپا کر دینے کے لیے برسوں سے گھر بیٹھے و ظیفے مل رہے تھے۔ اور بری طرح پھٹکا را گیا ان کو کہ انہوں نے ایسی غفلت کیوں برتی کہ ہندو مسلم اتحاد کا فتنہ برپا ہو گیا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ پکارا گیا ان تمام نوابوں رائٹ آنرز ریلوں خان بہادروں، رائے بہادروں، رئیسوں تاجروں سیٹھوں، سود خواروں، زمین داروں، جاگیر داروں، تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کے شہریاروں کو، جن کو حکومت سائنڈوں کی طرح پالے تھی..... کہ اے پٹوؤں کانگریس کی طرف اپنی توپوں کے منہ موڑ دو، اور آزادی کے دیوانوں پر اپنے کتے چھوڑ دو۔

اب کیا تھا ہر طرف پکڑ دھکڑ کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جیلیں بھری جانے لگیں، سولیاں کھڑی کر دی گئیں اور ہر جانب سے غلغلے بلند ہونے لگے۔ کہ خاک میں ملا کر رکھ دو انگریز بہادر کے غداروں کو یہاں تک کہ آگے چل کر جلیاں والے باغ کی زمین خون میں ڈوب گئی۔ اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہونے لگیں لاشیں محبان وطن کی اور آسمان سے آنے لگیں صدائیں

کسے نہ ماند کہ اور اتنی ناز کشی  
مگر کہ زندہ کئی خلق راؤ باز کشی

☆☆☆

## قومی تحریک سے وابستگی

یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۱۸ء کا ہے کہ سب سے پہلے محمد مستقیمؒ نے مجھ کو گاندھی جی کی شخصیت اور تحریک آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر کے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے واسطے احمد آباد بھیجا تھا۔ شام کے وقت احمد آباد پہنچا۔ ایک خیمے میں جا کر ٹھہر گیا۔ تھکا ماندہ تھا کھانا کھا کر سو گیا۔ پچھلے پہر یہ خواب دیکھ ہی رہا تھا کہ میں تخت سلیمان پر بیٹھا رہا ہوں کہ میرا خیمہ تانوں سے گونجنے لگا آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی۔ سوا چار کا وقت تھا خیمے کا پردہ الت کر باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی دیکھا کہ میرے خیموں کے شہر پر، سلونی سی گلابی روشنی برس رہی ہے اور سینکڑوں زہرہ جمال کجراتی لڑکیاں پتلی پتلی کمروں میں سرخ سرخ پیٹیاں باندھے اور ہاتھوں میں شمعیں اٹھائے قومی ترانے گا رہی ہیں اور پوری دنیا چھماچھمناچ رہی ہے

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شے  
میں صبح ہوتے ہی مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس پہنچا ان کے ساتھ چائے پی  
انہوں نے ہنس کر کہا ملیح آباد میں آپ نے جو لطیفہؒ آپ نے سنایا تھا آج تک اس کا  
مزا لے رہا ہوں۔

۱۔ وہ نسلی اعتبار سے انگریز دینی اعتبار سے مسلمان آگرے میں میرے سوتیلے  
مانموں کے ٹیوٹر، اور بعد کو میرے بھائی محمد یوسف خاں کے سیکرٹری کی حیثیت سے ملیح  
آباد گئے تھے۔ ۲۔ اس سفر میں مشیر احمد خاں رام پوری چھوٹے دادا، اور جگنو خدمت گار  
میرے ساتھ تھا ۳۔ وہ لطیفہ یہ ہے کہ ایک ایرانی ہندو سان کے آم کھا کر جب شیراز پہنچا  
تو اس نے وہاں جا کر آموں کی تعریف کے پل باندھ دیے تو اہل شیراز نے پوچھا کیا  
وہ پھل انگور سیب سے بھی اچھا ہے؟ اور اس ایرانی نے کہا کہ بمر اعلیٰ بہتر تو لوگ اس



کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کا مزا بتاؤ۔ مزا بتانے کی چیز ہی کب ہے کہ وہ بتاتا تقاضوں سے تنگ آ کر اس نے کہا آم اس قدر لذیذ تھے کہ کھانے کے بعد یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا علی مرتضیٰ ہیں کہ زبان سے گلے میں اترتے چلے جا رہے ہیں، ”نعرہ صلوٰۃ بر محمد و آل محمد۔“

### مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات

مولانا آزاد کے ساتھ گاندھی جی سے ملا۔ ان کی صورت نے میرے ذوق جمالیات کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مار دیا..... اور میرے دل میں اس وقت یہ بات آئی کہ اس قدر ٹوٹے ہوئے جسم اور اس قدر بگڑے ہوئے چہرے کا آدمی دنیا میں کر ہی کیا سکتا ہے..... ہندوستان کی آزادی اور گاندھی؟ یہ منہ اور مسور کی دال؟ مایوسی نے مجھ کو ڈھانک لیا۔

لیکن جب مختلف مسائل پر انہوں نے زبان کھولی تو ان کی رائے کی صحت و اصابت اور ان کے لہجے کی پختگی و صلابت نے یقین دلایا کہ ہندوستان کو جس مرد میدان کا انتظار تھا وہ آگیا ہے۔ اب ہمارے دن بہر جائیں گے۔ گاندھی جی کے پاس پنڈت موتی لال کی صاحبزادی و بے لکشمی سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں..... اس وقت تک میں نے حسن مغموم دیکھا نہیں تھا۔ میرا دل کانپ اٹھا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ اگر سید حسین سے ان کی شادی ہو جاتی تو کون سی قیامت آ جاتی ہم سب چھپ بھپے ہیں۔ آزادی کے بعد ہم بھی کتوں کی طرح آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے رہیں گے

اتنے میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مولانا آزاد سبحانی اور پنڈت جواہر لال نہرو آگئے نہرو نے مجھے گلے لگا لیا۔ اور مجھ کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ ان کے باپ کے مکان میں ٹھہرا اور وہاں سب سے پہلے ان کو دیکھا

تھا۔ اس وقت وہ بھی قیامت تھے اور میں بھی۔

اس کے بعد ہم سب پنڈال جانے کے لیے باہر آئے..... اللہ اللہ وہ ہندو مسلم اتحاد کا جوش و خروش وہ کوثر و گنگا کی موجیں دوش بدوش..... آنکھوں میں عزائم کے وہ ہونکتے گرداب اور وہ سورماؤں کے گرجتے شباب..... وہ کجراتی والنیر لڑکیوں کے جوشیلے گیت، گیتوں میں وہ پیت کی ریت..... وہ امنگوں کا زور وہ ترنگوں کا شور..... وہ جیالوں کی سج دھج وہ نعروں کی گونج گرج..... وہ تمنائوں کے طوفان..... وہ لودیتے ارمان..... وہ گونجتے یمین و یسار..... وہ ٹوٹتی زنجیروں کی جھنکار ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہندوستان کی زمین آسمانوں کی طرف ہمک رہی ہے ہر طرف ایک بجلی ہے کہ لپک رہی ہے۔ فرنگی کھڑے سینے کوٹ رہے ہیں۔ غرور حکومت کے شیشے چھنا چھن ٹوٹ رہے ہیں۔ طوفان بن کر آ رہا ہے سوراج اور ہندوستان کے سربرہنہ جاں بازوں کے قدموں کی طرف بہتا چلا آ رہا یہ برطانیہ کا تاج۔

بکوائے مے کدہ یارب، سحر چہ مشغلہ بود  
کہ شور شاہد و ساقی و شمع مشغلہ بود  
حدیث عشق کہ از حرف و صوت مستغنیست  
بنالہ دف و نونے در خروش و ولولہ بود  
مباحثے کہ در آں حلقہ جنوں ری رفت  
درائے مدرسہ و قال و قیل مسئلہ بود  
کانگریس پنڈال میں قدم رکھا تو حاضرین کے جوش و خروش کو دیکھا اور خون میرے بدن میں تین کروڑ میل فی لمحہ کی رفتار سے گردش کرنے لگا۔

اور تھوڑی دیر میں ہندو مسلم فساد کے سرکاری ایجنٹ مدن موہن مالویہ جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو تمام پنڈال بھر گیا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں نہیں سنیں گے نہیں سنیں گے بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔

## آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اجلاس

رات کے وقت جب خلافت کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہو کر پنڈال کی پشت سے گزرنے لگا۔ (جہاں روشنی اور آمد و رفت بہت کم تھی) تو میں نے ایک والنٹیر لڑکی کا دیوانہ وار بوسہ لے لیا اور میرے بوسہ لیتے ہی پنڈال سے آواز بلند ہوئی نصر من اللہ وفتح قریب۔

میں نے اس نعرے کو بہت اچھا شگون سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خلافت کے پنڈال میں گیا دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی اور مہاتما گاندھی کے درمیان بڑی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ ایک طرف گاندھی جی اور ان کے دیگر رفقاء اس بات پر مضرت تھے کہ سر دست برٹش تاج کے زیر سایہ آزادی طلبی جائے اور دوسری طرف مولانا حسرت موہانی ہیں جو آزادی کامل کاریز رویشن پاس کرانا چاہ رہے ہیں۔

حضرت حسرت موہانی کو سب نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے ..... اور سیدھے سٹیج کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپنا آزادی کامل کاریز ولوشن لے کر ..... سٹیج اونچا تھا اور حسرت پستہ قد آدمی تھے۔ میں نے سہارا دے کر ان کو اسٹیج پر چڑھادیا اور جب انہوں نے آزادی کامل کاریز ولوشن پیش کیا تو پنڈال میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور میں اس ہنگامے سے اکتا کر اس والنٹیر لڑکی کے پاس پہنچ گیا جو پنڈال کی پشت پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔

جب میں احمد آباد سے روانہ ہونے لگا تو چھوٹے دادا نے (جن کا ذکر آگے آئے گا) کہا بھائی شبیر حسن خاں مجھ کو اجیر شریف کی زیارت کرادو ایسے موقعے روز روز نہیں آتے۔ میں نے ان کی بات منظور کر لی ..... اجیر سے دو چار سٹیشن پہلے ہی ڈسٹنٹ سگنل ڈاؤن نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بلا کی حسین لڑکی سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے حسن نے مجبور کر دیا کہ اس کو پاس سے جا کر دیکھوں۔ میں گاڑی سے اتر کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اور اس قدر

مبہوت و مسحور ہو گیا کہ گاڑی ریگنے لگی چھوٹے دادا نے گلا پھاڑ پھاڑ کر آواز دی۔  
 میں نے پکار کر کہا کہ آپ جائیں اجمیر کے ویننگ روم میں ٹھہر جائیں میں دوسری  
 اے گاڑی سے آجاؤں گا دوسری گاڑی سے شام کے وقت میں اجمیر پہنچ گیا۔ ارجب کھانا  
 کھا کر لیٹنے لگا تو چھوٹے دادا نے کہا بھائی شبیر حسن خاں آؤ زیارت کرائیں..... میں  
 نے کہا آپ جائیں میں خولجہ صاحب کا مہمان ہوں..... اور

اے میری انظم جنگل کی شاہ زادی اسی رومانی سفر کی یادگار ہے (وہ بھی اب بوڑھی ہو  
 چکی ہے اے رے سفاک وقت)

جب تک خود میزبان بلائے نہیں آئیں گے میں نہیں جاؤں گا۔ چھوٹے دادا نے  
 مجھ کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں کفر بک رہا ہوں۔ اور منہ بنا کر درگاہ چلے گئے۔  
 حسب دستور کوئی چار بجے میری آنکھ کھلی میں نے شیروانی پہنی اور چاہا کہ جنگلوں کو جگا  
 کر ٹہلنے کے لیے نکل جاؤں..... لیکن خلاف دستور نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ جوتہ اور  
 شیروانی اتارے بغیر چارپائی میں دراز ہو کر سو گیا..... اور اسی عالم میں یہ خواب دیکھا  
 کہ ایک مرد بزرگ میرے سر ہانے کھرے بیڑی دل داری کے ساتھ مسکرا رہے ہیں  
 میں نے پوچھا آپ کا اسم گرامی انہوں نے عجیب مشفقانہ انداز سے کہا میرا نام ہے  
 معین الدین اور میزبان کی حیثیت سے آپ کو بلائے آیا ہوں شرط آپ کی پوری ہو گئی  
 اب تو آئیے گا نا؟

میری آنکھ کھل گئی چھوٹے دادا کو جگا کر خواب سنایا ان کو حیرت ہو گئی۔ کہنے لگے  
 بھائی شبیر حسن خاں آپ تو چھپے رستم نکلے..... اس کے بعد ہم دونوں درگاہ چلے گئے۔  
 اجمیر سے پلٹ کر جرجب لکھنؤ پہنچا غلغلا سنا کہ ٹیگور اے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنے  
 گیا۔ انہوں نے مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے کے بعد انگریزی میں پوچھا کیا



یہ بات سچ ہے کہ میں ایک نوجوان شاعر کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں؟ میں نے سر جھکا کر انگریزی میں جواب دیا شاید انہوں نے میرا نام پوچھا..... جب میں نے اپنا تخلص بتایا انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ اور کہا یہ عجیب اتفاق ہے کہ کل ہی سروجی ٹائیڈ وے نے آپ کی ایک نظم طلوع سحر کا ترجمہ سنایا تھا اور آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کی نظم لا جواب ہے اور اس کے سننے کے بعد میں آپ کو فرزند سحر گاہ کہہ سکتا ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ میرے باپ فارسی کے بڑے سکالر تھے۔ اور دیوان حافظ ان کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔

جب میں رخصت ہونے لگا تو انہوں نے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ شانتی نکتین آ کر کچھ روز کے لیے میرے ساتھ رہیں اور حافظ کی سپرٹ سے مجھ کو بخوبی آگاہ کر دیں؟ میں نے بڑی خوشی کے ساتھ ان کی دعوت قبول کر لی۔ اور جگنو خدمت گار کو لے کر وہاں پہنچ گیا..... اور مطالعے کے لیے بہت سی کتابیں بھی ساتھ لے لیں۔

یگور نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے ایک طالب علم برنی صاحب کے کمرے میں مجھ کو ٹھہرا دیا۔

وہاں کی زندگی بے حد سادہ تھی لیکن گوشت وہاں ہیں کھایا جاسکتا تھا۔ اس کی تکلیف ضرور تھی پھر بھی جگنو چوری چھپے گوشت کرانظام کر دیا کرتا تھا۔

صبح کی مٹی دونوں وقت کا غسل صبح و شام کی موسیقی اور گھنے درختوں کے سائے میں تدریس وہاں کی زندگی کے اجزائے لاینفک تھے۔

لڑکیوں اور لڑکوں کے میل جول کے معاملے میں یگور کس قدر وسیع القلب تھے اسکا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک روز کسی بوڑھے پروفیسر نے آکر ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے مابین حدود سے متجاوز تعلقات کی جب شکایت کی تو انہوں نے اس سے پوچھا یہ صورت جبر یا تراضی طرفین سے پیدا ہوئی تھی؟ اور جب

اس پروفیسر نے بتایا کہ اس صورت حال میں جبر کا کوئی دخل نہیں تھا تو یگور نے قہقہہ مار کر کہا تو پھر اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں قدرتی تقاضوں کے دھاروں پر بند باندھنا فطرت انسانی کے خلاف نا انصافی ہی نہیں بغاوت بھی ہے۔ آپ شاید بھول گئے لیکن مجھ کو اب تک یاد ہے کہ میں بھی ایک زمانے میں نوجوان تھا۔ یہ باسن کر میں بھی لڑکیوں سے کھل کر ملنے جلنے لگا۔

ہر چند میں تصوف کے دائرے سے نکل کر فکر کی جانب آہستگی کے ساتھ مڑ رہا تھا مگر یگور کی شاعری اس کے باوجود مجھ کو بے حد متاثر کیا کرتی تھی اور میں ان کے ترجمے پڑھ کر سر دھنا کرتا تھا۔ اور اب بھی میرے دل میں یہ چور ہے کہ گاہ گاہ صوفیانہ شاعری پر میں وجد کرنے لگتا ہوں۔ اور اس کی شاید یہ علت ہو کہ شاعر کسی منزل میں بھی خشک اور کھردرا فلسفی نہیں بن سکتا۔ اگر میں بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو یگور کی شاعری کو سمجھنے کی طرح سمجھ سکتا۔ لیکن مجھے اس کا بے حد افسوس ہے کہ میں نے ان کی شاعری کو انگریزی ترجموں کی وساطت سے پڑھا اور بنگالیوں کی طرح سمجھ نہیں سکا۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسا جادو ہے جس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعری آب گینہ ہے اور ترجمہ گھن شاعری شیشہ ہے اور ترجمہ پتھر شاعری حباب ہے اور ترجمہ ہوائے تند کا تھپیڑا۔

جب شاعری کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کا کندن مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے لالہ و گل پلاسٹک کے پھولوں کا لباس پہن لیتے ہیں اور اس کا شعلہ جوالہ راکھ میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں یہاں تک مان لینے پر تو اپنے آپ کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ فکری اور آفاقی مسائل کی شاعری کا تو کسی حد تک ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاعری کے اس کھنکھتے طلسمی دائرے میں ترجمہ باریاب نہیں ہو سکتا؟ جہاں الفاظ کو ان کے لغوی معنی سے جدا کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ان کے سروں پر بالکل جدید معنی کے

تاج رکھے جاتے ہیں۔ جہاں لہجوں کی ایک ایک کروت اور الفاظ کی ایک ایک پرت  
 کے نیچے سے نئے نئے مطالب کے صد ہا چشمے پھوٹا کرتے ہیں۔ جہاں مختلف النسل  
 لفظوں کے نقطہ ہائے اتصال سے خیالات کی ایک نئی نسل پیدا کی جاتی ہے۔ جہاں  
 طوائف حرم کو رقص اور رقص کو طواف حرم کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ جہاں اکائی  
 کے میدان میں اعداد کے میلے ہوا کرتے ہیں۔ جہاں دو دو مل کر چار نہیں ہوتے ایک  
 ہو جاتے ہیں..... جہاں دوش نفی پر علم اثبات لہرایا جاتا ہے۔ جہاں تلوار کی دھار سے  
 مرہم ٹپکتا ہے۔ جہاں نفثروں کی نوک سے زخموں میں ٹانگے لگائے جاتے ہیں۔  
 جہاں سب کے دستے سے کعبے کا درکھٹکھٹایا جاتا ہے۔ جہاں کانٹے گنگماتے اور پھول  
 کراہتے ہیں۔ جہاں موتیوں سے آنسو اور آنسوؤں سے موتی برسائے جاتے ہیں۔  
 جہاں نازک حبابوں کے گھن سے چٹانیں توڑی جاتی ہیں۔ جہاں بولوں کے کٹاؤ میں  
 کٹاریاں مچلتی ہیں..... جہاں اولوں کے مسامات سے چنگاریاں برستی ہیں.....  
 جہاں ڈوب جانے کے بعد سفینے ابھرتے ہیں جہاں تانوں کے تیشوں سے مجسمے  
 تراشے جاتے ہیں۔ جہاں نوحوں کی گود میں راگنیاں پروان چڑھتی ہیں۔ جہاں  
 پلکوں کی نوک پر آسمان تو لے جاتے ہیں۔ جہاں ٹکوروں سے فولاد برمایا جاتا ہے۔  
 جہاں ذہن کے سوپ میں اجرام پھٹکے جاتے ہیں۔ جہاں شعور کی چھلنی میں کائنات  
 چھانی جاتی ہے۔ جہاں فکر کے پروں پر ذات و صفات کو اسلایا جاتا ہے۔ جہاں اوس کی  
 بوندوں میں الاؤ روشن کیے جاتے ہیں۔ جہاں آنچ کی لہروں میں زہرا کی کمر لچکتی ہے  
 جہاں ہواؤں کو دیکھا اور صداؤں کو چکھا جاتا ہے۔ جہاں تیلیوں کی دھاریوں پر کرہ  
 ارض کو نچایا جاتا ہے۔ جہاں ایک ایک آن کی ہتھیلی پر کروڑوں صدیاں تھرکتی ہوئی نظر  
 آتی ہیں۔ اور جہاں جزویت اپنے ماتھے پر کلیت کا تاج کج کر کے آفاق کو اپنے  
 چوڑے میں لپیٹ لیتی ہے۔

مترجم جب اس دائرہ رقصاں کی جانب نگاہ اٹھاتا ہے تو اس کے الفاظ کی ہدیاں

بولنے لگتی ہیں۔ اس کی تخیل کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے وجود کا ڈورا چٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

کاش نوبل پر انز کے ارباب حل و عقد سے کوئی یہ جا کر کہہ دے کہ اے سخن نا آشنا سو اور اے قدامت پست اندھو! اگر تم ادب کے قدردان ہو تو شاعر کے کلام کو اسکی زبان میں پڑھو۔ خود نہیں پڑھ سکتے تو اس کے ہم زبان اکابر کی ایک کمیٹی بنا کر اس کے سپرد کر دو کہ وہ اپنی رائے سے تم کو مطلع کرے۔

تمہیں آ کر یہ کون سا دماغی مرض لاحق ہو گیا ہے کہ تم شاعری کے جیتے جاگتے جسم کی جانب تو کوئی اعتنا نہیں کرتے۔ اور جب ترجمہ اس گرم جسم کو ٹھنڈی لاش میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس لاش کو لم کلیجے سے لگا لیتے ہو..... اے جسم بیزار و لاش نوازو لوگو..... ادب کی دیوی تمہاری بے سوادی پر ماتم کر رہی ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ خیالات کے دھارے کبھی یوں بھی بہتے ہیں۔ اب پھر آجائے یگور کی طرف اور چند کلمات ان کی شخصیت کے بارے میں بھی سماعت فرمالیجیے۔

جس طرح بنگالی سے نا آشنا ہونے کی بنا پر میں نے ان کی شاعری کے باب میں ایک مستند نقاد کے مانند کوئی جامع تبصرہ نہیں کر سکتا اسی طرح میں ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی بھی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ شخصیت شناسی بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے۔ اور سا اہا سال کی بے تکلف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا اثر میلاپن کم نہیں ہوتا..... جناب والا یگور یا کسی اور کا تو ذکر ہی کیا مجھ سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ تو اپنے کو بھی جاننے کی طرح جانتا ہے؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ ہر چند بچپن سے لے کر اس پرانہ سالی تک علی الاصال و بہرہ دقیقہ اپنے ساتھ رہا ہوں لیکن قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ درحقیقت میں ہوں کیا

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے



بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں  
اور پھر میں یُگور کے ساتھ رہا بھی کتنا۔ صرف چھ مہینے اس لیے عرض ہی کیا کر سکتا  
ہوں۔ البتہ اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑے ہی وسیع المشرب، نہایت زندہ دل  
بے حد شریف حد سے زیادہ بے تکلف، حساس اور جمال پرست انسان تھے۔

لیکن ایک چیز ان میں ایسی تھی جو میرے دل میں کھٹکا کرتی تھی۔ اور وہ تھی ان کی  
نمود و نمائش کی عادت۔ میں نے ہمیشہ اس بات کو بری نظر سے دیکھا ہے کہ جب کوئی  
غیر ملکی انٹرویو کے واسطے ان سے ملنے آتا تھا تو اس کے آنے سے پیشتر وہ بن سنور کر  
ایک نمایاں مقام پر بیٹھ جاتے تھے عودان کی پشت پر سلگا دیا جاتا تھا۔ اور وہ حسین  
لڑکیوں کو اپنے گرد و پیش کھڑا کر کے یوں انٹرویو دیا کرتے تھے کہ آنے والے کو یہ  
گمان ہونے لگے کہ وہ کسی پر اسرار دیوتا کو دیکھ رہے ہیں۔

بیوی میری مفارقت برداشت نہیں کر سکیں۔ شانتی نکیتن ایک تار بھیجا کہ میں اس  
ہفتے کے واسطے ملیح آباد چلا آؤں۔ اس لیے میں نے وہاں اپنا سارا سامان اور ساری  
کتابیں چھوڑ کر آ گیا ملیح آباد آ گیا اور بیوی نے پھر اسی بری طرح گھیرا کہ میں دوبارہ  
شانتی نکیتن جا ہی نہ سکا۔ اور وہ میرا تمام سامان پھر مجھے کبھی نہیں ملا۔



## ایک خواب

یہ سنہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ ایک روز شام کے وقت جب میں قصر سحر میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامن کی پھولی ہوئی شفق کی رنگینی کی طرف اشارہ کر رہا تھا تو میری بیوی نے مجھ سے کہا دن رات تمہیں انہیں باتوں کی دھن لگی رہتی ہے۔ بھوے سے بھی اپنے گاؤں گراؤں کی خبر نہیں لیتے..... خولجہ حون کو تم نے ضلع دار بنایا ہے اور وہ ایسا دند مچائے ہوئے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ دونوں ہاتھوں سے لوت رہے ہیں تمہاری رعایا کو۔ ہر طرف مادھولوٹ مچی ہوئی ہے گاؤں گراؤں کا نہ حساب ہے نہ کتاب۔ اور جب تم حساب مانگتے ہو تو وہ باتوں کے طوطے اراٹے لگتے ہیں اور زبانی حساب بتا کر اٹے کچھ روپے تمہارے ہی ذمے نکال دیتے ہیں۔ تم کو دس ہزار دے کر بیس ہزار اپنے ڈب میں رکھ لیتے ہیں۔ یہ کاغذ کی ناؤ آخر لپے گی کب تک؟ میں نے کہا اچھا اشرف جہاں اب میں خود ہی کام کروں گا۔ انہوں نے تنک کر کہا ارے تم اس قابل ہوتے تو پھر یہ رونا کیوں ہوتا۔ تم تو اپنی جائے داد کا ایک بڑا حصہ اور ڈیڑھ لاکھ روپے نقد آنکھیں بند کر کے اپنے بڑے بھیا کی نذر کر چکے ہو۔ اور جو بچھا کچھا رہ گیا ہے اس کو بھی کسی کی بھینٹ چڑھا دو گے۔ ڈھاک کے تین پات رہ جائیں گے..... نہ لڑکی کا بیاہ ہو سکے گا نہ لڑکے کی پڑھائی۔

میں نے کہا اشرف جہاں اتنا دل چھوٹا نہ کرو میرے پاس جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی خدا کے فضل سے اس قدر ہے کہ ہم تم بڑے آڑام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں انہوں نے بگر کر کہا سدا اپنے ہی بارے میں سوچتے ہو۔ ارے یہ بھی تو سوچو کہ ہمارے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ میں پوچھتی ہوں کیا ہمارے بچے اپنے باپ دادا کا بھرم قائم رکھ سکیں گے؟

بیوی کی باتیں سن کر میں سنائے اٹھ گیا۔ دل میں کہا کہتی تو ٹھیک ہیں۔ اور وہ پہلا دن تھا کہ عقل معاش میرے سینے میں کمنائی اور سوچنے لگا۔ اپنی آمدنی اور اپنے

جائے داد کیوں کر بڑھاؤں اور جب خاک کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دل اداس ہو گیا اور  
چہرے پر بڑی بے کسی برسنے لگی۔

بیوی نے مجھے اداس دیکھا ان کے دل پر چھری چل گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر  
کر کہنے لگیں تم گھبراؤ نہیں..... تم جانتے ہو کہ باوا کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے کا کتنا  
شوق ہے اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ماماں ہیں اصلیں ہیں باور چنیں ہیں۔ مگر جب  
تک وہ اپنے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی چیز خود نہیں پکا لیتے، انہیں چین نہیں پڑتا انہیں دیکھ  
دیکھ کر مجھے اس قدر اچھا پکانا آ گیا ہے کہ میں لکھنؤ میں کھانے کا ایک ہوٹل کھول لوں  
گی اور اس سے اتنا پیدا کر کے دکھا دوں گی کہ پشتون تک کالے نہیں کٹے گا۔ ہمارے  
تمہارے بزرگ خالی ایک تلوار لے کر یہاں آئے تھے اور اس تلوار کے زور سے اتنے  
بڑے محل کھڑے کر کے اپنی بہادری کا لوہا منوا دیا اور میں اللہ نے چاہا تو کف گیر سے  
سونا اگلا دوں گی۔

بیوی نے ڈھارس بندھائی..... میرا دل اور بھی مغموم ہو گیا۔ اور دوسرے کمرے  
میں آ کر بچوں کے مستقبل پر غور کرنے لگا۔ اتنے میں خدا جانے یکا یک کیا ہر آئی کہ  
میں نعت کہنے لگا۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کا فری  
رعشہ خوف بن گیا ، رقص بتان آذری  
نعت کہہ کر کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو کر لحاف اوڑھ لیا۔ نعت سر میں گونجنے لگی  
بیوی کے خراٹوں نے میرے پوٹے بوجھل کر دیے۔ فاران کی ہواؤں نے لوری دی  
اور دو چار کروٹیں بدل کر سو گیا

سو گیا تو پچھلے پہر ایک انوکھا خواب دیکھا..... سچا خواب یا میرے تصورات کا  
گرداب میں کیا فیصلہ کروں یہ دنیا بڑی حیرت ناک اور پراسرار ہے۔  
ہاں تو یہ خواب دیکھا کہ ایک تالاب ناک چہرے کے مرد بزرگ میرے سامنے

کھڑے ہوئے ہیں اور میں چاندان کا طواف کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی آنکھوں میں خیرگی آئی بار بار میں نے آنکھیں ملیں غور سے ان کو دیکھا۔ پل بھر میں حافظہ جگمگا اٹھا میں پہچان کر ان کے قدموں میں گر گیا اور منہ ملنے لگا ان کے نعلین پر۔ انہوں نے ہاتھوں کا سہارا دے کر مجھے اٹھالیا۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ وہ میرے رسول ہیں جنہوں نے اپنا دیدار لڑکپن میں مجھے دکھایا تھا۔ یہ سن کر وہ مسکرائے اور فرمایا ہاں میں وہی تمہارے پہلے خواب کا محمدؐ ہوں۔ یہ سنتے ہی میں ان کے قدموں پر گر پڑا اور ان کی نعلین سے منہ رگڑ رگڑ کر رونے لگا۔

میرے محمدؐ نے فرمایا اٹھ کھڑے ہو۔ میں ہات باندھ کر ان کے رو برو کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا تم ہنسنے کے لیے بنے ہو روتے کیوں ہو۔ اور یہ کہتے ہی میری پائنتی کی جانب اشارہ کر کے فرمایا کہ تم اس شخص کے پاس چلے جاؤ میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو یہ دیکھا کہ ایک بادشاہ سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑا ہے میں نے کہا یا رسول اللہ یہ کون ہے؟ انہوں نے ارشاد فرمایا..... یہ نظام دکن ہے تم کو دس برس تک اس کے زیر سایہ رہنا ہے۔

یہ سن کر میرا دل یکا یک اس طرح دھڑکنے لگا کہ اس کے ضربات پیہم سے میری آنکھ کھل گئی اور روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

---

ایک اسی قبیلے کا خواب پہلے بھی دیکھ چکا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

---

جی بھر کے روچکا تو بستر سے اٹھا منہ ہات دھونے لگا۔ منہ پر دو چار چھپکے زور زور سے مارے تو حواس بجا ہوئے۔ اور حواس بجا ہوتے ہی ایک بے پایاں حیرت نے میرے تمام وجود کا احاطہ کر لیا۔ اور سر پکڑ کر یہ سوچنے لگا کہ میں نے ایسی اومرزین پر مکان بنوایا ہے جہاں دور دور تک کوئی باغ نہیں ہے اور ابھی تک میں نے اپنے مکان



کے ارد گرد چمن بندی بھی نہیں کی ہے۔ نہ گھانس ہی لگائی ہے نہ خوشبو دار پودے ہی نصب کیے ہیں! اور تو اور ابھی تک اس مکان کو پھولوں کے گملوں سے بھی نہیں سجایا ہے اور اس کے باوجود ایک نرالی خوشبو میرا احاطہ کیے ہوئے ہے..... اور خوشبو بھی ایسی کہ عطر اور پھول بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آخر یہ طلسم کیا ہے؟ کیا یہ خواب کے اثر کا جادو ہے یا سچ مچ کی خوشبو ہے۔ یہ خیال کر کے میں نے بیوی کو جگایا کہ دیکھو وہ بھی خوش بو محسوس کرتی ہیں یا نہیں۔

بیوی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں۔ پوچھا ٹہلنے جا رہے ہو؟ میں نے کہا اور کیا نو کر رہی اس لپات کے ہیں کہ جلدی سے گلوریاں بنا دو بیوی نے اٹھ کر کلیاں کیں پاندان کھولا اور جیس ہی انہوں نے چونے کی چمچی اٹھائی۔ بگڑ کر مجھے دیکھا اور پوچھا سچ بتاؤ یہ رات کو سوتا چھوڑ کر مجھے کہاں چلے گئے تھے۔ کہ ایسے مہکے مہکائے اور پھولوں میں بے چلے آ رہے ہو۔ میں نے کہا اللہ اللہ کرو اشرف جہاں اس چٹیل میدان میں کہاں جاؤں گا۔ لکھنؤ ہوتا تو بات بھی تھی۔ اور میں لکھنؤ میں بھی کبھی ایسا نہیں کرتا۔ کہنے لگیں اللہ ڈھتائی جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسے جا رہے ہو تمہارے پاس سے ایسی خوشبو کی لپٹیں چلی آ رہی ہیں کہ میں تو تمہارے کپڑوں میں عطر نہیں لگایا تھا۔ پھر یہ نگوری خوش بو کیوں آ رہی ہے۔ یہ کس غیبانی کی خاک میں ملی بیج کی خوشبو ہے؟

میں نے کہا تمہیں جگا کر تو میں گناہ گار بن گیا..... آؤ اور سونگھ کر دیکھ لو میرے کپڑوں کو اگر میرے کپڑوں میں خوش بو ہو تو میں گناہ گار ٹھہر جاؤں گا۔

---

اظہور علی خان کی کہانی کا ایک بار بار دہرایا ہوا فقرہ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

---

وہ میرے کپڑے سونگھنے کو اٹھیں اور سونگھ کر کہا تمہارے کپڑوں سے برابر خوش بو آ رہی ہے۔ اب بھی انکار کرو گے.....؟ میں نے کہا دوسرے کمرے میں چل کر میرے

کپڑے سونگھ لو تب ٹھیک ٹھیک پتا چل جائے گا تم کو..... انہوں نے کہا یہ کیا کہہ رہے  
 ہو؟ میں نے کہا چلی تو چلوں دوسرے کمرے میں پھر یہ سارا ماجرا بیان کر دوں گا.....  
 دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے خوب زور زور سے میرے کپڑے سونگھے بار بار  
 سونگھے اور کہنے لگیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ وہاں تمہارے کپڑوں  
 میں خوشبو تھی یہاں بالکل نہیں ہے۔ کیا تم نے کوئی جنتر منتر سیکھ لیا ہے؟ اس کے بعد  
 میں نے ان سے اپنا سارا خواب بیان کر کے کہا کہ یہ اس خواب کا کرشمہ ہے۔  
 انہوں نے پہلے تو اپنے منہ پر تھپڑ مار مار کر اور کان پکڑ پکڑ کر تو بہ کی اللہ مجھے معاف  
 کرے کہ میں نے اس خوشبو کو نگوڑی کہا تھا اور پھر مجھ سے کہا۔ تم کو بڑی بشارت ہوئی  
 ہے۔ میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں..... میں نے ان سے کہا تم کچھ نہ بولنا میں گلابو کو  
 اوپر بلاتا ہوں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ میں نے گلابو کو آواز دی۔ وہ اوپر  
 آئی تو میں نے کہا حقہ بھراؤ۔ وہ تنبا کو نکالنے کے لیے الماری کی طرف بڑھی۔ اور دو  
 قدم چل کر اس نے ایک لانی سانس لے کر کہا بی بی یہ کھس بو (خوشبو) کیسی آرہی  
 ہے؟ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا ہو بھونچکا ہو کر  
 مجھے دیکھنے لگی۔ اتنے میں نیچے سے چھوٹے دادا کی آواز آئی..... بھائی شبیر حسن خاں  
 آج ٹہلنے کے لیے نہیں چلیے گا۔ میں نے کہا اوپر آ جائے حقے کے دو ایک کشل کر  
 چلیں گے۔ چھوٹے دادا حسب عادت قمقمے مارتے ہوئے اوپر آئے اور ٹوپی تڑ سے  
 تحت پر پھینک دی اور کان کھڑے کر کے گہری گہری سانس لینے لگے اور پوچھا بھائی  
 شبیر حسن خاں کی بیوی آج تم نے یہ کیا عطر لگایا ہے کہ سارا کمرہ مہک رہا ہے۔ ایک  
 پھریری ہمیں بھی دو۔ الغرض کوئی آدھ گھنٹے تک وہ خوشبو میرے کمرے کے اندر مچلتی  
 رہی۔

وہ خواب اور خوش بو کا امتزاج آج تک ایک ایسا معمہ بنا ہوا ہے جس کو میں  
 قطعیت کے ساتھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ خواب اور اس کے بعد کی وہ خوش بو

میرے آبائی عقائد کی ایک محسوس کیفیت یا میرے شاعرانہ تصورات کی ایک حیرت  
ناک خلاتی ہو۔ ایسی خلاتی جو حواس کو فریب دے سکتی ہے۔ یا جناب والا یہ بھی ہو سکتا  
ہے کہ وہ انسان کے اس ابتدائی دور کے تمام قیاسات اور اب تک کے تمام سائنسی  
انکشافات سے قطعاً مختلف کوئی اور ہی چیز ہو..... بابا اس عالم امکان میں وہ کیا ہے جو  
ہو نہیں سکتا۔ ہماری اس دنیا کا یہ ہو سکتا پن اور اس کی یہ امکانیت ایک ایسا بے کراں  
میدان ہے جس کی حد بندی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہر کس نہ شناسندہ راز است وگر نہ  
ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است



## سریر امارت سے حصر ملازمت کی جانب

اس خواب کے بعد میری ضعیف الاعتقاد بیوی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ تم کو رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے کہ دکھن جانے کا جاؤ اور جلدی کرو۔

بیوی بے چاری کو تو میں نے کھٹ سے ضعیف الاعتقاد کہہ دیا..... لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ بات نہیں سوچی کہ اس وقت بھی کون سا بقر اطا اعظم تھا یہ سچ ہے کہ میں تشف کو ترک کر چکا تھا۔ اور انسان کی دردمندی کو دیکھ کر خدا کی شفقت و رافت سے بھی بدگمان ہو چکا تھا۔ لیکن ان دو بر جوں کے گر جانے سے ہوتا کیا ہے۔ دین کی پوری عمارت تو مسمار ہو کر نہیں رہ گئی تھی..... اس لیے میں بھی اس بشارت کے امتحان کی خاطر حیدر آباد جانا چاہتا تھا۔ یعنی بیوی ہی کے دل میں نہیں میرے دل میں بھی چور تھا۔ جو رنگ لائے بغیر نہیں رہا۔

یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ سفر دکن خالی ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ میری ایک رومانی گتھی بھی ایسی تھی جو حیدر آباد جائے بغیر کھل ہی نہیں سکتی تھی۔

---

۱۔ حیدر آباد پہنچ کر میں نے تیرے لیے کی سرخی سے ایک نظم کہی تھی جس کے دو تین شعر پڑھ کر آپ کو میرے اس رومان کا پتا چل جائے گا۔

دیکھ کر کیوں جی رہا ہوں دل رہا تیرے لیے  
ہر نفس ہے اک حدیث کربلا تیرے لیے  
پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے  
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لیے  
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے واسطے  
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لیے

(مطبوعہ نقش و نگار سنہ ۱۹۳۶ء)



ہر چند حیدر آباد جانے کی بات میرے دل میں ٹھن چکی تھی مگر سوچتا تھا کہ وہاں مجھے پوچھے گا کون۔ نہ ایم اے ہوں نہ صدر الافضل لے دے کے میری سرف ایک کتاب روح ادب چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ مگر ایک ٹھروں ٹوں کتاب سے ہوتا ہی کیا ہے..... ایک کتاب..... ایک کتاب کی اشاعت و مقبولیت سے کہیں شخصیت بنا کرتی ہے۔ شخصیت تو بنتی ہے ایک جگہ بیت جانے سے اور سا لہا سال خون جلر تھوکنے کے بعد۔ اور پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ میرا مزاج بہت ہی نازک نوکری کا ننگ برداشت ہو گا کیوں کر۔ اور اقرار اور احباب بھی یہی مشورہ دیتے تھے کہ اس خبط سے دست بردار ہو جاؤ اور اگر ایک مہینے کے اندر نظام دکن کو گالیاں دے کر واپس نہ آ جاؤ تو جو چور کی سزا ہے وہ ہماری یہ تمام باتیں سچائی کے عنصر سے خالی نہیں تھیں..... لیکن میری بیوی اور خود میرا دل حکم دے رہا تھا کہ حیدر آباد جائے بغیر دم نہ لے۔

الغرض عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر وحید الدین صاحب سلیم سے خط و کتابت کر کے اور مہاراجہ کشن پرشاد کے نام حضرت اقبال مولانا عبد الماجد دریابادی حضرت اکبر الہ آبادی اور مولانا سلیمان ندوی سے سفارشی خط حاصل کر کے میں سنہ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حیدر آباد پہنچ گیا۔

امیر ارخت سفر جب گھر سے باہر جانے لگا تو ایسا معلوم ہوا کہ عزت آباد کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ اور میری ماں نے جب یہ بین کیا کہ اے میرے قبر میں سونے والے سرتاج آؤ دیکھو کہ تمہارا نازوں پر پلا بچہ نوکری کرنے باہر جا رہا ہے۔ تو گھر بھر میں پٹس پڑ گئی۔ اور جب آہ و فغاں کے شور میں سب سے گلے مل کر میں رخصت ہونے لگا اور آداب خاندان کے جبر سے بیوی کو گلے نہ لگا سکا تو ان کی ڈبڈبائی آنکھوں نے مجھ سے کہا ہم سے گلے نہیں ملے۔ میں نے اداسی کے ساتھ آنکھیں جھکا لیں اور جب

اپنے دھڑکتے دل پر قدم رکھتا باہر آیا تو تمام نوکر چاکر بھی رونے لگے۔ اور جب ملیج آباد سے ریل چلی۔ باپ کی رندھی ہوئی آواز آئی اے میرے لاڈلے بیٹے اللہ تیرا نگاہ بان۔ ہائے کیا کروں۔ موت نے نیکس کر دیا ہے تجھ کو روک نہیں سکتا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میرے دادا کے باغوں نے جھک جھک کر مجھے سلام کیا۔ اور سر زمین وطن نے گریبان پھاڑ کر خدا حافظ و ناصر کا نعروں لگایا۔ اور میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا اور حزیں کا یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

بنو مید حزیں از کوئے او بار سفر بستم  
خدا صبرے کند روزی دل امید دارم را

(میں نے ایک اور اظہم اسی زمانے میں الوداع کے نام سے کہی تھی جو نقش و نگار میں موجود ہے اسے پڑھ کر میری اس وقت کی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔)

1 حیدر آباد میں سب سے پہلے، مہاراجہ کشن پرشاد سے ملا مجھے دیکھتے ہی، انہوں نے کہا جوش صاحب آپ کا مجموعہ کلام ”روح ادب“ دیکھ کر میں نے تمنا کی تھی کہ اللہ اس درویش صفت رئیس زادے سے ملائے، سو میری وہ تمنا آج پوری ہو گئی۔ میں نے وہ سفارشی خط پیش کئے، انہیں پڑھ کر، وہ کچھ سوچنے لگے، اور تھلنے میں لے جا کر، مجھ سے کہا جوش صاحب یہ بات اپنے تک رکھئے گا کہ میں آج کل سرکار کا معتبوب ہو چکا ہوں، اگر آپ میرے زمانے میں تشریف لاتے تو میں اسی دن آپ کا انتظام کر دیتا۔ بہر حال میں فنانس منسٹر اکبر حیدری کے نام ابھی خط لکھے دیتا ہوں، وہ مجھے بہت مانتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کریں گے یہ کہتے ہی کوئی تین صفحوں کا لمبا چوڑا خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا اور فون کر کے اسی وقت انہوں نے حیدری سے میری زبردست سفارش بھی کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ، ہر اس مسعود کو بھی فون پر ہدایت کر دی کہ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جا کر، حیدری سے ملا دیں اس مسعود مجھے حیدری کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ ہماری قوم کے ایک ابھرتے ہوئے

شاعر ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی حوصلہ افزائی کریں، آپ کے دوست حضرت اقبال نے بھی ان کی بڑی زبردست سفارش کی ہے، اور مہاراجہ نے بھی یہ خط آپ کو بھیجا ہے۔۔۔۔۔ حیدری صاحب نے خط پڑھ کر کہا ان کے متعلق مہاراجہ مجھ کو فون بھی کر چکے ہیں اور پھر میری طرف منہ کر کے حیدری صاحب نے کہا آپ آئندہ جمعرات کے دن، صبح دس بجے میرے پاس آجائیے گا میں آپ کو سرکار سے ملا دوں گا۔ 2

1 حسن اتفاق سے اس وقت مہاراجہ کے دربار میں سید محمد حسین صاحب، صدر محاسب، نواب بہادر جنگ، نواب اکبر یار جنگ، نواب قادر نواز جنگ، نواب مہدی یار جنگ، اور سر امین جنگ موجود تھے جو آگے چل کر میرے بہت گہرے دوست بن گئے اور میرے بہت کام آئے۔

2 ہر چند حیدری صاحب کے اس وعدہ سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی تھی، مگر وہ جو کہاوت ہے کہ بکری نے دودھ دیا، سو وہ بھی میٹگنی بھرا، مجھے ان کے لہجے سے بڑی تکلیف ہوئی تھی کہ وہ ”میں“ کے لفظ کو ”یکسرہ میم“ ادا کر کے بکریوں کی طرح ”میں“ ”میں“ کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اللہ نے میری کشوکار کی صورت نکالی تو مگر ایک بکری کی معرفت خوب جانتا ہوں کہ درحقیقت لہجے اچھے ہوتے ہیں نہ برے، ان کا اچھایا برا لگنا یعنی ہوتا ہے کانوں کی موروٹی عادت پر، اور ہم جس لفظ کا تلفظ بچپن سے جس

ابھی جمعرات میں دو دن باقی تھے کہ حیدری صاحب نے مجھے بلا بھیجا اس مسعود بھی وہاں موجود تھے نہایت نفیس چائے پلائی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہوں نے مجھ کو ان قطعات کا ایک بنڈل دیا، جو شاعروں نے ان کے خطاب ”سر“ کی مبارکباد کے طور پر کہہ کر، ان کی خدمت میں پیش کئے تھے میں وہ قطعات پڑھ چکا تو حیدری نے کہا جوش صاحب آپ بھی ایک ”کتا“ قطعہ کر دیں۔

ایک طرف تو لفظ ”قطعہ“ کو ”کتا“ سن کر میں بھنا گیا، اور دوسری طرف چونکہ میں فرنگی حکومت سے بیزار تھا میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔۔۔۔

حیدری صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ یکا یک اس قدر سیریس (Serious) سنجیدہ کیوں ہو گئے میں نے کہا آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ فرنگی جس شخص کو خطاب دیتا ہے اس پر ماں کی گالی پڑ جاتی ہے یہ سن کر اس مسعود اور حیدری چراغ پا ہو کر کھڑے ہو گئے، مجھ کو تنہا چھوڑ کر، دوسرے کمرے میں چلے گئے، اور میں اپنی قیام گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔<sup>1</sup>

جب یہ بات سنی تو نواب مہدی یار جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کو اپنے

طور پر سنتے آتے ہیں، جب وہی لفظ بدلے ہوئے لہجے میں سنتے ہیں تو ہم کو تکلیف ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود آج بھی کوئی شخص لفظ ”ادب“ کی دال کو ساکن کر کے ”ادب“ یا گاڑی کو ”گڈی“ کہتا ہے تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ اس کو اٹھا کر دے ماروں یہ بات فقط لہجوں تک محدود نہیں عقائد کے میدان میں بھی ہمارا یہی عالم ہے کہ جب ہم اپنے موروثی عقائد کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں حالانکہ عقائد ذہن انسانی کے موروثی عادات کے سوا اور کچھ ہوتے ہی نہیں۔

یہ دنیا ذہن کی باڑی گری معلوم ہوتی ہے  
جہاں جس شے کو جو سمجھو وہی معلوم ہوتی ہے!!

<sup>1</sup> ذرا دیکھئے تو میری دانائی، ارے ملازمت کی خواست گاری اور اس پر یہ برہنہ گفتاری سچ کہا تھا خدا بخشے محمد غنی خاں نے کہ بھائی شبیر حسن خاں، شعر، ویر، میں تو خیر، باقی اور تمام باتوں میں تم مہاتما قسم کے چوتھے ہو۔

والد نواب عماد الملک کے پاس لے جانا چاہتا ہوں میرے والد، سفارش کے



معاملے میں اس قدر سخت ہیں کہ جب میں کیمبرج سے امتحان پاس کر کے آیا تھا تو انہوں نے میری سفارش تک سے انکار فرما دیا تھا۔ بہر حال میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتا ہوں، ہر چند، مشکل سے، دو فیصد امید ہے لیکن اگر انہوں نے سفارش کر دی تو حیدر صاحب کی لاکھ سفارشوں پر بھاری ہوگی۔

ان کے ساتھ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک اسی پچاسی برس کے مرد بزرگ، برآمدے کی بڑی سی آرام کرسی پر دراز ہیں اور ان کے چہرے پر علم و فضل اور مضبوط کردار کا جلال برس رہا ہے مہدی صاحب نے میرا تعارف کیا؟ اعتناء کی ایک دھاری بھی ان کے چہرے پر نہیں دوڑی، میرے دل پر زبردست چوٹ لگی، لیکن پی گیا۔۔۔۔۔ میری اہمیت ظاہر کرنے کے لئے، مہدی صاحب نے کہا ابا یہ جوش صاحب حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں یہ سن کر وہ چونک پڑے اور کہنے لگے شمالی ہندوستان کا وہ ایسا کون با شندہ ہے جو ان کے دادا کے نام سے واقف نہ ہو لیکن ان کی ذات میں بھی کوئی جوہر ہے؟ مہدی صاحب نے کہا یہ بہت اچھے شاعر ہیں، آپ اجازت دیں تو جوش صاحب کچھ سنائیں۔

انہوں نے کہا اچھا۔۔۔۔۔ مہدی صاحب نے مجھ سے کہا جوش صاحب ارشاد اور جب میں نے اپنے ایک مسدس کے تین چار بند سنائے۔  
تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے اس نوجوان میں تو انیس کی روح بول رہی ہے، یہ عمر، اور اس قدر پختگی۔۔۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح یہ بھی آئیں بائیں شائیں کہتے ہوں گے مگر ان کے کلام میں تو روانی بھی ہے، اور معانی بھی مہدی خط لکھنے کا کاغذ لاؤ، مہدی صاحب کی باچھیں کھل گئیں، جلدی سے، اندر جا کر کاغذ و قلم لے آئے آرام کرسی کے دونوں ہتھوں پر، ایک تختہ رکھ دیا۔۔۔۔۔ نواب عماد الملک نے، پورے ایک صفحے کا سفارشی خط لکھا، اور کہا کہ مہدی تم نے یہ خط سرائین جنگ کے حوالے کر کے، میری طرف سے کہہ دینا کہ سرکار کے روبرو پیش کر دیں۔

نواب عماد الملک کے مکان سے گیٹ ہاؤس آیا ”چھوٹے دادا 1“ نے تار دیا  
تار کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ میری بیوی پرسوں شام کی گاڑی سے حیدرآباد آرہی  
ہیں میں حیران ہو گیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے ملازمت تو درکنار، میں نے ابھی تک تو  
نظام کو دیکھا بھی نہیں ہے اور بیوی ہیں کہ چلی آرہی ہیں۔

لیکن میں کرہی کیا سکتا تھا تیسرے دن میری بیوی، دونوں بچوں اور اپنے ماموں  
کو ساتھ لئے حیدرآباد آ گئیں اور گیٹ ہاؤس پہنچتے ہی، آب دیدہ ہو کر کہنے لگیں کہ  
میں یہاں اس لئے آئی ہوں کہ تمہارے دونوں بچے تمہارے حوالے کر دوں، اور خود  
اپنی ہیرے کی انگوٹھی کچل کر کھالوں اور اس دنیا سے سدھار جاؤں یہ سنتے ہی میرے  
ہوش اڑ گئے، اور گھبرا کر پوچھا اشرف جہاں خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کہ آخر بات کیا  
ہے انہوں نے روتے ہوئے کہا ماموں کو بلا کر پوچھ لو۔

ماموں نے آکر جیب سے ایک تار نکالا میں نے تار پڑھا تو معلوم ہوا کہ کسی اللہ  
کے بندے نے ان کے پاس یہ تار بھیجا تھا کہ آپ کے شوہر عقد ثانی کر رہے ہیں فوراً  
حیدرآباد پہنچ جائیے میں نے کہا اشرف جہاں یہ تار بالکل جھوٹا ہے بیوی نے کہا کہ اگر  
یہ تار جھوٹا اور تم سچے ہو تو اپنے بچوں کے بازو پکڑ کر قسم کھا لو کہ تم دوسرا نکاح نہیں کر  
رہے تھے اور جب میں نے اپنے بچوں کے دونوں بازو پکڑ کر بڑے ولولے کے ساتھ  
قسم کھالی تو ان کا چہرہ بحال ہو گیا۔

اتنے میں چھوٹے دادا، ہنستے ہوئے آئے اور میری بیوی کے دل پر اپنی خیر خواہی کا  
سکہ بٹھانے کی خاطر، انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں کی بیوی یہ تار میں نے دیا  
تھا۔۔۔ میں نے، برامان کر کہا چھوٹے دادا آپ کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے تھا انہوں  
نے کہا میرے بھائی برا نہ مانو، مجھ سے یہ کب ہو سکتا تھا کہ تمہارا گھر بگڑے اور میں  
بیٹھا تماشا دیکھتا رہوں میں نے کہا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں میرا گھر بگڑ کب رہا  
تھا۔ انہوں نے کہا وہ شوق والی بات یاد کرو جو ایک لڑکی کا پیام لے کر تمہارے پاس

1 میں انہیں اور رمضان باورچی کو، لیج آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

آئے تھے بیوی نے بگڑ کر مجھے دیکھا اور کہا لو اب تو بات کھل گئی، ہائے تم کیسے باپ ہو کہ تم نے اپنے دونوں بچوں کی بائیں پکڑ کر جھوٹی قسم کھالی۔

میں نے جھلا کر کہا اپنے بچوں کی جھوٹی قسم کھانے والے قصائی پر میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں، اب پوری بات مجھ سے سن لو یہاں ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں ان کی صاحبزادی نے خدا جانے مجھے کیوں کر دیکھ لیا کہ مجھ پر عاشق ہو گئیں، اپنی خادمہ کے ہاتھ خط بھیجا اور لکھا کہ میری ماں نے میرے باپ کو اس بات پر تیار کر لیا ہے کہ وہ آپ سے میری شادی کر دیں، کل ابا کے مصاحب شوق صاحب آئیں گے آپ کے پاس چنانچہ اس کے دوسرے روز ہی شوق صاحب نے ان جاگیردار صاحب کا نام لے کر مجھ سے آکر یہ کہا کہ اگر آپ ان کی صاحبزادی سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوں تو میں ان کے والد ماجد کو اس بات پر راضی کر سکتا ہوں کہ وہ اپنی صاحبزادی کا آپ سے نکاح کر دیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ آپ کے رہنے کے لئے ایک کوٹھی اور ایک کار کا انتظام کر دیا جائے گا، آپ کے تمام خانگی مصارف جاگیر سے ادا کئے جائیں گے، اور پندرہ سو روپیہ ماہانہ جیب خرچ بھی آپ کو دیا جائے گا۔ بیوی نے بری گھبراہٹ کے ساتھ بات کاٹ کر پوچھا اور تم نے کیا جواب دیا میں نے کہا کہ میں نے یہ جواب دیا کہ شوق صاحب، میری شادی ہو چکی ہے میں دو بچوں کا باپ ہوں ”ہم میاں بیوی کو ایک دوسرے سے بے حد محبت ہے اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ان پر سوت لاؤں یہ کہہ کر میں نے چھوٹے دادا سے کہا کیوں صاحب میں نے آپ سے یہی بات کہی تھی نایا کچھ اور؟“ چھوٹے دادا نے کہا نہیں یہی بات کہی تھی میں نے کہا جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں سراسر انکار کر چکا ہوں تو پھر آپ نے میری بیوی کو تار کیوں دے دیا۔۔۔۔۔ چھوٹے دادا نے کہا میرے بھائی آدمی کو بدلتے دیر نہیں لگتی، میں نے سوچا کہ تمہاری بیوی کو بلا

کر تم پر مسلط کر دوں۔

یہ بات سن کر میری بیوی کے دل کا ٹٹا نکل گیا کہنیلگیں اس بھڑو سے شوق کر  
اب کبھی اپنے گھر نہ آنے دینا علی کی تیغ ٹوٹے اس گلوڑے پر وہ میرا لاکھ کا گھر خاک  
کرنے آیا تھا مواد دوسرے ہی دن بیوی نے مٹھائی منگا کر مولا مشکل کشا کی نیاز دلائی  
اور گھر کا مطلع صاف ہو گیا۔

ایک روز میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ نواب عماد الملک کے خط کو بھی تقریباً ایک  
ماہ گزر چکا ہے، لیکن نظام نے اب تک مجھے طلب نہیں کیا ہے شاید وہ تیر بھی خطا کر گیا  
کہ پل بھر میں غم گیں ہونے کے عوض میرے دماغ میں ایک مسخرگی کی لہر دوڑ گئی اور  
اس نے کھٹ سے، ایک بازاری سامطع کہہ کر پیش کر دیا۔ اس مطلع پر مجھے، بے  
ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں ہنستا ہوا بیوی کے پاس آیا، لواشرف جہاں، ایک مطلع سنانے اور  
یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اس مطلع کے بعد میرے دل سے برابر یہ آواز آرہی ہے کہ یا تو  
نظام آج ہی مجھ کو حیدرآباد سے نکال دیں گے یا آج ہی اپنے پاس بلا لیں گے ان دو  
باتوں کے سوا کوئی تیسری بات ہو ہی نہیں سکتی بیوی نے مسکرا کر کہا مجھ پر تمہاری درویشی  
کا سکہ نہیں بیٹھ سکتا تم آئے دن تو ”زلف پیچاں“ اور ”روئے خوباں“ جکتے رہتے ہو  
اور میرے سامنے آئے ہو ولی اللہ بن کر میں نے کہا تم میرے مرتبے سے واقف نہیں  
حشر کے میدان میں جب تم پوچھو گی کہ ارے یہ کون ہے کہ اللہ میاں کے قدموں کے  
پاس بیٹھا ہوا گڑ گڑ حقہ پی رہا ہے تو فرشتے جواب دیں گے کہ یہ اصلی حضرت جوش  
صاحب قبلہ ہیں اور تم بھڑ بھڑا کر میرے قدموں پر گر پڑو گی وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئیں اور  
خوب ہنس چکیں تو کہا اچھا وہ شعر تو سناؤ میں نے کہا مطلع کو شعر کہہ رہی ہو، ماشاء اللہ،  
انہوں نے کہا زیادہ لیاقت نہ بگھا رو، اور مطلع سناؤ میں نے کہا لو سنو

دشمن ہوں، اس زمین پہ، شادہ و زیر کا  
لوٹا ہوں، آسمان پہ، جناب امیر کا



مطلع سنتے ہی تو بتو بہ کر کے انہوں نے اپنا منہ پیٹ لیا، کہنے لگیں تم کھڑے دوزخ میں جاؤ گے تو بہ، تو بہ، ارے کہاں جناب امیر، اور کہاں یہ باتیں اور پٹھان ہو کر اپنے کو لونڈا کہتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آئی میں نے کہا ارے خاک سمجھتی ہو، تم شاعری کی زبان کو۔۔۔ اس شعرے میں ”لونڈے“ کے معنی ہیں ”روحانی چیلہ“ اور ”چہینا“ تمہیں کیا خبر کہ ہم شعرا ئے کرام، الفاظ کے معنی یوں بدل دیتے ہیں کہ لغات کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

بیوی نے کہا بھاڑ میں جائے ایسا مسخرہ پن کہ اسی آن، دروازے پر موڑ آگئی زن زن اور برآمدے میں تالی 1 بجنے لگی ٹھن ٹھن

باہر آیا تو دیکھا نواب قادر نواز جنگ کھڑے ہیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا مبارک ہو، جوش صاحب سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے ابھی تیار ہو جائیے۔

میں اندر گیا اور بیوی کے سامنے جھک کر کہا آداب بجالاتا ہوں بیگم صاحب کیا میں نے ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ یا تو نظام مجھے آج ہی نکال دیں گے، یا آج ہی بلا لیں گے؟ دیکھا جو اس درویش نے کہا تھا، وہی ہوا نا؟ نظام نے مجھے بلا بھیجا ہے بیوی نے جھپٹنی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ، کہا بہت شخی نہ بگھارو، جلدی کپڑے پہنو اور جاؤ۔

کنگ 2 کوٹھی کی، کائی لگی، کالی کالی دیواروں اور اس کے شاہانہ پھاٹک کے بوسیدہ پردے پر عبرت کے ساتھ نگاہ ڈالتا اور بے پایاں دولت کے پیدا کردہ بے کر ان افلاس پر غور کرتا جب محل سرا کے اندر پہنچا تو یہ حسرت ناک تماشا دیکھا کہ وہاں سبزے کا فرش ہے، نہ کیاریاں، پھولوں کے پودے ہیں نہ سردو چنار۔۔۔۔ سوکھا، روڑھا صحن ہے اور اس بجھے بجھے صحن میں، ہزاروں چیزیں، نہایت بے قاعدگی کے ساتھ ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں سامنے ایک نہایت چھوٹا سا تین میڑھیوں کا برآمدہ ہے برآمدے میں ایک بے

1 اہل حیدر آباد تالی بجا کر اپنے آنے کی اطلاع دیتے ہیں

2 نظام کے محل کا نام اصلی میں کوٹھی تھی کسی کمال خاں کی جس نے چھپورے پن سے کام لے کر اس کوٹھی کے تمام دروازوں وغیرہ پر K, K یعنی کمال خاں کھدوا دیا تھا جب نظام نے قبضہ کر لیا تو اس کے حروف کو ”کنگ کوٹھی“ میں تبدیل کر دیا کیا وہ کمال خان دروازہ پر کخ نہیں کھدوا سکتا تھا؟ لیکن اس نے اپنے حروف ہجا سے گریز کر کے انگریزی کے حروف کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ اس کو ”صاحب بہادر“ سمجھا جائے ڈوب مڑاے چڑیا کے غلام!

پالش، چھوٹی سی کرسی پر، ایک ادھیڑ اور خشک چہرے کا دبلا پتلا آدمی میلے اور پیوند لگے کپڑے پہنے، اکڑا ہوا بیٹھا ہے اور اس کی بے پھند نے کی بوسیدہ ترکی ٹوپی کے کناروں پر میل کی ایک چوڑی تہ جمی ہوئی ہے اور اس کے سامنے تیس چالیس عمائد شہر اور اعیان ریاست، دستار و بکوس لگائے، اونگھی مرغابیوں کے مانند، دست بستہ و سرنگوں کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے بہت سے چیر کے ناکارہ بکس پڑے ہوئے ہیں۔

میری نذر قبول کر کے انہوں نے اپنے دست بستہ حاضرین سے کہا، انہیں پہچانتے ہو عماد الملک نے لکھا ہے کہ یہ فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں اگر اودھ کی سلطنت برباد نہ ہو جاتی، تو یہ دکن کیوں آتے آدھے مسلمانوں کو اودھ سنبھال لیتا، آدھے مسلمانوں کو دکن۔

اس کے بعد نظام نے اپنے استاد، حضرت جلیل مانک پوری کو مخاطب کر کے کہا، استادان کے خاندان سے تم 1 تو خوب واقف ہو گے استاد نے ہاتھ 2 جوڑ کر کہا خداوندان کے والد نواب بشیر احمد خاں نے اس وقت میری امداد کی تھی جب کہ میرے استاد، حضرت امیر مینائی کے انتقال کے بعد کوئی میرا سرپرست باقی نہیں رہا تھا جلیل صاحب کی اس شرافت پر میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں نظام نے حضرت جلیل کا یہ اعتراف احسان سن کر اور میری آنکھوں کی نیم ناک کی کو دیکھ کر کہا استاد آپ، اور جوش

دونوں بڑے شریف آدمی ہیں آپ نے سب کے سامنے یہ بے بے جھجک کہہ دی کہ ان کے والد نے تمہاری مدد کی تھی اور تمہارا یہ اعتراف سن کر جوش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مجھ کو تم دونوں کی یہ بات بہت پسند آئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر نظام نے کہا اعماد الملک نے یہ بھی لکھا ہے کہ نوجوان ہونے کے باوجود تمہاری شاعری میں اساتذہ کی سی پختگی پائی جاتی ہے اپنی کوئی چیز سناؤ۔

میں نے مطلع سنایا

1 استاد تک کو آپ نہیں تم سے مخاطب کیا جاتا تھا دولت جو چاہے کرے کون بول سکتا ہے

2 پائے اتحاد اور شاگرد سے بات جوڑ کر بات کرے حکومت کی ریت کیا کہنا تیری شرافت کا۔

ملا جو موقع، تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا  
پڑھوں گا، رحمت کا وہ قصیدہ، کہ ہنس پڑیگا عتاب تیرا  
نظام کے چہرے پر پسندیدگی کا رنگ دوڑ گیا، زیر لب ”واہ“ کہا اور جب میں نے یہ شعر پڑھا:

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں، فلک تو کیا، عرش کانپ اٹھتا  
اگر میں دل پر نہ روک لیتا، تمام زور شباب تیرا  
تو نظام نے، جھوم کر، کہا بہت اچھا بہت اچھا اور تمام حاضرین زور زور سے داد دینے لگے اور میری غزل کے اختتام پر نظام نے کہا استاد جلیل ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ بوڑھے ہو کر یہ تمہاری سہری 1 کے ہو جائیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے پوچھا جوش تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ میں نے کہا میری شادی ہو چکی ہے اور میری بیوی یہاں آ بھی چکی ہے۔۔۔۔۔ ”یہاں آ چکی ہیں“ انہوں نے حیرت سے کہا اور پھر فرمایا کہ تمہاری ملازمت سے پیش تر، وہ یہاں کیوں

چلی آئیں انہوں نے یہ خیال کیوں نہ کیا کہا اگر یہاں تم کو ملازمت نہ مل سکی تو ان کا یہاں چلا آنا بیکار ہو جائے گا۔

میں نے کہا سرکار، میری بیوی کو اس بات کا یقین ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ مجھ کو یہاں ملازمت نہ ملے۔

نظام نے پوچھا تمہاری بیوی کو اس بات کا یقین کیوں تھا کہ تم کو یہاں ملازمت ضرور ہی مل جائے گی یہ سوال سن کر میں چپ ہو گیا سوچنے لگا کہ اس خواب کا ماجرا کہوں یا نہ کہوں۔

میری اس شش و پنج کو دیکھ کر نظام نے کہا بولو جی بولتے کیوں نہیں اس موقع پر نواب مہدی یار جنگ، ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور چوں کہ میں ان سے اپنا خواب بیان کر چکا تھا انہوں نے کہا خداوند کی اجازت ہو تو ذری اس کی علت 1 در ہے کہ آلہ ہم سر

بیان کر دے نظام نے کہا بولو اور جب مہدی صاحب نے میرا تمام خواب بیان کر دیا تو نظام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا تو یہ بولو کہ سرکار دو عالم نے جوش کو میرے سپرد فرمایا ہے یہ کہا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ، سینے پر رکھ کر جھک گئے اور تمام دربار پر ایک گہرا سکوت چھا گیا۔

اس باریابی کے ایک ہفتے کے بعد، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دارالترجمہ کے ناظم، عنایت اللہ صاحب نے جو مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کے فرزند، اور اکبر حیدری وراس مسعود کے پرستار ہونے کی بناء پر میرے بدخواہ بن چکے تھے مجھے بلا کر کہا جوش صاحب مبارک ہو یہ لیجئے شاہی فرمان سرکار نے پولیٹیکل اکانومی کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرر فرما دیا ہے۔

میں نے ان سے کہا پولیٹیکل اکانومی سے میرا کوئی تعلق نہیں انہوں نے خوش ہو کر کہا تو پھر آپ انکار لکھ دیں۔۔۔ میں نے فرمان کے حاشے پر یہ لکھ دیا کہ سرکار والا



تبار کا بے حد شکریہ، لیکن چوں کہ پولیٹیکل اکانومی میرا سبکٹ نہیں رہی ہے اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں اس کام کو باحسن الوجوہ نہیں کر سکوں گا البتہ اگر انگریزی ادب کے ترجمے کا کام میرے سپرد کیا جائے گا تو اسے بڑی خوبی کے ساتھ، انجام دے سکوں گا۔

عنایت اللہ نے کہا انگریزی ادب ہی میں پڑھایا جاتا ہے اس لئے اس کے ترجمے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے آپ یہ عبارت قلم زر کر دیں میں نے کہا کیا مضائقہ ہے رہنے دیجئے گاٹوں کا نوید سنائی پیدا ہو جائے گی۔

عنایت اللہ نے کہا ناظم شعبہ ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کی عبارت کے نیچے یہ نوٹ لکھ دوں کہ انگریزی ادب براہ راست پڑھایا جاتا ہے اس کا ترجمہ ایک فعل عبث ہو گا آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا میں نے کہا بڑے شوق سے لکھ دیں آپ۔

اس کے چوتھے پانچویں دن عنایت اللہ خود میرے پاس آئے اور کہنے لگے صاحب مبارک ہو سرکار نے انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرر فرما دیا ہے یہ لیجئے فرمان، اور لکھ دیجئے اس پر اپنی منظوری۔

میں نے دیکھا کہ فرمان میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہر چند اس نئے عہدے کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے لیکن سر دست جوش ملیح آبادی کا مترجم انگریزی ادب کے عہدے پر فوراً تقرر کیا جائے اور جب ان کو ترقی مل جائے تو اس عہدے کو توڑ دیا جائے میں نے شکریئے کے ساتھ، اس فرمان پر دستخط کر دیئے۔۔۔۔۔ اور عنایت اللہ صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے بیوی کو یہ خوشخبری سنائی انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹکا کر کہا قربان جاؤں اپنے رسول اللہ کے دیکھی تم نے اس خواب کی تعبیر، تم نے تو حیدری سے بگاڑ کر، اپنے پاؤں پر کلباڑی مار لی تھی لیکن اللہ نے تمہاری مدد کی عماد الملک تمہاری پشت پناہی کو کھڑے ہو گئے میں تو کہتی

ہوں پتھر سے پانی نکل آیا۔۔۔۔ اور دوسرے ہی دن، بیوی نے بڑی دھوم سے میلاد کی اور محلے بھر میں مٹھائی بٹوائی۔

تقرر کے بعد، شکریے کی نذر لے کر پہنچا ایک نذر اپنی طرف سے اور دوندریں بیوی بچوں کی طرف سے پیش کیں نظام نے کہا ابھی کیا ہے، میں تمہیں اس قدر دوں گا کہ گھر میں رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہے گی کئے بیویاں ہیں تمہاری؟ میں نے کہا میری تو صرف ایک ہی بیوی ہیں انہوں نے کہا میں نے سنا ہے ”اودھ کے تعلقہ داران کے بہت سے بیویاں ہوتی ہیں“ میں نے کہا سرکار والا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتی ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میری بیوی بھی میری ہی طرح پٹھان نسل کی ہیں اور اس پر یہ طرہ کہ کئی برس سے وہ بے چاری شدید اختلاج میں مبتلا ہیں اگر میں دوسری شادی کر لوں گا تو ان کی ”ٹھنولی اور ان کا اختلاج، یہ دونوں مل کر انہیں ہلاک کر ڈالیں گے۔

نظام نے اختلاج کا حال سنا تو پوچھا کب سے ہے، میں نے کہا چار پانچ برس سے ہے پوچھا کس کس کا علاج کرا چکے ہو میں نے ان معالجوں کے نام بتا دیئے پھر سوال کیا اب تک علاج پر کس قدر روپیہ برباد کر چکے ہو میں نے کہا کم سے کم پندرہ بیس ہزار تک برباد کر چکا ہوں لیکن مرض ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ یہ سن کر نظام نے سیدھے ہو کر بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ میں ڈاکٹری اور طب میں اس قدر دست گاہ رکھتا ہوں کہ ماہر چند میں باقاعدہ مطب نہیں کرتا لیکن بڑے بڑے ڈاکٹروں اور طبیعوں کے لبائ نہیں کھلتے ہیں میرے سامنے۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ اندر گئے اور دو چار منٹ کے بعد آ کر چوب دار کو آواز دی کہ لے یہ پانچ رپاں عیسیٰ میاں کے بازار کے دوا خانے سے گاؤ زبان اور خمیرہ مروارید لے آج جب دونوں دوائیں آ گئیں تو ان کو میرے حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ دوائیں صبح و شام اپنی بیوی کو کھلاؤں پلاؤں، کسی دن ناغہ نہ ہونے دوں، اور عین مرگ 1 کے دن آ کر بتاؤں کہ اب میری

بیوی کیسی ہیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس دن کے بعد عین ”مرگ“ کے دن کنگ کوٹھی گیا دوندریں پیش کیس اشرفیوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی پوچھا یہ دوسری نذر کس کی طرف سے ہے میں نے کہا یہ میری بیوی کی طرف سے ہے انہوں نے پوچھا بتاؤ، میری دواؤں کا اثر، میں نے سفید جھوٹ سے کام لے کر کہا سرکار کی دواؤں نے تو جادو کا اثر کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کبھی اختلاج تھا ہی نہیں۔۔۔ یہ سنتے ہی، ان کے چہرے اور ان کے تمام بدن میں خوشی اور مناخرت کی لہر دوڑ گئی اور چوب دار کو حکم دیا کہ فلاں فلاں ”طیبیاں“ اور ”ڈاکٹروں“ کو فوراً حاضر کر دے۔

جب تمام نامی ”طیب“ اور ”ڈاکٹر“ حاضر ہو کر نذریں پیش کر چکے تو انہوں نے حکم دیا کہ تمام ”طیب“ میرے داہنے طرف اور تمام ”ڈاکٹر“ میرے بائیں جانب صفیں باندھ کر کھڑے ہو جائے اور جب حکم کی تعمیل ہو گئی تو کوتوال شہر و نکلا مارا ریڈی کو ان صفوں کے درمیان ”مرج البحرین“ کے طور پر کھڑا کر دیا گیا۔۔۔۔

1 دکن میں پرتگال کے یوم اولیس کو مرگ اور آغاز موسم باروں کا مرگ لگنا کہا جاتا ہے اس واقعہ عجیب کی شہر میں ڈگ پٹ گئی کہ جوش صاحب اس قدر بلند اقبال ہیں کہ سرکار نے ان کی بیوی کے علاج کی خاطر اپنی جیب سے ایک نہیں پورے پانچ روپے صرف کر ڈالے اور مہاراجہ پرشاد نے تو اس خوشی میں میری دعوت بھی کر ڈالی اور کہا ممالک محروسہ سرکار عالی میں آپ وہ پہلے آدمی ہیں جن پر نظام نے پانچ روپے اپنے جیب سے خرچ کر ڈالے ہیں۔

اور عین اس وقت جب کہ حکیم ڈاکٹر ان کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ آج ہم سب پر کوئی نہ کوئی نوازش ضرور کی جائے گی نظام نے کڑک کر ان سے کہا دیکھو یہ جوش ملیح آبادی تمہارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں یہ بے چارے اپنی بیوی کے علاج میں پندرہ بیس ہزار روپیہ تم بے ایمان مسخراں کو چٹا چکے ہیں لیکن تم

انہیں تندرست نہیں کر سکے، میں نے دو دو انہیں دیں اور بیس دن کے اندر ان کی بیوی کا مرض غائب ہو گیا اب اے سالو اگر تم میرے سامنے حذاقت کا دعویٰ کرو گے تو میں تمہاری۔۔۔۔۔ گا اور فقط یہی نہیں میں تم سب کی۔۔۔۔۔ میں ریل چلا دوں گا اور اس ریل میں بیٹھ کر دھکا دھک کرتا منماڑ تک چلا جاؤں گا۔

اپنے آقا کی زبان سے یہ فحش الفاظ سن کر ان سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ان کے گل مجھے لابی داڑھیاں ہوا میں پھر پھر انے لگیں ڈاکٹروں کی مونچھوں کی کھڑی چونچوں پر بھیسروں ناچنے لگا ذلت کے کوئے ان کے سروں پر قاؤں قاؤں کرنے لگے اور ان کی جھکی پلکوں کے نیچے لال لال منہ کے بندرجست و خیز کرتے نظر آنے لگے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی بہت بھاری پتھر کسی پہاڑی سے ٹوٹ کر دریا میں آگرا ہے اور ساکن موجوں میں یکا یک بھونچال آگیا ہے۔

میں نے بڑی عبرت کے ساتھ دیکھا کہ ان معزز ارباب فن کی پنڈیاں کانپ رہی ہیں ان کی گردنیں پتلی ہو ہو کر ان کے سروں کا وزن اٹھانے سے انکار کر رہی ہیں ان کی آنکھیں بجھ گئی ہیں ان کا جذبہ غیرت منہ پیٹ رہا ہے ان کی ناکیں سرخ ہو ہو کر لمبی ہو چکی ہیں اور ان کی خودداری ان کے رخساروں کی دونوں ابھری ہوئی ہڈیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی لید کر رہی ہیں ہائے انسان تیری مجبوریاں 1

1 اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ جب ان میں سے کسی نے بھی میری بیوی کا علاج نہیں کیا ہے تو پھر انہیں ذلیل کیا جا رہا ہے لیکن اس اس کی یہ علت سمجھ میں آرہی ہے کہ چونکہ نظام اپنے کو تمام طبیبوں اور ڈاکٹروں سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا دل اس بات پر کڑھا کرتا تھا کہ اگر میں مطب کرتا تو جو دولت یہ لوگ کما رہے ہیں میری جیب میں آتی اور منصب شاہانہ کی مجبوری سے

دارالترجمہ مقام دفتر کم اور دارالافتح زیادہ تھا ہم تمام لوگ 1 (سید ابوالخیر مودودی کے علاوہ) روز ہاشمی صاحب فرید آبادی کے کمرے میں جمع ہو کر گپیں اڑاتے



اور شاعری کیا کرتے تھے میں نے وہاں مترجم ادب انگریزی 2 کی حیثیت سے تقریباً ڈیڑھ برس کام کیا اور جب علامہ علی حیدر صاحب طباطبائی کو پنشن مل گئی تو اکبر حیدری اور اس مسعود کے علی الرغم نواب اکبر یار جنگ کے مخلصانہ مساعی کی بناء پر مجھے ترقی مل گئی میرا عہدہ توڑ دیا گیا اور میں علامہ طباطبائی کی جگہ ”مشیر ادب“ کے عہدے پر کام کرنے لگا میری یہ بڑی ادبی نمک حرامی ہوگی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبہ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی علامہ طباطبائی اور مرزا محمد ہادی رسوا کے فیضان صحبت نے مجھ بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوق مطالعہ پر مامور کر دیا اور صحت الفاظ و نجابت لہجہ کا جو پورا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سر زمین پر لگایا تھا اگر طباطبائی میرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پوچھا کبھی شاداب اور بار آور نہ ہوتا۔

چونکہ میں ایسا نہیں کر سکتا تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یہ نا اہل مزے اڑا رہے ہیں کیا ہوا اگر ان میں کوئی جوش کی بیوی کا معالج نہیں رہا ہے مگر ان کی بیوی کے معالحوں کے یہ لوگ ہم پیشہ اور ایک ہی ہتھیلی کے چٹے بٹے وہیں وہ معالج میرے ہاتھ نہیں آسکتے تو پھر ان کو ذلیل کر کے اپنے جی کیوں نہ ٹھنڈا کر لوں؟ ممکن ہے میری یہ رائے غلط اور اس کی علت کچھ اور ہی ہو اس لئے کہ دولت کی ضرورت سے زیادہ فراوانی اور مسخرے مصاحبوں کی حد سے بڑھی قصیدہ خوانی کے بگاڑے ہوئے دماغوں کی اچھل کود اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ کوئی ذی عقل اسے گرفت میں نہیں لاسکتا اے اللہ مجھ کو دولت کی فراوانی اور افلاس کی طغیانی سے محفوظ رکھنا، اس لئے کہ ان دونوں حالتوں میں انسانیت کا دم نکل جایا کرتا ہے۔

1 یعنی احسان احمد، علامہ عمادی، مولوی فدا علی، محمد ابراہیم، رشید احمد، مرزا طبیب، سناجے پوری اور گاہ گاہ قاضی غلام حسین، مسعودی علی محوی علامہ طباطبائی اور مرزا محمد

ہادی رسوا صاحب امراؤ جان ادا بھی شریک بزم ہو جایا کرتے تھے 2 میرے ذمے  
حیات بیکن کا ترجمہ تھا۔

میرزا محمد ہادی صاحب میرے پڑوسی تھے میں دکن آ کر پھر ان سے پڑھنے لگا، اور  
اس بار فارسی کے ساتھ ان سے انگریزی ادب، اور فلسفے کا بھی باقاعدہ درس لینا شروع  
کر دیا۔ ہرچند 1918ء میں شراب کے لطف سے آگاہ ہو چکا تھا، اس لئے کبھی کبھی  
کسی دعوت میں تو پی لیتا تھا لیکن اپنی تنخواہ سے خرید کر کبھی نہیں پیتا تھا اور اسی وجہ سے  
مجھے یہ فرصت حاصل تھی کہ روز رات کے گیارہ بارہ بجے تک اردو فارسی، انگریزی  
ادب اور فلسفے کا بلا ناغہ مطالعہ کیا کرتا۔

ہائے کیوں کر بیان کروں کہ اس وقت میرا حیدر آباد کیا چیز تھا اوزانی اور اس پر  
دولت کی فراوانی ہر طرف ایک چہل پہل تھی امراء کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجا  
کرتی تھی آئے دن جلسے، محرے، دعوتیں اور مشاعرے ہوتے متوسطین تک غرق نشاط  
رہا کرتے تھے اور اسکاچ و سکی صرف آٹھ روپے میں ملتی اور پانی کی طرح بہائی جاتی  
تھی۔

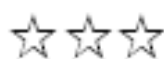
وہاں کا علمی و ادبی ماحول، موسمی اعتدال، مجلسی ابھار اور تہذیبی نکھار وہاں کی رامش  
ورنگ میں ڈوبی شائیں، پہاڑوں پر تھرکتی سحسیں، شبستانوں میں ناچتی گاتی راتیں،  
بانہوں اور بوسوں کی سو غاتیں یاران و نشیں کی ترنگیں، اٹھتی جوانیوں کی امنگیں، باغ  
عامہ کی لچکتی ڈالیاں، عثمان ساگر کی، گنگناتی متوالیاں، اونچی اونچی گاتیاں بہکی بہکی  
مدھ ماتیاں۔۔۔ وہاں کے میلے ٹھیلے پر یوں کے ریلے ہر چہرے پر رونق ہر گوشے میں  
ہو حق بجتی گلیاں تھرکتی رنگ رلیاں، ساحلوں پر براتیں اور وہ خیمہ ہائے جشن کی سنہری  
قناتیں وہ شاہ زادہ معظم جاہ کا دربار، گویا مصر کا بازار، وہ پریاں قطار اندر قطار، وہ  
گردنوں کو پیچھے ریلے ہوئے سینوں کے ابھار، وہ جھمکے، وہ چنن ہار، وہ چٹانوں کے  
بیوپار، وہ طوفان گیسو و رخسار، وہ پازیبوں کی جھنکار، وہ بلبلے وہ ستارہ گیتوں کی ہلکی ہلکی

پھواروہ غزلوں کے گونجتے اشعار، وہ ابلتے انواروہ کھکتے درو دیوار اور وہ چھلکتے شیشہ  
ہائے سرشار۔

ہائے کن کن باتوں کا ذکر کروں حافظے کا سرہ سفید ہو چکا ہے۔ اور پرانی صحبتیں کجا  
چکی ہیں اب شام کے وقت کراچی میں جب اپنے مکان کے کھلے ہوئے مغربی چھجے  
میں شمالی ناظم آباد کی دور کی روشنیوں کے سامنے تنہا پیئے بیٹھتا ہوں تو انسان کی رنگ  
رلیوں کو دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے والی مشیت میری زمانہ ماضی کی سرخوشیوں کی سزا  
دینے پر کمر بستہ ہو کر میرے بیٹے دنوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ میرا تعاقب کرنے لگیں  
جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حیدر آباد کی راتوں کی براتوں کے جلوس گم کردہ لمحوں اور  
گہنائے مکھڑوں کے دروانگیز جلوس دامن شفق کو پھاڑ کر باہر نکل آتے ہیں اور غلغلے  
مچانے والے یاروں کے چہرے اور آغوش میں مچلنے والے دلی داروں کے مکھڑے،  
فضا پر تیرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور میرے پیاسی نظریں، جب انہیں پکڑ لینے کے  
واسطے، دوڑتی ہیں تو وہ دریائے شفق میں غوطہ لگا کر میری آنکھوں سے پل بھر میں  
اوجھل ہو جاتے ہیں اور ایک سو گوار دھواں میرے سر پر منڈلانے لگتا ہے۔

اگر میں، کل، جی بھر کے، ہنستا نہ ہوتا، تو آج، دل تھا کریوں نہ روتا، سچ کہا ہے  
انہیں نے

روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں!!  
وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شے میں خیرہ اور خیر میں شر کا ایک عنصر ہوتا ہے وہاں کا دوسر  
بھیا نک رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔



## حیدرآباد سے اخراج

حیدرآباد کے سر پر جاگیرداری اور شہر یاری کا گدھ ٹھونگیں مار رہا تھا ہر طرف درباری سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے نظام کے مصاحب ہر چند لکھے پڑھے نہیں تھے لیکن اس قدر کڑھے، ایسے دربار مسخرے، موروٹی مراٹی، خاندانی خوش آمد خورے، مشاق بھانجی مار، جھوٹے قصیدہ خواں پختہ دروغ باف، چھٹے تہمت کار، بولی ٹھولی میں اس قدر طاق و مشاق، اور نظام کے اس درجہ مزاج شناس تھے کہ ان کو انگلیوں پر نچاتے، چاپلوسی کے توؤں پر روٹیاں پکاتے، اپنے کو ابھارتے، حریفوں کو گراتے روز ماں بہن کی گالیاں کھاتے اور شربت کی طرح پی جاتے باتوں کے طوطے اڑاتے اور ان طوطوں کو اپنے آقا کی بھوؤں پر بٹھاتے اور ان سے ”بنی جی بھیجو“ کے نعرے لگواتے تھے۔

جس طرح سانپ والے، بانسریوں پر ناگوں کو نچاتے ہیں اس طرح یہ مسخرے بھی اپنے ملائم لہجوں کی گاڑیوں میں اپنی آنکھوں کے گھومتے ہوئے عیار ڈھیلوں کے پئے لگاتے اور اپنی غلط بات کو سچ ثابت کر دینے کی خاطر، اپنے سدھے ہوئے چہروں کے منہ میں لگام لگا کر، اپنی منزل مقصود کی جانب ہنکاتے اور نظام کو اپنے راستوں پر چلاتے تھے اور بڑے سے حاکموں اور جاگیرداروں سے اگر بگڑ جاتے، تو سرور باران کو پٹوا کر نکلوا دیتے، اور ان کے گھروں میں جھاڑو پھر وادیا کرتے تھے۔

ان کی زبانیں ایسی رینگتی ہوئی ناگنیں تھیں جن سے اور تو اور شہزادے تک محفوظ<sup>1</sup> نہیں تھے۔

بہر حال اسے حیدرآباد میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھ کو دس برس تک اپنے سائے میں پروان چڑھایا تو نے مجھ کو کبھی غیر ملکی نہیں سمجھا تو نے مجھ کو کتب بینی کی دعوت دی تو نے میری شاعری کو آب و رنگ بخشا، تو نے مجھے علم و فکر کا راستہ دکھایا، تو نے مجھے کتاب کا کل اور کائنات کے مطالعے پر مامور فرمایا کتاب نے میری آگاہی



میں اضافہ کیا، کالوں کی چھاؤں نے مجھ کو جمالیاتی شاعری کا خزانہ بخشا کائنات کے مسائل نے مجھ میں تفکر کا مادہ پیدا کیا تفکر نے میرے علم میں اضافہ کیا علم کے اضافے نے مجھ پر یہ تلخ حقیقت عیاں کر دی کہ میں سراسر جاہل ہوں اور اس عرفان جہل نے مجھ کو وادی حیرت کی جانب موڑ دیا۔

میں نے ”غلط بخشی“ کے نام سے نظام کے خلاف ایک نظم کہی تھی جس کا ذکر آگے 1 یہ بات فقط حیدرآباد ہی سے مختص نہیں تمام دیسی ریاستوں کا یہی عالم تھا ہر جگہ مسخرے مصاحبوں کی ریشہ دوانی، اور پاگل ہنر ہائی نسوں کی حکمرانی تھی مصاحبوں کی زبانیں ان کی کھیتیاں تھیں اور والیاں ریاست کے کان ان کھیتوں پر برسے والے ابر تھے اور چونکہ انہیں کبھی ان کی غلطیوں پر مطلع نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ اپنے ہر برے سے برے فعل کو روا سمجھتے تھے اور چونکہ وہ مسلسل و لمل فراغت کے آغوش میں رہتے تھے اس لئے ان کے قوائے فکر کو زنگ چاٹ چکا تھا، اور ان کی عقلوں پر چربی چھا گئی تھی اس لئے وہ خطرناک قسم کے پاگل ہو چکے تھے اور اسی وجہ سے ذرا ذرا سی بات پر آب رو داروں کو ذلیل کر دینا، ارباب علم کے سروں پر ٹھوکریں مارنا، بھانڈوں بھگتیوں کو سر چڑھانا اور شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں پر سانڈوں کی طرح چڑھ جانا ان کا آئے دن کا مشغلہ اور آبائی کھیل تھا۔

اور ان سانڈوں ان دیوانوں اور ان کالے ناگوں کو فرنگی حکومت نے اس لئے قائم رکھا تھا کہ جب کبھی ہندوستان میں آزادی کا طوفان آئے گا یہ لوگ اسے روکنے کے واسطے فلک پیا بند تعمیر کر دیں گے اور راجہ پورس کے ہاتھوں کے مانند خود اپنی ہی قوم کو روند کر مار ڈالیں گے۔

آئے گا وہی نظم بظاہر میرے اخراج کا سبب بن گئی لیکن اس نظم کی پشت پر جو اور اسباب بھی کام رک رہے تھے ان کا اب تک کسی کو علم نہیں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب کو بھی بیان کر دوں۔

مجھ کم بخت گھر پھونک تماشا دیکھنے والے کی یہ افتاد مزاج ہے خواہ اسے ہنر سمجھا جائے یا عیب کہ میں عامۃ الناس کے قدموں پر سر جھکا دینے کو انتہائی شرافت اور خداوندان اقتدار کے تحت کے روبرو گردن میں خم پیدا کرنے کو انتہائی کمینگی سمجھتا ہوں اور میر تقی میر کے مانند:

سر کسو سے، فرو نہیں آتا  
حیف بندے ہوئے، خدا نہ ہوئے  
کافرہ لگاتا رہتا ہوں

اور اس افتاد مزاج کے ساتھ، میں جس وقت نظام کے روبرو سراپا انکسار بن کر جاتا ان کو ”سرکار“ کہتا اور ان کی زبان سے اپنے متعلق ”تم“ سنتا تھا تو میرے دل پر ایسی کاری ضرب لگتی تھی کہ بلبلہ اٹھتا تھا زبان سے تو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن میرے چہرے کا تغیر اور میرے چوٹ کھائے دماغ کی برقی لہریں نظام کے دل پر اس طرح اثر کیا کرتی ہیں جیسے میدان میں سونے والے پر شب نم گرتی ہے اور اسے کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ میرے سر میں یہ دھمک کیوں ہو رہی ہے۔

اپنے پاش پاش غرور کے ساتھ دربار سے جب گھر آتا تھا تو، بیوی کے سامنے، اپنی اس بے عزتی کا رونا رویا کرتا تھا اور وہ بھی اس بے احتیاطی کے ساتھ کہ نوکر چا کر سب سن لیا کرتے تھے۔

مجھ کو مطلق یہ معلوم نہیں تھا کہ نظام کی خفیہ پولیس کا گھر گھر میں اس طرح جال پھیلا ہوا ہے کہ کوئی اس کی زد سے بچ کر نکل ہی نہیں سکتا۔ صرف گھر کے نوکر چا کر یا مائیں ہی نہیں، سودا بیچنے والیاں تک خفیہ پولیس میں بھرتی ہیں۔

مجھ کو اس بات کا پتا کیوں کر چلا، وہ بھی سن لیجئے ایک روز، نواب قادر نواز جنگ بڑا خوفناک چہرہ بنائے میرے پاس آئے اور کہا جوش صاحب آپ اپنے محل میں جس بات کا رونا رویا کرتے ہیں سرکار والا تک وہ بات پہنچ گئی ہے اور مجھ کو اس بات کی بڑی







سر محفل مسک بد خصال  
کریم آ کے پھیلائیں دست سوال

ہنر ہو اور اس درجہ بے آب رو  
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!!

دوسرے ہی دن وہ نظم نظام تک پہنچ گئی کوئی دوسرا ایسی زبردست گستاخانہ نظم کہتا تو جن بچوں سمیت کولہو میں پیل دیا جاتا لیکن ان کی شرافت دیکھئے کہ انہوں نے بڑے خفیہ طور پر میرے ہم نوال و ہم پیالہ دوست آغا جانی نائب کو تو ال کو میرے پاس بھیجا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ، کنگ کوٹھی لے آئیں آغا نے مجھ سے کہا مجھ کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ رہ چند آپ نے اس قدر سخت نظم کہی ہے پھر بھی سرکار آپ کے خلاف کسی قسم کا اقدام پسند نہیں فرماتے ہیں اور انہوں نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر جوش مجھ سے معافی طلب کر کے، اس بات کا عہد کر لیں کہ وہ آئندہ میرے خلاف کچھ نہیں کہیں گے تو میں انہیں دل سے معاف کر دوں گا اس لئے ابھی ابھی میرے ساتھ چلئے اور اس معاملے کو رسیدہ ہو دبلائے بنا دیجئے میں نے ان کی بات سن کر سر جھکا لیا آغا نے کہا، ارے دیر نہ کیجئے کپڑے پہنئے اور میرے ساتھ ہو لیجئے میں نے کہا آغا معافی مانگنے پر میں تیار نہیں ہوں وہ یہ سن کر دنگ ہو گئے مجھ سے کچھ نہیں کہا زمانے دروازے پر جا کر آواز دی بھابی ذرا ایک بات سن جائیے اور جب میری بیوی پٹ کی آڑ میں آ کر کھڑی ہو گئیں تو انہوں نے کہا بھابی آپ کے شوہر نام دار سرکار سے معافی مانگنے پر تیار نہیں ہیں بیوی نے آغا سے کہا ذرا انہیں بلا لیجئے آغا نے مجھے پکارا میں پہنچ گیا اور بیوی نے بڑے تہیے کے ساتھ ڈانٹ کر مجھ سے کہا ارے کیا تمہارا دماغ چر گیا ہے آدھی سے زیادہ جائے داد تباہ کر کے یہاں آئے ہو اور ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں کہ اس آدھی جائیداد کو بھی ملیح آباد جا کر تین برس کے لئے خولجہ حسن کو ٹھیکے پر دے آئے ہو اور وہ سارا روپیہ بھی بالابالا بمبئی جا کر برباد کر آئے ہو معافی نہیں مانگو گے تو کیا جھنے

جھاڑے پھرو گے؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ لڑکی لڑکے کو لکھانا پڑھانا، اور ان کی شادیاں کرنا ہے جاؤ اس گھڑی جاؤ، اور سرکار سے جا کر معافی مانگ لو نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا سن رہے ہو تم؟

میں نے کہا اشرف جہاں یہ بات سچ ہے کہ ہم تم سے ڈرتے ہیں، مگر یہ بھی سن لو کہ اس قدر نہیں ڈرتے ہیں کہ بھیگی بلی بنے جائیں اور معافی مانگ آئیں یہ سن کر بیوی ہکا بکا ہو کر رہ گئیں دیر تک مجھے گھورا اور پھر آنکھیں جھکالیں اور آغا جانی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ جو شخص خودکشی پر تل جائے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

آغا کے چلے جانے کے بعد میں نے ڈر کے مارے گھر میں قدم نہیں رکھا اور دوسرے دن جلدی جلدی استغفہ لکھ کر اپنے محکمے کے سیکرٹری نواب ذوالقدر جنگ کے پاس چلا گیا۔

ذوالقدر نے کہا جوش صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں جذبات میں نہ بہتے عقل سے کام لیجئے جائیے اور سرکار سے معافی مانگ لیجئے آپ کو معلوم نہیں ملازم کی کھال کو موٹا ہونا چاہئے سرکار مجھے گالیاں تک دے چکے ہیں یہ آپ سے کہہ رہا ہوں لیکن میں پی گیا استغفہ نہیں دیا اور آپ کی بات تو قطعی اس کے برعکس ہے آپ نے خود سرکار پر لعن طعن کی ہے اور اس کے باوجود اٹے استغفہ دے رہے ہیں۔

دیر تک وہ مجھے سمجھاتے رہے دیر تک بڑی رو قدح رہی اور جب میں نہیں مانا تو انہوں نے غصے میں آکر میرا استغفہ کنگ کوٹھی روانہ کر دیا۔

میرا استغفہ، جنگل کی آگ کے مانند نظام تک پہنچ گیا اور نظام چیخ چیخ کر کہنے لگے ”بڑا غضب ہوا جوش مجھ سے جیتے جا رہے جوش مجھ سے جیتے جا رہے ہیں، نواب سر امین جنگ نے کہا خداوند سے کون جیت سکتا ہے کہاں جوش اور کہاں شاہ دکن جوش کی سری (مرتبے) کے تو سینکڑوں شاعر لکھنؤ کی گلیوں میں جوتیاں چٹختے پھرتے ہیں نظام نے کہا امین تم بات کی نزاکت نہیں سمجھ رہے ہو مزا تو جب تھا کہ ان کے استغفہ سے

پیش تر ہی میں ان کو برطرف کر دیتا۔ لیکن اس عالم میں جب کہ وہ خود مستغنی ہو رہے ہیں بات الٹ گئی ہے اور میں ہارا جا رہا ہوں۔“

نواب امین جنگ نے دست بستہ عرض کیا خداوند اس استغنیٰ کو خانہ زاد کے حوالے فرما دیا۔ فدوی ابھی معاملے کو پلٹ دے گا نظام نے میرا استغنیٰ ان کی طرف پھینک دیا امین جنگ نے اسے اٹھا کر فوراً چاک کر دیا اور ہوا میں اس کے پرزے اڑا کر کہا سرکار والا اس استغنیٰ کا اب وجود ہی باقی نہیں رہا ہے اب سرکار فرمان جاری کر دیں میرے استغنیٰ کے چاک ہو جاتے ہی نظام کا چہرہ دمک اٹھا اور کہنے لگے امین تم نے مجھ کو جتا دیا، ہمارے سیکرٹری کو ایسا ہی قابل ہونا چاہئے لکھو فرمان کہ جوش ملیح آبادی کو ممالک محروسہ سرکار عالی سے خارج کیا جاتا ہے پندرہ دن کے اندر وہ روانہ ہو جائیں اور تا حکم ثانی یہاں قدم نہ رکھیں۔

فرمان لے کر آغا جانی میرے پاس آئے اور کہنے لگے اس فرمان کو سمجھے بھی؟ میں نے کہا اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا میں سرکار والا کا مزاج شناس ہوں اس لئے فرمان کے دو نکتے بتانے آیا ہوں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ سرکار جب کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اسے چوبیس گھنٹے کے اندر نکال دیتے ہیں آپ کو چوبیس گھنٹے کے عوض پورے پندرہ دن کی مہلت دی گئی ہے اور وہ اس مقصد سے کہ آپ صورت حال کو ٹھنڈے دل سے سمجھ کر معافی مانگ لیں اور یہ فرمان واپس لے لیا جائے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس میں تا حکم ثانی لکھ کر آپ کی واپسی کو ناممکن نہیں بنایا گیا ہے دیکھئے اب بھی کچھ نہیں کیا ہے ابھی میرے ساتھ سرکاری کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگ لیجئے اگر اس وقت یہ فرمان منسوخ نہ کر دیا جائے تو میری ناک کاٹ لیجئے گا۔

میں نے آغا جانی کو گلے لگا کر ان کی پیشانی چوم لی اور کہا آپ واقعی میرے پکے دوست ہیں لیکن میں کسی طرح معافی طلب نہیں کروں گا۔

آغا نے سر پکڑ کر کہا بھائی راج ہٹ ہٹ بالک ہٹ تریا ہٹ تو سنی تھی آج معلوم ہوا

کہ چوتھی ہٹ، بھی ہوتی ہے جس کو شاعر ہٹ کہنا چاہئے

اندر جا کر میں نے بیوی سے کہا اب رخت سفر باندھو، ہم یہاں پندرہ دن کیوں پڑے رہیں، تین چار دن ہی میں کیوں نہ چلے جائیں بیوی نے کہا یہ تو سوچو جاؤ گے کیسے جانے کا دم درود بھی ہے؟ تمہاری بہن بہنوئی ان کے بچے اور پھر ہم لوگ اور چھوٹے دادا اور دونو کراتنے آدمیوں کا کرایہ بھاڑا کہاں سے آئے گا اور پھر تمہاری یہ ضد بھی ہے کہ ہم اپنی موٹر اور اپنے دونوں کتے بھی ساتھ لے جائیں گے اور ان کو یہاں کی گلیوں میں مارا مارا نہیں پھرنے دیں گے ان سب کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا اسی دن کے لئے میں تم سے کہا کرتی تھی کہ روز دعوتیں نہ کرو، غول کے غول آدمیوں کے روز شراہیں نہ پلاؤ اتنے اللے تللے نہ کرو اب بتاؤ کیا کرو گے اور کیسے جاؤ گے نہ تو من تیل ہو گا نہ را دھا جی نا چیں گی۔

بیوی کی باتیں سن کر میں چکرا گیا اور یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ان حالات میں سفرنا ممکن ہے میں نے کہا پھر اشرف جہاں کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا جاؤ اور شہر دے اور مہاراجہ کشن پرشاد سے جا کر قرض مانگو میں نے کہا میں قرض مانگنے نہیں جاؤں گا یہ تو ان دونوں کا فرض تھا کہ وہ کسی کو میرے پاس بھیج کر خود کچھواتے کہ ہم اس موقع پر کیا امداد کر سکتے ہیں جب انہوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا تو میں بے غیرتی لاڈ کران کے پاس کیوں جاؤں بیوی نے کہا ہاں سچ کہتے ہو لیکن میں پوچھتی ہوں کہ اب سہتا کیا کیا جائے میں نے کہا کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے الغرض ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے اور اخراج کی تاریخ قریب سے قریب تر آنے لگی اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی اور میرا عالم اس مسافر کا سا ہو گیا جو راستہ بھول کر جنگل میں سر ٹکراتا اور چیختا پھرتا ہے۔

شب تاریک دہیم موج و گردا بے چنیں مائل  
کجا وانند، مال ما، سبک ساران ساحل ہا



ایک روز، اسی ربودگنی و بے چارگی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ حکیم آزاد انصاری نے آکر کہا کچھ خیال بھی ہے کہ یہاں سے جانے میں اب فقط چار دن باقی رہ گئے ہیں؟ میں نے کہا آزاد صاحب اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اخراج کے دن میں بڑے اطمینان سے اپنے پھاٹک کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ جاؤں اور نظام کی نافرمانی کے جرم میں اپنے کو گرفتار کرا کے جیل چلا جاؤں لیکن میرے بال بچے کیا کریں گے؟

آزاد نے کہا گرفتار ہوں آپ کے دشمن، میں ایک ایسی تدبیر نکال کر آیا ہوں جو پٹ پڑی نہیں سکتی آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ خاندان آصفیہ کی یہ ایک قدیم روایت چلی آرہی ہے کہ شاہی معتبوں کو تا حیات وظیفہ دیا جاتا ہے آپ بھی معتب ہیں اس لئے آپ کو بھی وظیفہ دیا جائے گا اس لئے آپ اللہ کا نام لے کر اس مضمون کی درخواست کے ساتھ اکبر حیدری کے پاس جائیں کہ آپ کو خزانہ عامرہ سرکار عالی سے پانچ ہزار کی رقم بطور قرض دے دی جائے اور اس رقم کو وظیفہ عتاب میں سے بلا قسط وضع کر لیا جائے۔

میں نے کہا تدبیر تو آپ نے ایسی نکالی ہے جو تیر بہدف ہے لیکن کیا منہ لے کر حیدری کے پاس جاؤں انہیں تو ان کے خطاب کے معاملے میں ذلیل کر چکا ہوں۔۔۔۔۔ آزاد نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے آپ حیدری سے تو قرض نہیں مانگ رہے ہیں آپ کو تو خزانہ عامرہ سے قرض ملے گا میں نے کہا بہت اچھا میں تیار ہوں لیکن درخواست لکھنا تو مجھے آتا نہیں آزاد نے اپنی جیب سے ٹاپ شدہ درخواست نکال کر میرے حوالے کر دی اور کہا اسی خیال سے میں آپ کے پاس مسلح ہو کر آیا تھا کہ درخواست لکھنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔

اپنے مزاج کو لاکھوں کوڑے مار مار کر میں حیدری کے پاس گیا انہوں نے بڑی نرمی کے ساتھ پوچھا جوش صاحب میں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں لفظ کھدمت کے

زہر کو پی کر میں نے کہا آپ کو معلوم ہے کہ میرے اخراج میں اب صرف چار روز باقی رہ گئے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے میرے پاس اس قدر روپیہ نہیں کہ میں سفر کر سکوں اس صورت میں آپ مجھ پر دو عنایتیں کر سکتے ہیں پہلی عنایت تو یہ ہوگی کہ آپ میری اس قرض کی درخواست کو منظور فرمالیں اور یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری عنایت کریں کہ مجھ کو مجرم سرتابی گرفتار کر اسے جیل بھجوا دیں۔

انہوں نے میری درخواست اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے یہ کہا آپ گرفتاری کی بات نہ کہیں اگر آپ کو گرفتار کر لیا گیا تو لٹریچر کی ہسٹری حیدر آباد کو کبھی ”مان“ معاف نہیں کر سکے گی۔

میری درخواست پڑھ کر وہ داڑھی کھجانے لگے میں نے کہا حیدری صاحب آپ اپنے دماغ پر بار نہ ڈالیں میں ہر مصیبت کے لئے بخوشی تیار ہوں انہوں نے کہا جوش صاحب یہ فنانس کا معاملہ ہے اس میں پانچ چھ مہینے لگیں گے میں نے کہا مجھے تو صرف چار دن کی فرصت ہے۔

یہ سن کر انہوں نے سر جھکا لیا سوچنے لگے پھر اپنی خشخشی داڑھی کھجائی عینک صاف کر کے دوبارہ لگائی اور آخر کار گردن کے ایک فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ میری درخواست منظور کر کے اس پر دستخط کر دیئے اور دوسرے ہی دن مجھ کو پانچ ہزار مل گئے۔

جاتا ہے آسمان لئے کوچے سے یار کے  
آتا ہے جی بھرا، در و دیوار دیکھ کر!

ہائے کیسے بتاؤں کہ حیدر آباد سے روانگی کے وقت۔ میرے دل کا کیا عالم تھا ایک طرف غم دوراں تھا اور ایک طرف غم جاناں میری معاش کی شمع بجھ کر دھواں دے رہی تھی اور میرے معاشقے کا چاند گہنا کر اداسی برسا رہا تھا بیوی ریل کے ڈبے میں اداس بیٹھی تھیں اور محبوبہ اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں، پچھاڑیں کھا رہی تھیں اور میرا یہ عالم تھا

کہ بیوی کی نظر بچا بچا کر بار بار ویٹنگ روم جاتا محبوبہ کو گلے لگا کر روتا، اور آنسو پونچھ پونچھ کر باہر آتا اور سید علی اختر مرحوم، سید ابو الخیر مودودی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے (جو مجھے رخصت کرنے اسٹیشن آئے تھے) باتیں کرنے لگتا تھا۔

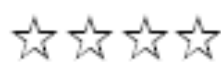
میں اسی عالم میں تھا کہ نواب ذوالقدر جنگ آگئے اور ایک کاغذ میری طرف بڑھا کر کہا یہ میرے نام کا شاہی فرمان ہے اسے پڑھ لیجئے فرمان حرف بحرف یا نہیں لیکن اس کا مفہوم یہ تھا کہ جوش ملیح آبادی آج ہندوستان جا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ ہندوستان جا کر وہ اپنے قلم کو ہمارے خلاف استعمال نہ کریں اور اگر معافی پر تیار ہوں تو ہنوز گنجائش باقی ہے میں نے کہا نواب صاحب اعلیٰ حضرت کی خدمت میں میرا شکر یہ عرض کر کے یہ کہہ دیجئے کہ میں ان کی ہدایت پر عمل کروں گا لیکن معافی طلب کرنے پر آمادہ نہیں ہوں نواب ذوالقدر جنگ نے کہا کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سرکار والا کو برا کہیں اور سرکار والا آپ سے معافی طلب کریں اتنے میں ریل ریگنے لگی، میں دوڑ کر سوار ہو گیا سب کو سلام کیا میری محبوبہ ویٹنگ روم سے نکل آئی اس نے آنسو سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ مجھے رخصتی سلام کیا، سلام کر کے لڑکھڑا گئی میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گلے لگایا اور گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔

ہر چند اس عالم پر اب ایک جگ بیت چکا ہے لیکن آج بھی جب کبھی اس کی یاد آ جاتی ہے کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہوں جو لوگ یہ کہتے ہیں قیامت کے دن ایک تنفس بھی زندہ نہیں رہے گا وہ مجھے دیکھیں کہ مجھ پر قیامت گزر چکی ہے اور آج تک زندہ ہوں لیکن ایسی زندگی بھی کس کام کی کہ جیتا جاگتا آدمی اپنے کو ”مرحوم“ لکھنے لگے ہائے وہاں سے کوچ کے وقت زلفوں سے مہکتی اور طلبوں سے گمگمتی سرشار، راتیں، عثمان ساگر کی سہانی صبحیں، پہاڑوں کی رنگین بدلیاں سکندر آباد کی الہیلی شایں اور یاران دکن کی چہکتی صبحیں میرے سامنے کھڑی ماتم کر رہی تھیں معظم جاہ کا دربار آنکھوں میں آنسو بھرے مجھے دیکھ رہا تھا اور کسی کی حریم نازے ہائے کی آوازیں آرہی

تھیں اور اس پر طرہ یہ کہ میں خود اپنے ارادے سے فردوس دکن کو تاج دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے  
وہ اداسی وہ فضائے گریہ سماں ہائے ہائے  
یاں لبوں پر جنبش آہ تک جاں وانصیب  
واں مژدہ میں لرزش اشک گریزاں ہائے ہائے  
یاں کف پا چوم لینے کی بھینچی سی آرزو  
واں بغل گیری کا شرمایا سا ارماں ہائے ہائے  
میں سراپا ساز عشرت اور وقف درد و غم  
تو مجسم ناز کی اور بار حرماں ہائے ہائے  
وہ مرے ہونٹوں میں کچھ کہنے کی حسرت دل شوق  
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے

میں اپنے ڈبے میں سر جھکا کر بیٹھ گیا غم دوراں اور غم جاناں کی پر شور موجوں نے  
میرے تمام وجود کو ڈھانک لیا اور میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے آبائی جائیداد  
نے پکار پکار کر مجھ سے کہا جب تک تین برس کا ٹھیکہ موجود ہے مجھ سے کسی فائدے کی  
امید نہ رکھنا پھر ان احباب کے چہروں پر تصوری نگاہ ڈالی جن کی بارہا عقدہ کشائی کر  
چکا تھا وہ ہچکچاتے نظر آئے اقرباء کا خیال آیا تو دیکھا کہ وہ میری بربادی پر مسکرا رہے  
ہیں اور آخر کار جھانسی تک آتے آتے میں نے یہ بات طے کر لی کہ اپنے قدر شناس  
قاضی سر عزیز الدین کے پاس چلا جاؤں جو دتیا کے وزیر اعظم ہیں۔





## دربدری

جھانسی پہنچ کر میں نے بیوی کو جب اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا اچھا یہ بھی کر کے دیکھ لو، وہ بڑی اداسی کے ساتھ لیچ آباد کی طرف روانہ ہو گئیں اور میں ریاست دیتا جانے کے لئے جھانسی اسٹیشن پر اتر گیا۔

دیتا پہنچ کر قاضی صاحب کو میں نے اپنی ساری داستان سنا دی انہوں نے کہا جوش صاحب آپ شخصی حکومت کا بار اٹھانے کے واسطے بنے ہی نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑا جوہر عطا فرمایا ہے میری رائے ہے کہ آپ آگرے کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کر دیں پرچے کا نام رکھئے ”سلطنت۔۔۔۔۔“ آگرے میں آپ کو رہنے کی دشواری اس لئے نہ ہوگی وہاں آپ کے مانا کا عالی شان محل موجود ہے۔

میں نے کہا قاضی صاحب رائے تو بہت اچھی ہے مگر کس برتے پر اخبار نکالوں انہوں نے جواب دیا کہ آپ ریاست دیتا کے برتے پر اخبار نکالیں سر دست، ریاست آپ کو ساڑھے چار سو فی ہفتہ کے حساب سے سولہ سو روپے ماہانہ دے گی اور سال آئندہ کے بجٹ سے یہ رقم دگنی کر دی جائے گی منظور ہے آپ کو؟ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے ان کی پیش کش فوراً منظور کر لی اس کے بعد انہوں نے کہا آپ اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دیں میں دوسری ریاستوں سے بھی آپ کو امداد دلا دوں گا قاضی صاحب کی اس تجویز سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ اور رات کو مشاغل سے فرصت پا کر سو گیا صبح جب ان کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھا تو انہوں نے کہا جوش صاحب آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہوگی میں نے کہا آپ فرمائیں انہوں نے کہا پروبرٹس (فرنگی حکومت کی حمایت) یہ سنتے ہی میرا چہرہ ملگجاسا ہو کر رہ گیا قاضی بھانپ گئے انہوں نے بڑے ولولے کے ساتھ میز پر گھونسا مار کر کہا جوش صاحب برٹش ایمپائر (سلطنت برطانیہ) ایک نعمت ہے اور بہت بڑی نعمت اگر یہ حکومت خدا نخواستہ

باقی نہ رہی تو میری یہ بات کان کھول کر سن لیجئے کہ ہندو ہم کو کچا چبا ڈالے گا سرکاری نوکری تو بڑی بری چیز ہے وہ ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دے گا، گائیں آپ کی کھیتیاں چر لیں گی، اور آپ گائے پر ہاتھ اٹھائیں گے تو کم سے کم آپ کا ہاتھ توڑ ڈالا جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ قتل بھی کر ڈالے جائیں ہندو آپ کے خون سے ہولی کھیلے گا آپ کے ایم اے لڑکوں پر ہندو میٹرک کو ترجیح دی جائے گی، اور آپ کے خاندانوں کو تہ تیغ کر دیا جائے گا فرمائیے کیا آپ اس پر تیار ہیں؟ میں نے کہا قاضی صاحب آپ میرے بزرگ ہیں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں میں آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا لیکن اس کو کیا کروں کہ مجھ کو انگریزی حکومت سے نفرت ہے میری بات کاٹ کر انہوں نے کہا آپ اپنے دوست جواہر لال کے بہکانے میں آگئے ہیں دیکھئے یہ آپ کی روزی، اور تمام مسلمانوں کی فلاح کا سوال ہے آپ فیصلے میں جلدی نہ کیجئے۔

لیکن جب ان کے بار بار سمجھانے کے بعد بھی میں نے فرنگی کی حمایت پر آمادگی ظاہر نہیں کی تو انہوں نے مایوس ہو کر کہا اگر آپ برٹش حکومت کی مخالفت کریں گے تو مجھے افسوس ہے کہ ریاست آپ کا ہاتھ نہیں بٹا سکے گی اور اگر میں ریاست سے آپ کی امداد کروں گا تو میری پرائم منسٹری ہی ختم ہو جائے گی میں نے کہا قاضی صاحب میں آپ کو آپ کے وعدے سے سبکدوش کرتا ہوں۔

اور رخصت ہوتے ہوئے، میں نے کہا قاضی صاحب میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں آپ نے تو دل سے یہ چاہا تھا کہ میری زندگی سدھر جائے لیکن میرے مزاج کی انقاد نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا آپ نے مجھ پر کرم کرنا چاہا لیکن میں اس کرم کا بار اٹھانے میں سکا خطا آپ کی نہیں میری ہے۔

مہرچہ ہست، از قامت کوتاہ بے ہنگام ماست  
ورنہ تشریف تو بربالائے کس کوتاہ نیست

دھول پور آیا تو دھول پور کے سب سے بڑے جاگیردار، اور اپنے حقیقی ماموں کی حویلی کے عوض اپنے پرانے دوست سردار روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرا۔

میں نے اپنی روداد سنائی اور کہا کہ مہاراجہ کے پاس آیا ہوں شاید وہ کوئی ملازمت دے دیں روپ سنگھ نے کہا مہاراجہ بڑا پانی ہے، مجھے اس سے کوئی امید نہیں جب تک تمہاری کوئی صورت نہ نکلے تم میرے ہی ساتھ رہو لیج آباد جا کر بھابی کو بلالو۔ نواب صاحب (میرے ماموں) کے باڑے کی حویلی میں ان کو ٹھہراؤ جب تک کوئی بندوبست نہ ہو جائے میں پانچ سو روپے ماہانہ تم کو دیتا رہوں گا جب اچھے دن آئیں تو ادا کر دینا۔

میں نے کہا میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ میرے بے کہے تم میری امداد پر آمادہ ہو گئے روپ سنگھ نے میری بات کاٹ کر کہا یہ کون سی انوکھی بات ہے کیا ہم دونوں بہت پرانے دوست نہیں ہیں؟ کیا تم نے، اپنے ماموں پر ترجیح دے کر میرے یہاں قیام نہیں کیا ہے؟ کیا ہم میں کوئی غیریت ہے؟ میں راج پوت ہوں تم پٹھان، تم مسلمان راج پوت ہو، میں ہندو پٹھان۔

میں نے کہا بھائی روپ سنگھ میں سوچ کر جواب دوں گا روپ سنگھ نے کہا سوچ کر جواب دینے والے کی ایسی تہیسی ابھی ابھی جواب دو ورنہ چھاتی پر چڑھ کر گلا دبا دوں گا میں نے ہنس کر کہا ایسی ہول جوں کا ہے کی ذرا سوچ تو لینے دو یہ سنتے ہی روپ سنگھ نے جست لگائی مجھ کو فرش پر گرا دیا میرے سینے پر چڑھ بیٹھے اور زور زور سے میرا گلا دبا دبا کر کہنے لگے منظور ہے کہ نہیں یا مار ڈالوں؟ میں نے کہا منظور منظور اے ظالم منظور میری آنکھوں سے شکرینے کے آنسو بہنے لگے۔ کانوں سے سنتے تھے ورنہ ستانی بستم می رسد، آنکھوں سے دکھا دیا روپ سنگھ نے دوست ہو تو ایسا میں نے تار دے کر بیوی کو دھول پور بلالیا وہ چھوٹے دادا اور سخاوت و ظفر<sup>1</sup> کو ساتھ لے کر آگئیں میں بھی روپ سنگھ کے باڑے سے اٹھ کر ماموں کے باڑے آ گیا اور ان کی خالی حویلی میں رہنے لگا

کئی بار مہاراجہ دھول پور سے ملا، ہر بار انہوں نے ملازمت کا وعدہ کیا لیکن ایفاء کی نوبت نہیں آئی جب اس گولگو میں دو تین مہینے گزر گئے تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

اسی اثناء میں خواب دیکھا کہ مولوی احمد حسین 2 صاحب فرما رہے ہیں کہ مہاراجہ سے کوئی امید نہ رکھئے آپ ایک رند پاک باطن ہیں، وہ بگلا بھگت صبح ایک تار آئے گا اس پر عمل کیجئے گا میں نے بیدار ہوتے ہی روپ سنگھ کو یہ خواب سنا دیا انہوں نے کہا یہ خواب تو ایسا ہے کہ اس کے سچے جھوٹے ہونے کا تو آج ہی پتہ چل جائے گا۔

اس کے کوئی دو گھنٹے کے بعد جب ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر گپ شپ کر رہے تھے کہ مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری آگئے اور مجھ سے کہائیں آپ سے تھکنے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور جب میں ان کو دوسرے کمرے میں لے گیا تو انہوں نے کہا سرکار فرماتے ہیں کہ میرا اور جوش صاحب کا معاملہ تو ایسا ہے جیسا درخت اور چھال کا ہوتا ہے اگر وہ یہاں سے چلے گئے تو میں بے بکل کا درخت ہو جاؤں گا میں جوش صاحب کو ایک اچھا سا عہدہ دینا چاہتا ہوں مگر دو شرطیں ہیں ایک تو کہ وہ شراب ترک کر دیں اور دوسری یہ ہے کہ روپ سنگھ 3 سے ملنا چھوڑ دیں میں نے کہا مہاراجہ سے جا کر کہہ دیجئے کہ انہوں نے میری ذات کے ساتھ جس یگانگی کا اظہار کیا ہے میں اس کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں لیکن اس کے باوجود نہ تو میں شراب ہی ترک کروں گا نہ روپ سنگھ ہی کی محبت سے دست بردار ہوں گا۔

روپ سنگھ پردے کی آڑ سے یہ باتیں سز ہے تھے میرا یہ آخری فقرہ سن کر وہ یہ 1 ایک پردہ وہ دوسرا ملازم 2 آگے ان کا تفصیلی حال آئے گا 3 روپ سنگھ مہاراجہ کے ساتھ کھیلے ہوئے دوستوں میں تھے جو آب معتب ہو چکے تھے۔

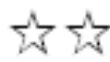
کہتے کمرے میں در آئے کہ سیکرٹری صاحب ٹھہریئے سرکار سے جا کر کہہ دیجئے کہ جوش شراب بھی چھوڑ دیں گے اور روپ سنگھ سے بھی منہ پھیر لیں گے۔ سیکرٹری نے



پوچھا جوش صاحب آپ کیا کہتے ہیں میں نے کہا میں شراب اور روپ سنگھ دونوں کو نہیں چھوڑوں گا مجھے سرکار کی یہ دونوں شرطیں منظور نہیں ہیں روپ سنگھ نے ڈپٹ کر کہا تم کو چھوڑنا پڑے گی یہ دونوں چیزیں میں نے کہا نہیں چھوڑوں گا نہیں چھوڑوں گا نہیں چھوڑوں گا اور اسی شور وغل میں سیکرٹری صاحبہ رے رام ایسی پکی دھن ایسی پکی دوستی کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

سیکرٹری کے چلے جانے کے بعد روپ سنگھ نے انگلی اٹھا کر کہا تم ڈیم فول ہو، سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا میں نے کہا تم ڈیم فول ہو، میں نے سارے بگڑے ہوئے کھیل کو سنوار دیا انہوں نے کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے؟ میں نے کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے؟ انہوں نے کہا میں ہرگز ہرگز اپنی غلطی تسلیم نہیں کروں گا اب میں نے جست کر کے ان کو گرا دیا سینے پر چڑھ بیٹھا، اور ان کا گلا دبا کر کہا تسلیم کرو اپنی غلطی انہوں نے کہا اچھا باوا جان تو چھوڑ دو، میں ہی غلطی پر ہوں میں ان کے سینے سے اتر آیا اور وہ مجھے گلے لگا کر رونے لگے کہ میری خاطر تم نے بہت بڑا ایثار کیا۔

اب ہم پھر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے روپ سنگھ نے کہا تمہارے خواب کا پہلا حصہ تو سچا نکلا کہ مہاراجہ سے قطع تعلق ہو گیا اب اگر تار بھی آ گیا تو پورا خواب سچا ثابت ہو جائے گا۔



## رسالہ ”کلیم“ کا دہلی سے اجراء

دہلی پہنچا تو مسز نائیڈو برس پڑیں کہنے لگیں ذرا اس کا نام تو بتائیے جس نے آپ کو یہ خبر دی تھی کہ سروجنی مر چکی ہے۔۔۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ انہوں نے کہا یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ مجھ کو زندہ سمجھتے تو سیدھے میرے پاس آ کر اپنی پتا کہتے اور میرا جواب سنے بغیر انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر گھوش مجھ کو نہ لکھتے تو مجھے یہ پتا ہی نہ چلتا کہ آپ دھول پور میں اپنے کسی دوست روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں نے معذرت کے واسطے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے کہا میں آپ کے ٹیپرامنٹ سے واقف ہوں کچھ نہ کہئے میری خواب گاہ میں جائیے میرے تنکے کے نیچے ایک بڑا سا لفافہ رکھا ہوا ہے اسے کھولے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیجئے ذرا سنبھال کر رکھئے گا تا کہ گر نہ جائے اب آپ کا یہ کام ہو گا کہ دہلی سے ایک نیم ادبی و نیم سرکاری ماہ نامہ نکالیں گے اور کسی ریاست کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے میں اشتہار بھی دلا دوں گی۔

میں رسالے کا نام ”کاخ بلند“ رکھنا چاہتا تھا میرے دوست ذوالفقار علی صاحب بخاری نے رائے دی کہ میں رسالے کا نام کلیم رکھوں کاخ بلند نام مشکل ہے میں نے یہ رائے مان لی اور رسالے کے اجراء کے ابتدائی مراحل میں سرگرم ہو گیا۔

رسالہ نکالنا ایک تجارتی امر ہے میری سات پشتیں بھی تجارت سے واقف نہ تھیں اس لئے ابتدائی مراحل ہی میں بہت سا روپیہ برباد ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دہلی کے احباب نے مجھے گھیر لیا روز بوتلیں کھانے اور دعوتیں ہونے لگیں اور کاتبوں کاغذ والوں بلاک سازوں اور چھاپہ خانے والوں نے بھی یہ سمجھ کر کہ میں مرا سرلر آدمی ہوں مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی دوسرا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا کہ تمام روپیہ تر بھر ہو گیا شرم آئی کہ مسز نائیڈو سے یہ داستان

کہوں اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے اب کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ بیمار پڑ گیا بخار اس قدر تیز آیا کہ حواس گم ہو گئے اور زلہ اس قدر شدید ہوا کہ تمام سینہ رندھ کر رہ گیا اور سانس بھی رک رک کر آنے لگی اور میں سمجھا کہ اب جان بر نہیں ہو سکوں گا۔

میں اس زمانے میں فتح پوری کے کراؤن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا بڑی مشکل سے ایک پرچہ پر میں نے مسز نائیڈ واور جواہر لال کا نام لکھا اور پرچہ لے کر کراہتا نیچے آیا مینجر کو وہ پرچہ دے کر کہا اگر میں مر جاؤں تو فوراً ان دونوں کو خبر کر دیجئے گا مینجر نے بے حد بد حواس ہو کر مجھ سے کہا جوش صاحب خدا کے واسطے خودکشی نہ کیجئے گا مجھ کو مینجر کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آگئی اور کہا مینجر صاحب میں بزدل نہیں کہ خودکشی کروں میری حالت خراب ہے اس لئے سوچا کہ مسز نائیڈ واور جواہر کو خبر ہو جائے مینجر دوڑا ہوا گیا اور ڈاکٹر سید ناصر عباس صاحب کو جن کا مطب وہاں سے دس قدم پر تھا اپنے ساتھ لے آیا ڈاکٹر صاحب مجھے پہلے سے جانتے تھے میرے سینے کا معائنہ کیا اور مطب جا کر، اپنے آدمی کے ہاتھ دوائیں بھیج دیں۔

دوائیں پی کر ابھی لیٹا ہوا اپنی بے کسی پر غور اور اپنی موت کی آمد کا انتظار کر رہی رہا تھا کہ آہٹ محسوس ہوئی اور پنڈت شیونرائن صاحب (جن کا مطب ہوٹل سے ملا ہوا تھا اور جن کو مطلبی فرید آبادی مجھ سے ملا چکے تھے میرے کمرے میں داخل ہو گئے) میں نے کہا آئیے شیونرائن صاحب افسوس کہ میں اٹھ نہیں سکتا آپ میرے سر ہانے بیٹھ جائیں مزاج پرسی کے بعد انہوں نے کہا جوش صاحب مجھ کو اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ رسالہ نہیں نکال سکتے میں کاروباری آدمی ہوں میرے پاس اپنا ذاتی چھاپہ خانہ بھی ہے اس لئے آپ پسند کریں تو میں آپ کا پچاس فیصد شریک ہو جاؤں۔ قلم آپ کا چلے گا روپیہ میں لگاؤں گا اور جب تک رسالہ چلنے نہ لگے پان سو روپیہ ماہانہ آپ کو بطور پیشگی دیتا رہوں گا میں نے اس تجویز کو لطیفہ غیبی سمجھا اور فوراً قبول کر لیا۔

دو چار دن کے اندر پنڈت شیونرائن نے ہوٹل کے سامنے ہی دو کمروں اور کشادہ

صحن کافلیٹ دفتر اور میری سکونت کے واسطے کرایہ پر لے لیا اور میں ہوٹل سے وہاں اٹھ آیا۔

اس کے کچھ روز کے بعد جب میں نے ان سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو بھی یہاں لے آنا چاہتا ہوں تو انہوں نے قزول باغ میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر اس کو فرنیچر سے آراستہ کر دیا اور میں بیوی کو لے آنے کے لئے دھول پور چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ میری بیٹی بیمار ہے بیوی اس کو آگرے لے کر چلی گئیں اور کسی ہسپتال میں وارڈ لے کر مقیم ہیں اور میرا بیٹا میرے دوست لطیف الدین کے مکان میں رہتا ہے سخاوت اور ظفر و بھاگ چکے ہیں دوسری ہی گاڑی سے گھبرا یا آگرے۔ لطیف کے گھر گیا، دیکھا کہ میرا بیٹا اور اس کا چچا زاد بھائی دونوں ایک نہایت بوسیدہ اور میلی دری پر اداس بیٹھے ہیں میرے بیٹے نے مجھے دیکھا دوڑ کر میرے گلے لگ گیا اور روہانسی آواز میں کہنے لگا ابا ہم یہاں اس دری پر سوتے ہیں ہم کو چار پائیاں بھی نہیں دی گئی ہیں اور ہم روز دس روپے دیتے ہیں تو ہمیں کھانا ملتا ہے اور وہ بھی ابلا سلا جی چاہا چیخیں مار مار کر رونے لگوں لیکن اس خیال سے ضبط کیا کہ میرے پرانے دوست لطیف برامانیس گے غالباً لطیف کی معاشی حالت اس وقت بگڑ چکی تھی۔

لڑکے کو لے کر ہسپتال پہنچا دیکھا بیوی کا منہ اترا ہوا ہے اور بیٹی نڈھال پڑی ہے اس کی چار پائی پر بیٹھ کر میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور آنسو جاری ہو گئے بیٹی بھی رونے لگی بیوی نے آنسو پونچھ کر کہا اللہ کے لئے اس طرح نہ روؤ، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا ارے ہم کیا ہیں بڑی بڑی شہزادیوں پر اس سے بھی برے وقت پڑ چکے ہیں اللہ کا شکر کرو لڑکی کو پلورسی ہو گئی تھی اب اچھی ہو چکی ہے بس طاقت آنے کی دیر ہے۔

میں نے بیوی سے کل حالات بیان کر دیئے انہوں نے کہا بس آٹھ دن کی دیر ہے یہاں ٹھہر جاؤ، پھر ہم سب ساتھ دہلی چلیں گے۔



آٹھویں دن دہلی آگیا، قزول باغ کی کوٹھی آباد ہو گئی۔۔۔۔۔ ”کلیم“ اچھا خاصہ چلنے لگا، معقول آمدنی ہونے لگی، میری نظموں کے دو مجموعے بھی چھپ گئے حیدر آباد سے عثمانی وظیفہ بھی جاری ہو گیا اور زندگی چین سے گزرنے لگی۔

سال دو سال آرام سے گزرنے کے بعد، میری زندگی پھر ایک بحران کی جانب مڑ گئی ایک روز شام کے وقت شیونرائن خشک چہرے کے ساتھ آئے اور کلیم سے اپنی دست برداری کا اعلان کر کے کہہ دیا کہ کل سے آپ اپنا پرچہ خود سنبھالیں۔

یہ سچ ہے کہ شیونرائن صاحب نے اپنے بھائیوں کے دباؤ میں آ کر یہ بات کی تھی، مگر ان کا یہ اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ مجھے کم سے کم تین مہینے کانٹس دیتے، مگر انہوں نے صرف بارہ گھنٹے کانٹس دے کر علیحدگی اختیار کر لی۔۔۔ میں سیدھا اپنے پڑوسی محمود علی خان جامعی کے پاس پہنچا، اور کلیم کا کاروبار ان کے سپرد کر دیا لیکن جب ایک مہینہ کے بعد انہوں نے کلیم کی آمدنی کے صرف نوے روپے میرے حوالے کئے تو میں دنگ ہو کر رہ گیا مگر فرط مروت سے کچھ کہہ نہ سکا (خدا غارت کرے اس مروت کو، اے خدا مروت کو کیا غارت کرے گا، خود مروت نے مجھ کو غارت کر کے رکھ دیا آج بھی غارت کئے ہوئے ہے اور انشاء اللہ مرتے دم تک غارت کرتی رہے گی)

جب اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے مسٹر پانی کار کو خط لکھا اور پانی کار نے تازہ بیج کر مجھ کو پیالہ بلا لیا پیالے پہنچتے ہی انہوں نے مجھے مہاراجہ پیالہ بھوپندر سنگھ سے ملوا کر میرا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اب دہلی آ کر میں نے محمود علی خان سے رسالہ نکال لیا۔ قزول باغ سے دریا گنج اٹھ آیا۔ ایک کوٹھی ادیتہ بھون کرائے پر لے لی ایک لکھے پڑھے ذہین پنجابی نوجوان اور دہلی کے دو تجربہ کار بوڑھوں کو ملازم رکھ کر میں

1 وہ دراسی زبان کے شاعر ادیب اور مہاراجہ پیالہ کے وزراء میں سے تھے جن سے سروجنی نائیڈو ملا چکی تھیں۔

خود رسالہ نکالنے لگا، اور حکیم حضرت آزاد انصاری بھی میرا ہاتھ بٹانے لگے اور

حیرت ہے کہ خود میری بیوی بھی کلیم کے کاروبار میں میری دستگیری کرنے لگیں اور ”کلیم“، ”صوری و معنوی، دونوں حیثیتوں سے دن و رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

میں نے اسی زمانے میں اپنی چچا زاد بہن کے بیٹے التفات احمد خان سے اپنی بیٹی سعیدہ کی بڑی دھوم دھام سے شادی بھی کر دی، میری بیٹی کی شادی کا کھانا پکویا تھا قزول باغ کے عبداللہ صاحب نے اور ایسا اچھا کھانا پکویا تھا کہ باید و شاید خدا جانے عبداللہ صاحب اب کہاں ہیں جہاں کہیں بھی ہوں میری یہ آواز سن لیں کہ میں آج تک ان کو یاد کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ، اس موقع پر میرے جگری دوست سردار دیوان سنگھ مفتون نے جس خلوص کے ساتھ میرا ہاتھ بٹایا تھا میں اسے بھی فراموش نہیں کر سکتا اور دہلی کا تھل کے لالہ شکر لال اور سروجنی نے جو تحائف دیئے تھے میرے دل میں ان کی یاد اور ان کا شکر بھی آج تک شاداب ہے۔

کلیم کی روز افزوں ترقی نے میرے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دیئے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ فرنگی حکومت کی تہذیب، سرمایہ داری کی تدفین، سوشلزم کی تبلیغ اقوال و اوہام کی تضحیک، فکر و تامل کی ترغیب، کانگریس کی تحکیم، اور مسلم لیگ کی تنقیص اس کی پالیسی میں داخل تھی اور اسی بناء پر شاہ فرنگی اور شاہ صاحب دونوں مجھ سے بگڑ گئے تھے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ کانگریس کے غلامی پرست مخالفین مسلم لیگ کے ”خطاب یافتہ مجاہدین“ حکومت کے کفش بردار حکام اور منبر و محراب پر بلبلائے والے سرکاری وظیفہ خوار علمائے کرام لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کراکھاڑے میں اتر آئے تھے۔

ادھر پائیں تھیں اور ادھر میں ایک فرد واحد تھا کہ آواز دے رہا تھا۔

من و گرز و میداں و افراسیاب

1 میں کلیم کے دور آخر میں تحریک پاکستان کا حامی بن گیا تھا اور پاکستان کی حمایت

میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے سامنے گنگا پرشاد میموریل ہال کی چھت کے نیچے

ایک ایسی گھن گرج انظم پڑھی تھی کہ ہال گونجنے لگا تھا اور میرے سینکڑوں کانگریسی دوستوں کو مجھ سے بے حد شکایت پیدا ہو گئی تھی (وہ انظم میرے کسی مجموعے میں شائع بھی ہو چکی ہے)

آئے دن میرے خلاف کفر کے فتوے اُٹا کرتے اور قتل کی دھمکیوں کے گم نام خط آیا کرتے تھے خفیہ پولیس سائے کی مانند میرا تعاقب کرتی تھی اور بیوی چلاتی رہتی تھیں کہ ارے منہ اندھیرے ٹہلنا چھوڑ دو، نہ جانے اندھیرے میں کون پیچھے سے آکر چھری مار دے لیکن میں ہر روز تاروں کی چھاؤں میں ایک زبردست تنبیہ الغافلین قسم کا ڈنڈا لے کر جمنائے کنارے بڑے اطمینان کے ساتھ ٹہلا کرتا تھا کہ آخر میں بھی آفریدی پٹھان ہوں دو چار کو مار کر مروں گا۔

اے نہ من باشم کہ روز جنگ، بنی پشت من  
اے منم، کاند رمیان خاک و خوں بنی سرم  
اس کلیمہ دور میں ایک بارسر تاج بہادر سپرو صاحب نے مجھ سے کہا جوش صاحب اگر آپ برٹش ایمپائر کی موافقت میں اور سوشلزم کے خلاف نظمیں کہنا اور مضامین لکھنا شروع کر دیں تو تھوڑی ہی مدت میں لکھ پتی بن سکتے اور حکومت سے خطاب حاصل کر سکتے ہیں بڑے بڑے والیان ریاست آپ کی شاعری کے رومانٹک اور نیچرل سینرینز کے حصوں کو بہت پسند کرتے ہیں اگر آپ اپنی یہ روش بدل دیں تو ریاستوں سے بھی آپ کی لٹریچر پشنیں مقرر ہو سکتی ہیں۔

میں نے کہا سپرو صاحب آپ میرے باپ کے احباب میں سے ہیں میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں لیکن آپ برا نہ مانیں تو اتنا عرض کروں کہ شاعری ایک خالص وجدانی معاملہ ہے جس کو جلب منفعت کا ذریعہ بنانا گناہ ہے اس لئے مجھ کو یہ امر اپیل نہیں کرتا کہ اگر میں حکومت یا امراء کی تعریف کروں گا تو دولت مند ہو جاؤں گا۔ شاعری کو جانچنا چاہئے اس کے مفید یا مضر اثرات کی روشنی میں۔۔۔۔۔ اور اگر محکم

دلائل کے ساتھ آپ اس امر کو ثابت فرما دیں کہ ہندوستان کے واسطے انگریز کی حکومت، اور والیان ریاست کی ہستی مفید اور بابرکت ہے تو میں اپنی روش ترک کر دوں گا۔

یہ سن کر سپرو کے چہرے پر ندامت کے ساتھ ساتھ غیظ کے ہلکے ہلکے آثار پیدا ہو گئے اور انہوں نے اپنے تلخ لہجے میں ملائم تبہم کی پھیکی سے شیرینی پیدا کر کے مجھ سے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ پھر آپ حیدر آباد اور پٹیالے سے وظائف کیوں لیتے ہیں؟۔۔۔۔۔ میں نے کہا سپرو صاحب غالباً آپ کا یہ خیال ہے کہ میں منکر مے بودن وہم رنگ مستان زیستن پر عمل پیرا ہوں مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے یہ سوال کر کے مجھے اس کا موقع دے دیا کہ میں اپنی پوزیشن صاف کر دوں پہلی بات یہ عرض کرتا ہوں کہ ان والیان ریاست کے پاس جو دولت ہے وہ ان کی نہیں، بلکہ عوام کی ہے اس لئے کہ وہ ہماری محنت کی پیدا کردہ اور انسان کے ضائع شدہ حقوق کا نتیجہ ہے اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم قوت استعمال کر کے، ان کی دولت چھین لیں اور اس کا عامۃ الناس میں تقسیم کر دیں اور جب تک وہ قوت حاصل نہ ہو ہم کو چاہئے کہ ان کی دولت سے تمتع کی سعی کرتے رہیں۔

اگر ہم اپنے اصول قربان کئے بغیر، ان سے ایک روپیہ بھی وصول کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ان کو بقدر یک روپیہ کم زور کر دیا، اور اپنے کو بقدر یک روپیہ قوی بنالیا۔۔۔۔۔ اور وہ ایک روپیہ جو مسخروں اور بھانڈوں بھگتیوں پر ضائع ہو جاتا، اپنے مصرف میں لا کر ہم نے اس سے بہتر کام لیا۔

یہ تو مختصر سا اصولی جواب ہے اب میری دونوں پنشنوں کی روداد سن لیجئے۔۔۔۔۔ جہاں تک میری حیدر آباد کی پنشن کا تعلق ہے وہ پنشن عثمانی پنشن ہے میں نے نظام کے خلاف نظم کہی، معتبوب ہوا اور حسب روایت خاندان آصفیہ پنشن کا مستحق ٹھہرا دیا گیا اور اب تک سرتابی کی داد حاصل کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ اب رہا

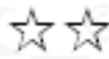


پٹیا لے کی پنشن کا معاملہ تو میری وہ پنشن سیاسی نہیں خالص ادبی ہے آج تک مہاراجہ نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں فرنگی کے خلاف شعر کہنا یا کھدر پنا ترک کروں اگر مہاراجہ کی پنشن مجھے میرے اصول سے منحرف کر دیتی تو مجھ سے زیادہ ذلیل اور کون ہو سکتا تھا لیکن اس عالم میں کہ وہ پنشن قطعی طور پر غیر مشروط ہے میں اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔

میری یہ باتیں سن کر سپرو خاموش ہو گئے لیکن چہرے پر تکدر کی شکنیں ابھر آئیں اور ان کے چشم و ابرو سے یہ بات ٹپکنے لگی گویا میں نے براہ راست ان کی اہانت کر دی ہے۔

وہ تاحیات مجھ سے روٹھے رہے سچ کہا ہے صائب نے:

گفتار صدق مایہ آزار می شود  
چوں حرف حلق بلند شد دوا می شود



## سیاست افرنگ کے دورخ

ساڑھے تین یا چار برس تک اپنے ماہ نامہ ”کلیم“ کو کامیابی سے چلا کر اور ایک ایسے رومانی عذاب میں گرفتار ہو کر جس نے میرے حواس چھین لئے تھے میں وہلی کی زندگی تج کرلیج آباد 1 چلا گیا۔ اور چوں کہ میں رسالے کے کام کا نہیں رہا تھا، میں نے اپنے داماد التفات احمد کو مینجر بنا دیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ نام خدا بالکل نکھٹو ہیں، میں نے ”کلیم“ بند کر کے مجاز، علی سردار، اور سبط حسن کی درخواست پر اس کو ان لوگوں کے رسالہ ”نیا ادب“ میں ضم کر دیا جو ”کلیم دنیا ادب“ کے از روئے قواعد غلط نام کے ساتھ لکھنؤ سے جاری ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے یلیح آباد آ کر چھ سات مہینے کے بعد میرے دل کا زخم بڑی حد تک مندمل ہو گیا۔ اور میں ”قصر سحر“ کی چمن بندی، اور توسیع میں لگ گیا۔

ارے میں ادب نقیب، کشتہ التفات حبیب، اور باغوں کی تنصیب۔۔۔۔۔

لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔۔۔۔۔ بیوی تل گئیں آموں کے باغ لگوانے پر اور ایسی تل  
نہیں کہ کھانا پینا دو بھر کر دیا۔ ہر آن یہ رٹ لگ گئی کہ باغ لگاؤ، اور جب تک باغوں  
میں قلم نہ لگ جائیں قلم نہ اٹھاؤ۔ میں نے اسی زمانے میں ایک طویل ڈرامائی نظم ”  
حرف آخر“ شروع کی تھی انہوں نے وہ نظم بھی نہیں کہنے دی۔ ۷

1۔ غالباً 1940ء میں 2 اور آج تک وہ نظم ناتمام پڑی ہوئی ہے نہ جانے اس کو تمام بھی کرسکوں گا یا ناتمام ہی چھوڑ کر سدھار جاؤں گا۔

تنگ آکر میں نے ماتا دین پٹواری کو بلایا پٹواری نے کہا مجھے بھیا 1 اب قانون بدل گیا ہے آپ کسی کاشتکار کو بے دخل کر کے اس سے زمین نہیں نکال سکتے اور جب زمین ہی نہیں نکل سکے گی تو باغ کیسے لگے گا۔

ماتا دین کی یہ بات سن کر میں باغ باغ ہو گیا کہ چلو ایک بڑی مصیبت کٹ گئی میں

خوشی خوشی بیوی کے پاس گیا اور جھوٹ موٹ کا غمگین چہرہ بنا کر پٹواری کی بات دہرا دی لیکن بیوی مایوس نہیں ہوئیں مجھے اور پٹواری کو ساتھ لے کر گاؤں گئیں، تھانے کے سامنے کاشتکاروں کو جمع کر کے، پٹواری سے کہا پوچھو کاشتکاروں سے کہ منجھلے بھیا 1 نے کیا تم پر کوئی ظلم ڈھایا ہے؟ تم پر لگان وصول کرنے میں کبھی سختی کی ہے تم سے کبھی بیگار لیا ہے اور جب ماتا دین نے یہ تمام سوالات کئے تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں ناہیں، ناہیں کھونا ہیں (نہیں نہیں کبھی نہیں) منجھلے بھیا کی جی منجھلے بھیا کا راج بنا رہے گنگا دھارتک (جب تک گنگا میں پانی ہے) پھر بیوی نے کہا ماتا دین سے پوچھو اگر بھیا باغ لگانے کے لئے تم لوگوں سے تھوڑی تھوڑی زمین مانگیں تو کیا تم نہیں دو گے؟ ساری رعایا نے یک زبان ہو کر کہا ”دیبا، دیبا، ابھوں ابھوں دیبا، گلے گلے دیبا (دیں گے، دیں گے، ابھی ابھی دیں گے، گلے گلے دیں گے)“

اس کے بعد ماتا دین نے استغنے نکالے اور کاشتکاروں نے دھڑا دھڑا انگوٹھے لگانا شروع کر دیئے اور جب تمام استغنے مکمل ہو گئے بیوی نے مجھ سے کہا اب تم ان کا شکریہ ادا کرو اور جب میں شکریہ ادا کرنے کھڑا ہوا تو تمام کاشتکاروں نے لگے بھیا، ہم تو تمہاری ”نہی“ ہیں اس نہ کرو بھیا ہم تو تمہاری جوتی ہیں ایسا نہ کرو۔

بیوی نے مٹھائی تقسیم کی، رعایا نے منجھلے بھیا کی جے کے نعرے لگائے اور دو تین مہینے کے اندر آم کے باغ نصیب ہو گئے اور بیوی نہال ہو گئیں۔

میں غالباً 1941ء میں پھر لکھنؤ آ کر رہنے لگا یہ سچ ہے کہ یلح آباد میں بے حد سکون تھا امانی گنج کے میدان کی خالص ہوائیں تھیں، طلوع و غروب کے مناظر تھے۔

1 پہلے بھیا تھا اب بوڑھا کھوسٹ ہوں

بوری خوشبو، کوئل کی کوکو اور پیسے کی پی ہو تھی اور لکھنے پڑھنے کی فرصت۔

لیکن آدمی، مدنی حیوان ہے شام کو جب لکھنے پڑھنے کے حج اکبر سے فارغ ہو کر بادہ خواری کی عبادت شروع کرتا تھا تو شدید تنہائی کے سوا کسی کو شریک نہیں پاتا تھا اور

دوستوں کو آنکھیں ڈھونڈنے لگتی تھیں اور چونکہ۔

زائد کی نماز ہو کہ مے کش کی شراب  
دونوں کا مزا ہے با جماعت ساقی  
اپنی تنہائی پر دل اداس ہو کر رہ جاتا۔

ایک روز اس گھٹن میں پی رہا تھا کہ دل ڈوبنے لگا، یاروں کے چہرے، اور دل  
داروں کے مکھڑے آنکھوں کے نیچے پھرنے لگے رباعی کا ایک مصرع زبان پر جاری  
ہو گیا۔

افسوس، شراب پی رہا ہوں تنہا  
جی میں آیا کہ قافیے کو ’ن‘ کی شرط پر لگا کر کہوں ن کی شرط لگا کر ’تنہا‘ کا ’نباہ‘  
بڑا ہی مشکل نظر آیا بہر حال طبیعت پر زور ڈال کر رباعی کہہ ڈالی آپ بھی سن لیں اور  
میری جگر کاوی کی داد دیں۔

افسوس، شراب پی رہا ہوں تنہا  
غلاں سب، تمام خون فن ہا  
ٹھٹھری ہوئی، ساغر میں نظر آتی ہے  
صہبا۔۔۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ملیح آباد کی بے احباب شاموں سے تنگ آ کر، میں لکھنؤ  
چلا گیا تھا اور لگے ہاتھوں اگر یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو میری گھٹن کا پورا اندازہ ہو جائے گا  
کہ اکثر ایسی بھیا نک شائیں بھی گزرتی تھیں کہ میرے اقرباء مجھے گھیر لیا کرتے، اپنے  
دیوانی فوجداری مقدمات کے روح فرساتہ کرے چھیڑ دیتے۔ فوجداری کے وقت،  
دشمن کے حملے کو خالی دے جانے اور اس پر کاری ضرب لگانے کے گر، اور کالے  
ساپوں سے بچنے کے پینترے بتایا کرتے تھے۔

ایک روز جب میں اپنی بناری باغ کے پھانک کے سامنے والی کوٹھی میں بیٹھا لکھنؤ



کے گورنر کی تقریر ریڈیو پر سن رہا تھا جس میں اہل ہند سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انسانیت کے مستقبل کو بچانے کی خاطر، جنگ عظیم میں، برطانیہ کی مدد پر کمر بستہ ہو جائیں، اس وقت میں نے یہ مندرجہ ذیل نظم ایسٹ 1 انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کے نام سے پندرہ منٹ کے اندر کہہ ڈالی تھی۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرو  
دہر میں، انسانیت کے نام کو اونچا کرو  
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے، بھیڑیا  
بھیڑیے کو مارو گولی، پئے امن و بقا  
باغ انسانی میں، چلنے ہی پہ ہے باد خزاں  
آدمیت لے رہی ہے، ہچکیوں پہ ہچکیاں  
بات ہے ہٹلر کا، رخس خود سری کی باگ پر  
تیغ کا پانی چھڑک دو، جرمنی کی آگ پر

2

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری، اور یہ ذکر!!  
نوع انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر!!  
جب، یہاں آئے تھے تم، سوداگری کے واسطے  
نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے  
1 یہ نظم چونکہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں کہی گئی تھی اس لئے اس میں شاعرانہ  
محاسن کی تلاش نہ کیجئے اور چونکہ یہ نظم ضبط ہو جانے کی بناء پر میرے کسی مجموعے میں  
شامل نہیں ہو سکی ہے اس لئے اس کو یہاں درج کر رہا ہوں تاکہ محفوظ ہو جائے۔  
ہندیوں کے جسم میں، کیا، روح آزادی نہ تھی؟  
سچ بتاؤ، کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

اپنے ظلم بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟  
 کمپنی کا بھی وہ دور مجرمانہ یاد ہے؟  
 لوٹتے پھرتے تھے تم جب کارواں در کارواں  
 سر برہنہ پھر رہی تھی دولت ہندوستان  
 دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم!  
 سرد لاشوں سے، گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم!  
 صنعت ہندوستان پر، موت تھی چھائی ہوئی  
 موت بھی کیسی۔۔۔ تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

اللہ اللہ، کس قدر انصاف کے طالب ہو آج  
 میر 1 جعفر کی قسم، کیا دشمن حق تھا سراج 2  
 وہ اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟  
 یاد ہے، جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟  
 ہجرت سلطان دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟  
 شیر دل ٹیپو کی خونیں داستان بھی یاد ہے؟  
 تیسرے فاتے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے  
 کن کے سر 3 لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے

1 ہندوستان کا روسیہ غدار (ایسے غداروں کی ہندوستان میں کبھی کمی نہیں رہی)

2 نواب سراج الدولہ بہادر (جو ہندوستان کا سپوت تھا)

3 خونی دروازے میں شہزادوں کے سر کاٹ کر، ان کے باپ حضرت ظفر کے

سامنے خوان میں رکھ کر لائے گئے تھے۔

یاد تو ہو گی، وہ مٹیا 1 برج کی بھی داستان؟  
 اب بھی، جس کی خاک سے رہ رہ کے اٹھتا ہے دھواں  
 تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہو گا بارہا؟  
 آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا 2  
 سچ کہو، کیا حافظے میں ہے، وہ ظلم بے پناہ  
 آج تک رنگون 3 میں، اک قبر ہے جس کی گواہ  
 ذہن میں ہو گا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی  
 یاد تو ہو گا تمہیں جلیان 2 والا باغ بھی؟  
 پوچھ لو، اس سے، تمہارا نام کیوں تابندہ ہے  
 ڈایر گرگ وہن آلود، اب بھی زندہ ہے  
 وہ بھگت سنگھ، اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے  
 اس کی گردن میں جو ڈالا تھا، وہ پھندا یاد ہے  
 ہند کے رہ بر، رہا کرتے تھے، کس نہجار سے  
 پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے  
 اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا  
 آج بھی گونجی ہوئی ہے، جن میں کوڑوں کی صدا

5

آج کشتی، خلق کے امواج پر، کھیتے ہو کیوں؟  
 سخت حیراں ہوں کہ اب تم درس حق دیتے ہو کیوں؟  
 1 کلکتے کی وہ عمارت جس میں حضرت واجد علی شاہ کو قید کیا گیا تھا 2 حضرت واجد  
 علی شاہ کا تخلص۔

1 حضرت ظفر کو رنگون میں قید اور دفن کیا گیا تھا 2 پنجاب کا ایک باغ جہاں شمرخو

جرنل ڈائر نے صدہا مجبان وطن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اہل قوت دام حق میں تو کبھی آتے نہیں!  
آدمیت کو، کبھی خاطر ہی میں لاتے نہیں!

6

لیکن، آج، اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم!  
ہو نہ ہو اپنے میں، اب قوت نہیں پاتے ہو تم!  
اہل حق روشن نظر ہیں۔۔۔۔۔ اہل باطل کور ہیں  
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کم زور ہیں  
آج، شاہد، منزل قوت میں تم رہتے نہیں؟  
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں؟  
کیا کہا؟ انصاف ہے انساں کا فرض اولیں!  
کیا قتال و ظلم کا، اب تم میں کس باقی نہیں؟

7

دیر سے بیٹھے ہو، نخل راستی کی چھاؤں میں  
کیا، خدا ناکردہ، کچھ موج آ گئی ہے پاؤں میں  
گونج ناپوں کی، نہ آبادی، نہ ویرانے میں ہے  
خیر تو ہے۔۔۔۔۔ اسپ تازی، کیا شفاخانے میں ہے  
آج کل تو ہر نظر میں، رحم کا انداز ہے  
کچھ طبیعت، کیا نصیب دشمنان ناساز ہے  
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے!  
نوع انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے!  
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے



لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

6

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین  
کل، یزید دُشمن تھے، اور آج بنتے ہو حسین  
خیر، اے سوداگر، اب ہے تو بس اس بات میں  
وقت کے فرمان کے آگے، جھکا دو گردنیں  
اک کہانی۔۔۔ وقت لکھے گا، نئے مضمون کی  
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی  
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں  
موت ٹل سکتی ہے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں

☆☆☆☆☆

اس انظم کا چھپنا تھا کہ آگ لگ گئی، طلاب اور علمۃ الناس جلوس بنا بنا کر نکلنے اور  
اسے گلی گلی گاتے پھرنے لگے، آگے آگے وہ لوگ ہوتے تھے، اور پیچھے پیچھے پولیس 1  
میری یہ انظم جب برلن ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوئی تو میری شدید نگرانی ہونے لگی،  
اور میری کوٹھی سے ملی ہوئی دوسری کوٹھی میں، ایک سی آئی ڈی انسپکٹر صاحب میری شبانہ  
روز نگرانی کے واسطے آکر رہنے لگے ایک دن سہ پہر کے وقت پولیس نے میری کوٹھی پر  
دھاوا بول دیا اور ایک ہندو انسپکٹر کی سرکردگی میں دس پندرہ کانٹیلبل آدھمکے میری خانہ  
تلاشی کے لئے اور کھڑے ہو گئے برآمدے میں اور انسپکٹر صاحب کمرے میں آگئے۔  
انسپکٹر سے میں نے کہا جناب میرا گھر کھلا ہوا ہے، آپ شوق سے ایک ایک گوشہ  
چھان ڈالیں، اس پر انسپکٹر نے سرگوشی کے انداز میں کہا میں آپ کو ایسی عمدہ انظم کی  
مبارکباد دیتا ہوں میں آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لوں گا صرف ضابطہ کی خانہ پری کر

کے چلا جاؤں گا میں نے کہا پولیس میں رہ کر آپ اس قدر شریف ہیں، بڑے تعجب کی بات ہے، اس نے کہا، میں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے مجبوراً نوکری کرتا ہوں، مگر میں نے

1۔ جن لوگوں نے یہ نظم پڑھی وہ گرفتار کر لئے گئے، لیکن مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا اسی زمانے میں سنا تھا کہ تیج بہادر سپرو نے یہ کہہ کر میری گرفتاری رکوا دی تھی کہ اگر میری پکڑ دھکڑ ہوگئی تو میں سیاست کے میدان کا عملی آدمی بن کر بہت خطرناک ہو جاؤں گا معلوم نہیں یہ خبر جھوٹ تھی یا سچ، مگر یہ واقعہ ہے کہ میری گرفتاری عمل میں نہیں آئی یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی قوم کی شرافت نے میری گرفتاری کی اجازت نہ دی ہو انگریز مہبان وطن کی دل ہی دل میں قدر کرتا تھا یہ اور بات ہے کہ بحکم سیاست اس کو سختی اختیار کرنا پڑتی تھی حکمران کی حیثیت سے انگریز کمینہ، لیکن من حیث القوم شریف تھا اور اس کے سینہ میں اس قدر چوڑائی تھی کہ اپنے خلاف بات سن کر مشتعل نہیں ہو جاتا تھا۔۔۔ لیکن میری قوم چونکہ ذہنی اعتبار سے ایک چھوٹی قوم ہے یہ اپنے خلاف آواز سن کر تاپیں مارنے لگتی اور کف دروہان ہو جاتی ہے۔

کسی انگریز فلسفی نے لکھا تھا کہ دو ڈھائی سو سال کی ذہنی ورزش کے بعد ہم نے اس اعلیٰ شرف کو پایا ہے کہ جب کوئی ہم کو برا کہتا ہے تو ہم برا نہیں مانتے، ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں کہ وہ برائی ہم میں ہے کہ نہیں ہوتی ہے تو ہم اس کو دور کرنے کی سعی کرتے ہیں نہیں ہوتی تو ہم اپنے برا کہنے والے کو سمجھانے کی تو ضرور کوشش کرتے ہیں لیکن اس کی عداوت کو دل میں جگہ نہیں دیتے۔

ضمیر نہیں بچا ہے میرا دل آپ لوگوں کے ساتھ ہے یہ کہہ کر وہ ایک میز پر، سر جھکا کر ضابطے کی خانہ پری کے واسطے کچھ لکھنے لگا، انسپٹر کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل صاحب نے میری ٹائم پیس اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی، چوری انہوں نے کی، میں نے شرمناک سر جھکا لیا۔

اور جب ضابطہ کی کارروائی مکمل کر کے وہ انسپکٹر صاحب رخصت ہونے لگے، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، اور ہندو کی شرافت اور مسلمان کی کمینگی دیکھ کر، مجھ کو دانتوں پسینہ آ گیا۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی  
بدی کرتا ہے دشمن، اور ہم شرمائے جاتے ہیں  
اس کے بعد میں نے اس واقعے پر ایک نظم کہہ کر چھپوادی<sup>1</sup> جو چھپتے ہی ضبط کر لی  
گئی چونکہ وہ نظم بھی میرے کسی مجموعے میں طبع نہیں ہوئی ہے اس لئے اسے بھی نقل  
کئے دیتا ہوں کہ محفوظ رہے،

جس سے امیدوں میں بجلی، آگ ارمانوں میں ہے  
اے حکومت کیا وہ شے اس میز کے خانوں میں ہے؟  
بند پانی میں سفیدے کھے رہی ہے کس لئے  
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لئے؟  
گھر میں، درویشوں کے، کیا رکھا ہوا ہے بد نہاد  
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد  
جس کے اندر، دہشتیں، پر ہول طوفانوں کی ہیں  
جس میں غلطاں آندھیاں، اندھے بیابانوں کی ہیں  
جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمن ہندوستان  
شیر، جس میں ہونکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں  
چھوٹی ہیں، جس سے نبضیں افسرو اورنگ کی  
جس میں ہے گونجی ہوئی آواز طفل جنگ کی  
جس کے اندر آگ ہے، دنیا پہ چھا جائے وہ آگ  
خامہ دوزخ کو، پسینہ جس سے آ جائے وہ آگ

1 میں ان ہیڈ کانسٹیبل صاحب سے بخوبی واقف تھا۔ ہزاروں بار میں نے مجالس عزائمیں انہیں چنیں مار مار کر روتے اور ماتم کرتے دیکھا تھا، وہ حسین کے محبت یعنی حق کے پرستار تھے اور اس کے باوجود ان کو میری گھڑی چراتے وقت شرم نہیں آئی 2 فرنگی کے دور میں اس کی حکومت کے خلاف نظمیں اور مضامین چھپ سکتے تھے اور اخباروں کی ضمانتیں بالعموم ضبط نہیں ہوا کرتی تھیں۔

موت جس میں دیکھتے ہے منہ، اس آنے کو دیکھ  
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ  
اس واقع کے بعد میں نے آغا صاحب کے امام باڑے میں ایک مسدس پڑھا  
”حسین اور انقلاب“ کے نام سے

”حسین اور انقلاب“ سننے کے لئے پورا ادبی لکھنو ٹوٹ پڑا تھا۔ امام باڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی، لکھنو کے تمام شعراء، تمام اساتذہ، یہاں تک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں اہل سنت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے۔

چونکہ اس مسدس میں آہ و فغاں پر زور دینے کے بدلے، ایثار اور کردار حسین پر عمل کرنے کی بالکل پہلی بار ترغیب دی گئی تھی اس لئے ارباب مجلس نے بالعموم اور اعیان سیاست نے بالخصوص، بار بار کھڑے ہو کر اس جوش و خروش سے داد دی تھی کہ ان کی آوازوں کے تھیٹروں سے منبر میں جنبش پیدا ہو گئی تھی۔۔۔۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے اپنے گریبان پھاڑ کر میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔

حکومت نے کان تک یہ غلغلہ پہنچا تو اس نے ”شیعہ خان صاحبوں“ خان بہادروں اور ”سروں“ کو طلب کر کے یہ ہدایت کی کہ وہ کوئی ایسی تدبیر نکالیں کہ اس مسدس کا اثر

1 یوں تو میرے دل میں یہ بات مدتوں سے کھٹکتی رہتی تھی کہ حسینیت کی سی دولت



کے علمبردار، شہادت حسین پر تو آنسو بہاتے لیکن عزیمت حسین سے جی چراتے ہیں اور یہ انوکھی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کربلا کا داور محشر یعنی حسین اعظم کا سا غیور سورما جس قوم کا ہیرو ہو وہ قوم باطل پرستی و بزدلی کا صید زبوں کیونکر بن گئی اور اس نے اس ننگ کے برداشت کر لینے پر اپنے کو کس طرح آمادہ کر لیا کہ وہ باطل بنیاد فرنگی کے آگے سر بسجود ہو جائے۔

لیکن مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں میرے اس شعلے کو ایک آنی سی ایس مستشرق انگریز نے، جو بورڈ آف ریونیو کا صدر تھا شعلہ جو آله میں تبدیل کر کے ”حسین و انقلاب“ کہنے پر مجھ کو آمادہ کر دیا تھا اور آپ بھی سن لیں کہ محرم کی پہلی تاریخ کو جب میں اس سے ملنے گیا تھا تو اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تاریخ اسلام میں حسین ایک ایسا منارہ حق ہے کہ اگر ہندوستان کے صرف مٹھی بھر شیعہ اپنے ہیرو کی اسپرٹ کو جذب کر کے اس کے راستے پر گامزن ہو جائیں تو ہماری برٹش حکومت کا ایوان پاش پاش ہو کر رہ جائے۔

زائل ہو جائے، اپنے آقا کا حکم سن کر انہوں نے مشورہ کیا اور مشورے کے بعد وہ تمام حسین کے پرستار، یزید کی حمایت پر تیار ہو کر، لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد سید ناصر حسین قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے یہ کہا کہ ارباب مجلس نے بالعموم اور بانی مجلس، حکیم صاحب عالم صاحب نے بالخصوص ہمارے دین کی زبردست توہین کی ہے اور منبر حسین پر جوش صاحب کے سے علانیہ بادہ خوار کو بٹھا کر، منبر کی تذلیل کا بھی ارتکاب کیا ہے اس لئے آپ اس مجلس کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیں۔

قبلہ و کعبہ نے مجھے بلا بھیجا، مجھے دیکھتے ہی ان تمام سرکار پرستوں کے چہروں پر حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔۔۔۔ اور چائے نوشی کے بعد قبلہ و کعبہ نے اپنے بائیں طرف مصلا بچھوا کر، جب مجھ سے یہ ارشاد فرمایا کہ جوش صاحب زحمت نہ ہو تو آپ میرے مصلے پر بیٹھ کر اپنا وہ مسدس سنا دیں، جو آپ نے آغانی صاحب کے امام

باڑے میں پڑھا تھا تو حکومت کے ایجنٹوں کی صفوں میں ایک کھلبلی اور بوکھلاہٹ پیدا ہو گئی اور جب میں قبلہ و کعبہ کے نعرہ ہائے تحسین کی گونج میں وہ مسدس پڑھ کر اپنی جگہ واپس آ گیا تو انہوں نے سرکار پرستوں کی ٹولی کی طرف دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات نے یہ حدیث مبارک کہ لا تقرب الصلوٰۃ آنتم سکا راتو ضرور سنی ہوگی جس کے یہ معنی ہیں کہ جب تم سگر میں ہو تو نماز کے قریب نہ پھنکو، اور اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ پینے والوں کو، ہوش کے عالم میں نماز پڑھنے سے روکا نہیں گیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص نشے کے عالم میں نہیں ہے تو وہ منبر حسین پر بھی بیٹھ سکتا، اور مسجد میں داخل ہو کر نماز بھی پڑھ سکتا ہے۔

یہ سنتے ہی سرکار پرستوں کا رنگ فق ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ دراصل معاملہ کیا تھا، میرے اس مسدس کا انگریزی میں ترجمہ ہو کر جب مسٹر مارش 1 مشیر گورنر 1 مسٹر مارش میرے باپ کے دوست مجرموں کے دشمن، بے آسرا لوگوں کے مددگار، اور اپنی آدھی تنخواہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اگر حکومت مسٹر مارش کے سے شریف حکام سے کام لیتی تو ابھی سو برس اور حکومت کر سکتی تھی۔

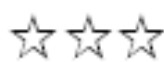
کے ملاحظہ سے گزرا تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا بڑی شفقت سے پیش آئے اور کہا اس سے پیشتر جب میں نے آپ کی انظم ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کا ترجمہ پڑھا تھا میری آنکھیں شرم سے جھک گئی تھیں اور اب جب میں نے آپ کی انظم حسین اور انقلاب کا ترجمہ پڑھا تو میں نے آپ کے باب میں یہ رائے قائم کی کہ آپ حق کے پرستار، اور باطل کے دشمن ہیں۔۔۔۔ اور اب میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا مسولینی اور ہٹلر، دونوں اس وقت یزید کا پارٹ کر رہے ہیں کہ نہیں اور جب میں نے کہا بیشک آپ سچ کہہ رہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے دوسرا سوال کیا کہ اگر میں آپ سے یہ درخواست کروں کہ آپ عصر نو کے ان زندہ یزیدوں کے خلاف آل انڈیا ریڈیو سے ہر ہفتے ایک انظم براڈ کاسٹ کرتے رہیں جس کے معاوضے میں

یوپی حکومت آپ کو آٹھ سو ماہانہ آنریریم دیا کرے گی، تو کیا آپ اس آفر (پیش کش) کو قبول نہیں کر لیں گے؟

یہ سن کر میں نے سر جھکا لیا انہوں نے پوچھا کیا بات ہے یہ ”آفر“ تو آپ کی افتاد مزاج سے ہم آہنگ ہے میں نے کہا مسٹر مارش میں دو وجوہ کی بنا پر آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں ایک تو آپ میرے مرحوم باپ کے دوست اور دوسرے آپ غریبوں کے بہت بڑے سرپرست ہیں میں کسی آنریریم کے بغیر آپ کے ارشاد کو مان لیتا مگر کیا کروں اپنے اصول سے مجبور ہوں کانگریس نے اس جنگ میں آپ کا ہاتھ بٹانے کی جو شرطیں پیش کی تھیں آپ کی حکومت نے انہیں نہیں مانا مارش نے میری بات کاٹ کر کہا میں آپ سے حکومت کے تعاون کی درخواست نہیں کر رہا ہوں میں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ آپ فقط مسو لینی اور ہٹلر کو بے نقاب کرتے رہیں میں نے کہا اگر میں ایسا کروں گا تو اس کا جو گرانڈ ٹوٹل نکلے گا وہ بالواسطہ آپ کی حکومت کی موافقت پر مشتمل ہوگا۔

مارش یہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے تو خاموش ہو گئے پھر اپنی عینک کی تال صاف کر کے وہ بڑے ولولے کے ساتھ کھڑے ہو گئے میں سمجھا وہ مجھ پر حملہ کریں گے میں بھی جوابی حملے کے واسطے کھڑا ہو گیا۔

لیکن وہ میرے قریب آئے اور میری پیٹ ٹھونک کر کہنے لگے ”ونڈر فل ینگ مین“ (حیرت ناک جوان آدمی) آپ کے انکار نے میرے دل میں آپ کی عزت قائم کر دی، آپ اپنے باپ کی مانند بڑے آدمی ہیں آپ کو دیکھ کر میں نے اپنی اس رائے میں تبدیلی کر دی ہے کہ ہندوستان کی زمین کریکٹر پیدا نہیں کرتی اگر آپ کو کبھی میری ضرورت پڑے یاد کر لیجئے گا یہ کہہ کر وہ مجھے رخصت کرنے پر آمادے تک آئے اور برابر مسکراتے رہے۔



## کچھ دن فلمی دنیا میں

امید صاحب ایٹھوی، اور ساغر صاحب نظامی کو ساتھ لے کر جب میں ایک مشاعرے کی شرکت کے واسطے بمبئی گیا تو اس کے دوسرے ہی دن شام کے وقت شالیمار پکچر زپونا کے مالک احمد صاحب بنے (سید سجاد ظہیر) کے گھر آئے (ہم وہیں ٹھہرے ہوئے تھے) اور ہم لوگوں کا کلام سننے کے بعد وہ بنے میاں کو دوسرے کمرے میں اٹھا کر لے گئے اور دیر تک باتیں کرنے کے بعد جب رخصت ہو گئے تو بنے میاں نے مجھ سے کہا کہ احمد صاحب آپ کو، اور ساغر صاحب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں آپ دونوں پر کوئی پابندی نہیں ہوگی صرف گانے لکھ دیا کیجئے گا آپ کا معاوضہ گیارہ سو تک اور ساغر صاحب کا معاوضہ ساڑھے پان سو تک حاضر 1 کیا جائے گا میں نے کہا یہ سرخوشی کا وقت ہے اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں کل جواب دوں گا صبح کو ساغر نے مجھ سے کہا اگر آپ یہ شرط لگا دیں گے کہ میرا اور ساغر کا معاوضہ بالکل مساوی ہوگا تو احمد صاحب کی چونکہ یہ تمنا ہے کہ آپ ان کے وہاں کام کریں، اس لئے وہ اس شرط کو قبول کر لیں گے، اور میری زندگی بن جائے گی میں نے ساغر کی بات مان لی۔

میں نے بنے سے کہا کہ میری یہ شرط ہے کہ ساغر کو میرے برابر معاوضہ دیا جائے، اگر احمد صاحب اسے قبول نہیں کریں گے تو میں ان کی یہ پیش کش نامنظور کر دوں گا۔ احمد صاحب نے، بادل نا خواستہ یہ شرط قبول کر لی اور تھوڑے دن کے بعد، 1 معاوضہ اچھی طرح یا نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ساغر صاحب کا معاوضہ مجھ سے نصف تھا۔

ہم لوگ، پونے آگئے اور شکر سیٹھ روڈ کے ”طاہر پلس“ میں رہنے لگے۔ پونے کے موسم کا اعتدال، وہاں کے مناظر، وہاں کی دل فریب صبحیں اور شامیں وہاں کی پابند اوقات برسات، اور وہاں کی پہاڑیاں ایسی چیزیں تھیں جن کو آج تک



بھلا نہیں سکا ہوں۔

میں نے اپنے دہلی کے رہنے والے پنجابی دوست ملک حبیب احمد، اور اپنے دکنی دوست حبیب اللہ رشدی کو بھی شالی مار میں ملازم رکھا دیا تھا، کرشن چندر کو بھی احمد صاحب پونے کھینچ لائے تھے بے چارہ جو انا مرگ شام تیواری، حمید بٹ مرحوم، برج بھوشن، اور بھارت بھوشن (ہندی کے شاعر) بھی شالیمار سے وابستہ تھے میرے پرانے فوجی دوست منان خاں رام پوری بھی بسلسلہ تبادلہ پونے آچکے تھے اور پونے کے نئے دوست قدوس گھڑی والے اور محمد فصیح بھی ایسے دلچسپ نکلے کہ رات کی اکثر نشستیں ان کے گھر پر ہوا کرتی تھیں اور ایک اچھی خاصی چنڈال چوکڑی کی صورت نکل آتی تھی۔

اسی اثناء میں قمر علی 1 صاحب اور سید 2 آفتاب حسین صاحب سے بھی بڑے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے فصیح 3 صاحب کی گردن میں ایک ذرا سا خم تھا اس لئے ان کو مرد کج گردن کہا کرتا تھا اسی کے ساتھ ساتھ چوں کہ وہ تاویلات و قوائی پر بڑی وسعت رکھتے تھے میں ان کو ”امیر تاویلات و قوائی“ کا خطاب بھی دے دیا تھا۔ وہاں میرے ایک لکھ پتی دوست اور بھی تھے ”مولا ڈینا“ جو ہمہ وقت شراب پیتے اور لوگوں کی بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ امداد کیا کرتے تھے اور ایک سلسلہ خاص میں انہوں نے میری اعانت بھی کی تھی جس کو میں فراموش نہیں کر سکوں گا۔

وہیں ساغر صاحب کا مراد آباد کی ایک صاحبزادے سے قلمی معاشقہ بھی چل رہا تھا اور کچھ روز کے بعد وہ صاحبزادی طاہرہ پریس میں دلہن بن کر آگئی تھیں۔

1 قمر علی ٹیلرنگ فرم کے مالک اور لکھ پتی انسان تھے 2 آفتاب صاحب ایک لانڈی کے مالک اور آسودہ حال آدمی تھے کراچی آکر دونوں تباہ ہو چکے ہیں کراچی نے چھوٹوں کو ابھارا اور بڑوں کو دفن دیا ہے 3 آگے چل کر یہ بات کھل گئی کہ وہ دل چسپ زیادہ اور مخلص بہت کم تھے۔

پونے کا ہر دن عید تھا، ہر رات، شب برات تھی اور ہر آٹھویں دسویں دن میں بمبئی جا کر کسی کے آستان جمال پر سجدہ ریزی بھی کرتا تھا لیکن احمد صاحب کی غلط عملی نے دو ڈھائی سال کے اندر وہ سارا ظلم توڑ دیا وہ چپ چاپ تے پاکستان کی طرف پرواز کر گئے، اور ہم سب لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور وہ سارا کھیل خوش و زخشد، ولے دولت مستعجل بود ہو کر رہ گیا۔

پونے کو خیر باد کہہ کر میں بمبئی آ گیا اور 1 بنے کے خالی گھر میں رہنے لگا اس گھر کے ایک گوشے میں ممتاز حسین (جو آج کل کراچی کے کسی کالج میں اردو کے استاد ہیں) بھی رہتے تھے جہاں سعیدہ کے بچوں اور ان کے مابین روز کوئی نہ کوئی جھگڑا ہوا کرتا تھا اس لئے کچھ روز کے بعد میں اپنے ایک بے تکلف ملنے والے ماسٹر عبدالعزیز صاحب رام پوری کے جیکب سرکل واٹ خالی فلیٹ میں اٹھ آیا تھا اس زمانے میں فلمی بازار، ٹھنڈا پڑا ہوا تھا ساغر، ہر دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے اور ہم ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے کہ خاں صاحب اب ہو گا کیا۔

پروڈیوسر اس بات پر مصر تھے کہ جوش صاحب ہمارے اسٹوڈیو آئیں گے تو ہم ان سے گیت لکھائیں گے اور جوش صاحب اس بات پر اڑ گئے تھے کہ وہ ہمارے گھر آنے کا دکھ نہیں گے تو ہم گیت کہیں گے۔

میرے دوست آغا جانی کاشمیری، اور خولجہ احمد عباس نے بہت کوشش کی کہ معاملات رو براہ ہو جائیں مگر کچھ نہ ہو سکا اس کش مکش میں میرا حال بد سے بدتر ہوتا چلا گیا آمدنی کچھ تھی ہی نہیں اور بیوی کے پاس جو کچھ اچھی پونجی تھی وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔

میں اسی عالم میں ایک روز شام کے وقت شغل کر رہا تھا کہ بازار میں یکا یک ایک قیامت کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور ہر طرف سے ”مارو، مارو، مارو“ کی آوازیں آنے لگیں میں برآمدے میں جا کر جھانکنے لگا کہ دیکھوں معاملہ کیا ہے کہ اتنے میں کسی نے زور

زور سے میرے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا میں نے بھری سوڈے کی بوتل ہاتھ میں لے کر دروازہ

1 وہ کہیں بہت دور گئے ہوئے تھے۔

کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک صورت آشنا ہندو پڑوسی نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ کہا مسٹر جوش آپ فوراً یہاں سے کسی مسلم محلے میں چلے جائیں کسی نے مہاتما گاندھی 1 کو گولی مار دی ہے ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے اس لئے فوراً یہاں سے چلے جائیے میں اپنے بال بچوں اور بوتل کو لے کر اپنی بیٹی کی سہیلی رفعت کے مکان میں جو بھنڈی بازار میں تھا چلا گیا اور وہاں پہنچا تو ریڈیو پر جواہر لال کا یہ اعلان سنا کہ مہاتما جی کو ایک ہندو مرہٹے گوڈ سے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے اس اعلان نے مسلمانوں کو قتل عام سے بچا لیا اگر جواہر اس اعلان میں پانچ منٹ کی بھی تاخیر کر دیتے تو لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا دوسرے دن میں اپنے فلیٹ میں آ گیا، ادھر، زندگی، فاقہ، فقر کے سائے میں گزرنے لگی ایک دن میں نے دیکھا بیوی بے حد اداس بیٹھی ہیں پوچھا کیا بات ہے کہنے لگیں میرے پاس جو روپیہ تھا اب وہ سسکیاں بھر رہا ہے جلدی کوئی سبتیا کرو نہیں تو خدا نہ کرے دھڑا دھڑا فاقے ہونے لگیں گے یہ سن کر یہ بات میرے دل میں آئی کہ اب میں اپنی آن توڑ دوں اور قلم کان میں لگا کر ”کام گیت لکھنے کا“ کے نعرے لگاتا، اسٹوڈیوں کی گلیوں میں پھرنا شروع کر دوں۔

کہ، جاہا سپر باید انداختن!

میرے خون میں جب اس ارادے کی دھمک پیدا ہوئی تو میرے سینے کا خوابیدہ شاعر جوش یکا یک بیدار ہو گیا اور جامے سے باہر ہو کر کہنے لگا کہ تو اس دنیا ردار شبیر حسن خاں کے بہکانے میں آ کر پروڈیوسروں کی طرف جائے گا تو تیری ٹنگویاں توڑ کر رکھ دوں گا۔

اپنے غیور شاعر کی یہ گھن گرج سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بجلی کی لپک کے مانند فوراً ایک تدبیر میری سمجھ میں آ گئی میں سیدھا بیوی کے پاس گیا اور کہا اشرف جہاں پانچ دن اور راستہ دیکھ لو اگر اس مدت میں کوئی سہیتا نہ ہو تو مجھے تمیں چالیس روپے اور یہ کالا کمبل دے دینا بیوی نے کہا اس روپے سے کیا کرو گے اور روپے کے ساتھ یہ کمبل کیوں مانگ رہے ہو میں نے کہا میرے ایک کاروباری ملنے والے ہے ان کو ساتھ لے جا کر مارکیٹ سے

1 اسی بمبئی نے گاندھی جی کی موت کی منحوس خبر سنائی تھی اور اسی بمبئی نے آزادی ہند کا مشرودہ بھی سنایا تھا پہلی خبر پر میں نے انسو بہائے تھے اور دوسری خبر سن کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ سڑکوں پر ناچا تھا۔

ترکاریاں لاؤں گا اور عین اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے کمبل بچھا کر آلو، گو بھی اور ہنڈے بیچنا شروع کر دوں گا میرے باپ کو ہنڈے بہت پسند تھے اور ان کے خدام بازار سے ہنڈے خرید کر لاتے تھے اب ان کا بیٹا سڑک پر بیٹھ کا ہنڈے بیچے گا اور اول و آخر میں ایک نسبت پیدا ہو جائے گی یہ سنتے ہی بیوی اچھل پڑیں گویا خدا نہ کردہ بجلی کا جھٹکا لگ گیا ان کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو بھر آئے کہنے لگیں ایسا کرو گے تو ناک کٹ جائے گی میں نے کہا اشرف جہاں تعلقہ داری کی بودماغ سے نکال ڈالو حلال کی روزی کمانے میں کہیں ناکیں کٹا کرتی ہیں ناک تو کٹتی ہے چوری چکاری کرنے، اپنی آن توڑ دینے اور اسٹوڈیوں کے چکر لگانے سے اور بفرض محال اگر اس بات کو بے عزتی مان بھی لیا جائے تو میرے اس طرح سڑک پر بیٹھ کر ترکاری بیچنے سے میری نہیں ہندوستان کی ناک کٹ جائے گی۔

بیوی نے سر سے لے کر پاؤں تک مجھے دیکھا ”اے اللہ تو کہاں جا کر سو گیا ہے“ کہا تنکے پر سر رکھ دیا اور بڑے بیکسی کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔

بیوی کی اس اداسی پر میرا دل بھر آیا دوسرے کمرے میں لیٹ کر سو گیا اور خواب



دیکھنے لگا کہ میں اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے سڑک پر کمبل بچھائے ترکاریاں بیچ رہا ہوں اور سامنے سے جنازے گزر رہے ہیں میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ جنزے کس کے ہیں لوگ کہہ رہے ہیں تمہارے آباؤ اجداد کے جب بیدار ہوا تو دیکھا میرا داماد التفات ایک اخبار لئے آ رہا ہے اس نے اخبار دے کر کہا ماموں سرکار ہند کو اپنے رسالے آج کل کے لئے ایک ایڈیٹر کی ضرورت ہے جس کی درخواستیں مانگی گئی ہیں آپ کے واسطے یہ بہترین موقع ہے آپ فوراً درخواست روانہ کر دیں اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس اسی درخواست کی نقل بھیج دیں میں نے کہا بیٹا درخواست تم لکھ لاؤ میں دستخط کر دوں داماد تھوڑی دیر میں درخواست لکھ کر آ گیا اور درخواست دہلی بھیج دی گئی۔

اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن، حسن اتفاق سے پنڈت جواہر لال نہرو، اور مولانا ابوالکلام، دونوں بمبئی آگئے میں نے ان کی اس آمد کو وہ سمجھا جس کو عرف عام میں تائید غیبی کہتے ہیں اور سیدھا گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ پنڈت جی اور مولانا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور ایک گھنٹے میں پلٹ آئیں گے۔

جی میں آیا کنور 1 مہاراج سنگھ سے کیوں نہ مل لوں، اور خالی بیٹھ کر، انتظار کیوں کروں پرچے پر اپنا نام لکھ کر بھیجا انہوں نے فوراً بلالیا اور بڑے تپاک سے پیش آئے اور پوچھا خاں صاحب آپ یہاں کہاں میں نے کہا میں تو آج کل بمبئی میں رہتا ہوں انہوں نے کہا اور پھر بھی مجھ سے کبھی نہیں ملے میں نے کہا میں اس وقت پنڈت جی سے ملنے آیا تھا وہ موجود نہیں ہیں اس لئے آپ سے ملنے آ گیا ہوں میں بے سوچے سمجھے یہ کہہ گیا مگر فوراً خیال آیا کہ میں نے بڑی بے تکی بات کہی ہے اس کے تو یہ صاف معنی ہیں کہ میں کنور صاحب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر پنڈت جی اس وقت غیر حاضر نہ ہوتے تو میں آپ سے ملنے نہ آتا، یہ سوچ کر میرے چہرے پر خجالت کے آثار پیدا ہو گئے مہاراج سنگھ بڑے ذہین آدمی تھے بھانپ گئے اور مسکرا کر کہنے لگے آپ

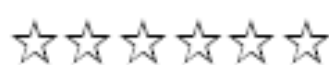
پٹھانوں کی یہی بات تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ جو بات آپ کے دل میں ہوتی ہے، وہی پھٹ سے زبان پر آ جاتی ہے۔ میں نے کہا میں اپنی بدحواسی کی معافی چاہتا ہوں انہوں نے کہا میں جس بات کی دل سے قدر کرتا ہوں آپ اسی کی معافی چاہ رہے ہیں ان کے یہ کہتے ہی مولانا آگے آگے اور پنڈت جی پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں داخل ہو گئے مولانا نے فقط ہاتھ ملایا اور پنڈت جی لپک کر میرے 2 گئے لگ گئے اور چھوٹے ہی پوچھا جوش صاحب آج کل آپ کیا کر رہے ہیں میں نے کہا پنڈت جی ”آج کل“ کے واسطے درخواست دے کر اس کا انتظار کر رہا ہوں پنڈت نے مسکرا کر کہا یہ ”آج کل“ کی الٹ پھیر میری سمجھ میں نہیں آئی۔

مولانا نے لال بجھکو بن کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب نے ہمارے سرکاری رسالے ”آج کل“ کا جواشتہار نکالا ہے اس کی ادارت کے واسطے درخواست دی ہوگی پنڈت جی نے کہا تو پھر چھٹے روز آپ دہلی آجائیں میں بندوبست کر دوں گا۔

مولانا آزاد نے کہا پنڈت جی آپ کو معلوم نہیں یہ محکمہ سردار ٹیل کا ہے آپ سوچ سمجھ کر جوش صاحب کو دہلی بلائیں پنڈت جی نے کہا جوش صاحب ہمارے شانے سے شانہ ملا کر برٹش ایمپائر سے لڑ چکے ہیں ٹیل کو بھی یہ بات معلوم ہوگی اور نہیں معلوم ہوگی تو میں ان کو بتا دوں گا آپ بڑے اطمینان کے ساتھ دہلی آجائیں۔

1 کنور مہاراج سنگھ اس وقت بمبئی کے گورنر تھے اور میرے پورے خاندان سے ان کو واقفیت تھی

2 مولانا بے چارے پر تعلیمات کی وزارت کا نشہ چڑھ چکا تھا اور ہندو وزارت عظمیٰ کا پورا مے خانہ خالی کر دینے کے باوجود ہوش میں تھے یہ فرق دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا کہ مولانا مجذوب بن چکے ہیں اور پنڈت سالک کے درجے پر فائز ہیں افسوس کہ مسلمان پر حکومت کا نشہ جلد چڑھ جاتا ہے۔



## مژدہ! خار دشت پھر

وہ غالباً 1948ء کا ورد تھا کہ میں ترکاری فروخت کرنے کے ارادے کو فسخ کر کے دہلی پہنچا اسٹیشن سے سیدھا پنڈت جی کے پاس گیا اور انہوں نے سردار پٹیل سے ٹیلی فون پر بات کر کے میری ملازمت کی بات چکی کر لی اور یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ ریاستوں سے میری پٹنیں بھی مقرر کرادیں گے اور مجھ کو میاں عظیم حسین صاحب کے پاس بھیج دیا جو اس وقت اطلاعات عامہ کے سیکرٹری تھے۔

میاں عظیم حسین واقعی میاں آدمی نکلے میں ان کی شرافت سے بے حد متاثر ہوا اثنائے گفتگو میں انہوں نے مجھ سے کہا تنخواہ آپ کو صرف گیارہ سو ماہانہ ملے گی آپ اس قلیل تنخواہ میں کیوں کر زندگی بسر کر سکیں گے میں نے کہا میاں صاحب پنڈت جی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کئی ریاستوں سے میری ادبی پٹنیں مقرر کر کے اس قلیل تنخواہ کی خانہ پڑی کر دیں گے۔

جب انٹرویو سے پہلے میں نے اس کچھا کھج بھرے ہوئے ہال میں قدم رکھا جہاں ”آج کل“ کی ادارت کے امیدواروں کا ایک لشکر بیٹھا ہوا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی تمام امیدواروں کے چہرے فٹ ہو گئے اور میرے مقابلے میں اپنی ناکامی کا یقین ان کی آنکھوں میں تیرنے لگا اس بات سے میرے دل کو بہت سخت دھچکا پہنچا اور میں سوچنے لگا کاش میں یہاں آ کر اتنے بڑے لشکر کی مایوسی کا سبب نہ بنتا اور عرفی کا یہ شعر سر میں گونجنے لگا:

اے متاع درد در بازار جاں، انداختہ

گوہر ہر سود در جیب زیاں، انداختہ

اور جب انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھا کہ میاں عظیم حسین اور اجمل خاں کے علاوہ چار پانچ آدمی ایسے بھی ہال میں موجود ہیں جن کو میں نہیں جانتا اس کمرے میں بیٹھ کر جب میں نے اپنے پان کی ڈبیا کھولی تو ایک صاحب نے جو

صورت کے اعتبار سے مد راسی معلوم ہو رہے تھے مجھ سے انگریزی میں کہا یہاں پان کھانا آداب کے خلاف ہے میں نے جھلا کر جواب دیا آزاد ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پرانے آقا کے آداب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں میں پان کھانے سے باز نہیں آسکتا پان میرے واسطے ایسا ہی ہے جس طرح سانس لینا آپ اسے پسند نہیں کرتے تو میں انٹرویو سے دست بردار ہو کر باہر چلے جانے پر آمادہ ہوں میں ڈبیا بٹوا اٹھا کر جب اٹھ کھڑا ہوا تو میاں عظیم حسین اور اجمل خاں نے مجھ کو روک لیا کہ آپ شوق سے پان کھائیں۔

اس کے بعد غالباً اجمل خاں نے کہا جوش صاحب ہم آپ کا انٹرویو کیا لیں، بس وہ انظم سنا دیجئے جو آپ نے نظام کے خلاف کہی تھی میں نے کہا اجمل خاں جن لوگوں کے دماغوں پر اب تک فرنگی آداب کی مہر لگی ہوئی ہے وہ میری انظم کیا خاک سمجھ سکیں گے۔

اس پر میاں عظیم حسین، اجمل خاں اور ان کے ساتھ کئی اصحاب نے ہم زبان ہو کر کہا جوش صاحب آپ ہماری طرف دیکھیں اور ہم کو انظم سنائیں ہم سب آپ کے قدر دان ہیں میں نے اس انظم کے چند شعر سنائے اور انٹرویو ختم ہو گیا۔

”آج کل“ کی ادارت سنبھالنے کے بعد، جب ایک روز پنڈت جی سے ملنے گیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ اپنے محکمے کے وزیر، سردار پٹیل سے اب تک ملے کہ نہیں میں نے کہا نہیں اور نہ ملنے کا ارادہ ہی ہے پنڈت نے پوچھا کیوں میں نے انگریزی میں جواب دیا کہ:

”Because he has got a criminal face“ اس لئے کہ

ان کا چہرہ مجرموں کا سا ہے۔

یہ سن کر پنڈت جی نے بڑا زبردست قہقہہ لگایا اور پھر مجھ سے کہا نہیں نہیں آپ کو ان سے ضرور مل لینا چاہئے میں ابھی فون پر آپ کی ملاقات طے کئے لیتا ہوں انہوں



نے فون کیا جواب آیا ابھی روانہ کر دیجئے میں ان کی کوٹھی پر پہنچا وہ دھوتی باندھے، برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے میں نے ہاتھ ملاتے ہی ان سے کہا سردار صاحب مجھے آپ سے ملنے کا ایک خاص وجہ سے بڑا اشتیاق تھا وہ بڑے گھاگ آدمی تھے ” خاص وجہ “ سن کر بھانپ گئے اور پوچھا آپ کو مجھ سے ملنے کا کیوں اشتیاق تھا میں نے کہا اس لئے کہ میں آپ کی بہت سی برائیاں سن چکا ہوں۔

یہ سن کر وہ مجھے کمرے میں لے گئے، بیٹھتے ہی انہوں نے انگریزی میں کہا آپ نے یہ سنا ہوگا کہ میں مسلمان کا دشمن ہوں آپ جس قدر خوفناک برہنہ گفتار آدمی ہیں اسی قدر میں بھی ہوں اس لئے آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کے سے ان تمام مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہوں، جن کے خاندان، باہر سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں لیکن میں ان مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا جن کا تعلق ہندو قوم کے شودروں اور نیچی ذاتوں سے تھا اور مسلمانوں کی حکومت کے اثر میں آکر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا یہ لوگ دراصل نہایت معتصب، شریر اور فسادی ہیں اور اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندو اکثریت کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا سردار صاحب پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک نسل سے ہیں ذات پات کا بالکل قائل نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر آج سے دو تین سو برس کسی کے پروادا کا پروادا چمار تھا تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اس کے چمار پن میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی ہے؟ اور وہ آج تک چمار ہی چلا آ رہا ہے اس بات کا وہ جواب دینے والے ہی تھے کہ ان کے سیکرٹری نے آکر کہا آپ نے مہاراجہ پٹیل کو نام دیا تھا وہ آگئے ہیں۔

سردار کی کوٹھی سے ابھی نکلا تھا کہ مولانا آزاد سے مڈ بھیسٹ ہو گئی انہوں نے اپنی موٹر روک کر مجھے آواز دی اور جب میں اپنی موٹر سے اتر کر ان کی موٹر میں بیٹھ گیا انہوں نے مجھے بڑے درد انگیز تیروں سے دیکھ کر کہا جوش صاحب آپ اور سردار ٹیل میں

نے سر جھکا لیا، اور انہوں نے یہ شعر پڑھا:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن  
کہ نور دیدہ اش، روشن کند چشم زلیخارا

مولانا آزاد تو یہ شعر پڑھ کر چلے گئے لیکن میرے دل کا عجیب عالم ہو گیا میں سوچنے لگا کہ ہم نے اپنے ملک کو اتنی قربانیاں دے کر کیا یہ دن دیکھنے کے لئے آزاد کرایا تھا کہ انگریز کے جاتے ہی اردو کا بیڑا غرق ہو جائے اور مسلمانوں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں کان میں ریاست دتیا کے وزیراعظم عزیز الدین کی آواز آئی کہ جوش صاحب ہم نہ کہتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا تو ہندو، مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالیں گے؟ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ پاکستان بنانے والوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا حشر کیا ہو گا وہ ایک ایک مسلمان کو پاکستان کیوں نہیں لے گئے پھر میں نے اپنے کو اس امید سے تسلی دی کہ نفرت کی عمر زیادہ نہیں ہوتی چار دن میں یہ تعصبات ختم ہو جائیں گے اور سوشلسٹ حکومت آ جائے گی، اور پھر یہ ساری تفریقیں فنا ہو کر رہ جائیں گی اور دینی برادری ختم ہو کر، انسانی برادری کے دور کا آغاز ہو جائے گا۔

یہ ایک شب کی تڑپ ہے سحر تو ہونے دو  
بہشت سر پہ لئے روزگار گزرے گا  
فضا کے دل میں پر افشاں ہے آرزوئے غبار  
ضرور ادھر سے کوئی شہ سوار گزرے گا!

1955ء میں جب بسلسلہ شرکت مشاعرہ تیسرے بار میں پاکستان آیا تو ہر چند اس سے پیشتر بھی میرے دیرینہ دوست سید ابو طالب صاحب نقوی (چیف کمشنر کراچی) مجھ کو پاکستان آجانے کی دعوت دے چکے تھے لیکن اس مرتبہ تو وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں پاکستان چلا آؤں۔

میں پاکستان آنے پر بالکل تیار نہیں تھا لیکن صاف انکار نہیں کیا کہ نقوی کا دل نہ ٹوٹ جائے اور یہ کہہ کر نال دیا کہ میں اس مسئلے پر غور کروں گا۔

اس اثناء میں انہوں نے اپنے گھر پر مجلس کی تمام اکابر شہر کے ساتھ، اسکندر مرزا صاحب کو بھی بلایا، اور سب کو میرا مسدس ”حسین و انقلاب“ سنوایا، اور ان تمام اکابر نے جن میں اسکندر مرزا بھی شامل تھے مجھ سے اصرار کیا کہ میں پاکستان کا باشندہ بن جاؤں ان کی دعوت پر ہر چند میں نے اپنے دل میں تو یہ کہا کہ خدا کی قسم، میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا لیکن زبان سے یہ کہا میں بھی یہی سوچ رہا ہوں اب نقوی کا یہ تکیہ کلام ہو گیا کہ جوش صاحب آخر آپ کب تک سوچیں گے تو میں پریشان ہو گیا کہ آخر میں کب تک ٹالتا اور بے دودھ کا بچہ پالتا رہوں گا۔

اسی دوران میں ایک روز، وہ میٹروپول آگئے اور مجھ سے کہا سارے کام چھوڑ کر آج آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے پاکستان آ جانے کا اقرار لے کر، دم لوں۔ میں نے کہا نقوی صاحب آپ جانتے ہیں کہ مجھ کو آپ سے کس قدر محبت ہے اگر آپ میری جان تک مانگیں تو حاضر کر دوں لیکن نقوی صاحب نے کہا دیکھئے ”لیکن“ کے بعد انکار نہ کر دیجئے گا میں چپ ہو گیا وہ اپنا سودا چھوڑ کر میرے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے فرمائیے آپ پاکستان کب آ رہے ہیں اب جی کڑا اور آنکھیں نیچی کر کے میں نے کہا نقوی صاحب جب تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو زندہ ہیں میں پاکستان کیوں کر آ سکتا ہوں۔

انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا اور نہرو کے بعد کیا ہوگا، یہ بھی کبھی سوچا ہے؟ میں نے کہا خدا نہ کرے کہ میں ان کے بعد زندہ رہوں۔ انہوں نے کہا شاعر کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ وہ زندگی کے سنجیدہ مسائل کو بھی جذبات کی ترازو میں تول کرتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر انہرو صاحب آپ کی زندگی ہی میں سدھار گئے تو پھر ہندوستان میں آپ کا چاہنے والا کون رہ جائے گا، آپ کی یہ نوکری،

آپ کی یہ فراغت و عزت کیا ان کے بعد ختم نہیں ہو جائے گی؟ اور تھوڑی دیر کے واسطے، یہ بھی فرض کر لیجئے کہ پنڈت نہرو کے بعد بھی ہندوستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے رہے گا لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ خدا نہ خواستہ آپ کے بعد وہاں آپ کے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ دیکھئے جوش صاحب آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچے در در مارے پھریں گے اور ایک تنفس بھی ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھے گا۔۔۔۔۔ یہاں تک تو معاشی پہلو پر میں ہاتھ کر رہا تھا اب ذرا تہذیبی پہلو پر بھی نگاہ ڈالنے یہ اس سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوگا۔ جوش صاحب آپ کے بچے اور اردو بھول جائیں گے۔ ہندی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگی وہ آپ کے کلام کا۔

1۔ میں جس وقت دل ہی میں دل میں پاکستان نہ آنے کی قسم کھا رہا تھا اس وقت فرمان روزگار مجھ پر مسکرا رہا تھا۔

ترجمہ ہندی میں پڑھیں گے اور تہذیبی، روایتی اور ثقافتی اعتبار سے آپ کی پوری نسل میں اس قدر زبردست و عبرت ناک تبدیلی پیدا ہو جائے گی کہ آپ سے اس کا کسی نوعیت کا بھی تعلق باقی نہیں رہ جائے گا کیا یہ عظیم لسانی، مزاجی اور روایتی بربادی آپ کو منظور ہے؟ اور اگر آپ یہاں نہ آگئے تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ آپ اپنی وقتی فراغت و عزت کی قربان گاہ پر اپنے پورے خاندان کو بھینٹ چڑھا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

ان کی اس طویل جذباتی و منطقی تقریر نے میرا دل ہلا دیا، اور میری آنکھیں کھول دیں اور میں سوچنے لگا کہ میرے بعد یہ میرے نازوں کے پلے بچے اور میری یہ شاہانہ مزاج رکھنے والی بیوی کیا کرے گی نقوی صاحب سے میں نے کہا آپ نے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا بے شک میری آل اولاد ہندوستان میں پنپ نہیں سکے گی نقوی صاحب، مجھ کو چوبیس گھنٹے اور دے دیجئے کہ میں اس مسئلہ پر ایک بار اور غور کر لوں۔ کل اسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر، اپنا آخری فیصلہ سنا دوں گا۔

نقوی صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے ناصر احمد خاں سے کہا تم نے سن لی



نقوی صاحب کی ساری تقریر، اب کیا کہتے ہو، ناصر نے کہا مجھ کو ان کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے اگر آپ یہاں منتقل نہ ہوئے تو زندگی بھر پچھتائیں گے۔ یہ کہتے ہی ناصر میرے قریب آ کر بیٹھ گئے اور بڑے ولولے کے ساتھ انگشت شہادت بلند کر کے کہنے لگے خاں صاحب آپ کئی پشتوں سے ملیح آباد پر حکومت کرتے چلے آ رہے ہیں، آپ کی رعایا آپ کے سامنے تھراتی اور جھک جھک کر سلام کرتی ہے کل اسی دو کوڑی رعایا کے بچے، آپ کے بچوں پر حکومت کریں گے، ان کو دھوتیاں بندھوائیں گے اور ان کے سروں پر چوٹیاں رکھوائیں گے اللہ کرے یہ دن دیکھنے سے پیش تر ہم مرجائیں۔

صبح اٹھ کر میں نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا نہادھو کر نقوی صاحب پاس گیا اور ان سے کہہ دیا کہ اب میں ہجرت پر تیار ہو گیا ہوں یہ سنتے ہی نقوی کی باچھیں کھل گئیں دوڑ کر مجھے گلے لگایا اور اسی وقت ڈپٹی کمشنر کو طلب کر کے حکم دیا کہ جہانگیر روڈ پر جو ایک بہت بڑا پلاٹ خالی پڑا ہے اس کو جوش صاحب کے نام الاٹ کر دیجئے اس پر ان کا سینما ہال اور مکان تعمیر کیا جائے گا اور فلاں 1 مقامی پر پچاس ایکڑ زمین بھی جوش صاحب کو الاٹ کر دیجئے وہاں ان کا باغ نصیب کیا جائے گا۔

1 ناصر احمد ملیح آبادی، میرے قرابت داروں میں سے ہیں وہ مجھ سے پہلے ہی پاکستان چلے آئے تھے اور جب سے میں آیا تھا وہ ہر وقت میرے ہی ساتھ رہتے تھے لیکن اب اس خطا پر کہ ان کی ایک مصیبت کے وقت میں نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا، انہوں نے مجھ سے ملنا جلنا ترک فرما دیا ہے ایک اور کام آج کا اٹکا ہم سے ایک اور ہوا دشمن جانی پیدا۔

جب ان کے حکم کی تعمیل ہو گئی تو دونوں زمینوں پر مجھ کو قبضہ دے دیا گیا اور میرے چوکی دروازہ جھونپڑیاں ڈال کر وہاں رہنے لگے۔

اور جب تمام لکھا پڑھی مکمل ہو گئی تو نقوی صاحب نے کہا آپ دہلی جا کر ایمر جنسی سٹوفلیٹ پر اپنے بال بچوں کو یہاں لے آئیں آپ کے آتے ہی سینما کی تعمیر کا کام

شروع کرا دوں گا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے سیکرٹری ربانی صاحب کو بلا کر میرے مکان کی تلاش کے لئے کہا ربانی صاحب نے سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک اچھی سی کوٹھی میرے حوالے کر دی اور میں وہاں پرواز کر گیا۔

دہلی پہنچا، معلوم ہوا پنڈت جی باہر گئی ہوئے ہیں دو تین دن میں آئیں گے سیدھا مولانا کے پاس گیا مولانا کسی اخبار میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ہندوستان کے ایک شاعر پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے انہوں نے چھوٹے ہی مجھ سے کہا غالباً آپ ہی وہ شاعر ہیں جس پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے میں نے کہا جی ہاں مولانا میں وہی شاعر ہوں اس کے بعد میں نے اپنی ساری روداد بیان کر دی نقوی صاحب کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو دہرایا اور پھر ان سے پوچھا اب آپ کی کیا رائے ہے مولانا؟

انہوں نے چند سوال کر کے جب معاملے کے ہر پہلو کو سمجھ لیا تو کہا آپ کا ہجرت کر جانا ہر چند ہمارے واسطے پشیمانی و سرگرمی کا باعث ہو گا لیکن جہاں تک کہ آپ کے خانوادے کے مستقبل کا سوال ہے میری رائے ہے کہ آپ ہجرت کر جائیں نقوی نے یہ سچ کہا ہے کہ نہرو کے بعد آپ کا یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا آپ تو آپ خود مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔

میں ہر معاملے کو منطقی طور پر دیکھنے کا خوگر ہوں لیکن جو اہر لال شدید جذباتی آدمی ہیں وہ آپ کی ہجرت پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوں گے۔

### 1 نام یاد نہیں رہا اس مقام کا

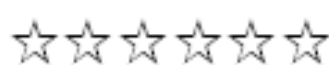
تیسرے دن یہ سن کر کہ پنڈت جی آج آرہے ہیں میں پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا وہ اترے تو میں نے ان سے کہا مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہے اور آج ہی انہوں نے کہا تو پھر ابھی میرے ساتھ چلے اور جب ان کے گھر آ کر، میں نے اپنا کل ماجرا بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ مولانا آزاد کی اس باب میں کیا رائے ہے تو ان کے چہرہ پر شدید کرب کے آثار نمایاں ہو گئے اور کہا جوش صاحب آپ نے

مجھ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہندو کی تنگ 1 دلانہ حب الوطنی یہ صورت حال نہ پیدا کر دیتی تو آپ کے دل میں ترک وطن کا کبھی خیال پیدا ہی نہ ہوتا لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے مجھے سوچنے کے لئے دو دن کا وقت دیجئے میں خود بھی غور کروں گا، اور مولانا سے بھی رائے لوں گا۔

دو دن کے بعد جب پہنچا تو نظر اٹھاتے ہی میں نے ان کے دل موہ لینے والے چہرے پر اس قسم کی شگفتگی دیکھی جو کسی ذہنی گرہ کے سلجھانے کے بعد پیدا ہوا کرتی ہے انہوں نے بڑی بشاشت کے ساتھ نگاہ اٹھائی شیریں تبسم لبوں پر مچلنے لگا اور انہوں نے کہا جوش صاحب میں نے آپ کے معاملے کا ایسا اچھا حل نکال لیا ہے جسے آپ بھی پسند کریں گے کیوں صاحب یہی بات ہے نا کہ آپ اپنے بچوں کے معاشی و تہذیبی مستقبل کو سنوارنے، اور اردو زبان کی خدمت کرنے کے واسطے پاکستان جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے انہوں نے کہا تو پھر آپ ایسا کریں کہ اپنے بچوں کو پاکستانی بنادیں لیکن آپ یہیں رہیں اور ہر سال پورے چار مہینے آپ پاکستان میں قیام کر کے اردو کی خدمت کر آیا کریں سرکار ہند آپ کو پوری تنخواہ پر ہر سال چار مہینے کی رخصت دے دیا کرے گی۔

پنڈت جی کی اس تجویز پر میں اچھل پڑا میں نے کہا یہ تجویز مجھے دل سے منظور ہے اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی پنڈت جی میری منظور سے بے حد بشاش ہو کر میرے گلے لگ گئے حوریاں رقص کناں ساغر و پیانہ زرد!

1 انہوں نے انگریزی میں Narrowminded Patriolism کہا تھا۔ دوسرے ہی دن اخبار والوں نے مجھ کو گھیر لیا میں نے وہ تمام معاملہ جو میرے اور پنڈت جی کے مابین ہوا تھا بیان کر دیا اور تیسرے روز ہی میرا انٹرویو ہندوستان کے تمام انگریزی و اردو اخباروں میں شائع ہو گیا۔



## پاکستانی شہریت

جانا، شاہ زادہ گل فام کا، چوتھی طرف  
اور گھر جانا اس کا آسیبوں کے نرغے میں

آسیبوں کے ذکر سے پیش تر یہ سن لیجئے کہ جب پنڈت جی سے یہ معاملہ طے کر کے پاکستان آیا تو نقوی صاحب نے میری خوشی پر پانی پھیر دیا انہوں نے کہا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ آپ پاکستانی باشندے نہ بنیں، اور یہاں زمین کا الاٹمنٹ آپ کے نام ہو جائے، ہم کو آپ کے بچے آپ کی نسبت سے پیارے ہیں، جب آپ ہی ہمارے نہ بن سکیں گے تو ہمارے واسطے ناممکن ہو جائے گا کہ ہم آپ کے واسطے سینما بنوائیں، یا باغ لگوا دیں اس کے علاوہ، یہ صورت حال آپ کو کہیں کا بھی نہ رہنے دے گی، پاکستانی آپ کو ہندوستانی سمجھیں گے اور ہندوستان آپ سے اس لئے بدگمان ہو جائے گا کہ آپ کا پورا خاندان پاکستانی بن چکا ہے اور خود آپ بھی ہر سال چار ماہ پاکستان میں رہیں گے جوش صاحب دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر دریا کو عبور نہیں کیا جا سکتا آپ کا بھرم دونوں ملکوں سے اٹھ جائے گا میرے دل کو نقوی صاحب کی اس بات سے بڑا دھکا لگا لیکن چونکہ بات تھی باون تو لے پاؤرتی کی، اس

1. ہماری کہانیوں کے تمام شہزادے ”گل فام“ ہوا کرتے تھے اور جب وہ شکار کے واسطے جانے لگتے تھے تو ان کی مائیں ہمیشہ ان کو یہ تاکید کیا کرتی تھیں کہ جنگل میں صرف تین طرف شکار کھیلنا، چوتھی طرف ہرگز ہرگز نہ جانا اور چوتھی طرف جانے سے وہ اس انبار پر منع کیا کرتی تھیں کہ انہوں نے یہ سن رکھا تھا کہ چوتھی طرف بھوتوں اور آسیبوں کا رہنا ہے لیکن چونکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس شے سے منع کیا جاتا ہے اوبدا کر اس شے کی طرف دوڑتا ہے اس لئے تمام گل فام شادی شکار کھیلتے کھیلتے چوتھی طرف ضرور جاتے اور اپنے کو بھوتوں کے نرغے میں گھیر لیا کرتے تھے۔



لئے ان کی منطق کے سامنے سپر ڈال دی اور پاکستانی بن گیا اب نیچے آسیدوں کا ذکر۔

میرے پاکستانی بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا پورے پاکستان میں اور شہر کراچی میں تو اس قدر بلبلایا اٹھا گیا صور قیامت پھونک دیا گیا ہے۔۔۔ تمام چھوٹے بڑے اردو اور انگریزی اخباروں کے لشکر، خم ٹھونک ٹھونک کر میدان جنگ میں آگئے تمام ادباء و شعراء اور کارٹوں سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیاں سے نکال کر میرے خلاف مضامین قطعات، اور کارٹونوں کی بھرمار کر دی۔

ہر طرف منڈیوں کا سا ایک غلغلہ بلند ہو گیا کہ دہائی سرکاری، مغل اعظم، یعنی ابو طالب نقوی نے جوش کو آدھا پاکستان کاٹ کر دے دیا۔۔۔ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ میرے خلاف متحد ہو کر شیر و شکر ہو گئے وہابیوں بریلیوں، دیوبندیوں، قادیانیوں، سنیوں اور شعیبوں نے اپنی چودہ سو برس کی نفرتوں کو یکسر بھلا دیا تبرا اور مدح صحابہ کے مابین طرح مصالحت پڑ گئی اور میرے خلاف متحدہ طور پر اعلان جنگ فرما دیا گیا۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستان کھل گیا میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہے یا ابرسہ نے کعبے کا محاصرہ کر لیا ہے یا کام دیو، اچھوتیوں کے محل میں کود پڑا ہے اور تمام کنواری کنیاں ہائے اللہ، ہائے اللہ کے نعرے لگا کر بھاگ رہی ہیں یہ تمام شور، یہ تمام غلغلے یہ تمام دھماکے اور یہ ساری دہائیاں جب حکومت کے کان تک پہنچیں تو وزارت داخلہ نے نقوی صاحب سے جواب طلب کر لیا اور جس وقت میں نے یہ بات دیکھی کہ مجھے باغ اور سینما کی زمین دے کر نقوی صاحب ایک بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں تو میں نے چپکے سے باغ اور سینما کے پلاٹ واپس کر دیئے۔

اس زمانے میں چودھری محمد علی صاحب وزیر اعظم تھے، نقوی صاحب کی ان سے کھٹ پٹ ہو گئی نقوی صاحب نے اسکندر مرزا کے بل بوتے پر وزیر اعظم سے ٹکری تھی سکندر مرزا نے ان کی پشت پناہی سے روگردانی کی اور ان کی کمشنری ختم کر دی گئی نقوی صاحب کے زوال نے میری کمر توڑ دی۔۔۔۔۔ میں ادھر کارہانہ ادھر کا۔

میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں غیرت نے اجازت نہیں دی۔۔۔۔۔ میں نے دل سے پوچھا خاں صاحب اب کیا ہوگا، دل نے کیا ہمت نہ ہارا گر خار سے بود گل دستہ گردو۔۔۔۔۔

لوگوں نے رائے دی کہ میں حکومت سے درآمد برآمد کا لائسنس لے کر کاروبار شروع کر دوں مجھ گاؤں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں تجارت کا اہل نہیں میں نے دوڑنا شروع کر دیا اس دوڑ دھوپ میں زندگی اجیرن ہو گئی۔۔۔۔۔ روز صبح کو گھر سے نکلتا دوپہر کو پلٹتا تھوڑی دیر آرام کر کے پھر باہر نکل جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔

میرا عالم اس گاؤں والوں کے علم کا سا ہو گیا تھا جو محرم کے زمانے میں اٹھایا جاتا ڈھول تاشوں کی تروڑ، تروڑ، جھیم جھیم کی گونج میں ہر مکان کے چبوترے پر رکھا جاتا اور اسی طرح دن بھر چکر کاٹ کاٹ کر پھر اسی تروڑ تروڑ جھیم جھیم کے ساتھ مکان میں لا کر رکھ دیا جاتا ہے اس دوڑ دھوپ میں خدا کے فضل و کرم سے کچھ ہاتھ تو آیا نہیں البتہ ڈائریکٹروں، سیکریٹریوں اور وزیروں کے ایسے دو دو کوڑی کے نخرے ایسے اوچھے ٹھسے اور اس قدر غیر شریفانہ گڈامیر پن دیکھے کہ آدمی کا وقار نظروں سے گر گیا اور یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس قوم میں کسی صاحب قلم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ہر ادیب و شاعر کو چاہئے کہ وہ خود کشی فرمالے یہ سچ ہے کہ ہندو حکام بھی بعض اوقات نخرے دکھاتے ہیں لیکن اللہ اکبر یہ مسلمان جب ہیڈ کانسٹیبل ہو جاتا ہے تو ہامان و فرعون بن جایا کرتا ہے اور حکومت کی گدی پر بیٹھ کر، خدمت گاروں اور پھیری والوں کے لڑکے بھی اپنے کو قیصر و دارا سمجھنے لگتے ہیں اللہ بونوں کے در پر لٹکا والوں کو نہ لے جائے اب میری مسلسل

نا کامیوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

1 جہانگیر روڈ کا سینما پلاٹ، اور باغ لگانے کی زمین۔۔۔۔۔ خود میں نے واپس کر دی۔

2 ایک سوسائٹی کا سینما پلاٹ، نیلام میں، میرے نام چھوٹا۔۔۔۔۔ قیمت ادا نہ کر سکا اس لئے نکل گیا۔

3 کاشتکار کے لئے، ہاشمی صاحب، ڈپٹی کمشنر کراچی نے پچاس ایکڑ زمین دی الطاف گوہر نے اسے ضبط فرمالیا۔

4 سائیکل رکشاؤں کے پرمٹ ملے۔۔۔۔۔ نرخ گر گیا پرمٹ ہوا میں اڑ گئے۔

5 کولڈ اسٹوریج کی اجازت مل گئی روپیہ لگانے والوں کو ورغلا دیا گیا۔

6 واجد علی شاہ کنٹرول ریٹ پر بیس دینے پر آمادہ ہو گئے۔۔۔۔۔ روپیہ لگانے والے کو روک دیا گیا۔

7 بیٹری کے چوں کا لائسنس مل رہا تھا لائسنس دینے والے کے غمزے برداشت نہ کر سکا اسے برا بھلا کہہ کر گھر آ گیا۔

8 سینما کے ساز و سامان کا دوسرے دن پرمٹ مل رہا تھا۔۔۔۔۔ وزیر معطل کر دیا گیا۔

9 ٹیکسٹائل کا اجازت نامہ ملنے والا تھا۔۔۔۔۔ وزیر بدل گیا۔

10 پریس قائم کرنے کا اجازت نامہ لکھ کر تیار ہو گیا دستخط کرنے سے پیشتر وزیر کو نکال دیا گیا۔

11 مچھلی کی تجارت کا پرمٹ لکھ دیا گیا تھا سیکرٹری کو برطرف کر دیا گیا۔

12 پٹرول پمپ کی سعی کی گئی ناکام ہو گئی۔

13 ایک مکان الاٹ ہوا تھا آج تک قبضہ نہ مل سکا

14 دیہی ترقی کے محکمے میں نوکری کی درخواست دی منظور نہیں ہوئی۔

15 اپنی کتابوں کی طباعت و اشاعت چاہی 1 کوئی ناشر تیار نہیں ہوا۔

16 فریئر ہال کے ایک کوشے میں ریسٹوران کھلوا دینے کا وعدہ محکم کیا

گیا۔۔۔۔۔ افسر صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔

17 سندھی ادبی بورڈ میں ایک علمی کام کیا۔۔۔۔۔ اجرت نہیں ملی

18 محکمہ اباد کاری کے ایک افسر صاحب نے مکان کی زمین الاٹ کر

دی۔۔۔۔۔ چلتے وقت وہ کھڑے نہیں ہوئے الاٹمنٹ کا پرزہ پھاڑ کر ان کے سامنے

پھینک دیا۔

19 پنجاب کے چیف منسٹر قزلباش صاحب ایک کارخانے کا پرمٹ دے رہے

تھے کہ اسی دن فوجی انقلاب آ گیا اور ان کی وزارت نے دم توڑ دیا الغرض:

جس جگہ، ہم نے بنایا گھر، سڑک میں آ گیا

ان مسلسل نا کامیوں نے مجھ کو چکرا دیا۔ شدت یاس اور ہجوم افلاس نے میرا احاطہ

کر لیا۔۔۔۔۔ نقوی صاحب جو ایک ہزار روپیہ بطور قرض دیتے تھے وہ اس قدر کم تھا

کہ میرا گھر چلا نہیں سکتا تھا اس لئے اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے زیور بیچ بیچ کر

کام چلانے لگا۔

میں نے سوچا کہ یہ کاغذ کی ناؤ کب تک چلے گی۔۔۔۔۔ بیوی نے کہا ساری مددیں

آدھی کر دو اس کی لپیٹ میں آ کر، شراب ترک کر دی۔۔۔۔۔ ترک شراب کے بعد،

میرا اس بچے کا سہاواں وہ گیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے شراب کی پھڑکن سے نجات

پانے کے واسطے شام ہی سے کھانا 1 کھالیا کرتا تھا لیکن بے چینی میں کمی نہیں آتی تھی

جی بہلانے کو کتاب اٹھا لیتا تھا کہ شراب کی کلک بہل جائے کتاب کی سطریں ناگنوں

کے مانند ریگنے لگتی تھیں اور حروف کے دائروں میں بچھوڑ نک اٹھائے نظر آتے تھے۔

گڑ مڑا کر بستر پر لیٹ جاتا اور کروٹوں پر کروٹیں بدلتا تھا لیکن نیند کسی طرح بھی

نہیں آتی تھی اور تمام جسم میں کھجلی ہونے لگتی تھی، گھنٹوں کھر کھر کھجایا کرتا



1 کھانے کے بعد شراب کی خواہش باقی نہیں رہتی۔

اور چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کے مانند رات رات بھر تڑپتا رہتا تھا۔۔۔۔۔ اور صبح کو جب خط بنانے کے واسطے آئینے کے سامنے بیٹھتا تھا تو اپنا بے خوابی کا رونا ہوا تنہیا کا سامنہ دیکھا نہیں جاتا اور اپنی شکل دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تھوڑا قسم کے مسکین شاہ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے دانت نکال نکال کر بھیک مانگ رہے ہیں۔ اگر کسی دن کتے کی سی چھپکلی آ بھی جاتی تھی تو اتنے برے برے اور ٹوٹے ٹوٹے خواب دیکھتا تھا کہ بار بار بھق سے آنکھ کھل جایا کرتی۔۔۔۔۔ اور گھڑی کی ٹک ٹک دل پر گھن چلانے لگتی تھی۔

نہ جانے کتنے سنسناتے سیلے پاٹ سوکھے روکھے پھکے ڈکارتے ڈستے پھنکارتے بھیا نک اور بھنبھوڑتے خواب دیکھ ڈالے اس زمانے میں ان خوابوں میں سے ایک خواب 1 درج کر رہا ہوں:

تکے پر سر رکھا، اندازہ ہو گیا کہ آج بھی پایاب، اور اوچھی نیند آئے گی۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر چت پڑا رہا۔۔۔۔۔ بدن سنسنانے لگا آہستگی سے دہنی کروٹ لی۔۔۔۔۔ دہنی کروٹ کو پھر بائیں کروٹ میں تبدیل کیا۔۔۔۔۔ دماغ کو خالی کر کے چاہا کہ اس میں نیند کو آباد کر دوں۔۔۔۔۔ رفتہ رفتہ سانس میں ہمواری پیدا ہونے لگی اور سر پر ایسے آہنگ کے ساتھ نیند منڈلانے لگی جیسے اترتے وقت جہاز کی آواز۔۔۔۔۔ شاید بیس پچیس منٹ میں سو گیا اتنے میں کسی احمق نے فریج میں کوئی چیز رکھ کر دھڑام سے اس کا دروازہ بند کر دیا۔۔۔۔۔ اوچھے کا پیار، بابو کی دیوار۔۔۔۔۔ اس دھڑاکے سے نیند اچٹ گئی اور آکف ہو کر ہنہانے لگی اور دماغ تپ تپ ہونے لگا دل نے کہا ارے غضب ہو گیا اب نیند نہیں آئے گی گھبرا کر سیدھے ہاتھ کی طرف کروٹ بدلی کمبل کو سینے تک کھینچ لیا چادر سے کے گووشے کو گل تکیہ بنالیا۔۔۔۔۔ اور دماغ کو اس تصور کی موجوں سے ترانے لگا کہ میں اپنے ریزرو کمپارٹ منٹ میں سفر کر رہا ہوں

1 اس خواب کو صبح ہوتے ہی لکھ لیا تھا اس لئے محفوظ رہا۔

گھنے اور اندھیرے جنگل سے ریل ستار بجاتی گزر رہی ہے تھوڑی دیر میں دوبارہ ہلکی سے جبا بی نیند آنے لگی ایسا لگا کہ دماغ پر اس گر رہی ہے پھر ہلکے سے کھرے نے میرے وجود کو ڈھانک لیا ریل چھکا چھک چلی جا رہی ہے اور میں سو رہا ہوں خدا خدا کر کے نیند آگئی تو خواب دیکھا کہ سامنے ایک بڑا سا میدان ہے جہاں خیمہ نصب کرنے کے لئے میخیں ٹھونکی جا رہی ہیں کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ۔۔۔۔۔ اس کے بعد ایک دل بادل خیمہ نصب کر دیا گیا ہے خیمے کے اندر باہر بڑے بڑے گیس کے ہنڈے روشن کئے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد دس پندرہ فراش آگئے اور بڑی بڑی دریوں کو زور زور سے جھٹک کر بچھا رہے ہیں دریوں کے جھٹکے جانے سے گرداڑ رہی ہے گرد سے مرچوں کی دھانس آ رہی ہے۔۔۔۔۔ ایک کچھو داڑھی کا فراش چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے اے رمضیا سالے، زندہ ہے کہ مر گیا ارے اگان دان لا اگال دان۔

اب کچھ لوگ خیمے میں داخل ہو رہے ہیں ان کی ٹوپیاں دو دو گز لمبی ہیں ٹوپوں پر مرغے کڑھے ہوئے ہیں کچھ لوگوں کے سروں پر بڑے بڑے کالے پگڑ ہیں پگڑوں کے اوپر گیا بیتال بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں ان کے جسموں پر چیتے کی کھال منڈھی ہوئی ہے جوتوں کی ڈوریوں میں مگر مچھ بندھے ہوئے ہیں ان کی جیبوں سے بار بار بندر جھانک رہے ہیں بندروں کی گردنوں میں ناگوں کے مغر پڑے ہوئے ہیں اور جب وہ لوگ بیٹھ گئے قالینوں پر تو بیٹھتے ہی ان کی ناکیں دفعۃً چھ چھ فیٹ لمبی ہو گئیں اور ناکوں کی چونچوں پر ریچھنا چنے لگے۔۔۔۔۔ اوہو، ایک مشعلچی بڑھتا چلا آ رہا ہے اس کی ٹھڈی پر لنگور کی دم کی سی پتلی داڑھی ہے۔۔۔۔۔ اور اس کے پیچھے پیچھے ایک پورا طائفہ چلا آ رہا ہے بڑے زبردست ہنگامے کے ساتھ۔۔۔۔۔ طائفہ خیموں کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ حاضرین حقے پینے اور سازندے ساز ملانے لگے۔۔۔۔۔ سازوں کے ملنے سے دوخوں خوار بلیوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں

[illegible]

اتنے میں یہ دیکھا کہ مشکل سے دو باشت کا ایک بونا گل مجھے رکھے مٹکتا چلا آ رہا ہے اس کے گلے میں ایک بڑی سی دیگ لٹکی ہوئی ہے اور وہ لوہے کے ایک ٹکڑے سے اس دیگ کو ٹن ٹن ٹن بجا بجا کرتا ل دے رہا ہے۔۔۔۔۔ اتنے میں کیا دیکھا ہوں کہ اس کی دیگ سے ایک مرہٹہ کود پڑا اور جھانجھیں بجانے لگا اور جھانجھیں اس زور سے بجنے لگیں کہ مجھ بد بخت کی آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ گھڑی تین بج رہی ہے اور سیف شاہ جہاں پوری کا یہ شعر دماغ میں گونج رہا ہے:

دل کی لگی شب فراق اپنا اثر دکھائے گی  
لیو گے، لاکھ بن کے تم نیند کبھی نہیں آئے گی

سہروردی صاحب اسی اثناء میں سہروردی صاحب کو وزیراعظم بنا دیا گیا اور میں اس فکر میں پڑ گیا کہ لاسنوں کے چکر سے نکل کر میں نے ”باپ قرطاس و قلم“ و ایکادمی آف لیٹرز کے نام سے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کو سہروردی صاحب کی بارگاہ میں کیوں کر پیش کروں اور جب میں نے اپنے ایک مخلص دوست منان خاں ایڈووکیٹ سے اس کے متعلق مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں محمود الحق صاحب عثمانی، جو سہروردی صاحب کے مقرب خاص ہیں ان سے کہوں گا کہ وہ آپ کو سہروردی صاحب سے ملا دیں۔۔۔۔۔ چنانچہ ایک روز منان

خاں عثمانی صاحب کو لے کر خود میرے گھر آگئے اور معاملہ طے ہو گیا اس کے دوسرے ہی دن عثمانی صاحب نے مجھے سہروردی صاحب سے ملا دیا سہروردی صاحب نے میری تجویز کو بہت پسند کیا اور وعدہ فرمایا کہ میں اکیڈمی قائم کرا دوں گا۔

لیکن میری بدبختی دیکھئے کہ دوسرے ہی دن عثمانی اور سہروردی کے مابین ایسا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ ان کی آمد و رفت ہی بند ہو گئی اور میں بے آسرا ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بیگم شائستہ<sup>1</sup> اکرام کراچی آگئیں اور آفتاب احمد خاں، وزیراعظم کے سیکرٹری بلکہ دست راست بن گئے۔۔۔ اور چوں کہ یہ دونوں مجھ کو بہت پہلے سے جانتے تھے، انہوں نے میری بڑی دست گیری کی۔

بیگم صاحب، سہروردی کی، رشتے کی بہن تھیں انہوں نے میرے مبالغہ آمیز ”محامد و محاسن“ کچھ اس طرح دلنشیں کر دینے کہ سہروردی صاحب جو خود بھی ایک ادبی اور صاحب جو ہر آدمی تھے مجھ پر بے حد مہربان ہو گئے اور مجھ کو اجازت دے دی کہ میں جب بھی جی چاہے بلا روک ٹوک ان کے پاس آ جایا کروں۔

اس طرح آفتاب احمد خاں نے بھی سہروردی پر میرا سکہ جمانا اور میرا ہاتھ بٹانا<sup>2</sup> شروع کر دیا اور میری تجویز حرکت میں آ گئی۔

حسن اتفاق، یا میری خوش قسمتی کہئے کہ اس اثناء میں زبیری صاحب مرحوم تعلیمات کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔۔۔ وہ نہایت ذی علم و ادب نواز انسان تھے میری امداد پر تل گئے اپنی زبردست سفارش کے ساتھ انہوں نے میری کارروائی فنانس بھیج دی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں فنانس سیکرٹری ممتاز حسن صاحب سے مل لوں۔

ممتاز حسن صاحب کا نام سن کر میں چکرا گیا۔

1 میں اپنے ان دونوں محسنوں کو تا مرگ فراموش نہیں کر سکوں گا

2 آفتاب صاحب کے توجہ دلائے پر سہروردی صاحب نے لٹریچر سے مجھے



پانچ ہزار روپے بھی بھیجے تھے پانچ ہزار روپے اس وقت پانچ لاکھ معلوم ہوئے تھے۔  
 اور اس چکرانے کے دو اسباب تھے پہلا سبب تو یہ تھا کہ چونکہ 1942ء میں دہلی  
 کے ایک مشاعرے کی شرکت کے سلسلے میں، ہمارے مابین ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ  
 چکا تھا، اور اس لئے میں سمجھتا تھا کہ وہ کسی مفید ملک کام میں بھی میرا ساتھ نہیں دیں  
 گے، اور دوسرا سبب یہ تھا کہ حدیث متواتر کے طور پر میں یہ سن چکا تھا کہ ممتاز حسن  
 صاحب، اس بدنصیب صوبے کے دشمن جانی ہیں جس کو ”یو پی“ کہتے ہیں لیکن میں ان  
 سے کیوں کر نہ ملتا۔ ارتکاب ازواج کے بعد باپ اور نانا بن چکا تھا ان سب کو پالنا  
 کیوں کر اس لئے، اپنی اوقات پر لعنت بھیجتا ہوا دفتر مال پہنچا۔ پہنچتے ہی قدم دو دامن  
 کے ہو گئے۔۔۔۔۔ ٹھنڈی انگلیوں سے اپنا نام لکھ کر، پرچہ اندر بھیج دیا۔

چرا اسی نے آکر کہا اس وقت ایک صاحب وہاں بیٹھے ہوئے ہیں آپ پی اے  
 کے کمرے میں انتظار کریں دل نے کہا اور آؤ پاکستان خون کے گھونٹ پئے اور پی  
 اے کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا پی اے صاحب نہ تو کھڑے ہوئے نہ ہاتھ ملایا، مجھ کو  
 فرعون کی طرح دیکھا، اور کام کرنے لگے۔ دل نے کہا مبارک ہو خاں صاحب،  
 پاکستان کی طرف سے یہ عزت افزائی جی چاہا کہ کمرے سے نکل جاؤں پھر سوچا کہ ہم  
 تو طارق کی طرح کشتی جلا کر آئے ہیں اب کہاں جاسکتے ہیں۔

ابھی مشکل سے چھ سات منٹ اس عذاب میں گزرے تھے کہ کیا دیکھتا ہوں، کہ  
 خود ممتاز حسن صاحب میرے سامنے کھڑے، اور معذرت خواہی کر رہے ہیں۔۔۔۔۔  
 ممتاز صاحب کی اس غیر متوقع اور غیر معمولی شرافت نے مجھ کو حیرت میں ڈال دیا او  
 ر میرے دل کو ان کی جانب جھکا دیا اور میں اپنے سورطن پر دل ہی دل میں ملامت  
 کرنے لگا۔

اپنے کمرے میں لے جا کر انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ آپ کی اکاڈمی کی تجویز  
 بہت لمبی چوڑی ہے اگر آپ اس کو تدوین لغت تک محدود کر دیں تو فنانس اس کی

منظوری دے دے گا مجھے اپنی اس تجویز کے بچاؤ پر افسوس ہوا لیکن میں بے چارہ کر ہی کیا سکتا تھا ناچار اسی شکل کو غنیمت سمجھا، میں نے ان کی بات مان لی، ترقی پر اردو بورڈ وجود میں آ گیا، اور میری کئی سال کی عرق ریزی اور سعی مسلسل مشکور ہو گئی۔

بورڈ بن گیا تو انجمن ترقی اردو کے صدر مولوی عبدالحق صاحب کو رکنیت کی دعوت دی گئی مولوی صاحب مجھ کو ناپسند کرتے تھے، اس لئے انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر مجھ کو لغت کا چیف ایڈیٹر نہیں بنایا گیا تو میں رکنیت کی دعوت کو ٹھکرا دوں گا۔

ممتاز حسن صاحب نے عبدالحق صاحب کی اس ضد پر منہ بنایا۔۔۔۔۔ لیکن، کچھ سوچ کر منظور کر لیا اب کیا تھا، عبدالحق چیف ایڈیٹر ہو گئے۔۔۔۔۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں لغت کا کام ہونے لگا میں نے بورڈ کے لئے دوڑ دھوپ کر جو عمارت کرائے پر لی تھی وہاں چند کلرک رہ گئے اور میں ممتاز حسن صاحب نے مجھ کو ”مشیر ادب“ کا عہدہ دے دیا سب سے زیادہ میری تنخواہ مقرر کر دی لیکن عبدالحق صاحب نے کوئی سوایا ڈیڑھ برس تک مجھ سے کوئی کام ہی نہیں لیا اور میں دفتر میں بیٹھا تنخواہ لیتا، مکھیاں مارتا اور یہ سوچتا رہا کہ میں نے جس دفتر کو، کئی سال خون پانی ایک کرنے کے بعد قائم کرایا تھا مجھ کو اسی دفتر میں ”چوں مد بحساب اندر“ بنا کر رکھ دیا گیا ہے بے کاری، اور مفت کی تنخواہ داری سے تنگ آ کر میں نے آخر ممتاز صاحب کو لکھا کہ مجھ سے لغت نویسی کا کام لیا جائے۔۔۔ اور جب انہوں نے مجھ کو لغت نویسی پر مقرر کر دیا تو مولوی عبدالحق صاحب کو اس قدر تاؤ آ گیا کہ وہ ادارت و رکنیت، دونوں سے، دست برداری پر آمادہ ہو گئے۔

اس کے بعد بورڈ کے سیکرٹری شان الحق صاحب حقی کا مولوی عبدالحق اور شوکت صاحب سبزواری سے سخت بگاڑ ہو گیا۔ اور گرم گرم مراسلت کا سلسلہ چھڑ گیا مولوی صاحب کے انتقال کے بعد لغت کا کام بورڈ کے دفتر میں ہونے لگا۔ اور حقی صاحب و سبزواری صاحب کے مابین ظاہری مصالحت تو ضرور ہو گئی، لیکن دلوں میں کدورت

باقی رہی، اور انشاء اللہ تا قیامت باقی رہے گی اس لئے کہ ارباب یوپی اور اہل دہلی کی فطرت ہی یہی ہے۔

اس کے بعد حقی صاحب کے دل میں مجھ سے کبھی گرہ پڑنا شروع ہو گئی۔ برتاؤ تو ہمارے درمیان خوردانہ و بزرگانہ ہی رہا۔ لیکن چونکہ حقی صاحب کا یہ درپردہ مطالبہ رہتا ہے کہ لوگ ان کے روبرو جھکتے رہیں، اور میں نے ان کے اس مطالبے کو خوراک نہیں پہنچائی اور جب وہ مطالبہ مسلسل بھوکا رہنے لگا تو وہ سوچنے لگے کہ مجھ کو کس طرح زک پہنچا سکتے ہیں اور آخر کار، اللہ نے ان کو وہ موقع دے ہی دیا۔

غالباً اگست 1967ء میں رخصت لے کر، میں اپنے ملیح آباد کے باغوں کے تصفیے کی خاطر ہندوستان گیا۔ اور باغوں کے معاملے نے اس قدر طول کھینچا کہ مجھے وہاں چار مہینے رہنا پڑا۔ باغوں اور مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا انصاری صاحب کسی اخبار کے نمائندے کو لے کر انٹرویو کے لئے آئے۔۔۔۔ اور میرا انٹرویو کسی انگریزی اخبار میں شائع ہو گیا۔۔۔۔ رخصت کے اختتام پر جب لاہور پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ میرے بمبئی کے معصومانہ انٹرویو کو نئے نئے معافی پہنا کر، یہاں کے اخباروں نے خوب اچھا لا اور مجھ کو پاکستان دشمن ٹھہرا دیا ہے مجھ کو یہ سن کر افسوس تو ضرور ہوا لیکن تعجب بالکل نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ جب حدیث اور قرآن کو اپنے سانچے میں ڈالنے کے لئے تاویلات کے ذریعے سے بدل دیا جاتا ہے تو میرا انٹرویو کیا چیز ہے لاہور میں ان اخباروں کا ابطال شائع کرا کے جب کراچی آیا اور دفتر پہنچا تو حقی صاحب نے بڑے گستاخانہ انداز میں مجھ سے مراسلت شروع فرمادی۔

اور آخر کار، اس غیر شریفانہ سلسلے کو بند کر دینے کے واسطے میں نے حقی کو لکھ بھیجا کہ میں جس خاندان کا رکن اور جس مزاج کا آدمی ہوں اس مزاج کا آدمی ٹوٹ تو سکتا ہے لیکن لچک نہیں سکتا۔ اگر آپ میری معاش پر ضرب لگانے کی ٹھان چکے ہیں تو:

نگاہ گرم سے، حالت ہو دل کی اور تباہ

اگر یہی ہے ارادہ تراء تو بسم اللہ  
میری اس آخری تحریر کے بعد حقی صاحب کا مراسلہ آیا کہ اب مجھے تو سب سے نہیں دی  
جائے گی میں دفتر سے قطع تعلق کر کے گھر آیا اور حقی کے گھر میں گھی کے چراغ جلنے  
لگے۔

لیکن اس خبر کو حقی صاحب نے کسی اخبار میں شائع نہیں ہونے دیا، تا کہ ان کا پول  
نہ کھلنے پائے اور جب ہندوستان کے ریڈیو نے میری برطرفی کا اعلان کیا تو یہاں کے  
اخبار نے، بڑی ڈھٹائی کے ساتھ، اس کی تردید کرتے ہوئے الٹا اس کو جھوٹا قرار  
دے دیا۔ چہ لا درست دزدے۔۔۔۔۔ میری زندگی کا بھدا اللہ کہ یہ پانچواں معاشی  
بحران ہے، جس سے کہ اس وقت گزر رہا ہوں ہر چند میری ملازمت کو ختم کر دیا گیا میرا  
پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا گیا ہے میری سیمنٹ کی ایجنسی بھی مجھ سے چھین لی گئی  
ہے۔۔۔۔۔ اور میرے باغوں کا جو روپیہ ہندوستان کے ریزرو بینک میں جمع ہے وہ  
بھی مجھے یہاں نہیں مل سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ ہر چند، خدا کے فضل و کرم سے میرا  
کوئی بینک بیلنس بھی نہیں ہے لیکن میں بدحواس نہیں ہوں بدحواسی تو درکنار میں پہلے  
ہی کی طرح ہشاش بشاش ہوں اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ میرا یہ بحران بھی میرے چار  
عدد سابق بحرانوں کے مانند، کسی خیر جدید کا سرچشمہ بن جائے گا۔

مجھ کو اس امر کا یقین کس بناء پر ہے؟ یہ بھی سن لیجئے:

میں جب حیدر آباد گیا تھا اور سر اکبر حیدری کی سی طاقت و شخصیت سے بگاڑ پیدا  
ہونے کے بعد جب میرے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔۔۔۔۔ اس وقت  
نظام نے میری خاطر، ایک جدید و غیر ضروری عہدہ خلق کر کے مجھے برسر روزگار بنا دیا  
تھا۔

جب دکن سے میرا اخراج ہوا تھا۔۔۔۔۔ اس وقت سردار روپ سنگھ اور سروجنی  
ٹانڈو نے میری مدد کی تھی اس کے بعد شیونرائن نے ہاتھ بٹایا تھا اور جب شیونرائن نے



ساتھ چھوڑ دیا تھا،۔۔۔ اس وقت مہاراجہ پٹیالہ میری پشت پر آکر کھڑے ہو گئے تھے جب بمبئی میں نان شبیہ تک سے محروم ہونے کا وقت سر پر آ پہنچا تھا اس وقت پنڈت نہرو نے میری دستگیری کی تھی۔

جب نقوی صاحب کی دعوت اور بھروسے پر یہاں آیا تھا اور نقوی صاحب کی کمشنری جاتی رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت سہروردی صاحب شائستہ اکرام، آفتاب احمد خاں، زبیری صاحب، اور ممتاز حسن صاحب نے میری تجویز کو منظور کر کے ترقی اردو بورڈ بنایا اور میری معاش کا بندوبست کر دیا تھا۔

سوچتا ہوں کہ جب کوئی نامعلوم تو انائی یا حسن اتفاق کی تکرار ہر برے وقت پر میرا ساتھ دیتی رہی ہے اور ہر موقع پر کوئی اللہ کا بندہ ”مردے از غیب“ کی طرح چپکے سے آکر اور میری مصیبت کے پہاڑ کاٹ کر، غائب ہو جاتا ہے تو مجھ کو اس بحران کی بھی کوئی پروا نہیں کرنا چاہئے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس بحران کا سر بھی میرے قدموں پر جھک کر رہے گا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں، ایک جنبش میں  
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے!  
اور اسی بناء پر جس دن میری نوکری چھٹی تھی تو نوے یا مرثیے کے بدلے میں نے  
اسی روز ایک نظم ”ترانہ بہار“ کے نام سے کہی تھی آپ بھی سن لیں اور داد دیں۔

لو اٹھا جھوکر، وہ ابر بہار  
والشر بو، والشر بو، اعلیٰ الابصار  
آؤ، ”یا ہو“ کی گونج میں وہ الپ  
کہ دو عالم ہوں رقص پر تیار  
آؤ، وہ دھن، کنشت میں چھیڑیں  
جھوم جائیں، بہشت کے اشجار

خطہ برف سے اگائیں آگ  
 آگ میں لہلہائیں پھر گل زار  
 سنگ و آہن کو بخش دیں آہنگ  
 خار و خس کو عطا کریں چہکار  
 کھٹ کھٹائیں، سب کے دستے سے  
 باب آگاہی و در اسرار  
 آج، یہ راز فاش کر دیں آؤ  
 کہ رئیسان شہر ہیں نادار  
 آؤ، دربار کج کلاھاں میں  
 عاجزی کو سکھائیں استکبار  
 بخش دیں، رہ نشیں گداؤں کو  
 حکم سلطان سے جرات انکار  
 گنج باطل کو چھوڑ دیں شاخیں  
 دست قاتل کی توڑ دیں تلوار  
 آندھیوں کو بنائیں، موج نسیم  
 زلزلوں کو سکھائیں وضع قرار  
 نار گیتی سے بین لیں شعلے  
 مار گردوں سے چھین لیں پھنکار  
 آؤ عرفاں کے یوں سب چھلکائیں  
 کہ الٹ جائیں، اولیائے کبار  
 یوں کریں، شرح وحدت آفاق  
 ایک ہو جائیں کافرو دیں دار

ذرہ و آفتاب کے مابین  
 ڈال دیں، آؤ، طرح بوس و کنار  
 آؤ، یوں، دھوم سے گال اڑائیں  
 کہ گلابی ہو، کھکشاں پہ سوار  
 آؤ، پیدا کریں، بگردش جام  
 وقت اندک میں، فرصت بسیار  
 آؤ، عمر خضر کو، چکرا دیں  
 تپ و تاب لمحہ سرشار  
 آؤ، ذرات کو، عطا کر دیں  
 تتلیوں کے پروں کے نقش و نگار  
 لائی، پھر، بوئے زلف لا محدود  
 مرحبا، مرحبا، نسیم بہار  
 ہاں اب اے دل نواز سازندے  
 اور کچھ اور تھاپ کی گمگار  
 اور پھر جائے، این و آن سے نگاہ  
 اور گھر جائے ابر زمزمہ بار  
 اور بڑھ جائے، صحت مستی  
 اور چڑھ جائے نرگس بیمار  
 اور ہو تیز، اے نسیم شمال  
 اور ہو تند، اے ہوائے چنار  
 اور اے ابر سرگیں، دھال  
 اور اے آب آتشیں دہکار

اور	مہکو	ہزارہ	وسوسن
اور	بہکو،	ثوابت	و سیار
اور	بوجھل	ہو	مے کدے پہ گھٹا
اور	گٹھل	ہو،	احتیاط کی دھار
اور	ساز	الست	کی آہنگ
اور	رندان	مست	کی بنکار
اور	شیشوں	کی	انجمن میں کھنک
اور	بوندوں	کی	شاخ سے پڑکار
ہاں،	اہل	اے	شراب کا کل درخ
ہاں	بدل،	اے	مزاج لیل و نہار
ہاں،	لہر دے	میں	گھوم جائے گھٹا
ہاں	کھردے	میں	جھوم جائے نکھار
بدلیو،	ہاں،	یہی	گرج، ہر آن
بجلیو،	ہاں	یہی	کڑک، ہر بار
خوف	شب	خوں	پہ، ہاں یہی پتھراؤ
جور	گردوں	سے	ہاں یہی پیکار
ہاں،	یہی	بھیڑ	بھاڑ، اے رندو
ہاں،	یہی	چھیڑ	چھاڑ اے بوچھار
ہاں	یہی	نغمہ	ہو الوجود
ہاں	یہی	نعرہ	ہو الغفار
ہاں	گدایان	کوئے	پیر مغاں
یوں	جگا	دو،	لیوں پہ، صوت ہزار



کہ سلاطین آسماں اور نگ  
 مانگے آئیں، رقص و رنگ ادھار  
 یوں ابلجھنے لگے، گھٹا سے ہوا  
 کہ سلجھنے لگیں، نشاط کے تار  
 کھول دو، ہاں، زمین کے غرنے  
 بول دو، آسمان پر، یلغار  
 یوں، پھرکنے لگے رگوں میں سرور  
 کہ تھرکنے لگے چمن کا نکھار  
 مست رامش گرو، دھنوں میں گھماؤ  
 نغمہ بھرو موجہ انہار  
 یوں ستاروں پہ، متصل جھالے  
 کہ پڑے دور تک مہین پھوار  
 یوں مان آڑے سروں کو قوس بناؤ  
 کہ جھلک جائے مصر کا بازار  
 مغنچو گھوم کر کمر لچکاؤ  
 مطربو، جھوم کر اٹھاؤ ستار  
 گرہ زلف ناز و بند قبا  
 کھول دو، دختران قاف و تار  
 یوں، نقائیں اٹھاؤ مکھڑوں سے  
 کہ گلابی کو، توڑ دیں، رخسار  
 اس ٹھکانے کے ساتھ بھاؤ بتاؤ  
 کہ بدل جائے وقت کی رفتار

بوئے گل کو بناؤ خیمہ زر  
 رنگ مل کو بجاؤ سلسلہ وار  
 اس انوکھی لٹک سے توڑا کو  
 کہ دھڑکنے لگے دل کہار  
 لے کو پہناؤ ادکھلی چولی  
 سر پہ جھمکاؤ، لٹ پٹی دستار  
 اس جونئی دھمک سے رقص کرو  
 کہ گمکنے لگیں، در و دیوار  
 یوں ہو چھم چھم کہ فرش بن جائے  
 تند قلزم کی سطح ناہموار  
 توڑ دو جال، اے زمان و مکاں  
 تال دو، تال اے یکمین و یسار  
 ہاں، گلوں کی خمیدہ لیکھوں پر  
 کم سنو، یونہیں، پتیوں کی قطار  
 اے بتوں کی چھبو، یہی جادو  
 اے گلابی لبو، یہی مہکار  
 مدد بھری پاگلو، یہی چھل بل  
 گھومتی چھاگلو، یہی جھنکار  
 نشر کرنا ہیں، جوش کے نعمات  
 ہاں، اٹھو، اے پیمبران بہار!!

دیکھے، آپ نے میرے تیور؟ ایسی تیزی اس بحران کی برپا پوش قلندر!!!

بھدا اللہ کہ میری نوکری چھٹے 1 ہوئے اب ایک مدت گزر چکی ہے جس روز میں

حضرت حق کے فضل و کرم اور حقی صاحب کے قلم فیض رقم سے برطرف کر دیا گیا تھا، اس روز پورے دن نہ سہی چند گھنٹے تو ضرور پریشانی رہی تھی لیکن میری بیوی کی ہمت اور میری عزیمت نے اس وقتی پریشانی کو شام ہوتے ہوتے، کہنی کی چوٹ کے مانند فراموش کر دیا تھا۔

اور اب چونکہ وہ سارا معاملہ رونے والے روچکے اور ہنسنے والے ہنس چکے

1 نوکری چھوٹ جانے کے بعد میں نے موسیٰ خاں، فدا حسین صاحب، اور خود صدر پاکستان کو اس مفہوم کے خط لکھے تھے کہ اب میں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ کبھی سرکاری نوکری نہیں کروں گا البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تمام حجت کے طور پر اس غلط فہمی کو دور کر دوں جو حکومت کے دل میں میری طرف سے پیدا ہو گئی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں حکومت سے کسی خیر کا طالب نہیں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ معاملے کی صفائی کر کے اپنے کو مزید شر سے محفوظ کر لوں۔ اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میں قید سے لے کر قتل تک اپنے کو آمادہ پاتا ہوں اس لئے اپنی صفائی میں دروغ بیانی سے کام نہیں لوں گا اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو سچائی کے ساتھ بیان کر دوں گا۔۔۔ ان خطوں کا حشر یہ ہوا کہ فدا حسین صاحب، اور صدر پاکستان نے تو مجھے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتی البتہ موسیٰ خاں نے جواباً لکھا کہ میں اپنی شکایات لکھ بھیجوں لیکن میں نے اس ننگ کو گوارا نہیں کیا اور ان کو لکھ بھیجا کہ میں اب ان کو کبھی خط نہیں لکھوں گا۔۔۔۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کر دیا کہ روح کو بلا گویا رہے کہ میں نے ”اتمام حجت“ میں کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے۔

اک پرانا واقعہ ہے، خانہ ویرانی مری کے حدود میں داخل ہو کر گل دستہ طاق نسیاں بن چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ چونکہ میں اپنے بزرگوں کے ناموس اور اپنی عزت نفس کو شاہد بنا کر، یہ قسم کھا چکا ہوں کہ مر جاؤں گا لیکن اب سرکاری ملازمت کا ارتکاب نہیں کروں گا یعنی ”اب کھائی تو

کھائی، اب کھاؤں تو، رام دہائی، تو اس منزل میں اگر اب میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کا ارادہ کروں گا تو مجھے یقین ہے کہ میرے اس عمل کو حکومت کی خوشامد یا ملازمت کی آرزو نہیں سمجھا جائے گا اور اسی بناء پر میں بباگن دہل اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ 1946ء کے اواخر میں میرے خلاف ارادی غلط گوئی یا شدید غلط فہمی کی بناء پر جو یہ پروپیگنڈا فرمایا گیا تھا کہ میں پاکستان کا دشمن، یا صدر پاکستان کا مخالف ہوں قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تھا حیرت ہے کہ اس موٹی سی بات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ میں پاکستان کا دشمن ہوتا تو اپنی دولت، اپنی عزت، اپنی فراغت، اپنے احباب، اپنے بزرگوں کی ہڈیوں سے منہ موڑ کر اور اپنے ناز بردار جواہر لال نہرو کا دل توڑ کر یہاں آتا کیوں؟

اگر اس موقع پر کوئی زبوں حال صاحب یہ فرمائیں کہ مجھے دولت کی طمع یہاں کھینچ کر لے آئی تھی تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں میرے واسطے کس چیز کی کمی تھی کہ میں اس کمی کو پورا کرنے یہاں آتا۔۔۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میں ان بزرگ وار سے یہ بھی عرض کروں گا کہ وہ میرے مزاج اور میری زندگی کے حالات سے اگر واقف ہوتے اور ان کو یہ معلوم ہوتا کہ میں ایک لکھ لٹ انسان رہا ہوں، اور لکھ لٹ انسان کبھی لالچی ہو نہیں سکتا تو وہ میرے باب میں اس قدر اچھی بات کہنے کی کبھی جرأت نہ فرماتے۔۔۔۔۔

اور بالفرض محال تھوڑی دیر کے واسطے یہ مان بھی لیا جائے کہ مجھ کو طمع کھینچ کر یہاں لائی تھی لیکن جب نقوی اور سکندر مرزا کے زوال کے بعد مجھ پر عرصہ حیات تنگ ہوا کرتا تھا اور میری پریشانیوں کا حال سن کر جب پنڈت جی نے مجھ سے کہا ابھیجا تھا کہ میں پاکستان کو ترک کر کے ہندوستان آ جاؤں تو اس وقت میں نے ہندوستان جانے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟

اور اب، جب کہ میں پاکستان میں اپنا مکان بھی بنوا چکا ہوں، اور یہیں کی خاک



میں دفن ہو جانے پر بھی آمادہ ہوں تو کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ مجھ کو پاکستان دشمن کہہ کر اپنے خبث نفس یا اپنی حماقت کا اعلان فرما دے۔

پھر کان کھول کر سن لیجئے کہ میں ان خیالات کا اظہار اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ خدا نخواستہ حکومت مجھ پر مہربان ہو جائے میں جانتا ہوں کہ ایک میرے سے مزاج، اور ایک میرے سے برہنہ گفتار آدمی پر دنیا کی کوئی حکومت کبھی مہربان ہو ہی نہیں سکتی حکومتیں مہربان ہوتی ہیں بے ضمیروں پر اور میرے پاس ضمیر جیسی خطرناک چیز موجود ہے اور اب جب کہ خدا کے فضل و کرم سے میرے چل چلاؤ کا زمانہ سر پر آ چکا ہے، سوچتا ہوں اب کوئی مہربان ہوا بھی تو کیا اور نامہربان رہا بھی تو کیا۔

راس، اول تو نہ آئے گی، زمانے کی ہوا  
راس بھی، دو دن، زمانے کی ہوا آئی تو کیا  
میں اس نفرت پروردہ و سیاست گزیدہ زمانے میں جب کہ ایک ملک دوسرے  
ملک کو اپنے پیٹ میں رکھ لینے پر تلا بیٹھا ہے اور ملک تو پھر بھی ایک وسیع تصور ہے  
جب کہ ایک صوبہ دوسرے صوبے پر چھری تانے کھڑا ہے یہ بات کس سے کہوں کہ  
میں تمام نوع انسانی کا دوست ہوں اور یہ کہوں بھی تو یقین کون کرے گا، ہر سننے والا  
میرے اس دعوے کو اپنے خبث نفس کی ترازو میں تول کر مجھ کو جھوٹا سمجھے گا لیکن میں  
اپنے سچ کو اس خوف سے دبا نہیں سکتا کہ اس کو جھوٹ خیال کیا جائے گا اس لئے میں یہ  
کہہ دینا چاہتا ہوں جو قیامت کی نوک سے کوئی مانے یا نہ مانے، کہ اب ایک مدت دراز  
سے میرے سینے میں ابوالانسان حضرت آدم کا دل دھڑک رہا ہے میں اس دنیا کے ہر  
قریب دور ملک کو بلا استثناء اپنا وطن اور اس کرہ ارض کے ہر نیک و بد انسان کو بلا استثناء  
اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔

جب کسی کے گھر میں جشن ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں وہ جشن میرے ہی گھر میں ہو رہا  
ہے، اور جب کسی گھر سے کوئی جنازہ نکلتا ہے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ جنازہ

میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ انفس و آفاق، وحدت کی زنجیر میں  
جکڑے ہوئے اور ایک ہی قسم کے عناصر ترکیبی کے مختلف مظاہر ہیں جن میں صرف  
اسم و جسم کا فرق ہے اصلیت اور حقیقت سب کی ایک ہے، اس کائنات میں غیریت کا  
کہیں کوئی نام ہی نہیں ہے اور عینیت کامل سب کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اس عالم  
وحدت و عینیت میں اگر کسی سے نفرت یا دشمنی کروں گا، تو اس کے سوا اور کوئی معنی ہی  
نہیں ہو سکتے کہ میں خود اپنی ذات سے نفرت یا دشمنی کا رہا ہوں۔

اے دوست، دل میں، گرد کدورت نہ چاہئے  
اچھے تو کیا، برے سے بھی وحشت نہ چاہئے  
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہئے  
کانٹے سے بھی مگر تجھے نفرت نہ چاہئے  
کانٹے کی رگ میں بھی ہے، لہو، سبزہ زار کا  
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا!!

☆☆☆☆☆☆

## میری موجودہ زندگی

اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں۔ جان کی اماں پاؤں تو زبان ہلاؤں۔۔۔۔۔  
اللہ اللہ یہ آب و ہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کی علم بیزاری۔۔۔۔۔ یہ پرانی یادوں کی  
کٹاریاں یہ نئے ماحول کی آریاں۔۔۔۔۔ یہ مولد و منشاء سے دوری، یہ غربت کی  
رنجوری۔۔۔۔۔ سینے میں یہ کھٹکتی پھانسیں یہ حالات کی اکھڑی سانسیں۔۔۔۔۔ یہ دل پر  
چلتے بان یہ سر پر کڑکتی کمان۔۔۔۔۔ یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں یہ حکومت کی  
سرگرائیاں۔۔۔۔۔ یہ دوستوں کا نقدان، یہ معاشی بحران۔۔۔۔۔ اور یہ چہرہ زندگی پر  
گرد و غبار کا غازہ اور یہ دوش پر عزت نفس کا جنازہ۔۔۔۔۔

میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو، خون تھوک تھوک کر مر چکا ہوتا۔۔۔۔۔ لیکن مجھے  
دیکھو کہ میں اب بھی جی رہا ہوں اور فقط جی ہی نہیں رہا ہوں آلام حیات پر سکرا بھی رہا  
ہوں ان درد مند یوں کے بولتے گرداب میں لوہے کا جگر درکار ہے، مجھ اللہ کو میرا جگر  
لاہے کا ہے میں ایک دقیقے کے واسطے بھی اپنے کو اداس نہیں ہوتے، دنیا غم کو برابر  
ٹھکراتا رہتا اور:

چوں، غم تو، نہ توں یافت، مگر دردل شاد  
ما بامید غمت خاطر شادے طلبیم

کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالے رہتا ہوں میں خارج سے خوشی کی طلب  
گاری نہیں کرتا خارج میں رکھا ہی کیا ہے میں اپنے باطن میں خوشی بونا، خوشی کی آب  
یاری کرنا، خوشی اگانا، اور خوشی کی بالیاں کاٹتا رہتا ہوں اور مستی کے عالم میں دنیا کے  
تمام بے دردوں کو، مخاطب کر کے گنگنا مارتا ہوں کہ:

تھوڑی سی زندگی تھی بہر حال کٹ گئی  
تم کو، جو ہم پہ رحم نہ آیا، تو کیا ہوا!

حسب معمول قدیم تاروں کی چھاؤں میں، بلاناغہ، ہر روز دو یا تین بجے صبح کو

بیدار ہو کر خوب اچھی طرح کلیاں اور غرارے کرتا، ڈغڈغا کر کٹورا بھر پانی پینا، منہ پر دو چار چھپکے مار کر تولیا سے منہ پوچھتا، اور لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں میز پر اگر جتنی جلتی رہتی ہے اور وہاں پہنچتا ہوں، جس عالم کا، کوئی نام اب تک رکھا ہی نہیں گیا ہے۔

اس وقت کبھی کبھی میرے گرد و پیش ہلکی ہلکی گھنٹیاں سی بجنے لگتیں اور دماغ کے ایوان میں وہ راگنیاں چھڑ جاتی ہیں کہ بقول حضرت اقبال منازاں نغمہ پتیدم کہ سر ددوم نہ تو اں بعض اوقات طبع میں اس قدر ناز کی ہوتی ہے کہ موذن کی آواز گراں گزرتی ہے۔ اور بعض اوقات جب اذان کی آواز سنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کرہ ارض عرش کی جانب پرواز کرتا چلا جا رہا ہے اور تمام ثوابت و سیار زمین کی جانب جھکتے چلے آ رہے ہیں۔

اور جب رات کی گہری سیاہی، سانولے پن میں تبدیل ہونے لگتی ہے تو کتاب و قلم سے دست بردار ہو کر کبھی کبھی انگنائی میں آتا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا اور جب کچھ جواب نہیں ملتا تو بلبلہ بلبلہ کر پوچھتا ہوں۔

اے پچھلے پہر کے غم گسارو بولو

اے مجر گردوں کے شرارو بولو

اس پردہ رنگ و بو میں پوشیدہ ہے کون؟

بولو 1 اے ڈوبتے ستارو، بولو!!

اس کے بعد، اگر ہمت ہوتی ہے تو ٹہلنے کے واسطے نکل جاتا ہوں، یا پھر، مکان ہی میں ورزش کر کے خط بناتا، نہاتا، ناشتہ 2 کرتا، اور پھر لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔۔۔ اور یہ سلسلہ سہ پہر کو دو یا تین بجے تک بڑے تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے پھر نیند آئے یا نہ آئے ایک گھنٹے کے واسطے

1 ایک باریہ بھی ہو چکا ہے کہ تاروں کو دیکھ کر گریبان کے ٹکڑے گرائے اور



بچکیاں لے لے کر اپنے بے پایاں جہل پر رویا بھی ہوں 2 پر تیس برس سے دوپہر کا  
کھانا ترک کر چکا ہوں۔

لیٹ جاتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ حمام کر کے نوشت 1 وخواند کا سہ بارہ آغاز  
کر دیتا ہوں اور شام ہوتے ہی منہ ہاتھ دھو کر مغرب کی طرف نگاہ اٹھا کر سوال کرتا  
ہوں۔

اے دشمن بے پناہ کب ہو گا غروب؟  
اے سنگ رہ گناہ کب ہو گا غروب؟  
پیاسے بیٹھے ہیں کب سے، رندان کرام  
اے شعلہ رو سیاہ، کب ہو گا غروب؟  
اور آفتاب غروب ہو جاتا ہے تب:

دل کی جانب، رجوع ہوتا ہوں میں  
سر تا بقدم، خضوع ہوتا ہوں میں  
جب مہر مہیں، غروب ہو جاتا ہے  
پیانہ بکف، طلوع ہوتا ہوں میں!

اس دشمن بے پناہ کی تجھیز و تکفین کی خوشی میں بڑے چاؤ اور انوکھے رچاؤ کے  
ساتھ، پیانہ بھرتا ہوں اور یہ سوچ کر کہ اس کرہ آفات میں آج کا دن بھی محض حسن  
اتفاق سے بخیریت

1 کھوکھلے اقتدار کی چھچھوری آرزو کے ڈسے ہوئے، ان سفید اور دیوانے  
سیاست دانوں کو جو گلی گلی، ووٹوں کی بھیک مانگتے، کھوئی دولت کی تابرگ نہ سمجھ سکنے  
والی پیاس کے مارے ہوئے ان جاہل اور بورا نے صنعت کاروں یعنی دولت مند  
ناداروں کو جو قریبوں قریوں نوٹوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں اس بات کا مطلق علم  
نہیں ہے کہ اس دنیا میں دولت کی نہیں دماغ کی فرماں روائی ہے اور سرکار قلم کے

دربار میں سکندر اعظم اور قارون پر شکم کی بس اس کے متوالوں کو اس بات کا پتا نہیں ہے کہ نوشت و خواند ایک ایسی بے نظیر عیاشی بھی ہے کہ رجبہ اندر کا اکھاڑ الفظ یا نیا خیال ہاتھ آجاتا ہے تو ان کے جشن ہائے فتح مندی کے زمزے بازار شور بن کر رہ جاتے ہیں اور اور اسرار حیات و کائنات کی تحقیق ایک ایسی بے لوث و گراں قدر عبادت ہے کہ کرو روں حج اکبر اس کا طواف کرتے رہتے ہیں اور جس وقت کہ اس کے نیم دقیقے کو ہزار سالہ زہد پر لا داجاتا ہے تو اس کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں، اور اپیل میں وہ اس اونٹ کے مانند زمین پر اپنا سینہ رکھ دیتا ہے جس کی کمرنا قابل برداشت وزن سے دب کر چٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔

گزر گیا، یہ رباعی پڑھ کر  
جو سامنے آیا تھا، وہ عفریت گیا  
میں ہارنے والا تھا مگر جیت گیا  
اس مرد فگن، صبر شکن دنیا میں  
صد شکر کہ دن آج کا بھی بیت گیا

بھرے پیانے کو نعرہ ”بسم اللہ“ اور ”بیا دفلاں، بنت فلاں“ کے ساتھ لبوں سے لگا لیتا اور ”الحمد للہ“ کہہ کر پیانے کو سامنے کی گھڑی کے قریب رکھ کر شفق پر نگاہیں جماتا حال سے منقطع اور مستقبل سے بے پروا ہو کر ماضی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔

ماضی کے سوا میرے پاس اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔۔۔۔۔ پہلے یاوش بخیر بونل کھلتے ہی طبلے پر تھاپ پڑتی تھی، نازنیوں کی پانکیں جھنک اٹھتی تھیں اور یاران سرمست کے لطیفوں سے محفل گونجنے لگتی تھی۔۔۔۔۔ اب طبلے کی تھاپ کی جگہ مہامات سے اٹھتی بھاپ ہے، پانکوں کی جھنک کے عوض سینے میں بربادی کی کھٹک ہے اور یاروں کے لطیفوں کے بدلے حالات کے کشینے ہیں۔

نہ محرم، نہ شفیق، نہ ہمدے وادم  
حدیث دل بکہ کریم، عجب غمے وادم

میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس اور کم سے کم پندرہ منٹ کے وقفے سے صرف چار  
پیگ پیتا ہوں اور جب تین پیگ ختم کر کے چوتھا پیگ بنانے لگتا ہوں تو ام اشعراء  
پوچھتی ہیں ”کو تھا“ تو میں ”چوتھا“ کہہ کر ہنسنے لگتا ہوں اور جب چوتھا پیگ اُدھا ختم ہو  
جاتا ہے تو کھانا طلب کر لیتا ہوں اور کھانا کھا کر کلیوں اور غراروں سے فارغ ہو کر تکیے  
پر سر رکھ دیتا ہوں اور پھر جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں حسب معمول تاروں کی چھانوں میں  
بیدار ہو کر لکھنے پڑھنے لگتا ہوں

پہلے شراب تھی مایہ نشا طو آب و حیات اور آج ہے خواب نوشی واروئے بے ہوشی  
ہائے، کہاں سے کہاں آگیا میرا کاروان حیات!!

مجھ کو آخر یہ زبردستی جلایا کیوں جا رہا ہے، کیا میں ہی ایک رہ گیا ہوں مشق ستم کے  
واسطے؟ یاں تو جب چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا پا کھ ”ماضی کے سسکیاں لیتے  
سمندر میں ڈوب کر مے کشی کا نہیں تے کشی“ کا آغاز کرتا ہوں تو۔۔۔۔۔ سلونی فضا،  
سینما کے پردوں میں تبدیل ہو جاتی ہے ہر آن پردے اٹھنے اور گرنے لگتے ہیں اور ہر  
پردے کے اٹھتے وقت گھنٹیاں سی بجتیں، اور منادی کی آواز گونجنے لگتی ہے کہ اے جوش  
دیکھ۔۔۔۔۔ یہ تیرا لیج آباد ہے جہاں تو شہزادوں کی طرح رہتا ہے یہ تیرے محل کے  
سقف و بام ہیں یہ وہ انگنائی ہے جہاں تو کھیلا کرتا تھا یہ تیری وہ کھلائی ہے جس نے  
برکھارت میں کلکتے والا ساون گایا اور گھر بھر کو رلایا تھا اور یہ تیرے ماں باپ ہیں میری  
ماں، میری طرف، ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر دور سے میری بلائیں لیتیں اور سر پٹنے  
لگتی ہیں اور میرے باپ بڑی حسرت کے ساتھ میری طرف آنکھیں اٹھاتے اور ”  
ہائے میرا بیٹا“ کہہ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب دوسرا پردہ اٹھتا ہے اور منادی کہتا ہے۔۔۔۔۔ اے جوش دیکھ یہ تیرا سب سے

پہلا شہر درس گاہ سینٹا پور ہے یہ تیرا گنبد غنا اور کعبہ تہذیب لکھنؤ ہے۔۔۔۔۔ یہ تیرا آگرہ ہے۔۔۔۔۔ تیرا حیدر آباد دکن ہے یہ تیری بمبئی ہے اور یہ تیری دہلی ہے میں ان کی گلیوں میں گھومنے لگتا ہوں بہت سے جانے پہچانے لوگ مجھے سلام کرتے ہیں اور جب ان سے ان کے نام پوچھتا ہوں تو پردہ گر جاتا ہے۔

اب تیسرا پردہ اٹھتا ہے، اور منادی کہتا ہے۔۔۔۔۔ اے جوش دیکھ۔۔۔۔۔ یہ تیرے نکھڑے اور زیر خاک سوئے ہوئے احباب یعنی تیرے مورخان شباب ہیں تو انہیں پہچانتا ہے؟ ”ہاں پہچانتا ہوں۔۔۔۔۔ ان کو نہیں تو اور کسے پہچانوں گا“

یہ صف اولیٰں میں کھڑے ہوئے ہیں، ابرار، مختار، مانی، صاحب عالم، مجاز اور مخمور تم سب تو ہمیشہ چہچہاتے رہتے تھے ارے اب بولتے کیوں نہیں؟ تم مجھ کو دیکھ کر مسکرا رہے ہو ہائے تمہارا تبسم تو آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ہے ارے کچھ تو بولو سب رو رہے ہیں اور مجاز، اپنا وہی پرانا گیت بریلی کے بجا رہیں جھمکا گراری سنا رہا ہے میری ہچکیاں بندھ گئیں اور پردہ گر گیا۔

اب چوتھا پردہ جو چھم چھم کی آوازوں کے ساتھ اٹھ رہا ہے منادی آواز دے رہا ہے دیکھ اے جوش۔۔۔۔۔ یہ تیری جوانی کے خیمہ رقص و رنگ کی گانے اور ناچنے والیاں ہیں، اور ایک فتنہ روزگار بڑی غمگین آواز میں گارہی ہے:

لذت سے نہیں خالی، جانوں کا کھپا جانا  
کب، خضر و مسیحا نے، مرنے کا مزا جانا  
اے فتنہ محشر، ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں  
اس راہ سے گزرے تو، ہم کو بھی جگا جانا  
سارنگی سے نوحوں کی آواز نکل رہی ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب پانچواں پردہ اٹھا ہے اور کہنے والا کہہ رہا ہے۔۔۔۔۔ دل تھام کر دیکھ اے جوش یہ تیرے محبوب ہیں جن کے مکھڑوں کی جوت سے، تیری نبضیں چلا کرتی تھیں



جن کی پل بھر کی جدائی بھی تجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور جب روزگار تیرے اور ان کے مابین فاصلہ پیدا کر دیتا تھا تو نیند، تیرے پوٹوں پر صبح تک پر بھی نہیں مارتی تھی اور تیرے تنکے روتے روتے بھگ جاتے۔

اللہ اللہ جگر جگر مکھڑے فضا پر دمک رہے ہیں سب کی آنکھڑیوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں کسی کسی نے اپنی زلفیں سوگ وارانہ انداز سے بکھرا دی ہیں اور کسی کسی نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا ہے اور فضا پر ”ہائے اللہ ہائے اللہ کی آوازیں تیرے لگتی ہیں کہ عین اس وقت یکا یک پشت کی جانب سے ایک آواز آتی ہے ”سنو 1“ میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ آواز ہے میری دن بھر کی اکتائی ہوئی بیوی کی۔۔۔ اور ”سنو“ کے بعد وہ کہنے لگتی ہیں کہ آج نو کرنے حساب میں اتنے پیسے مار لئے، ”فریج میں پانچ انڈے تھے اب صرف تین باقی ہیں سعیدہ کے منہ لے۔“

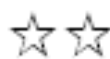
1 بات یہ ہے کہ میری بیوی میرے پڑھنے لکھنے کا بہت احترام کرتی ہیں، اور ہر گز نہیں چاہتیں کہ وہ میری مشغولیت میں خلل انداز ہوں اسی لئے صبح سے وہ گھر کے دھندوں میں لگ جاتی ہیں لیکن فرصت پا کر جب وہ تخت پر بیٹھتیں اور مجھ سے گودین و دنیا سے بے پروا پاتی ہیں تو اکتا کر نیچے اتر جاتی ہیں اور سعیدہ سے کہتی ہیں کہ بیٹیا میں کس سے بات کروں وہ تو پچھلے پہر سے لے کر شام تک سر جھکائے لکھتے رہتے ہیں اور میں سارا سارا دن عقلا تو بنی بیٹھی رہتی ہوں گھنٹے دو گھنٹے کے بعد جب اوپر آتی ہیں مجھ کو اسی عالم میں پاتی ہیں اور کبھی کبھی مجھ پر ترس کھا کر کہتی ہیں ارے اتنی محنت نہ کرو حقہ نہ کرے بیمار پڑ جاؤ گے اور میں ان سے مسکرا کر کہتا ہوں کہ بیوی تم کو معلوم نہیں ایک بالشت بھر کا فرشتہ چھوٹا سا پستول ہاتھ میں لئے میری میز کے اوپر کھڑا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر قلم ہاتھ سے رکھ دیا تو گولی مار دوں گا اور

بیٹے نے آج بڑی بدتمیزی کی میں نے اسے تھپڑ مار دیا اور ہاں میں نے غزالہ سے کہا تھا اوپر آ کر حساب لکھ دینا وہ ابھی تک نہیں آئی تم اسے بلا کر ڈانٹ دو۔۔۔ بیوی

کی یہ باتیں سن کر میری جان نکل جاتی ہے میرے سینما ہال سے دھواں اٹھنے لگتا ہے اور میرے سارے پنچھی بھرامار کراڑ جاتے ہیں۔

لیکن میں نہیں چاہتا کہ بیوی اس بھید کو پا جائیں کہ میں ان کی باتوں سے گھبرا رہا ہوں اس لئے ان کی باتوں سے میرے چہرے کا رنگ جب اڑنے پر تل جاتا ہے تو میں جھپامار کرا سے اپنے چہرے پر پھر جمالیتا اور مصنوعی طور پر مسکرا نے لگتا ہوں۔۔۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے آتے ہی جب میں ایڑ لگا کر اپنے چہرے کو شگفتگی کی جانب موڑنا چاہتا ہوں تو میرا چہرہ شریر گھوڑے کی طرح دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ہنہانے لگتا ہے میرے دونوں گالوں کی ہڈیاں ابھر آتی ہیں منہ چوڑا ہو کر تو بڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور میری ناک میرے قابو سے نکل کر ڈیڑھ باشت لمبی ہو جاتی ہے اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ یہ میں نہیں ہوں کا کا تو ابیٹھا ہوا ہے۔

وہ تخت پر گڑ تڑا کر لیٹ جاتی ہیں کبھی کبھی تو ان کی اس تنہائی پر ترس کھا کر میں ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں لیکن زیادہ سے زیادہ دس پانچ منٹ کے بعد پھر لکھنے لگتا ہوں اور جب غروب کے بعد میں شغل شروع کرتا ہوں تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس وقت میں خالی بیٹھا ہوا ہوں میرے پاس آ کر بیٹھ جاتیں اور گھر کی باتیں کرنے لگتی ہیں بیوی بے چاری کو کیا معلوم کہ جس وقت وہ یہ سمجھتی ہیں کہ میں خالی ہوں اس وقت تو میں پرانی یادوں سے لبالب بھرا ہوا بیٹھا ہوتا ہوں اور ایسا بھرا ہوا کہ سانس لینے تک کی گنجائش نہیں پاتا ہائے میری بیوی کہ سہاگن ہونے کے باوجود ان پر بیواؤں کی سی تنہائی چھائی رہتی ہے میرا دل کڑھتا رہتا ہے مگر کیا کروں کام بہت ہے اور عمر کم رہ گئی ہے چاہتا ہوں کہ میرے سینے میں جو کچھ ہے اسے گھبرا گھبرا کر کاغذ کے سپرد کر دوں۔



## میرا دین

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم ان نے تو  
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اک جری انسان کے مانند، میں با آواز بلند یہ اعلان کرتا ہوں جو ادھر دیکھ رہا ہے  
وہ ادھر مڑ جائے جو دور ہے وہ قریب آجائے جس نے اب تک نہ سنا ہو وہ کان کھول کر  
سن لے جواب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے وہ اپنے حسن ظن سے دست بردار ہو جائے  
اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر، یعنی لفظ خدا کے لامحدود معنی میں منکر ہوں وہ بھی  
اپنے سو ظن سے توبہ کر لے کہ میرا دین خیابان ذہن انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصول  
علم و نقد ان جہل کی ارزو اور محرک اولیں کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور  
ہر طرف سے منہ موڑ کر میں کافر باللہ و مومن بالانسان تو اے کائنات سے گرم پیکار،  
جنس آگاہی کے خریدار ارذرات صید و انجم شکار نوع بشر کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ کہہ رہا  
ہوں کہ من قبلہ راست کر دم ہر طرف کج کلا ہے۔

میں بھی ایک زمانے میں عقل بیزار و عقائد پرستار میری دنیا میں بھی روایت کو  
درایت پر ترجیح حاصل تھی تیغ روزگار کے رو برو میرے ہاتھ میں بھی ”مصلحت الہی“  
اور ہر چہ از دوست می رسد، نیکو ست کی مضبوط سپر تھی میرے گرد و پیش بھی بہت سی  
مناجاتیں بہت سی ڈھارسیں بہت سی تشفیاں بہت سی تسلیاں بہت سی امیدیں بہت سی  
دعائیں بہت سی فردا کی کام گاڑیاں اور بہت سی نجات کی امید واریاں تھیں اور میرے  
مشام تک بھی حواریان مقصورات کے لب ہائے رنگیں کی مہکیں آیا کرتی تھیں۔

لیکن اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے میرے دماغ نے مجھ کو لوٹ لیا ہے اور  
میں اب بیکسی میں تو ادھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں کا مصداق بن کر رہ گیا ہوں اور بے  
مروت عقل میرے از رکدہ تصورات کے تمام خوبصورت مجسموں کو پاش پاش کر کے

میرے سامنے کھڑی نہں رہی ہے۔

ایک زمانہ دار تک عقل کو آلہ ابلیس خیال کر کے میں اس سے لڑتا اور اس کا راستہ روکتا رہا لیکن وہ میرے عقائد پر سے یوں گذر گئی جس طرح ڈاک گاڑی، ان پتھروں کو پیستی گزر جاتی ہے جن کو بچے پٹری پر رکھ دیا کرتے ہیں

اے ایمان والو، تمہارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور میرا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے مجھ کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھو یہ موقع تو ہے ترس کھانے کا۔

اور اے میرے مفکر احباب، تم بھی مجھ پر طنز نہ کرو، اور مجھ سے یہ نہ کہو کہ اے ما فہم جو مل تو کیسا عجیب آدمی ہے کہ منقولات سے نجات پانے اور معقولات کے قریب آ جانے پر افسوس کر رہا ہے میں تمہارے طنز کی معقولیت کو تسلیم کرتا ہوں بے شک میں عجیب انسان ہوں لیکن اس بات کو نہ بھولو کہ میں ایشیا کا باشندہ ہوں، وہ ایشیا جو روایات، اقوال اور اوہام کا پائے تخت ہے وہ ایشیا جہاں لاکھوں سال سے بھوتوں، چڑیلوں، شہید مردوں، جنوں اور فرشتوں کی کہانیوں کی چھاؤں میں بچوں کو سلایا جا رہا ہے جہاں بڑے بڑے صوفی اور شاعر حکمت پر جنون، اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے چلے آ رہے ہیں جہاں روایت کی قربان گاہ پر روایت کو چڑھایا جا رہا ہے جہاں ”دعائے صبح و آہ شب“ کو ”کلید گنج مقصود“ ٹھہرا دیا گیا ہے جہاں ”دو دو چار“ کے سر کو ”دووپانچ کے آستانہ“ پر جھکا دیا گیا ہے جہاں ”الف لیله“ ”اندر سبھا“ ”چہار درویش“ اور ”ظلم ہو شر با“ کے عقلیں چک لینے والے سائے میں ذہنوں کو پالا پوسا جا رہا ہے اور جہاں براہین قاطع کی گردنوں پر صدیوں سے کشف و کرامات کی چھریاں چلائی جا رہی ہیں اس ایشیا میں کس خالص مفکر کا پیدا ہو جانا تقریباً ایک محال امر ہے اس لئے اگر تم یہ دیکھو کہ میں اپنے دماغ کی آبادی، اور دلی کی بربادی پر کبھی کبھی آزر دہ سا نظر آتا ہوں تو مجھے قابل معافی سمجھو اس لئے کہوز میں شور سنبل بر نہ آرد۔

اور اے مفکر دوستو، اظہار حقیقت میں شرمانا کیسا، میں تم سے اپنے دل کا یہ چور بھی



بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آباء و اجداد مجھ کو پکڑ لیتے ہیں تو میرا جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ انہوں نے جو مافوق الفطرت باتیں مجھ سے کہی تھیں اللہ کرے وہ ساری کی ساری سچ نکلیں مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ملوں شافع محشر سے اپنے سارے گناہ معاف کرا کے جنت میں جاؤں حوض کوثر کے کنارے جام پر جام لٹھاؤں اور حورو غلماں کو بھیج بھیج کر گلے لگاؤں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سن لیجئے کہ ان کمزور لمحوں کے روزن سے جب میری عقل جھانک کر مجھ کو دیکھ لیتی ہے تو میرے مرجھائے گالوں پر تراق سے تھپڑ مار کر مجھ سے کہتی ہے کہ اے ستر بہتر کے بڈھے بول تو نابالغ کب تک رہے گا تیرے دودھ کے دانت کب ٹوٹیں گے؟ اور اے کھوسٹ، تیرے دل میں جو بچہ بیٹھا فیل کر رہا ہے اس کی مسیں کب تک نہیں بھیگیں گی؟

اس جملہ معترضہ کے بعد اپنے موضوع کی جانب مڑ کر یہ عرض کر دینا بھی چاہتا ہوں کہ آج بھی میرے دل میں دنیا کے تمام بانیاں مذاہب کا بے حد احترام ہے اور خصوصیت کے ساتھ قوت و حیات کے شاہکار حضرت محمدؐ عربیؐ حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کا شیدائی اور آبائی عقائد<sup>1</sup> سے آزاد ہو جانے کے باوجود میں ان متذکرہ بالا تینوں مقتدر ہستیوں کا دل سے پرستار ہوں۔

آنحضرتؐ کے بارے میں اکثر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ عرب کی سی جہالت کی راج دھانی میں اور وہ بھی آج سے کچھ اوپر چودہ سو برس پیش تر ان کا پیدا ہو جانا اور کسی ایک تنفس کی شاگردی کئے بغیر جہاں استاد کا مرتبہ حاصل کر لینا روزگار کا ایک ایسا معجزہ عظیم ہے کہ انسانی تاریخ انگشت حیرت کو اپنے دانتوں کے نیچے سے آج کے دن تک نکال نہیں سکی ہے وہ پیداؤں عالم اور پیداؤں مفکر اور نظری نہیں عملی مفکر تھے۔

<sup>1</sup> اس دھرتی ماتا پر کون ایسا مائی کا لال اور کون ایسا سورما ہے اور کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ سینہ ٹھونک کر یہ دعویٰ کر سکے کہ میں آبائی عقائد اور ان عقائد کے

پیدا کردہ مزاجی قوم سے کلیۃً آزاد ہو چکا ہوں یہ اور بات ہے کہ مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جبہ وجوہ آزاد ہو چکا ہوں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ احساس خود ستائی ہے یا خود فریبی دانش مندی ہے کہ حماقت۔

انہوں نے جاہلوں کے درمیان حقائق کو آشکار کر کے سقراط کے مانند، زہر کا پیالہ نہیں پیا اور حقائق کو دل نشیں لباس پہنا کر چشمہ حیواں پر قبضہ کر لیا۔

سقراط نے اپنی قوم کی ذہنی سطح سے بلند ہو کر زبان کھولی، اس کو ہمیشہ کے واسطے خاموش کر دیا گیا محمدؐ نے اپنی قوم کی ذہنی سطح پر قدم رکھ کر بات کی اور وہ بات، اذان بن کر اس دنیا میں اب تک گونج رہی ہے محمدؐ کو ایسی حیرت ناک بصیرت حاصل تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی لرزش مرثاں سے ان کے دلوں کی پرتیں شمار کر لیتے اور ان کے انفاس کی درازی و کوتاہی پر نظر جما کر ان کے جذبات و خیالات کا عرض و طول ناپ لیا کرتے تھے۔

وہ ایک طرف تو اپنی قوم کے تمام مکروہات و مرغوبات کے زبردست نباض تھے اور دوسری طرف وہ نوع انسانی کی اس کمزوری کو بھی پا گئے تھے کہ یہ سود و زیاں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا خود پرست حیوان صرف تنخویف و تحریر کی وساطت سے راہ راست پر لایا جاسکتا ہے۔

اور اسی لئے وہ دوزخ کے انگاروں اور حوروں کے رخساروں کو دمکا کر اپنی قوم کو راہ راست پر لے آئے انہوں نے ایک مصلح عملی حکیم کے مانند، یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں ایسی فلسفیانہ موشگافی، ایسی منطقی پردہ دری اور ایسی حقائق کشا برہنہ گفتاری سے کام نہیں لیں گے، جس سے ایک صحرائیں قوم کی فعالیت میں فرق پڑ سکتا ہے۔

اور اسی دانش مندانہ فیصلے کی بناء پر انہوں نے کاروان خیال کی نقل و حرکت کے واسطے ایک وجدانی شاہ راہ تراش لی اور اس کے دونوں طرف روایات، کنایات،



شجاعت، یہ دوا ایسے اضمحلال ہیں جو کبھی ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے جس ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے وہ قلم وک اپنی انگلیوں کی گرفت میں نہیں لاسکتا، اور جس ہاتھ میں قلم ہوتا ہے وہ تلوار نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن انسانی تاریخ میں علی کا ہاتھ وہ تنہا جامع اضمحلال ہاتھ تھا جو تلوار اور قلم دونوں کو مساوی روانی کے ساتھ چلا سکتا تھا۔

وہ ادیب شاعر اور مفکر تھے اور اسی کے دوش بدوش، عدیم النظیر سپاہی بھی وہ صفحہ قرطاس پر مجسم کلک گوہر بار اور میدان کارزار میں سراپا شمشیر آب دار تھے۔

وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ موت ان پر گرے یا وہ موت پر ان دونوں کو وہ مساوی طور پر محبوب سمجھتے تھے اس لئے کہ ان کی نگاہوں نے موت کی پیشانی پر حیات ابدی کا جھومر دیکھ لیا تھا اس کے علاوہ ان کو ایک ایسی جواں بختی و برکت بھی حاصل تھی جس سے اس دور کا کوئی انسان بہرہ ور نہیں ہوا تھا اور جس نے ان کو اپنے تمام معاصرین پر وہ فوقیت بخش دی تھی، جو آفتاب کو ذرات پر حاصل ہے اور وہ فوقیت یہ تھی کہ انہوں نے جو چہرہ سب سے پہلے دیکھنے کی طرح، دیکھا وہ محمدؐ کا چہرہ تھا اور انہوں نے جو آواز سب سے پہلے سننے کی طرح سنی وہ محمدؐ کی آواز تھی۔

محمدؐ نے ان کو گودوں میں پالا اپنی شخصیت کے سانچے میں ڈھالا اپنے سائے میں پروان چڑھایا اور وہ ان کے وجود میں اس طرح جذب ہو گئے کہ علیؑ کو اپنے انفاس سے بوئے محمدؐ آنے لگی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ علیؑ حق پر اس مضبوطی سے قائم ہو گئے کہ وہ حق کا جسم، حق کی جان، حق کا اعلان، اور حق کی آواز بن گئے اور یہاں تک کہ حق کو علیؑ سے اور علیؑ کو حق سے پہچانا جاتا تھا اور چونکہ بہر آن و بہر نفس حق پر قائم رہنا ایک بہت بڑا خطرناک مرحلہ ہے اس لئے ان کی زندگی کبھی پنپ نہیں سکی۔۔۔ دنیا والے ان کی شدت حق پرستی کو برداشت نہیں کر سکے اور تو اور خود ان کے حقیقی بھائی ان کا ساتھ چھوڑ کر اس ایوان میں چلے گئے جہاں اسلام کے سر پر شاہی تاج رکھ دینے کے منصوبے تیار کئے جا رہے تھے اور جہاں شہد میں اس نیت سے زہر ملایا جا رہا تھا کہ



ارباب حق کو موت کے گھاٹ اتار کر باطل کو تخت شاہی پر بٹھا دیا جائے۔

علی کو حق پرستی کی تاب نہ لا کر، مسلمانوں کو ایک جماعت کثیر نے ان سے منہ پھیر لیا تھا اور یہاں تک کہ انہیں آخر کار یہ کہنا پڑا تھا کہ دنیا نے مجھ کو ذلیل کر دیا، ذلیل کر دیا ذلیل کر دیا اور اس قدر کہ میرا اور معاویہ کا تقابل کیا جانے لگا۔

علی کی زندگی اس کرہ ارض کے تمام عظیم انسانوں کے مانند محرومی و ناکامی کے سوا انہیں کوئی اور چیز نہیں دے سکی لیکن جب انہیں قتل کر دیا گیا تو ان کی موت نے ان کی قبر پر وہ چراغ عظمت جلا دیا جس سے ان کی زندگی کو محروم کر دیا گیا تھا۔

ان کا کام کار حریف اپنے تمام کروفر کے ساتھ وقت کے سمندر میں ڈوب چکے ہیں لیکن ان کی زندگی کی تمام ناکامیوں کے باوجود ان کا نام تاریخ انسانیت کی پیشانی پر آج تک دمک رہا ہے اور وہی لوگ جنہوں نے ان کی طرف سے منہ موڑ لئے تھے ان کی موت کے بعد جب کسی بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو ”یا علی“ کے نعرے لگانے لگتے ہیں

اے علی، شرافت انسانی، تیرے ان دو اخلاقی معجزوں کو قیامت تک فراموش نہیں کر سکے۔ گی کہ جب تیرے حریف نے تیرے منہ پر تھوک دیا تھا تو نے اس کی جاں بخشی فرمادی تھی اور موت کے وقت جب تیرے سامنے شربت کا پیالہ پیش کیا گیا تھا تو نے یہ کہا تھا کہ جب تک میرے قاتل کو شربت نہیں پلایا جائے گا، میں نہیں پیوں گا۔

اے علی، اے میدان جنگ کے سورما جز خواں اے منبر امن کے شیریں سخن خطیب اے ایوان عدل کے دیدہ ورقاضی اے کشور سیف و قلم کے خدیو صحیح کلاہ اے نان جویں کی بے پناہ طاقت کے مظہر اے زندگی کے معتبوب اے موت کے محبوب۔۔۔۔۔ اے علت العلل کے باب میں ”لا غفور“ ”لا رحمن“ اور ”لا قہار“ اور ”الاھو“ کی سی معنی خیز و خیال انگیز بات کہہ کر خاموش ہو جانے والے مفکر۔۔۔۔۔ سیف و قلم کا مجرا قبول کر!

اب دل تھام کر نگاہ اٹھائیے علی کے سوراہے اور محمدؐ کے لہو لہان نواسے حسین کی جانب جو گریاں تاریخ کے سینے کا سوراہہ اور گزراں وقت کی پیشانی کا نور ہے۔

وہ حسین جس کے نظامِ انفاس کی اطمینان آمیز ہمواری کی زد پر میدانِ کربلا کی بادِ سموم کا دم ٹوٹ گیا تھا۔۔۔۔ جس کے لبوں کی خشکی دیکھ کر فرات کی موجیں آبِ آب ہو کر رہ گئی تھیں اور جس کے چہرے کی شادابی کو دیکھ کر کربلا کے تپتے سورج کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

وہ حسین۔۔۔۔ جس نے اس ارادے سے کہ ایوانِ حق کے چراغاں پر کوئی آنچ نہ آ سکے اپنے گھر کے تمام چراغوں کو بجھا دیا تھا۔۔۔۔ اور ناموسِ انسانی کو بچانے کی خاطر جس نے فولا دو کو پگھلا دینے والے عزم اور زلزلوں کی سانس اکھاڑ دینے والے ثبات کے ساتھ موت سے ٹکر لی تھی اور ایسی ٹکر کہ موت کی پیشانی سے لہو کا توارہ جاری ہو گیا تھا حسین نا تو اس تھے یزید تو انا تھا قانونِ قدرت کے مطابق ہونا یہ چاہئے تھا کہ یزید، حسین کو شکست دے کر حسینیت کا چراغ گل کر دیتا۔

لیکن ہوا یہ کہ قانونِ قدرت کے علی الرغم، حسین کی نا توانی نے یزید کی تو انائی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔۔۔۔ اور اپنی مقتولیت کی ایک ضرب سے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا وہ موت جس کے صرف تصور سے بڑے بڑے سادنتوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں وہ موت منہ کھولے جب حسین کے سامنے آئی تو حسین اس کو دیکھ کر ایسی حقارت کے ساتھ مسکرائے کہ خود موت کی نبضیں ساقط ہو کر رہ گئیں۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس وقت بھی جب کہ تیروں کا موسلا دھار مینہ برس رہا تھا اور حسین اپنے رفیقوں اور جگر گوشوں کی لاشیں، میدان سے اٹھا اٹھا کر، بار بار خیمے کی طرف جا رہے تھے اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ جب کہ ان کے تمام انصار و اقرباء موت کی نیند سوچکے تھے اور ان کا قتل ایک یقینی امر بن چکا تھا عین اس نازک ترین، اور مہلک لمحہ میں بھی ان کے حواس بجا تھے اور ایک بہادر سپاہی

کا حوصلہ مندانہ تبسم ان کے لبوں پر کھیل رہا تھا۔۔۔ اور یہ دیکھ کر کہ ہیبت باطل سے حق کا چہرہ سفید ہو چلا ہے وہ اس پر سرخی دوڑانے کے لئے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا خون روانہ کر رہے تھے صرف یہی نہیں کہ اس یقینی ہلاکت کے موقع پر ان کے حواس بجا تھے بلکہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی قربانی دے چکنے کے بعد بھی ان کے چہرے پر اس فخر و مباہات کی ایک ایسی معمولی سی دھاری بھی رونما نہیں ہوئی تھی اور ان کی زبان سے ایک ایسا آدھا لفظ بھی ادا نہیں ہوا تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اے اہل اسلام میں نے غیرت اسلام کے آفتاب کو ڈوبنے سے بچا کر، تم پر احسان کیا ہے، اور میں نے اپنے واسطے یہ حق خرید لیا ہے کہ تم مجھ کو ایثار کا دیوتا سمجھ کر میرے سامنے اپنی گردنیں جھکا لو۔

اے حسین۔۔۔۔۔ اے دریائے زہر سے آب حیات پینے والے۔۔۔۔۔  
 اے بھرے طوفان کو اپنے سفینے میں ڈبو دینے والے۔۔۔۔۔ اے حریم شہادت کے،  
 سب سے اونچے منارے اے ہمت مردانہ کے اوتار اور اے ثبات و عزم کے  
 پروردگار۔۔۔۔۔ ازل سے لے کر ابد تک کے انسانیت کا غلامانہ سلام قبول کر!

لیکن میری زبان سے ان متذکرہ بالا اعیان ممکنات کی تعریف سن کر اس مغالطے میں نہ پڑ جائے گا کہ میں کسی دینی یا اعتقادی بنیاد پر ان کا مداح سراہوں میرے ان کے مابین جو رابطہ ہے وہ صرف انسانی صفات کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے آپ کو معلوم نہیں کہ میں سقراط مزوک، خورتشت، گوتم بدھ، مہاویر، تلسی واس، کنفیئش، مسیح، کبیر واس، گرونانک، مارکس، لینن، منٹشے اور برٹنڈرسل کا بھی جان و دل سے شیدائی ہوں اور جب تک رام چندر اور کرشن کے متعلق مجھ کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں تاریخی انسان نہیں صرف اساطیری کردار ہیں اس وقت تک میں ان کا بھی بہت احترام کرتا تھا لیکن ان متذکرہ بالا شخصیتوں کی شینفتگی کے یہ معنی نہیں کہ میں ان کا ہم خیالی اور ان کا پیرو بھی ہوں۔

بات یہ ہے کہ مبلغان ادیان و مصلحان اذہان نے جس ”منشت اول“ پر اپنے نظام کے تصور تعمیر فرماتے ہیں وہ ”خشت اول“ سائنس دانوں کی سی کرید اور کھرے سونے کی سی تحقیقی نیت کے باوجود اب تک میرے ذہن کی گرفت میں نہیں آسکی ہے۔ اور یہی میرا دیانت دارانہ اعتراف جہل ہے جس کو یاروں نے الحاد عدوان اور ارتداد کا نام دے کر میرے خلاف ایک غوغا بلند کر رکھا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ میری عقل کا قصور ہو لیکن یا ر لوگ اس کو میری نیت کا فتور سمجھ بیٹھے ہیں اور لطف یہ کہ جو لوگ مجھ سے برا فروختہ ہیں وہ علت العلل یا محرک اول کے باب میں مجھ سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔۔۔ ان کو اپنے جہل کا علم نہیں اور اسی بنیاد پر وہ دین دار ہونے کے مدعی ہیں۔

کاش ان کو اس بات کا پتا ہوتا کہ ہمارا ایمان اس پیڑھی اور میڑھی کے مثل ہے جس کو ہم نے والد مرحوم کے تر کے میں پایا ہے ہمارا ايقان تحقیقی نہیں تقلیدی ہے ہم حادثہ اتفاقی کے طور پر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں اس لئے مسلمان ہیں اگر یہودی کے گھر میں پیدا ہو جاتے تو ہم سے بڑا یہودی کوئی نہ ہوتا اور ہمارے معتقدات کا پر فسوں محل، ٹھوس کھوپڑی پر نہیں کھوکھلے کانوں پر تعمیر فرمایا گیا ہے اب رہا علت العلل اور محرک اولیں کا مسئلہ جس کو ”خدا“ ”بھگوان“ ”اللہ“ ”یہوا“ ”منروا“ یا گاؤ کے نام دیئے گئے ہیں جو تریہ کے دائرے میں ”نور“ یا ”ہو“ ہے لیکن تشبیہ کے میدان میں ایک مطلق العنان بادشاہ اور انسانوں کا سامراج رکھنے والا انتہائی طاقت ور شخص ہے سو یہ بحث اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ اس کے واسطے اس کتاب میں گنجائش نکالی نہیں جاسکتی۔

بہر حال میں اقرار و انکار کے دو کروں کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوا ہوں نظام سادی کو دیکھتا ہوں تو کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا دل اقرار کرنے لگتا ہے اور نظام ارضی کو دیکھتا ہوں تو اس میں کروڑوں خلا نظر آتے ہیں اور حیات انسانی کی عبرتناک بے ثباتی اور

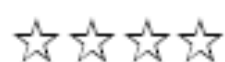


[illegible]

اقرار یا انکار کا موقع اس وقت آئے گا جب ہم، ذرے سے لے کر آفتاب تک کے علم پر حاوی ہو جانے کے بعد علت العلل کے ہر پہلو کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے میرا یہ خیال ہے کہ اس آخری منزل تک پہنچنے میں ابھی لاکھوں سال بیت جائیں گے اور میں اس تذبذب کے عالم میں خالی ہاتھ دنیا سے اٹھ جاؤں گا۔

لیکن مجھ کو یقین کامل ہے کہ لاکھوں یا کروڑوں برس کے بعد سہی مگر ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ نوع انسانی آخر کار روح کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لے گی اور پوری کائنات پر فرماں روائی کرنے لگے گی۔

جس وقت بفیض مشق فکر جولاں  
انسان بنے گا تاجدار دوراں  
مجھ کو نہ ملا، تو اے نگار آفاق  
بچ کر، مری اولاد سے جائے گا کہاں؟



## میرا خاندان

### میرے پردادا

تہور جنگ، حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر، گویا 1 ان کے دادا، یا اربیک خاں درہ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔

1 کتاب کی طباعت سر پر آگئی ہے وقت نہیں کہ تاریخوں سے حضرت گویا کے تمام حالات جمع کر کے قلم بند کر دیں اس لئے اختصار سے کام لوں گا ان کے تفصیلی حالات مندرجہ ذیل تاریخوں اور تذکروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

سراپا سخت، جلوہ خفر تاریخ مختشم، از محمد مختشم خاں پسر نواب محبت خاں، تاریخ دتاسی، تاریخ اسپرنگو، نامہ مظفری، تذکرہ شعرا راز ابن امین اللہ خاں طوفان، بوستان اودھ از راجہ درگا پرشاد، سندیلہ، تاریخ آفتاب اودھ، سیرت سید احمد بریلوی، از ابو الحسن علی تاریخ امیر خانی، قیصر التواریخ، از جمال الدین حیدر، زائر لکھنوی لکھنؤ گزیٹیئر، از مسٹر نیل آئی سی ایس، تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ، تاریخ نظم اردو، از محمد باقر ایم اے دہلی، داستان اردو، از حامد حسین قادر تاریخ اودھ ایسٹ انڈیا کمپنی از ڈاکٹر باسو تاریخ غازی الدین حیدر، از محمد تقی ایم اے پی ایچ ڈی لکھنؤ تاریخ واجد علی شاہ از ڈاکٹر بھٹناگر، خطوط گویا کتب خانہ ٹونک و دارالانشاء رام پور تذکرہ خوش معرکہ زیبا، از سعادت علی خاں، ناصر لکھنوی، تذکرہ گلشن بے خزاں از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، تذکرہ شعرائے اردو، از عبدالغفور، نساخ کلمتہ، تذکرہ شعرائے اردو، از صغیر بلگرامی تاریخ عمادت السعادت از غلام علی آزاد، تذکرہ ریاض الفصحا، انہ مصحفی، روزنامہ قاضی، کاکوری، وصیت نامہ فقیر محمد خاں بہادر گویا (قاضی عظیم بیچ آبادی) تاریخ فرخ آباد شیو پرشاد قدیم نسخہ قلمی نسخ (کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی، لکھنؤ) تذکرہ آب حیات از آزاد شعر الہند از عبدالسلام ندوی نعمات القلندر یہ (تکیہ شریف کاکوری) شباب لکھنؤ از احمد علی لکھنوی تاریخ داستان اردو از ڈاکٹر گیان چند جین ایم اے اور

اودھ کے پہلے دونواب ”The first two Nawabs of Oudh“ از شیر  
بادی الال سر یواستوا

یار بیگ خاں کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے کا نام محمد نام دار خاں اور چھوٹے کا محمد  
بلند خاں، نام دار خاں درہ خیبر ہی میں رہے اور محمد بلند خاں آفریدیوں کے ایک قبیلے  
اور اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لے کر 1234ھ میں  
ہندوستان چلے آئے اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔

اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انہوں نے اودھ کا رخ کیا اور لکھنؤ آ کر  
مقیم ہو گئے۔

اور جب نواب غازی الدین حیدر کے دربار تک رسائی کا موقع مل گیا تو نواب  
نے ان کو تین سو روپیہ ماہانہ پر فوج میں کوئی عہدہ دے دیا۔

ایک روز موقع پا کر محمد بلند خاں نے نواب سے کہا میں آزاد قبائل کا فرد ہوں، کھلی  
ہوا میں رہنے کی عادت ہے شہر میں میرا دم گھٹتا ہے مجھ کو اطراف لکھنؤ کے کسی ایسے قصبے  
میں زمین دے دی جائے کہ میں وہاں سے روز لکھنؤ آؤں اور فرائض منصبی انجام دے  
کر شام کو وہاں چلا جاؤں۔

نواب نے کہا آپ اطراف لکھنؤ میں کوئی قصبہ منتخب کر لیں زمین آپ کو دے دی  
جائے گی۔

محمد بلند خاں نے تمام قریبی دیہات اور قصبات کا دورہ کر کے کنول ہار کو پسند کیا  
جو آفریدیوں کا گڑھ اور بلخ آباد کا ایک محلہ ہے زمین ان کو دے دی گئی اور انہوں نے  
وہاں ایک کچا مکان بنا کر بود و باش اختیار کر لی اور اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح  
گھوڑے پر لکھنؤ جاتے، اور شام کو کنور ہال پلٹ آتے تھے۔

کنول ہار میں انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کی تعلیم کا  
سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ روز کے بعد ان کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں تعلیم سے بد دل ہو کر ریاست اندر چلے گئے، اور مہاراجہ ملکر کی فوج میں رسالہ داری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

کنول ہار سے چلتے وقت انہوں نے یہ چاہا کہ اپنے چھوٹے بھائی فقیر محمد خاں کو بھی جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی اپنے ساتھ اندور لے جائیں لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی آپ جائیں میں تعلیم سے فراغت پا کر آپ کے پاس چلا آؤں گا۔

اس کے پانچ چھ سال کے بعد جب فقیر محمد خاں فارغ التحصیل ہو گئے تو بڑے بھائی کے پاس اندور چلے گئے اور بھائی نے ان کو بھی رسالہ داری کا منصب دلا دیا۔

اس کے کچھ روز بعد مہاراجہ ملکر کو یہ خبر ملی کہ پڑوس کا ایک راجہ اندور پر چڑھائی کی نیت سے آیا ہے اندور کے قریب اس کی فوج کا پڑاؤ ہے اور صبح ہوتے ہی حملہ ہونے والا ہے۔

یہ سنتے ہی مہاراجہ ملکر نے بگل بجوا دیا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔

اسی رات کو فقیر محمد خاں نے بھائی سے کہا بھائی اب صبح ہوتے ہی میدان جنگ میں اترنا ہے، دیکھئے نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے ان کی یہ بات سن کر بڑے بھائی کے دل 1 میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ چھوٹا بھائی علم حاصل کر کے بزدل ہو گیا ہے اسے راتوں رات ہی قتل کیوں نہ کر دوں، تا کہ خاندان کی عزت پر حرف نہ آنے پائے لیکن برادرانہ محبت جوش میں آگئی انہوں نے سوچا کہ جب میدان جنگ میں یہ دیکھوں گا کہ یہ لڑنے سے جی چرا رہا ہے اس وقت اس کا کام تمام کر دوں گا ابھی جلدی نہ کرنا چاہئے۔

لیکن صبح ہوتے ہی جب میدان کا رزار گرم ہوا تو ان کو دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ ان کا اٹھارہ سال کا چھوٹا بھائی صفوں سے آگے بڑھ بڑھ کر دشمن پر نیزہ بازی کر رہا ہے یہ



جوان مردی دیکھ کر ان کا دل ہاتھ بھر کا ہو گیا۔

معرکہ بے حد سخت تھا لیکن یہ دونوں بھائی اس جوان مردی کے ساتھ لڑے کہ راجہ  
ملکر کی فوج کا حوصلہ بلند ہو گیا اور دن ڈھلتے ڈھلتے، دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ

1 یہ سارا ماجرا دادی جان نے مجھ سے کہا تھا۔

گئے اور حملہ آور راجہ بھاگ کھڑا ہوا۔

فقیر محمد خاں نے اس راجہ کا تعاقب کیا بیس میل کا فاصلہ طے کر کے اسے گرفتار کر  
لیا اور مہاراجہ ملکر کے قدموں میں ڈال دیا اس واقعہ کے بعد ڈنکے پٹ گئے دونوں  
بھائیوں کی بہادری کے جب ان کی شجاعت اور کارناموں کا غلغلہ راجپوتانہ سے سفر کر  
کے ٹونک پہنچا تو نواب میر خاں والی ٹونک نے مہاراجہ ملکر کے پاس برادرانہ خط بھیجا  
کہ ان دونوں بھائیوں کو مجھے دے دیجئے۔

مہاراجہ ملکر بڑے شش و پنج میں پڑ گیا سوچا کہ اگر ان دونوں کو بھیج دوں گا تو میری  
فوج میں پھر رہ کیا جائے گا اور اگر انہیں بھیجوں گا تو نواب میر خاں سے بگاڑ پیدا ہو  
جائے گا اور ان کے سے زبردست آدمی سے بگاڑ پیدا کر لینا خطرے سے خالی نہیں ان  
تمام باتوں پر غور کر کے اس نے والی ٹونک کو لکھا کہ میرے آپ کے برادرانہ تعلقات  
ہیں آپ اگر میری اس تجویز کو مان لیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا کہ ان  
دونوں میں سے ایک بھائی محمد عوض خاں میری فوج میں رہیں اور دوسرے بھائی فقیر محمد  
خاں آپ کے پاس چلے جائیں نواب میر خاں نے یہ بات مان لی اور فقیر محمد خاں  
ٹونک چلے گئے۔ نواب میر خاں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، اور رسالدار بنادیا۔

ٹونک میں اس وقت فارسی و عربی کے علماء کا ہجوم تھا، فقیر محمد خاں وقت نکال کر ان  
بزرگوں سے اکتساب علوم کرنے لگے۔

اس کے بعد نواب میر خاں اور انگریزوں کے مابین جنگ چھڑ گئی اور چونکہ نواب  
میر خاں کے مانند فقیر محمد خاں بھی انگریزوں کے دشمن جانی تھے انہوں نے بڑے

دلو لے کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا پنڈارے انگریزوں کے مددگار اور گوروں کے دوش بدوش نواب میر خاں کی فوج سے برسرِ پیکارتھے پنڈاروں نے فقیر محمد خاں کے تیور دیکھ کر یہ سوچا کہ اگر ان کو ہلاک کر دیا جائے تو نواب میر خاں کی فوج بھاگ کھڑی ہو گی اس لئے ایک پنڈارے نے ان پر توپ چلا دی گولا ان کی ران میں آ کر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے ایک پنڈار تلوار سونت کر ان کی طرف جھپٹا انہوں نے بیٹھے بیٹھے اس کے اس طرح نیزہ مارا کہ وہ گر پڑا۔ نواب میر خاں کی نظر پڑی گھوڑا دوڑاتے آئے اور پنڈارے کا ایک ہاتھ میں کام تمام کر دیا۔ اور چاہا کہ انہیں اٹھا کر گھر پہنچا دیں تا کہ فوراً مرہم پٹی ہو جائے فقیر محمد خاں نے کہا میں نے زخم کو خوب کس کر باندھ لیا ہی سپاہی جیتے جی لڑائی کا میدان نہیں چھوڑتا آپ یہ توپ میرے قریب کرادیں میں بیٹھے بیٹھے دشمن پر گولہ باری کروں گا اور انہوں نے اس قدر شدت کے ساتھ دشمن پر گولے برسائے کہ انگریزی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔

جنگ فتح ہوتے ہی ان کی مرہم پٹی کی گئی اور دو تین مہینے کے اندر وہ زخم بھر گیا۔ نواب میر خاں نے خوش ہو کر ان کا عہدہ بڑھا دیا اور بھائیوں کی طرح سلوک کرنے لگے۔

اس کے کچھ روز کے بعد نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کر دیں۔

جب انہوں نے جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کیا تو دونوں جگہ ایک ہی معاملہ پیش آیا رانی جے پور اور بیگم بھوپال نے جب یہ دیکھا کہ فقیر محمد خاں کا مقابلہ آسان نہیں ہے تو بانسوں پر اپنے اپنے دوپٹے بندھو کر، ہوا میں اڑنا شروع کر دیئے کہ ہم صلح پر آمادہ ہیں۔

فقیر محمد خاں کا جب سامنا ہوا تو رانی جے پور اور بیگم بھوپال دونوں نے یہ استدعا کی کہ ہم کو اپنی بہن بنا لیجئے اور انہوں نے ان کی درخواست قبول کر لی اور رشتے کو

یہاں تک نباہا کہ جب بھی کبھی کسی نے جے پور یا گوالیار پر حملہ کیا انہوں نے فوراً موقع پر جا کر انہیں بھگا دیا۔

اسی دوران میں نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو بعض مسائل طے کرنے کی غرض سے اپنا سفیر بنا کر اودھ روانہ کر دیا۔

ان کی شجاعت، اور فن جنگ کا غلغلہ اودھ اور نواب تک بھی پہنچ چکا تھا جب وہ سفیر کی حیثیت سے نواب غازی الدین حیدر وائی اودھ سے ملے نواب نے ان کی بڑی خاطر مدارت کی اور جب سیاسی مسائل پر بات چھڑی تو نواب اودھ نے بڑی حیرت سے کہا خاں صاحب آپ خالی بہادر ہی نہیں ایک بڑے دانش مند اور ذی علم انسان بھی ہیں آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔

انہوں نے عرض کیا کہ خداوند نعمت میں تو ایک مدت سے اودھ کا باشندہ ہوں میرے باپ محمد بلند خاں آپ کی سرکار کے ملازم تھے وہ ملیح آباد میں موجود ہیں غازی الدین حیدر نے کہا پھر تو آپ حق بحق (ار رسید) کی طرح اپنے وطن ہی میں آجائیں گے۔

اس پر انہوں نے کہا لیکن یہ بات آئین وفاداری اور اصول شرافت کے منافی ہے کہ میں والی ٹونک کی رفاقت کو ترک کر دوں۔

نواب نے کہا خاں صاحب میں ابھی اس مسئلے کو حل کئے دیتا ہوں اور ہر کارے کو حکم دیا کہ نواب معتمدولہ آغامیر (وزیر اودھ) کو حاضر کرے۔

آغامیر کے آتے ہی انہوں نے حکم دیا کہ اس جانب کی طرف سے نواب میر خاں کو خط لکھ کر فقیر محمد خاں کو مانگ لو۔

خط روانہ کر دیا گیا اور چند روز کے بعد آغامیر نے ان کو مطلع کر دیا کہ والی ٹونک نے ہماری بات منظور کر کے آپ کو اودھ میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔

انہوں نے کہا جب تک نواب میر خاں مجھ کو براہ راست خط لکھ کر اجازت نہیں

دے گے میں اودھ کی ملازمت قبول نہیں کروں گا۔

اور جب تھوڑے دن میں ان کے پاس نواب میر خاں کا براہ راست خط آگیا تو انہوں نے شادہ اودھ کی پیش کش قبول کر لی اور یہ عرض کیا کہ خداوند نعمت کی ملازمت قبول کرنے سے پیشتر میری دلی تمنا یہ ہے کہ ملیح آباد جا کر اپنے باپ کی قدم بوسی کر آؤں۔

غازی الدین حیدر نے آغا میر کو حکم دیا کہ فقیر محمد خاں کو ہاتھی پر ملیح آباد روانہ کیا جائے۔ تین سو سوار اور نقیبوں کی ایک ٹولی بھی ان کے ساتھ کر دی جائے اور جب اس ترک و احتشام کے ساتھ وہ ملیح آباد پہنچے کہ ان کے ہاتھی کے پیچھے تین سو سوار رہیں اور ان کی ہاتھی کے آگے آگے نقیبوں کی ایک ٹولی ہٹو بچو فقیر محمد خاں بہادر کی سواری آرہی ہے کے نعرے لگا رہی ہے تو وہاں کے پٹھان یہ سمجھے کہ کوئی بادشاہ، ادھر سے گزرتا غالباً سندیلے جا رہا ہے۔

اور ان کے باپ نے جب یہ سنا کہ نقیب فقیر محمد خاں کا نام لے رہے ہیں تو انہوں نے لوگوں سے کہا ارے یہ تو میرے بیٹے کا نام ہے یہ سن کر پٹھانوں نے قہقہہ مارا اور ایک صاحب نے بطور طنز یہ کہا کہ جی ہاں آپ کا بیٹا بادشاہ بن کر آ رہا ہے اور آپ کے اس کچے مکان میں دربار کریگا۔

اس پر محمد بلند خاں نے کہا مسخر و ہنستے کیا ہوا اللہ کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔

اس کے بعد جب وہ ”شاہی سواری“ سندیلے کا راستہ چھوڑ کر کنول ہار کی طرف مڑنے لگی، تو تمام پٹھانوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور پوری آبادی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگی اور جب وہ جلوس محمد بلند کے مکان کے سامنے آ کر ٹھہر گیا تمام لوگ ادھر دوڑ پڑے اور حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

فقیر محمد خاں کی نظر جب اپنے باپ پر پڑی انہوں نے ہاتھی کے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا دھم سے اس کی پیٹ پر سے ”باوا باوا“ کہتے کود پڑے اور جا کر باپ کے



قدموں پر سر رکھ دیا باپ نے ”ارے میرا فقیر“ کا نعرہ لگا کر بیٹے کو قدموں سے اٹھا کر کلیجے سے لگایا اور بوڑھے باپ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

باپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر کے جب وہ لکھنؤ واپس آئے غازی الدین حیدر نے ان کو پچیس ہزار سواروں کا رسالہ دار بنا دیا اس کے کچھ دن بعد وزارت مال بھی ان کے سپرد کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ انہیں ”سرکار خیر آباد“ کا گورنر بنا دیا<sup>1</sup> اس کے دوش بدوش غازی الدین حیدر نے گولا گنج میں زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ بھی ان کے حوالے کر دیا اس قطعے کے انہوں نے دو ٹکڑے کر دیئے ایک ٹکڑے کا نام ”احاطہ پختہ فقیر محمد خاں“ اور دوسرے احاطہ کا نام ”احاطہ خام فقیر محمد خاں رکھ دیا۔“

احاطہ پختہ فقیر محمد خاں میں متعدد محلات تعمیر کرا کے خود رہنے لگے اور احاطہ خام

1۔ راجہ صاحب محمود آباد کے دیوان میں جس کا نام ”دیوان سحر“ ہے ایک قطعہ موجود ہے جو انہوں نے ان کے گورنر بنائے جانے کی خوشی میں بطور مبارکباد کہا تھا۔

میں اپنے ذاتی سپاہیوں اور کارندوں کو آباد کر دیا<sup>1</sup> بلج آباد سے ایک میل کے فاصلے پر انہوں نے مرزا گنج میں سینکڑوں ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے محل بنائے بارہ دری تعمیر کی آم کے باغ نصب کرائے اور گرمیوں کے واسطے ایک پختہ برف خانہ بنوا دیا۔

اسی اثناء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کے اخلاص اور ان کی شجاعت کے لکھنؤ کیا پورے اودھ میں ڈنکے پٹ گئے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ان کے ایک منجر خاص نے ان تک ایک زبردست سازش کی خبر پہنچادی جو ان کے رفیق نواب معتمد الدولہ بہادر آغا میر وزیر اودھ کے خلاف تھی اس سازش کے بانی تھے غازی الدین حیدر کے مقربین میں سے ایک مرزا حاجی۔

مرزا حاجی نے دو راہبوتوں کو دس دس ہزار روپے دثوت دے کر اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ جب آغا میر شاہی طبیب حکیم واجد علی خاں کے بیٹے کی شادی میں

شریک ہونے کے واسطے پرسوں ان کے وہاں جائیں تو تم پہلے ہی سے وہاں پہنچ کر دروازوں کے پتوں کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور جیسے ہی آغا میرے دروازے میں قدم رکھیں تم دونوں بیک وقت حملہ کر کے ان کو قتل کر ڈالنا۔

یہ خبر پاتے ہی فقیر محمد خاں، آغا میر کے محل گئے ان سے اس سازش کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا اور جب آغا میر کے لڑکے کی شادی میں شریک ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے تو فقیر محمد خاں بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔

حکیم صاحب کے مکان کے سامنے پہنچے ہی انہوں نے آغا میر سے کہا آج میں آگے آگے چلوں گا، اور آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔

ہن کی اس انوکھی درخواست سے آغا میر کے تمام رفقاء دنگ ہو کر رہ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے آغا میر نے آنکھیں جھکا لیں اور تھوڑے سے توقف کے بعد کہاں خاں صاحب آپ کی تجویز منظور بسم اللہ آپ آگے آگے چلیں فقیر محمد خاں نے جیسے ہی دروازہ کے اندر قدم رکھا راجپوت نے تلوار چلا دی جس سے ان کا داہنا ہاتھ بڑی

---

1 وہ دونوں احاطے، اپنے چند محلوں کے ساتھ دو بڑے محلوں کی صورت میں آج

بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔

---

طرح زخمی ہو گیا اور جب فوراً تلوار سونت کر انہوں نے راجپوتوں کو ڈانٹا، تو ان کی آواز سنتے ہی ان کے ہاتھوں سے تلواریں گر پڑیں انہوں نے بھاگنا چاہا لیکن انہوں نے جھپٹ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جب ان کی لاشوں کا معائنہ کیا گیا تو یہ دیکھا کہ ان راجپوتوں کے بازوؤں پر دس دس ہزار کے نوٹ تعویذوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں۔

آغا میر نے فقیر محمد خاں کو دوڑ کر کلیجے سے لگایا ان کے زخمی ہاتھ کو بوسہ دے دے کر بار بار آنکھوں سے لگایا اور کہا خاں صاحب جب آپ نے میرے آگے آگے چلنے

کی فرمائش کی تھی اسی وقت میں بھانپ گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی بات ضرور ہوگی۔  
اس کے بعد انہوں نے پوری سازش کا حال بتا دیا۔ مرزا حاجی کو کھڑے کھڑے  
جس دوام کیس زادی گئی اور آغا میر نے ان کو دوبارہ گلے لگا کر کہا خاں صاحب آپ  
نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچالی یہ مجھ پر آپ کا وہ احسان ہے جس کو میں  
زندگی بھر یاد رکھوں گا۔

شاہ اودھ نے جب ان کا یہ کارنامہ ایثار سنان کی بے حد تعریف کی سات پارچے  
کے خلعت سے نوازا اور نواب حسام الدولہ، تہور جنگ کا خطاب بھی عطا فرما دیا۔  
حضرت ناسخ نے اس واقعہ پر ایک تاریخی قطعہ کہا تھا جو ان کے دیوان میں ”  
تاریخ مجروح شدن دست فقیر محمد خاں بہادر کے عنوان سے موجود ہے۔“  
لگے ہاتھوں میرے پر دادا کا ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے۔

آغا میر پر جب زوال آیا اور ان کے حریف میر مہدی کو قلمدان وزارت ملا تو  
چونکہ فقیر محمد خاں آغا میر کے طرف داروں میں سے تھے اور میر مہدی کے دل میں یہ  
خوف بیٹھا ہوا تھا کہ فقیر محمد خاں ایک نہ ایک دن اپنے اثرات سے کام لے کر آغا میر کو  
پھر برسر حکومت لے آئیں گے اس لئے اس نے ان کی ہلاکت کا منصوبہ بنا کر ایک  
روز انہیں دوپہر کے کھانے پر اپنے وہاں مدعو کیا۔

اور اس منصوبے کی تکمیل کے واسطے اس نے یہ صورت نکالی کہ خود تو بالائی کمرے  
پر بیٹھا اور سنگین دیواروں سے محصور تنگ انگنائی میں ایک بھینسے کو خواب شراب پلا کر  
آزاد چھوڑ دیا کہ جیسے ہی وہ انگنائی میں قدم رکھیں وہ بھینسا ان پر حملہ کر کے ان کا کام  
تمام کر دے۔

چنانچہ یہی ہوا کہ جب فقیر محمد خاں نے انگنائی میں قدم رکھا بھینسے نے شیر ببر کے  
مانند جھپٹ کر ان پر حملہ کر دیا انہوں نے بھینسے کا وار خالی دے کر پینتر ابدلا اور  
دوسرے گوشے میں تلوار تول کر کھڑے ہو گئے وہ ادھر بھی تیر کی طرح آیا انہوں نے

اس پر تلوار چلا دی جس سے اس کی پیٹھ زخمی ہو گئی زخمی ہو کر وہ اور بھی خوفناک ہو گیا اور اپنے دونوں سینک جھکا کر دوڑا کہ ان کا پیٹ پھاڑ ڈالے لیکن جیسے ہی اس نے سر جھکایا انہوں نے تلوار کا ایک ایسا دو ٹوک وار کیا کہ اس کی پہاڑی گردن کٹ گئی اور خون کا ایک فوارہ آسمان کی طرف جست کرنے لگا۔

وہ اپنی خون آلود تلوار لئے اوپر چڑھ گئے، میر مہدی اور ان کے مصاحب، دوسرے کمرے کی طرف بھاگے انہوں نے جھپٹ کر میر مہدی کا گریبان پکڑ لیا اور اس کی گھگی بندھ گئی اور پھر انہوں نے اس کے منہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ وہ اوندھے منہ گر گیا اور دستار و زارت ڈھلکتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی اور فقیر محمد خاں یہ کہتے ہوئے اتر گئے کہ او گندھی کے بچے تو پٹھانوں کی شجاعت کا امتحان لیتا ہے۔

یہاں تک تو سرسری طور پر ذکر تھا ان کی عالی مرتبگی اور دلیری کا اب ان کی تہذیبی زندگی کے بھی چند واقعات سماعت فرمائیے۔

سب سے پہلی اور سب سے زیادہ حیرتناک بات تو یہ ہے کہ ہر چند پشتوان ان کی مادری زبان تھی پھر بھی انہوں نے اردو شاعری اور اردو زبان پر اس بلا کی قدرت حاصل کر لی کہ نسخ سے کٹر آدمی نے ان کو اپنے حلقہ تلامذہ میں لے لیا اور ان کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ میرے زمانہ تعلیم تک ان کا کلام نصاب میں داخل تھا۔

اور ہر چند وہ آزاد قبائل کے ایک اکھڑ پٹھان تھے انہوں نے لکھنؤ کی تہذیب کو اس قدر جذب کر لیا کہ لکھنؤ کے قدیم نوابوں اور ان کے مابین کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا تھا۔

ان کے محلوں کی سجاوٹ ان کے ماکولات و ملبوسات کی نفاست، ان کی بیڑوں اور مرغوں کی پالیاں ان کے مشاعرے ان کے شبستان میں راتوں کے مجرے ان کی ادب نوازیاں اور اہل علم پر ان کی زرباشیاں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں



تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ وہ دین تہذیب میں ایک نو مسلم کی طرح داخل ہوئے ہیں اور دراصل ایک بالکل اجنبی زبان اور ایک قطعی ناموس تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی یہ حریت ناک صلاحیت و اخاذیت ایک ایسی نادرسفت ہے جو لاکھوں ہی نہیں کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک غیر معمولی شخصیت ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہر چند وہ بہت دولت مند انسان تھے اور میری دادی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا تمہارے دادا جان کے وہاں اس قدر روپیہ پھینکا تھا کہ اسے گننا ممکن ہی نہ تھا اس لئے ترازوؤں میں تول تول کر روپیہ پھیلایا اور وہ خانوں میں رکھا جاتا تھا لیکن تمول کے باوجود وہ کثرت زر کی نحوست سے بخوبی واقف تھے اور یہ بات ان کو پسند نہیں تھی کہ اپنے اخلاف کے واسطے گاؤں گاؤں یا کسی قسم کی کوئی جائیداد غیر منقولہ ایسی چھوڑ جائیں کہ ان کے خلاف دولت و عشرت کی فراوانی کی سیدزبوں بن کر اوصاف انسانی سے محروم ہو کر رہ جائیں۔

ان کی یہ تمنا تھی کہ جس طرح تلوار کے زور سے میں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر لئے ہیں اسی طرح میری اولاد بھی تلوار کی وساطت سے کمائے اور میری ہی طرح جی کھول کر مستحقین پر روپیہ برسائے۔

اور اس خیال کے تحت انہوں نے اپنے نائب مرزا حسن علی بیگ، عرف مرزا حسو کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان کے واسطے گاؤں گراؤں ہرگز نہ خریدیں۔

ایک روز جب یہ بات ان کے علم میں لائی گئی کہ مرزا حسو بیگ ان کے نام پر سینکڑوں زمینیں سینکڑوں باغ اور سینکڑوں گاؤں آئے دن دھڑا دھڑ خریدتے چلے جا رہے ہیں تو ان کو یہ بات بے حد ناگوار گزری، انہوں نے حسو بیگ کو طلب کر کے ان سے کہا مرزا میری سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آتی کہ میں نے تم سے وہ کون سی ایسی برائی کی ہے کہ تم میرے واسطے جائیدادوں کی خریداری پر اتر آئے ہو، اور میری اولاد کے حق میں کانٹے بھر رہے ہو مرزا حسو بیگ نہایت دوراندیش آدمی تھے انہوں نے

دست بستہ عرض کیا کہ خاں صاحب بہادر آپ کی سرکار میں تعمیرات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور میں دوسرے زمینداروں پر دباؤ ڈال ڈال کر ان کے وہاں سے مزدور بلاتا رہتا ہوں اس لئے آئے دن کی مصیبت سے نجات پانے کے واسطے میں نے جائیداد اس لئے خرید لی ہے کہ آسانی کے ساتھ مزدور مہیا ہوتے رہیں یہ سنا تو فقیر محمد خاں کا غصہ فرو ہوگی اور ارشاد فرمایا کہ جائیداد کی یہ خریداری صرف مزدوروں کی فراہمی کے حدود میں رہے اور ریاست نہ بننے پائے۔

مرزا صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ تو کر لیا مگر درپردہ جائیداد کی خریداری کا سلسلہ بڑی سرگرمی سے جاری رکھا۔

ایک روز فقیر محمد خاں سے چوب دار نے آکر عرض کیا کہ کان پور کی ایک بیگم صاحب سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہیں انہوں نے فرمایا بلا لاؤ۔

وہ بیگم صاحب آتے ہی رونے لگیں اور کہا میرا بیٹا بد راہ ہو گیا ہے باپ کا سارا اندوختہ چوک میں اڑا چکا ہے اور پرسوں اس نے بہت بڑی جائیداد صرف ڈیڑھ لاکھ میں آپ کے نائب کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے آپ کی دریا دلی اور سخاوت کے اودھ میں ڈنکے پٹے ہوئے ہیں اس لئے میں یہ درخواست کرنے حاضر ہوئی ہوں کہ مجھ سے ڈیڑھ لاکھ نقد لے کر میری جائیداد واپس فرما دیجئے۔

انہوں نے حسو بیگ کو بلایا انہوں نے آتے ہی جھک کر سلام کیا فقیر محمد خاں نے سلام کا جواب نہیں دیا مرزا صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہا فدوسی سے کوئی قصور ہو گیا ہے؟ فقیر محمد خاں نے بگڑ کر ارشاد فرمایا مرزا جائیداد پیدا کرنے کا چسکا تم سے جائے گا نہیں، یہ دیکھو کان پور کی بیگم صاحب بیٹھی ہوئی ہیں جن کو تم شکار کر چکے ہو۔

مرزا نے کہا خدا گواہ ہے کہ میں ان بیگم صاحب سے بالکل واقف ہی نہیں اس پر بیگم صاحب نے جلدی سے بات کاٹ کر اپنے بیٹے کا نام لیا اور پوچھا کیا آج سے ایک مہینہ پیشتر آپ نے اس کی جائیداد نہیں خریدی ہے اور جب مرزا صاحب گھبرا کر

سرکھجانے اور کوئی عذر ڈھونڈنے لگے تو فقیر محمد خاں نے کہا ان بیگم صاحب کے لڑکے کی جائیداد اسی وقت واپس کر دو مرزا صاحب نے کہا میں نے وہ جائیداد تین لاکھ میں خریدی ہے اور بیگم صاحب ڈیڑھ لاکھ کہہ رہی ہیں انہوں نے حکم دیا کاغذات لاؤ، اور جب کاغذات آگئے تو معلوم ہوا کہ میرزا صاحب سچ کہہ رہے تھے اس پر ان بیگم صاحب نے کہا کہ اب پتا چلا کہ وہ جائیداد ڈیڑھ میں نہیں تین لاکھ میں خریدی گئی ہے آپ یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ جو میں اپنے ساتھ لائی ہوں اپنے خزانے میں جمع کرادیں اور مجھ کو دو مہینے کی مہلت عطا فرمادیں اس مدت کے بعد میں جب باقی ڈیڑھ لاکھ روپیہ حاضر خدمت کر دوں تو میری جائیداد میرے بچے کے نام کر دی جائے۔

فقیر محمد خاں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ بیگم صاحب آپ کا فرزند اس جائیداد کر پھر کسی کے ہاتھ فروخت کر ڈالے گا بیگم نے یہ بات سنی تو یہ سمجھ کر رونے لگیں کہ فقیر محمد خاں ان کی جائیداد واپس کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

ان کی یہ کیفیت دیکھ کر انہوں نے فرمایا بیگم صاحب آپ میری بات نہیں سمجھیں میں چاہتا ہوں کہ آپ کے فرزند کے عوض وہ جائیداد آپ کے نام منتقل کرادوں تاکہ آپ کا لڑکا دوبارہ فروخت نہ کر سکے۔

بیگم کا چہرہ یہ سن کر کھل گیا اور کہا خاں صاحب جیسا کہ ابھی کہہ چکی ہوں یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ آپ اسی وقت لے لیں، باقی روپیہ جب دو مہینے کے بعد لے کر آؤں تو ان کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہو پائی تھی کہ انہوں نے ارشاد فرمایا مرزا بیگم صاحب سے مطلق روپیہ نہیں لیں گے تم ان کے فرزند کی جائیداد میری طرف سے بیگم صاحب کے نام اسی وقت ہبہ کر کے ہبہ نامہ ان کے سپرد کر دو۔

یہ سنتے ہی مرزا صاحب کا رنگ اڑ گیا بیگم کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہنے لگے اور ان کی جائیداد واپس کر دی گئی۔

ایک بار ان کے ایک دوست نے جن کا نام غالباً محمد علی خاں تھا، ان سے کہا کہ

ریاست رام پور پر میرے ایک قرابت دار ناجائز طور پر قابض ہو چکے ہیں حالانکہ از روئے شریعت و قانون یہ ریاست مجھے ملنے چاہئے کہ میں اس کا صحیح وارث ہوں میں نے غاصب پر مقدمہ دائر کیا تھا لیکن رشوت کے بل بوتے پر وہ جیت گیا اب میں اس مقدمے کو ولایت کی پریوی کونسل تک لے جانا چاہتا ہوں جس کے واسطے اسی ہزار کی شدید ضرورت ہے مجھے یقین ہے کہ پریوی کونسل میں رشوت نہیں چل سکے گی اور میں یقیناً مقدمہ جیت جاؤں گا ان کی اس استدعا پر فقیر محمد خاں نے ان کو اسی ہزار روپے دے دیئے۔

اور جب مقدمہ جیت لینے کے بعد، ان کو رام پور کا نواب بنا دیا گیا، تو انہوں نے فقیر محمد خاں کو خط پر خط لکھے کہ رام پور تشریف لائے، کچھ روز میرے مہمان رہئے میں اس اثناء میں تمام اعیان ریاست کو جمع کر کے، آپ کے اس احسان کا اعلان کروں گا۔ جو آپ مجھ پر کر چکے ہیں اور اسی دربار میں آپ کے اسی ہزار بڑی نیاز مندی کے ساتھ واپس کر کے آپ کی خدمت میں ایک بڑی جاگیر بھی پیش کروں گا فقیر محمد خاں نے اس روپے کے واپس لینے سے انکار کرتے ہوئے لکھا کہ وہ ”حساب دوستاں درد دل“ کے طور پر دی گئی تھی میں کوئی بنیائیں کہ اسے واپس لے لوں 1

1 میں نے جب کہ میں 1927ء میں وائی رام پور، نواب حامد علی خاں کے زمانے میں بطور مہمان رام پور میں ٹھہرا ہوا تھا ان تمام خطوں کو ریاست کے دارالانشاء سے منگا کر خود پڑھا تھا لیکن جوانی کے لالچالی پن میں ان کی نقلیں نہیں کرائی تھیں اور اب جبکہ مجھے ان نقلوں کا خیال آیا تو میں نے کتب خانہ رام پور کے لائق مہتمم عرشی صاحب کو خط لکھا کہ وہ نقلیں مجھے بھیج دیں تاکہ اس کتاب میں درج کر لوں تو انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ دارالانشاء کے تمام کاغذات کو حکومت نے الہ آباد بھیج دیا ہے اب اتنا وقت کہاں کہ الہ آباد جاؤں اور نقلیں حاصل کروں۔

اب چند تذکرہ نویسوں اور مورخوں سے بھی ان کے حالات ملاحظہ فرمائے:



صاحب الیا قوت والمرجان فی ذکر علمائے یہوان لکھتے ہیں کہ حکیم بدر الدین فاروقی، ابن شیخ محمد صدر الدین تھانیسری و شاگرد شاہ رفیع الدین، محدث دہلوی، نواب فقیر محمد خاں بہادر کے مشیر و ندیم اور ان کے محلات کے معالج رہے۔

صاحب ”تاریخ اودھ“ کا بیان ہے کہ نواب فقیر محمد خاں ایک اولوالعزم سپاہ سالار ہی نہیں مزاج بھی شاہی پایا تھا۔ ایک بار نواب آغا میر نے ان سے کہا کہ اس فصل میں ہم آم کھانے بلخ آباد آئیں گے، اور بادشاہ سلامت کو بھی ساتھ لائیں گے۔

نواب فقیر محمد خاں نے ان شاہی مہمانوں کے لئے ایک بارہ دری تین لاکھ روپے میں تعمیر کرائی اور تین لاکھ کے فرنیچر سے اس کو آراستہ کیا۔

صاحب ”صبح گلشن“ نے لکھا ہے کہ اس قصبے (بلخ آباد) میں عمارات رفیع و بساتین و انہار رواں، ان کی عظمت و ثروت کے آثار ہیں۔

صغیر بلگرامی کہتے ہیں کہ انہیں آموں کا بہت شوق تھا، اور آم بڑے اہتمام سے لگائے تھے اور سنا ہے کہ وہ دودھ اور شربت سے سینچے جاتے تھے۔

نواب مصطفیٰ خاں شفیقہ نے تحریر کیا ہے کہ باوجود ہجوم دنیا، قدردان اہل ہر فن است تذکرہ ”خوش معرکہ زیبا“ میں درج ہے اتمام اس (فقیر محمد خاں) کا آغاز سے خوش تر جب کہ دولت مند تھا اب شیعہ امیر المومنین حیدر<sup>1</sup>

کریم الدین خاں ان کے باب میں لکھتے ہیں کہ ہمیشہ شیعوں سے ہنگامہ رہتا ہے سننے میں آیا ہے بہت متعصب سنی ہے 2 تاریخ ”مختشم“ میں لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے وزیر منتظم الدولہ فقیر محمد خاں سے ناخوش ہو گئے تھے۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ انہوں نے وزیر کے روبرو، تاج الدین حسن خاں کے حق میں کلمات درشت کہے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ فقیر محمد خاں جبری آدمی تھے، اور ان کے سامنے ظلم ہوتا تو مظلوم کی پاس داری۔

1 ان کے شیعہ ہو جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا 2 انہوں نے حضرت علی کی شان

میں جو قصیدے اور امام حسینؑ کی جناب میں جو سلام کہے ان سے اس قول کی تکذیب ہوتی ہے۔

کرتے تھے اس لئے ان کے خلاف یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ وہ دربار میں ہتھیار باندھ کر نہ آئیں گویا نے کہا میں اس پر خانہ نشینی کو ترجیح دیتا ہوں اس پر انہیں ہتھیار لگانے کی اجازت دے دی گئی۔

الہ آباد کے رسالہ ”ہندوستانی“ میں ایک مقالہ ”مخزن آلام“ اور ”احمد کی شاعری“ کے عنوان چھپا تھا جس میں صاحب مقالہ نے لکھا ہے کہ گویا کا عروج، نصیر الدین حیدر تک رہا، وہ اودھ کے ساڑھے تین لاکھ سپاہیوں کے سالار تھے اور خود چودہ سو پیادے اپنی ذات خاص میں رکھتے تھے۔

صاحب ”نامہ مظفری“ نے لکھا ہے کہ گویا، عربی بھی ایسی صاف بولتے تھے کہ گویا مادری زبان ہے اور ان کی ترکی بولنے پر بھی لوگوں کو حیرت ہوتی تھی چودہ سو سپاہی ان کے ذاتی ملازم تھے فقیر محمد خاں کے باپ بھی بڑی آن بان کے آدمی تھے، تمام عمر وہ اپنے کچے مکان ہی میں رہے، بیٹے نے لاکھ لاکھ جتن کئے کہ باپ محلوں میں اٹھ آئیں، لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، اور کہا میں زرخا بننا پسند نہیں کرتا۔“

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فقیر محمد خاں کے باپ اپنے گھوڑی کولنگوری 1 چال سے دوڑاتے ہوئے چوک سے گزر رہے تھے اور جب ان کا گھوڑا، ایک طوائف کے چھجے کی طرف بلند ہوا تو نوچی نے ناکہ سے پوچھا یہ سوار کون ہے ناکہ نے کہا چپ رہ، یہ نواب فقیر محمد خاں بہادر کے باپ ہیں۔

یہ سن کر، وہ غصے میں بھرے ہوئے، گھر آئے اور بیٹے سے کہا فقیرے اب میں زندگی بھر چوک سے نہیں گزروں گا۔ بیٹے نے سبب پوچھا تو انہوں نے سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہا، دنیا کا قاعدہ ہے کہ بیٹا باپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور آج یہ الٹی گنگا بھی کہ باپ کو بیٹے کے نام سے پہچانا گیا ہے لعنت، ہزار لعنت، چوک سے

گزرنے والے پر۔

ایک بار فقیر محمد خاں کے مہتمم ”باغات“ نے ان کی خدمت میں لکھا کہ حضور کے

1 گھوڑے کی وہ چال کہ وہ زمین سے بلند ہو کر، اچھلتا، اور قوس سی بناتا، زمین

پر قدم رکھتا ہے۔

والد ماجد جب باغات تشریف لاتے ہیں تو پٹھانوں کے غول کے غول ان کے

پیچھے آتے اور ہزاروں کچے کچے آم توڑ کر لے جاتے اور پودوں کی شاخیں بھی توڑ

ڈالتے ہیں۔

یہ خبر سن کر، فقیر محمد خاں نے اپنے باپ کے نام، لکھنؤ سے یلح آباد یہ خط بھیجا کہ باوا

تمام باغ آپ کے ہیں آپ کو ان پر کامل تصرف حاصل ہے، آپ باغوں میں جتنے

آدمی چاہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں لیکن آپ کے علم کے بغیر جو لوگ آپ کی آڑ

لے کر، باغوں میں گھس جاتے اور نقصان پہنچاتے ہیں، ان کے متعلق میں نے مہتمم

باغات کو لکھ دیا ہے کہ انہیں باغوں میں نہ جانے دیا جائے۔

بیٹے کا یہ خط پڑھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے، اپنے بھانجے سے کہا فقیر امیر ہو کر

دیوانہ ہو گیا ہے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ جو لوگ میرے پیچھے پیچھے باغوں

میں آنا چاہیں ان کو روک دیا جائے چلو میرے ساتھ لکھنؤ، میں آج فقیرے کو مزا چکھا

دوں گا۔

فقیر محمد خاں اپنے محل میں شہزادوں اور عمائد لکھنؤ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ

چوب دار نے آکر عرض کیا کہ سرکار کے والد محترم غصے میں بھرے ہوئے اپنے بھانجے

سے یہ کہتے تشریف لارہے ہیں کہ میں آج اسے مزا چکھا دوں گا۔

فقیر محمد خاں نے یہ سنا تو گھبرا گئے اور حاضرین سے کہا میں اس بڑی الماری کے

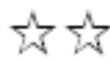
پیچھے جا کر چھپ جاؤں گا باوا تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں اس وقت کہیں باہر

گیا ہوا ہوں۔

اتنے میں بھرے ہوئے محمد بلند خاں آگئے، تمام محفل کھڑی ہو گئی، انہوں نے پوچھا فقیر کہاں ہے، حاضرین نے جواب دیا کہ کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں محمد بلند خاں نے کہا خوشامد خورو، جھوٹ نہ بولو اور صاف صاف بتاؤ کہ وہ کہاں ہے۔  
 ”خوشامد خوروں“ کا لفظ سن کر تمام ارباب محفل دنگ ہو کر رہ گئے لیکن حضرت گویا کے پاس خاطر سے، کسی نے کوئی ناشائستہ جواب نہیں دیا۔

اتنے میں ہوا کا ایک تند جھونکا آیا، اور فقیر محمد خاں کا اڑتا دامن دیکھ کر، محمد بلند خاں کے بھانجے نے الماری کی طرف اشارہ کر دیا محمد بلند خاں الماری کی طرف جھپٹ پڑے، بیٹے کو کھر کھڑا کر، الماری کے پیچھے سے نکالا اور ان کا گریبان پکڑ کر کہا تیری یہ مجال ہے کہ میرے ساتھ باغوں میں جانے والے کو روک دے، یہ کہتے ہوئے ان کے منہ پر تڑاق سے طمانچہ مار دیا اور جب طمانچہ کھا کر انہوں نے سر جھکا لیا تو محمد بلند خاں کے بھانجے نے کہا ماموں بس اب اس سے زیادہ اور ذلیل نہ کیجئے۔

اور جب محمد بلند خاں بیٹے کو بھری محفل میں ذلیل کرنے کے بعد باہر جانے لگے تو بیٹے نے باپ کے قدم پکڑ لئے اور کہا باوا معاف کر دیجئے اور پھر باپ نے بیٹے کو گلے لگالیا اور پورے اودھ میں غلغلہ بلند ہو گیا فقیر محمد خاں کی بے نظیر شرافت و سعادت مندی کا اور شعراء نے ان کی سعادت مندی کی تعریف میں قصیدے کہے اور انہوں نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔





## میرے دادا

نواب محمد احمد خان بہادر، احمد صاحب<sup>1</sup> ”مخزن الآم“ اور تعلقہ دار کسمندوی، جسمانی و جنسی طاقت کے اعتبار سے ایک ایسے غیر معمولی انسان تھے جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

میں نے ان کو اپنے جاتے بچپن اور آتے لڑکپن میں دیکھا تھا ان کا جسم بے حد گٹھا ہوا تھا کلائیوں دو آدمیوں کی کلائیوں سے بھی زیادہ چوڑی تھیں اور آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والے کے زخموں کے ٹانگے ٹوٹ جائیں۔

ان کی آنکھیں بہت بڑی تھیں منہ پر داڑھی تھی، سر پر پگڑی باندھتے تھے اور جب داڑھی اور پگڑی کے مابین ان کی آنکھیں چمکتی نظر آتی تھیں تو ڈر کے مارے میرا پیشاب خطا ہونے لگتا تھا وہ انگرکھا پہنتے اور انگرکھے کے اوپر ایک مٹلی رومال لپیٹ لیا کرتے تھے۔

ان کی چال اس قدر نپلی تھی کہ اس میں تیز رفتاری کا عنصر پیدا ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ تیز تیز چلنے کو وہ آداب شرفاء کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ صرف ایک وقت، یعنی دوپہر کو کھانا کھاتے اور صبح روزتے کر کے ناشتہ کیا کرتے تھے۔

ان کی پچیس تیس بیویاں، چار نکاحی، اور باقی سب لونڈیاں باندیاں

1۔ ان کے دیوان کا نام

تھیں۔۔۔۔۔ وہ ایک سو بارہ بچوں کے باپ تھے ان کے بچوں کے غالباً پچاسی نام میرے پاس لکھے ہوئے ہیں، باقیوں کے نام اب کس سے پوچھوں۔

ان کا انتقال اٹھاسی برس کی عمر میں ہوا انہوں نے بلوغ کے بعد سے، انتقال تک، کبھی ایک رات بھی عورت کے بغیر نہیں گزاری۔۔۔۔۔ البتہ جب لکھنؤ جاتے تو پردے کی شدت کی بناء پر چوں کہ بیویاں کیسی، لونڈیاں باندیاں بھی ان کے ساتھ

نہیں جاسکتی تھیں اور چوں کہ طوائفوں سے وہ سخت نفرت کرتے تھے اس لئے دو ایک راتیں نانہ ہو جاتی تھیں اور صبح ہوتے ہی ان کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا۔۔۔۔۔ اس عالم میں یہ ایک بندھا کا معمول تھا کہ دو مضبوط جسم کے خدمت گار، ان کی کنپٹیوں پر روئی کے گالے چپکا کر ایک گھنٹے تک سنسی سے ان کا سر دبایا کرتے تھے۔

ان کی اس غیر معمولی جنسی طاقت کا غلام سن کر، لکھنؤ کے بڑے بڑے سول سرجن اور ڈاکٹر ان کے پاس آتے ان سے ان کی غذا، ان کے معمولات مرغوبات و مکروہات کے بارے میں دیر تک سوال کرتے، اور ان کا خون جانچتے تھے مگر کسی کو ان کی بے مثال جنسی طاقت کی لم نہیں معلوم ہو سکی۔

میں نے کم سنی میں ان کی اس بے گراں طاقت کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ چونکہ وہ کاکوری کے تکیہ شریف کے شاہ صاحب کی دعا سے پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے، دادامیاں کو ان کے لڑکپن میں اپنا پائے جامہ پہنا کر، کچھ زیر لب دعا کی تھی اس لئے ان میں یہ غیر معمولی طاقت آگئی تھی (اس بات کو میں ایک افسانے سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا)

ہمارے خاندان کا یہ اصول تھا کہ خلف اکبر کو باپ کا جانشین اور تعلقہ دار بنایا جاتا تھا اور باقی بچوں کو صرف گزارہ دار کی حیثیت دی جاتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن دادامیاں کو چونکہ اپنے تمام بچوں سے بے حد محبت تھی انہوں نے اس اصول کو دوسری شکل دے دی، یعنی میرے حقیقی چچا اور میرے باپ کو، ہر چند سب سے بڑی جائیداد عطا فرمائی اور تعلقہ داری چچا کو بخش دی، لیکن اپنے کسی فرزند کو میرے چچا یا باپ کا دست نگر نہیں رکھا، اور گزارے کے بدلے سب کو دل کھول کر گاؤں اور باغ مرحمت فرمائے، بعض کو مرتبے کے لحاظ سے زیادہ جائیداد دی اور بعض کو کم لیکن کسی ایک فرزند کو بھی محروم نہیں رکھا اور ان بیٹوں کو بھی جو لونڈیوں، باندیوں کے پیٹ سے ہوئے تھے کم سے کم دو دو

گاؤں اور دو دو باغوں کا مالک بنا دیا۔

جس طرح ململ کی چادر کو بھول کے اوپر ڈال کر اور پھر زور سے کھینچ کرتا رتا کر دیا جائے اسی طرح انہوں نے اپنی جائیداد کے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیئے۔

اودھ کے تمام تعلقہ داروں کی طرح، دادامیاں نے بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں فرمائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے باپ کے علاوہ ان کے تمام فرزند جاہل رہ گئے اور حرف شناسی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دادامیاں کو عورتوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ اپنے علاقے کی نگرانی اور ضلع داروں سے حساب نہی کرتے، اس لئے تمام کارندوں نے خوب جی بھر کر لوٹا اور ایک کارندے صاحب نے تو جن کی تنخواہ فقط بیس روپے ماہوار تھی ساڑھے تین لاکھ روپے جمع کر لئے جو ان کے انتقال کے بعد ان کی اکلوتی بیٹی کو مل گئے۔

مہینے، دو مہینے کے بعد جب وہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو لوگوں میں یہ غلغلہ بلند ہو جاتا تھا کہ آج بڑے خاں صاحب برآمد ہوئے ہیں اور احاطے میں اہل ملیح آباد اور رعایا کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے سلام کرنے کی غرض سے، شرفاء کے واسطے کرسیاں اور رعایا کے واسطے دو دو رتک بنچیں رکھ دی جاتی تھیں اور ان کی یہ سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ وہ اس سرے سے لے کر اس سرے تک ہر شخص سے فرداً فرداً باتیں کرتے اور کسی ایک فرد کو بھی مکالمات سے محروم نہیں رہنے دیتے تھے۔

وہ انگریزوں کو ناپاک سمجھتے تھے اور دورے کے سلسلے میں جب ملیح آباد میں کمشنر کا پڑاؤ ہوتا تو حسب دستور وہ سب سے پہلے دادامیاں سے آکر ملتا تھا اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ جب وہ اس فرنگی سے ہاتھ ملاتے، تو اسی وقت تسلہ آجاتا اور وہ اس کے سامنے بیسن مل کر ہاتھ دھولیا کرتے تھے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد (جس کو فرنگی ”غدر“ سے منسوب کرتے تھے)

جب تعلقہ داری کے اسناد تقسیم ہو رہے تھے تو تمام تعلقہ داروں کے ساتھ دادامیاں بھی

تجدید سند کے واسطے گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے تھے اور جیسے ہی لیفٹیننٹ گورنر کی نظر دادامیاں پر پڑی اس نے چیخ مار کر کہا دل ہم نے آپ کو پہچان لیا آپ وہی ہے جو بشیرت گنج کی لڑائی میں برٹش کے خلاف لڑا تھا، آپ نے ہمارا بہت سا آدمی مارا تھا ہم فوج کا کرنل تھا ہم نے آپ کو دو رہین سے دیکھا تھا نائیں نائیں ہم آپ کو سند نہیں دے سکتا۔

جب یہ سنا تو دادامیاں نے گرج کر کہا۔ بے شک میں آپ کے خلاف لڑا تھا اور مجھے لڑنا ہی چاہئے تھا میں نمک حرام نہیں ہوں کہ نواب اودھ اور اپنے ملک سے غداری کرتا ہم پٹھانوں کے خون میں غداری نہیں ہے ہم لوگ تو آن پر جان دے دیا کرتے ہیں آپ سند نہیں دیتے شوق سے نہ دیں۔

دادامیاں کی اس گرج سے دربار پر خاموشی چھا گئی، بہت سے تعلقہ دار ڈر گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے لیکن لیفٹیننٹ گورنر بڑا معقول اور شریف آدمی تھا، وہ مسکرایا اور کہا بہت اچھا بولا، بہت اچھا بولا ہم آپ کا تعلقہ داری کی سند دے گا بہت اچھا بولا پٹھان کیریٹر کے ماپھق (موافق) بولا۔

لیفٹیننٹ گورنر نے ان کو تعلقہ داری کی سند کے ساتھ ساتھ درجہ اول کا آئری مجسٹریٹ بھی بنا دیا اور وہ مہینے میں ایک بار مجسٹریٹ کے فرائض انجام دینے لگے۔

ملیح آباد چونکہ پٹھانوں کی بستی ہے اس لئے آئے دن وہاں لٹھ پونگا ہوا کرتا تھا اور برابر فوج داری کے مقدمے پیش ہوا کرتے تھے لیکن ان کی مجسٹریٹ کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ کسی پر جرمانہ کرتے تھے تو جرمانے کی رقم خود ان کے خزانے سے ادا کی جاتی تھی۔

ایک بار ان کے اجلاس پر ایک پٹھان کا مقدمہ پیش ہوا جس نے ملیح آباد کے اسٹیشن پر ایک بدکلام انسپکٹر پولیس پر لٹھ سے حملہ کر کے اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔

انہوں نے اس پٹھان پر جرمانہ کر کے، جرمانے کی رقم حسب دستور اپنی سرکار سے



ادا کردی اور شام کے وقت اسے بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے اس بد تمیز انسپکٹر کا دماغ صحیح کر دیا۔ میں اس صلے میں تمہیں روپے ماہانہ تمہارا وظیفہ مقرر کر رہا ہوں جو تمام عمر تم کو ملتا رہے گا دادامیاں کے بعد بھی ان کو وہ وظیفہ تا حیات ملتا رہا۔

ایک دن علاقے کے چند کاشتکار خاں صاحب بہادر کی دہائی خاں صاحب بہادر کی دہائی کے نعرے مارتے آئے اور کہا حضور ہمارے گاؤں سیدا پور سے داروغہ جی گزر رہے تھے، انہوں نے ہمارے ٹھوکریں ماریں اور کہا سالو سلام کے لئے کیوں نہیں کھڑے ہوئے۔

دادامیاں نے کسی سپاہی کو حکم دیا کہ ان کے سر پر کس کس کر چپتیں مارو کاشتکار چلائے کہ ہم تو آپ کے پاس فریاد لے کر آئے تھے آپ اٹھائے ہمیں کو پٹوار ہے ہیں اس پر انہوں نے کہا تمہارے سروں پر چپتیں اس لئے لگوا رہا ہوں کہ تم ہماری رعایا ہو اور پھر بھی ٹھوکریں کھا کر آئے ہو جاؤ ابھی جاؤ اور تھانے میں گھس کر داروغہ کے سر پر جوتے مارو اور جب جوتے مار کر آؤ گے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

اور جب وہ لوگ داروغہ کو جتیا کر آ گئے تو ان کی پوریوں، کچوریوں اور مٹھائیوں سے تواضع کی گئی اور ان کا آدھا لگان معاف کر دیا گیا۔

انہیں بیٹریں لڑانے، بیٹریں پالنے، اور بیٹریں کھانے کا بہت شوق تھا سپاہی راتوں کو کھیتوں میں جال لگاتے پھندیتوں کے پنجرے چاروں طرف لٹکاتے، ان کی بولیوں پر بیٹریوں کو کھیتوں میں گراتے، اور صبح کو سینکڑوں بیٹریں جالوں میں پھنسا کر لے آتے تھے ان میں سے کچھ، لڑنے کے لئے پال لی جاتیں، کچھ بچوں میں تقسیم کر دی جاتیں اور کچھ دسترخوان کے لئے پکالی جاتی تھیں۔

جب وہ دوپہر کے وقت دسترخوان پر بیٹھتے تھے تو محل کا پورا لمبا چوڑا الق و دق برآمدہ ان کے ساتھ کھانے والے بچوں سے بھر جاتا، اور ایسا معلوم ہوتا کہ سکندر اعظم

کی فوج ٹوٹ پڑی ہے۔

ایک روز میں اپنے باپ کے پاس بیٹھا برقی کھا رہا تھا کہ دادامیاں کا خاص خدمت گار رحم علی آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا بڑے خاں صاحب بہادر نے یاد فرمایا ہے۔

جب میں، اپنے باپ کے ساتھ، محل میں داخل ہوا، دیکھا کہ وہ ایک ٹھل سے ڈھکے ہوئے موٹڈھے پر تشریف فرما ہیں اور فرط غضب سے ان کا سر ہل رہا ہے اور جب میرے باپ نے جھک کر سلام کیا اور پوچھا باوا کیا بات ہے تو انہوں نے سر کو جھٹکا دے کر فرمایا ”بشیر مجھے آج محمد اسحاق کی صورت سے نفرت ہو گئی، میرے باپ نے بڑے ادب سے پوچھا باوا کس بات پر دادامیاں نے فرمایا کہ ابھی اسحاق تیز تیز قدم رکھتا میرے پاس آیا تھا میں نے کہا اسحاق، اس طرح چھچھورے پن سے تیز تیز چلنا آداب شرفاء کے منافی ہے، تم جانتے ہو اس نے میری یہ ڈانٹ سن کر کیا جواب دیا، اس نے کہا باوا معاف فرمائیے، خوشی کے مارے میری چال بدل گئی، ہمارے علاقے کے گاؤں تھری میں ایک بہت بڑا خزانہ نکل آیا ہے اس کی خوشخبری دینے آیا ہوں، بشیر اس کا یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں نے کہا دور ہو جا میری نظروں سے بھلا خزانہ بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے شریفوں کی چال میں فرق آ جائے۔

### 1۔ فرزند اکبر

پچاسی برس کی عمر میں بھی دادامیاں کی صحت اس قدر اچھی، اور ان کے قواء اس قدر مضبوط تھے کہ وہ ابھی دس بیس برس تک اور جی سکتے تھے مگر ایک حسین عورت ان کی موت کا باعث بن گئی۔“

واقعہ یہ ہے کہ ان کو خوش کرنے کے لئے مرزا ادا بیگ نے لکھنؤ سے ایک نہایت خوب رو اور دراز قامت مغربی کو بطور تحفہ ان کی سرکار میں پیش کیا تھا، اس عورت کو آتشک کا مرض تھا جو ان کو لگ گیا انہوں نے شرم کے مارے کسی سے نہیں کہا اور کچھ

روز بیمارہ کراسی مرض میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک روز رات کے وقت، جب دادامیاں کے پاس گیا تھا ان کی داہنی میز پر ایک بڑا سا اکا جل رہا تھا، اور بائیں جانب وہ صبح و دراز قامت مغلانی کو لے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی میں اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اس کو جانب، ٹنگلی باندھ کر دیکھنے لگا تھا اور انہوں نے میری یہ حالت دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا تھا ڈیوٹ 1 الوٹ کیا دیکھ رہا ہے، بدتمیز کہیں کا جھکا لے آنکھیں۔

یہ بات کہیں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میرے دادا اپنے مختلف البطن چھوٹے بھائی نواب محمد نسیم خان سے خوش نہیں تھے اور نسیم خان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب محمد علی خان کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے،

دادا جان جب مرض الموت میں گرفتار ہو گئے تو عین ان کے انتقال کے دن ان کو خبر دی گئی کہ محمد علی خان عیادت کے واسطے حاضر ہوئے ہیں۔

یہ سنتے ہی انہوں نے لونڈیوں سے کہا مجھے اٹھا کر بٹھا دو، گاؤتکیہ پیچھے رکھ دو حقہ سامنے لگا دو، میری دادی جان نے کہا اٹھ کر نہ بیٹھو، ایسا نہ ہو دشمنوں کی طبیعت اور خراب ہو جائے انہوں نے جواب دیا کہ محمد علی مجھ کو دیکھنے آیا ہے

---

1 ایک بات سوٹ پہنے دیکھ کر انہوں نے مجھ کو ”ڈیوٹ الوٹ“ صاحب بہادر کا خطاب دیا تھا اور اکثر اسی نام سے مجھے پکارا کرتے تھے

---

آیا ہے، میں اس کو یہ دیکھ کر خوش نہیں ہونے دوں گا کہ چچا اب انتقال کے قریب آگئے ہیں۔

اور جب وہ اٹھا کر بٹھا دیئے گئے انہوں نے حکم دیا بلاؤ محمد علی کو، محمد علی خان نے پوچھا چچا مزاج کیسا ہے، دادامیاں نے بلند آواز سے ارشاد فرمایا، محمد علی اب فاقہ ہو رہا ہے یہ کہہ کر وہ بڑے کڑا کے سے حقہ پینے اور پان کھانے لگے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر جب بھتیجا چلا گیا تو گاؤتکیہ ہٹوا کر میری دادی سے ارشاد فرمایا، میرے بدن میں جس

قدر بھی طاقت باقی تھی وہ میں نے محمد علی پر صرف کردی اس کے بعد، کلمہ پڑھا، اور  
روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ان کے مجموعہ کلام کا نام ”دیوان احمد، موسوم بہ مخزن آلام“ ہے ناسٹل تیج پر مندرجہ  
ذیل عبارت ایک حلقے میں درج ہے ”من نتائج افکار، سخن، سخن، معجز بیان و عالی خاندان  
الادو دمان جناب محمد احمد خان صاحب بہادر، تعلقہ دارو آنریری، مجسٹریٹ خلف الرشید،  
دست گیر افتادگان جنت مکاں حضرت فقیر محمد خاں صاحب بہادر گویا مرحوم و مغفور“  
دادامیاں نے ایک مطبع قائم کر کے ملیح آباد (مرزا گنج) ہی میں یہ دیوان چھپوایا اور  
خاندان میں تقسیم کر دیا تھا۔

اس دیوان کی ضخامت پانچ چھ سو صفحے سے کم نہیں تھی میرے پاس ان کے پچاس  
دیوان تھے گھر میں چوری ہوئی تو چور کتابیں بھی لے گیا اب چند اوراق میرے پاس رہ  
گئے ہیں۔

وہ ٹھیک قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے چند اشعار آپ بھی سن لیں۔

کبھی گر سامنا ہو گا رخ گل گون جاناں کا  
تو فق ہو جائے گا منہ، دیکھنا صبح بد خشاں کا  
علی مرتضیٰ شیر خدا کی مدح لکھتا ہوں  
نیمتاں نام رکھا جائے گا میرے قلمداں کا  
وہ ہوں میں رند، اے واعظ، نہیں کچھ مذہب و ملت  
نہ قائل کفر کا سمجھو، نہ تابع مجھ کو ایماں کا

قتل کر کے ورا بانی بیداد آیا  
آرزو تھی مجھے جس کی وہی جلا د آیا  
نہ ہوا تو مری خاطر سے فراموش کبھی



میں تو بھولے سے بھی تجھ کو نہ کبھی یاد آیا

شہر میں آئے تو جنگل کی ہوا، سر میں بھری  
لائی صحرا میں جو وحشت تو وطن یاد آیا

ثمر باغ جہاں میں یہ ملا نخل جوانی کا  
کہ وصل یار حاصل ہے، مزا ہے زندگانی کا  
حسینوں میں تمہارا نام ہو تابوت پر میرے  
صنم تم ڈال دو اپنا دوپٹہ کام دانی کا

جیتے جی فرقت دل دار نے سونے نہ دیا  
قبر میں حسرت دیداد نے سونے نہ دیا  
رات بھر گنتے رہے تارے، شب تار میں ہم  
یاد افشان رخ یار نے سونے نہ دیا  
خواب میں دیکھ لیا، رقص جو کرتے ان کو  
گھنگروؤں کی ہمیں جھنکارنے سونے نہ دیا

عدم سے جانب ہستی جو بو تراب آیا  
ہوا یہ شور جہاں میں کہ آفتاب آیا

جو یاد ہجر میں ان کی کوئی ادا آئی  
پری کا بھیس بدل کر، مری قضا آئی

صبا، تو آئی ہے کیا ہو کے اس کے کوچے سے؟  
کہ تجھ سے آج مجھے بوئے آشنا آئی  
بہایا آنکھوں سے دریا لہو کا احمد نے  
تمہاری یا وجو اے شاہ کربلا آئی

پڑ مردہ ہو کے بے رخی باغباں سے ہم  
برگ خزاں کی طرح چلے بوستاں سے ہم  
تلقیں کی احتیاج نہیں ہم کو زاہدا  
ہیں فیضیاب، صحبت پیر مغاں سے ہم

جب سے عاشق ہوئے تمہارے ہم  
لگ گئے گور کے کنارے ہم  
وصل کی شب وہ مجھ سے کہتے ہیں  
آج تم جیتے اور ہار سے ہم

☆☆☆☆☆

## میرے باپ

نام تھا نواب بشیر احمد خاں، اور تخلص تھا ”بشیر“ مردانہ حسن میں ان کا جواب نہیں تھا یہ منسلک تصویر اس وقت کے ایک اناڑی کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی ہے جس سے ان کی صورت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ان میں جمال و جلال کا ایسا امتزاج تھا کہ جس جگہ بیٹھ جاتے تھے، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والوں کے ہجوم سے گلیاں بند ہو جاتی تھیں اور جب ریل میں سفر کرتے تھے، تو فرنگی بھی، جن کی تہذیب میں تعارف کے بغیر، بات کرنا بد تہذیبی ہے اس قدر متاثر ہو جاتے تھے کہ ان سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ آپ کا نام کیا ہے، اور آپ کس خاندان کے فرد ہیں ان کو اپنی اولاد سے اس قدر محبت تھی کہ ستر ماؤں کی محبت کو ان کی ایک محبت پر قربان کر دیا جاسکتا تھا، وہ رات کے ایک یا دو بجے مردانے سے اٹھ کر جب زمانے میں تشریف لاتے تھے تو ایک خادمہ، لال ٹین ہاتھ میں لئے آگے آگے چلتی تھی اور وہ ہم ساتوں بھائیوں بہنوں کی نبضیں دیکھے بغیر نہیں سوتے تھے اور جب ہم میں سے کسی کا ناخن بھی دکھتا تو ڈاکٹروں سے ہمارا گھر بھر جایا کرتا تھا اور جب ہم میں سے کسی کے منہ سے کوئی بدشگونی کی بات نکل جاتی تھی تو ہم پر سے صدقے اتارے جاتے تھے اور چونکہ ہمارے تمام محلوں کو بھوتوں اور چڑیلوں کا رونا خیال کیا جاتا تھا اس لئے ہم سب بچوں کی خواب گاہ کے گرد روز رات کو حصار کھینچا جاتا اور ہماری پائنتی ایک ایک

---

1. میں اپنے باپ کے بہت سے واقعات اوپر درج کر چکا ہوں اس لئے اس موقع پر اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔

---

انا یا دو اسلائی جاتی تھی، جب ہم زمانے سے مردانے میں جاتے تو بھی ڈیوڑھی میں سے گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی خادمہ ہمارے ساتھ کر دی جاتی تھی جب ہم غسل خانے جاتے تو اس وقت بھی دروازے پر ایک ماما کھڑی رہتی اور بار بار پکار

پکار کر کہا کرتی تھی بھیا، یا بٹیا ڈرنا نہیں ہم دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں اور جب سوتے وقت دادی جان حصار کھینچ کر، تین بارتالیاں بجاتی تھیں تو ڈر کے مارے، میرے تمام رونگٹے جھمن سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

لیکن انتہائی شفقت کے باوجود وہ تربیت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت گیر، اور دادی جان کی اس نصیحت پر کہ ”بٹیا“ بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ، اور دیکھو شیر کی نگاہ سے بڑی شدت کے ساتھ عامل تھے۔

انہوں نے خصوصیت کے ساتھ، ہم تینوں بیٹوں کو، بڑی سختی کے ساتھ، اس بات کی ممانعت کر دی تھی کہ آپس میں یا دوسرے ساتھ کھیلنے والے بچوں سے کشتہ کشانی نہ کرو، شور نہ مچاؤ، کونوں کھڑوں میں نہ کھیلو خدمت گاروں کارندوں اور سپاہیوں کی چارپائیوں پر نہ بیٹھو، خواہ وہ موجود ہوں یا نہ ہوں، لکھنے پڑھنے کے وقت کھیل کود کے قریب بھی نہ پھلو، کمرے کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھو، اگر کوئی مذاق دل لگی کی بات کرے اسے مارو اور ہمارے پاس لے آؤ، لونڈیوں، باندیوں سے ہنس کر بات نہ کرو۔

ایک روز، کسی منجر نے آدھی رات کو، ان تک یہ بات پہنچا دی کہ میرے بڑے بھائی اور میں دونوں حضرت احسن<sup>1</sup> مارہروی کے صاحبزادے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، باغ میں ٹہل رہے تھے، یہ خبر سن کر وہ آگ بگولا ہو گئے محافظین ماما کی معرفت ہم دونوں بھائیوں کو اسی وقت جگو اکریلوایا، ہم پہنچے تو انہوں نے فرمایا سنا ہے آج آپ دونوں احسن صاحب کے لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ میں گل گشت فرما رہے تھے۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنا کوئی بری بات ہے ہم نے اقرار کر لیا ہمارے اقرار کے بعد انہوں نے بھاری آواز میں فرمایا آپ

<sup>1</sup> وہ ہمارے یہاں اکثر آتے اور ہفتوں ٹھہرا کرتے تھے۔



دونوں ادھر آئیں، جب ہم ان کے قریب پہنچ گئے انہوں نے کہا آپ دونوں اپنے اپنے ہاتھ کھول کر جھکا دیں، اور جب ہم نے ہاتھ کھول کر جھکا دیئے تو انہوں نے اپنے بھرے ہوئے حقہ کی دہکتی ہوئی چلم کے انکارے ہمارے ہاتھوں پر گرا دیئے ہمارے ہاتھ بری طرح جل گئے اور صبح تک بڑے بڑے آبلے پڑ گئے۔

جہاں تک کہ علم و فضل کا تعلق ہے وہ عام روساء سے بالکل مختلف، اور رات کے دو بجے تک کتب بینی کیا کرتے تھے فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر ان کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ سعدی، حافظ، نظیری، قاضی اور فردوسی کا پورا کلام از بر تھا اردو میں وہ میر تقی میر اور میر انیس کے شیدائی تھے اور جب انیس کے مرثیے اور فردوسی کا شاہنامہ سناتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔

شاعری میں سب سے پہلے مرزا داغ سے اصلاح لی اس کے بعد امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے استفادہ کیا، ہر چند وہ لکھنوی غالب پرست ”معیار پارٹی“ کے رکن تھے مگر غالب پر میر کو ترجیح دیتے تھے۔

اور تاریخ اسلام جب بیان فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس دور میں موجود تھے، مجھ سے ایک بار، سیدنا صر حسین صاحب قبلہ نے فرمایا تھا کہ آپ کے والد گرامی کو تاریخ اسلام پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ خود مجھے اس پر غبط پیدا ہوا کرتا تھا۔ دینی اعتبار سے وہ سنی تھے لیکن اہل بیت کی محبت کو جزو ایمان ہی نہیں عین ایمان سمجھتے اور حضرت علی کو تینوں خلفاء پر اہل ترجیح دیتے تھے۔

قلب کی گدازتگی، شاعری سے شیفنگی اور علم و فضل سے وابستگی، اور لکھنوی تہذیب سے دل دادگی کے باوصف، ان کے مزاج میں اس قدر غصہ تھا کہ غضب کے ہنگام وہ ایک خوف ناک پٹھان کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آتے تھے اور قبضے پر ہاتھ رکھتے ہی کچھ اور ہو گئے کا عالم ان پر طاری ہو جایا کرتا تھا۔

ان کی سرکار سے سینکڑوں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظائف ملا کرتے

تھے اور اس کے اخفاء میں ان کو اس قدر غلو تھا کہ کسی کو کانوں کان، خبر ہی نہیں ہونے پائی تھی۔

ان کے انتقال کے بعد میں نے وظائف کا رجسٹر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ اس رجسٹر میں ان لوگوں کے نام بھی درج ہیں جو ہمارے خلاف عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دے چکے تھے۔ اور اس کے باوجود ان کا وظیفہ بند نہیں کیا گیا تھا۔

ہم آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین شاہی دور میں ہمیشہ تلوار چلتی رہی انہیں قندھاریوں میں ایک صاحب عبدالرحمن خان تھے جو میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے انہیں آتے جاتے دیکھ کر مجھ کو اس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ قندھاریوں اور آفریدیوں کے درمیان تو ایک مدت سے عداوت چلی آرہی ہے، پھر وہ میرے باپ سے کیوں ملنے آتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اور پشیمانی آمیز افسوس اس بات پر ہوتا تھا، کہ عبدالرحمن خان کے آتے ہی میرے باپ کی آنکھیں کیوں جھلک جاتی ہیں میں یہ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھا کرتا تھا کہ میرے باپ شاید عبدالرحمن خان سے ڈرتے ہیں جبھی تو ان کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں لیکن ڈر کے مارے زبان سے کچھ کہتا نہیں تھا، جب بہت دن تک یہ تماشہ دیکھتا رہا تو مجھ سے ضبط نہیں ہوا اور ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا میاں آپ عبدالرحمن خاں سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتے انہوں نے میرا یہ سوال سن کر پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجھ کو اپنے قریب بٹھا کر فرمایا بیٹا عبدالرحمن خاں ایک زمانے میں رئیس تھے اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے اس لئے میں ان کو وظیفہ دیتا ہوں، اور بیٹا شریفوں کی یہ آن ہے کہ جس کو وظیفہ دیتے ہیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہو جائے اور جب میں آنکھوں میں آنسو بھرے جانے لگا تو انہوں نے فرمایا دیکھ بیٹا میرے سر کی قسم یہ بات کبھی زبان پر نہ لانا۔

جہاں تک ان کی ادبی زندگی کا تعلق ہے وہ گاہ گاہ غزلیں کہا کرتے تھے ان کے

پاس کوئی بیاض نہیں تھی غزلیں پر چوں پر لکھ کر ادھر ادھر ڈال دیتے یا کبھی صندوقے پر رکھ لیا کرتے تھے اس لئے ان کے کلام کا بہت بڑا حصہ تلف ہو گیا، جو چند غزلیں مل سکیں وہ بھائی صاحب نے ”کلام بشیر“ کی صورت میں چھاپ دیں، جس کا ایک حصہ ترقی اردو بورڈ میں موجود ہے۔

ان کو زبان کی صحت، اور لہجے کی نجابت کا بے حد خیال رہتا تھا اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بولتا تھا، وہ تڑاق سے، تھپڑ مار دیا کرتے تھے۔  
افسوس کہ ”کلام بشیر“ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے حافظے میں جو چند شعر موجود ہیں وہ سن لیجئے:

آمادہ ہو جو سوز نہاں کے بیان پر  
انگارہ خود اٹھا کے میں رکھ لوں زبان پر  
چھوڑو خدا ہی پر کہ وہاں ہو گا فیصلہ  
میرے بیان پر نہ، تمہارے بیان پر  
اب تم بھی مہرباں ہو تو جی خوش نہ ہو سکے  
دل مر گیا، کچھ ایسی بلا آئی جان پر

یہ رشک کے صدمے کبھی دل سہہ نہیں سکتا  
جنت بھی ترا گھر ہو تو میں رہ نہیں سکتا  
سمجھو تو اسی پردے میں کہ جاتا ہے سب کچھ  
جو تم سے یہ کہتا ہے، میں کچھ کہہ نہیں سکتا

جگنوؤں کا وہ چمکنا کبھی ویرانوں میں  
وہ غریبوں کے مزاروں پہ چراغاں ہونا

دل ہی دل میں مرے رونے پہ وہ ہنسا ان کا  
اثر ضبط وہ چہرے سے نمایاں ہونا

راہ پر، ان کو، لے ہی آیا د  
اف رے چلتے ہوئے زمانے کے

دم ان کے سامنے نکلے دعا یہ مانگوں گا  
ذرا مجھے مرے احباب قبلہ رو کرتے  
برا ہو دل کا یہ کم بخت آہ کر بیٹھا  
قریب تھا کہ وہ کچھ مجھ سے گفتگو کرتے

کوئی گریاں قریب تربت ہے  
زندگی! پھر تری ضرورت ہے

☆☆



## میری ماں

نواب خولجہ محمد خاں، جاگیر دار دھول پور (راجپوتانہ) کی بیٹی تھیں۔

میرے نانا ہر چند بہت معمولی سے پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ انہیں اپنی بیٹی اور بیٹے کی تعلیم و تربیت میں بے حد غلو تھا۔ انہوں نے لکھنؤ سے ایک قابل استانی اور لائق استاد کو بلا کر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا، اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے لکھنؤ کی مغلانیوں کو بھی ملازم رکھا تھا کہ وہ انہیں آداب دکھائیں۔

اس لکھنوی اثر کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرے ماموں تو بالکل شیعہ ہو گئے اور میری ماں ہر چند اصحاب ثلاثہ کو مانتی رہیں لیکن حضرت علی کو سب پر بمراحل ترجیح دینے اور محرم میں عزاداری کرنے لگیں۔

میری نانی کا سایہ، میری ماں کے سر سے لڑکپن ہی میں اٹھ چکا تھا، لیکن ان کی سوتیلی ماں حاتم زمانی بیگم نے انہیں سگی ماں کی طرح اس لاڈ سے پالا کہ میری ماں کو یہ محسوس نہیں ہو سکا کہ ان کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے، جب میری ماں کی شادی کا وقت آیا تو چونکہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میرے دادا براتیوں کا لشکر ساتھ لے کر آ رہے ہیں اس لئے وہ دھول پور سے آگرہ چلی آئیں کہ نانا کے آگرے والے محل میں بیک وقت پانچ چھ سو مہمان ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔

میرے نانا کے تعلقات راجپوتانہ کے تمام والیان ریاست سے بردرانہ تھے اسی لئے میری ماں کی شادی میں چھ سات والیان ریاست نے شرکت کی تھی۔

اور چونکہ میری سوتیلی نانی حاتم زمانی بیگم واقعی حاتم ثانی تھیں اس لئے انہوں نے اس قدر جہیز دیا تھا کہ وہ مال گاڑی کی آٹھ بڑی کراچیوں میں بھر کر ملیح آباد لایا گیا تھا اور اور آگرے میں اس شادی کے ڈنکے پٹ گئے تھے۔

حاتم زمانی بیگم نے دو مغلانیاں، دو غلام اور ایک ہاتھی بھی اس کے چاندے

سونے کے زیوروں کے ساتھ جہیز میں شامل کر دیا تھا۔

آگرے سے کامل دو مہینے کی مہمان داری کے بعد جب برات ملیح آباد آئی تو میری دادی فرماتی تھیں کہ تمام محل میں چراغاں کیا گیا اور ایک عشرے تک دعوتوں اور مجروں کا سلسلہ جاری رہا۔

دادامیاں چونکہ غیر معمولی طور پر سجد کثیر العیال تھے، اور چونکہ ان کے بہت سے بیٹے فوت ہو چکے تھے اس لئے ان کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے، شام کے وقت اپنے مرے بیٹوں کو نام لے لے کر پکارتے کہ اے امیر احمد، اور اے رشید احمد واپس آ جا واپس آ جا اور اس قدر زور سے روتے تھے کہ محل کے تمام سقف و بام ہلنے لگتے تھے<sup>1</sup>۔ دادامیاں کی آواز چراغ جلے جب محل میں گونجنے لگتی تھی ڈر کے مارے میری ماں کا برا حال ہو جاتا تھا وہ کانپنے لگتی تھیں اور میکے سے آئی ہوئی مغلانیاں ان سے کہتی تھیں صاحبزادی یہ نواب صاحب کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے آپ کو شیروں کے کٹہرے میں بند کر دیا ہے۔

میرے باپ کو میری ماں کی اس دہشت زدگی کا علم ہوا تو وہ اپنے بڑے بھائی محمد اسحاق خان کے محل میں اٹھ گئے لیکن وہاں پہنچ کر بھی میری ماں کو سکون حاصل نہ ہو سکا۔ میرے چچا اس قدر مغلوب الغضب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر ماماؤں اسیلوں

1۔ یہ ماجرا میری ماں نے مجھ سے بیان فرمایا تھا

کو اس قدر زور سے ڈانٹتے ڈپٹتے تھے کہ ان کی آواز کی دھمک سے زمین کانپنے لگتی اور نم خوردہ چھجے کے پلاسٹر کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر چبوترے پر بکھر جاتے تھے۔ خسر کے محل میں ہائے ہائے کی پکار اور دیور کے محل میں شیر کی ڈہکار۔۔۔۔۔ میری ماں بڑے شش و پنج میں مبتلا ہو گئیں۔

اس کے بعد میرے باپ کا محل کیسے بنا، اس کی روداد میری ماں کی زبان سے سن

لیجئے۔

انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا بیٹا جب میں تمہارے چچا کے گھر میں رہتی تھی ایک دن ایک ایسی ہلچل برپا ہو گئی کہ میں سمجھی آج میرا دم نکل جائے گا اور ہلچل کیسے ہوئی، یہ بھی سن لے۔

ایک دن تمہاری چچی، ساٹھن کا بے حد چست گھٹنا پہنے جب چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو اس قدر گھٹنے پر زور پڑا کہ وہ ان کے گھٹنے کے نیچے کوئی ایک باشت بھرا دھڑ گیا۔ اتنے میں بد قسمتی سے تمہارے چچا نا وقت زمانے میں آنکے انہوں نے اپنی بیوی کا ادھر اگھٹنا دیکھا تو بڑی تیزی کے ساتھ کمرے میں جا کر ایک بڑی لمبی سی چھری لے کر آگئے تمہاری چچی کو چبوترے پر گرادیا ان بچاری کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور کہا اے بے غیرت بھرے گھر میں نگلی پھر رہی ہے یہ کہتے ہی انہوں نے چھری اٹھائی کہ ان کا گلا کاٹ ڈالیں وہ تو اللہ نے یہ بڑی خیر کی کہ یہ ماجرا تمہاری دادی نے دیکھ لیا انہوں نے آکر تمہارے چچا کی پیٹ پر، زور سے چھڑی مار کر کہا اسحق میرے سر کی قسم میری بہو کے سینے سے اتر آ بڑا غیرت دار بنا ہے۔

جب ماں نے قسم دی تو تمہارے چچا تمہاری چچی کے سینے سے اتر آئے اور چھری پھینک کر بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیٹا یہ تماشا دیکھ کر میں ادھ موئی ہو کر رہ گئی اور جب تمہارے باپ گھر میں آئے میں نے سارا ماجرا بیان کر کے ان سے کہا، اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو خود اپنا مکان بنوا لیجئے، نہیں تو میں ہول کھا کھا کے ایک دن مر جاؤں گی۔

اس کے بعد میرے باپ کا مکان تعمیر ہو گیا اور میری ماں نے اپنے مکان میں آکر اطمینان کی سانس لی۔

میری ماں کو اس ناز و نعم سے پالا گیا تھا کہ وہ کھانا پکانا، سینا پرونا بالکل نہیں جانتی تھیں پکانا ریندھنا، یا سینا پرونا تو بڑی بات ہے ان کو پوری سوتک گنتی بھی نہیں آتی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روپے میں کتنے پیسے اور آنے ہوتے ہیں ان کی خاص

مغلانیاں موم بیگم اور عباسی خانم ان سے مہینے میں دو دو اور کبھی تین تین بار تنخواہیں وصول کر لیتی تھیں اور ان کو پتہ نہیں چلتا تھا، اور جب کبھی وہ کہتی تھیں کہ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں پہلی کو تمہاری تنخواہ دے چکی ہوں تو وہ کہتی تھیں ہے ہے بیگم صاحب بھلا ایسا اندھیر ہو سکتا ہے کہ ہم تنخواہ پا چکنے کے بعد بھی پھر آپ سے تنخواہ مانگیں حضرت عباس کی قسم آپ کو دھوکا ہو رہا ہے تو میری ماں اسی شرمندہ ہو کر رہ جایا کرتی تھیں ان امور پر نگاہ کر کے، میرے باپ نے گھر کا انتظام کبھی ان کے سپرد نہیں کیا اور میری دادی<sup>1</sup> جان گھر چلائی رہیں۔

1 میری دادی آگرے کے اس ممتاز اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں جس کے محل کے چاروں طرف ایک بہت بڑا پائین باغ تھا اور اسی بناء پر اہل آگرہ اس باغ کو ”باغ والے“ کہا کرتے تھے دادی جان کے باپ کا نام غالب مرزا ثار حسین بیگ تھا جن کے دادا ترکستان سے آکر آگرے میں آباد ہو گئے تھے مرزا ثار حسین بیگ صاحب آگرے کے کوتوال تھے اور آگرے کی مشہور ”کوٹوالی گلی“ آج تک ان کے نام سے مشہور ہے میں نے دادی جان کے حقیقی خالہ زاد بھائی مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبر آبادی کو لڑکپن میں دیکھا تھا وہ کڑھا انگرکھا پہنتے تھے، اور شانوں پر شالی رومال پڑا رہتا تھا حضرت رئیس بڑے وضع دار اور بڑی آن بان کے بزرگ اور آدھے شعرائے آگرہ کے مانے ہوئے استاد تھے آخر عمر میں ان کی جاگیر داری پر زوال آگیا تھا مگر رکھ رکھاؤ میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی تھی ایک بار کسی نے ان کے سامنے مرزا غالب کا ذکر کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ غالب کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے اس لئے کہ وہ میرے قرابت داروں میں سے تھے۔۔۔۔۔ دادی جان کو ہزاروں کہاوتیں اور فارسی و اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے جنہیں وہ با محفل صرف کیا کرتی تھیں اور جب ہم سب بھائی بہن دسترخوان پر بیٹھتے تھے وہ ہمارے ساتھ آکر بیٹھ جاتیں اور کھانے کے آداب بتایا کرتی تھیں اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بول اٹھتا



تھا تو وہ منہ پر تھپڑ مار دیا کرتی تھیں وہ بیدار سناخ العقیدہ شیعہ تھیں اور جب وہ چپکے چپکے مجھ کو شیعیت کا درس دیا کرتی تھی تو میری پچھلی جو میرے چچا کی طرح کڑسنی تھیں ان سے ہنس کر کہا کرتی تھیں اماں پوتے کو شیعہ نہ بنائیے تو وہ بگڑ کر کہتی تھیں چل خچ مر دار خارجن آخر گھر میں کوئی تو ایسا ہو جس کا فاتحہ درود مرنے کے بعد مجھ تک پہنچ سکے۔

ان میں اس قدر زبردست انتظامی قوت تھی کہ وہ ایک سلطنت کا کام چلا سکتی تھیں۔

میری ماں کو شاعری سے بڑی دلچسپی اور امیر انیس سے بڑی محبت تھی اور ان کے مرثیے پڑھ پڑھ اور سن سن کر رویا کرتی تھیں۔

ہم سات بھائی بہن تھے یعنی افسر جہاں بیگم 1، شفیق احمد خاں، شیر احمد خاں (بعد کو شبیر حسن خاں جوش) انیس جہاں بیگم، رئیس احمد خاں، حشمت جہاں اور شوکت جہاں۔۔۔۔۔ لیکن ہم سات بھائی بہنوں میں میری ماں مجھے سب سے زیادہ چاہتی تھیں، اوروں کی خدمت گزاری بواگزار کے سپرد تھی لیکن میرے ناشتے کا دودھ، شہد اور جلیبیاں ملا کر وہ اپنے ہاتھ سے تیار کر کے مجھ کو آواز دیا کرتی تھیں، ننھے آ، تیرا دودھ تیار ہے۔

ابھی کوئی ایک ہفتہ کی بات ہے کہ صبح کو میری بیوی نے مجھ سے پکار کر کہا اے ہے کب تک اچھل کود (ورزش) کرتے رہو گے، تمہارا دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے بیوی کی یہ آواز سن کر مجھے اپنی ماں یاد آ گئیں دل پر بجلی گر پڑی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ جاری ہو گیا۔

میری پیاری ماں، آپ سوچکی ہیں اور میں ابھی تک جاگ رہا ہوں زندگی کی رات کس قدر بھیا نک ہے یہ آپ سے کیوں کر بتاؤں۔۔۔۔۔ اماں آپ کا ”ننھا“ اب بوڑھا ہو چکا ہے اور اب اس کو ”ابا“ اور ”نانا“ کے ناموں سے پکارا جا رہا ہے۔  
کاش! میں آپ کے سامنے مرجاتا اور یہ دن نہ دیکھتا۔

میری اچھی ماں اب مجھے اپنے پاس بلا لیجئے اور اے اللہ اب مجھ کو اس دنیا سے اٹھا  
لے۔

سر گھوم رہا ہے، ناؤ کھیتے کھیتے  
اپنے کو، فریب عیش دیتے دیتے  
اف کار حیات، تھک گیا ہوں معبود  
دم ٹوٹ چکا ہے، سانس لیتے لیتے!

1۔ صد صیف، افسر جہاں بیگم، شفیق احمد خاں اور حشمت جہاں کا انتقال ہو چکا

ہے۔

☆☆☆

All rights reserved.

©2002-2006

## میرے چچا

نام تھا نواب محمد اسحاق خان ”کسمنڈی“ کے تعلقہ دار اور بڑے رعب و داب کے بے حد اکھڑ پٹھان تھے آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والوں کے کلیجے شق ہو جائیں مزاج میں اس قدر زبردست غصہ تھا کہ جب بگڑ جاتے تو بے تحاشہ گالیاں دینے اور بکنے لگتے تھے اور یہ بھی خیال نہیں رہتا تھا کہ بھائی بھتیجے بھانجے، بیٹے بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ میرے باپ کے حقیقی بڑے بھائی اور ان سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ میرے باپ نے ان کی بیوی کا دودھ پیا تھا۔ مزاج میں وہ میرے باپ کے بالکل برعکس تھے۔ علم و ادب اور تہذیب سے انہیں کوئی سرکار نہیں تھا میرے باپ تفصیلی اور وہ سجد کٹر سنی خلیفہ اول کو تمام اصحاب پر ترجیح دیتے تھے۔

جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ میں شیعہ ہو گیا ہوں تو انہوں نے مجھے اس نیت سے اپنے گھر بلایا کہ میری مرمت کر دیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گرج کر کہا:

سب کے سر تاج بعد پیغمبر  
یعنی بوبکر، افضل و برتر

پوچھا کیسا شعر ہے میں نے کہا بڑے باوا اچھا، میرا جواب سن کر وہ بھنچے ہوئے غصے کے ساتھ منہ سے آوازیں نکالنے لگے ہوں، ہوں، ہوں، وہ معمولی آواز کی ”ہوئیں نہیں بڑی گھڑ گھڑاتی، اور طویل الصوت ”ہوئیں“ تھیں۔“ جن کے یہ معنی تھے کہ اگر اس شعر کے خلاف کچھ کہو گے تو مزاح چکھا دوں گا لیکن میں بے وقوف نہیں تھا کہ ان کو موقع دے دیتا اس لئے ٹال کر چلا آیا۔

میری دادی جان، میرے باپ کے ساتھ رہتی تھیں اور وہ ہر جمعرات کو ان سے ملنے آیا کرتے تھے ایک روز رئیس احمد انگنائی میں کھیل رہا تھا کہ وہ دادی کے سلام کی خاطر آگئے رئیس احمد سے انہوں نے کہا آؤ میرے ساتھ، اماں کو سلام کرنے کے بعد تم

کو گھر لے جا کر خوب برنی کھلاؤں گا وہ دادی کو سلام کر کے بیٹھ گئے اور رئیس کو گھٹنے پر بٹھالیا۔

دادی جان نے باتوں باتوں میں کہا بیٹا اسحق یہ بو کیسی آرہی ہے، انہوں نے کہا اماں یہاں تو کسی قسم کی بو نہیں ہے دادی نے اپنی لونڈی سے کہا سکونت کیا تجھے بھی بو محسوس نہیں ہو رہی ہے اور جب سکونت نے بھی یہی کہا کہ بی بی مجھ کو تو بو نہیں آرہی ہے تو دادی نے ناک پر آنچل کا سر رکھ کر کہا افوہ بو بکر

یہ سنتے ہی چچا جامے سے باہر ہو گئے رئیس کو گھٹنے سے نیچے گرا دیا اور کہا اماں آپ تبر بازی کر رہی ہیں یہ کہہ کر انہوں نے فرش پر دھم سے ڈنڈا مار کر کہا اماں دم چار یا دم 1 چار یا یہ سنتے ہی دادی نے کڑک کر کہا بیٹا دم پختن دم پختن اور وہ دم چار یا دم پختن کے نعرے اس قدر بلند ہو گئے کہ مردانے تک آواز پہنچی میرے باپ گھبرائے اندر آئے کہ یہ ”دم چار“ اور ”دم پختن“ کیا ہو رہا ہے۔

میرے باپ کے آتے ہی بڑے باوا غصے میں کانپتے کھڑے ہو گئے اور کہا بشیر تم دیکھ رہے ہو کہ اماں تبرے بازی کر رہی ہیں کیا کروں ماں ہو پڑیں، کوئی اور کہتا تو خون چوس لیتا ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرغی گزرنے لگی۔

1 یعنی میں چار یا رکام بھرتا اور ان کی برتری کا نعرہ لگاتا ہوں۔

انہوں نے مرغی کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیں اور فوراً میرے گھر سے کانپتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ہنگامہ 1857ء کے بعد، فرنگی حکومت نے ایک سخت مزاج کمشنر کو، جس کا نام شاید ہیولاک تھا اس امر پر مامور کیا تھا کہ وہ روہیل کھنڈ اور لیج آباد کے پٹھانوں کو ڈرائے اور ان کے دلوں پر انگریزی حکومت کے رعب کا سکہ بٹھائے۔۔۔۔۔ دورہ کرتا جب وہ لیج آباد آیا، تو میرے دادا کی مخالف پارٹی نے اس سے کہا کہ نواب محمد اسحق خان کے سپاہیوں میں بہت سے بدمعاش اور ڈاکو شامل ہیں اور جب چچا اس



سے اپنے سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ ملنے گئے تو کمشنر نے ان سے کہا ”دل کھان صاحب آپ کا سپاہی لوگ بدماں (بدمعاش) اور ڈاکو ہے یہ سنتے ہی انہوں نے بڑے زور سے ڈانٹ کر کہا اے تو بدمعاش ہے تو ڈاکو ہے، میں ابھی تیری اور تیری مبینی (میم) کی۔۔۔ پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ اور کھانچی 1 بھر ہگادوں گا“ یہ کہہ کر وہ اس کی طرف جھپٹے وہ گھبرا کر خیمے سے نکل گیا اور گھوڑی پر بیٹھ کر لکھنؤ بھاگ گیا۔۔۔ اور لکھنؤ جاتے ہی اس نے ملیح آباد کے تھانے کے انچارج کوتا ردیا کہ چچا کے تمام اسلحہ ضبط کر لئے جائیں۔۔۔ تھانے دار کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی وہ سیدھا دادامیاں کی ڈیوڑھی پر گیا۔ دادامیاں محل کے اندر جا چکے تھے اس نے ان کے منہ چڑھے خدمت گار رحم علی کی ٹھڈی میں ہاتھ ڈال کر کہا مجھ پر ایک بہت بڑی مصیبت آ گئی ہے میں اس وقت بڑے خاں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، خدا کے واسطے میری خبر کر دو۔۔۔ رحم علی کو ترس آ گیا، اس نے فوراً ماما کے ذریعہ سے خبر کر دی دادامیاں نے پردہ کرا کے اس کو اندر بلا لیا۔

تھانے دار ان کے قدموں پر گر پڑا اور کہا خاں صاحب بہادر میری جان بچا لیجئے چھوٹے خان صاحب (میرے چچا) کے اسلحہ ضبط کر لینے کا مجھے کمشنر نے تار دیا ہے حضور مدد کر دیں گے تو میری جان اور نوکری بچ جائے گی۔

1 بہت بڑا خرپڑے کا ٹوکرا (یہ ان کا تکیہ کلام تھا وہ جب کسی کو ہگاتے تو کھانچی بھر ہگاتے تھے)

دادامیاں نے چچا کو بلا کر کہا اسلحہ میرے سر پر ہاتھ رکھو چچا نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو انہوں نے کہا ان تھانے دار کو کمشنر نے تار دیا ہے کہ تمہارے اسلحہ ضبط کر لئے جائیں اس میں ان کی کوئی خطا نہیں میرے سر کی قسم انہیں کوئی گزند نہ پہنچانا۔

انہوں نے تھانے دار سے کہا آئیے میری طرف اور لے جائیے ہتھیار۔۔۔۔۔ اس کے بعد بیٹھ کے میں ایک بڑی سی میز پر تمام اسلحہ چن دیئے گئے،

سب سے پہلے انہوں نے بندوق اٹھائی، اس کو فرش پر رکھا، اور اس پر پانچ جوتے مارے، اور تھانے دار کی طرف یہ کہہ کر بندوق پھینک دی کہ لیجئے اس کو اپنی ماں کی۔۔۔۔ میں رکھ لیجئے اور اسی طرح، ایک ایک کر کے، تمام اسلحہ پر پانچ پانچ جوتے مار کر اور اسے بھی اپنی ماں کی۔۔۔۔ میں رکھ لیجئے کہہ کہہ کر انہوں نے تمام ہتھیار واپس کر دیئے اور گالیاں کھایا ہوا تھانے دار سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

ان کو جب غصہ آتا تھا تو بقدر شدت غضب وہ دیر تک اس قابل نہیں رہتے تھے کہ بات کر سکیں اس عالم میں وہ اپنے دونوں ہاتھ کی انگلیوں کو باہم پیوست کر کے، اپنے دونوں انگوٹھوں کو اٹھا لیتے اور ایک دائرے کی صورت میں ایک دوسرے کے گرد گردش دینے لگتے تھے اور جب تک ان پر یہ کیفیت طاری رہتی تھی کوئی ان کے پاس آنے یا ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ کسی کو گالیاں دینے کے بعد اپنے انگوٹھوں کو گھمار رہے اور تمام حاضرین ان کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں لرزاں وترساں کھڑے ہوئے تھے کہ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب ان سے ملنے کے واسطے آگئے، ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کوئی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا کہ فرط غضب کی بناء پر خاں صاحب کے انگوٹھے گھوم رہے ہیں اس وقت ان کے پاس نہ جائیے۔

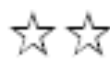
چنانچہ ڈپٹی صاحب ان کے کمرے میں داخل ہو گئے داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا آداب عرض خاں صاحب ”چچا جان نے، ان کی طرف گھور کر دیکھا بول سکنے کی طاقت نہیں تھی سلام کا جواب نہیں دیا اور ”ہوں“ کر کے اور تیزی سے انگوٹھے گھمانے لگے، ڈپٹی نے بڑے غور سے ان کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا اور یہ کیا تماشہ ہے کہ ان کے انگوٹھے برابر گھوم رہے ہیں اور دو ایک منٹ کی حیرانی کے بعد جب اس نے پھر کہا ”خاں صاحب مزاج کیسا ہے؟“۔۔۔۔۔ تو انہوں نے اپنی رانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا، ”



تو ”چری پھٹی“ ”چری پھٹی“ ”چری پھٹی“ کی آوازیں آرہی ہیں آئندہ مجھ کو یہ فحش  
باجانہ سنانا، ورنہ ڈنڈا۔۔۔ گھسیڑ دوں گا۔

اور جب وصی احمد بھائی کھسیانے ہو کر باجہ اٹھنے لگے، تو بڑے باوانے ڈنڈا مار کر  
اس کو توڑ ڈالا۔

ایک مرتبہ وصی احمد بھائی سوٹ پہن کر اپنی فرنگی معشوقہ سے ملنے کے لئے لکھنؤ جا  
رہے تھے ابھی وہ احاطے کو طے ہی کر رہے تھے کہ معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ بڑے  
باوا، خلاف وقت و معمول مردانے میں نکل آئے اور ان کی پشت دیکھ کر، سپاہیوں سے  
پوچھا یہ کون فرنگی جا رہا ہے، سپاہیوں کو یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کے فرزند  
اکبر وصی احمد خان ہیں، لیکن بڑے باوانے جب ڈانٹ کر پوچھا تو انہوں نے ڈرتے  
ڈرتے بتا دیا کہ حضور یہ وصی احمد خان ہیں، بڑے باوانے ڈانٹ کر آواز دی پلپلی  
صاحب ادھر آئیے۔ وصی احمد بھائی اچھل پڑے رنگ زرد ہو گیا سر جھکائے ہوئے  
آئے بڑے باوانے فرمایا کہ آپ پٹھان ہو کر ایسے بے غیرتی کے ننگے کپڑے پہنتے  
ہیں جب آپ پھانک کی طرف منہ کئے جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے  
سرین ط، ط، ط، کرتے اوپر نیچے آ جا رہے ہیں تھوک ہے آپ کی پٹھنولی پر  
جائیے۔۔۔ میں آپ کو عاق کرتا ہوں، ہر چند آپ فرزند اکبر ہیں مگر میں آپ کو نہیں  
آپ کے چھوٹے بھائی کو اپنا جانشین بناؤں گا۔۔۔ جائیے، اور اب بڑے مزے سے  
اپنے سرینوں کو طوئے، طوئے، طوئے، طوئے کرتے پھرینے۔





## میری بیوی

اشرف جہاں بیگم، میرے دادا کے مختلف البطن، چھوٹے بھائی، نواب محمد نسیم خان بہادر، تعلقہ دار سہلामو کے فرزند محمد مقیم خان کی بیٹی، اور ساملہ بیگم کی نواسی ہیں۔  
صائمہ بیگم کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ میری بیوی کا مزاج سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

صائمہ بیگم میرے اور میری بیوی کے پردادا نواب فقیر محمد خان بہادر کی نہایت شعلہ مزاج، اور چیتتی بیٹی تھی اور باپ نے اس خیال سے کہ بڑے محل میں ان کی شعلہ مزاجی کی بناء پر کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ انہیں ”منجھل محل“ دے دیا تھا، کہ وہاں وہ بلا اثر کت غیرے آرام سے رہیں۔

صائمہ بیگم کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے کپڑے دھو بی کے وہاں نہیں جاتے تھے، دھو بن ان کو گھر ہی میں دھوتی اور استری کر دیا کرتی تھی،  
ان کا کھانا تو منجھل محل ہی میں پکتا، لیکن ان کا ناشتہ، ایک روپیوں اور اشرافیوں سے بھرے ہوئے تھال کے ساتھ بطور جیب خرچ، باپ کے گھر سے آیا کرتا تھا جس کو وہ چاندی اور سونے کی آمیزش کی بناء پر ”کچھڑی“ کہا کرتی تھیں۔

چونکہ ان کے دو تین بچے سنور ہی میں جاسکے تھے، اس لئے اپنی مغلانیوں، اماؤں، اسیلوں، اور لونڈیوں باندیوں کے متعلق انہیں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تھی، کہ ہونہ ہو، ان میں کوئی ”ٹنہیا 1“ ضرور ہے۔

اور جب تیسرے یا چوتھے بچے کی ولادت ہوئی تو انہوں نے محل کے تمام دروں میں پردے جھڑوا دیئے اور زچہ خانے کے دروازے پر عورتوں کا پردہ بٹھا دیا کہ مخصوص اماؤں کے سوا اور کوئی اندر نہ آ سکے۔

اسی اثناء میں ایک متجسس مزاج کمن لونڈی نے ان کے بچے کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر کوٹھے پر دبے پاؤں چڑھ کر جیسے ہی کھڑکی کا پٹ کھول کر جھانکا، صائمہ بیگم کی نگاہ

اس پر پڑ گئی، انہوں نے جھٹ سے بچے کے منہ پر پلو ڈال کر فوراً حکم دیا کہ اس کلموئی  
 مٹھیا کو زندہ دفن کر دیا جائے اور اسے چاری لونڈی کو محل کے ایک گوشے میں قد آدم  
 گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا۔

اس انتہائی ظالمانہ حادثہ کے بعد ایک روز ان کے شوہر نے جو اودھ کی فوج کے  
 عہدہ دار تھے جب لکھنؤ جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے کہا آج نہیں، پرسوں  
 جانا، شوہر نے کہا ایک ایسا سرکاری کام ہے کہ مجھے آج ہی جانا ہے، انہوں نے کہا،  
 میں آج تو ہرگز جانے نہیں دوں گی، شوہر نے کہا بیگم مجھے تو آج ہی جانا ہے اتنا کہہ کر  
 وہ محل سے نکل گئے صائمہ بیگم نے کسی لونڈی کو حکم دیا کہ سل اٹھالائے وہ سل اٹھالائی  
 اور سل انہوں نے اپنے سینے پر اس قدر زور سے مار لی کہ پل بھر میں روح پرواز کر گئی:

دید کی کہ خون نا حق پروانہ شمع را  
 چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

محل میں رونا پیٹنا ہونے لگا، ان کے شوہر نے وہ آہ وبکا کی آواز سنی، گھوڑے سے  
 کود پڑے اور جب محل میں قدم رکھتے ہی انہیں بیوی کی خودکشی کا حال معلوم ہوا، تو  
 پستول نکال کر سینے پر مار لیا۔۔۔۔ اور بیوی کی چارپائی کے پاس ہی گر کر دم توڑ دیا۔

1 وہ عورت جو ٹوٹنے ٹوٹنے سے بچوں کو ہلاک کر کے ان کا کلیجہ نظروں ہی  
 نظروں میں چبا ڈالتی ہے۔

یہ ہے میری بیوی کے مزاج کا پس منظر۔۔۔۔۔ وہ ہمہ وجوہ صائمہ بیگم ہیں اس  
 لئے جب ان کو غصہ آتا ہے تو جان لینے اور جان دینے پر اتر آتی ہیں۔

میں اب تک زندہ ہوں، میری سخت جانی کا یہ معجزہ ہے وہ کبھی سیدھے منہ بات  
 نہیں کرتیں، میری بیٹی سعیدہ، میرا بیٹا سجاد، اور ان دونوں کے بچے ان سے ڈرتے  
 ہیں اور چونکہ وہ بچوں کو ہر آن ڈانٹتی ڈپٹتی، گھبراتی اور بات بات پر بدتمیز کہتی رہتی ہیں  
 اس لئے وہ ان کے پاس آنے جانے سے گریز کرتے ہیں۔

جب مکانوں کے سقف و بام سے آوازیں اگلو لینے والا کوئی آلہ ایجاد ہو جائے گا تو میرا سارا مکان ”بدتمیز، بدتمیز“ کی آوازوں سے گونجنے اور کاٹنے لگے گا۔

یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پورے کرۂ ارض کا کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی ماہر نفسیات، یا ماہر نفسیات کا باوا ہی کیوں نہ ہو اس امر کا کبھی اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ وہ کب اور کس بات پر ہنسیں اور کس بات پر جامے سے باہر ہو جائیں گی۔

کون ان کے مزاج کو پرکھ یا پکڑ سکتا ہے۔۔۔۔۔ میں ہزاروں بار تجربہ کر چکا ہوں کہ ایک روز میرے جس لطیفے پر وہ خوب جی بھر کے ہنسی تھیں، جب میں نے ان کو وہی لطیفہ دوبارہ سنایا تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اور کہنے لگیں بھاڑ میں جائے یہ بھی کوئی لطیفہ ہے۔۔۔۔۔ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کہا کرو۔

ہر چند میں نے اپنے معاملات عشق امکانی حد تک ان سے مخفی رکھے تھے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے، میرے دو ایک اور خصوصیت کے ساتھ، میرے آخری عشق کے معاملات اڑتے اڑتے ان تک پہنچ گئے تھے، اور انہوں نے مجھے ایک کمرے میں قید کر کے جو جو ستم مجھ پر ڈھائے تھے ان کی شرح اب بیکار ہے کہ:

سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالب  
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کیجئے  
لیکن اب بھی جب کہ میں کم بخت بوڑھا ہو چکا ہوں وہ کم سے کم مہینے میں چار  
پانچ بار عین اس وقت جب کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد میں طلوع ہونا شروع کرتا  
ہوں وہ مجھے بڑی شدت کے ساتھ میری عاشقی پر طعن و تشنیع کا ہدف بنایا کرتی ہیں میں  
دانت نکال نکال کر کہتا ہوں ارے اشرف جہاں میں دن بھر کا تھکا ماندہ اس وقت پینے  
اور جینے بیٹھا ہوں اس وقت تو گڑھے مردے نہ اکھیڑو، اس وقت، میری غلطی سے ہو  
گیا سو ہو گیا، ارے اب تو اس پر خاک ڈالو، بھول جاؤ، معاف کر دو، لیکن میری

گر گڑا ہٹوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور مجھے لگتا رہا بھلا کہتی رہتی ہیں وہ سلسلہ اس قدر طویل اور روح فرسا ہوتا ہے کہ میں تمللا اٹھتا ہوں، کبھی کبھی جلدی جلدی چار پیگ زہر مار کر کے اور اوندھے سیدھے دو چار لقمے کھا کر اور کبھی کھانا کھائے بغیر ہی خواب گاہ کی طرف بھاگتا اور بستر پر جا کر لیٹ جاتا ہوں مگر وہاں بھی وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں اور خواب گاہ میں داخل ہو کر وہی سلسلہ شروع کر دیتی ہیں۔

اشنائے ملامت میں جب وہ پان دان کھول کر پان بنانے لگتی ہیں تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ اب تبرے بازی ختم ہو جائے گی اور میں کم بخت سوسکوں گا لیکن وہ وقفہ خاموشی قبل از طوفان بن جاتا ہے اور گلوری منہ میں رکھ کر وہ اپنی ملامت کی بندوق میں نئے کارتوس بھر کر مجھ پر دوبارہ گولیاں برسائے لگتی ہیں۔

اس طرح وہ بار بار پان بناتیں اور دو ایک منٹ خاموش رہ کر پھر تبرا شروع کر دیتی ہیں میں بار بار کروٹیں بدلتا ہوں اور وہ ہر بار، ٹھہر ٹھہر کر طعن و تشنیع کے بالکل نئے نئے گوشے نکال کر ”آتے ہی غیب سے یہ مضامین خیال میں کاشوت دیتی رہتی ہیں۔“ شاید کسی نے یہ شعر میرے ہی واسطے کہا تھا:

آ کر سر مزار وہ کیا کیا نہ کہہ گئے  
ہم نے نہ کچھ جواب دیا چپ پڑے رہے  
اور بالآخر مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں کے زیر اثر میں تڑپ تڑپ کر  
سو جاتا نہایت بھیا نک خواب دیکھنے لگتا اور صبح کو اس زخمی چوہے کی طرح بیدار ہوتا  
جن سے جی بھر کر بلی کھیل چکی ہو۔

اب ان کے مزاج کی چند خصوصیات اور بھی سن لیجئے۔  
پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بدگمانی، ہر وسوسے، ہر قیاس، ہر ظن، اور ہر  
واہمے کو ایک حقیقت کبریٰ اور وحی و لہام کا مرتبہ دے دیتی ہیں۔

مثلاً جب کسی نواسے یا پوتے کو وہ کوٹھے سے پکارتی ہیں اور وہ بچہ آواز پر آواز نہیں



دیتا تو یہ جانچے بغیر کہ وہ اس وقت مکان میں ہے کہ نہیں، یا کسی ایسے دور کے گوشے میں ہے جہاں تک آواز نہیں پہنچ سکتی ان کو اس بات کا یقین اور یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بیٹی یا بیٹے نے اپنے بچوں کو ہدایت کر دی ہوگی کہ وہ میری آواز پر آواز نہ دیں، اور یہ سوچ کر وہ بیٹی اور بیٹے پر برس پڑتی ہیں اور وہ سلسلہ دیر تک قائم رہتا ہے۔

یعنی ان کے دل میں جب کسی امر کے متعلق ایسا ہوا ہوگا کا خیال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے ہمیشہ یہ معنی ہوتے ہیں کہ یقیناً ایسا ہو چکا ہے اور اس کے سوائے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

یوں تو میں بالعموم پچھلے پہر بیدار ہوتا ہوں لیکن مہینے میں کبھی ایک آدھ بار کسی نا معلوم سبب کے باعث، جب میں دیر سے جاگتا ہوں تو اس غم میں سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ جاتا ہوں کہ آج میں جلوہ ہائے طلوع صبح سے محروم ہو کر رہ گیا اور وہ جب مجھے اس عالم میں دیکھتی ہیں تو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اپنی معشوقہ کو خواب میں دیکھا ہوگا اور چونکہ ”دیکھا ہوگا کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں ”دیکھ چکا ہوں“ وہ مجھ سے بگڑ کر کہتی ہیں اب بھی تم خوابوں میں اس کلمہ کو دیکھ کر تے ہو، اللہ تم کو غارت کرے کیا اب بھی مجھے چین سے نہیں رہنے دو گے؟“

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ صبح کو بیدار ہوں، اس وقت کوئی شخص بلند آواز سے نہ بولے اگر اس وقت کوئی بلند آواز سے بول دیتا ہے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔

چھوٹے دادا کو بلند آواز سے بولنے کا مرض تھا، اور میری بیوی سب سے زیادہ ان کو جھڑکیاں دیا کرتی تھیں اور وہ میرے پاس منہ پھلائے آتے اور کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں تمہاری بیوی نے تو نا طفقہ بند کر رکھا ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک بار انہوں نے جو چیز کسی جگہ رکھ دی ہے اب وہ چیز قیامت تک اسی جگہ رکھی جائے گی اور اگر کوئی اس چیز کو کسی دوسری جگہ رکھ

دے گا تو قیامت آجائے گی وہ صبح کو خواب گاہ سے نکل کر، برآمدے کے تحت کے جس گوشے پر سب سے پہلی مرتبہ آکر بیٹھی تھیں روز اس گوشے پر آکر بیٹھتی ہیں ہر چند گرمیوں کے موسم میں ادھر دھوپ آجاتی ہے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتیں اور جب میں کہتا ہوں دھوپ سے ہٹ کر سائے میں بیٹھ جاؤ تو وہ بگڑ کر کہتی ہیں یہ میری وضع کے خلاف ہے میں تمہاری طرح تو ہوں نہیں کہ روز ٹھور ٹھکانے بدلتی رہوں اگر میں اس قدر مستقل مزاج نہ ہوتی تو تمہارے سے ہر جانی کو آج تک نباہ ہی نہ سکتی تھی۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی آدمی کو شریف نہیں سمجھتی کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی عورت سے ان کا خلا ملا نہیں بڑھ سکا، وہ کہیں نہیں جاتیں اور کسی عورت کا اپنے وہاں آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے ترتیبی کو برداشت نہیں کر سکتیں، چادروں کی شکنوں اور کرسیوں وغیرہ کے زاویے درست کرتی رہتی ہیں۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناشتہ کے بعد، کم سے کم، آدھ گھنٹے کے واسطے ہمیشہ لیٹ جاتیں اور منہ سے نہیں بولتی ہیں۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیدار ہوتے ہی کراہتیں اور کہتی ہیں کہ آج طبیعت بہت خراب ہے ہڈی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑکپن ہی سے اختلاج قلب میں بری طرح مبتلا ہیں میں نے لاکھوں علاج کر دیکھے مگر وہ بیچاری تن درستی سے آج تک محروم ہیں۔

اور ان کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر روز ایک ایک پانی کا حساب لکھاتیں اور جب تک حساب نہ لکھ جائے ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی ہیں۔

جہاں تک کہ تدبیر منزل کا تعلق ہے ان کی سی منتظم اور سلیقہ مند عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری ہے۔

میں ایک لکھ لٹ انسان ہوں، اگر میری شادی ان سے نہ ہوئی ہوتی تو میں فاقے

کر کے مر جاتا۔

میں دس کروڑ گھوڑوں کی طاقت کا انجن ہوں، وہ اس سے چوگنی طاقت کا بریک ہیں اگر اس قدر قوی بریک نہ ہوتا تو میں اپنا انجن ہمالیہ سے ٹکرا کر اب تک کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔

میں جب حیدر آباد دکن میں تھا وہ اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے تین مہینے کے لئے بلج آباد چلی گئی تھیں ان تین مہینوں کا حال سن لیجئے۔

جب پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی تو ساری تنخواہ، مہمان نوازیوں اور اللوں تللوں کی وجہ سے دسویں پندرہویں دن ہی ختم ہو جاتی تھی اور ہر پندرہویں کو رام لال بقال سے قرض لے کر، گھر کا کام چلایا کرتا تھا اور جب دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ لے کر گھر آتا۔ رام لال کو اپنے برآمدے کی کرسی پر بیٹھایا سوتا پاتا اور رام لال اپنا روپیہ مع سود کاٹ کر باقی رقم میرے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میں نے بہت سی دکانوں میں کھاتے بھی کھول لئے تھے اور اس طرح چیزیں گھر لایا کرتا تھا گویا وہ سب آندھی کے آموں کی طرح مفت مل رہی ہیں اور مہینے کی پہلی یا دوسری کو جب ان دکانوں کے بل آتے تھے تو سر پکڑ کر رہ جاتا رام لال سے مزید قرض لے کر بل ادا کیا کرتا تھا۔

بیوی جب بلج آباد سے آئیں تو گھر کا یہ رنگ دیکھ کر انہوں نے منہ پیٹ لیا اور تھوڑے ہی دن کے اندر انہوں نے پھر گھر کو درست کر کے رام لال بقال سے نجات دلا دی اور میرے سارے کھاتے بند کر دیئے۔

ان کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جب گھر سے جاتے وقت ان سے دس پانچ روپے مانگتا ہوں تو تین چار پیشیوں کے بعد دس مانگتا ہوں تو صرف پانچ دیتی ہیں، اور جب گھر پلٹتا ہوں تو پانی پانی کا حساب لکھا لیتی ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب

خون جگر، ودیعت مرگان یار تھا  
 مجھ کو مشاعروں سے نفرت ہے، اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مجھے خلاف معمول دیر  
 تک جاگنا پڑتا ہے اور میرے دماغ پر اس کا کم از کم دو تین دن تک بار رہتا ہے اور  
 دوسری وجہ یہ ہے کہ مشاعروں میں زاع و زغن کو اس یقین کے ساتھ کلام سننا پڑتا ہے  
 کہ مفہوم شعر تو الگ رہا سامعین الفاظ کا تک سمجھ نہیں سکیں گے اور اسی کے ساتھ ساتھ  
 زاع و زغن کا کلام سننا بھی پڑتا ہے۔

لیکن چونکہ میں اس قربانی کے بعد مشاعرے سے ایک ہزار روپیہ گھراتا ہوں وہ  
 مجھے مشاعروں کی قربان گاہ پر چڑھا دیا کرتی ہیں اور مجھے قربان گاہ پر نہ چڑھائیں تو  
 کیا کریں اس لئے کہ میری معاش بجد محدود ہے۔

لگے ہاتھوں مشاعروں کے متعلق میری دو رباعیاں بھی سن لیجئے۔

ہوتی ہے، مشاعروں میں بو گھورے کی  
 حاجی بخش اللہ کی، میاں نورے کی  
 افسوس کہ اس عطر سخن کو اپنے  
 بھرتا ہوں میں شیشیوں میں قارورے کی

یہ بندہ، سر حشر، بجرم تشکیک  
 دوزخ کا سزا وار ہے؟ تیرے نزدیک  
 معبود، خطا ایک، سزا ہو سو بار  
 فدوی تو مشاعروں میں ہوتا تھا شریک

ابھی پانچ چھ برس کی بات ہے، جب میں عامل کالونی میں رہتا تھا اس وقت  
 انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارا مزاج ایسا ہے کہ نوکری زیادہ دن تک نبھ نہیں سکے  
 گی، اور نبھ بھی گئی تو جب پنشن پر علیحدہ ہو جاؤ گے تو یہ مکان چھن جائے گا اس لئے



میں چاہتی ہوں کہ اپنا ایک ذاتی مکان بنالوں، یہ سن کر میں نے کہا تھا کہ اب تو میرا مقبرہ بننے کا زمانہ ہے تم مکان کی فکر کر رہی ہو۔

لیکن صاحب، میری بیوی کی ہمت پر صد آفریں کہ انہوں نے لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا دو منزلہ مکان بنوا کر دم لیا ورنہ ایوب خان سابق صدر پاکستان اور ان کے نفس لوامہ الطاف گوہر صاحب کے عتاب کے بعد میں اپنے پورے قبیلے کے ساتھ آج کسی جھونپڑی میں پڑا ہوتا۔ سچ ہے گھڑ بیوی بڑی دولت ہوتی ہے ان کا ایک کارنامہ اور بھی سن لیجئے۔

ایک روز انہوں نے مجھے کمرے میں بلا کر ایک دم بکس دکھایا اور کہا بتاؤ، اس میں کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے کیا معلوم، انہوں نے پوچھا تم کب سے شعر کہہ رہے ہو میں نے کہا لڑکپن سے، انہوں نے کہا وہ پرچے اور کاپیاں کیا کہیں جن پر تم نے شعر کہے تھے میں نے کہا سب کی سب تلف ہو گئیں میری یہ بات سن کر انہوں نے وہ بکس کھول کر کہا دیکھو میں نے تمہاری ایک ایک کاپی اور تمہارا ایک ایک پرچہ اس بکس میں محفوظ کر لیا ہے اب تم یہ کاپیاں ممتاز حسن صاحب کے قومی عجائب گھر کے ہاتھ فروخت کر دو اور میں نے وہ کاپیاں پندرہ ہزار روپے میں فروخت کر دیں (میں اس باب میں مختار حسن صاحب اور پیر حسام الدین صاحب راشدی کا شکر گزار ہوں کہ اگر وہ توجہ نہ کرتے تو یہ سودا کبھی نہ ہو سکتا)

کہاں تک اپنی بیوی کی خوش انتظامی بیان کروں آموں کے چار باغ انہوں نے نصب کرائے اور 1921ء میں انہوں نے ٹھیل ٹھیل کر، مجھے مجبور کیا میری سب سے پہلی تصنیف ”روح ادب“ کے مرتب اور شائع کرانے پر اس کے بعد انہوں نے میرے سر پر مسلط ہو کر میری مندرجہ ذیل کتابیں مجھ سے مرتب کرائیں اور چھپوائیں اگر وہ زبردستی نہ کرتیں تو یہ کتابیں کبھی معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔

روح ادب، جذبات فطرت، خیالات زریں، اوراق سحر، آوازہ حق، شاعر کی

راتیں، شعلہ و شبِ نم، حرف و حکایت، جنون و حکمت، آیات و نعمات، سیف و سبوت، فکر و نشاط، ہرود و خروش، حسین اور انقلاب، اشارات، سنبل و سلاسل، رامش و رنگ، عرش و فرش، سموم و صبا، قطرہ و قلزم، طلوع فکر، نجوم و جواہر، اور الہام و افکار<sup>1</sup>

اور میری یہ زیر کتاب ”یادوں کی برات 2“ بھی انہیں کی مرہونِ منت ہے اگر وہ میرے سر پر سوار نہ ہو جاتیں تو میں اسے بھی مرتب نہ کر سکتا۔

اپنے ان متذکرہ بالا کارناموں کی بناء پر جب وہ حسب سنت جاریہ، مجھ سے

1 میری مندرجہ ذیل کتابیں ہنوز شائع نہیں ہوئی ہیں ”مد و جزر“ ”آگ“ ”وحدت انسانی“ ”موت“، ”محمد و آل محمد کی نگاہ میں“ ”موجد و مفکر“ ”عظمت انسانی اور“ ”حرف آ کر“ اس طویل ڈرامائی نظم کا آغاز 1948ء میں ہوا تھا ا کے بعد مجھ کو زندگی کے مکروہات سے نجات نہیں ملی اس لئے ابھی تک نام تمام ہے اگر فرصت ہاتھ آئی تو اس نظم کو مکمل کر کے کسی بینک میں یا بیوی کے پاس رکھوا دوں گا کہ اسے میرے مرجانے کے بعد شائع کیا جائے اور یہ اس لئے کروں گا کہ اگر یہ اوہام شکن روایات فگن نظم میری زندگی میں شائع ہو گئی تو مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔

2 بیوی سے چھپا کر میں نے اس کتاب میں اپنے معاشقوں کا حال قلم بند کیا ہے اب دیکھئے اس کی طباعت کے بعد کیا ہوتا ہے۔

کسی بات پر، بگڑ جاتی ہیں تو کہتی ہیں کہ میری جوتیوں ہی کا طفیل ہے کہ تم اس وقت جوش صاحب بنے بیٹھے ہو اگر میں تم پر زور نہ ڈالتی تو تمہاری کوئی ایک کتاب بھی نہ چھپتی اور دنیا کو یہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ تم کس کھیت کی مولیٰ ہو۔

اور کبھی یہ بھی کہتی ہیں کہ جب مجھ سے تمہاری شادی ہوئی تھی، اس وقت تک، تم، چھوٹے دادا کی زبان میں لفافہ جھناتھے اگر میں جی لگا کر تمہاری تاک نہ کرتی تو تم کو یہ ڈیل ڈول کبھی حاصل ہی نہ ہوتا، اور ہمیشہ دبلے پتلے لقات ہی بنے رہتے۔

ہر چند، جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں وہ نہایت مغلوب الغضب اور تنک مزاج ہیں،

لیکن میری ذات کے ساتھ اب بھی ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ اگر میں اسے لفظ عشق سے منسوب کروں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں ان کی محبت کی تخفیف و توہین کر رہا ہوں۔

جوانی میں جب میں، باہر سے، رات کے وقت، گھر آتا تھا تو اس امر کا پتہ چلانے کی نیت سے کہ میں کسی عورت سے ہم آغوش ہو کر تو نہیں آ رہا ہوں وہ مجھے روشنی میں لے جا کر غور سے میرا چہرہ دیکھتیں لال ٹین اوپر اٹھا کر میری شیروانی پر نگاہ کرتیں کہ کہیں کسی زلف کا بال تو اس میں چمٹا ہوا نہیں ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ میرے کپڑے لمبی لمبی سانس لے کر سونگھا کرتی تھیں کہ میرے جسم سے کسی عورت کے بدن یا بالوں کی خوشبو تو نہیں آرہی ہے

اور: عشق است و ہزار بدگمانی کے تحت یہاں تک ہوتا تھا کہ وہ جاڑوں میں پچھلے پہر، میرے لحاف میں ہاتھ ڈال کر یہ پتہ چلانے کے لئے کہ میں ان کے سو جانے کے بعد کسی عورت کے پاس چلا تو نہیں گیا تھا وہ میرے تلوے ٹٹول کر یہ دیکھا کرتی تھیں کہ وہ ٹھنڈے ہیں یا گرم۔

اور آج بھی جب کہ میں ایک خبیث بوڑھے کی صورت اختیار کر چکا ہوں، جب کبھی کوئی اخباری جوان عورت میرا انٹرویو لینے یا کوئی نو عمر شاعرہ مجھ سے ملنے آتی ہے وہ میرے چہرے کے نشیب و فراز اور میری آنکھوں کے رنگ پر اپنی متجسس نظروں کے آلات لگا کر یہ جانچتی رہتی ہیں کہ میں اس کو محبت کی نظر سے تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ اور جب تک وہ عورت بیٹھی رہتی ہے، ان کے چہرے پر بدگمانی کا پیدا کردہ کرب مچلتا رہتا ہے۔

مری خاک بھی لحد میں، نہ رہی امیر باقی  
انہیں مرنے کا ہی اب تک نہیں اعتبار ہوتا  
وہ مجھ کو آج تک چوتھی کا دواہا سمجھتی اور پہلے کی طرح اب بھی مجھ سے محبت کرتی

ہیں۔

ہر چند میری پاگل اور اندھی جوانی کے مسلسل معاشقوں نے میری اختلاج کی ماری دھان پان بیوی کے دل پر ایسے ایسے گھن چلائے تھے کہ اگر وہ پہاڑوں پر چلائے جاتے تو ان کے پر نچے اڑ جاتے لیکن اللہ ری میری بیوی کی استقامت محبت کہ انہوں نے ان روح فرسا حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایسا مقابلہ کہ العظمتہ للہ۔ جھانسی کی رانی نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا، میدان جنگ میں شہید ہو گئی مگر دشمن کے سامنے سپر نہیں ڈالی، میری بیوی نے ڈٹ کر میرے محبوبوں کا مقابلہ کیا، نہ سپر ہی ڈالی نہ شہید ہی ہوئیں اور آخر کار مجھ کو سب سے چھین کر، میدان جیت لیا۔

بہر	کارے	کہ	ہمت	بستہ	گرد
اگر	خارے	بود	گل	دستہ	گرد

میں نے 1950ء میں ام الشعراء یعنی اپنی بیوی پر ایک نظم کہی تھی جو ہنوز نا تمام ہے آپ بھی سن لیں:



## رفیقہ حیات سے خطاب

دیکھ کر تجھ کو، مرے دل سے ٹپکتا ہے لہو  
اے مرے باپ کی، غم دیدہ و ناشاد بہو  
تیرا، ہر لمحہ، بجز حسرت و وسوس نہ تھا  
میری قصاب جوانی کو یہ احساس نہ تھا  
مجھ کو ہر رات، وہ آراہ لئے پھرتی تھی  
ایک بجلی تھی کہ خرمن یہ ترے گرتی تھی  
جب مجھے، چھاؤں میں زلفوں کی وہ سلوتی تھی  
چاندنی، دھوپ ترے واسطے بن جاتی تھی  
آگ تھی جس میں، برستا نہ وہ پانی تجھ پر  
کاش بھولے سے بھی آتی نہ جوانی مجھ پر  
ہائے، اک شب بھی نہ ہوتی تھی سہانی تیری  
کروٹیں، آنچ پہ لیتی تھی، جوانی تیری  
جب بھی اٹھتی تھیں، مری سمت، نگاہیں تیری  
ان نگاہوں سے برستی تھیں کراہیں تیری  
تیری عفت کے شبتاں میں ہے اک حشر پاپا  
میرے معصوم گناہوں کو یہ معلوم نہ تھا  
تجھ پہ بالقصد نہیں تھی وہ جفائیں میری  
جبر سرکار مشتمل تھیں، خطائیں میری  
اس قدر قرب پہ بھی، تجھ سے بہت دور تھا میں  
الاماں، طبع کی افتاد سے مجبور تھا میں  
اب کہ، بالوں کی سفیدی نے جگایا ہے مجھے

جذبہ کرب ترے سامنے لایا ہے مجھے  
شرم سے جو نہیں اٹھتی وہ نظر لایا ہوں  
اپنی بہکی ہوئی شاموں کی سحر لایا ہوں  
اپنی آنکھوں کے، ترے در پہ گہر رکھتا ہوں  
بخش دے مجھ کو، ترے پاؤں پہ سر رکھتا ہوں

☆☆☆☆☆☆



## میری بیٹی

نام ہے سعیدہ خاتون میں پیارے مردانہ نام بنا کر کھتا ہوں۔  
غالباً 1917ء یا 1918ء کے لگ بھگ وہ ملیح آباد میں اپنی نانی کے گھر پیدا ہوئی  
تھی حیدر آباد کن میں تعلیم پائی تعلیم جاری تھی کہ مجھے نظام نے خارج البلد کر دیا اور  
اس کے بعد برابر ایسے مواقع پیدا ہوتے رہے کہ اس کی تعلیم کا تکملہ نہیں ہو سکا۔

وہ غالباً 1936ء کا زمانہ تھا کہ میں نے دہلی میں اس کی شادی کر دی تھی۔ اپنی چچا  
زاد بہن کے بیٹے التفات احمد شہاب سے التفات احمد علی گڑھ کا گریجویٹ، خوش فکر  
شاعر، اور صاحب فکر انسان تھا لیکن اس میں جینے اور ابھرنے کا حوصلہ نہیں تھا کثرت  
آرام سے بیمار ہو کر وہ بے چارہ بہت قبل از وقت اس دنیا سے سدھار گیا۔

سعیدہ بے حد ذہین اور نکتہ سنچ ہے اور سخن فہم بھی، طبیعت موزوں ہے مگر شعر نہیں  
کہتی وہ ماشاء اللہ نو بچوں کی ماں ہے نانی بھی بن چکی ہے، لیکن مجھ کو اب تک گڑیاں  
کھیلاتی بچی نظر آتی ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کے نام بھی لکھ دوں ان خطابات  
کے ساتھ جو ان کو میری سرکار کی جانب سے عطا ہوئے ہیں۔

انور سعید خاں، عرف ”میاں“، ”مویاں“ اور ”مسٹر بھٹا کا“۔۔۔۔۔ حیدر مسعود  
خاں، عرف ”بغا“۔۔۔۔۔ پرویز شہاب خاں، عرف ”پری“، ”مسٹر پریر“ ”مسٹر بانا“ اور  
”وحشت کا چڑھا“، صبوحی خاتون، عرف ”بوئی چوئی“۔۔۔۔۔ غزالہ خاتون، عرف  
”غزلیا“۔۔۔۔۔ خسرو شہاب خاں عرف بلو ”مسٹر نازن“ اور جاموس اشرف  
جہاں علی معظم خاں عرف ”مسٹر مہنورٹ“ اور ”مسکین شاہ“۔۔۔۔۔ فرخ جمال  
عرف ”بدھا“، قلن ”قلندر“ اور ”قلعوا۔۔۔۔۔“ سراج انور خاں عرف مسٹر کچی اور  
”مسٹر کالا گڈون“ ماشاء اللہ اتنے بہت سے بچوں کا پالنا کوئی ہنسی کھیل نہیں اس نے  
اپنے خون جگر سے ان پودوں کو سینچا اور پروان چڑھایا ہے میری بیوی شکایت کرتی ہیں  
کہ اب سعیدہ کو ہمارا خیال نہیں رہا ہے میں کہتا ہوں اس بچاری کو فرصت ہی کب ملتی

ہے اپنے بچوں اور اپنی نواسیوں نواسوں کی خدمت سے کہ وہ کسی اور طرف توجہ کر سکے۔

اس دن رات کی مسلسل کاوش نے اس کی صحت بگاڑ کر رکھ دی اور جب میں اپنی بیٹی کا منہ اتر اہوا دیکھتا ہوں تو میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

☆☆☆





میر اپلیا

نام ہے سجاد حیدر خاں میں اس کو پیار سے ”چچجوا“ کہتا ہوں سعیدہ کی ولادت کے غالباً دو سال کے بعد وہ لکھنؤ میں پیدا ہوا تھا۔

وہ بیمار پیدا ہوا، اور آج تک تندرست نہیں ہے وہ اپنڈکس سے لے کر ٹائی فائیڈ ڈبل نمونیا اور طاعون کے سے مہلک مرض میں گرفتار رہ چکا ہے۔

اس نے سات آٹھ برس کی عمر ہی سے موٹر چلانا سیکھ لیا تھا، اور جب کسی قدر سیانا ہوا تو شوفر کی مدد سے اس نے تھوڑا بہت موٹر کی مرمت کا علم بھی حاصل کر لیا جو آج آڑے وقت اس کے کام آ رہا ہے (جس کی تفصیل آگے آئے گی)

میرے پونے کے اثناء قیام میں اس نے محمد فقیہہ صاحب پیرسٹر اور نائب وزیر جو ناگرھ کی بیٹی انور خانم سے اپنی ماں کی علی الرغم شادی کر لی تھی جس پر بیوی اب تک ناخوش ہیں۔

وہ ماشاء اللہ پانچ بچوں کا باپ ہے ان کے نام بھی مع عرفیت سن لیجئے۔۔۔۔۔

ساجد حیدر خاں، عرف ”مسٹر ناز“۔۔۔۔۔ ناز خاتون، عرف ”امی“۔۔۔۔۔ ترنم خاتون عرف ”چمنی“، تاج دار بیگم۔۔۔۔۔ تبسم خاتون عرف ”چنچی“، اور فواد حیدر عرف ”مسٹر بندر“

سجاد بھی اپنی بہن کی طرح بلا کا ذہین ہے شعر بھی کہتا ہے بعض اشعار آب و آہ بھی ہوتے ہیں اور وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

----- افسوس کہ بیماریوں کے تواتر سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔

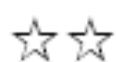
وہ آج سے کچھ اوپر دو برس پہلے میری سیمنٹ ایجنسی کو چلاتا خود اپنے پر خرچ کرتا اور مجھے کما کر دیا کرتا تھا لیکن 1946ء میں جب کہ میں ہندوستان گیا اور وہاں کسی انگریزی اخبار میں میرا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا اس وقت ترقی اردو بورڈ کے سیکرٹری

شان الحق حقی، وزارت اطلاعات کے سیکرٹری الطاف گوہر، اور میرے نئے حواری عیش ٹونکی نے اس انٹرویو کے معنی کچھ اس قدر مسخ کر کے پیش کئے کہ اس وقت کے مطلق العنان صدر فیلڈ مارشل صاحب یعنی ایوب خاں نے برہم ہو کر میری نوکری بھی ختم کر دی میرا پاسپورٹ بھی چھین لیا اور قومی عجائب گھر کو بھی میرے مسودات کی خریدار سے روک دیا میری بیوہ لڑکی کے آئیل ٹینکر کے بارے میں بھی اشارہ فرما دیا کہ اس میں مال نہ بھرا جائے اور میری ایجنسی بھی بند کر دی۔

میری اس بے سرو سامانی سے متاثر ہو کر سجاد نے ایک چھوٹی موٹی ورکشاپ کھول لی جس سے وہ لشتم پشتم زندگی بسر کر رہا ہے یا یوں کہئے کہ زندگی کو بھوک رہا ہے ہائے میرے بچے۔

سجاد نے لکھنؤ کی بھاٹ کھنڈے یونیورسٹی سے سند حاصل کی تھی وہ پاکستان ریڈیو پر ستار بجانے کے واسطے بلایا جاتا تھا ایوب خاں صاحب بہادر نے اس کا وہ دروازہ بھی بند کروا دیا۔

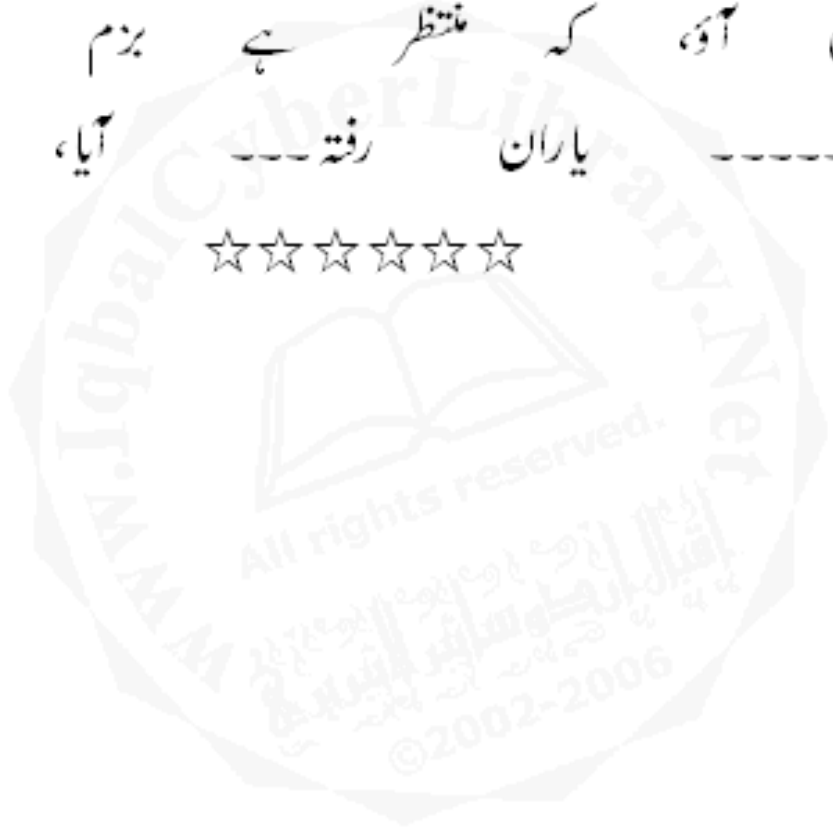
میں نے اجداد کی تلوار کو پگھلا کر قلم بنا لیا تھا میرے بیٹے نے میرے قلم کو ہتھوڑے میں ڈھال لیا ہے ہائے میرے خاندان کا وہ عروج اور ہائے یہ زوال



## میرے چند قابل ذکر احباب

یاں چمپنی دھوپ ہے، گلابی سلیا  
رہتا ہے، سحابِ ابدیت چھایا  
جوشِ آؤ، کہ منتظر ہے بزمِ ارواح  
آیا۔۔۔۔۔ یارانِ رفتہ۔۔۔ آیا، آیا

☆☆☆☆☆☆



## ابراہن حسن خاں اثر ملیح آبادی

خوب صورت، خوش دماغ، حاضر جواب، جادو بیان، داستان سرا، عاشق مزاج، لطیفہ گو، شوخ و طرار، ملیح آباد کی نژاد نو میں، سب سے زیادہ ذہین مرغ و ماہی پکانے میں استاد میرے لنگوٹیا یا ر، میرے بہنوئی، میری سراپا شفقت بچتی زاد بہن کے منخلے بیٹے (جو میری صحت کی ناز بردار، اور میری بیماری میں مستقل تیمار دار تھیں) چڑھتی عمر تک سراپا نیاز، ڈھلتی زندگی میں خوفناک دشنام طراز۔ اور میرے اس کوچے کے واہ بر اولین تھے جس کو بدتوفیتوں کی اصطلاح میں کوئے بد اعمالی کہا جاتا ہے چونکہ وہ بچپن ہی میں تقسیم ہو گئے تھے اس لئے میرے باپ نے ان کی پرورش و تعلیم کا بار اپنے ذمے لے لیا تھا ان کے اور میرے مکان کے مابین کھڑکی تھی وہ سونے کے اوقات کے علاوہ ہمارے ہی مکان میں رہا کرتے ہمارے ہی ساتھ کھاتے پیتے اور کھیلتے کودتے رہتے تھے لڑکپن کا ذکر ہے ایک روز ہم لوگ، دوپہر کے وقت، ڈیوڑھی میں بیٹھے غالباً تاش کھیل رہے تھے کہ ابراہ آ گئے، اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کو بھی کھیل میں شریک کرو، میرے بڑے بھائی نے (جو سال، دو سال مجھ سے بڑے تھے) ان سے کہا کہ تم کھیل میں ہمیشہ بے ایمانی کرتے ہو ہم تم کو نہیں کھلائیں گے انہوں نے کہا اگر ہم کو نہیں کھلاؤ گے تو ہم ”قرآن مجید 1“ کی قسم تم کو بشیر ماموں 2 سے ابھی پٹوا دیں گے میرے بڑے بھائی

1 نہ جانے ان کی زبان میں کیا خرابی تھی کہ وہ ”قرآن مجید“ کہا کرتے تھے 2

چونکہ میرے باپ

نے کہا جا بے مروت، تو کیا پٹوا سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ میرے باپ کے پاس گئے اور کہنے لگے بشیر ماموں شفیق احمد خاں (میرے بڑے بھائی) کہہ رہے ہیں کہ ہم سے مسلمانی لڑاؤ یہ سنتے ہی میرے باپ آگ بگولا ہو گئے اور ڈیوڑھی میں آ کر میرے بڑے بھائی کو خوب مارا وہ چیختے رہے کہ ابراہ جھوٹا ہے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی اور



ابراہیم کا چہرہ 1 بحال ہو گیا وہ رئیس 2 احمد کی انا سے اس گمان پر جلتے تھے کہ وہ ان کو باسی کھانا دیتی ہیں اور انا ان سے اس بناء پر کھنستی تھیں کہ وہ ان پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں ایک روز شام کے وقت ڈیوڑھی کے پھانک سے چیخ چیخ کر کہا ہے ہے میاں آگ لگے اس چودھویں صدی کو ارے غضب خدا کا یہ کل کا چھو کر ابراہیم مجھ سے کہہ رہا ہے ”اونڈھی ہو جاؤ“ میرے باپ کوتاؤ آگیا سپاہی کو حکم دیا کہ آٹھ دس چھڑیاں نیم سے کاٹ لاؤ پھانک بند کر دو کہ ابراہیم بھاگ نہ پائے اور جب چھڑیاں آگئیں ابراہیم کو پکڑ بلوایا اور میرے باپ نے چھڑی اٹھا کر کہا کیوں بے مرد و گھر کی بڑی بوڑھیوں سے بدتمیزی کرتا ہے ادھر آج تیرے لکڑے اڑا کر رکھ دوں گا انہوں نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا بشیر ماموں تو ان مجید کی قسم تو ان مجید کی قسم تو ان مجید کی قسم میرے باپ نے کہا قسمیں ہی کھاتا رہے گا یا کچھ کہے گا بھی۔۔۔ وہ دوڑ کر میرے باپ کے قدموں پر گر پڑے اور ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا بشیر ماموں تو ان مجید کی قسم میں نے تو ”اونڈھی ہو جاؤ“ نہیں ”اونڈھی ہو جاؤ“ کہا تھا ابراہیم کی اس ذہانت پر میرے باپ کو ہنسی آ گئی اور چھڑی پھینک کر فرمایا گرو گھنٹال 3 آج تو چھوڑے

کو ان کی ماں ”بشیر ماموں“ کہتی تھیں اس لئے ان کی زبان پر یہی لفظ چڑھ گیا تھا 1 یہ اور بات ہے کہ جب میرے باپ کو دوسرے دن یہ پتا چل گیا کہ ابراہیم نے جھوٹا الزام لگایا تھا تو ان کی بھی پٹائی کر دی گئی تھی 2 میرا چھوٹا بھائی 3 چونکہ وہ ہم لوگوں کو نئی نئی شرارتیں سکھایا کرتے تھے اس لئے میرے باپ نے ان کو گرو گھنٹال کا خطاب دے دیا تھا۔

دیتا ہوں لیکن اب اگر اس قسم کی کوئی بات زبان پر لائے گا تو تیری ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں گا۔

ہماری ماماؤں میں سے تھیں ایک کوزہ پشت محبوبن بوا، وہ بھی ان کی شرارتوں کے باعث، ان سے جلتی تھیں ایک روز انہوں نے امام باڑے سے ملے ہوئے کمرے

میں ان کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا اور میرے باپ سے جا کر کہا میاں ”ابریل“ (ابرار) چرٹ پی رہا ہے اور جب ”ابریل“ خوب تھپڑائے گئے، تو بوا محبوبن کے چہرے کی جھریوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس چالاکی سے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ حرکت ان کی تھی جس زمانے میں رئیس احمد اور ابرار میرے ساتھ لکھنؤ کی لاٹوش روڈ کی گلی کے مکان میں بسلسلہ تعلیم رہتے تھے ابرار کا معمول تھا کہ روز منہ اندھیرے وہ سگریٹ پی کر دوغز لیں:

کھلی ہے کنج قفس میں، مری زبان ”صیاد“ اور  
 محبت میں تری، ہم سے، برآں اہل وطن بگڑا  
 بالالتزام گایا کرتے تھے اور سگریٹ کے واسطے جب فق سے دی سلائی جلاتے  
 تھے تو دھند لکے کا اندھیرا کانپ اٹھتا تھا اور اس کا شعلہ میری آنکھوں میں اس طرح  
 چبھ جاتا تھا کہ میں آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا اس مکان کا ذکر ہے، میرے باپ، ملیح آباد  
 سے آکر اس مکان کی نچلی منزل میں اور میرے بڑے بھائی، ہمارے اوپر کے کمرے  
 سے ملے ہوئے دوسرے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہفتے کی رات تھی، میں اور ابرار اپنے پڑوسی طالب علم شریف<sup>1</sup> کے ساتھ باتیں کر  
 کر کے قہقہے مار رہے تھے ابرار نے مجھ سے کہا ہم ہنس بول رہے ہیں شفیع احمد خاں  
 (میرے بڑے بھائی) پر یہ بات شاق گزر رہی ہوگی۔ وہ عجب نہیں کہ بشیر ماموں  
 سے جا کر شکایت کر دیں وہ ہمیشہ ہماری تاک میں رہا کرتے ہیں ابرار کا یہ جملہ ختم ہی  
 ہوا تھا کہ بھائی صاحب دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگے انہوں نے کہا دیکھئے وہ جو  
 میں نے ابھی کہا تھا وہی ہوا۔ شفیع احمد خاں ہماری شکایت کرنے کے لئے نیچے جا رہے  
 ہیں۔

<sup>1</sup> وہ ”بھدوئی“ کا رہنے والا اور میرا محبوب دوست تھا اب نہ جانے کہاں ہے

میں تو شریف کو لے کر اس چور دروازے سے اسی وقت بھاگا جا رہا ہوں اگر بشیر

ماموں اوپر آکر آپ کو برا بھلا کہیں تو آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے وہاں آجائے گا اور صبح کی گاڑی سے ہم لوگ نواب صاحب رام پور کے پاس چلے جائیں گے ابرار یہ کہہ کر اتر گئے میں تنہا رہ گیا اتنے میں میرے باپ آئے، فرمانے لگے تم لوگوں نے شفیع احمد کی نیند حرام کر دی، شہدے کہیں کے، اور وہ مرو و گرد گھنٹال کہاں ہے، میں نے کہا وہ شریف کے گھر چلے گئے ہیں۔

باپ کی یہ بے جا ڈانٹ پھٹکار، مجھ کو زہر لگی، ان کے نیچے اتر جانے کے بعد میں ابرار کے پاس چلا گیا ابرار نے کہا اب یہ گھر رہنے کے قابل نہیں رہا ہے قرآن مجید کی قسم شفیع احمد خاں ایک روز ہم کو مروا ڈالیں گے، چلے انیس خالہ (میری چھوٹی بہن) کے گھر میں رات گزار دیں اور پہلی ٹرین سے رام پور چلے جائیں اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے ابھی ہم شریف کے دروازے سے نکلے ہی تھے کہ دیکھا ہمارے باپ کے سپاہی، ریاست علی خاں، لالٹین لئے چلے آ رہے ہیں ابرار نے کہا کہ یہ مخبری بھی شفیع احمد خاں نے کر دی ہوگی کہ آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے ہاں چلے آئے ہیں، دیکھئے ریاست علی خاں جب قریب آئیں تو قرآن مجید قسم ان کو ماں کی گالی دیجئے گا میں نے کہا ابرار کیسی باتیں کرتے ہو ریاست علی خاں کھرے پٹھان ہیں، اور بوڑھے آدمی بھی ہیں۔ میں ان کی سفید داڑھی کی حرمت کرتا ہوں ان کو ہرگز گالی نہیں دوں گا اتنے میں ریاست علی خاں قریب آ گئے اور کہا خاں صاحب بہادر نے فرمایا ہے کہ آپ فوراً گھر آ جائیں نہیں تو مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا ابرار نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا ریاست علی خاں سو بات کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی قسم، تمہاری تو ماں۔۔۔۔۔ بے چارے ریاست علی خاں اس قدر فحش گالی سن کر اس طرح اچھل گئے گویا کسی نے ان کو گولی مار دی ہے انہوں نے بڑی بے چارگی کے ساتھ نگاہیں جھکا لیں اور دھل دھل آنکھوں سے آنسو بہنے لگے (ان کے بہتے آنسو آج تک میرا تعاقب کر رہے ہیں)

انیس کے وہاں ہم دونوں بہت تڑکے بیدار ہو کر سفیر کی تیاری کر رہے تھے کہ مکان کے نیچے گاڑی ٹھہرنے کی آواز آئی انہوں نے جھانک کر دیکھا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی ارے بشیر ماموں آگئے انیس خالہ نے ہماری مخبری کر دی آپ کو ایسا چاہئے نہ تھا اور زینے پر جب قدموں کی آواز گونجنے لگی تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے چار پائی کے نیچے جا کر دبک گئے میں نے آکر بڑی خشونت کے ساتھ مجھ کو دیکھا میں کانپنے لگا فرمایا گرو گھنٹال کہاں ہے انیس نے چار پائی کی طرف اشارہ کر دیا۔ میاں نے گرج کر فرمایا نکل چار پائی کے نیچے سے مردو دابر چار پائی کے نیچے سے یوں نکلے جیسے آواز صور سن کر بے چارے مردے اپنی بے حساب درد مند زندگی کا حساب دینے کے واسطے، اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے۔

میاں نے ایک حرف بھی نہیں کہا ہم دونوں کو کوٹھے سے اترنے کا اشارہ فرمایا آگے آگے میاں، اور پیچھے پیچھے ہم مغرورین کوٹھے سے اترے تو میاں نے گاڑی میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، اور ہم دونوں ان کے سامنے اس طرح گاڑی میں بیٹھ گئے گویا شیر کے سامنے دو بکرے بندھے ہوئے ہیں راستے بھر میاں نے کوئی بات نہیں کی گھر آتے ہی فرمایا چلو اوپر جب ہم اوپر آگئے تو میاں نے ابرار کے منہ پر زناٹے کے ساتھ تھپڑ مارا کہ ابرار لونڈ پونڈ ہو گئے لیکن چار پانچ سیکنڈ کے اندر ہی اندر بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک ایک جست میں تین تین چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے مکان سے باہر نکل گئے۔

ان کے اس ڈرامائی فرار کے بعد میاں نے مجھ سے کہا سنتا ہوں آپ کو سپہ گری کا بڑا دعویٰ ہے امید ہے 1۔ دو لاٹھیاں لے آؤ۔ ایک ان سورما صاحب کے ہاتھ میں دے دو، ایک مجھے آج میرے ان کے مابین دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ اور پتا چل جائے کہ بہادر کون ہے امید ہے ایک لاٹھی میاں کے ہاتھ میں دے دی اور دوسری لاٹھی میری طرف بڑھائی میری کیا مجال تھی کہ باپ سے نبرد آزمائی کے واسطے لاٹھی ہاتھ



میں لیتا میں نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

### 1۔ داروغہ امید علی خاں

اور امید نے میرے کاندھے سے لگا کر لاٹھی کھڑی کر دی میں پیچھے ہٹ گیا لاٹھی گر گئی میاں نے ڈپٹ کر فرمایا اے بزدل لاٹھی ہاتھ میں لے اور میدان پکڑ اور جب میں ٹس سے مس نہ ہوا تو میاں نے ارشاد فرمایا کہ تو سراسر زنخا ہے علمائے اخلاق نے سچ کہا ہے کہ بزدلی و بے حیائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو سمجھا میں تجھے بے حیا کیوں کہہ رہا ہوں؟ تجھ کو بخوبی معلوم ہے کہ آج کل تیرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا ہے، اگر تو غیرت مند ہوتا تو اس موقع پر گھر چھوڑ کر نہ چلا جاتا کہ اگر میرے باپ مقدمے سے ہاتھ اٹھالیں گے تو میری بیوی کسی اور کے پہلو میں چلی جائے گی میں نے اب دیدہ ہو کر کہا میاں میں آپ کو اس قدر غیرت مند اور شریف انسان سمجھتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے کتنے ہی ناخوش ہو جائیں مگر مقدمے سے کبھی دست بردار ہو ہی نہیں سکتے میری یہ بات سن کر میاں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

رئیس احمد کو ابتداء ہی سے شکار، ورزش، گھوڑے کی سواری اور اپنے جیب خرچ کو گنیوں میں تبدیل کر کے جمع کرنے کا شوق تھا ابرار نے ان کے اس میلان صحت کو دیکھ کر ایک دن ان سے کہا رئیس احمد، میں آپ کو قرآن مجید کی قسم، ایک ایسی نایاب دوا دے سکتا ہوں کہ آپ دو مہینے کے اندر اندر ایک دیوبکر پہلوان بن جائیں، رئیس کی باچھیں کھل گئیں پوچھا اس دوا کا نام کیا ہے انہوں نے کہا ”زبان پر لگانے کا طلا“ رئیس نے قیمت دریافت کی ابرار نے کہا ارے کچھ نہیں فقط پانچ گنیاں رئیس نے چپکے سے گنیاں دے دیں ابرار ایک چھوٹی سی شیشی میں روغن بادام لے آئے، اور کہا دیکھئے روز ایک کوری سینک اس میں ڈبو کر نہار منہ چاٹ لیا کیجئے گا قرآن مجید کی قسم آپ بھونپو ہو جائیں گے بھونپو ایک روز بڑے بھائی صاحب نے رئیس کو سینک چاٹتے

دیکھ کر پوچھا یہ کیا دوا ہے رئیس نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا میاں بھائی یہ زبان کا طلا ہے ابرار پانچ گنیوں میں لائے ہیں بڑے بھائی صاحب کو لفظ طلا کے معنی تو معلوم نہیں تھے لیکن یہ سمجھ کر کہ ابرار ڈاکٹر ہیں نہ حکیم، ہونہ ہوا نہ ہوں نے چھلی بٹا کر کے رئیس سے اشرفیاں اینٹھ لی ہیں، میاں سے جا کر سارا واقعہ بیان کر دیا میاں نے رئیس کو بلا کر پوچھا، اسے کیا معلوم تھا کہ اس میں کوئی بری بات ہے کل واقعہ بیان کر دیا میاں نے شیشی دیکھی اس میں روغن بادام پایا اسی وقت ابرار کو بلایا اور فرمایا کیوں مردود تو نے ”دبا با 1“ سے گنیاں اینٹھ لیں مجھ کو اس کی پروا نہیں مگر اس دوا کا نام اس قدر خشن بتایا ”زبان کا طلا“ آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا یہ کہہ کر میاں ابرار کی طرف جھپٹے ابرار نے چیخ مار کر کہاں قرآن مجید کی قسم میں نے ”زبان کا طلا“ نہیں ”زبان کا تیل“ کہا تھا رئیس احمد خاں نے میری بات سمجھی ہی نہیں میں نے کہا تھا ”تیل“ وہ سمجھے طلا طلا کیا چیز ہوتا ہے قرآن مجید کی قسم مجھ کو معلوم ہی نہیں میاں سمجھ تو گئے کہ ابرار بات بنا رہا ہے لیکن ان کی ذہانت و حاضر جوابی کی داد کے طور پر انہیں معاف کر دیا۔

جس زمانے میں ہم، 2 آگرے کے سینٹ پیٹر ز کالج میں زیر تعلیم تھے اور ملیح آباد سے تعطیل کی مدت گزار کر آگرے جا رہے تھے میاں نے رئیس ابرار اور مجھے پانچ پانچ سو روپے دیئے تھے کہ آگرے جا کر جڑ اول بنوالینا اس وقت ابرار نے یہ لکھ کر کہ میری جڑ اول پانچ سو روپے میں نہیں بن سکے گی مزید پانچ سو روپے کا مطالبہ کیا تھا۔

میاں نے ہم دونوں بھائیوں اور ابرار کو طلب کر کے مجھ سے اور رئیس سے پوچھا کہ تمہاری جڑ اول پانچ پانچ سو روپے میں بن جائے گی کہ نہیں ہم نے جواباً عرض کیا کہ بن جائے گی میاں نے ابرار سے کہا کہ ان دونوں کی جڑ اول تو پانچ پانچ سو میں بن جائے گی تمہاری جڑ اول میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ اس قدر رقم میں تیار نہیں ہو سکے گی؟ تو ابرار نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ جواب دیا تھا کہ بشیر ماموں

آپ غصے نہ ہو جائیں تو یہ کہوں کہ ان دونوں کی جڑ اول بھی اس قدر کم روپے میں نہیں بن سکے گی یہ آپ کے بیٹے ہیں روپیہ کم پڑے گا تو یہ آپ سے دوبارہ منگالیں گے میں آپ کا

### 1 رئیس کا پیار کا نام 2 رئیس و ابرار

بیٹا نہیں ہوں مجھ یتیم کی ہمت نہیں پڑے گی یہ سن کر میاں نے ابرار اور ان کے طفیل ہم دونوں بھائیوں کو بھی ایک ایک ہزار روپے مرحمت فرمادیئے تھے۔

ایک بار ان کے ایک کشمیری محبوب نے ان سے چار سو روپے طلب کئے وہ اس سے وعدہ کر کے تو چلے آئے لیکن بڑے خلفشار میں پڑ گئے کہ روپیہ دوں گا کہاں سے کئی روز تک پریشان رہنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا شبیر حسن خاں قرآن مجید کی قسم ایک ایسی تدبیر سمجھ میں آگئی ہے کہ کبھی پٹ نہیں پڑ سکتی آپ رئیس احمد خاں کو بلا لیں رئیس آگئے تو انہوں نے کہا آپ جانتے ہیں کہ بشیر ماموں آپ سب کو کس قدر چاہتے ہیں وہ آپ کے ناخن کا دکھنا تک برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔

رئیس نے کہا آخر کہنا کیا چاہتے ہو، انہوں نے کہا بشیر ماموں کو جو محبت آپ سے ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں میں نے کہا پہلیاں سی کیوں بجھا رہے ہو، صاف صاف بات کہو، انہوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ جھوٹ موٹ بے ہوش ہو جائیں ظاہر ہے کہ آپ کی بیہوشی سے بشیر ماموں کا دل دہل کر رہ جائے گا اور تھوڑی دی رے ہوش رہ کر ہوش میں آجائیں اور ان سے چار سو روپے کی فرمائش کر دیں اگر رئیس احمد خاں آپ یہ ڈراما کھیل کر مجھے روپے دلا دیں گے تو قرآن مجید کی قسم، میں زندگی بھر کے لئے آپ کا غلام بن جاؤں گا رئیس نے ان سے امداد کا جب وعدہ کر لیا تو برابر تین دن تک ابرار نے ان کو رہسہل کرایا جسمانی حرکات بتائیے اور لہجے کے طول و عرض کو بار بار سکھایا خود لیٹ لیٹ کر بتایا کہ کھانا کھانے میں آپ یوں لیٹ جائیے گایوں نوالہ توڑیئے اور پھر یوں دھم سے گر پڑیئے گا اور ہوش میں آجانے کے بعد پھر یوں

ٹھہر ٹھہر کر حرف مطلب زبان پر لائے گا۔

جب تین دن تک مسلسل ریہرسل ختم ہو گیا تو ہمارا طائفہ ملیح آباد آیا اور شام ہوتے ہی رئیس احمد نے حسب تعلیم ابرار، اپنی انا سے کہا آج طبیعت کچھ خراب ہے کھانا ابھی سے کھلا دو کھانا، امام باڑے کے برآمدے میں چن دیا گیا ابرار اور میں دونوں صحن میں بیٹھ گئے یہ دیکھنے کو کہ رئیس کیسی اکیٹنگ کرے گا۔

رئیس نے ابرار کے کہنے کی مطابقت گن کر تین نوالے کھائے چوتھا نوالہ اٹھا کر کراہنے لگا ابرار نے مجھ سے چپکے سے کہا کتنی اچھی اکیٹنگ ہو رہی ہے رئیس نے کراہ کر تین بار آہ آہ آہ کی آواز نکالی نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دھم سے لیٹ کر بے ہوش ہو گیا۔

اس کے ”بے ہوش“ ہوتے ہی گھر بھر میں کہرام برپا ہو گیا انا دوڑی ہوئی باہر گئیں اور دیوانہ وار پکار کر کہا ہے ہے میاں رئیس بے ہوش ہو گیا میاں کے حواس اڑ گئے ننگے پاؤں دوڑتے آئے اور رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعا کرنے لگے کہ اے اللہ میری جان کی قربانی قبول کر، اور اسے اچھا کر دے۔ پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر عبدالکریم صاحب آگئے میاں نے کہا خدا کے واسطے میرے بچے کو بچا لیجئے ڈاکٹر صاحب نے آلہ لگا کر اور انگلیوں سے ٹھونک ٹھونک کر اس کے سینے کا مطالعہ کیا نبض دیکھی اور کہا خاں صاحب کوئی گھبرانے کی بات نہیں گرمی دماغ پر چڑھ گئی ہے میں ابھی دوا لے کر حاضر ہوتا ہوں ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد میاں پھر رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعائیں مانگنے لگے دادی جان نے جب قرآن کی ہوادی رئیس نے ابرار کی سکھائی ہوئی انتہائی نقاہت کے ساتھ ذرا سی آنکھیں کھول دیں میری ماں نے کہا مبارک ہو رئیس کو ہوش آ گیا۔

میاں نے انتہائی بے تابی کے ساتھ جھپک کر پوچھا طبیعت کیسی ہے؟ رئیس نے سن کر بار بار پلکیں جھپکائیں میاں کا چہرہ فق ہو گیا وہ اس کے سر ہانے بیٹھ گئے رئیس



نے دوبارہ آنکھیں کھول کرتا گئے کی سی مہین آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا باوا چار سو روپے  
میاں نے میری ماں سے کہا ارے جلدی سے پانچ سو کی تھیلی لے آؤ اور جب تھیلی اس  
کے سامنے رکھ دی گئی اس نے بڑی کانپتی آواز میں پوچھا میاں ہمارے سر کی قسم یہ  
روپے دے کرواپس تو نہیں لے لیں گے؟ میاں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ جواب  
دیا ارے تیرے سر کی قسم واپس نہیں لوں گا اس کے دوسرے ہی دن ہم لوگ لکھنؤ چلے  
گئے اور شام ہوتے ہی ابراہار اس کا شمیری لڑکے کو چار سو دے آئے اور باقی سو روپوں  
سے خوب تفریح کی۔

انہیں کہانیاں کہنے کا بھی نہایت شوق تھا سنی ہوئی کہانیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے  
ہزاروں من گھڑت کہانیاں اور فرضی قصے بھی سنایا کرتے تھے اور اس جادو بیانی اور اس  
ڈرامائی انداز کے ساتھ کہ سننے والے چھ چھ سات سات گھنٹے تک مسلسل سنتے رہتے  
اور بھوک پیاس تک بھول جایا کرتے تھے۔

اور جب وہ مسائل پر زبان کھولتے تو حاضرین پر سناٹا سا چھا جاتا اور بڑے  
بڑے صاحبان علم و ارباب خطابت کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا تھا۔

ابتداء میں بادہ خواری کے وقت وہ بلبل ہزار داستان بن جاتے ٹھمریاں، دادرے  
اپنا اور دوسروں کا کلام اور لطیفے سناتے اور بسا اوقات انگریزی ناچ بھی دکھایا کرتے  
تھے لیکن زندگی کے آخری دور میں وہ اس قدر خوفناک ہو گئے تھے کہ شراب پینے کے  
وقت جس کی طرف بھی ان کی نظر اٹھ جاتی تھی وہ اس کو گالیاں دینے لگتے تھے ایسا  
معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کھوپڑی میں ماں بہن اور بیٹی وغیرہ کی گالیوں کے کارتوس دن  
سے چل جایا کرتا تھا میں نے اور مجھ سے زیادہ رئیس نے بے حد کوشش کی اور بارہا  
سزائیں بھی دیں کہ ان کی اصلاح ہو جائے مگر عمر کے انحطاط اور شراب کی کثرت نے  
ان کے دماغ کو موقوف کر دیا تھا کہ وہ راہ راست پر نہیں آئے آخر کار تنگ آ کر میں نے  
اپنی رات کی محفلوں میں شریک ہونے سے ان کو روک دیا، اور پہرے بٹھا دیئے کہ وہ

باریاب نہ ہو سکیں۔

حقہ پانی بند ہو گیا تو وہ بڑے اداس ہو کر رہ گئے اور اپنے گھر میں بیٹھ کر پینے لگے اور گھر والوں کو گالیاں دینے لگے اور اس مقاطعے اور گھر والوں کے احتجاج مسلسل سے تنگ آ کر وہ نان پارے چلے گئے اور راجہ صاحب نان پارہ کی نوکری کر لی۔

ایک روز میں اپنی لکھنوی بنارس باغ کے سامنے والی کوٹھی سے منہ اندھیرے سیر کرنے کے واسطے باہر نکلا ہی تھا کہ وہ تانگے پر اپنا سامان رکھے آگئے میرا ماتھا ٹھنک گیا کہ ہونہ ہو وہ راجہ صاحب نان پارہ کو گالیاں دے کر آئے ہیں۔

اور جب تانگے سے اترتے ہی انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ شبیر حسن خاں یہ نان پارے کا راجہ نہایت کمینہ ہے، تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی اس لئے کہ ان کی یہ سنت جاری تھی کہ وہ رات کو جسے گالیاں دیتے تھے اگر وہ صبح کو شکایت کرتا تھا تو وہ اسے کمینہ آدمی کہا کرتے تھے۔

میں نے کہا تمہارا اس طرح لدا پھندا آنا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ رات کے وقت تم نے راجہ کو ضرور گالیاں دی ہیں انہوں نے کہا قرآن مجید کی قسم میں نے گالیاں نہیں دی ہیں اسی دن سر شام میں انہیں ساتھ لے کر راجہ صاحب کے پاس گیا ان سے کہا تم موٹر میں بیٹھے رہو جب بلاؤں تو آنا اندر جا کر راجہ صاحب سے پوچھا انہوں نے کہا رات کو خاں صاحب نے میری تمام محفل درہم برہم کر دی میرے وہاں ڈرنک اور ڈنر کی پارٹی تھی جس میں انگریزوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جب ہم سب کھانے کی میز پر آئے خاں صاحب چینی کی پلیٹ میں ہڈی توڑنے لگے کھٹا کھٹ، اور جب میرے سیکرٹری نے انہیں روکنا چاہا تو خاں صاحب نے اس کو فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا راجہ صاحب، ابراہن کو آپ سے بے حد محبت ہے وہ اپنی اس غلطی پر بے حد پشیمان ہیں اب وہ نوکری کرنا نہیں چاہتے لیکن

چونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں اس لئے ان کی یہ تمنا ہے کہ آپ کے پاس آ کر معذرت کر لیں راجہ صاحب نے کہا جوش صاحب میں نے خاں صاحب کو کبھی ملازم نہیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا آپ انہیں بلوالیں آدمی بھیج کر میں نے انہیں

1. جس دعوت میں انگریز شریک ہوتے تھے ہم گھٹیا لوگ اس دعوت کو بڑھیا سمجھتے تھے۔

بلوالیا ابرار نے جھپٹ کر راجہ کو گلے سے لگالیا اور رونے لگے راجہ نے کہا خاں صاحب خدا کے واسطے نہ رویئے میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں چھوڑیئے اس ذکر کو پھر آجائیے میرے پاس اسی اثناء میں آفتاب غروب ہو گیا میں اٹھنے لگا راجہ نے کہا ایسی بھی کیا بے مروتی، تھوڑی سی ڈرنک تو کرتے جائیے میں نے کہا میں ابرار کی صحبت میں شراب نہیں پیوں گا آپ کسی دوسرے کمرے میں ان کا انتظام کر دیں۔ ابرار نے مجھ کو بڑی شکایت آمیز نظروں سے دیکھا اور راجہ صاحب نے کہا جوش صاحب آپ اجازت دے دیں تو خاں صاحب ایک پیگ تو میرے ساتھ کر لیں، پھر دوسرے کمرے میں انہیں بھیج دوں گا اس کے بعد بوتل کھلی سب سے پہلے حسب دستور مہتمم شراب کو ایک پیگ پلایا اور دس پندرہ منٹ کے بعد جب اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ شراب میں کسی دشمن نے زہر نہیں ملوایا ہے ہم لوگوں کے جام بھر دیئے گئے۔

آدھا جام خالی کر کے، ابرار نے صوفہ چھوڑ دیا راجہ کے سامنے فرش پر آ کر بیٹھ گئے ان کے ہاتھ چوم چوم کر ”میر چنوا“ ”میر منوا“ کہنے لگے اس کے بعد جلدی سے اپنا گلاس ختم کر کے انہوں نے میرا جام غٹ غٹا کر پی لیا اور اس کے بعد جلدی سے راجہ کا جام بھی ایک سانس میں خالی کر کے وہ مسکرائے اور اپنی ترکی ٹوپی کچ کر لی۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ گالی دینے ہی پر ہیں اس لئے کہ بارہا دیکھ چکا تھا کہ گالیاں دینے سے پیشتر وہ مہین مہین مسکراتے اور ٹوپی کچ کر لیا کرتے ہیں میں نے چاہا کہ میں فوراً اٹھ جاؤں لیکن راجہ نے میرا دامن پکڑ لیا مجھے بٹھالیا ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ابرار نے

رابعہ صاحب کی جانب نظر اٹھائی، ان کا ہاتھ چوما اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

رابعہ صاحب قرآن مجید کی قسم آپ بھی بڑے حرام زادے ہیں اور محفل برخواست ہوگئی ایک روز سہ پہر کے وقت لکھنؤ کے ”مقبرہ جناب عالیہ“ کے قریب کے مکان میں جہاں اپنی سالی کے علاج کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا وہ میرے پاس اداس اداس آئے اور کہنے لگے شبیر حسن خاں آپ جانتے ہیں کہ مجھے لڑکپن ہی سے آپ سے کس قدر محبت ہے آپ نے جس دن سے میرا بایکاٹ کر دیا ہے میری زندگی ویران ہو کر رہ گئی ہے یہ کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے میں نے انہیں گلے لگالیا، اور کہا ابراہیم کو بھی معلوم ہے کہ میں تم کو کس قدر چاہتا ہوں مگر بایکاٹ ہاری گالیاں کون برداشت کر سکتا ہے انہوں نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ لوگ مجھے ”اری ٹیٹ 1“ ”برافروختہ“ کر دیتے ہیں اس لئے مشتعل ہو کر میرے منہ سے آخر پٹھان ہوں نا، گالیاں نکل جاتی ہیں اگر کوئی مجھے ”اری ٹیٹ“ نہ کرے تو قرآن مجید کی قسم میرے منہ سے گالی نکل ہی نہیں سکتی میں نے کہا اچھا تو آج یہ کرو کہ میرے ساتھ پیو، اور اس طرح کہ میرے تمہارے سوا اور کوئی تیسرا شخص موجود نہ ہو۔ میں تو ”اری ٹیٹ“ نہیں کروں گا؟ انہوں نے کہا بھلا آپ اور مجھے اری ٹیٹ کریں یہ ہو ہی نہیں سکتا اور آپ نے اگر مجھے ”اری ٹیٹ“ بھی کیا تو آپ کے قدموں پر سر رکھ دوں گ اور اگر آپ مجھے جوتے بھی ماریں گے تو قرآن مجید کی قسم اف تک نہیں کروں گا میں نے کہا میرے گھر پر روز دس پانچ دوست آجاتے ہیں یہاں تخیلہ میسر نہیں ہو سکے گا انہوں نے کہا چلئے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کے نیچے، گومتی کے کنارے بیٹھ کر پیس گومتی کے کنارے، ایک پیگ کرنے کے بعد، انہوں نے کہا یہاں اندھیرا ہو چکا ہے چلئے چوک چلیں، اور نازنین 2 کے کمرے میں بیٹھ کر پیس اور گانا بھی سنیں میں نے کہا چلو اسی وقت چلو بسم اللہ، دیکھو میں تمہیں ”اری ٹیٹ“ نہیں کر رہا ہوں۔







بیچارے کا یہ حشر ہوا۔

وہ اچھے شاعر بھی تھے افسوس کہ ان کے بیٹے اظہارِ ملیح آبادی نے ان کا تمام کلام ضائع کر دیا ورنہ میں ان کے شعر سنا کر کے آپ کو یہ تسلیم کرا دیتا کہ وہ بڑے خوش گو تھے انہوں نے حیدر آباد میں دو نظمیں کہی تھیں لو آہی گئی لاڈلے بیٹے پہ جوانی اور ”سیندھی نے تو اے یار عجب دھوم مچا دی“ جن میں نظیر اکبر آبادی کی سی رونا ی تھی ایک شعر یاد رہ گیا ہے ان کا

زوال ہوش کے عالم میں بھی ہم نے یہ دیکھا ہے  
خرو کے چند فتنے ذہن میں بیدار رہتے ہیں۔

ان کی موت میرے دل کا زخم نہیں ناسور ہے اور ایسا کہ زندگی بھر رستار ہے گا اور ان کا اس دنیا سے اٹھ جانا میری زندگی کا ایک ایسا خلا ہے جو مرتے دم تک پر نہ ہو سکے گا 2 ہم پٹھانوں میں بڑے بھائی کو ”دادا“ بھی کہا جاتا تھا۔

چھوٹے دادا کے جملہ خصوصیات کو میں نے ان چند سطروں میں بند کر دیا ہے اب جو کچھ لکھوں گا وہ اس اجمال کی تفصیل ہوگی۔

خدا جانے وہ کون ایسی قبول عام کی گھڑی تھی کہ میں نے ان کو ”چھوٹے دادا“ کے نام سے پکارنا شروع کیا تھا کہ تمام ملیح آباد اور تمام لکھنواں کا نام بھول کر انہیں اس طرح ”چھوٹے دادا“ کہنے لگا کہ وہ جگت گرد کے مانند جگت چھوٹے دادا بن گئے اور ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی ان کو ”چھوٹے دادا“ کہنے لگے۔

اب تفصیلی ملاحظہ فرمائیے۔ ان کا تندرست رہنے اور زیادہ سے زیادہ جینے کا شوق، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ امانی گنج کے میدان میں ہر صبح و شام میرے ساتھ ٹہلا کرتے اور ٹہلنے میں ایسے ایسے شندے کرتے تھے کہ بے ساختہ ہنسی آ جاتی تھی۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ باند کر کے چکر گھنی کی طرح گھماتے پھر بھالو کی طرح کودتے

گردن کو دائیں بائیں گھما گھما کر ”یا علی“ کے نعرے لگاتے درختوں کے نیچے جا کر اس زور زور سے سانسیں لیتے تھے گویا عالم نباتات کا تمام جوہر پی جائیں گے اور پھر ہا ہا ہا ہا کی آوازوں کے ساتھ اپنا منہ ظلم ہوش ربا کے حملہ آور دیو کے مانند اس طرح پورا کھول کر دوڑتے تھے کہ میدان کی ہوا کے تمام اجزائے صحت کو چبا کر رکھ دیں گے اور جب ٹہل کر گھر آئے تھے تو چارپائی پر چت لیٹ کر اپنی دونوں کلائیوں کو بلا مانعہ ناپا کرتے تھے کہ اب وہ کتنی اور موٹی ہو گئی ہیں۔

اسی ذوق میں صحت اور تمنائے درازی عمر نے ان میں کھانا کھانے کا ہوکا بھی پیدا کر دیا تھا وہ کھانے کی میز یا دسترخوان پر اس طرح خم ٹھونک کر بیٹھا کرتے تھے گویا وہ میدان جنگ میں کود پڑے ہیں اور اپنے شرکائے طعام کو بڑی ذلیل شکست دینے پر تل گئے ہیں۔

وہ اپنے سامنے کی پلیٹیں اور پیالے جلد جلد صاف کر کے انتہائی بے تکلفانہ بے دردی کے ساتھ ہا ہا ہا کر کے دوسروں کی پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا کرتے، اور ان کے شرکائے طعام خالی معدوں کے ساتھ دسترخون سے اٹھ جایا کرتے تھے۔

اور تو اور وہ اس معاملے میں بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے اور جب کوئی بچہ ادھر ادھر کسی گوشے میں ان کو مل جاتا تھا تو وہ اس کو گود میں اٹھا کر گھر سے باہر نکل جاتے اور وہاں جا کر اس کے ہاتھ کی چیز پھسلا کر اس سے لے لیتے، اور ہا ہا کر کے کھا جایا کرتے تھے۔

وہ میرے لڑکپن میں میرے گئے چھپلا کرتے دو چار گندیریاں مجھے دیتے اور یہ کہہ کر پورا گنا خود کھا جاتے تھے کہ باقی سب گرہیں نکل گئیں اور جب میرے واسطے برنی آتی تھی تو دونا میرے ہاتھ سے لے کر کہتے تھے مولود شریف تو پڑھو الو اور دونه کو ”مولود شریف مولود شریف“ کہہ کر بلند کرتے اور دو ڈلیاں میرے حوالے کر کے ساری مٹھائی ہا ہا کر کے خود کھا لیا کرتے تھے۔



ایک بار ابرار تیخ میں لگا ہوا تیتز بھون کر لائے اور کہا رئیس احمد خاں آج ایسا تیتز بھون کر لایا ہوں کہ قرآن مجید کی قسم مزہ آجائے گا یہ کہتے ہی ان کے ہاتھ کو یکا یک ایک جھٹکا لگا اور مڑ کر یہ دیکھا کہ چھوٹے دادا اس تیخ کو اپنے ہاتھ میں لئے ہا ہا کرتے اپنے گھر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

ایک روز میری کھانے کی میز پر کھانا چٹا جا رہا تھا، اور وہ آستینیں چڑھائے بیٹھے تھے کہ کسی نے آکر ان کی والدہ کے انتقال کی خبر سنائی میں اداس ہو کر کھڑا ہو گیا اور آدمی سے کہا کھانا بڑھاؤ انہوں نے بے حد تعلمان ہو کر مجھے دیکھا میں سمجھا ماں کی خبر مرگ نے ان کو غمگین بنا دیا ہے میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے میں نے کہا چھوٹے دادا چلئے آخری دیدار کر لیں انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن کا زندگی و موت پر کس کا قابو چلتا ہے آخری دیدار سے پہلے کھانا تو کھالیں بھوکے پیٹ سے تو رو یا نہیں جائے گا میں بڑی حیرت سے ان کو دیکھنے لگا اور انہوں نے ایک ہاتھ 1 مار چھپلا دو ٹوکے ہو جائیں کہہ کر کھانا شروع کر دیا دیکھا آپ نے ان کا ذوق طعام!

1 اے چھپلا (بانکے محبوب) ایک ایسا ہات میرے مار کہ میرے دو ٹکڑے رہ

جائیں۔

اسی تمنائے صحت نے ان میں یہ بات بھی پیدا کر دی تھی کہ جب میں یا میرے گھر کا کوئی فرد بیمار پڑ جاتا تھا تو چھوت چھات کے ڈر سے وہ مریض کے کمرے میں قدم نہیں رکھتے تھے اور دروازے کی دہلیز سے ناک پر رومال رکھ کر دور ہی سے مزاج پرسی کر کے فوراً چلے جاتے تھے ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بے حد بخیل بھی تھے اور حیرت تو یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کے ذوق پر بھی وہ بخل حاوی رہتا تھا اور کبھی وہ اپنی جیب سے خرید کر دو پیسے کی چیز بھی نہیں کھاتے تھے۔

انہوں نے زندگی بھر کوئی محنت نہیں کی ان کی آمدنی کا تمام انحصار میری ذات پر تھا، میں جیب خرچ اور کپڑے لے، جوتے ٹوپی وغیرہ کے واسطے جو روپیہ ان کی

خدمت میں حاضر کیا کرتا تھا وہ اس کو ایک پائی خرچ کئے بغیر سیونگ بینک میں جمع کر دیا کرتے تھے۔

انتقال سے کوئی دو مہینے پیشتر، وہ بھائی بہنوں سے ملنے کے لئے مجھ سے رخصت لے کر پونے سے ملیح آباد چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

جب ان کے پر سے کے لئے میں وطن گیا تو ان کے چھوٹے بھائی محمد علی خاں نے مجھ سے کہا کہ جب چھوٹے دادا بیمار پڑ گئے اور حالت غیر ہونے لگی تو میں نے ان سے کہا چھوٹے دادا میں بڑی اچھی پونجی کا آدمی ہوں آپ سیونگ بینک سے دو چار سو روپے نکال لیں تاکہ آپ کا علاج ہو جائے یہ سن کر وہ بگڑ گئے کہنے لگے خاں صاحب آپ روپیہ نکالنے کا ہم کو مشورہ نہ دیں ہمارا علاج و لاج کچھ نہ کریں اور اگر ہمارے دشمن مرجائیں تو ہماری لاش کو سمر<sup>1</sup> تالاب میں پھنکوا دیں اب ان کی خودداری کا حال سنیے ایک بار کوئی ڈپٹی کلکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے ان کے سامنے حقہ رکھ دیا گیا حقہ کا دس پانچ کش لگا کر، انہوں نے وہ حقہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کر چھوٹے دادا کے سامنے رکھ دیا اور جب چھوٹے دادا حقہ پی چکے تو جوتے کی نوک پر حقہ رکھ کر اپنا پاؤں ڈپٹی کی طرف پھیلا دیا۔ اور ڈپٹی بے چارہ منہ تکتا رہ گیا۔

### 1۔ ملیح آباد کے ایک تالاب کا نام

ایک بار ایک سہ منزلے کے اوپر کی دیوار پھلانگ کر مجھے ایک فتنہ روزگار سے مل کر یہ کہنا تھا کہ

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہو گا  
وہ کام کیا ہم نے ، جو رستم سے نہ ہو گا  
میں دیوار پر چڑھ گیا اور منڈیر پر بیٹھ کر کہا چھوٹے دادا آپ بھی آ جائیں  
انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں آپ دبلے پتلے آدمی ہیں آپ آسانی کے ساتھ  
دیوار پھلانگ سکتے ہیں میں ماشاء اللہ موٹا آدمی ہوں مجھے ڈر ہے کہ دیوار پھانڈنے

میں کہیں خدا نخواستہ ایسا نہ ہو کہ میں سڑک کی طرف اتر جاؤں۔

دیکھی آپ نے چھوٹے دادا کی خودداری، اپنے باب میں یہ نہیں کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو سڑک پر گر پڑوں اس لیے کہ گر پڑنے کے لفظ کو اپنی طرف منسوب کرنا انہیں اپنی شان کے خلاف نظر آیا۔ میں نے کہا چھوٹے دادا اس اتر جاؤں کی بلاغت کی داد نہیں دی جاسکتی۔ یہ کیوں نہ کہا کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میں گر نہ پڑوں انہوں نے کہا گرتے ہیں دھنیے جلا ہے ہم پٹھان گرتے نہیں فقط سڑک کی طرف اتر جاتے ہیں۔ ہائے ان کے علاوہ سڑک کی طرف اتر جانا اس دنیا میں اور کون کہہ سکتا تھا۔ اور وہ بھی ”فقط“ کے ساتھ۔

اور ان کی خودداری کا یہ پہلو بھی بڑا دلچسپ ہے کہ وہ اپنے کوتاہی کشادہ دلی کے ساتھ اس امر کا حق دیے ہوئے تھے کہ وہ جس سے بھی چاہیں مذاق کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے کسی کا اپنی ذات پر یہ حق تسلیم نہیں کیا تھا کہ کوئی ان کے مذاق کا تصور بھی کر سکے۔

اور اسی بنا پر جب کوئی ان سے مذاق کا ارتکاب کر بیٹھتا تھا تو وہ مارنے مرنے پر اتر آتے تھے اور زندگی بھر کے لیے اس سے تعلقات منقطع کر لیا کرتے تھے۔

ایک بار کاکوری کے عرس پر شاہ جہانیاں پور کے کسی معمر و معزز پٹھان سے بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے کہ ان معمر پٹھان نے ملیح آباد کے آدموں کے تذکرے میں ان سے پوچھا خاں صاحب آپ نے کبھی ہمارے شہر کا ”بلاغند“ بھی کھایا ہے یہ سن کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ بلاغند کسی عضو فحش کا نام ہے وہ جامے سے باہر ہو گئے اور آستینیں چڑھا کر کہنے لگے کہ بلاغند آپ نے کھایا ہوگا اور آج بھی کھا رہے ہوں گے، وہ تو کہیے ایک صاحب فوراً چھوٹے دادا اور شاہ جہاں پور کے آمادہ نبرد آزما پٹھان کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا چھوٹے دادا شاہ جہاں پور میں بیل کو بلاغند کہتے ہیں۔ اگر وہ عین موقع پر آ کر رفع شر نہ کر دیتے تو دونوں لڑ مرتے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ چھوٹے دادا معافی کے خواست گار ہوتے مگر ان کو بلا غنڈ سن کر ہی اس قدر غصہ آچکا تھا کہ معافی طلب نہیں کی، اور تنقالتے ہوئے باہر چلے گئے اللہ ری بلا غنڈ کی فحاشی آمیز صوتی دھمک ایک بار میرے سکھانے پر ان کا پانچ برس کا بھانجا چوہے دان لیے ہوئے گھر سے نکلا اور دہلیز سے پکار کر اس نے کہا مانموں مانموں چھوٹے دادا نے کہا کیا ہے بیٹا اس نے چوہے دان کی طرف اشارہ کر کے کہا مانموں آؤ اس کے اندر بیٹھ جاؤ یہ سنتے ہی وہ ابے مردود کہتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑے وہ بھاگا۔ وہ مکان کے اندر گھس کر اپنی نانی یعنی ان کی ماں کی پشت پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھپٹے اسے مارنے کے لیے بچے نے نسل مچایا ان کی ماں نے پوچھا نورتن کیا ہے انہوں نے کہا میں اس کے ٹکرے اڑا دوں گا۔ یہ مردود مجھ سے کہتا ہے مانموں آؤ چوہے دان میں بیٹھو ان کی ماں ہنسنے لگیں۔ وہ ان کے ہنسنے پر بگڑ گئے اور جیسے ہی انہوں نے چاہا کہ ماں کی پشت سے لیٹے ہوئے بچے کو کھینچ کر ماریں پیٹیں ان کی ماں جھلا کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں اگر بچے کو ہاتھ لگایا تو تیرے ہاتھ تو رکر رکھ دوں گی۔ دیوانہ ہو گیا ہے۔ معصوم بچوں سے لڑتا ہے۔ آج کی اس نئی نسل کا کوئی بیٹا ہوتا تو بھانجے ہی کو نہیں ماں کو بھی دھنک کر رکھ دیتا مگر وہ تھے پرانے دور کے شریف زادے، ماں کی ڈپٹ سن کر باہر چلے گئے۔ لیکن بھانجے سے اپنے نزدیک یہ انتقام لیا کہ اس کے دوسرے روز جب اس کا فتنہ ہوا تو وہ شریک نہیں ہوئے اور لکھنؤ چلے گئے۔

حیدر آباد کا ذکر ہے ایک راز رات کے بارہ بجے میں گھر آیا ابراہیم میرے ساتھ تھے پھانک پر آتے ہی موٹر رک گئی میں نے ابراہیم سے کہا اب موٹر خانے تک کیسے پہنچاؤں ابراہیم نے صحن میں لیٹے ہوئے چھوٹے دادا کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ کیا قلی پڑا ہوتا ہے اس سے ڈھکھلا لیجیے۔ یہ سنتے ہی چھوٹے دادا نے شیر کی مانند سر سے جست کی، ڈنڈا اٹھا کر کہا ابراہیم کی طرف یہ کہتے ہوئے جھپٹ پڑے کہ ابے مردود، گھس کھدے، ہم کو قلی کہہ رہا ہے۔ ٹھہر جا تیرے ٹکرے اڑا کر رکھ دوں گا۔ ابراہیم بھاگے وہ ڈنڈا





گوئیں گے تھے اور قہقہے مار کو جب وہ ان تھو کرتے اور ان کا تھوک چارپانچ گز آگے جا کر گرتا تھا۔ تو وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں دیکھا میرے پیچھڑوں کا زور؟

ان کے الفاظ کی تراش خراش بھی دنیا سے نرالی تھی ان کے سینکڑوں الفاظ میں چند یاد رہ گئے ہیں آپ بھی سن لیں۔ قرول باغ دہلی کا واقعہ ہے حضرت آزاد انصاری میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ روز صبح ان کے کمرے میں جا کر پوچھا کرتے تھے آزاد صاحب کیا لکھا جا رہا ہے وہ کہتے تھے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ وہ ہا ہا کرتے ان کے کمرے سے نکل جاتے تھے۔ جب یہ سلسلہ آٹھ دس روز تک جاری رہا تو ایک دن انہوں نے پھر پوچھا آزاد صاحب کیا لکھا جا رہا ہے اور جب آزاد نے پھر یہی جواب دیا کہ چھوٹے دادا اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں تو انہوں نے ایسا فارا شکاف قہقہہ لگایا کہ آزاد اچھل پڑے۔ اور کہا آزاد صاحب اللہ اللہ یہ مقدمہ ہے کہ بالے میاں کی چھیر ہم تو سینکڑوں مقدمہ بازیاں دیکھ چکے ہیں۔ مگر آپ کی مقدمہ بازی اس قدر طویل ہے کہ قطب مینار اس کے سامنے چر کٹے کا لونڈا معلوم ہوتا ہے۔ ارے یہ پاتا بہ ستر لاتی اور قنورہ زربفتی والا لمبا چوڑا، جھبر جھاڑ، جھاڑ جھنکار شتر خوار مقدمہ۔ مقدمہ ہے یا صدر پور کے نبی شیر خاں کے تاڑوں کا سرد در در و سر و سر و رو، رو، قاہ، قاہ، قاہ، قاہ، قاہ، آزاد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اور لوٹنے لگے۔ ایک بار لکھنؤ کی ایک تنگ گلی سے ہم گزر رہے تھے دیکھا ایک مست سائڈ، رسیاں تڑا کر ہماری طرف سر پیٹ دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ میں اور چھوٹے دادا، ایک چبوترے پر چڑھ گئے۔ اور شرر صاحب جب گلی کے ایک کنارے سے مل کر چلتے رہے تو انہوں نے چیخ کر کہا ارے شرر صاحب چبوترے کے اوپر چڑھ آئے ورنہ یہ ادھیایا ہوا مادہ دیوانہ سائڈ اپنے سینگوں سے آپ کی دونوں مغیانوں کو پھاڑتا ہوا اور آپ کے سارے جھولے کو روندتا ہوا نکل جائے گا۔

ایک روز میں نے پوچھا یہ آپ کی بھنویں کیوں چلتی رہتی ہیں انہوں نے قہقہہ مار کر کہا بھائی شبیر حسن خاں جب سے میں بوڑھا ہو گیا ہوں یہ خصماتی حرام زادیاں چھٹال ہو گئی ہیں اور یاروں کو اشارے کیا کرتی ہیں۔

ایک روز کسی نے پوچھا چھوٹے دادا آپ نے شادی کیوں نہیں کی انہوں نے قہقہہ مار کر کہا۔ جناب یہ دم بھر کی پلپلاہٹ اور جیتے جی کی بھلبھلاہٹ آپ ہی کو مبارک ہو۔ یار لوگ ایسی نچال نہیں پالتے۔ خاں صاحب کا ایک مادہ کار بن جانے کے بعد دنیا بھر کے نروں کی مادہ بن جانا کون گوارا کر سکتا ہے۔

ایک پلا اس کاندھے پر اور ایک پلا اس کاندھے پر اور میانی کے گولے تھر تھر تھر تھر ہا ہا ہا۔ بھوتیا کون بنے۔ اگر د شادی او مانی کے نعروں میں بنو کو گھر میں بیاہ کر لے آتا تو اس سارے ہاڑ سے ہاتھ دھو کر خاں صاحب میں بھی آپ ہی کی طرح لقات اور لفافہ بنا ڈگ ڈگ ڈگ کرتا پھرتا ہوتا۔

ایک بار میں نے اپنے نانا جان کے ساتھ ریاست رام پور کے سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ میرے مانموں کے ایک بوڑھے اتالیق نے جن کو شاہ صاحب کہا جاتا تھا برآمدے میں بیٹھ کر بری طرح کھانس رہے تھے۔ ان کی کھانسی کی آوازوں کو سن کر انہوں نے مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں سن رہے ہیں آپ یہ آوازیں بھوق والی دی بھوق والی دی ہا ہا ہا ہا ہا۔

ہائے اب بھی جب کوئی بری طرح کھانستا ہے تو چھوٹے دادا بھوق والی دی یاد آ جاتی ہے۔

وہ عصر حاضر کی سپاٹ عمارتوں کو حرام زادی کلین شیو کہا کرتے تھے۔ اور نئے فیشن کی لڑکیوں کو انہوں نے لونڈا فیملی کا خطاب بخشا تھا۔ اور جب کسی مولے تازے امر د کی پشت پر وہ نظر جماتے تو قہقہہ مار کر کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں ٹھاپ دی بال۔

ان کے مزاج کی یہ بھی ایک ناقابل فہم خصوصیت تھی کہ جس وقت موسم میں غیر معمولی شدت آجاتی تھی۔ مثلاً شدید گرمی یا شدید سردی پڑنے لگتی تھی تو وہ اپنے ہم نشینوں سے اس طرح بگڑ جاتے تھے گویا موسم کے شدائد کو انہوں نے ہی پیدا کر دیا ہے ایک بار جب میں نے ان سے پوچھا کہ چھوٹے دادا، سختی تو موسم کرتا ہے اور بگڑ جاتے ہیں آپ ہم سب سے آخر اس کی کیا وجہ ہے تو ایک روکھی ہوں کے سوا وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ ہاں یہ بھی سن لیجیے کہ ان کا کوئی فعل ٹکڑے ٹکڑے ارادینے سے کم کا کبھی ہوتا ہی نہیں تھا۔

مثلاً جب وہ حمام سے نکلتے تو یہ کہتے نکلتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو نہاتے نہاتے ٹکڑے اڑا دیے میں نے اسی طرح جب کھانے کی میز سے اٹھتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو کھاتے کھاتے ٹکڑے اڑا دیے میں نے اور جب ٹہل کر آتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو ٹہلتے ٹہلتے ٹکڑے اڑا دیے میں نے یعنی وہ دنیا میں جو بھی کام کرتے اسے ٹکڑے اڑا دینے کی حد تک کرتے تھے۔

ان کی یہ بھی ایک دنیا بھر سے نرالی خصوصیت تھی کہ جس وقت کسی اللہ کے بندے کو کوئی حادثہ پیش آجاتا تو ہو ہمیشہ کہا کرتے تھے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے حالاں کہ وہ کبھی پہلے سے ایک حرف بھی نہیں کہا کرتے تھے۔ میں اکثر یہ تماشا دیکھا کرتا تھا

---

۱۔ یعنی جس طرح فٹ بال پر ٹھاپ سے ٹھوکر لگاتے ہیں اسی طرح تم بھی ایک ٹھوکر لگا دو۔

---

کہ جب کوئی سائیکل سے گر جاتا یا پھل تراشنے میں کسی کی انگلی کٹ جاتی، کسی شخص کی ریل چھوٹ جاتی تھی، تو ان تمام مواقع پر وہ بڑے پیمبرانہ انداز میں ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کا اعلان کیا کرتے تھے۔



آخر میں ان کی ایک اور بات بھی سن لیجیے جس سے پتہ چل جائے گا کہ ساٹھ برس کی عمر میں بھی عورت نابدیدہ چھوٹے دادا کس قدر بے خبر انسان تھے۔

ایک روز میرے پاس غصے سے بھرے ہوئے آئے اور کہنے لگے بھائی شبیر حسن خاں آپ نے اپنے دو کوڑی کے خدمت گار جگنو کو بے حد منہ چڑھا رکھا ہے۔ اگر آپ کا منہ نہ ہوتا تو آج مار مار کر سالے کے ٹکڑے اڑا دیتا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے انہوں نے کہا وہ مجھ سے بحث کر رہا تھا کہ بچہ مادہ کے آگے کے رخ سے پیدا ہوتا ہے اور جب میں نے اس گاؤ دی سے یہ کہا کہ تیرا خیال سراسر غلط ہے بچہ مادہ کے پیچھے سے پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ سالا مجھ پر ہنسنے لگا۔ مجھے ان کے اس بھولے پن پر ہنسی آگئی میں نے کہا چھوٹے دادا جگنو سچ کہتا ہے بچہ مادہ کے اگلے حصہ سے پیدا ہوتا ہے تو انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا بھائی شبیر حسن خاں میں اپنی ان دونوں آنکھوں سے دن دیہاڑے میتھنیا کی بھینس کو خود جنتے دیکھ چکا ہوں کہ اس کا بچہ پیچھے کی طرف سے پیدا ہوا تھا۔ اور جب میرا قہقہہ نکل گیا تو وہ وزیرے چنیں شہر یارے چناں۔ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔



## مختار احمد خاں

میرے ساتھ کھیلے ہوئے پڑوسی میرے باپ کے رفیق، شبیر احمد خاں کے بیٹے، نسلی طور پر رام پوری وطنی اعتبار سے ملیح آبادی، عاشق مزاج و صوفی منش دبلے پتلے دھان پان اور بلا کے ذہین انسان تھے۔ ابرار اور چھوٹے دادا وغیرہ کے مانند خصوصیات کثیرہ کے جامع تو نہیں تھے۔ لیکن ان کی ایک خصوصیت ایسی تھی کہ جو ہزاروں خصوصیات پر بھاری تھی اور انسانی تاریخ آج تک اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکی ہے۔

اس سے پیشتر کہ میں اس خصوصیت پر روشنی ڈالوں، یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ پڑھے کڑھے آداب مجلسی سے واقف لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر تھے اور اس امر کو بھی خوب بدرجہ اتم سمجھتے تھے کہ بے محل کی بات کرنا یا کہنا آدمی کو سبک بنا دیتا ہے..... لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود وہ جب کسی ایسی ناقابل تعظیم ہستی سے دوچار ہو جاتے تھے جس کی ذات سے کسی دینی احترام کا تصور وابستہ ہوا کرتا تھا اس وقت ان کو بے اختیار ہنسی آنے لگتی تھی۔ ہر چند وہ صاحبان کشف و کرامات کے روبرو اس امر کی انتہائی کوشش کرے تھے کہ باادب و سنجیدہ رہیں اور بعض اوقات تو سنجیدہ رہنے کی کوشش میں ان کی جان تک پر بن جایا کرتی تھی لیکن ان تمام مساعی کے باوجود ان بزرگوں کے سامنے ان کی چھاتی کو توڑ کر قہقہے بلند ہو جایا کرتے تھے۔

یہ بھی سن لیجیے کہ وہ ملحد نہیں بلکہ دین دار آدمی تھے۔ اور تصوف کی چاشنی ان کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ ان بزرگوں کا احترام کرتے اور بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے روبرو سر جھکاتے اور ان کے ہاتھ چومتے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ رسم عالم اور خود اپنے عقائد کے خلاف وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔

نفس انسانی کا مسئلہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور بعض اوقات تو یہ مسئلہ ایسی بھول

بھلیاں بن جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو کر باہر نکلنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔  
اب ان کی زندگی کے چند واقعات سن لیجیے۔ اور زندگی بھر غور فرماتے رہیے کہ ان کی علت کیا تھی۔

پہلا واقعہ: ایک روز میں اپنے نانا کے انتقال کے غم میں چارپائی پر اداس لیٹا تھا اور وہ پانکٹی کی طرف غمگین بیٹھے ہوئے مجھے تسلی دے رہے تھے کہ اتنے میں مولانا صاحب تعزیت کے لیے آگئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا..... اور جب انہوں نے فاتحہ کو ہات بلند کیے تو نیچے سے میری چارپائی اچھلنے لگی، میں گھبرا گیا۔ اور تھوڑا سا جھک کر جب چارپائی کے نیچے نظر دوڑائی تو یہ دیکھا کہ وہ چارپائی کے نیچے پڑے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں اور مولانا صاحب لاحول و لا قوۃ کہتے باہر تشریف لیے جا رہے ہیں۔

دوسرا واقعہ: ایک بار میں آباد (لکھنؤ) کے چوراہے پر ہماری مڈ بھیڑ ہو گئی، شمس العلماء مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محل سے ہم لوگ تانگے اور وہ گاڑی میں تھے مولانا کو دیکھ کر میں نے تانگہ ٹھہرا لیا اور مجھے دیکھ کر مولانا نے گاری روک لی۔ صاحب سلامت و مزاج پرسی کے بعد جب مولانا نے پوچھا کہ خاں صاحب کہاں جا رہے ہیں؟ تو مختار نے قہقہہ مار کر جواب دیا حضور چوک جا رہے ہیں چوک گانا سننے کے واسطے قاقا، قاقا، قاقا۔ ارے جوش جلدی تانگہ بڑھاؤ۔ ہم مرے جا رہے ہیں۔ یہ خلاف توقع بات دیکھ کر مولانا نے کوچ بان سے بلند آواز سے کہا گاڑی بڑھاؤ۔ اور مختار نے جھک کر کہا حضور آداب اور مولانا دو رتک مڑ مڑ کر نہایت غصے کے ساتھ دیکھتے چلے گئے۔

تیسرا واقعہ: یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء کا ہے جب کہ لکھنؤ میں ایک بزرگ وارث جن شاہ صاحب کے کشف و کرامات کے ڈنکے پٹے ہوئے تھے ان کے خاص مریدوں میں زیادہ تر علماء بیر ستر اور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اور یہ مشہور تھا کہ وہ ان سب کی

شراب چھڑوا چکے ہیں۔ اس لیے کہ جب وہ پیگ بناتے تھے تو ان کو یہ نظر آتا تھا کہ جام کے اندر سینکڑوں سوراخوں کے پچے تیر رہے ہیں۔

ان کے عقیدن مندوں نے شاہ صاحب کے ٹیلے کی مسجد کے جوار میں ان کے واسطے ایک کوٹھی تعمیر کروادی تھی۔ اور وہ بڑی شان کے ساتھ وہاں رہتے تھے۔

اسی اثنا میں ایک روز صبح کو مختار میرے پاس آئے اور کہا چلو حضرت وارث شاہ حسن صاحب کی زیارت کر آئیں۔

ابھی ہم مسجد کی سیڑھیاں طے ہی کر رہے تھے کہ میں نے کہا دیکھو مختار شاہ صاحب کی ذات سے احترام کا تصور وابستہ ہے خدا کے واسطے ان کے سامنے جا کر ہنسنے نہ لگنا۔ وہ میری بات سن کر چوکنا ہو گئے اور کہا خدا تمہارا بھلا کرے بڑے موقع سے تم نے ہنسی کی بات یاد دلا دی۔ اب دانش مندی اسی میں ہے کہ شاہ صاحب کا تصور کر کے یہیں سیڑھیوں میں بیٹھ جاؤں۔ وہ بیٹھ گئے اور اس زور زور سے ہنسنے لگے کہ گویا ان کو ہنسی کا ہیضہ ہو گیا ہو۔

شاہ صاحب کے خادم ابو بکر نے اپنے کوارٹر سے جب ان کا یہ عالم دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ ان پر جن آیا ہوا ہے وہ پانی بھرا ہو بدھنا لے کر ان کی طرف دوڑ پڑا۔ اور کچھ پڑھ پڑھ کر ان کے منہ پر زور زور سے چھینٹے مارنے لگا۔ اس عمل نے ان کی ہنسی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اور وہ ہنسنے کے مارے لوٹنے لگے۔ الغرض کوئی آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے کے بعد یہ بادل چھٹا اور ہنسی کا مینہ تھم گیا..... انہوں نے منہ دھو کر رومال سے پونچھا پانی پیا گہری سانس لی اور آسمان کو دیکھا۔ ٹوپی درست کی پھریری لی اور مجھ سے کہا اب چلو بڑے اطمینان سے بیٹھیں گے۔ اس قدر ہنس چکا ہوں کہ اب سال بھر تک ہنسی نہیں آئے گی۔

اب ہم وارث شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے مختار ان کے داہنے ہاتھ پر اور میں اٹے ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اور وہ انتہائی عقیدت کے



ساتھ مکالمت کرتے رہے۔ اور میں مطمئن ہو گیا کہ اب کوئی بات خلاف تہذیب نہیں ہو سکے گی۔

باتوں باتوں میں شاہ صاحب نے پوچھا مختار تمہارے والد کا مزاج کیسا ہے۔ اس سوال نے ان کے صبر و تحمل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ شاہ صاحب کے احترام کا بار پہلے ہی برداشت کیے بیٹھے تھے۔ اب شاہ صاحب کے سوال کے دوش پر ان کے باپ کا احترام بھی لا دیا اور یہ دہرا بوجھ ان سے اٹھ نہیں سکا۔ اور پہلو بدل کو انہوں نے کہا حضور..... میں سمجھ گیا کہ اب حضور کو کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے کہ میں بارہا تجربہ کر چکا تھا کہ جس طرح گالی دینے سے بیشتر ابرار مہین مہین مسکرا کر اپنی ٹوپی کج کر لیتے تھے۔ اسی طرح مختار قہقہوں سے پیشتر اپنی لائبی آواز میں حضور کہا کرتے تھے۔

شاہ صاحب نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضور کہہ کر خاموش ہو گئے ہیں پھر دریافت کیا کہ بتاؤ تمہارے والد کا مزاج کیسا ہے..... انہوں نے بھنجی سی تھر تھراتی آواز میں کہا حضور خیریت سے ہیں۔ اور ان کے شانے ہلنے لگے۔ اور شاہ صاحب کے تیور بدل گئے۔

مجھ کم بخت میں یہ بڑا عیب ہے کہ جب کوئی میرے سامنے ہنسنے لگتا ہے تو میں کسی طرح بھی ہنسی کو ضبط نہیں کر سکتا میں نے فوراً کھنکھار کر اس طرح اٹھنا چاہا گویا باہر جا کر گلا صاف کرنا چاہتا ہوں شاہ صاحب نے کہا میاں اگالداں آپ کے پیچھے رکھا ہوا ہے۔ میں نے منہ موڑ کر اس بڑے اگالداں میں اپنی ہنسی خوب جی بھر کر تھوکی اور اس قصد سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا کہ اب مرد و مختار کی طرف دیکھوں گا ہی نہیں۔

اتنے میں شاہ صاحب نے بگر کر مختار سے کہا اودھ کے شریف زادوں میں یہ کیا ناشائستگی پیدا ہو گئی ہے کہ جب ان کے والد گرامی کا مزاج پوچھا جاتا ہے تو وہ حضور کہہ کر ہنسنے لگتے ہیں۔ انہوں نے جھک کر شاہ صاحب کے قدم پکڑ لیے اور قہقہہ مار کر کہا۔ حضور میں بدتمیز نہیں ہوں۔ میرے پیر تھے دیرے شریف کے حاجی وارث علی شاہ، حضور پرسوں انہیں خواب میں دیکھا تھا جب سے بیکار بیکار برابر ہنسی آتی رہتی

ہے قاہ قاہ قاہ..... اور میں اپنی پسلیاں پکڑ کر اگال دان میں دوبارہ ہنسی تھوکنے لگا۔

شاہ صاحب نے غصہ بھری آواز میں کہا۔ مختار یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کہ تم نے اپنے پیر کو خواب میں دیکھا اور اس کا یہ اجر ہوا کہ تمہیں بیکار بیکار ہنسی آتی رہتی ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارا قلب سیاہ ہو چکا ہے۔ میں تمہیں چالیس تعویذ دوں گا انہیں چالیس دن تک گھول کر پینا اس سے جو شیطان تم پر مسلط ہو گیا ہے وہ بھاگ کھڑا ہوگا۔ مختار کے حواس بجا نہیں رہے تھے انہوں نے پھر قہقہہ مار کر کہا اے حضور ایک تعویذ کو پورے چالیس دن تک کیسے پیتا رہاں گا..... شاہ صاحب نے ڈانٹ کر کہا میں تمہیں چالیس تعویذ دوں گا تم اسے ایک سمجھ رہے ہو۔ یہ سنتے ہی مختار نے قہقہے میں دھلی چیخ مار کر مجھ سے کہا۔ ارے جوش اپنا قلم دے دے ترکیب استعمال لکھ لوں قاہ قاہ قاہ قاہ..... میں نے قلم نکالنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ ایک من کا ہو کر کاٹنے لگا۔ اور ایک زبردست قہقہہ میرا سینہ توڑ کر ہوا میں گونجنے لگا۔ اور میں یہ کہتا ہوا بھاگا کہ شاہ صاحب یہ خاکسار چلا۔ اور مختار میرے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ ارے قلم تو دے دو۔ اور اسی عالم میں ہم دونوں مسجد سے باہر آ کر مسجد کے فرش پر گر کر ماہی بے آپ کی طرح تر پنے لگے۔

چوتھا واقعہ: وہ ایک زبردست عشق کے سلسلے میں بمبئی اور بمبئی سے کلکتہ چلے گئے۔ اور وہیں پھر تجارت بھی کرنے لگے تھے۔ اور میں بھی اپنی زندگی کے سب سے زیادہ پیچیدہ عشق کو بہلانے اور بہلانے کی خاطر غالباً سنہ ۱۹۲۲ء میں کلکتہ چلا گیا تھا اور غالباً ڈھائی تین مہینہ ان کے ساتھ رہا تھا۔

میں ان کی ناقابل شرح ہنسی کے تو بہت سے واقعات دیکھ چکا تھا لیکن ان کے ناقابل فہم رونے سے وہاں جا کر دو چار ہوا تھا۔

کلکتہ میں ایک فرنگی لڑکی پر جس کا نام تھا مس میسی وہ عاشق ہو گئے تھے اور وہ اس قدر وفادار تھی کہ روز وقت نکال کر چار بجے سہ پہر سے آٹھ بجے رات تک وہ ان کے

پاس بلا ناغہ آیا کرتی تھی لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ روز اس کے آتے ہی وہ رونے لگتے تھے۔ معشوق کی بے وفائی پر تو سب روتے ہیں وہ معشوق کی وفاداری پر رو دیا کرتے تھے۔ ان کی اس روش سے ان کی محبوبہ کو بھی تعجب ہوتا تھا۔ اور تاسف بھی۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں مختار کو سمجھاؤں کہ وہ خوشی کے موقع پر رویا نہ کریں۔ میں نے انہیں سمجھایا بھی اور انہوں نے وعدہ بھی کر لیا کہ اب نہیں روئیں گے۔ لیکن جب وہ سامنے آئی اس اللہ کے بندے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ جب میں نے بہت غور کیا تو یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ چوں کہ تصوف کا جذبہ ان کو اپنے باپ سے خون میں ملا تھا اور چوں کہ صوفیا کے متعلق یہ سنا گیا ہے کہ وہ لذات شیرینی میں غم کی چاشنی ملا دیا کرتے ہیں۔ اور یہاں تک کہ لڑیڈ کھانوں میں بھی پانی کی آمیزش کر کے ان کو بدمزہ بنا دیتے تھے۔ اس لیے مختار اپنی معشوقہ کے شربت دیدار میں اپنے آنسو گھول دیتے ہیں کہ مسرت کی تیز دھار کند ہو جائے۔

وہ میرے ناقابل حل پیچیدہ عشق کو بھلانے کی خاطر اکثر کلکتے کی حسینوں کے پاس مجھ کو لے جایا کرتے تھے۔ لیکن میرے دل میں کسی کی جگہ ہی پیدا نہیں ہوتی تھی..... ایک روز وہ ایک نہایت حسین لڑکی کے کان میں کچھ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے تو وہ لڑکی میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ میں مسکرا نہ سکا۔ پھر اس نے چٹ سے میرا بوسہ لے کر میری گردن میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔ میں نے کہا میں ان بانہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس نے جھینپ کر کہا اللہ رہے لکھنؤ کی نزاکت۔ ارے میں تو مختار کا چوتھا واقعہ بیان کر رہا تھا اپنا دکھڑا

وہ دور ایسا دور تھا کہ اپنے عشق کی بنا پر میرے دل میں تل بھر جگہ بھی خالی نہیں تھی۔ ورنہ میہی کے جال کا وہ عالم تھا کہ اگر میرا دل برائے کرایہ خالی ہوتا تو میں

اسے اپنے دل میں بسالیتا۔ چلیے بہت اچھا ہوا اور نہ مختار کے سے جگری دوست سے  
تصادم ہو جاتا۔ اپنے اس عشق پر میں نے ایک انظم بھی کہی تھی جس کا ایک شعر یاد ہے۔

تیرے پانے پہ بھی نہیں راضی  
تیرے کھونے پہ بھی نہیں تیار

ہاں تو سنیے اسی زمانے میں ایک دن مختار نے مجھ سے کہا شبیر میں دنیا ترک کر کے  
اب اللہ اللہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ساری دکان فروخت کر کے اور زمینی کو اس کا روپیہ  
دے کر یح آباد چلا جاؤں گا۔ اور کا کوری شریف کے سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت کر  
لوں گا وہیں کوئی حجرہ مجھے بھی دلا دینا۔ وہاں بیٹھ کر ساری زندگی یاد الہی میں گزار دوں  
گا۔ میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ ان کے سر پر ترک دنیا کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ وہ  
نہیں مانے دکان کو غالباً ستر ہزار میں فروخت کر کے انہوں نے اپنے پاس فقط تین سو  
روپے رکھ لیے اور باقی تمام روپیہ اپنی معشوقہ کے حوالے کر دیے ہر چند وہ روپیہ قبول  
نہ کرنے اور ان سے کلمتہ نہ چھوڑنے پر اصرار کرتی رہی۔ لیکن انہوں نے اس کی بات  
نہیں مانی۔ مجھے ساتھ لے کر یح آباد سے میرے ساتھ ٹم ٹم میں سوار ہو کر کا کوری پہنچ  
گئے۔

خانقاہ کے گنبد پر نظر پڑتے ہی میں نے کہا دیکھو مختار حبیب حیدر شاہ سے ہمارے  
تمہارے تین چار پشتوں کے تعلقات ہیں اور پھر میں ان کا مرید بھی ہوں اگر ان کے  
سامنے جا کر تم نے ہنسنا شروع کر دیا تو یاد رکھو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ یہ سنتے ہی  
وہ مجھ سے لپٹ کر اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور جب ہچکیوں کا تار ٹوٹا تو  
ڈبڈباتی آنکھیں اٹھا کر انہوں نے کہا شبیر تمہارا ہنسوڑ مختار تو اب مر چکا ہے وہ اب  
جب تک جئے گا لگا تار روتا ہی رہے گا۔ اگر مرزا ہے تو پچھلے ہر رونے میں اس کے بعد  
نہایت اطمینان کے ساتھ میں ان کو حبیب حیدر شاہ کے پاس لے گیا، ان کا اور ان کے



باپ کا نام بتا کر درخواست کی کہ ان کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل فرمالیجیے۔  
 شاہ صاحب ہر شخص کو مرید نہیں بناتے تھے لیکن چوں کہ میں نے درخواست کی تھی  
 اور وہ مختار کے پورے خاندان سے بھی واقف تھے انہوں نے میری درخواست منظور  
 کر کے ان کو حکم دیا کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو۔ انہوں نے اس قدر طویل رکوع و سجود  
 اور اس درجہ اخلاص مندی کے ساتھ نماز پڑھی کہ عہد رسالت کے مسلمان یاد آگے۔  
 نماز پڑھ کر انہوں نے ان پورے روپوں کی مٹھائی منگائی جو کلکتہ کی دکان کے باقی رہ  
 گئے تھے۔ اب مال دنیا میں ان کے پاس ایک پانی بھی نہیں تھی۔

اب حبیب حیدر شاہ ان کو اپنے رو برو بٹھا کر حسب دستور قدیم ان کا ہات اپنے  
 ہاتھ میں لے کر اپنے سلسلے کے تمام بزرگوں کے نام لے لے کر ان سے یہ کہلانے  
 لگے کہ میرا یہ ہات فلاں فلاں بزرگوں کے ہاتھ پر ہے۔

غالباً تراب علی شاہ قلندر کا نام لے کر انہوں نے مختار سے کہا اب کہو یہ میرا ہات مجا  
 شاہ قلندر کے ہات پر ہے۔ مجا شاہ قلندر کا نام سنتے ہی مختار پر دفعۃً خاموشی چھا گئی۔ شاہ  
 صاحب اس خیال سے کہ ان پر رقت طاری ہو گئی ہے۔ دو منٹ کے واسطے خاموش ہو  
 گئے۔ اور جب ٹھہر کر شاہ صاحب نے پھر فرمایا ہاں تو کہو میرا یہ ہاتھ مجا شاہ قلندر کے  
 ہاتھ پر ہے تو انہوں نے پھریری سی لے کر کہا حضور۔ ان کے اس طویل الصوت حضور  
 کو سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اور سمجھ گیا کہ اب پل بھر میں کیا  
 ہونے والا ہے۔ اس لیے میں نے ٹھان لی کہ فوراً بھاگ کھڑا ہوں..... لیکن یہ سوچا کہ  
 اگر جوتے پہن کر جانے لگوں تو شاہ صاحب پوچھ بیٹھیں گے کہ میں کہاں جا رہا ہوں  
 اس لیے آؤ دیکھانٹاؤ۔

اور ایک دقیقہ ضائع کیے بغیر میں جھٹ سے اٹھا اور شاہ صاحب کی نظر بچا کر ان  
 کے بائیں ہاتھ کے برآمدے میں آ گیا اور پا کھے لگ کر چوروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ و  
 ہ برآمدہ آٹھ دس فٹ بلند تھا۔ اور جھانک کر میں نے دیکھ لیا تھا کہ بھاگ سکتا ہوں کہ

نہیں۔

اب شاہ صاحب نے فرمایا کہ مختار میاں نماز میں تاخیر ہو جائے گی۔ جلد ان منازل سے گزر جاؤ اور کہو کہ میرا ہاتھ مجا شاہ صاحب کے ہاتھ پر ہے۔

شاہ صاحب کے ہونٹوں کی جنبش ابھی ختم ہوئی تھی کہ ان کے خارا شگاف قہقہے سے خانقاہ کے تمام سقف و بام گونج اٹھے۔

شاہ صاحب نے گھبرا کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تیز تیز قدم رکھتے ہوئے مسجد چلے گئے۔

---

۱۔ تمام ناموں کے بعد حضرت علی کا نام لیا جاتا تھا۔ اور پھر بیعت مکمل ہو جاتی تھی۔

---

میں ننگے پاؤں دھم سے کود پڑا۔ اور اپنی باہر کھڑی ہوئی ٹم ٹم کی طرف بھاگا۔ ان کے قہقہے اور ان کے یہ الفاظ میرا تعاقب کرنے لگے کہ حضور ایسا نام تو کبھی سنا ہی نہیں تھا۔ اللہ اکبر مجا شاہ قلندر ہا ہا، ہا ہا، ہا ہا، ہا ہا۔ ارے شبیر کہاں غائب ہو گئے ہوارے مجھے سنبھالو دم نکال جا رہا ہے میرا اف اف مجا شاہ ارے تو بہ قاہ قاہ قاہ قاہ قاہ قاہ ہا ہا ہا۔



## قاضی خورشید احمد

ریاضی استاد، شاعر و نقاد، فارسی و سنسکرت ماہر، مکذب بدیہیات، طفل حرکات،  
اخلاق شعار، دوست نواز، دشمن ناشناس، امر و پسند، آداب شکن، سرایج الکلام آشفته مزاج،  
غریب الخصال، بظاہر بیگانہ، باطن یگانہ اور

گے بر طارم اعلیٰ نشینم  
گے بر پشت پائے خود نہ بینم

قسم کے ایسے سنی انسان تھے کہ جن کو نفسیات کے ماہر غور و فکر کا ایک اہم موضوع بنا  
سکتے تھے۔ ان کے سے کثیر الجہات ادبی کے تمام خصوصیات اور گفتنی ناگفتنی حالات  
پر اگر تفصیل کے ساتھ قلم اٹھاؤں تو ایک دفتر ہو جائے..... لیکن چونکہ میں بڑی تیزی  
کے ساتھ غروب ہو رہا ہوں اور اس جھٹپٹے میں اتنا وقت نہیں نکال سکتا، اس لیے ان کی  
زندگی کے چند ہی پہلوؤں پر لکھ سکوں گا۔

وہ جھانسی اٹا وہ اور الہ آباد کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء  
الدین کے بعد مسلمانوں میں ریاضی کے سب سے بڑے ماہر تھے..... ریاضی دانوں  
کو بالعموم ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ دریائے ادب کے بھی پیراک  
اور اس قدر زود گو شاعر تھے کہ جب کبھی ان کے کالج میں کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ ایک  
نشت

.....  
۱۔ قصبہ قہونہ ضلع سیتاپور کے باشندے تھے۔

.....  
میں ہزار ہزار پندرہ سو شعر کہہ کر کالج کے لڑکوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ Mass Production یعنی وافر پیداواری تلکثر آفرینی یا انبار  
ابداعی میں بڑھیا مال تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی ان کی غزلوں میں کبھی کبھی اچھے شعر

بھی جھلک اٹھا کرتے تھے۔

شاعری کے سلسلے میں وہ دوبار مجھ سے بگڑ بھی گئے تھے پہلی بار تو شفق پر میری نظم سن کر انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں جلدی جلدی کہا تھا..... یہ مناظر کی شاعری انگریزوں کو مبارک ہو مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انگریزی پرھ کر آپ نے اپنی شاعری خراب کر ڈالی ہے۔ بالکل خراب اور دوسری بار میری ایک فارسی غزل مسلسل کو سن کر انہوں نے کہا تھا کہ آپ مہربانی فرما کر ایران تشریف لے جائیں۔ ایران آپ کو مطلق اردو نہیں آتی مطلق مطلق نہیں آتی۔ ہر چند میں نے اپنا اب تک کوئی تخلص تجویز نہیں کیا تھا اس کے باوجود آپ سے بہتر کہیں بہتر شعر کہتا ہوں۔

اس پر میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا ارے قاضی خدا کے لیے تخلص نہ رکھ لینا ورنہ میں تو خاک میں مل کر رہ جاؤں گا۔

اب ان کے انتقاد کی شان بھی دیکھ لیجئے ان کو جب یہ شعر سنایا گیا

کبھی اے حقیقت منظر نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو انہوں نے زور سے منہ جھٹک کر کہا لا حول بھلا یہ بھی کوئی شعر ہے شاعر صاحب

اللہ تعالیٰ سے فرما رہے ہیں کہ ہر چند میرے ماتھے پر ہزاروں سجدے پھدک رہے

ہیں لیکن جب تک تو اطلاق و تنزیہ کے دائرے سے نکل کر چھپن چھری یعنی جانکی بانی آ

ف الہ آباد کے لباس میں انگیا کرتی پہن کر نہیں آئے گا میں تیری بارگاہ میں ایک سجدہ

بھی نہیں کروں گا اس سے زیادہ مادہ پرستی اور اہانت الہی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا.....

اس کے بعد انہوں نے کہا مجھے اس غزل کے دو شعر یاد آ گئے ذرا ان کو بھی پرکھ کر دیکھ

لیجئے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی

مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں



اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر نے جس قدر بھی اودے نیلے پیلے سفید اور دھانی گناہ کیے تھے وہ جب عفو بندہ نواز کے تنبو کے دروازے پر پناہ مانگنے آئے تو انہیں بھگا دیا گیا لیکن شاعر صاحب کے جب حبشیوں کی طرح کالے کلوٹے گناہوں نے درخواست کی تو انہیں فوراً پناہ دے دی گئی۔

کاش کوئی اللہ میاں سے جا کر یہ پوچھے کہ آپ کو انسان کے حبشی گناہوں پر کیوں پیارا آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس شعر کے پہلے مصرعے میں جہاں کاللفظ انتہائی خشوع ہے۔

اب دوسرا شعر دیکھیے

کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا  
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں  
پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ عراقی کے شعر کا پرتو ہے

بحرم جو سجدہ کردم زحرم ندا برآمد  
کہ مرا خراب کر دی تو بسجدہ ریائی

اور دوسری بات یہ ہے کہ مصرعہ اول کے جزو اول یعنی کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا میں ایک ایسی فحاشی اور بدتمیزی کی گئی ہے کہ جس کو میں زبان پر نہیں لاسکتا۔ تو بہ تو بہ کھڑا ہوا

ایسی فحاشی معاذ اللہ

ایک روز میں نے ان کو اپنا ایک مطلع سنایا

حرم کو جاتا ہے کچھ دل سے ساز کرتا جا  
طواف کعبہ حسن مجاز کرتا جا

انہوں نے منہ بنا کر کہا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر ہندوستان کی سکونت ترک فرما کر ایران تشریف لے جائیں جی ہاں

ایران ایران ایران تشریف لے جائیں۔ اور وہاں جا کر طواف کعبہ حسن مجاز کی فارسی خوب بگھارتے پھریں۔ اس کے علاوہ مصرے میں جاتا کا الف گر رہا ہے۔ ہر چند قدما کے نزدیک حروف اصلی کے سوا اور تمام حروف گرائے جاسکتے ہیں۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ اس طرح اسقاط حروف سے شعر کی موسیقی خراب ہو جاتی ہے اور ایک عیب اس شعر میں اور بھی ہے کہ طواف کرنا فصیح زبان ہے آپ نے پہلے طواف اور بعد کو کرتا جا کہہ کر اس قدر تعقید پیدا کر دی ہے کہ شعر کا سارا مزا کر کر اہو گیا ہے اور ایک بڑی نازک بات اور کہتا ہوں آپ نے طواف میں اضافت کا دم چھلا لگا کر طواف کرتا جا کو ظوائف کرتا جا کی آواز میں مبدل کر دیا ہے۔ جو صحیح ہونے کے بعد سراسر مکروہ ہے۔

ان کی ہیئت کچھ ایسی عجیب تھی کہ جب کسی اجنبی کی طرف نگاہ ان کی طرف اٹھ جاتی تھی تو وہ بھونچکا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ ان کا قد لانا تھا رنگ سنا نولا منہ پر ایک عجیب سی فرنیچ کٹ داڑھی تھی۔ آنکھوں پر بھیانک سی عینک ان کی ترکی ٹوپی ان کے ماتھے پر اپنے پھند نے کی سوئڈ ہلایا کرتی تھی۔ کسی سے گفتگو کرتے تھے تو انکا لعاب ارار کر سامع کے منہ پر آیا کرتا تھا۔ اور آواز کے ایسے متسل جھونکوں اور الفاظ کی ایسی مسلسل تکراروں کے ساتھ گھبرا گھبرا کر جلدی جلدی باتیں کیا کرتے تھے کہ گویا گھانس کاٹنے کی مشین چل رہی ہے۔ یہ بھی ان کی ایک خاص ادا تھی کہ وہ اپنے دوستوں کی ہر بات کے ابطال ہر ہر وقت تلے رہتے تھے۔

ہر چند وہ آب حیات کی زبان کے خود بڑے معترف تھے۔ لیکن ایک روز جبکہ میں ان کے وہاں مہمان تھا۔ اور کسی صاحب نے ان کے روبرو آب حیات کی زبان کی تعریف کی تھی تو انہوں نے حسب عادت ان کی اس رائے کا ابطال کرتے ہوئے کہا تھا کہ محمد حسین آزاد کو تو زبان کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ وہ تو بالکل ہی بوڑھا آدمی تھے۔ اور جب کسی نے ان کے روبرو میرزا غالب کے باب میں یہ کہا تھا کہ غالب ہماری زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا تو انہوں نے بڑی برہمی سے کہا تھا کہ اجی غالب وہ حضرت تو

فارسی میں سوچتے اور اردو میں شعر فرماتے تھے لاجول ولاقوت۔

ان کے ابطال کی یہ لے یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ بدیہیات تک کی تکذیب پر اتر آتے تھے مثلاً ان سے اگر کوئی شدت سرما کی شکایت کرتا تھا تو وہ کہا کرتے تھے اجی سردی وردی کیسی شاید آپ نے کسی اخبار میں پڑھ لیا ہے کہ سردی پڑ رہی ہے سردی کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنی بات بھول کر کہنے لگتے کہ یار آج تو بڑی سردی پڑ رہی ہے کہ دانت بج رہے ہیں۔

ان میں ساری دنیا سے جدا ایک ایسی بات تھی کہ جو ان کے سوا میں نے اس دنیا کے کسی آدمی میں آج تک نہیں پائی ہے۔ اور وہ بات یہ تھی کہ جب ان کا کوئی کچھڑا ہوا دوست برسوں کے بعد بھی ان سے ملنے آتا تھا تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے دوڑ کر گلے لگانا خواہ کہہ کر خیر مقدم کرنا یا مزاج پوچھنا۔ یہ ساری باتیں ان کے معمولات سے یکسر خارج تھیں۔ اور برسوں کا کچھڑا چہیتا دوست بھی جب ان کے گھر جاتا تھا تو وہ اس کو اس طرح دیکھتے تھے گویا وہ ایک گھنٹہ پیشتر ان کے پاس بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ اور اب دوبارہ آگیا ہے۔

گلے ہاتھوں ان کی سنک کے بھی چند واقعات سن لیجیے ایک بار کوئی پانچ چھ برس کے بعد میں ان سے ملنے جھانسی گیا دیکھا کہ وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا قاضی صاحب آداب انہوں نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں اور بری سپاٹ سی اواز سلام کا جاب دے کر پھر لکھنے میں غرق ہو گئے۔ دوسرا ہوتا تو بگڑ جاتا کہ انہوں نے میری آمد ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ میں ان کا مزاج شناس تھا میں نے برا نہیں مانا اور وہ برابر لکھتے رہے۔

جب لکھ چکے تو میری طرف نگاہ اٹھا کے کہا۔ جوش میاں ہم ایک معمر حل کر رہے ہیں میں نے کہا چلو اچھا ہوا کہ معمر حل کر لیا۔ اب یہ بتاؤ مزاج کیسا ہے؟ میری مزاج پر سی ان پر بہت گراں گزری انہوں نے اپنے ایک دوست سے جو میرے آنے سے

پیشتر وہاں موجود تھے میری جانب اشارہ کر کے کہا آپ جانتے ہیں ان کو؟ یہ ہیں حضرت جوش ملیح آبادی ان کے دوست ہڑا کر مصافحے کے لیے اٹھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا نہیں نہیں ان سے ہرگز مصافحہ نہ کیجیے ہر چند یہ میرے بہت ہی پرانے یار ہیں مگر آتے آتے انہوں نے مزاج پر سی کے ذریعہ مجھ پر وار کر دیا ہے۔ میں نے کہا ارے قاضی وار کیسا؟ یہ کیا بک رہا ہے انہوں نے کہا کئی روز سے میری طبیعت خراب تھی۔ آج ارادہ کر چکا تھا کہ جلاب ضرور پیوں گا لیکن معمرہ حل کرنے میں جلاب پینا ہی نہیں یہ بات ہی بھول گیا تھا کہ میری طبیعت کئی روز سے خراب ہے۔ اور اس بھول کی بنا پر ناشتہ منگوانے ہی والا تھا کہ تم نے مزاج پر سی کر کے یہ بات یاد دلادی کہ میری طبیعت کئی روز سے خراب ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے آ کر میرا ناشتہ روک کر مجھ کو جلاب پینے پر مجبور کر دیا یہ ہے تمہاری دوستی اب تم مزے سے ناشتہ کرو گے اور میں کم بخت رو کر جلاب پیوں گا۔

ابھی یہ سنک چل ہی رہی تھی کہ ایک نہایت خوش رونو جوان اعلیٰ درجہ کا سوت پہنے آیا اور انہیں سلام کر کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس خوبرونو جوان کو اپنی داڑھی کھجا کھجا کر گھورنے لگے اور ایسا لگا کہ جیسے وہ کوئی بات یاد کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جب انہوں نے اس کو بار بار گھورا اور داڑھی کھجائی تو میں نے کہا گھورے ہی چلے جاؤ گے یا کوئی بات بھی کرو گے۔ انہوں نے کہا جوش میاں! اس سے تمہیں کیا غرض کیا غرض کیا غرض میں تو ان نو جوان سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں میں نے کہا پھر پوچھتے کیوں نہیں انہوں نے سہ بارہ داڑھی کھجا کر اس نو جوان سے کہا میاں صاحبزادے ہمارا حافظہ بالکل بالکل بالکل خراب ہو چکا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کبھی آپ کو استعمال میں لائے ہیں کہ نہیں؟

یہ سن کر وہ نو جوان نہایت غصہ میں بھرا اٹھا اور بڑے کھڑا کے سے کرسی پیچھے دھکیل دی اور بڑے زور سے کھٹ کھٹ کرتا زینہ سے اتر گیا۔



اس کے جاتے ہی انہوں نے کہا کہ اگر یہ کسی شریف خاندان کا آدمی ہوتا تو اس  
سنجیدہ بات پر بھی نہ بگڑتا۔ ہونہ ہو یہ بدقوما ہے بدقوما ہے بدقوما..... سال بدقوما کہیں کا  
ہونہ۔

ایک روز ایک نوشق و نوجوان شاعر نے ان سے فرمائش کی کہ وہ نہیں ایک سہرا کہہ  
کر دیں جس کو وہ کسی رئیس لر کے کی شادی پر پڑھیں گے۔ اور ان غریب

قاضی نے بڑے عریاں الفاظ میں پوچھا تھا میں نے اسے کسی قدر شائستگی کے  
سانچے میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔

کو کچھ مل جائے گا۔ انہوں نے کہا بہت اچھا میں بہت تڑکے فن سخن کرتا ہوں،  
آپ کل ٹھیک آٹھ بجے آجائے گا۔ سہرا تیار ملے گا۔ تیار ملے گا ان بیچارے شاعر کی  
شامت اعمال کہ وہ صبح چھ بجے ہی آگئے۔ انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ میں نے  
تو آپ کو آٹھ بجے بلایا تھا۔ شاعر بے چارے نے دانت نکال کر کہا میرا جی چاہا کہ  
یاد دہانی کر دوں انہوں نے بگڑ کر کہا یاد دہانی یاد دہانی یاد دہانی تو جھوٹوں کو کرائی جاتی  
ہے آپ نے مجھے جھوٹا سمجھا جھوٹا جھوٹا یہ کہتے ہی انہوں نے وہ پرچہ جس پر وہ  
سہرے کے چند اشعار لکھ چکے تھے چاک کر کے فرش پر پھینک دیا۔ اور شاعر ماتھا پیٹتا  
ہوا چلا گیا۔

ایک روز میں ان کو اپنے ساتھ موٹر میں لیے باغ عامہ جا رہا تھا کہ چوراہے پر  
میرے ایک مولانا قسم کے دوست نے موٹر ٹھہرانے کا اشارہ کیا۔ میں نے موٹر روک  
لی۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا ایں موٹر کیوں روک لی۔ میں نے مولانا کی طرف اشارہ  
کر کے کہا آپ کے ایما سے قاضی صاحب نے مجھ سے ان کا نام پوچھا میں نے کہا  
مولانا عبدالعزیز انہوں نے کہا مولانا عبدالعزیز ہٹ جائے ہٹ جائے ہٹ جائے

ہمارے پروگرام میں یہ بات داخل نہیں تھی کہ ہم اس چوراہے پر آپ کے لیے موٹر روک دیں گے۔ جائے جائے اور پھر مجھ سے کہا۔ فوراً موٹر سٹارٹ کر دو ورنہ میں اتر جاؤں گا میں نے موٹر اسٹارٹ کر دی اور مولانا بے چارے منہ دیکھتے رہ گئے۔

ایک بار میں ان کے وہاں جھانسی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح کو انہوں نے مجھ سے پوچھا جوش میاں میرے ساتھ کالج چلو گے کالج کالج کالج؟ میں نے کہا ضرور چلوں گا انہوں نے ملازم کو پکار کر کہا ناشتہ لاؤ ناشتہ لاؤ ناشتہ۔

جب ناشتہ چن دیا گیا تو ان کے یہاں جو ایک دوسرے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے وہ بھی دسترخوان پر آ کر بیٹھ گئے ان کے بیٹھتے ہی انہوں نے کہا نہیں نہیں آپ کا ناشتہ بعد کو آئے گا بعد کو بعد کو یہ فقط کالج کالج کالج جانے والوں کا ناشتہ ہے۔ اور وہ پانی پانی ہو کر دسترخوان سے اٹھ گئے۔

ایک روز میں ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اثنائے طعام میں انہوں نے مجھ سے کہا جوش میاں تمہاری یہ برکت ہے کہ آج خالص گھی کا کھانا کھا رہا ہوں۔ ورنہ چھ مہینے سے شبیرہ! مجھ کو تیل ملا کھلا کھلا کر مارے ڈال رہا تھا۔ اور جب کھانا ختم ہو گیا تو شبیرہ نے قہقہہ مار کر مجھ سے کہا پورے چھ مہینے سے اعلیٰ سے اعلیٰ گھی لالا کر پکوا رہا تھا ہر بار قاضی صاحب یہی شکایت کرتے تھے کہ ان کو تیل کھلا کھلا کر مارے ڈال رہا ہوں اور آج جب کہ میں نے تیل میں کھانا پکویا ہے تو قاضی صاحب اس کو خالص گھی کہہ رہے ہیں۔

ایک بار کچھ ایرانی مذاق کے شکایات سے متاثر ہو کر محکمہ تعلیمات نے ان کو پرنسپل کے عہدے سے ہٹا کر وائس پرنسپل بنا دیا لیکن تنخواہ وہی پرنسپل والی رکھی۔ انہوں نے اس خوشی میں کہ وائس پرنسپل بن کر ان کی ذمہ داریاں تو بہ کم ہو گئیں لیکن تنخواہ میں کمی نہیں ہوئی بڑی دھوم سے ہم لوگوں کی دعوت کی کھانا زیادہ تھا اور برتن کم تھے۔ اور جب ان کے سالے نے کہا پلاؤ کا ہے میں دیں برتن تو باقی نہیں رہے تو انہوں نے کہا

کوئی بات نہیں چارپانچ کموڈراکھ سے دھلوا کر لے آؤ۔ میں نے کہا گھانس کھا گیا ہے قاضی اے کموڈ میں پلاؤ کھلوائے گا۔ انہوں نے بگڑ کر کہا بس پتا چل گیا کہ تم ہو کیا بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے ہو۔ تم سالے سو فی صدی بورژوا ہو بورژوا ہو بورژوا ہو۔ اس بات پر تمام مہمانوں نے کہا قاضی صاحب۔ فقط جوش صاحب ہی نہیں ہم سب کے سب بورژوا ہیں بورژوا۔ ہم میں سے کوئی بھی کموڈ میں نہیں کھائے گا انہوں نے کہا جہنم میں جاؤ تم سب بورژوا ہو اور وہ کموڈ میں پلاؤ کھانے لگے۔

لکھنوکا ذکر ہے ایک بار حکیم آشفۃ کی جو شامت آئی تو انہوں نے ایک رفاہ عام کے ایک بہت بڑے جلسے کا قاضی کو صدر بنا دیا۔ اور جب ہال کھچا کھچ بھر گیا تو وہ صدارتی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے شاعری کی ماہیت بیان کی پھر فارسی عربی سنسکرت اور انگریزی شعراء کے کلام پر سرسری سا تبصرہ کیا۔ اور بات جب اردو غزل تک آئی تو انہوں نے کہا پچانوے فی صد غزل گو نہ کسی پر عاشق ہوتے ہیں نہ رندی کے طریقوں سے واقف ہوتے ہیں۔ نہ شراب پیتے ہیں اور نہ بے دین ہی ہوتے ہیں مگر ان سب

ان کے سالے کا نام

کی غزلوں کا مدار ہوتا ہے عاشقی رندی شراب خوری اور کافری پر ان کی تمام شاعری فقط روایتی ہوتی ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے سارے غزل گو چوتے ہوتے ہیں۔ چوتے چوتے چوتے۔ اور دس منٹ کے اندر تمام بھرا ہوا ہال خالی ہو کر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

ان کی ایک انوکھی جنگ سننے سے پیشتر یہ بات ذہن نشین فرما لیجیے کہ وہ اپنے جنسی مسائل کو ایک نہایت مقدس فریضہ انسانی سمجھتے تھے۔ اگر ان کے اس ایرانی مذاق کے

خلاف کوئی ایک کلمہ بھی زبان سے نکالتا اس میں استہزاء کا کوئی پہلو پیدا کرتا تھا تو وہ اس کو مداخلت فی الدین سمجھ کر جامے سے باہر ہو جاتے تھے۔

یہ سمجھ لینے کے بعد اب سنیے کہ شام کا وقت تھا وہ اپنے لاٹوش رو دو الے مکان کی مہتابی پر میرے ساتھ بیٹھے بادہ خواری کا شغل کر رہے تھے کہ رفیع احمد خاں آگئے اور چھوٹے ہی پوچھنے لگے قاضی صاحب اب کبھی انفعالیات کو بھی جی چاہتا ہے کہ نہیں انہوں نے بری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا..... بے شک کبھی کبھی ضرور جی چاہتا ہے کہ اس چیز کو بھی برت کر دیکھوں۔ رفیع نے کہا تو پھر بسم اللہ کیجیے انہوں نے جواب دیا کہ فقط دو چیزیں مانع ہیں ایک تو تکلیف دوسرے سکینڈل (رسوائی) اور جب رفیع نے ان دونوں کا حل پیش کر دیا تو انہوں نے کہا اگر آپ اس کا ذمہ لیتے ہیں تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں۔ ان کی اس آمادگی پر رفیع کا قہقہہ نکل گیا۔ کہہ چکا ہوں کہ ان معاملات میں استہزاء کو قطعی طور پر مداخلت فی الدین سمجھتے تھے۔ اس لیے رفیع کے قہقہے پر وہ جامے سے باہر ہو گئے اور کہا پہلے اپنی..... خانم کا چال چلن درست کیجیے پھر مجھ پر ہنسیے گا۔

رفیع پٹھان تھے یہ سن کر آگ بگولا ہو گئے اور رٹ سے ان کو ماں کی گالی دے دی۔ قاضی نے گالی سنتے ہی اپنا سیدھا ہاتھ بلند کر کے کہا غلط در غلط۔ جوش میاں غور کرو انہوں نے مجھ کو گالی دی مجھ کو مطلق غصہ نہیں آیا۔ اس لیے کہ گالی شدت غضب کی ایک مہمل سی آواز کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اور ان کو میری بات پر غصہ آ گیا اس لیے کہ وہ بات فیکٹ (حقیقت) ہے اور سچی بات پر لوگوں کو غصہ آ جاتا ہے۔

رفیع نے پھر با آواز بلند ان کو ایک موٹی سی گالی دی انہوں نے پھر اپنا سیدھا ہاتھ بلند کر کے کہا غلط در غلط جوش میاں مہملیت ان کی طرف ہے اور واقعیت میری طرف اس لیے میں ان کی بات کا برا نہیں مان رہا ہوں۔ اور یہ انکارے کی طرح دہکتے چلے جا رہے ہیں۔ رفیع ان کے اس طرز عمل سے سخت الجھن میں پڑ گئے۔ کہ وہ مجھے حملہ



کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی ذہنی کوفت بھانپ کو میں نے ان کو وہاں سے اٹھا کر زبردستی نیچے لایا اور جب ہم دونوں سڑک پر آ گئے تو دیکھا کہ قاضی صاحب اوپر سے جھانک رہے ہیں اور چاندنی رات میں ان کی فرنیچ کٹ داڑھی کا عکس زمین پر پڑ رہا ہے۔ ابھی ہم دو قدم ہی چلے تھے کہ اوپر سے ان کی آواز آئی خاں صاحب اپنی..... خانم کا چال چلن درست کر لیجئے پھر مجھ پر ہنسیے گا۔ رفیع نے منہ اٹھا کر کہا اے تیری تو ماں کی..... اور انہوں نے کوٹھے سے کہا غلط در غلط..... اور جب میں غصہ سے کانپتے رفیع کو گھر پہنچا کر پلٹا تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وہ جنگ جس کے ایک سرے پر ماں کی گالی تھی اور دوسرے سرے پر غلط در غلط کے نعرے تھے خون خچر کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

قاضی صاحب میں سنجیدگی اور مجلسی تہذیب کی مطلق صلاحیت نہیں تھی اور اس کرہ ارض پر انہوں نے اس طرح زندگی کا ت دی جس طرح لڑکے بورڈنگ میں رہا کرتے ہیں میرے اس قول کی تصدیق مندرجہ ذیل واقعہ سے حرف بحرف ہو جائے گی۔

ایک بار انہوں نے جبکہ حیدر آباد دکن میں وہ میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے مجھ پر فرمائش کی کہ میں ان کو مہاراجہ کشن پرشاد صاحب سے ملا دوں۔ میں نے کہا قاضی تم دونوں بس بعد مشرقین ہے۔ تم اول جلول مطلق العنان اور آزاد و انسان ہو اور مہاراجہ کا بہر بن مو تہذیب کے آئین و آداب میں گندھا ہوا ہے۔ وہ مشرقی وضع داری کے سب سے برے علم بردار ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ست سے متجاوز ہے۔ لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود کیا مجلس کہ مجلس میں وہ صوفے سے پیٹھ لگا کر یا پاؤں پاؤں رکھ کر یا ٹوپی اتار کر بیٹھ جائیں۔ یہ سنا تو انہوں نے کہا کیا میں کوئی کنجڑ اقصائی دھنیا جلاہا ہوں کہ تم مجھے ان سے ملنے کے قابل نہیں سمجھتے ہو میں ہندوستان جنت نشان کا باشندہ ہوں۔ افریقہ کا رہنے والا نہیں مشرقی تہذیب تو میرے گھر کی لونڈی ہے تم خچو ہو تم نے

مجھے سمجھ کیا رکھا ہے میں نے کہا اچھا بھائی نہیں مانتے ہو تو کل ملا دوں گا۔ دوسرے دن مہاراجہ کے دربار کے آداب سلام و اسالیب نشست برخواست سے ان کو بخوبی آگاہ کے انہیں مہاراجہ کے پاس لیے گیا۔

مہاراجہ کا سامنا ہوتے ہی انہوں نے السلام علیکم کا پتھر کھینچ مارا۔ تمام دربار میں حیرت کی لہر دوڑ گئی اور میں نے دل ہی دل میں کہا وہ مارا۔

مہاراجہ نے پوچھا قاضی صاحب کیا آپ پہلی بار حیدر آباد تشریف لائے ہیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں پہلی بار بالکل پہلی بار بالکل پہلی بار۔ مہاراجہ نے پوچھا دکن کو آپ نے کیسا پایا؟ قاضی نے کہا لا حول و لا قوۃ یہاں کے لوگوں کو اردو نہیں آتی۔ بالکل اردو نہیں آتی ریل سے اترتے ہی تارگھر پر میری نظر پڑی دیکھا کہ اس کے بورڈ پر تاریں لکھا ہوا ہے۔ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ تار مذکر ہے۔ اسمائے مذکر کی جمع اس طور سے بن ہی نہیں سکتی اور پرسوں ایک صاحب جوش میاں سے خان ساماں کو لے کر آنے کا وعدہ کر گئے تھے سو آج تک وہ پالت کر نہیں آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے آدمی پر لے درجے کے جھوٹے ہیں جھوٹے جھوٹے جھوٹے ہیں۔

اہل ربار میں یہ سن کر حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور مہاراجہ کے چہرے پر انفعال مچلنے لگا۔ لوگوں نے آنکھوں آنکھوں میں پوچھا کہ یہ کیسا جناور پکڑ لائے ہو۔ میں نے آنکھیں جھکالیں۔

مہاراجہ کی تہذیب دیکھیے کہ ان کے منہ پر ان کے وطن کو اور وہ بھی برسر دربار و علی روس الاشہاد برا بھلا کہا گیا لیکن ہر چند ان کے چہرے پر تو پشیمانی کا رنگ دوڑا مگر زبان سے اف تک نہیں کی۔

قاضی کی اس براں گفتاری کو ضبط کرنے میں دو تین منٹ لگ گئے مہاراجہ کو۔ اور انہوں نے اپنی خوش خلقی کا سہارا لے کر مجھ سے کہا..... جوش صاحب آپ کی زبانی یہ معلوم کر کے کہ قاضی فقط ریاضی داں نہیں شاعر بھی ہیں مجھے اشتیاق پیدا ہو گیا ہے کہ

ان کے کلام سے بہرہ اندوز ہوں۔ قاضی نے کہا نہیں نہیں مجھے اپنا کلام یاد نہیں۔  
 مطلق مطلق یاد نہیں۔ یہ کہہ کر قاضی نے اپنا سیدھا ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیا۔ اور بار  
 بار انگلیاں اٹھا اٹھا کر اور جھکا جھکا کر کہنا شروع کیا۔ آپ کچھ سنائیں سنائیں  
 سنائیں۔ آپ کچھ سنائیں۔ ان کی اس لونڈوں کی سی حرکت پر میں عرق عرق ہو کر رہ  
 گیا دل میں سوچا کہ دنیا میں کلام سنانے کی اس طرح بھی فرمائش کی جاتی ہے۔ مگر اللہ  
 ری مہاراجہ کی خوش خلقی اس ادائے فرمائش کو بھی پی گئے۔ اپنی بیاض منگائی کہا کہ میں  
 کس سے بیحد گلو گرفتہ ہوں جوش صاحب اپ کوئی غزل اس بیاض میں سے سنا  
 دیں۔

ہر چند قاضی کی حرکتوں سے میں دریائے شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا پھر بھی موڈ پر  
 قابو پا کر میں نے مہاراجہ کی دو غزلیں قاضی کو سنا دیں۔ انہوں نے اپنی میز پر اپنی ٹوپی  
 پٹک کر کہا میاں جوش بہت غنیمت مہاراج نہ دہلوی نہ لکھنوی لیکن اچھے شعر کہتے ہیں۔  
 اور وہ بھی ہندو ہو کر ہندو ہو کر قاض صاحب کے اس ریمارک سے مجھ پر اور پورے  
 دربار پر بجلی سی گر گئی۔ ہر طرف ایک سناتا چھا گیا اتنے میں سونے پر سہا گا وہ ٹوپی اتار  
 کر پھینک ہی چکے تھے اب انہوں نے پاؤں پر پاؤں رکھ لیا۔ اور جب میں نے آنکھ  
 بچا کر ان کو ٹھوکا دیا تو وہ حسبِ عادی قدیم اوں اوں اوں کرنے لگے۔ اب وہاں  
 بیٹھا رہنا میرے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے مہاراجہ سے جھپے ہوئے  
 چہرے جھکی ہوئی آنکھوں اور رندھی ہوئی آواز میں رخصت کی اجازت طلب کی اور  
 رندھی ہوئی آواز میں ڈوبتے ہوئے دل اور لرکھڑاتے ہوئے پاؤں کے ساتھ نیچے آ  
 گیا۔ اور آنکھوں کا یہ عالم تھا کہ جب میں نے اپنی موٹر کی طرف نگاہ اٹھائی تو ایسا  
 معلوم ہوا کہ اس پر دھواں سا چھایا ہوا ہے۔ میں بصد ہزار دشواری موٹر کا دروازہ کھول  
 کر ایک کراہ کے ساتھ گدی پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ ابھی گاڑی سٹارٹ کروں ورنہ  
 کہیں ٹکر کرادوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک چوب دار ہانپتا ہوا

آیا اور کہا سرکاری دفتر مار ہے ہیں یہ سنتے ہی جی سن سے ہو کر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مہاراجہ کو کس طرح منہ دکھاؤں گا۔ میٹرھیوں پر من من بھر کے قدموں سے چڑھا اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ اپنے کو نہیں پانچ ہاتھیوں کو زینے پر چڑھا رہا ہوں۔

جھکے سر اور بوجھل پوٹوں کے ساتھ جب مہاراجہ ک پاس گیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا کل رات آپ اور قاضی صاحب یہیں ماحضر تناول فرمائیں گے۔

میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر کہا مہاراج مجھ کو آپ کی اس سنت جاریہ کا علم ہے۔ کہ جب کوئی نیاز مند اپنے مہمان کو آپ کی خدمت میں لاتا ہے تو آپ اس کی میزبانی فرماتے ہیں..... لیکن میری یہ استدعا ہے..... میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ مہاراجہ نے جلدی سے میری بات کات کر فرمایا جوش صاحب آپ ہرگز شرمندہ نہ ہوں میں قاضی صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں اس لیے کہ اس قیامت کا بے لوث نڈر بے جھک اور صاف گو انسان آج ک میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اور یہ وہ پہلے شخص ہیں جن کو تہذیب ریاکار بنانے میں ناکام ہو گئی ہے۔ مہاراجہ کی ان باتوں سے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور ان کی دعوت منظور کر کے گھر آ گیا۔

گھر آ کر میں نے قاضی سے شکایت کی۔ وہ اٹے مجھ پر برس پڑے اور کہنے لگے کہ اب تم نواب فقیر محمد خاں بہادر کے پوتے نہیں جملی پیادے بن کر رہ گئے ہوں۔ تمہاری رگ و پے میں غلامی سرایت کر گئی ہے۔ میں نے کہا قاضی اگر تہذیب کی نگہ داری غلامی ہے تو میں غلام میری سات پشتیں غلام۔

انہوں نے کہا اگر تم مناسب نہ سمجھو تو میں کل مہاراجہ کے پاس نہ جاؤں۔ میں نے کہا جانا تو پڑے گا لیکن یہ وعدہ کرو کہ کل شروع سے آخر تک خاموش رہو گئے انہوں نے کہا بہت اچھا آپ کی محبت میں اسے بھی گوارا کر لیں گے۔ اور حضرت چپ شاہ قلندر چپ شاہ قلندر بنے بیٹھے رہیں گے۔

دوسرے دن جب ہم مہاراجہ کا زینہ طے کر رہے تھے تو انہوں نے کہا سنتا ہوں



ارباب دکن چپاتی نہیں کھاتے چاول کھاتے ہیں میں نے کہا بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے؛ لیکن شان دار دعوتوں میں چپاتیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر چپاتیاں نہ ہوں تو بھیا اعتراض نہ کر بیٹھنا۔ انہوں نے کہا ہم تو چپ شاہ قلندر بنے رہنے کا وعدہ کر کے آئے ہیں۔

جب ہم کھانے کی میز پر آئے سامنے بیٹھ گئے تو پلیٹیں گردش کرنے لگیں۔ اور چپاتیاں بھی قاب میں لا کر سامنے رکھ دی گئیں۔ چپاتیوں کو دیکھتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا ارے چپاتیاں آگئیں میں نے آنکھوں آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ چپ ہو گئے۔

اتنے میں کوفتوں کی ڈش آگئی انہوں نے گن کر پانچ کوفتے اپنی پلیٹ میں رکھ لیے۔ کوفتہ چکھ کر خوش ہو گئے اور یہ کہہ کر کہ جوش میاں چکھ کر دیکھو کس مزے کا کوفتہ ہے۔ ایک کوفتہ میری جانب لڑھکا دیا۔ وہ سفید میز پوش پر ایک پیلی سی لیکر ڈالتا میرے ہاتھ سے آکر ٹکرا گیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا گویا مجھ پر بم پھٹ پڑا ہے۔

جب کھانا ختم ہو گیا تو ایسا لگا کہ میں نے کھانا نہیں کھایا بلکہ کھانا مجھ کو کھا کر رخصت ہو گیا ہے۔

اب ہم سب رقص و سرود کے جگمگاتے کمرے میں آگئے تمام حاضرین مہاراجہ سمیت دوزانو بیٹھ گئے۔ میں نے کہا قاضی دوزانو بیٹھنا ہوگا۔ انہوں نے برے اکراہ کے ساتھ کہا تمہاری محبت میں یہ بھی بھگت لیں گے۔ اب گانا شروع ہو گیا اور تانیں ہوا میں بل کھانے لگیں..... تھوڑی دیر میں قاضی نے میرے کان میں کہا دم اکلا جا رہا ہے دوزانو بیٹھنے سے۔ میں نے کہا برآمدے کے صوفے پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ قاضی نے زور سے کہا وہاں سے رنڈی نظر نہیں آئے گی۔ تمام محفل میں یہ فقرا گونج اٹھا اور وہ بڑے اطمینان سے پلٹھی مار کر بیٹھ گئے۔ ان کی اس حرکت پر لوگوں کی نظریں اتھ گئیں۔ میں نے آنکھیں جھپکالیں انہیں ٹھوکا دیا دوزانو بیٹھ جائیں مگر وہ حسب عادت پھراؤں اوں اوں اوں کرنے لگے۔

گانے والیوں میں ایک برس پندرہ یا سولہ کاسن والی ایسی حسین لونڈیا تھی کہ میرا دل اس پر لہلوٹ ہو کر رہ گیا تھا اور آخر کار اس کے دل کو میں نے جیت لیا تھا۔ کیوں کہ وہ سیادتو کسی صید پر تو سن ڈالے صید جب خود ہی چلے آتے ہوں گردن ڈالے۔

اور خدا کا شکر ہے کہ سارنگی کی روؤں روؤں نے ان کی اوں اوں جذب کر لی۔  
اب اسی برس پندرہ یا سولہ کاسن والی طوائف کا مجرا شروع ہوا۔ اللہ نے اس کے حسن کے ساتھ گلابھی بہت اچھا دیا تھا۔ اس نے بحر طویل میں خود مہاراجہ کی ایک غزل چھیڑ دی۔ اس نازنین کے گلے کی چلت پھرت بحر کے پیچ و خم اور سازوں کی ہم آہنگی نے وہ طلسمی عالم پیدا کر دیا کہ لوگ سرشار ہو گئے اور مہاراجہ نے اپنی غزل کا پورا رس پینے کے واسطے آنکھیں بند کر لیں اور جھومنے لگے۔

یہ جادو کا سماں بندھا ہوا تھا کہ قاضی نے اپنے گھٹنے پر تال دیتے ہوئے پوچھا کہ یہ کس کی غزل ہے؟ میں نے کہا مہاراجہ کی یہ سنتے ہی قاضی نے اپنے پیچھے پھروں کی پوری طاقت سے سبحان اللہ کا نعرہ لگایا کہ مہاراجہ یہ سمجھ کر کہ نظام دکن تشریف لائے ہیں دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اور جب قاضی نے دوبارہ سبحان اللہ کا نعرہ بلند کیا تو مہاراجہ یہ بات محسوس کر کے کہ وہ نظام کے بجائے قاضی کے روبرو ہات جوڑے کھڑے ہیں جھینپ کر بیٹھ گئے۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اور جب گھر آ کر میں نے کہا کیوں بے قاضی آخر کار مہاراجہ کو ہاتھ جروا کر تو نے دم لیا تو وہ اپنی داڑھی کھجانے لگے۔

اب ان سے میری آخری ملاقات کا حال بھی سن لیجیے..... سنہ ۱۹۵۵ء کے اواخر کی بات ہے کہ میں ریکس احمد اور اپنے چچا زاد بھائی مصطفیٰ علی خاں کے ساتھ لکھنؤ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور کھاپی کر بستر پر دراز ہو چکا تھا کہ برآمدے میں ہوٹل کے

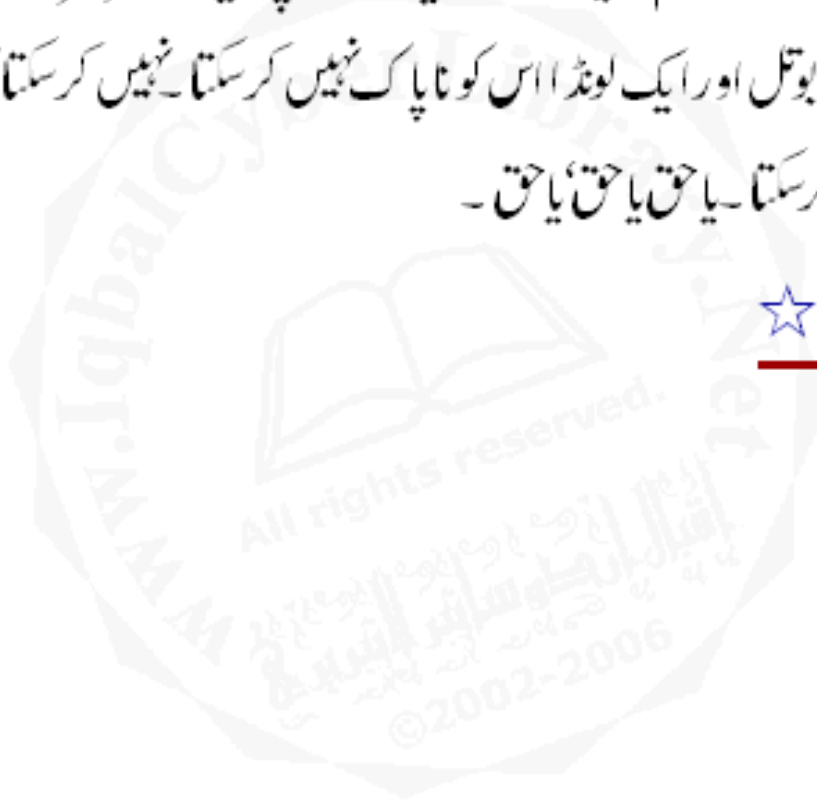
بوائے کی آواز آئی صاحب وہ سوچکے ہیں دروازہ اب نہیں کھلے گا۔ اور اس کے بعد یہ آواز آئی کہ نہیں نہیں ہم تو ابھی ابھی ابھی ملیں گے تو میں نے کہا مصطفیٰ علی دروازہ کھول دو قاضی آئے ہیں انہوں نے دروازہ کھول دیا تو کیا

۱۔ مہاراجہ کو یہ دھوکہ اس لیے ہوا کہ نظام کے علاوہ ان کی محفل میں کوئی زور سے بولتا نہیں تھا اور نظام ہمیشہ بہت بلند آواز میں باتیں کیا کرتے تھے۔

دیکھتا ہوں کہ چار گردے کی داڑھیوں والے دست بستہ اور سیاہی مائل احمقوں کے جلو میں کوئی سجادہ نشین صاحب میری چار پائی کی طرف بڑھے آرہے ہیں۔ میں نے کہا رئیس احمد دوسری لائٹ بھی کھول دو۔ دوسری لائٹ بھی کھل گئی تو یہ سماں دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ قاضی صاحب چوگوشیا ٹوپی پہنے اور عمامہ باندھے میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ میں اپنے بستر پر اچھل کر بیٹھ گیا۔ اور ارے قاضی ار اس بیٹ میں کہہ کر میں نے مصطفیٰ علی کو آواز دی قاضی درویش ہو گیا ہے اسے چونچ دکھاؤ اور جب انہوں نے کھرے ہو کر قاضی کو چونچ دکھائی تو قاضی صاحب ارے یہ کیا بیہودگی یہ کیا یہ کیا بیہودگی کہنے لگے۔ قاضی کی یہ گت بنتے دیکھی تو ان کے چاروں خفیف الوجہ معتقدین بھاگ کھڑے ہوئے اور اس قدر زور سے کہ لکڑی کا زینہ ان سر اسیمہ و پریشان مغرورین کے بھدے قدموں کی دھمک سے بجنے لگا

جب معتقدین بھاگ گئے تو میری چار پائی پر بیٹھ کر انہوں نے کہا میں غلام علی میاں کا مرید ہو چکا ہوں۔ میں نے کہا ارے دیوانے کیسی پیری اور کیسی مریدی پڑھا لکھا آدمی ہو کر اس چوتیا چکر میں پڑ گیا ہے۔ انہوں نے کہا تم کیا جانو ہمارے دل کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ بالکل بالکل بالکل بالکل کل رات کو ہمارے ساتھ کھانا کھانے آنا۔۔۔ دوسرے دن رئیس و مصطفیٰ کو لے کر ان کی جائے قیام پر پہنچا دیکھا کہ جلاہوں کی

سی شکل کے دس بارہ گھامڑان کے سامنے دو زانو بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی قاضی نے ان کو اٹھا دیا۔ ان کے قریب گیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ ان کے داہنے طرف شراب کی لابی سی بوتل رکھی ہوئی ہے۔ اور بائیں طرف ایک چھریر اسالونڈا بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے کہا کیوں قاضی اس درویشی میں بھی۔ انہوں نے کہا تم ارباب ظاہر ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے ہم کو میاں (پیر) یہ نکتہ سمجھا چکے ہیں کہ بحر معرفت اس قدر زخار ہے کہ ایک بوتل اور ایک لونڈا اس کو ناپاک نہیں کر سکتا۔ نہیں کر سکتا نہیں کر سکتا۔ ناپاک نہیں کر سکتا۔ یا حق یا حق یا حق۔





## حکیم صاحب عالم

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا..... لکھنؤ کے حاذق و ممتاز طبیب عربی و فارسی کے منتہی مذہبی قصائد کے عدیم النظر شاعر یتیموں اور بیواؤں کے سر پرست مملکت شرافت کے تاجدار، اقلیم خلوص کے شہریار اور کاروان زہد و اتقا کے سالار صاحب عالم..... کیا بتاؤں کس قدر خوش رو خوش وضع، خوش طبع، خوش فکر، خوش اخلاق، خوش پوشاک، خوش گفتار، خوش تبسم خوش اوقات، خوش مدارات، خوش میزبان اور خوش مطبخ تھے۔

ان کا بونا سا قد تھا۔ چھوٹے چھوٹے ملائم ہاتھ تھے گورا گورا رنگ تھا اور چوڑی پیشانی تھی۔ لکھنؤ میں ان کے تقوے کی اس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ بڑے سے بڑے رند کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کی محفل میں پی کر جائے یا ان کے سامنے خلاف شرع زبان ہلائے لیکن اس قدر زبردست تقشف کے باوجود مجھ رند نامہ سیاہ کے دوست اور دوست بھی کیسے کہ میرے پسینے پر خون چھڑکنے والے دوست تھے اور میرا ان کا یارا نہ تقشف اور تر دامنی کا ایک ایسا عجیب سنگم تھا کہ جو دیکھتا تھا انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا تھا۔ اور جب کہ وہ میری صحبت ہائے شبانہ میں بھی شریک ہونے لگے اور میری بے پایاں محبت کے طفیل انہوں نے میرے شرکاء بزم کو بھی اپنے سامنے پینے کی اجازت دے دی تو لکھنؤ میں چرچے ہونے لگے کہ حکیم صاحب عالم کا سا متقی بھی مے خوار بن گیا ہے۔ اور جب اڑتے اڑتے یہ خبر لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد سید ناصر حسین صاحب قبلہ تک پہنچی تو انہوں نے صاحب عالم کو بلا کر یہ سمجھایا کہ وہ میری راتوں کی صحبت میں شریک ہونا ترک کر دیں۔ لیکن انہوں نے قبلہ و کعبہ کی بات نہیں مانی اور برابر میری صحبتوں میں شریک ہوتے رہے، ان کو میری شاعری سے عشق تھا۔ اور کہا کرتے تھے کہ اپ کی صحبت میں بیٹھ کر بدنام ہو جانا اس امر سے بمراصل بہتر ہے کہ لوگ مجھ کو خاصان خدا میں شمار کرنے لگیں۔

خلق می گوید کہ خرد بت پرستی می کند

ارے ارے می کنم با خلق و عالم کار نیست  
 وہ اس بلا کے نکتہ سنج تھے کہ اچھا شعر سن کر جھومنے اور سر دھنسنے لگتے تھے۔ اور ایک  
 بار تو میری ایک نظم سن کر ان کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ انتہائی مہذب ہونے کے باوجود  
 جست کر کے میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور میرا گلا دبا کر چیخنے لگے تھے کہ آج تجھ کو مار  
 ڈالوں گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ میری بلخرانہ نظموں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور ان  
 کی پیروڈی کہہ کر خود مجھ کو سنایا کرتے تھے اور میں ان کی داد دیا کرتا تھا۔  
 ایک روز میں نے ان سے کہا حکیم صاحب پیروڈی کی جو نظمیں آپ مجھے سناتے  
 ہیں ان میں بڑی جان ہوتی ہے۔ اگر آپ اسی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شاعری کی طرف  
 بھی مائل ہو جائیں تو ڈنکے پٹ جائیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا بھائی میں غزل گوئی تو  
 کر ہی سکتا۔ اس لیے کہ میری زندگی میں اس قس کی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔  
 البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آئیمہ طاہرین کی شان میں قصیدے کہنا شروع کر دوں..... چناں  
 چہ انہوں نے قصیدے کہنا شروع کر دیے اور ایسے ایسے بے مثال قصیدے لکھے کہ  
 قافی سے ٹکر لینے لگے۔

وہ کھانا بھی بہت اچھا کھاتے اور کھلاتے تھے نواب حامد علی خاں والی رام پور کے  
 کھانے کی یو پی بھر میں دھوم مچی ہوئی تھی میں نواب صاحب کے وہاں بھی متعدد بار

افسوس کہ وہ نادقصدیے ان کے ان بیٹوں کے پاس ہیں جن کو نعل وادب سے  
 کوئی واسطہ نہیں میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ انہیں چھوڑ دو۔ وعدہ تو کر لیتے ہیں کہ چچا  
 ضرور چھوڑ دیں گے۔ مگر مجھے ایفائے وعدہ کی کوئی امید نہیں۔ اور افسوس کہ وہ متاع  
 بے بہا کیڑوں کی غزا بن جائے گی۔

کھانا کھا چکا تھا اس بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ حکیم صاحب کے مطبخ میں جو کھانا پکتا تھا اس کی لذت رام پور کے کھانوں سے کہیں زیادہ تھی۔

ان کا مطب تھا نخاس میں چڑیا بازار کے قریب جہاں کسی زمانے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے میں رہتا تھا۔ مطب کی چھت پر ایک چوکور بڑا سا ہال، ہال کے پہلو میں ایک کمرہ مع غسل خانہ اور چوراہا آنگن تھا۔ میں جب وہلی سے آتا تو کبھی کبھی ان کے اوپر کے کمرے میں ٹھہرا کرتا تھا شام ہوتے ہی رات کی محفل جما کرتی تھی۔ جس میں میرزا جعفر حسین ایدو وکیٹ مولانا ثاقب، سید غلام علی، علی عباس حسینی، مولانا اختر علی تھری سید اعظم حسین، سابق مدیر سرفراز سید احتشام حسین نواب جعفر علی خاں، اثر، مجاز مخمور، سراج، قدیر، احسن طباطبائی، میرزا یگانہ چنگیزی اور صدیق حسن خاں (انی سی ایس) وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے اور آدھی رات تک شاعری ہوا کرتی تھی..... ہائے وہ صحبتیں جواب خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب ان کی یاد آتی ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔

ایک بار وہلی سے لکھنوا لیا ت وان کے وہاں نہیں ٹھہرا ایک ہوٹل میں قیام کیا اور اوبدا کر انہیں اپنے آنے کی خبر بھی نہیں کی تا کہ ان کے ہاں اچانک پہنچ کر وہ کھیل کھیلوں جس کو وہلی سے ٹھان کرایا تھا۔

شام ہوتے ہی رئیس احمد سے ملنے بن کے وہاں پہنچا۔ اور حکیم صاحب سے جو کھیل کھیلنے والا تھا اس کا طریقہ ان کو بتا دیا..... رئیس نے تانگہ منگایا اس پر چادر باندھی مجھے اندر بٹھایا خود کوچ بان کے قریب بیٹھے تانگہ حکیم صاحب کے مطب کے پھانک پر روکا۔ اندر گئے حکیم صاحب سے کہا لیج آباد کی ایک خاتون کو کئی روز سے بخارا رہا ہے میں انہیں تانگے میں لایا ہوں آپ کو تکلیف نہ ہو تو مہربانی فرما کر ان کی نبض دیکھ لیں حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کے واسطے پردے میں ہات ڈالا اور میں نے ان کے ہاتھ میں..... تھما دیا وہ اچھل گئے اور ارے کہہ کر اس زور سے ہاتھ کھینچا گویا ان کا ہاتھ

بجلی کے برہنہ تار سے مس ہو گیا ہے۔ دو تین سیکنڈ

ایریس کی معشوقہ جواب ملیج آباد میں انہیں کے ساتھ رہتی ہے۔

تک تو وہ دنگ ہو کر ریمس کا منہ تکتے رہے اور پھر انہوں نے قہقہہ مار کر کہا تانگے سے اتر آئیے جوش بیگم میری جان میں تانگے سے ہنستا ہوا کود پرا انہوں نے بم مہاراج کہہ کر مجھ کو گلے لگالیا اور اس قدر ہنسے کہ انسونکل آئے لیکن اس تمام مسرت میں انہوں نے اپنا وہ ہاتھ جس سے نبض دیکھی تھی اپنے جسم سے دور رکھا اور مطب آ کر جب اس کو تین بار خوب اچھی طرح صابون سے دھویا تو اس کیلے ہاتھ سے میرا منہ چھو کر اسے چوم لیا۔

ہائے کل جس بات پر اس قدر ہنستے تھے آج اس پر دل تھام کر رو رہے ہیں..... دنیا کی یہی ریت ہے میری مہاجرت کے سال بھر بعد وہ بھی پاکستان آ گئے تھے اور ان پر دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس لیے وہ میرے پاس آنے سے معذور تھے۔ میں متعدد احباب کے ساتھ ہر ہفتے ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اور چار پانچ گھنٹے کے لیے شاعری و لطیفہ گوئی کی محفل جم جاتی تھی اور لکھنوکا سماں بندھ جایا کرتا تھا۔

ایک روز حسب معمول ہم سب لوگ یعنی منور عباس علی حسنین زیبا مرحوم..... سالک لکھنوی، میرزا عالم گیر قدر، قیصر مرحوم میرزا ابو جعفر، اور نواب ابوالحسن بلگرامی مرحوم ان کے وہاں پہنچے۔ وہ پھولوں کا سا شگفتہ چہرہ لیے باہر آئے۔ میں نے سینے سے لگا کر ان کا ماتھا اور انہوں نے میرا منہ چوم لیا۔ اور کہا کہ آج اپنے راوی سے ایسا قصیدہ سنواؤں گا کہ آپ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی۔ میں نے کہا میرے پاؤں زمین پر رہتے ہی کب ہیں میں تو عرش بریں پر قدم جمائے رہتا ہوں وہ ہنسنے لگے۔



اتنے میں ان کے دونوں چھوٹے بھائی محمد نواب اور لڈن صاحب بھی اپنی بیگموں سمیت آ گئے۔ یعنی پاکستان میں ان کے جس قدر بھی چہیتے اور قرابت دار تھے۔ وہ اتفاق سے سب کے سب یکجا ہو گئے اور انہوں نے سب کو جی بھر کے دیکھ لیا..... ابھی چائے آ ہی رہی تھی کہ ان کو کھانسی آنے لگی۔ ان کے ڈاکٹر بیٹے نے کہا گولی حاضر کروں انہوں نے کہا شاعری کے بعد..... اور جب تھوڑی ہی دیر میں کھانسی بڑھ کر اچھو کی شکل

.....  
ان کے عزیزوں میں ایک خوش گلو صاحب زادے ان کا کلام سنایا کرتے تھے۔

.....  
اختیار کر گئی تو ان کی سانس گلیں میں رکنے لگی..... اور پل بھر میں روح پرواز کر گئی۔ صاحب عالم میں مرجاتا تم نہ مرتے..... تم نے مجھے زندہ درگور کر دیا۔ ارے حیرت کہ تم مر گئے اور میں ابھی تک جی رہا ہوں

پس از معشوق جینا عشق کو بدنام کرنا ہے  
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

☆☆☆

## رفیع احمد خاں

میرے آبائے اولیٰں کے چند روزہ وطن فرخ آباد کے پٹھان تمام دنیا کے فحش نگاروں کے سلطان۔ علی گڑھ کے گولڈ میڈلسٹ ایم اے متعدد کالجوں کے پروفیسر، آخری دور میں لکھنؤ کو آپریٹو سوسائٹی کے سیکرٹری..... متوسط القامت شگفتہ پیشانی، تاش استاد، سدا بٹاش چوک رسیا پدر معتب شہر محبوب، جوانی میں امر و پرستار زوال جوانی میں طوائف گرفتار۔ مرنجان مرنج قسم کے دل موہ لینے والے انسان تھے۔

ان کا امکان میرزا عالم گیر قدر کے مکان کے عین سامنے امین آباد سے بہت قریب اس سڑک پر تھا جس کو اب کون روڈ کہا جاتا ہے۔ میں اپنے زمانہ تعلیم میں ان کے مکان کے بالکل قریب راجہ ابو جعفر صاحب کی کوٹھی جعفر منزل میں رہتا تھا۔ اس لیے میرزا عالم گیر قدر وہ اور میں ایک ایسا گٹلم بن گئے تھے جس کو ہمیشہ یک جا پایا جاتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کہ ہم لوگ یوسف مرزا ابرار اور شوکت تھانوی کو ہم راہ لے کر شام ہوتے ہی لکھنؤ کی خاص خاص جوانی مدار پر اسرار و شمر دار گلیوں میں بسلسلہ تلاشِ معاش گھوما کرتے تھے۔ اور دن کے وقت ہمارے جاں نثار کارندے اس بات کی ٹوہ لینے نکل جایا کرتے تھے کہ کن کن بوڑھوں نے دوسری یا تیسری رچائی ہے۔

---

ایہ ہماری چندال چوکڑی کی خاص اصطلاح تھی جس کے معنی تھے نجستوئے لالہ  
رخان۔

---

ہم ان بوڑھوں کی فہرست تیار کر کے مختلف ذرائع اور مختلف و مشترک احباب کی وساطت سے ان بوڑھوں کے پاس جاتے اور ان پر اپنی پارسائی و دیں داری کے سکے بٹھاتے تھے۔ ان کی نظروں میں سماتے تھے ان سے پینگ بڑھاتے اور اس طرح آخر

کاران کی بے آب و گیاہ لہنوں تک آتے جاتے تھے۔

ان کے باپ کا نام تھا شفیع احمد خاں ان کی عقل آواز اور گردن بہت موٹی تھی۔  
داڑھی بے حد ڈراؤنی تھی جب وہ صبح اپنی بھیانک آواز میں تلاوت کرتے تھے تو  
میرے کمرے تک اس کی خوف ناک آواز کی گونج آیا کرتی تھی اور میں یہ شعر پڑھا  
کرتا تھا

گر تو قرآن بایں نمط خوانی  
بہر د رونق مسلمانی

خدا کی قسم ان کے گلے سے الفاظ اس طرح ٹھوکر مار کر نکلتے تھے گویا وہ ڈوبتے  
ستاروں کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہوں..... ان کو رفیع سے بے حد نفرت تھی۔  
میں نے آج تک دنیا کے کسی باپ کو اس قدر نامہربان نہیں دیکھا۔

رفیع نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا کہ بیٹا خراب نکل آئے تو اس کو ناخلف کہتے  
ہیں شبیر یہ تو بتاؤ کہ باپ خراب نکل جائے تو اسے کیا کہیں گے۔ اور میں نے کہا تھا  
ناسلف۔ جب میری پہلی تصنیف روح ادب نکلی تھی اس پر رفیع نے مقدمہ لکھا تھا تو وہ  
گل رعنا کے مصنف حکیم عبدالحی صاحب کے پاس اس کو لے کر گئے تھے اور کہا تھا یہ  
دیکھیے ایک بد معاش کی کتاب پر دوسرے بد معاش نے مقدمہ لکھا ہے۔ چور کا بھائی  
گرہ کٹ..... اور سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں ہم سے نفرت کرنا ہی چاہیے تھا۔ اس لیے  
کہ وہ بے حد کھڑنک ملا تھے اور ہم سب لوگ بے حد آزادہ رو۔ اور ان کے نقطہ نظر سے  
پر لے درجے کے اوباش تھے۔

ایک بار رفیع احمد خاں کے ایک رشتے دار کے چچا نے ان سے کہا دس بارہ برس ہو  
چکے ہیں تمہاری شادی کو اب تک کوئی بچہ نہیں ہوا ہے شاید تمہاری بیوی

.....  
لے دیکھیے میری نظم یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے۔

-----  
باجھ ہے تم دوسری شادی کر لو نہیں تو نسل منقطع ہو کر رہ جائے گی۔

اس کے جواب میں انہوں نے چچا سے کہا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں کوٹھے پر جا کروں ہاں پر اس کا جواب دے دوں۔ چچا نے کہا کوٹھے سے جواب کا کیا تعلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ پٹنے سے بچ جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ کوٹھے پر دوڑ کر چڑھ گئے اور وہاں سے پکار کر کہا چچا جان میں مر جاؤں گا لیکن بچے کا باپ نہیں بنوں گا چچا آپ کو معلوم ہے کہ ہماری نسل کس قدر شقی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اشتیاء کی یہ نسل ہمیشہ کے واسطے منقطع ہو کر رہ جائے چچا نے کہا تو برا مرد دود ہے۔ انہوں نے کہا کہ تو کیا اپنے سے بھی ایک برا مرد دود اور پیدا کر دوں؟

اور ایک بار خدا کے وجود پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ رفیع احمد خاں بڑے سکون سے سن رہے تھے۔ لیکن وہ بحث جب اس جانب مڑی کہ خدا کے وجود کے سینکڑوں مسکت دلائل تو ضرور موجود ہیں لیکن شانی و منطقی دلیل ایک بھی نہیں تو انہوں نے میز پر گھونسا مار کر کہا..... شٹ اپ (خاموش) میرے پاس وجود باری کی شانی و منطقی دلیل نہ ہی لیکن ایک دلیل ایسی ہے جو منکرین و متشککین کی کھوپڑیاں توڑ کے رکھ سکتی ہے۔ اور اس دلیل کا نام ہے دلیل ڈنڈاوی مجاز نے کہا کہ تو کیا ہمارے سروں پر ڈنڈا مار کر آپ خدا کے وجود کو ثابت کرنا چاہتے ہیں؟..... رفیع نے جواب دیا نہیں ایسا نہیں کروں گا بلکہ آپ حضرات کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا کہ آپ تمام حضرات اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ خاک سار نہایت عمدہ سمجھ بوجھ کا آدمی ہے صحت کے اعتبار سے بھی ہزاروں سے بہتر ہے سورت بھی شریفوں کی سی ہے مطالعہ بھی خوب اچھا ہے اور ان تمام اوصاف کے ساتھ ساتھ یہ فدوی ایم اے اور گولڈ میڈلسٹ بھی ہے اور اسی کے دوش بدوش فدوی کی لیاقت کو تسلیم کر کے اسے متعدد کالجوں میں پروفیسری کے عہدے بھی بارہا دیے جا چکے ہیں لیکن جھورے ہی دن بعد اس ناچیز کو کالج سے



نکال دیا جاتا ہے۔ اور ان تمام حالات پر نگاہ کر کے میں آپ تمام حضرت سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ اگر خدا موجود نہیں تو پھر یہ ڈنڈا کس کا ہے جو رفیع احمد خاں کی..... میں گھسا ہوا ہے؟ اور یہ ناچیز رفیع احمد خاں جس صوبے میں بھی جاتا ہے وہ غیبی ڈنڈا اس کے گھسا ہوا قطع منازل کرتا رہتا ہے جس سے یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ وہ ہے اور ضرور ہے اور لگے ہاتھوں یہ بات بھی پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ صرف موجود ہی نہیں بلکہ حاضر و ناظر بھی ہے..... اب بولو ملعونو!

وہ فحش نگاروں کے بادشاہ تھے یاروں نے جسم انسانی کے اعضاء عورت کے نام لینے کو فحش نگاری سمجھ رکھا ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ صرف گالی بک دینے سے یا پوشیدہ اعضاء کے نام نظم کر دینے سے کام نہیں چلتا۔ فحش نگاری میں بھی سنجیدہ شاعری کی سی لیاقت و صلاحیت کا موجود ہونا ضروری ہے انہوں نے فحش نگاری کو ادب عالی کا جو مقام بخشا تھا اور اس میں جو شعریت پیدا کی تھی وہ شیخ سعدی اور ملا عبیدزاکانی کے درجے کی چیز تھی۔ اور بعض اوقات تو وہ ان دونوں سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ افسوس کہ میری قوم میں ابھی تک مرد و اپن نہیں پیدا ہو رہا ہے ورنہ میں ان فحش اشعار نقل کر کے اپنے دعوے کو مدلل کر لیتا۔

ان کی رگ رگ میں ایسی شوخی بھری ہوئی تھی کہ وہ ایک لمحے بھی سنجیدگی کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ایک رات کو لکھنؤ کی گلیوں میں انہوں نے ایک جلوس خرام و دشنام نکالا تھا۔ اس کا ماجرا بھی سن لیجیے..... ایک دن رات کے دو بجے گانا سن کر جب ہم سب چوک سے نکلے تو انہوں نے کہا میں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ چوک سے امین آباد تک ملنے والوں کے جتنے بھی مکان پڑیں گے۔ تانگے روک روک کر اور آوازیں بدل بدل کر ان تمام مکان والوں سے مذاق کروں گا اور گالیاں دوں گا میں نے کہا رفیع یہ بات آداب شرفا کے خلاف ہے انہوں نے کہا ایسی تہمتی آداب شرفا کی..... سب سے پہلے میرزا محمد ہادی رسوا صاحب امراؤ جان ادقا کا مکان پڑا ان کے مکان کے نیچے

تانگے روک دیے گئے۔ میں نے دیکھا کہ رفیع ان کو گالی نہ دینا یہ میرے استاد ہیں انہوں نے کہا کہ اگر تم چپ نہیں رہو گے تو میں تمہارا نام لے کر ان کو گالی دوں گا۔ میں

امیرزا صاحب بالا خانے پر رہتے تھے۔

خاموش ہو گیا۔ انہوں نے تانگے سے اتر کر آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ میرزا صاحب میرزا صاحب جناب میرزا صاحب جناب میرزا صاحب جناب میرزا محمد ہادی رسوا صاحب قبلہ دس پانچ ہانکوں کے بعد میرزا صاحب کی باریک سی آواز آئی کون صاحب ہیں؟ ان کی آواز سنتے ہی رفیع احمد نے کہا میں ہوں امراؤ جان ادا کا دھگڑا امیرزا صاحب کی آواز آئی انہیں آئیں۔ انہوں نے کہا جناب میں نے سنا ہے کہ آپ نے اپنے کالج کے پرنسپل مسٹر ہیڈلی کا..... چھری سے کاٹ لیا ہے۔ اور اسے گڑھے کی سرائے میں پھینک دیا ہے۔ فل ڈپازٹ کے طور پر جمع کرا دیا ہے۔ یہ سنتے ہی میرزا صاحب نے اپنے ملازم سے پکار کر کہا رمضان ذرا چھجے سے جھانک کر تو دیکھ یہ کون بد معاش بے ہودگی کر رہا ہے اتنے میں ہمارے تانگے حرکت میں آ گئے اور رمضان کی آواز آئی حضور وہ تو تانگوں میں بھاگ کھڑے ہوئے پیر بخارا کے شہدے ہوں گے سرکار۔ اس کے بعد دو تین اور مقامات پر گالیاں دیتا اور مذاق کرتا۔ یہ فحاشی کا جلوس جب امین آباد پہنچا تو پرنس ہوٹل کے نیچے کھڑے ہو کر انہوں نے ہانک لگائی جناب تصدق حسین صاحب جناب قمرار صاحب قمرار صاحب جناب تصدق حسین صاحب قمرار اوپر سے آواز آئی کون پکار رہا ہے انہوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کا لغت قمرار اللغات اپنے تمام الفاظ کی پلٹن لے کر آپ کی والدہ کی..... میں داخل ہو گیا ہے۔ آواز آئی لاجل ولاقوۃ یہ کون بیہودہ آدمی ہے۔ بد تمیز کہیں کا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ اب سید جالب دہلوی مدیر ہم دم کے مکان پر جا کر انہوں نے پکارا جناب سید

جالب صاحب دہلوی..... جالب صاحب جالب صاحب ارے جناب جالب صاحب تھوڑی دیر میں ایک انتہائی جی ہوئی آواز آئی کون ہے؟ کون ہے؟ انہوں نے کہا جناب عالی در دولت پر اس قدر عرض کرنے حاضر ہوا ہوں کہ اے حضرت جالب صاحب دہلوی مدخلہ آپ کی تو ماں کا..... اندر سے آواز آئی اوف اوف اوف اور ہم گھر جا کر سو رہے۔

لکھنؤ کی ایک رنڈیوں کی سرائے۔

صبح جب رفیع احمد خاں ہم لوگوں کو ساتھ لے کر ایک نہایت شریف و مہذب انسان کے مانند اپنے دشنام خوردگان شبانہ کے پاس ایک ایک کر کے پہنچے۔ کسی نے پچھلی رات کے واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ جب ہم سید جالب کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا کہ جوش صاحب لکھنؤ کے ڈنکے پٹے ہوئے ہیں اب اس کی یہ گت بن چکی ہے کہ کل رات تین چار بجے ایک شخص نے زور زور سے مجھے آواز دی اور جب میں نے ڈانٹ کر پوچھا کہ کون ہے تو وہ گنڈامیری والدہ معظمہ کی شان میں گستاخی کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ جالب صاحب کا یہ فقرہ سن کر رفیع کو ہنسی آ گئی کہ اس کے ضبط کرنے میں ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آنکھیں ابل پڑیں ان کی ٹھڈی کا پنے لگی اور ان کے دونوں گال پر تو لے والی چڑیا کے مانند پھر پھر آنے لگے۔



## پرنس میرزا عالم گیر قدر

خاندان تیمور کی یادگار، لکھنؤ کے باشندہ باوقار کچھ اوپر چالیس سال سے ضلع  
انفس میں گرفتار پھر بھی آواز بلا کی پاٹ دار زوداشتعال و شرارہ بار میرے لڑکپن کے  
یار، موسیقی اور مرزا میر کے ماہر اسرار، کھانا پکانے میں یکتائے روزگار خننجوں کے شہریار  
اور معلومات عامہ کے پروردگار، سانولے رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں کے پوست  
استخواں اور کاغذی بدن کے آدمی ان کے دادا جان کو میں نے لڑکپن میں دیکھا تھا۔  
اللہ اللہ ان کا جاہ و جلال وہ صبح شام ایک معین وقت پر کوٹھے سے بالائی منزل سے اتر کر  
ایسے وقار کے ساتھ حویلی میں جاتے تھے کہ مجھے اپنے دادا کی سلطان خرامی یاد آ جاتی  
تھی..... اور ان کو اس قدر اعزاز حاصل تھا کہ گورنر جنرل تک ان کی خدمت میں حاضر  
ہوا کرتا تھا۔

کوئن روڈ پر رفیع احمد خاں کے مکان کے عین بالمتقابل ان کی عالی شان حویلی!  
حویلی کے پہلو میں ایک دو منزلہ کوٹھی تھی اور پشت پر بڑا سا پائیں باغ تھا اور یہ جو  
امین الدولہ پارک کے آخری گوشے میں سنٹرل ہوٹل کی دو منزلہ عمارت کھڑی ہوئی ہے  
! افسوس کہ ان کے بڑے بھائی میرزا جہاں گیر قدر نے وہ جائے داد جس کی  
قیمت اس دور رزانی میں پانچ چھ لاکھ سے کم نہیں تھی اپنی ڈپٹی کلکتری کے شہرہ آفاق  
دور عیاشی میں اونے پونے بیچ کر خاندانی اثا ر امارت کو برباد کر ڈالا تھا۔ اس حویلی  
میں رہنے والے میرزا عالم گیر قدر اب ڈرگ کالونی کے ایک چھوٹے سے بھنچے ہوئے  
مکان میں تنہا رہتے ہیں ہائے کیا پلٹا کھایا ہے روزگار نے ہائے کس قدر ہر آن بٹاش  
رہنے والے چہرے اب مستقل طور پر اداس رہنے لگے ہیں۔

وہ انہیں کے پائیں باغ کو قطع کر کے تعمیر کی گئی ہے۔ وہ اس قدر خنسنج ہیں کہ شعر  
سنتے ہی اس کے تمام محاسن و معائب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو شعر میں  
ایسے معنی پیدا کر دیتے ہیں کہ شاعر دنگ ہو کر رہ جاتا ہے کہ ارے یہ معنی کہاں سے نکل



آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھانا پکانے میں بھی ایسی دست گاہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے رکاب داران کے سامنے کان پکڑتے ہیں کشمیری چائے ایسی بناتے ہیں کہ باشندگان کشمیر حیران رہ جائے ہیں۔ اور طبلہ ایسا بجاتے ہیں کہ بڑے بڑے برے چلی ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں لیکن مغلوب الغضب اس قدر ہیں کہ ذرا سے مذاق پر جامے سے باہر ہو جاتے ہیں اور بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ ایک سیدھی بات کو پرچہ و خم سمجھ کر ترک کر لیتے ہیں۔ اور دل اتنا اچھا ہے کہ کچھ روز روٹھے رہنے کے بعد پھر خود بخود من جاتے ہیں۔

اب رہا ان کے معلومات عامہ کا مسئلہ سو اس باب میں اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میرزا صاحب کو کیا کیا آتا ہے تو میں اس سے کہوں گا کہ یہ پوچھ کہ اس عالم کون و فساد میں وہ کون ایک ایسی بات ہے جو ان کو نہیں آتی

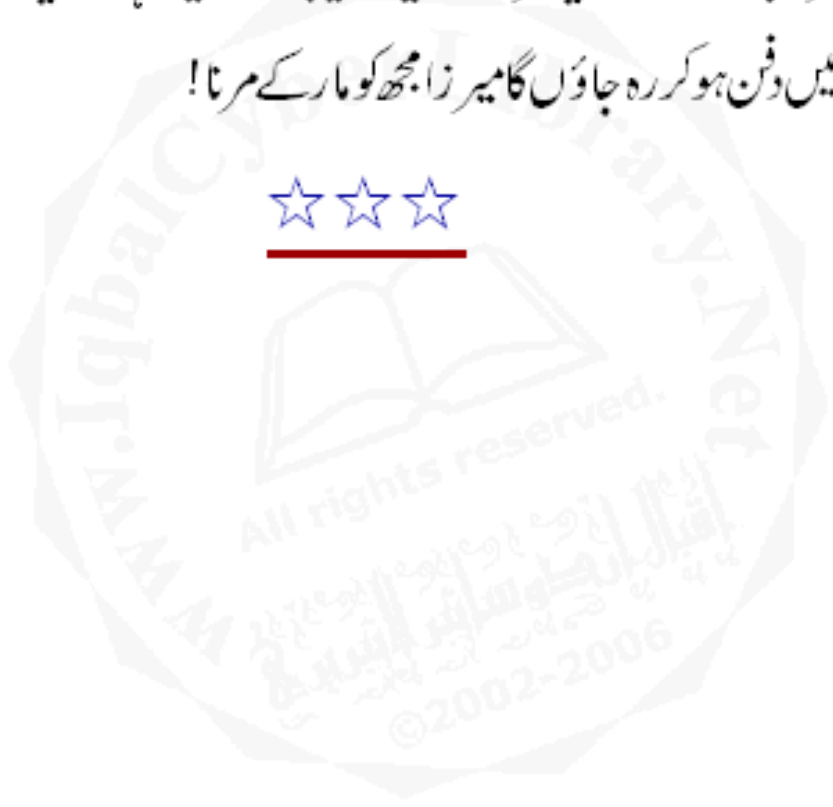
ہر فن میں ہوں استاد مجھے کیا نہیں آتا  
جناب والا تفسیر حدیث، منطق فلسفہ، ہیئت، ادب، موسیقی، نقاشی، ایلو پیمنٹری، ہومیو پیتھی، اور طب یونانی کے بے شمار علوم کے دوش بدوش ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ شیر کا شکار کیوں کر کھیلا جاتا ہے کون کون سی پیٹنٹ دوائیں کن کن امراض کے واسطے مخصوص ہیں موٹر کا کون سا پرزہ کہاں مل سکتا ہے۔ اور ریلوں اور ہوائی جہازوں کے اوقات کیا ہیں..... اچی آپ میرزا صاحب کو کیا سمجھتے ہیں کان کھول کر سن لیجیے کہ اس کرہ ارض پر معلومات عامہ کا اس قدر بڑا کباڑی اور کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

بس یہ سمجھ لیجیے کہ جہاں تک کہ جہاں علم و آگاہی کا سوال ہے آسمان پر خدائے قدیر ہے اور زمین پر میرزا عالم گیر ہیں وہ عرش پر علام الغیوب ہے یہ فرش پر علام الشہود ہیں یعنی

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر  
میرے موتر خاں طفلی و شباب میں سے اب صرف میرزا ہی باقی رہ گئے ہیں وہ

مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں کس قدر نازک اندام و حسیں تھا۔ اور جب میں جرنیلی ٹوپی  
کج کر کے اور سیاہ شہروانی پہن کر دو تین سپاہیوں کو جلو میں لیے امین آباد پارک میں  
اپنا سونے کا درہلا ہلا کر ٹھہا کرتا تھا تو میری سیاہ شہروانی پر میری گھڑی کی سنہری زنجیر  
ایسی لگتی تھی جیسے کالے بادل میں بجلی چمک رہی ہے۔

میری محراب زندگی میں یہ میرزا ہی ایک دیا باقی رہ گیا ہے اگر یہ بھی بجھ گیا تو میں  
اندھیرے میں دفن ہو کر رہ جاؤں گا میرزا مجھ کو مار کے مرنا!



## مولانا سہا بھوپالی

وہ اس قدر طفل قامت تھے کہ ان کے روبرو ٹھگنے اور زیادہ دبتے ہوئے قد کے آدمی بھی بلغم با محور یا بالے میاں کی چھڑ نظر آتے تھے۔ جب ان کو مولانا سہا کے نام سے پکارا جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ننھے سے بچے کو مولانا تار کہا جا رہا ہے۔

لیکن ان کی ذرا سی جان میں قدرت نے علم و ادب کی ایک کثیر مقدار کو اس طرح فشار دے کر بند کر دیا تھا کہ جس طرح ایک چھوٹے سے ٹین کے ڈبے میں تین چالیس مچھلیاں منقبض کر کے تلے اوپر بند کر دی جاتی ہیں۔

معلوم نہیں کس بنا پر ان کو مجددی کہا جاتا تھا۔ لیکن ان کی لیاقت کا میں دل سے قائل ہوں۔ جب وہ کسی علمی یا ادبی مسئلے پر باتیں کرتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ وہ کس قدر وسیع المطالعہ ہیں۔ وہ پرانے رنگ کے شاعر اور نئے مزاج کے نقاد بھی تھے۔ اور اس کوتاہقامتی کے باوجود حسینوں پر بے ساختہ دست درازی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ عورت اور شراب کے اس قدر رسیا تھے کہ دونوں کی بو پا کر دوڑ پڑتے تھے ان بے چارے کی عمر کا بہت زیادہ حصہ افلاس میں گزرا لیکن امیروں کے آستانوں پر کبھی نہیں جھکے امیروں کے در پر جھکنا تو درکنار وہ انہیں ان کے منہ پر بڑی روانی سے گالیاں بھی دے بیٹھتے تھے ایک روز ایک راجہ صاحب کے وہاں ڈرنک اور ڈنر کی دعوت تھی..... جب سہا صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو راجہ صاحب نے، ایک دوسرے راجہ صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ ان راجہ صاحب نے بیٹھے بیٹھے مصافحے کے واسطے ہاتھ بڑھایا اور انہوں نے ان کو موٹی سی گالی دے کر کہا اے سالے بدتمیز شاعروں سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملاتا ہے ان راجہ صاحب کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا..... میزبان راجہ صاحب نے جھٹ سے ان کو گود میں اٹھا کر کہا آپ نے میری ناک کاٹ ڈالی کہیں شرفا بھی گالیاں دیتے ہیں۔ سہا نے ان کی گود میں بیٹھے ہوئے کہا راجہ صاحب کیا آپ نا صح مشفق کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ راجہ نے کہا یہی سمجھ لیجئے سہا

صاحب نے کہا تو پھر تو نا صحن مشفق بھی ماں کا..... رجبہ نے گھبرا کر ان کو گود میں سے اتار دیا اور وہ بچوں کی طرح کھٹ کھٹ کرتے کمرے سے نکل گئے۔

وہ اختری فیض آبادی پر مرتے تھے دونوں کا مکان لال باغ میں تھا اور میں ان دونوں کے قریب بنارس باغ کے سامنے رہتا تھا۔ وہ دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے مجھ کو اختری کے وہاں لے جاتے اور بچوں کی طرح گود میں بیٹھ کر سرکار..... ایک پیار کی درخواست کرتے تھے۔

ایک شام وہ حسب معمول اختری کی گود میں بیٹھے ہوئے پیار مانگ رہے تھے اور شراب پی رہے تھے کہ اختری کی ماں نے کہا مولانا آپ جانتے ہیں کہ اختری نواب صاحب رام پور کی سرکار میں ملازم ہے۔ اور ان کے سیکرٹری صاحب یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ اختری کی گود میں سے اتر آئیے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دیکھ لیں یہ سنتے ہی انہوں نے بگڑ کر کہا نواب رام پور کی ماں کا..... اختری کی ماں نے اپنا منہ پیٹ لیا اور اختری نے ان سے کہا مولانا یہ بہت بری بات ہے۔۔ اس پر انہوں نے بے ساختہ کہا اچھا تو پھر سرکار کی بھی ماں کا.....

اور تو اور وہ اپنی بیگم کو بھی گالی دے بیٹھتے تھے اور ان کی بیگم ایک اونچے سے طاق یا مچان پر بٹھا کر گھر کے دھندوں میں لگ جاتی تھیں اور مولانا اوپر سے چیختے رہتے تھے کہ خدا کے لیے مجھے اتارو اب گالی نہیں بکوں گا۔

ایک روز بنارس باغ والے مکان میں وہ میرے پاس آئے شام کا وقت تھا دور چلنے لگا۔ انہوں نے رباعیوں کی فرمائش کی۔ میں رباعیاں سنانے لگا۔ ان کو میری ناچیز رباعیاں اس قدر پسند آئیں کہ دس پانچ رباعیوں کے بعد انہوں نے کہا جوش صاحب آپ کے سامنے تمام ہندوستان کے شاعروں کی ماں کا..... اور سناؤ۔ اتنے میں کسی نے ایک نام و شاعر کا نام لے کر پوچھا کیا ان کی بھی ماں کا؟ انہوں نے ہاتھ بلند کر کے کہا نہیں ان کو تو شامل نہیں کر رہا ہوں جب دس بیس رباعیاں اور سن چکے تو



مستثنیٰ شاعر کا نام لے کر کہا۔ ان کی بھی ماں کا..... اور چند رباعیاں میں نے پڑھیں تو بے قابو ہو کر انہوں نے بہت زور سے کہا اب تو مولانا سہا مجددی کی بھی ماں کا.....

ایک رات کو ہم چوک گئے گانے سننے کے لیے۔ مجاز ایک دکان پر پان کھانے کے لیے ٹھہر گئے۔ سامنے ایک پٹاخاسی چھو کری چھجے پر کھڑی ہوئی تھی انہوں نے کہا سب سے پہلے اس کی بانگی دیکھیں گے۔ کچھ تو پان بننے میں دیر ہوئی اور ایک صاحب جو مجھے دیکھ کر رک گئے تھے ان سے باتیں کرنے میں وقت صرف ہو گیا۔ اب ہم فارغ ہوئے تو دیکھا کہ سہا صاحب غائب ہو چکے ہیں اور بالا خانے سے آوازیں آ رہی ہیں لدے امی جان دوڑیے کوئی بھوت آ کر مجھ سے چمٹ گیا ہے۔ ہائے اللہ ہائے اللہ ہائے اللہ میں نے مجاز سے کہا ہونہ ہو سہا صاحب اوپر چڑھ گئے ہیں۔ اور جب ہم اوپر پہنچے تو دیکھا کہ اس چھو کری کی کمر سے لپٹے ہوئے ہیں۔ ایک بوسہ ایک بوسہ ایک بوسہ کی درخواست کر رہے ہیں اور وہ چھو کری اور اس کی ماں دونوں تھر تھر کانپ رہے ہیں۔

غالباً یہ سنہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے کہ ایک روز وہ بمبئی میں مجھے مل گئے۔ اور دوڑ کر لپٹ گئے۔ میں نے پوچھا یہاں کیسے آنا ہوا انہوں نے کہا لوہے کے کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوں۔ میں نے کہا اللہ اللہ یہ موم کا پتلا اور لوہے کا کاروبار۔ کہنے لگے۔ میں نہیں میرا ایک ساتھی کام کرے گا۔ میں ان کو لے کر گھر آ گیا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے کہا جوش اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا ہے۔ ایک تو یہ دھندا ہاتھ آ گیا ہے جس سے بھوجن چلے گا اور اسی بھوجن کے ساتھ رحمت الہی نے میرے..... کا بھی معقول بندوبست کر دیا ہے اور ایک ایسی چاند سی بیوی دے دی ہے کہ چراغ گل ہو جانے کے بعد بھی اس کا مکھڑا اور بھی دمک اٹھتا ہے۔ اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ اللہ نے یہ فضل کیوں کیا ہے میں نے کہا آپ بتائیں انہوں نے کہا و سکی اور برانڈی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ البتہ وائن کی دو اور بیر کی چار بوتلیں روز شام کو پی لیتا ہوں۔ میں نے کہا

واقعی اسے کہتے ہیں تو بتہ النصوح۔

شام ہوتے ہی میں نے وائسن اور بیئر کا بندوبست کر دیا وہ پی کر غسل خانے چلے گئے۔ دس پانچ منٹ تک تو میں نے انتظار کیا اور جب وہ نہیں آئے غسل خانے کے دروازے پر دستک دی دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا اور یہ سماں دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہ فلش کے چبوترے پر چاروں شانے چت پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

ایک باریہ سن کر وہ سخت بیمار ہیں میں بھوپال آ گیا۔ ان کو خیراتی وارڈ میں دیکھ کر روٹ گئے کھڑے ہوئے گئے سیدھا نواب صاحب بھوپال کے پاس پہنچا ان کو غیرت دلانی کہ ان کے بھوپال کی اتنی بڑی شخصیت خیراتی وارڈ میں دم توڑ رہی ہے انہوں نے فوراً ہی کسی افسر کو بلا کر حکم دیا کہ سہا صاحب کو ایک پرائیویٹ کمرے میں رکھ کر سرکاری طرف سے ان کا علاج کیا جائے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ دفتری کارروائیوں کی بنا پر اس قدر دیر میں حکم نامہ جاری ہوا کہ جب ایک دروازے سے ان کا حکم نامہ آیا تو دوسرے دروازے سے ان کی لاش باہر جا رہی تھی..... فردوسی کا سانحہ یاد آ گیا۔

ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا



## ڈاکٹر ایس کے سکسینہ

نہ دبلے نہ دھم دھوم مزاج میں زراسی گڑبڑ چہرے کا ملگجاسا گونگا رنگ، لہجے میں بچتا چنگ۔ بد مزاج بیوی کے صید زبوں وہ ظالم لیلیٰ یہ مظلوم مجنوں آنکھیں ذہانت سے ضیاء، معقولات کے علم بردار، فلسفے کا افتخار، منطق کا وقار کاہلی کا پرستار اور بزدلی کے مہا اوتار۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں جب میں محکمہ اطلاعات کے تین رسالوں آج کل ”بٹا عالم“ اور ”دکشمیر“ کا مدیر تھا وہ ہندو کالج میں فلسفے کے صدر شعبہ تھے۔ اس وقت کے چیف کمشنر شکر پرشاد آئی سی ان کے بڑے پرانے دوست تھے اور انہوں ہی نے مجھ کو ان سے ملوایا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ میرے دفتر میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہو گئے تھے اور ہر وقت میری ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اب ہونولولو میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ کبھی کبھی دہلی آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کی سنہ ۱۹۶۱ء میں دہلی گیا تھا اتفاق سے وہ آئے ہوئے تھے۔ بہت سی ملاقاتیں ہوئیں میں نے کہا ہونولولو میں لولو ہونے لگے ہو وہ بہت ہنسے بیوی آگئیں ہنسی نے دم توڑ دیا۔

کاہلی اور بزدلی کے علاوہ میرے ان کے مزاج میں تقریباً سو فیصد اشتراک پایا جاتا ہے۔ مزاج کے ساتھ ساتھ کائناتی مسائل میں بھی ہم دونوں کے جادہ فکر میں یک سر مو فرق نہیں ہے۔ اور بفضلہ ہم دونوں وہ ہیں جن کو اوہام پرستوں اور عقل دشمنوں کے حلقے میں کافر کہا جاتا ہے۔

وہ ہندوؤں کی حماقت کا رونا روتے ہیں میں مسلمانوں کی بے عقلی پر آنسو بہاتا ہوں۔ اور پھر ہم دونوں مل کر ہندوؤں مسلمانوں یہودیوں عیسائیوں بودھیوں سکھوں اور جینیوں کی زبوں اندیشیوں پر ماتم کرتے ہیں۔ اب ان کی بالیں پرست کاہلی کا ایک واقعہ سن لیجئے میرے صد ہا تقاضوں کے بعد آخر کار وہ اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ وہ میرے ساتھ صبح کو ٹہلا کریں گے۔

چناں چہ دوسرے دن ہی صبح کو میں ان کے گھر پہنچا ان کو جگایا۔ وہ بستر سے اٹھے بڑی بے کسی کے ساتھ مجھے دیکھا چارپائی سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلے۔ قدم اس طرح اٹھے گویا وہ آندھی کے جھکڑوں میں پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ اور ٹانگیں دامنوں کے مانند ہوا میں اڑ رہی ہیں غسل خانے سے نکلے تو چارپائی کرکراہ کر بیٹھ گئے میں نے کہا ان نخروں سے تو کرن پھوٹ جائے گی اور دھندلے کا سہاگ ہی لٹ جائے گا۔ انہوں نے بڑی بے چارگی سے تھکی آوازیں کہا چلتے ہیں یہ کہہ کر وہ منہ بناتے اٹھے پھاٹک پر آئے اور سر کھجا کھجا کر باتیں کرنے لگے میں نے کہا راستے میں بائیں کرتے چلیں گے، انہوں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے پاؤں کھلیں گے تو زبان بند ہو جائے گی۔ میں نے جھلا کر کہا ارے بھائی چلنا ہو تو چلیے ورنہ سورج نکل آئے گا۔ انہوں نے کہا دراصل بات یہ ہے کہ پر ماتما نے ٹانگیں فقط اس لیے دی ہیں کہ ہم کو غسل خانے تک پہنچا دیں اور دفتر جانا ہو و پھاٹک تک لے جا کر سواری میں بٹھا دیں۔ یہ ٹانگیں ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہیں کہ ہم خاک چھانتے مارے مارے گھومتے پھریں سنو ہماری بہترین ٹہل یہ ہے کہ ہم دونوں پاؤں پھیلائے بسر پر چوبیس گھنٹے لیٹے رہیں۔ میں نے کہا مجھ سے ٹہلنے کا وعدہ کیوں کیا تھا۔ انہوں نے کہا یا آپ کے آنے اور اپنے وعدے کا یہاں تک تو احترام کر دیا کہ بستر سے اٹھ کر ان لوگوں سے قطعی مختلف ہو گیا جو بستروں پر اینڈر ہے ہیں حالانکہ آپ کی خاطر میں اپنے کو جن لوگوں سے مخلف بنایا ہے وہ ہم دونوں سے بہت اچھے ہیں اور وہ وہاں سے اپنا سامنہ لے کر ٹہلنے چلا گیا اور عہد کر لیا کہ اب سکینہ کے پاس صبح کے وقت کبھی نہیں جاؤں گا۔

ایک روز میں ان کے گھر گیا کہا آئیے قطب چلیں۔ انہوں نے کہا تھک جاؤں گا۔ میں نے کہا ارے موٹر سے جانا ہے انہوں نے بات کاٹ کر کہا آپ بات سمجھتے نہیں میل دو میل جانا ہو تو کوئی بات نہیں سولہ سرہ میل میں چولیس بل جائیں گی اور پھر دوسری



بات یہ ہے کہ دل نہیں ہے آج تو مائل سفر۔ میں نے کہا یہ مائل سفر کیا چیز ہوتی ہے انہوں نے جواب دیا اضافت بریکٹ میں رکھ دی ہے۔

(ب) ان کی بزدلی کے بہت سے واقعات میں سے دو واقعے سماعت فرمالیجے۔ پہلا واقعہ انہیں کی زبان سے سن لیجیے دہر لفظ تو یاد نہیں مگر واقعہ سامنے آجائے گا۔ ”جوش صاحب کل ہم ناشتہ کر کے برآمدے میں بڑے آرام سے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں بیوی نے تیز تیز آواز میں کہا ادھر آؤ ادھر آؤ۔ آپ جانے ہیں کہ ہم بے حد بزدل ہیں اور ہمارا قول ہے کہ ہر دل میں تھوڑا سا بزدل چاہیے۔ بیوی کے اس گرم ارگھرائے ہوئے لہجے سے ہم ڈر گئے کانپنے لگے انہوں نے کہا میں کہہ رہی ہوں ادھر آؤ ادھر آؤ ہم کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ جوتہ پہنے بغیر ہی بیوی کے پیچھے پیچھے ہو لیے اور ہر قدم پر دل بلیوں اچھلتا رہا کہ دیکھیے کیا چیز پیش آتی ہے۔ بیوی نے باورچی خانے کیدروازے پر ہم کو لے جا کر کھڑا کر دیا اور اشارہ کر کے کہنے لگیں دیکھو یہ چار برتن ٹوٹے پڑے ہیں اگر باورچی اسی طرح دھوتا رہا تو ایک برتن بھی گھر میں باقی نہیں رہے گا۔

یہ سن کر ہمارے حواس بحال ہو گئے کہ گھر میں کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے ہم نے باورچی کو بلا کر کہا ارے بابا کان کھول کر سن لو کہ تانے اور پیتل کے برتن چینی کے برتنوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور یہ بھی سن لو کہنچر کا یہ اٹل قانون ہے کہ جب قوی اور کم زور میں ٹکڑ ہوتی ہے وہ کم زور ٹوٹ جاتا ہے اس لیے کل سے ایسا کرو کہ قوی برتنوں کو کم زور برتنوں سے ملا کر دھونا چھوڑ دو۔ جب یہ سمجھا کر ہم پھر اخبار پڑھنے لگے تو بیوی نے پیچھے سے آکر ہماری پیٹھ پر اس زور سے دو تھڑ مارا کہ ہمارے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اور ہم ہائے رام ہائے رام کرنے لگے انہوں نے ہماری چیخ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا میں نے تم کو اس لیے ٹوٹے ہوئے برتن دکھائے تھے کہ تم باورچی کے سامنے فلسفے پر پکچر بگھار کر باہر چلے جاؤ۔

ہم نے کہا ارے پھر تم کیا چاہتی تھیں کہنے لگیں ہم چاہتے تھے کہ تم نوکر کو مارو ہم نے کہا رام رام کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہم مار کیسے سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کیا تمہارے ہاتھ ٹوٹ چکے ہیں؟

ہم نے کہا ارے بات سمجھنے کی تو کوشش کرو۔ کہیں ہاتھ خالی ہات بھیکسی وک مار سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا یہ خالی بھرے ہات کی کیا بات کر رہے ہو۔ ہم نے کہا ارے بی بی جب کھوپڑی میں غصہ بھر جاتا ہے تو کھوپڑی ہات کو مارنے کا حکم دیتی ہے۔ ہماری کھوپڑی میں غصہ تھا ہی نہیں مارتے کیسے؟ اب سمجھیں؟

میں نے گھرا کر یہ سارا واقعہ بیوی سے بتا دیا۔ شام کو سکینہ صاحبہ آئے تو انہوں نے کہا سکینہ صاحبہ سنتی ہوں کہ آپ کی بیوی بڑی پاجن ہیں اور میں نے دلہی دل میں کہا اور تم کیا کم ہو۔ سکینہ نے جواب دیا کہ اس پاجن پن میں میری بیوی کا رتی بھر بھی قصور نہیں ہے اس میں تمام قصور ہے شادی کے رواج کا بھابی دراصل یہ میاں بیوی کا رشتہ ہی کمینہ ہوتا ہے۔ اور یہ جو کچھ ہوا وہ اسی کمبخت رشتے کا پاجن پن تھا اور کچھ بھی نہیں اور میری بیوی منہ پھلا کر اندر چلی گئی۔ بیوی کے اندر جاتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا اب ہمیں جانے دو۔ میں نے کہا ابھی تو ایک پیگ باقی ہے اور پھر کھانا بھی کھانا ہے۔ انہوں نے کہا اب میں نہیں ٹھہروں گا۔ آپ کی بیوی بگڑ گئی ہیں۔ ایسا نہ ہو مجھے دسپنے سے آکر مارنے لگیں میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب ان کی بزدلی کا دوسرا واقعہ بھی سن لیجیے۔ وہلی کے قدسیہ باغ میں ایک روز شام کے وقت ہم لوگ موٹر میں بیٹھے پی رہے تھے کہ گشتی پولیس کے دو آدمی ادھر آنکے اور ہم سے کہا آپ لوگ پبلک مقام پر شراب پی رہے ہیں تھانے چلیے تھانے کا نام سنتے ہی سکینہ کے ہات سے گلاس چھوٹ گیا۔ میں نے پولیس والوں سے ڈانٹ کر کہا ہم ہانے وانے نہیں جائیں گے ہماری گاڑی کا نمبر نوٹ کر کے

ہماری رپورٹ کر دو۔

پولیس والے میرا منہ دیکھنے لگے۔ اور انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا میرے ڈرائیور سے کہا! ہماری گاڑی سٹارٹ کر دو۔ اور قدسیہ باغ کے پھاٹک سے نکل کر ہماری نے جب نئی دہلی کی طرف گاڑی موڑ دی تو انہوں نے کہا نہیں سیدھے چیف کمشنر کے ہاں لے چلو۔ میں نے کہا ہم تو انڈیا گیٹ جانے کے لیے نکلے تھے۔ اس وقت چیف کمشنر کے وہاں جانے کا کیا تک ہے۔ انہوں نے کہا اب انڈیا گیٹ نہیں جائیں گے۔ اس لیے کہ یہ پولیس ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے کہا گھانس کھا گئے ہو۔ پیدل پولیس والے موٹر کا تعاقب کریں گے۔ انہوں نے کہا یہ باتیں نہ کرو پولیس سب کچھ کر سکتی ہے۔ ہماری گاڑی موڑ دو چیف کمشنر کی طرف شکر پرشاد صاحب چیف کمشنر کے وہاں جیسے ہی گاڑی رکی وہ اس قدر زور سے کٹھی کی طرف بھاگے کہ کتے بھونکنے لگے اور اندر جا کر انہوں نے چیف کمشنر سے کہا۔ شکر پرشاد صاحب خدا کے لیے ہم کو بچائیے پولیس ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ شکر پرشاد نے حیران ہو کر پوچھا کیا بابا ہے میں نے فقہہ مار کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ بھی ہنسنے لگے۔ ہم کو ہنستا دیکھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے اور کہنے لگے خطرناک موقع پر ہنستے نہیں ہیں، اس سے خطرہ اور قریب آ جاتا ہے۔ شکر پرشاد صاحب آپ فوراً چودھری آئی جی کو فون کر دیں کہ وہ ان دونوں پولیس والوں کو گرفتار کر لیں۔

شکر پرشاد نے کہا ارے سکسینہ کیسی باتیں کر رہے ہو انہوں نے کہا یہ موقع مباحثے کا نہیں پر ماتما کا واسطہ ابھی فون کر دو شکر پرشاد نے فون کر کے آئی جی کو اپنے گھر ہی بلا لیا اور ہنس ہنس کر سارا واقعہ بیان کر کے کہا چودھری صاحب ان کی تسلی کر دیجیے۔ چودھری نے ان کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ آپ فکر نہ کریں میں ان پولیس والوں کو بخوبی تنبیہ کر دوں گا۔ لیکن ان کا خوف کم نہیں ہوا۔ اس کے بعد وہ سکی کا دور چلنے لگا۔ اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب ہم لوگ فارغ ہوئے تو میں نے کہا آئیے

سکسینہ صاحب آپ کو گھر پہنچا دوں انہوں نے قہر کی نظر سے دیکھ کر مجھ سے کہا آپ جائیں اور گرفتار ہو جائیں۔ اس میں میں نے اور شکر دونوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ انہوں نے کہا جتنا چاہو دل کھول کر ہنس لو ہم اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھیں گے۔ شکر پر شاد صاحب گاڑی بھیج کر ہمارے کپڑے منگوا لیجئے۔

الغرض وہ دفتر میں رخصت کی درخواست کر کے پورے ایک ہفتے شکر پر شاد ہی کے گھر رہے۔ اور ساتویں دن آئے تو آئی جی کے ساتھ دفتر آئے۔

جب اس واقعے اور سکسینہ کی زبان سے اس خوفناک حادثے کو اٹھ دنگز گئے تو مجھے شوخی سوچھی۔ اور فون پر ان سے یہ کہا کہ سکسینہ صاحب پولیس ہتھکڑیاں لیے ہوئے میرے کمرے کی طرف آرہی ہے۔ یہ سنتھے ہی میں نے ان کی چیخ اور کھٹاک سے فون گر جانے کی آواز سنی۔ اتنے میں چند اور احباب آگئے اور میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ ابھی میں باتیں کر ہی رہا تھا کہ میرے دوست کنور مہندر سنگھ سٹی مجسٹریٹ میرے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکل گیا آئیں!

میں نے پوچھا کیا بات ہے انہوں نے کہا سکسینہ صاحب عجیب آدمی ہیں انہوں نے ابھی مجھے فون کیا کہ فوراً جائے جوش گرفتار ہو چکے ہیں اور اب میری باری آرہی ہے۔

میں نے ہنس کر کہا میں نے تو ان سے مذاق کیا تھا۔ کنور صاحب نے کہا ان سے ایسا مذاق کرنا تو بے حد خطرناک ہے۔ وہ ایسے مذاق سے مر بھی سکتے ہیں۔ چلیے ان کے کمرے میں چلیں اور جب کمرے میں جا کر دیکھا تو انہیں موجود نہیں پایا۔ میں نے کہا صرف دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ آپ کے وہاں گئے ہوئے ہیں شکر پر شاد صاحب کے پاس کنور صاحب نے میرے کمرے میں آ کر اپنے اجلاس پر فون کر کے پوچھا معلوم ہوا ہے کہ وہاں نہیں ہیں۔ اتنے میں شکر پر شاد کا فون آیا کہ جوش صاحب



مجھے بتائیے کہ ہوا کیا، میں نے کہا کچھ بھی نہیں ہوا۔ خالی مذاق کیا تھا سکسینہ سے انہوں نے کہا بڑا غضب کیا آپ نے سکسینہ کی حالت خراب ہے۔ وہ سات گلاس پانی پی چکے ہیں۔

کنور صاحب کو لے کر وہاں پہنچا دیکھا کہ سکسینہ کا چہرہ سفید ہو چکا ہے۔ میں قہقہہ مار کر ان سے لپٹ گیا۔ اور کہا ارے اتنی سی دل لگی میں دم نکل گیا۔ انہوں نے پھٹی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھا ایک حرف زبان سے نہیں کہا۔ اور آنکھیں نیچی کر لیں۔

میں نے اور کنور صاحب نے ان کو لا کھلا کھ سمجھایا کہ ارے خدا کی قسم آپ سے مذاق کیا تھا لیکن وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ شکر نے کہا ارے بھائی اب تو حواس درست کر لو ہنسو بولو اور مذاق کا لطف اٹھاؤ۔ انہوں نے کہا شکر صاحب ہمارے گھر گاڑی بھیج کر ہمارے کپڑے منگا لیجیے۔ اب ہم آٹھ روز تک آپ ہی کے گھر میں رہیں گے۔ اور ہم لوگ جھک مار کر چلے گئے اور جب خدا خدا کر کے دس بارہ روز کے بعد آئی جی کے ساتھ وہ پھر دفتر آئے۔ اور لنچ کے بعد سبزے پر میرے ساتھ بیٹھ گئے تو انہوں نے بڑی متانت سے کہا جوش ہمارے من کی بات سنو گے۔ میں نے کہا ضرور سنوں گا۔ تو انہوں نے کہا جن پولیس والوں نے قدسیہ باغ میں ہم کو ٹوکا تھا جب تک ہندوستان کے تمام اخباروں میں ان کی موت کی خبر نہیں چھپ جائے گی اس وقت تک ہم اپنے کو سیف (Safe) نہیں سمجھیں گے۔

ہے دنیا میں کوئی مثال اس بے پایاں بزدلی کی؟

یہ میرے چلا چلاؤ کا زمانہ ہے دیکھیے سکسینہ سے اب کبھی ملاقات ہوگی بھی کہ نہیں میں مرجاؤں تو کوئی ان کو میرا سلام پہنچا کر یہ کہہ دے کہ تمہارا سب سے بڑا چاہنے والا اس دنیا سے اٹھ گیا برشا خوش بادنا خوش ہائے دنیا دنی!

محفوظ

## مانی جائسی

گورے رنگ متوسط قامت کے خوش رو بدگمان، سرایع الغضب، خدمات فراموش، پریشان روزگاری میں کامل دوست، فراغت میں قطعی اجنبی، اوہام کی حد تک راسخ العقائد بدرجہ اتم نکتہ سنج، قیامت کے ذہین، نہایت خوش فکر غزل گو، بلا کے عاشق مزاج اور ایسی رحم انگیز دردمندی سے غزل پڑھنے والے انسان تھے کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں ایسا دل ہے جو صبح از لے شام ابد تک برابر پھٹتا ہی چلا جائے گا۔ اور لہجے میں ایسی کشش موسیقی تھی کہ بات کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طبلے پر بول کٹتے چلے جا رہے ہیں۔

میری نوعمری کے زمانے میں وہ میرے چچا نواب محمد علی خاں کی سرکار میں بطور منشی ملازم میرے پرائیویٹ ٹیوٹر اور کچھ روز کے بعد میرے بڑے بے تکلف دوست بھی ہو گئے تھے۔ اور ایسے دوست کہ ایک مدت تک میں ان کو اپنے تمام دوستوں سے زیادہ چاہتا رہا تھا۔

وہ ملیح آباد کے اثنائے قیام میں میرے چچا کی فرنگی بیوی کے بھائی پر مرٹے اور ہر آن اسی کا نام رنا کرتے تھے۔ اور جب اس سے ان کا دل بھر گیا تو لکھنؤ کی ایک خوبرو طوائف پر جس کا نام غالباً مہدی جان تھا مرنے لگے تھے اور اس کے عشق میں جب ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی تو میں نے اس طوائف کو ملیح آباد طلب کر کے ان کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے جھانکا تو یہ دیکھا کہ وہ پاؤں دبا دبا کر بری طرح رو رہے ہیں۔

میں نے ان کو بلا کر کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ پاؤں دبائے اور سٹوے بہانے کا موقع نہیں ہے۔ جائے اور خوش فعلیاں کیجیے۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اچھا اور اندر جاتے ہی پھر اسکے پاؤں دبا دبا کر رونے لگے۔ اس بات کا لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا لیکن یہ میری آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے کہ وہ میرے بار بار سمجھانے

کے باوجود اس طوائف کے پاؤں رات بھر رو رو کر دباتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جناب والا اس کم بخت عشق کی بھی ہزاروں شائیں ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات تو یہ جذ بہ انسان کو اس طرح دیوچ لیتا ہے کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

یہ غالباً سنہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے کہ میرے کل کے یار اور آج کے اجنبی دوست مخمور اکبر آبادی نے آگرے سے مجھ کو اپنی شادی کا دعوت نامہ بھیجا تھا اور مانی سے میری شیفٹنگی پر نگاہ کر کے مجھ کو چکھی دینے کی خاطر یہ بھی لکھا تھا کہ مانی بھی ان کی شادی میں شریک ہونے والے ہیں..... تو میں چالیس فی صد مخمور کی شادی میں شریک ہونے اور ساٹھ فی صد مانی سے ملنے کے لیے اتنا بڑا سفر اختیار کر کے حیدر آباد دکن سے آگرے آ گیا تھا..... لیکن میں جب قیصر باغ میں اس وقت ان سے ملنے گیا جب کہ وہ راجہ صاحب محمود آباد کی سرکار میں ان کی بیگم کی ریاست بلہرہ کے مینجر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے تو انہوں نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی اور میرے منہ پر یہاں تک کہہ دیا کہ جوش صاحب میں ضیاء عباس کے علاوہ کسی اور کو اپنا دوست ہی نہیں سمجھتا۔ اس بات نے میرا دل اس قدر توڑ دیا کہ میں نے ان کے پاس آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔

لیکن اس واقعے کے کئی برس کے بعد جب حکیم عالم نے مجھے اس امر سے آگاہ کیا کہ مانی کو راجہ صاحب محمود نے چھڑا دیا ہے اور بے چارے کڑھ کے ابو تراب خاں کے ایک ٹوٹے مکان میں بڑی عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو مجھ سے رہا نہیں گیا میں نے دوپہر کی پروا نہیں کی۔ سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ پانی پانی ہو گئے اور جب میں دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا اور کہا کہ جب تک میں زندہ رہوں گا آپ پریشان نہیں ہو سکتے۔ تو شدید حیرت اور بے پایاں شرمندگی اور لامحدود تشکر کے باعث انکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور جھکی آنکھوں سے انہوں نے کہا جوش صاحب میں نے آپ سے بڑا غیر شریفانہ برتاؤ کیا تھا۔ اگر کسی اور سے میں وہ برتاؤ

کرتا تو عمر بھر وہ میری صورت نہ دیکھتا۔ میں نے فوراً بات کاٹ کر کہا بس بس مانی صاحب مجھے شرمندہ نہ کیجیے..... اور ہماری دوستی پھر بحال ہوگئی۔

اور جب معاشی پریشانی میں گھر کر غالباً سنہ ۱۹۴۸ء میں وہ میرے پاس دہلی آئے اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں سرکار ہند سے ان کا ادبی وظیفہ مقرر کرادوں..... تو میں نے سیدھا مولانا ابوالکلام کے پاس یا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ انہوں نے کہا میں تو ان کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا اور میرا خیال ہے کہ آپ کا سببا لغ النظر آدمی بھی یہی سمجھتا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ یگانگت کی بنا پر آپ سفارش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا مولانا وقت واحد میسجپ نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں ایک معنوی اور ایک لفظی۔ معنوی ٹھوکرتو یہ ہے کہ آپ مانی صاحب کو سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھتے یہ صحیح ہے کہ وہ بڑے شاعر نہیں اور کوئی غزل گو بڑا شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر ہمارے یہاں جو شعر کا معیار ہے اس پر نگاہ کر کے میں ان کو ہزاروں غزل گو بانوں پر ترجیح دوں گا۔ اور یگانگت کا لفظ استعمال کر کے آپ نے لفظی ٹھوکر کھائی ہے۔ فارسی لفظ یگانہ میں یہ تارے عربی کہاں سے آگئی مولانا کے شہرے پر شدید انفعال دوڑ گیا۔ پھر بھی انہوں نے سنبھل کر کہا یہ غلطم انعام ہے..... میں نے کہا جان کی اماں پاؤں تو یہ بات زبان پر لاؤں کہ یہ غلط العام نہیں غلط العوام ہے۔ وہ شرمندہ ہو کر مسکرانے لگے۔ اور میں پنڈت جی کے پاس چلا گیا۔

انکے سیکرٹری نے کہا جوش صاحب پنڈت جی اس وقت نہایت ضروری کام کر رہے ہیں انہیں بالکل فرصت نہیں ہے۔ میں نے کہا تو پھر آپ میرا نام لے کر یہ پوچھ آئیں کہ میں کب آؤں۔

سیکرٹری نے آکر کہا پنڈت جی سے آپ ابھی مل سکتے ہیں۔ میں پہنچا تو وہ ایک اونچے سے ڈسک پر کھڑے لکھ رہے تھے۔ میں نے کہا اپنے استاد حضرت مانی جاسی کو آپ سے ملانے آیا ہوں انہوں نے کہا کہ آپ کا بھی کوئی استاد ہو سکتا ہے؟ بلا



لیجیے..... مانی نے اپنا دیوان پیش کیا پنڈت جی نے کہا میں آپ کا مشکور ہوں میں نے کہا شا کر کہیے..... ایسے مواقع پر مشکور کہنا غلط ہے انہوں نے ہنس کر کہا آپ کہاں تک میری زبان درست کریں گے۔ میں نے مانی صاحب کے ادبی وظیفے کی درخواست پیش کر دی۔ انہوں نے فوراً منظور کر کے اس پر دستخط کر دیے پنشن جاری ہو گئی اور مانی صاحب نے مجھ سے ملنا ترک فرما دیا۔

لیکن اگر آپ مجھ سے میرے دل کی بات پوچھیں تو میں بتاؤں کہ جب میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو دیر تک روتا رہا اور آج بھی جب ان کی یاد آ جاتی ہے تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں ہائے مانی..... ہائے مانی۔



## منے میرزا اثر لکھنوی

نہایت گورے رنگ بڑی بڑی بھوری مونچھوں کرنچی آنکھوں اور سبل ناک نقشے کے اس قدر شگفتہ مزاج اور مخلص انسان تھے کہ ان سے مل کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایسے خوش فکر مرثیہ و غزل گو شاعر بھی تھے کہ اگر شدید قسم کی سنک ان کا راستہ نہ روک لیتے تو اساتذہ لکھنوی میں وہ نہایت نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔ وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے اور میرے باپ کے ملنے والے تھے۔ لیکن میری ہمکنی ہوئی جوانی کی بے پایاں شوخی اور انکی ڈھلتی عمر کی شدید سنک نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں کہ ہم دونوں میں ہم عمروں کی سی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔

جب کبھی کبھار میں دس پندرہ روز لکھنؤ نہیں جاتا تھا وہ مجھ سے ملنے یلح آباد آ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز وہ ملیجاً آباد آئے ہوئے تھے اور ہم لوگ اپنے احاطے کی انگنائی میں بیٹھے ان کی باتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے کہا سنیے ایک تازہ غزل کہی ہے؟ قید رسم و رواج کیا کیجیے کی طرح پر جس کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

ہوس زر ، بری سہی ، لیکن  
ہو اگر احتیاج کیا کیجیے  
ہم نے مانا کہ وہ کل آئیں گے  
عقل حیراں ہے آج کیا کیجیے

دوسرا شعر سن کر میں نے کہا میں آپ کے اس آج کیا کیجیے کا حل آپ کو بتا دوں؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے چہرے کو گھور کر دیکھا۔ میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی مٹھی پکڑ لی اور ہاتھ ہلا ہلا کر کہا اثر صاحب آج یہ کیجیے۔ وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے خدا ہماری سنک کا بیڑہ غرق کر دے جو ہم لونڈوں کی صحبت میں لا کر بٹھاتی ہے۔ اور ایسے فحش اشارات دکھاتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ بس

ملاقات ختم ہم ابھی لکھنوجار ہے ہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں روکا۔ اور تھوڑی دیر میں وہ من گئے۔ اور جب ان کا مزاج نارمل ہو گیا تو میں نے کہا شرر صاحب ایک مصرع کہتا ہوں سینہ بلبل میں چھالا پڑ گیا۔ اسپر ایک شعر کہہ دیجیے چھالا قافیہ ہو گا۔ انہوں نے دو منٹ تک سوچا اور اچھل کر کہا لو جیسی طرح ہے ویسا ہی لونڈھیائی شعر سن لو

لیٹنے میں پھینک کر دل یہ کہا  
وہ پڑا ہے ..... جا اٹھا لا پڑ گیا

چھوٹے دادا نے قہقہہ لگا کر کہا واہ کیا بغدہ شیدی لندھور شعر کہا ہے..... وہ ہنسنے لگے۔ اور جب میں نے یہ اعتراض کیا کہ اس شعر میں ردیف مہمل اور گوئی ہو کر رہ گئی ہے تو انہوں نے کہا ردیف نہ مہمل ہے نہ گوئی با معنی ہے اور آواز بھی دے رہی ہے۔ صاحب زادے یہ ڈرامائی شعر ہے اندر چلو میں تخت پر بیٹھ کر اس شعر کو آنکھوں سے دکھا کر سمجھا دوں گا۔ وہ اندر جا کر تخت بیٹھ گئے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے کہا دیکھو اس مٹھی میں عاشق کا دل ہے۔ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ لیٹنے لگے ابرار سے کہا تم عاشق بن کر سامنے کھڑے ہو جاؤ اور جب ابرار عاشق بن کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے تو لیٹتے لیٹتے انہوں نے اپنی مٹھی کھول کر اس کو اس طرح جھٹکا دیا گویا انہوں نے فرش پر ان کا دل پھینک دیا ہے اور دل پھینکتے ہی وہ ابرار کی طرف یہ نگاہ کر کے کہتے ہوئے کہ وہ پڑا ہے جا اٹھا لا دھم سے لیٹ گئے۔ اور کہنے لگے اب بتاؤ پڑ گیا یعنی لیٹ گیا میں ردیف چسپاں ہوئی کہ نہیں؟

اب ان کی سنک کے دو واقعے بھی سن لیجیے میرے باپ کی زندگی کا واقعہ ہے ایک روز وہ خاصہ تناول فرما کر لیٹے اور شرران کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ میرے باپ کے ایک شاگرد شباب لکھنوی اصلاح کے لیے ایک غزل لے کر آئے میرے باپ پر غنودگی طاری تھی انہوں نے فرمایا شرر صاحب آپ اصلاح دے دیجیے انہوں نے

بڑی بے چارگی سے کہا خاں صاحب میں کیوں کر اصلاح دے سکتا ہوں۔ میرے پانچے میں تو گھٹنے کے اوپر کھونچا لگ گیا ہے ان کا یہ نرالا عذر سن کر میرا باپ نے قہقہہ لگا کر فرمایا کہ اگر مجھ کو اس حادثے کا علم ہوتا تو میں آپ سے اصلاح کے لیے ہرگز نہ کہتا۔ اس لیے کہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب کسی شاعر کے پانچے میں اور بھی وہ گھٹنے کے اوپر کھونچا لگ جاتا ہے تو اس میں اصلاح دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور شرر یہ سمجھ کر کہ میرے باپ ان کا مذاق نہیں اڑا رہے ہیں۔ بلکہ انکی تائید کر رہے ہیں بے حد خوش ہو گئے۔

جب میں سینٹ پیر کالج میں پڑھتا تھا اور لکھنؤ میں تعطیل کا زمانہ گزرا کر آگرے جانے والا تھا تو میں نے شرر صاحب سے یہ محکم وعدہ لے لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ آگرے چل کر دو ایک مہینے گزار دیں گے۔

لیکن جب میں ابراہار اور رئیس کو ساتھ لے کرتا ننگے میں لد پھندا اوزیر گنج پہنچا اور ان کے مکان پر دستک دے کر پوچھا کہ شرر صاحب ہیں یا نہیں۔ تو انکی بیگم نے کہا جی ہاں ہیں اور پھر اس جی ہاں کے ایک سیکنڈ کے بعد آواز آئی اچھا نہیں ہیں۔ اس میں اور اچھا نہیں ہیں۔ سے میں سمجھ گیا کہ وہ گھر میں چھپے ہیں۔ اور یہ اچھا نہیں ہیں ان کے اشارے پر کہا گیا ہے۔ اتنے میں ان کے دروازے کا پردہ ہوا سے جنبش میں آ گیا اور میں نے دیوار کے قد آدم آئینے میں دیکھ لیا کہ شررا اپنی بیگم سے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں میں نے پکار کر کہا شرر صاحب خیریت اسی میں ہے کہ آپ فوراً باہر آ جائیں ورنہ میں ایک دو تین کہہ کر گھر میں گھس پڑوں گا۔ اور جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو لونڈے پن کا تو زمانہ تھا ہی میں ایک دو تین کہہ کر ان کے گھر میں گھس گیا وہ آئیں آئیں کرتے رہے اور میں ان کو کھینچ کر باہر لے آیا۔ اور ان کی بیگم کی آواز آئی کرو پٹھانوں سے دوستی اور اندر سے دروازے میں زنجیر لگالی۔

میں نے کہا آپ نے تو آگرے چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا



ہاں ہاں گئے گئے وعدہ کیا تھا لیکن یکا یک ایک بڑا ضروری کام نکل آیا ہے کل اسے نمٹا کر پرسوں شام تک آگرے آجاؤں گا۔ میں نے کہا ضروری کام کی ایسی کی تیسری میں تو اسی وقت ساتھ لے جاؤں گا۔ انہوں نے کہا حضرت عباس کی قسم آج نہیں جاسکتا خواہ آپ مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں..... میں نے کہا تو اچھا ہم کو سٹیشن تک تو پہنچا دو گے۔ وہ تانگے میں بیٹھ گئے میں نے تانگے والے سے کہا چلیے چلیے نا۔ انہوں نے کہا خون حسین کی قسم بالکل مجبور ہوں ورنہ ضرور چلتا۔ اب تانگے سے ہمارا سامان اترنے لگا اور ابرار کو روپے دے کر میں نے کہا کہ ہمارے ٹکٹ لے آؤ اور ایک پلیٹ فارم ٹکٹ شرر صاحب کے لیے بھی لیتے آنا اور جب ابرار بکنگ آفس کی طرف روانہ ہونے لگے تو حیرت ہو گئی کہ اس بات پر شرر صاحب نے پکار کر کہا ابرار پلیٹ فارم کا نہیں ہمارا بھی آگرے کا ٹکٹ ہی لے آؤ دیکھی ہے آپ نے کبھی ایسی تگڑی سنک جے مہاتما شرر لکھنوی کی!

آگرے کا ذکر ہے ایک روز شرر ابرار رئیس اور میں سب مل کر میرزا محمد زکریا صاحب ملک کے وہاں گئے۔ ملک صاحب میرے باپ کے نا نہالی بھائی اور آگرے کے رئیس اعظم و نامور شعر میرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبر آبادی کے بڑے تیکھے اور بانگے فرزند تھے۔ میں نے راستے میں کہا شرر صاحب اس قدر عنایت ضرور کیجیے گا کہ کم سے کم پہلی ہی ملاقات میں ملک چچا کو اس بات کا پتا نہ چل جائے کہ آپ سنگی ہیں۔ انہوں نے کہا اور آپ بھی اپنی سنک کو ظاہر نہ ہونے دیجیے گا۔ میں نے کہا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور آپ بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا قول مردوں جانے دارداب ہم ملک صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے انہوں نے ہم لوگوں کو بڑی شفقت کے ساتھ گئے سے لگایا میں نے شرر صاحب کا تعارف کرایا انہوں نے بڑے تپا کسے ان سے بات ملایا اور صدر مقام پر بٹھا دیا۔ اور اھد را دھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں ملک صاحب نے چونک

کر کہا معاف کیجیے گا شرر صاحب میں چائے بھول گیا۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے ملازم کو آواز دی۔ شرر نے کہا میرزا صاحب چائے کی قطعی زحمت نہ فرمائیے ملک صاحب نے کہا بھلا جناب والا چائے میں زحمت ہی کیا ہوتی ہے شرر صاحب نے کہا بات یہ ہے میرزا صاحب کہ میں چائے قطعاً پیتا ہی نہیں ہوں اس لیے وہ ضائع ہو جائے گی۔ ملک صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اب شاعری شروع ہو گئی۔ ملک صاحب نے پہلے اپنا کلام سنایا پھر شرر صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ انہوں نے کہا میرزا صاحب مجھ ناچیز کا کلام سننے سے پہلے چائے تو پلا دیجیے۔ یہ انوکھی بات سنتے ہی میرزا صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور چائے آگئی تو انہیں بڑے شوق سے چائے پیتے دیکھ کر وہ ہم سب لوگوں کو بار بار دیکھنے لگے۔

گھر آتے ہی میں نے ان سے کہا کیوں شرر صاحب آخر آپ سب نے ہم سبکی ناک کٹوا دی نا۔ پہلی ہی ملاقات میں یہ ظاہر کر دیا کہ آپ معمولی نہیں پر لے درجے کے سبکی ہیں انہوں نے بات کاٹ کر کہا سنگیہوں ہمارے دشمن ہم نے بفضلہ کوئی سنگلی بات نہیں کی ہے۔ میں نے کہا دیکھیے خیریت اسی میں ہے کہ قائل ہو جائیے۔ انہوں نے کہا قیامت تک قائل نہیں ہوں گا۔ میں نے پوچھا پرانی قائل کر دینے والی صورت پر عمل کروں انہوں نے کہا سو بار عمل کر دیکھیے بندہ قائل نہیں ہونے کا۔ میں نے کہا رئیس وہی پرانا عمل یہ سنتے ہی رئیس نے ان کو چارپائی سے گرا کر اپنی پہلوانی گھٹنا ان کے سینے پر رکھ کر پوچھا قائل ہوئے یا نہیں۔ انہوں نے کہا نہیں ہرگز نہیں۔ اب اور گھٹنا دبا کر پوچھا اب کہا اب بھی نہیں قطعی نہیں۔ اور اب سہ بارہ جب رئیس نے اپنا گھٹنا ان کے سینے پر بہت زور سے دبا کر پوچھا اور اب تو وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ قائل قائل قائل۔ اور ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور لطف یہ کہ تھوڑی دیر میں وہ تہقہبے لگانے لگے۔

اب ایک آخری بات سنا کر جو آج تک فراموش نہیں ہو سکی ہے۔ ان کی داستان کو

ختم کر رہا ہوں۔

ایک روز آغاز بہاراں کے جادو بھرے گنگنا جمنی دھند لکے میں۔ جب کہ آسمان سے زمین تک منہ پر مٹھاس اتر رہی تھی۔ ہم لوگ امرغان سحر کی بانگوں آمادہ سفر ستاروں اور ترانہ خواں جھونکوں میں ڈوبے ہوئے گوشتی کے ساحل پر ٹہل رہے تھے کہ ایک دور کے مندر کے چراغ کی سہانی روشنی نے ہم کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور مندر کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہم جھومنے لگے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ بڑی آہستگی کے ساتھ جھٹکتا ہوا عرش بریں کی جانب اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ اور کائنات بھیرویں میں ڈوب کر یہ رباعی گنگنا رہی ہے۔

آتش	پے	مغاں	نے	راگ	گایا	تیرا
ہندو	نے	صنم	میں	جلوہ	پایا	تیرا
دہری	نے	کیا	دہر	سے	تعبیر	تجھے
انکار	کسی	سے	بن	نہ	آیا	تیرا

کہ اتنے میں ایک لالہ رخ طفل برہمن جس کا بھرا بھرا چہرہ پگھلتے ہوئے سونے سے ابل اور اچھل رہا تھا جس کی خواب آلودہ آنکھوں میں شام اودھ کروٹیں لے رہی تھی۔ اور جس کے ماتھے پر قشتے سے صبح بنارس طالع ہو رہی تھی۔ اپنے پھول سے گلے میں حیطہ ابض اور قوس قزح کی سی آڑی زنا رڈالے ایسی نندا سی لٹک کے ساتھ مندر سے برآمد ہوا۔ جیسے کھرے کے پیچ در پیچ بھورے نم ناک لچھوں میں کنوار کی شعاع اولیں مچلتی نظر آتی ہے۔ میں نے شفق صبح کی کوکھ سے پیدا ہونے والے اس طفل نواز کو دیکھا تو یا ہو کا نعرہ لگا کر سر سھننے لگا۔ اور شرر نے کلیجہ تھام کر آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑے وقفے کے بعد انہوں نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا کہا سنیے ابھی ابھی اس فتنہ دہر پر ایک شعر کہا ہے۔

کوئی اس وقت برہمن کی صباحت دیکھے

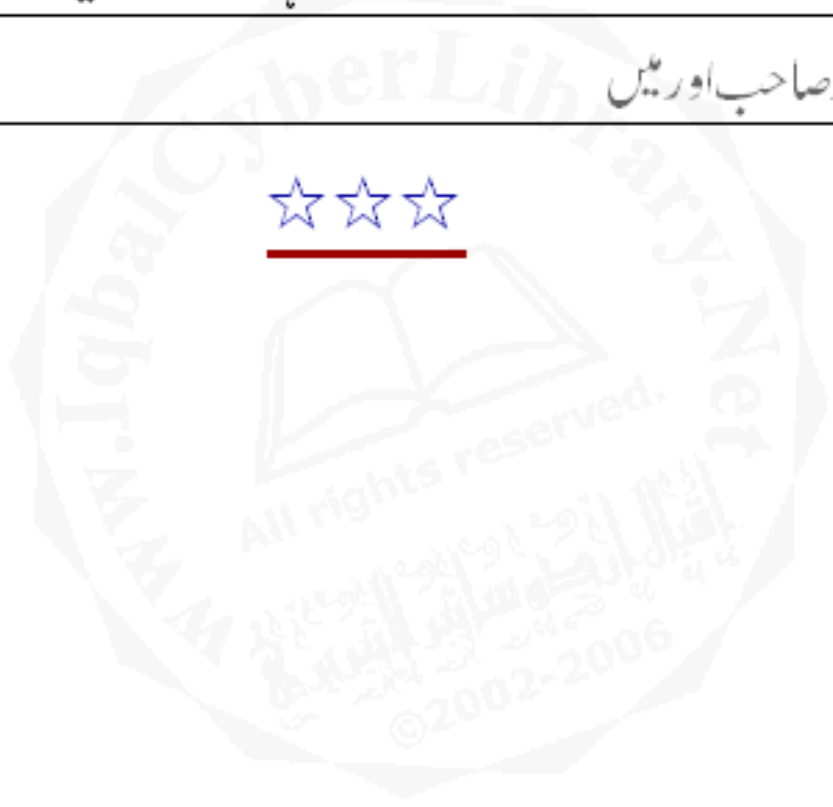
نکلے جب رات کا جاگا ہوا ب خانے سے!  
ہائے وہ دھند لکا ہائے وہ بالکا ہائے وہ شر رہائے وہ سماں اس گھری کا ایک ایک لمحہ  
میرے دل میں آج تک برچھی کی طرح چبھا ہوا ہے۔

رنگ مل سینے میں چبھتا ہے کسے آواز دوں  
بوئے گل دل میں کھٹکتی ہے الہی کیا کروں!!

---

اشتر صاحب اور میں

---





## شاہ دل گیر اکبر آبادی

رسالہ نقاد کے مدیر خاندان مشائخ کے چشم و چراغ دراز قامت دراز ریش وراس دست کوتاہ ہمت بخل پسند پر کیسہ تہی دست کثیر السواد قلیل الرماذ بخوشی میہمان بکراہت میزبان عقاب پنجہ کبوتر مزاج خانقاہ کی محراب میں قطب الاقطاب حسینوں کی جناب میں پارہ سیماب کیا کیا خصوصیات بیان کروں شاہ صاحب کے۔

وہ اس قدر تلملا جاتے تھے کہ ماہ جبینوں کو دیکھ کر کہ ان کے حواس بجا نہیں رہتے تھے۔ راہ گلی میں ان کے ساتھ چلنا پھرنا بے حد خطرناک تھا اس لیے کہ جب کسی حسین چہرے پر ان کی نگاہ پڑ جاتی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کی پسلی پر اس قدر زور سے کہنی مارتے تھے کہ اس بے چارے کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی۔ اسی طرح جب وہ جھوم جھوم کر دیوانہ وار اپنا کلام سناتے تھے تو زور زور داد دینے والے کی ران پر اپنا پہاڑ سا ہاتھ اس قدر زور سے مارتے تھے کہ وہ غریب اچھل جایا کرتا تھا۔

ایک بار وہ ٹونڈلہ جنشن تک مجھے پہنچانے گئے تھے میری گاڑی کے باقاعدہ ایک دوسری گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس گاڑی میں نہایت قبول صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے اسے دیکھ لیا وہیں جم کر کھڑے ہو گئے۔ اور میری پسلیوں پر برابر کہنیاں مارنے لگے۔ میری پسلیاں پھوڑا ہو گئیں۔ تو میں نے تو قدم پیچھے ہٹ کر اسے قلی کو ان کے پہلو میں کھڑا کر دیا۔ وہ اس قدر مجھو تھے کہ انہیں اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ ..... اور اب انہوں نے پھر بڑے زور سے کہنی ماری کہنی قلی کی پسلیوں میں لگی۔ اس کے سر سے میرا بکس اور بستر گر گیا اس نے ہائے رام کہا اور اپنی پسلیاں پکڑ کر پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا۔ اور مجھ دکھتی پسلیوں کے در در سیدہ سے بد بخت کی گاڑی چھوٹ گئی۔

آگرے کے اثنائے قیام میں ایک روز مجھے شرارت سو جھی۔ فانی ومانی کو ساتھ لے کر شاہ صاحب کے وہاں پہنچا ان دونوں کو شاہ صاحب کے داہنے بائیں بٹھا کر خود ایک گز کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اور ان سے کلام سنانے کی فرمائش کر دی فانی ومانی فوراً

تاڑ گئے میری شرارت کو۔ انہوں نے کہا جوش صاحب اپنی کرسی پر ہم دونوں کے درمیان لے آئے میں سمجھ گیا کہ ان کی نیت اور اپنی جگہ سے یہ کہہ کر نہیں ہلا کہ ادھر ہوا خوب آ رہی ہے۔ اب شاہ صاحب نے شعر خوانی شروع کر دی۔ فانی و مانی بڑی آہستگی سے داد دینے لگے۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر زور سے داد دیں گے تو شاہ صاحب کا بھاری ہاتھ پڑنے لگے گا ان کی رانوں پر

اتنے میں انہوں نے جب اپنا یہ شعر سنایا  
تم کو نہیں مجھے تو نہایت عزیز تھا  
وہ نامراد دل جو شہید جفا ہوا  
تو ان دونوں کی چالاکی کا توڑ کرنے کے لیے میں نے ایک فلک شگاف نعرے کے ساتھ کہا سبحان اللہ سبحان اللہ۔ شاہ صاحب نے بڑے زور سے جھوم کر فانی کی ران پر ترقی سے ہات مار دیا۔ فانی کانپ اٹھے میں نے کہا شاہ صاحب مکرر ارشاد ہو..... اور انہوں نے جھوم کر دوبارہ شعر پڑھا۔

تم کو نہیں مجھے تو نہایت عزیز تھا  
وہ نامراد دل جو شہید وفا ہوا  
اب انہوں نے مانی کی ران پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ بہ بلبل کر رہ گئے۔  
میں نے کہا شاہ صاحب خدا کے واسطے ایک بار اور فانی اور مانی نے مجھ کو گھور کر دیکھا اور شاہ صاحب نے سہ بارہ..... ارے تم کو نہیں ارے تم کو نہیں ارے تم کو نہیں..... مجھے تو ارے مجھے تو نہایت عزیز تھا۔ اب دونوں کی رانوں پر تڑا تڑا تڑا ہاتھ پڑنے لگے۔ اور میں ہنسی چھپانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ کر جھومنے لگا۔

وہاں سے گھر آئے تو شاہ صاحب کے دونوں مضروب مجھ پر برس پڑے.....  
دونوں نے اپنی رانیں کھول کر دکھائیں۔ جن میں نیل پڑ چکے تھے۔ اور شاہ صاحب کی موٹی انگلیاں بنی ہوئی تھیں۔

## نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

حضرت عزیز لکھنوی کے قابل شاگرد مجھ ہیچ مداں کے استاد بھائی علم عروض و فن شاعری کے مرکزی استاد فارسی و انگریزی ادب کے زبردست نباض، قلمزم انسانیت کے منارہ ضو بار، ممبر انتقاد کے خطیب اعظم مسند زبان کے قاضی القضاات اور مدینہ تہذیب لکھنؤ کے طاق زریں کے ہزروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطاروں میں ایک ایسے آخری و تنہا چراغ تھے جن کے گل ہو جانے سے تمام شہر پر مہیب اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا ہے اور ہر ذرہ کراہ کراہ کر فریاد کر رہا ہے کہ

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے!  
ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں ایک پوری صدی ایک پورے طرز معاشرت کی موت ہے۔ اور نصیر الدین حیدر سے لے کر حضرت جان عالم کے زریں دور لکھنؤ کے اولیائے علم و ائمہ ادب نے شائستگی، تہذیب، نفاست، لطافت اور آداب کی نجابت کا جو دستور قائم کیا تھا۔ اور اس کے دوش بدوش انہوں نے جس وضع داری ایثار پسندی، تواضع شعاری نرم گفتاری شیریں لہجگی اور بلور مزاجی کو فروغ بخشا تھا اس کا بھی جنازہ نکل گیا۔

سنان مثل وادی غربت ہے لکھنؤ  
شاید کہ آتش آج وطن سے نکل گیا  
میں نے جب حضرت عزیز کے مکان پر سب سے پہلے انہیں دیکھا تھا تو اس وقت میری جوانی کی پہلی کرن پھوٹی تھی۔ اور وہ جوانی کی دو پہر سے گزر رہے تھے۔ میرے ان کے مابین چھوٹے اور بڑے بھائی کا سا برتاؤ تھا۔ اور چوں کہ وہ شدت ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اس لیے میری آزاد خیالی پر وہ ناک بھوں چڑھاتے اور اکثر مجھ کو ٹوکا کرتے تھے۔

اور رفتہ رفتہ جب میرے اور ان کے درمیان خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی تو ایک

روز میں نے کہا اثر صاحب اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں انہوں نے کہا شوق سے کہیے۔

میں نے کہا تمام ہندوستان آزادی حاصل کرنے کے لیے فرنگی کے روبرو خم ٹھونک کر میدان میں آچکا ہے محبان وطن دھڑ دھڑ نوکریاں چھوڑ چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں اور آپ حسین کھے پرستار ہونے کے باوجود ڈپٹی کمشنر کی کرسی پر بیٹھے عصر حاضر کے یزید فرنگی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ کیا جواب ہے اس کا آپ کے پاس؟ میری یہ بات سن کر ان کے چہرے کا رنگ ملگجاسا ہو گیا کوئی چیز ان کی پتلیوں میں چھپنے لگی؟ اور انہوں نے آنکھیں جھکالیں اور میں ان کے چہرے پر اس قدر کرب انگیز شرمندگی دیکھی کہ پھر تمام عمران سے اس موضوع پر بات ہی نہیں ان کی شاعری کا بھی میں کبھی قائل نہیں رہا۔ لیکن ان کے بے پایاں شرافت اور بے کراں زبان دانی کا ہمیشہ لوہا مانتا رہا ان کے تمام بے شمار خوبیاں سر آنکھوں پر لیکن ان کو اپنا کلام سنانے کا اس قدر ہوکا تھا کہ سامعین کی قوت برداشت کی ہڈیاں ٹوٹنے لگتی تھیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ معرض تحریر میں لا رہا ہوں جس کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اور بھی اور بھی سانس لینے لگیں گے۔

ایک بار مجاز کو ساتھ لے کر میں کشمیر گیا۔ اس دور میں مہاراجہ کشمیر حکم راں اور اثر صاحب کسی شعبے کے وزیر تھے۔ میں وہاں گیا تو تھا یہ نعرہ لگاتا ہوا کہ

عصیاں	کی	گھٹا	کی	چھاؤں	میں	دم	لینے
ممنوع	شجر	سے	لطف	پیہم	لینے		
آواز	دو	کاشمیر	آ	پہنچا	جوش		
اللہ	سے	انتقام	آدم	لینے			

لیکن وہاں پہنچا تو نواب جعفر علی خاں اثر کے ذوق غزل سرائی کی چھنی پھٹکی میں بند ہو گیا۔



ہاں تو سنیے کہ ہم کشمیر پہنچے تو دن ڈوب رہا تھا۔ میں نے کہا مجاز اس وقت تو یہ مناسب معلوم وہ رہا ہے کہ ہم شیخ عبداللہ اور اثر صاحب کو آنے کی اطلاع نہ دیں، اور کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں، ہوٹل میں ہم نے اپنا شغل شروع کر دیا۔ اور جب مجاز نے برآمدے میں کھڑے ہو کر سری نگر پر نگاہ ڈالی تو کہا جوش صاحب یہ شہر تو ایسا ہے گویا ہم ماربرے آگئے ہیں اس لطیفے پر ہنس کر ہم سو گئے۔

بہت تڑکے میں نے مجاز کو جگایا انہوں نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر کہا معاف کیجیے یہ وقت کوؤں کے جاگنے کا ہے میں بستر نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے انہیں جھنجھوڑ کر کہا ارے کم بخت دم بھر میں صبح کا گنگا جمنی جلوس گزرے گا۔ اور تو اپنی بند آنکھوں کے پوٹوں پر سے اس جلوس کو گزار دے گا۔ یہ کیسی غیر شاعرانہ حرکت ہے ارے کشمیر میں صبح کیوں کر ہوتی ہے یہ تو دیکھ لیے۔ الغرض مجاز کو زبردستی ساتھ لے کر ٹہلنے چلا گیا۔ ابھی مشکل سے دو میل ٹہلا ہوں گا کہ دیکھا کہ ایک کوٹھی کے پھاٹک کے ستون پر نواب جعفر علی خان کا بورڈ لٹکا ہوا بہیم کوٹھی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ کوٹھی کے بالائی برآمدے میں پھاٹک کی طرف منہ کیے کھڑے ہیں انہوں نے ہم کو دور سے دیکھ لیا۔ وہ لکڑی کے زینے سے کھٹ کھٹ کرتے نیچے آئے ہم سے بغل گیر ہوئے۔ پوچھا یہاں کب آئے میں نے کہا شام کو۔ انہوں نے کہا ٹھہرے کہاں ہیں میں نے کہا ہوٹل میں انہوں نے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا میرے وہاں سیدھے کیوں نہیں چلے آئے کیا مجھ کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے آواز دی کوئی ہے اردلی دوڑا آیا انہوں نے اس کو حکم دیا کہ ہمارا سامان ہوٹل سے لے آئے اور بل ادا کر دے۔ میں نے کہا بل میں ادا کروں گا۔ انہوں نے کہا ہرگز نہیں۔ اس مرحلے کے بعد وہ ہمیں اوپر لے گئے۔ اور ہم کو برآمدے میں بٹھا کر فوراً کمرے میں داخل ہو گئے۔ اور زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کے اندر ایک موٹی سی بیاض لے کر باہر آ گئے اور ایک دم سے غزلوں کی گولیاں دنا دنا دنا دنا دنا چلانے لگے۔

جب اس طرح ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تو میں بوکھلا گیا۔ کہ ابھی تک نہ میں نے خط بنایا ہے۔ تم حمام و ناشتہ ہی کیا ہے۔ میں نے مجاز کو اور مجاز نے مجھے بے کسی کیساتھ دیکھا اسی کے ساتھ ساتھ کلام کی داد بھی دیتے رہے کہ اتنے میں سیکرٹری نے آکر کہا کہ سرکار ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ دس بجے مہاراجہ کی ڈیوڑھی میں آپ کو تشریف لے جانا ہے۔ انہوں نے بڑی بے لطفی کے ساتھ بیاض بند کر دی۔ سامنے والے کمر کی طرف آوازہ کر کے کہا کہ آپ کا سامان یہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ مہاراجہ کے پیلس چلے گئے۔ اس غزلوں کے دو گمڑے کے بعد ہم نے خط بنایا اور حمام و ناشتہ کر کے لیٹ گئے اور مسلسل غزلیں سننے اور پیاپے داد دینے کے تکان کی بنا پر ہم کو نیند آ گئی۔ تین گھنٹے تک برابر ہم سوتے رہے اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ گھڑی ایک بج رہی ہے۔ اور حضرت اثر ایک لنبوڑا سار جسر بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا آپ کو کشمیر کی سیر کرانے آیا ہوں میں نے کہا تو اتنا وقت دیجیے کہ ہم دوبارہ نہا دھو کر کپڑے پہن لوں انہوں نے کہا میں آپ کو اسی طرح کمرے میں بیٹھے بیٹھے کشمیر کی سیر کراؤں گا۔ اور یہ کہتے ہی انہوں نے وہ لنبوڑا سار جسر کھول لیا۔ انہوں نے ابھی رجسٹر کھولا ہی تھا کہ اردلی نے آکر کہا۔ سرکار لنچ تیار ہے۔ انہوں نے کہا آئیے لنچ کر لیں۔ لنچ کی میز پر بیٹھتے ہی طعام و کلام کے دہرے مشاغل بیک وقت جاری ہو گئے۔ اور ہمارا عجیب عالم ہو گیا کہ کانوں میں مناظر کشمیر پر نظمیں منہ میں نوالے اور ہونٹوں پر سبحان اللہ کے جھوٹے نعرے۔ اور اس طرح وہ لنچ ہم دونوں کو تناول فرمانے لگا۔

اور خدا خدا کر کے جب وہ کلام و طعام کا مرکب لنچ ہم کو کھا کر ختم ہوا تو۔ ہات دھو کر ہم اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئے اور شاید ابھی مشکل سے دو تین کروٹیں ہی لی ہوں گی کہ وہ ایک چوکور بیاض لے کر آ گئے۔ اور یہ کہہ کر نظمیں سنانے لگے کہ دیکھیے بد نصیب شاعرہ سیفو کی ماتم نام نظموں کے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر یہ نظمیں کہی ہیں۔

اور جب نظمیں سنتے سنتے پانچ بج گئے تو میرا دماغ سنسنانے لگا۔ میں نے کہا میں دونوں وقت حمام کرتا ہوں۔ آپ اجازت دیں اگر حمام کر کے چائے پی لوں تاکہ تازہ دم ہو کر آپ کا کلام سنوں میں غسل خانے چلا گیا۔ وہ مجاز کو اپنا کلام سنات رہے۔ اور مجاز کی داد کی آواز بتدریج دھیمی ہوتی چلی گئی اور تھکی ہوئی آواز کی مری ہوئی واہ واہ ہوا میں تیرنے لگی۔ والے اے اے اے والے اے اے اے میں حمام کر کے نکلا تو انہوں نے کہا یہاں مجاز تم بھی حمام کر آؤ انہوں نے کہا میں تو صبح کو بھی نہیں نہایتا۔ یہ دو فیرا غسل جوش صاحب ہی کو مبارک ہو۔ اتنے میں چائے آگئی۔ اور چائے کا آدھا آدھا گھونٹ پی پی کر وہ سیف کی نظموں کے آخری ٹکڑے سنانے اور ہم دونوں داد دینے لگے۔

اتنے میں بڑی کراہ کے ساتھ آفتاب ڈوب گیا۔ فضا سانولی سلونی ہو گئی۔ اثر صاحب نے ہم دونوں قربانی کے بکروں کو بڑے شان دار ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا بلب روشن کر دیے ہیٹر جلا دیا۔ اعلیٰ درجے کی وسکی کی بوتل نہایت خوبصورت گلاس اور تلے کا جو کی ڈشیں ہمارے سامنے رکھوا کر بہت سی اگر بتیاں جلوادیں۔

اب ہم دن بھر کے جھنجھوڑے بھنجھوڑے اور دوہے ہوئے تھکے ماندے بندوں نے اپنے اپنے پیانے بھرے الحمد للہ کہہ کر دو دو گھونٹ پیے مجاز نے سگریٹ اور میں نے سگار سلاگالیا۔ اور وہاں ایک بغلی کمرے سے نکل آئے۔ ہمارے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور میر تقی میر کے رنگ کی غزلیں سنانے لگے اور میدان داد کے ہم دونوں کرائے کے ٹٹو پھر دلی پو لی سگوری قدم اور سرپٹ کے جوہر دکھانے لگے۔

اور جب رات کے گیارہ بج گئے تو مجاز کو الالاکے قے ہو گئی۔ دوار دلی ان کو پکڑ کر خواب گاہ میں لے گئے۔ دوفرش صاف کرنے لگے۔ اثر نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر مجھے ٹٹولا کہ مجھ میں اگر دم باقی ہو تو وہ میر کے رنگ کی غزلیں پھر سنانے لگیں میں نے ان کے ارادے کو بھانپ لگ کر دن ڈال دی اور محفل برخواست ہو گئی۔

اور صبح کو چار بجے میں نے جب مجاز کو جگایا تو وہ یہ سمجھ کر کہ اثر صاحب آگئے ہیں اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہنا شروع کر دیا سبحان اللہ جواب نہیں ہے اس شعر کا۔ اس کی اس داد پر میں جب ہنسنے لگا تو اس نے آنکھیں پھاڑے کر مجھے دیکھا اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔ جعفر علی کاں نہیں جوش صاحب آپ ہیں۔ اور ہم دونوں اس وقت زندہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب کیا میری ماں نے مجھ کو صرف اس لیے پیدا کیا تھا کہ جب میں جوان ہو جاؤں تو آپ کے ساتھ کشمیر جاؤں اور کشمیر کی سیر کیے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ اور آپ میری بات مانیں ابھی سویرا ہے اس وقت یہاں سے چپک چپاتے بھاگ کھڑے ہوں اور کسی دور کے ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو جائیں میں نے کہا یہ تمام سامان کیا ہم اپنے سروں پر لا کر لے جائیں گے۔ اسنے کہا جس ہوٹل میں ہم نے کل رات بسر کی ہے وہیں ٹیکسیوں کا اڈا ہے۔ میں ٹیکسی کے ساتھ مزدور بھی لاؤں گا۔ ٹیکسی کو پھانک کے باہر ٹھہرا دوں گا۔ اور مزدور یہاں سے سامان جانے کر ٹیکسی میں رکھ دیں گے۔ مس نے کہا بڑی اچھی تدبیر ہے دیر نہ کرو ابھی جاؤ۔

جب ٹیکسی آگئی اور سامان رکھ دیا گیا تو میں نے کہا ڈرائیور صاحب ہم کو کسی ایسے ہاؤس بوٹ تک پہنچا دو جو یہاں سے دور ہو۔ ڈھونڈنے والے کو آسانی سے نہ مل سکے۔

ٹیکسی والے نے ہم کو غالباً ہائی کورٹ کی پشت کے ایک ایسے ہاؤس بوٹ میں لے کا کر ٹھہرا دیا جو گزرگاہ عام سے دور تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے خط بنایا حمام کیا غسل خانے سے نکال کر جب ناشتے کی میز پر بیٹھا تو دیکھا کہ مجاز سو رہا ہے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کو جگاؤں تنہا ناشتہ کیا اور ٹہلنے نکل گیا۔ ٹہلنے میں زیادہ لطف نہیں آیا۔ اس لیے کہ حضرت اثر کے کلام کی لگاتار بارش سے میرا سر کپوہ چکا تھا۔ ہاؤس بوٹ میں جا کر سو گیا۔ دن کے ایک بجے آنکھ کھلی



دیکھا کہ مجاز سو رہا ہے۔ اسے جگایا دوپہر کے کھانے کا آرڈر دیا۔ مجاز سے کہا جلدی جلدی خط بنا کر نہاڈالو مجاز نے کہا کل خط بناؤں گا۔ میں نے کہا اچھا تو پھر حمام ہی کر آؤ اس نے مسکرا کر کہا جوش صاحب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم مسلمان ہیں پنڈت دوارکا پرشاد نہیں کہ اشران کریں میں نے کہا یوں کہو ہم گندے مثلے ہیں ہم کو حمام سے کیا کام۔ اور مجاز نے فقط دو چھوٹی کلیاں کر کے ناشتہ شروع کر دیا۔ اور مجھ کو گھن آنے لگی۔

کوئی چار بجے کے قریب میں نے دریا کا لطف اٹھانے کیلئے شکارا بلایا اور شکارے پر اپنا افطار کا سامان رکھوا دیا۔ تو مجاز نے بڑی بھیا نک آواز میں کہا۔ جعفر علی خاں کی سی صورت کے کوئی صاحب ہائی کورٹ کی سیڑھیوں سے اترتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا ایسی بھبکا نہ نکالو منہ سے کوئی اور ہوگا۔ مجاز نے کہا ارے جوش صاحب سچ مچ جعفر علی خان چلے آ رہے ہیں آئیے سوفوں کے نیچے لیٹ جائیں میں نے کہا یہ تو شتر مرغ کیسی حرکت کی ہوگی جو طوفان کے وقت ریگ میں اپنا منہ چھپا کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ طوفان گزر گیا۔ اتنے میں دو تین دردی پوش آدمیوں کے ساتھ جعفر علی خاں ساحل پر آ گئے اور ان کے آدمی کشتی بانوں سے ہمارے قیافے بتا کر پوچھنے لگے کہ وہ دونوں کس ہاؤس بوٹ میں ہیں۔

ہماری بد قسمتی دیکھیے کہ ہمارے ہاؤس بوٹ کا ملال جو سامان لینے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ کم بخت ادھر سے گزرا۔ اور جب ہمارے قیافے بتا کر ہمارا پتا پوچھا گیا تو اس نے کہا آئیے میرے ساتھ وہ ہمارے ہی بوٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں نے ان کو اپنی کشتی کی طرف آتے دیکھا تو ہم اس طرح سرا سیمہ ہو گئے جس طرح جیل سے بھاگے ہوئے چور پولیس کو تعاقب میں آتا دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں۔

اتنے میں وہ آ گئے اور چھوٹے ہی انہوں نے کہا۔ کیوں جوش صاحب دوستوں کے گھر سے کوئی یوں بھی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر میرے ہاں کوئی تکلیف تھی

تو مجھ سے کہہ دیتے۔ میں اسے رفع کر دیتا۔ آپ کو معلوم نہیں۔ صبح جب میں آپ کے کمرے میں چلا گیا اور کمرے کو خالی پایا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں نے اپنے آدمی آپ کی تلاش میں چاروں طرف دوڑا دیے۔ اور جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے وہاں کے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے جب یہ پتا چلا کہ آپ ہائی کورٹ کی پشت کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو میں خود آیا اور آپ کو گرفتار کر لیا۔

ان کی شکایت سے میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اور کہا اثر صاحب یہ مجر د مجاز ہے جو مجھے آپ کے دولت کدے سے بھگا یہاں لے آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کشمیر آنا اور ہاؤس بوٹ میں ٹھہرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ انہوں نے کہا مجھ سے کہتے ہیں سرکاری ہاؤس بوٹ کا بندوبست کر دیتا۔ میں نے آنکھیں جھکا کر کہا بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ میرا مزاج تو دیوانہ راء ہوئے بس است کا سا ہے۔ مجاز نے ہو کہا اور میں دیوانہ بھاگ کھڑا ہوا میں دست بستہ آپ سے معافی کا طالب ہوں آپ کریم ہیں معاف فرما دیں۔

اثر صاحب نے مسکرا کر مجھے گلے لگا لیا۔ مجاز سے کہا تم بڑی بس کی گانٹھ نکلے۔ اس کی آنکھیں رپر پانے لگیں۔ اثر صاحب نے ایک وردی پوش کو آواز دی اور انہوں نے کہا بوتل لاؤ اس نے بوتل سامنے رکھ دی۔ مجاز بوتل کی طرف ہڑبڑا کر ہنکے میں نے کہا آفتاب ڈوبنے میں ابھی دس گیارہ منٹ باقی ہیں۔ ٹھہر جاؤ مجاز منہ بنا کر بیٹھ گئیل اور اثر صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ اور ہماری سیر دریا کی تمنا پر پانی پھر گیا۔

دوسرے دن صبح کو ٹہل کر جب میں ہاؤس بوٹ میں آیا تو مجاز نے کہا اب کیا کریں اثر صاحب نے گھر دیکھ لیا ہے کسی اور ہاؤس بوٹ میں چلے جائیں۔ میں نے کہا وہ سمجھ جائیں گیک ہم ان سے منہ چھپا رہے ہیں۔ اس پر مجاز نے کہا تو پھر آج جلدی کھانا کھا کر دو بجے ہی شکارے پر بھاگ کھڑے ہوں اور گھوم گھام کر ہتھری اوک

والے جزیرے جائیں اور وہیں بیٹھ کر شغل کریں۔

اس تجویز پر عمل کر کے ہم لوگ دو بجے ہی شکارا منگا کر نکل گئے اور بہت سے مقامات کی سیر کر کے تھری اوک کھے جزیرے میں شام ہوتے ہی پہنچ گئے بساط بادہ خواری بچھا دی گئی۔ ورمہ ایک ہفتہ کو سلام کر کے پیانے بھر دیے گئے۔ اور آہستہ آہستہ پینے لگے۔ اور مجاز نے بڑے ولولے کے ساتھ کہا اب پکڑ لیں ہم کو نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی ابھی ان کی آواز گونج ہی رہی تھی کہ دیکھا کہ ایک شکارا دور سے ہماری طرف چلا آ رہا ہے اتنے میں چاند کی روشنی تیز ہو گئی۔ دریا کا پانی جھلکنے اور کڑم کڑم کرنے لگا۔ اور شیشوں کی آگ ہمارے جسم میں دوڑنے لگی۔ کہ اتنے میں وہ شکارا قریب آ گیا۔ مجاز نے شکارا کو غور سے دیکھا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے مجھ سے کہا ارے جعفر علی خاں چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا دیوانے ہو گئے ہو انہوں نے کہا ارے وہی عینک ارے وہی شمین کیپ ارے وہی شیروانی ہائے رام ہائے رام!

اتنے میں شکارا ہمارے جزیرے سے آ کر لگ گیا۔ اور اثر صاحب اتر کر ہماری طرف آنے لگے۔ ہم کھڑے ہو گئے انہوں نے کہا تو جہاں جا کے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا۔ اور یہ مصرع سنا کر انہوں نے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔



## حکیم آزاد انصاری

رقت انگیز حد تک نحیف الجثہ تھے۔ چٹ کی طرح لائے ٹھڈی پر سفید فرنج کٹ داڑھی۔ سر پر بے پھند نے کی ترکی ٹوپی چہرہ لانا نفاذ آنکھوں پر موٹے تالوں کی عینک سخن سنجوں کے امام، مولانا حالی کے شاگرد اور سہل ممتنع کے وحدہ لاشریک شاعر۔

حیدر آباد دکن میں ان سے تعارف ہوا تھا۔ اور پہلی ملاقات کس قدر پھیک سی رہی تھی۔

لیکن آہستہ آہستہ جب ان کے جوہر کھلنے لگے تو ہمارے مابین پینگ بڑھتے گئے۔ وہ اوپر سے خشک و بے رنگ نظر آتے تھے لیکن اندر سے بے حد تروتازہ تھے اور رنگین تھے۔ اور اسی رنگینی کی بنا پر وہ اپنے بیٹے احسان احمد سے ناخوش ہو کر جو کھٹ ملا اور اپنی باپ سے کھسانے والی بیوی کے اشاروں پر چلتا۔ اور بیوی کو باپ پر ترجیح دیتا تھا۔ مستقل طور پر میرے پاس رہنے لگے تھے۔

ابرار ان کو چھیڑ کر لطف اٹھاتے اور یہ کہا کرتے تھے کہ آزاد صاحب اگر آپ اپنی زبان کو موج نکالنا چاہتے ہوں و خدا را لکھنوجا کروہاں سال دو سال قیام کیجیے اور یہ ممکن نہیں تو ایک روز لکھنوکا ٹکٹ لے کر جائیے چارباغ اسٹیشن پر اترئیے اور وہاں کی کسی دیوار کو چھو کر ہی پلٹ آئیے۔ زبان آجائے گی۔ آپ کو۔ اور آزاد صاحب آپ کو آپ زبان تو آپ کے استاد حالی کو بھی نہیں آتی تھی۔ اور وہ جو بر سے گاپانی تو جائے گا دھل کی حد تک تعقیبہ کے مرض میں گرفتار بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مملکت تعقید کے وہ مطلق العنان بادشاہ تھے۔ اور آزاد صاحب بگڑ جاتے اور دو دو تین تین دن ان سے بات ہی نہ کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کسی خدیجہ بی کی لوح قبر کے واسطے ایک قطعہ کہہ کر ابرار کو سنایا جس کا قافیہ وردیف تھا ”عزت خدیجہ بی“ اور ”تربت خدیجہ بی“ اور جب انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

دل سے سارے عزیز کرتے ہیں



عزت و حرمت خدیجہ بی

تو ابرار نے قہقہہ مار کر کہا تو ان مجید کی قسم اب تو آپ گالیاں بھی بکنے لگے ہیں۔ انہوں نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ بھلا اس میں گالی کی کیا بات ہے ابرار نے کاہ پہلے مصرعے ہی میں ایک تگڑی سی گالی بن گئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں دل سے سارے عزیز کرتے تھے۔ یعنی بڑے ولولے کے ساتھ مرحومہ کے ایک دو نہیں سارے عزیز ان کے ساتھ کرتے تھے۔ جناب والا اس کرتے تھے۔ سے ذہن جس طرف منتقل ہوتا ہے۔ آپ اس سے واقف نہیں خدیجہ بی کا بیٹا آئے گا۔ تو اس سے کہوں گا کہ بھائی اپنی ماں کی لوح مزار پر یہ قطعہ تاریخ ہرگز نہ کھدوانا ورنہ والدہ مرحومہ کی ناک کٹ کر رہ جائے گی۔

انہوں نے کہا لکھنوالوں کا مذاق متبذل ہے۔ اس لیے آپ کو میرے مصرعے میں دم کا پہلو نظر آ رہا ہے۔ ابرار نے کہا جی ہاں یہ تو وہی بات ہوئی ہوئی کہ اگر کس جشن کے گردے کے سے موٹے موٹے ہونٹوں کو دیکھ کر ہم قہقہہ ماریں تو افریقہ والے یہ ارشاد فرمانے لگیں گے۔ کہ تمہارا مذاق متبذل ہے۔ حضور والا متبذل چیز کو سن کر یاد دیکھ کر اعتراض کرنا تو اس امر کی دلیل ہے کہ اعتراض کرنے والا ابتذال سے کوسوں دور ہے۔ میں آپ کے مصرعے کے خاندان کے چند شعرا اور مصرعے سناتا ہوں۔ آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ میرا اعتراض کس قدر درست ہے سنیے ایک صاحب فرماتے ہیں۔ کھڑا ہے دیر سے در پر ترے۔ عشاق کا مجمع خدا لگتی کہیے گا آزاد صاحب لفظ مجمع سے پہلے ہی ذم کا پہلو نکل آیا ہے کہ نہیں؟ اسی طرح ایک صاحب فرماتے ہیں۔

دل کو ہم اپنے تسلی شب غم دیتے ہیں

جس کو تم دے نہیں سکتے اسے ہم دیتے ہیں

آپ سمجھے لینے دینے کرنے اور کرانے میں کس قدر ذم کے پہلو ہیں؟

ایک اور مصرع سنیے قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر خیال تو کیجیے۔ خبر تک

آتے آتے مبتدا ہی میں ایک فحش بات نکل آئی۔ کہ نہیں؟ یوں نہیں ایک اور صاحب ارشاد فرماتے ہیں جو روح کو گر مادے جو قلب کو تر..... پادے آپ نے پادے کے ساتھ یہ تر کی آواز سنی فرمائیے کیا ارشاد ہے۔ لیکن پہلے منہ پر رومال رکھ لیجیے۔ اسی طرح ایک شاعر صاحب فرماتے ہیں۔ ساقی مجھے..... کوثر پہ..... کھڑا کر کے دکھا دے۔ حضور والا یہ فحش التجا کی جا رہی ہے کس سے؟ حضرت علیؑ کے سے جلیل القدر امام سے استغفر اللہ بس ایک اور شعر سن لیجیے

خدا کے واسطے جلدی سے اب کہیں گردن  
کوئی ملول کی اس رہ گزار میں مارے  
ارے ڈھائی لاٹ صاحب کی حد کر دی ملول صاحب نے ذرا دیکھیے تو حضرت  
ملول کس امر قبیح کی التجا فرما رہے ہیں۔ اور وہ بھی خدا کا واسطہ دے کر انتہا کر دی بے  
شرمی و بے ادبی کی۔

اب ان مثالوں کی روشنی میں اپنا مصرع خود ملاحظہ فرمائیے دل سے سارے عزیز  
کرتے تھے۔ ہائے مرجانے کے بعد خود خدیجہ بی اور ان کے ساتھ ساتھ انکے  
سارے عزیزوں کے ایک پوشیدہ شرمناک راز کو آپ نے افشا کر دیا۔ انہوں نے کہا  
سمجھ میں آگئی بات واقعی بیہودہ مصرع ہے۔ بدل دوں گا اسے یہ تھی انصاف پسندی  
حضرت آزاد کی۔

میں غزل کا مخالف اروہ غزل کے شیدائی تھے۔ اس سلسلے میں اکثر میری ان سے  
دو دو چونچیں ہوا کرتی تھی۔ اور میری باتوں سے جل کر انہوں نے میرے خلاف ایک  
بڑی اچھی رباعی کہی تھی آپ بھی سن لیں

کہتے ہو جچتی نہیں اب شان غزل  
ممکن ہو تو ڈھا دیجیے ایوان غزل  
سرکار غزل میں پل کے غزلوں سے یہ بیر

افسوس ہے اے نمک حرامان غزل  
 اور میں نے اس قافیہ وردیف میں ایک جوابی فحش رباعی کہی تھی جس کو اپنی شرمیلی  
 قوم کے گوش گزار نہیں کر سکتا۔ ایک روز شام کے وقت جب کہ میں اور آزاد اور سید علی  
 اختر اختر حیدر آبادی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا خانہ زار سخاوت مینا خاتون  
 اور گلاسوں کو ایک جھلکتی ٹرے میں لے کر آ گیا۔ اگر بتیاں جلا دیں۔ میں نے اپنا  
 گلاس بنانے کے بعد مزاحاً دو گلاس اور بھرے اور اختر و آزاد کے سامنے رکھ دیے۔۔  
 اختر گلاس سے ہٹ کر اس طرح پیچھے ہٹ گئے کہ اگر نہیں ہٹتے تو وہ انہیں ڈنک مار  
 دے گا۔ لیکن آزاد جیسے بیٹھے رہے۔ میں نے اختر کے سامنے کا گلاس یہ کہہ کر اٹھالیا کہ

مے بزہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب  
 پیش ایں قوم بشورابہ زمزم نہ رسد

اور آزاد نے کہا بسم اللہ اختر نے کہا خدا کے واسطے یہ ام الخبائث ان کے سامنے  
 سے ہٹا لیجئے۔ میں نے آزاد سے پوچھا کیا آپ بھی اس جوہر ناب کا ام الخبائث سمجھتے  
 ہیں انہوں نے کہا نعوذ باللہ میں تو اس کو عشق راپروردگارے حسن راپینمبر سمجھتا ہوں اختر  
 نے آزاد صاحب غالباً آپ مزاحاً ایسا کہہ رہے ہیں دل سے ایسا نہیں سمجھتے اس لیے  
 خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔

انہوں نے کہا اختر صاحب میرا لڑکا مسلمان اور کھٹ ملا ہے اور شاید اسی انحطاط پر  
 حشر میں بھی پکڑا جاؤں گا آزاد نے یہ کہہ کر پیانا منہ کو لگالیا۔ اختر اس طرح اچھل  
 پڑے جیسے گویا جلیک کا جھٹکا لگ گیا ہے۔ اور ارے ارے ارے ارے ارے ارے  
 رے رے کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس روز کے بعد وہ میرے ساتھ برابر پینے لگے پینے کے بعد وہ کبھی بگڑتے نہیں  
 بشاش سے بشاش تر ہو جایا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات دو پیگ پی کر کھڑے ہو جاتے  
 اور پینے والوں کو چونچ دکھا دکھا کر قوں قوں قوں کی آوازیں نکالنے لگتے تھے۔

ایک بار جب وہ میرے ساتھ بمبئی گئے اور اصغری بیگم کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے میں انکو ساتھ لے کر سیر کو نکلا اور دن بھر گھوم گھام کر سہ پہر کو گھر پلٹا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جب باہر جانے لگا تو میں نے کہا آزاد صاحب آپ بورھے آدمی ہیں اب میرے ساتھ نہ چلیں گھر ہی میں آرام کر لیں تو انہوں نے کہا بوڑھے ٹھوڑے ہوں گے آئیں تو بہتر سال کا نو جوان ہوں آپ کیساتھ چلوں گا۔ اور جب مالا بار کے باغ میں انہوں نے حسینوں کے ایک پرے کو دیکھا تو چیخ ماری ارے مر گئے تمام مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگے ہر شخص ان کی طرف دیکھتا کہ چیخ کی آواز انہیں کی جانب سے بلند ہوئی تھی۔ مگر ان کی سفید ڈاڑھی دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتا، اور یہ خیال کہ اس عمر کا شخص جو بڑی سنجیدگی کیساتھ اپنی فرنیچ کٹ ڈاڑھی کھجا رہا ہے بھال اس طرح چیخ مار سکتا ہے۔

افسوس کہ ہندوستان میں جیسی ہونا چاہیے تھی ان کی قدر نہیں ہوئی۔ ہر چند وہ اپنے عصر کے برے بڑے مشہور شاعروں سے بمراحل بلند تھے۔ لیکن گمنام رہے اور آج تک گمنام ہیں۔

وہ الفاظ کی نثری ترتیب کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ اور اس ترتیب کے باوجود وہ اپنے افکار کی بلندی اور شعریت کی رنگینی کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔ نثری ترتیب کی پابندی کے ساتھ کہنے والے اور شعراء بھی گزر چکے ہیں مگر ان کی شاعری کی بولی ٹھولی سے آگے نہیں بڑھ سکی مثلاً

جو دل چھین لینے کا ڈھب جانتے ہیں  
وہ ترکیب و رکیب سب جانتے ہیں

یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا  
آج تو ہم بھی بڑا جی کر گئے



وہ ہلھے لب تمہارے وعدے پر  
وہ تمہاری زبان سے اکلا

جب کہا ہائے دل زار تو اس نے یہ کہا  
جی دل زار دل زار کے نکلے کر دے

ایک ، دو ، تین ، چار ، پانچ نہیں  
سب خطائیں مری معاف کر دو

کہا خلوت میں مل بیٹھیں کہا خلوت میں مل بیٹھو  
کہا ہیجان کا ڈر ہے کہا ہیجان تو ہو گا

میں نے کہا علاج دل درد مند کر  
کہنے لگا وہ شوخ کہ بکواس بند کر  
آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ ان اشعار میں رکھا ہی کیا ہے۔ لفظوں کے طوطے اڑ  
گئے ہیں اور بس۔

اب نثری ترتیب میں آزاد صاحب کے اشعار آب و بار ملاحظہ ہوں و طرح تھی  
زماں اور بھی ہیں مکاں اور بھی ہیں۔

کبھی مے درد مے کے علاوہ  
مراعات پیر مغاں اور بھی ہیں  
فقط وجہ قرب خدا ہی نہ سمجھو

مفادات عشق بتاں اور بھی ہیں

اگر ارشاد حالی ہو تو میں مایوس ہو جاؤں  
بہت اغماض کی تکلیف فرمانے سے کیا حاصل

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں چلتا  
تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

دیکھنا حضرت آزاد تو محفل میں نہیں  
کہ ہمیں بوئے نفوس فقراء آتی ہے

اک پائے مال جور سے امید شکر جور  
جا شکر کر کہ تاب شکایت نہیں رہی



## فانی بدایونی

تاج باختہ بادشاہوں، روزگار گزیدہ فن کاروں، امید بریدہ مریضوں، شب دریدہ  
محبوبوں معشوق سوختہ عاشقوں پریدہ رنگ بیوہ نعرہ سوس، پر سر مردہ باپوں اور پدر گم  
کردہ یتیموں کے کیمہ سوگواری میں بیٹھ کر..... مغموم قدرت نے..... غم دوراں اور غم  
جاناں کے آفات، ورتھر کے مصائب اور شوپن ہار کی نامرادی کے تحت میں..... دیوار  
گریہ کی مٹی کو..... میر تقی میر کے آنسوؤں میں تر کر کے گوندھا..... اس مٹی سے ایک  
دبلا پتلا گندمی رنگ کا پتلا بنایا۔ اس پتلے کے دھڑکتے ہوئے دل میں تمنائے مرگ کی  
روح پھونک دی۔ اور نام رکھ دیا اس کا فانی بدایونی۔ میں سب سے پہلے ان سے  
لکھنؤ میں ملا تھا جہاں وہ اس طرح وکالت کرتے تھے کہ ہفتے میں بمشکل دو ایک بار  
عدالت جاتے زیادہ وقت محبوبہ کے گھر میں کھیلتے۔ اور فرصت کے اوقات میں  
مقدمات کی مسلیں دیکھنے کے عوض مجھ کو اپنی معشوقہ کی تصویریں دکھاتے اور پہروں  
اس کی داستانیں سناتے تھے۔

میں بھی اسی دور میں خیر سے عاشق تھا۔ اس لیے گھنٹوں ان کی صحبت میں بیٹھا کرتا  
تھا۔ ان کی محبوبہ لکھنؤ چھوڑ کر آگرے چلی گئی تو وہ بھی وکالت کرنے آگرے چلے  
گئے۔ اور میرے حالات نے مجھ کو حیدر آباد دکن پہنچا دیا۔ اور بصر ارفن و من در کوچہ  
ہارسوا شدم! کچھ روز کے بعد وہ غم جاناں اور غم دوراں کے ستائے ہوئے حیدر آباد  
آئے مہاراجہ سے ملا کر میں نے ان کی ملازمت کی سبیل نکال دی۔ اور وہ کسی سکولمیں  
ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ اور قیس عامری نے معلم کا لباس پہن لیا۔ لیکن معلمی زیادہ دن چلی  
نہیں اور جب وہ ملازمت سے سبک دوش ہو گئے تو مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کا وظیفہ  
مقرر کر دیا۔..... اس زمانے میں وہ شاہ زادہ معظم کی سرکاری بھی جانے لگے لیکن  
کچھ ہمت نہیں آیا۔ اور انہوں نے وہاں اپنا وقت مفت ہی گنوا یا۔

مریے تمام معاصرین میں وہ سب سے بمرحل بلند مرتبہ غزل گو شاعر تھے۔

میں ان کے غم پرستی کا قائل نہ سہی لیکن یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ ان کی غزل کا قافی  
 پیائی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ان کی ہر غزل ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص  
 فکر کی حامل ہوتی تھی۔ جس کی آج تک کوئی نقل نہیں کر سکا۔ زندگی کی مسلسل ناکامیوں  
 نے ان بے چارے کو اس قدر ادھیڑ دیا تھا کہ زندگی کے دور آخر میں ان کو اپنے انتہائی  
 وفادار دوستوں پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔ اور وہ صرف یہیں تک آ کر ٹھہر گئے تھے  
 بلکہ یہاں تک سمجھنے لگے تھے کہ ان کے تمام دوس ان کی دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھے  
 ہیں۔ اور تو اور انہیں میری طرف سے یہ بھی بدگمانی پیدا ہو گئی تھی کہ میں بھی ان کے  
 درپے ہوں آزار ہو گیا ہوں۔ حالانکہ میں ان کا عاشق دوست تھا۔

ان کی بدگمانی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اگر وہ کسی مجھ کو اپنی طرف آتا دیکھ لیتے تو  
 کہتے تھے ہونہ ہو یہ ملیریا کا مجھ میرے کسی دیرینہ دوست نے اس لیے بھیجا ہے کہ یہ  
 مجھے کاٹ لے اور میں ملیریا میں گرفتار ہو جاؤں وہ طبعاً غم دوست اور نشاط دشمن انسان  
 تھے۔ اور معاشقہ و معاش کی پیہم ناکامیوں نے ان کو اس عقیدے پر قائم اور اس وہم  
 میں مبتلا کر دیا تھا کہ ہنسنا یا قہقہہ لگانا ایک ناقابل عفو گناہ ہے۔ اور حیات انسانی ایک  
 بے گور و کفن لاش ہے اور لاش کے سر حانے کھڑے ہو کر ہنسنا سب سے بڑی شقاوت  
 کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے۔ جہاں تک کہ انسان کی دردمندی کا سوال ہے میں ان کا  
 سو فیصد ہم خیال ہوں اور یہ کس کی مجال ہے کہ وہ قید حیات و بند غم اصل میں  
 دونوں ایک ہیں کا انکار کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود میرا یہ خیال ہے کہ دانائی اور ذہن  
 کی توانا یکا یہ فرمان ہے کہ غم دل پر دستک دے ہم اس کے واسطے دروازہ کھول دیں۔  
 اس کو مہمان ٹھہرائیں..... لیکن دوسرے دن کرن پھوٹنے سے بہت ہی بیش تر ہم اس  
 کو اپنے دل سے رخصت کر دیں۔

اس لیے کہ

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیس ازیک نفس



برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم  
 افسوس کہ میرے دوست فانی کو جینے اور بہر حال خوش رہنے کا یہ گر معلوم نہیں تھا۔  
 وہ غم کو پالتے پوتے پروان چڑھاتے چھاتی سے لگائے رہتے اور دودھ پلاتے تھے۔  
 اور اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ وہ ابو الحزن نہیں ام الحزن تھے۔ ان کے تمام احباب میں  
 سے صرف ایک میں تھا کہ انہیں گاہ گاہ وہ مسکرانے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ ورنہ  
 کہاں ہنسنا کہاں فانی۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ وہ کسی دارھی والے کے ساتھ موٹر  
 میں جا رہے ہیں۔ ہر چند میں سن چکا تھا کہ اکل انکا ڈڑھیل بیٹا بدایوں سے آچکا ہے۔  
 لیکن شام کو ان کے آپس پہنچا تو انتہائی سنجیدگی سے میں نے پوچھا کہ فانی صاحب کیا  
 آپ کے والد ماجد تشریف لائے ہیں؟ انہوں نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ان کے  
 انتقال کو تو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ میں نے پھر کہا یہ آج کس کے ساتھ آپ ریلوے  
 سٹیشن کے سامنے سے موٹر میں بیٹھے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا ارے بھائی وہ میرا  
 بیٹا ہے میں نے کہا مبارک ہو پدر پسر نما اور وہ ہنسنے لگے۔

لیکن ہنسنے کے بعد ان کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا کہ اب اس ہنسنے کا خمیازہ  
 بھگتنا پڑے گا۔ اور جس قدر ہنسا ہوں اسی قدر مزید رلایا جاؤں گا۔

ایک بار ہم لوگ شغل کر رہے تھے کہ میں نے کہا ارے فانی کبھی کبھار تو ایک آدھ  
 پیگ پی لیا کرو۔ خدا جانے وہ اس وقت کس موڈ میں تھے۔ انہوں نے ایک گلاس پی  
 لیا۔ لیکن جب میں نے ان کے گلاس میں دوسرا پیگ ڈال دیا تو انہوں نے کہا بس  
 میں نشاطی کیفیت کو برداشت نہیں کر سکا۔ اس کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گئے۔  
 اشارے سے مجھے بلایا اور کہا ذرا سا جھک کر میری بات سنو اور جب میں اپنے کان  
 ان کے لبوں کے قریب لے کر گیا تو انہوں نے بڑے پیمبرانہ انداز میں بڑی آہستگی  
 سے کہا دیکھو جوش تم شراب پی کر غم غلط کرتے ہو غم اللہ کی بخشی ہوئی ایک بہت بڑی  
 دولت ہے اور ایک گراں قدر امانت ہے۔ اور اس کو غلط کرنا کفران نعمت میں سے

ہے۔ حشر کے دن یہاں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ مشرکوں تک کو بخش دے لیکن یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ غم غلط کرنے والوں کو بھی معاف فرما دے۔ وہ پلان چٹ کے ذریعے سے روہیں بلایا کرتے اور کچھ دن سے انہوں نے مجھے بھی اسی دھڑے پر لگا دیا تھا۔ پلان چٹ لکڑی کا ایک قلب صورت آلمہ ہوتا ہے۔ جس کے ایک طرف چھوٹے چھوٹے پیسے اور ایک طرف پنسل بنانے کا سوراخ ہوتا ہے۔ اور جب کسی کی روح کو بلانے کے واسطے ذہن پر زور ڈالا جاتا ہے تو وہ آلمہ خود بخود معرض حرکت میں آجاتا ہے۔ اور کاغذ پر جوابات لکھنے لگتا ہے۔

ایک بار فانی آزاد انصاری، علی اختر اور مودودی وغیرہ کے سامنے میں نے غالب کی روح کو بلا کر کہا تھا اپنا اسم گرامی لکھ دیجیے لان چٹ نے غالب مغلوب لکھ دیا۔ میں نے کہا یہ مغلوبیت کیسی پلان چٹ نے جواب دیا اہل دنیا کی ناقدر شناسی کے باعث اب تک یہ اپنے کو مغلوب سمجھ رہا ہوں۔ میں نے کہا پرسوں آپ کے مزار پر گیا تھا۔ انہوں نے لکھا میرا قیام مزار میں نہیں ہے۔ میں نے پوچھا کہا ہے انہوں نے لکھا اس مقام پر جس کا کوئی نام نہیں۔ میں نے پوچھا شراب کے باب میں کیا ارشاد ہے انہوں نے لکھا ظرف لازم ہے۔ میں نے آزاد انصاری کی طرف سے اشارہ کر کے پوچھا یہ میرے واسطے طرف کون صاحب بیٹھے ہیں انہوں نے لکھا میرا پوتا ہے۔ میں نے کہا آپ مغل ہیں اور یہ انصاری۔ آپ کے پوتے کیسے ہوئے؟ انہوں نے لکھا یہ میرے شاگرد حالی کے شاگرد ہیں۔ اور اسی رشتے سے میرے معنوی پوتے ہیں۔ ایک بار فانی نے ایک طوائف کی روح کو بلا کر مزاج پوچھا اس نے لکھا آپ بے وفا کو میرے مزاج سے کیا سروکار ہے آپ تو مجھ کو چھوڑ کر ایک قظامہ پر مرنے لگے تھے۔ اچھا ہوا کہ اس نے آپ سے دغا کی۔ اور میرا دل باغ باغ ہو گیا ڈاکٹر و اگرے نے ایک روح مجھ سے کہا گنگا دھرتی کی روح کو بلا کر ان سے پوچھیے کہ ہندوستان کب آزاد ہوگا تلک نے ہندی میں جواب لکھا میں نیکیا واگرے صاحب ہندی میں نہیں

جانتا آپ پڑھ کر بتائیں ڈاکٹر نے کہا اس نے کہا ہے اکیس برس بعد۔  
 فانی صاحب نے ایک رات کو میر تقی میر کی روح کو بلا کر پوچھا اقبال کیسے شاعر  
 ہیں پلان چٹ نے لکھا میں ان کو آدھا شاعر مانتا ہوں اس لیے کہ وہ دوسروں کے  
 خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کو ذاتی و نجی بالکل اوجھی ہے۔  
 ایک مرتبہ مہاراجہ کشن پرشاد نے مجھے اور فانی کو پلان چٹ سمیت بلا کر یہ کہا کہ  
 میں نام نہیں

یہ سوال غالباً سنہ ۱۹۲۷ء میں کیا گیا تھا۔

بتاؤں گا آپ میری ذات میں ڈوب کر میرے مغلوب بزرگ کی روح کو بلائیں  
 فانی نے کہا یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے جوش صاحب آپ کی مشق اب مجھ سے بڑھ چکی  
 ہے۔ آپ ہی بلائیں۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ اور خلاف معمول تاخیر کے ساتھ  
 آئے۔ آنے میں حرکت پیدا ہوئی مہاراجہ نے کہا میرا سلام کہہ دیجیے۔ آ لے نے لکھا  
 خوش باش اور مہاراجہ رونے لگے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کیوں رو پڑے  
 انہوں نے کہا میں نے اپنے باپ کی روح کو بلایا تھا۔ اور اب میرے سوا یہ بات کسی  
 کو معلوم نہیں کہ وہ میرے سوال کے جواب میں ہمیشہ خوش باش کہا کرتے تھے۔ اگر  
 آپ میرے دلی بات پوچھیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ جب تک روح کی حقیقت کا  
 مکمل طور سے انکشاف نہیں ہو جائے گا۔ اور دو دو چار کی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں  
 ہو جائے گی کہ روح دراصل ایک لافانی شے ہے اور وہ بعض معلوم ہانا معلوم اسباب کی  
 بنا پر خارج سے آکر انسانی جسم میں داخل ہو جاتی ہے یا داخل کر دی جاتی ہے۔ اور  
 وہاں کچھ روز قیام کر لینے کے بعد جسم سے پرواز کر کے پھر خارج میں چلی جاتی ہے۔  
 اس وقت تک یہ مسئلہ قطعی طور پر ایک غیر علمی اور نامعتبر بنا رہے گا۔ اور پلان چٹ یا

دیگر عملوں یا منتروں کی وساطت سے روحوں کا اس زمین پر طلب کیا جانا اور ایک ذی شعور کے مانند ان کا باتیں کرنا، سوالوں کے جواب دینا یا معاملات دینا پر متصرف و اثر انداز ہونا اہل تسلیم نہیں سمجھا جائے گا۔

ایک طرف ارباب نقل و اور روایت کا گروہ روح کے فانی ہونے اور اس کے تصرفات کا قائل ہے تو دوسری طرف ارباب عقل و روایت کی جماعت ہے۔ جس کا یہ خیال ہے کہ اعضائے انسانی اور ان کے وظائف کے توازن و ہم آہنگی سے جو حرارت عزیز می معرض وجود میں آتی ہے اسی کو روح کہتے ہیں۔ اور انسان کی موت کے بعد دو ٹکرائے ہوئے ریلوے انجنوں کی سٹیم کے مانند ہوا میں منتشر ہو کر رہ جاتی ہے۔

الغرض جتنے منہ اتنی باتیں لیکن فرق اتنا ہے کہ ارباب نقل کانوں کے سہارے اور ارباب عقل کھوپڑی کے بوتے پر رائے قائم کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کھوپڑی کے مقابلے میں کان کوئی وقعت نہیں رکھتے اس لیے معقول آدمی ارباب عقل کی باتوں کو وزنی سمجھتے ہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ پلان چٹ پر اگر ارواح کا تصرف نہیں ہوتا تو پھر اس کی جنبش و نویندگی کی علت کیا ہے۔؟ سو میں یہ جواب دوں گا کہ اس کی علت ہے خیال کی مرکوزیت کا دباؤ۔ اور دماغ کے امواج برقی کا تموج دار تعاش اوری جواب کوئی انوکھا جواب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ہم بار بار دیکھ چکے ہیں کہ نظر بھر کر دیکھتے ہی پیپر ویٹ معلق ہو جاتا ہے۔ اور کرسی چھت سے جا کر لگ جاتی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خیال مادے پر تصرف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر میرا یہ جواب سن کر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ اگر یہ سارا کھیل ہمارے دماغ کا ہے تو یہ پلان چٹ کو ہمارے دماغ کے حلقہ معلومات تک محدود ہونا چاہیے تھا لیکن بعض اوقات وہ آلہ ایسی باتیں بھی معرض تحریر میں لے آتا ہے جو ہمارے دائرہ علم سے قطعی خارج ہوتی ہیں۔ اس بنا پر یہ صرف ارواح کے سوا اور کیا علت ہو سکتی ہے؟ وہیں یہ



عرض کروں گا کہ انسانی دماغ کے گوشوں اور تحت الشعور کے تہ خانوں میں دنیا کا وہ کون سا علم ہے جو موجود نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ ہم کو اب تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

صد حیف کہ ابھی تک نفس انسانی کا غرقہ ایک ربع سے زیادہ نہیں کھلا ہے اس لیے ہم اپنے علم اور اپنی ذات کو محدود سمجھ رہے ہیں۔

لیکن جب لاکھوں یا کروڑوں برس کے بعد غرقہ نفس پورے طور پر کھل جائے گا اور غنچہ انسانیت کھل کر ادب بن جائے گا تو اس کی خوشبو آفاق کا محاصرہ کر لے گی۔ اور ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تمام کائنات ہمارے نفس کے اندر سانس لے رہی ہے۔ اور یہ پورا نظام سٹشی ہمارے ماسہ سر کا طواف کر رہا ہے۔



## آغا شاعر قزلباش

داغ کے ممتاز شاگرد وہابی کے نامور استاد۔ روایات کے بندے اوہام کے پتلے بھوتوں چڑیلوں کے تصور سے لرزاں بلند آوازوں سے ترساں حقے کے دشمن سگریٹ بازو سے ان بن آغاز میں زرداد انجام میں پریشان روزگار جوانی میں یوسف کنعان بڑھاپے میں آئینہ پریشان بہر نفس کراہ تحت اللفظ کے بادشاہ۔ اول اول رند خرابات آخر آخر بتائے صوم و صلوٰۃ پھر بھی پرستار خوباں شیریں حرکات۔ ایک روز وہ میرے دریا گنج (وہابی) کے مکان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ سر پر جرنیلی ٹوپی اور اس پر لٹ پٹی دستار بندھی ہوئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فوجی کپتان بیٹھا ہوا ہے کہ اتنے میں چھوٹے دادا نے کھیر کھا کر اس کا خالیتھلا سنگین فرش پر تڑ سے ٹپک دیا۔ وہ اچھل پڑے مجھ سے کان میں کہا ذرا چھوٹے دادا کو سمجھا دیجیے کہ میں یہ کریہہ آوازیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے چھوٹے دادا کو سمجھا دیا۔ لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ دوسرا تھلا بھی خالی کر کے تڑاق سے فرش پر دے ٹپکا۔ آغا صاحب پھر زور سے اچھل پڑے۔ کہا اب یہاں نہیں بیٹھوں گا میں نے بہت روکا وہ نہیں مانے اور جب تانگے پر بیٹھ کر ج انے لگے تو جھک کر مجھ سے کہا اپنے ان گھامڑ چھوٹے دادا سے گھر جا کر پوچھیے گا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں انہوں نے چھوٹے دادا اس طرح دانت پیس کر کہا کہ ہر چند میں نے ضبط کر لیا لیکن قہقہہ نکل ہی گیا اور وہ تاحد نظر مجھے گھورتے چلے گئے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا۔ ایک روز میں دو پہر ڈھلے ان کے وہاں پہنچا تو معلوم ہوا محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں ابھی آجائیں گے۔ مجھے شرارت سو جھی ان کے بستر سے سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ تھوڑا دیر بعد وہ آئے اور بستر کی طرف دیکھا سمجھے کہ انکا کوئی بیٹا سو رہا ہے۔ وہ تخت پر آہ آہ کر کے بیٹھ گئے۔ میرے لحاف کے اندر سے بھی آواز آئی آہ آہ وہ چوکنہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اور یہ سمجھ کر کہ

میرے کان بج رہے ہیں۔ انہوں نے موزہ اتارتے وقت حسب عادت دوبارہ آہ آہ کی آواز نکالی اور جب میرے لحاف سے اس کے جواب میں آہ وہ یہ خیال کر کے ہونہوئی کوئی جن یا بھوت ان کی چارپائی پر دراز ہے چیخ مار کر کمرے سے باہر نکل گئے اور دعائیں پڑھنے اور مولیٰ مشکل کشا دے کے نعرہ لگانے لگے۔

اور لحاف الٹ کر جب میں نے پوچھا ارے آغا صاحب ہوا کیا وہ میری آواز پہچان کر۔ دوبارہ کمرے میں آئے اور کہنے لگے تو ایک دن دہلا کر مجھے مار ڈالے گا۔ ایک روز چھٹپٹے کے وقت بوتل جیب میں رکھ کر میں انکے وہاں پہنچا۔ زینے کی زنجیر کھٹکائی۔ ایک چھوکرا آیا۔ میں نے کہا آغا صاحب سے جا کر کہہ دو کہ ایک شاعر اپنی غزل پر اصلاح لینے آیا ہے۔ اس چھوکرے نے آکر جواب دیا کہ آغا صاحب کی طبیعت خراب ہے کل آئے گا۔ میں نے لڑکے سے کہا کاغذ اور پنسل لا دو وہ بے آیا اور میں نے لکھا آغا صاحب قبلہ میرا نام عبدالصمد خاں پشاور کا رہنے والا ہوں آج رات دس بجے مشاعرہ ہے خدا کے واسطے میری غزل بنا دیجیے۔ میں اس کا فوری نذرانہ بھی پیش کروں گا۔ اور اگر آپ نے مجھے نہیں بلایا تو آپ کی تاک لگائے بیٹھا رہوں گا۔ اور جب آپ نیچے اتریں گے تو خدائے بزرگ و برتر کی قسم آپ کو جان سے مار ڈالوں گا سمجھے آپ؟

میرا پرچہ پڑھتے ہی انہوں نے اس خادم زادے سے کہا ابے جلدی سے زینے کے دروازے پر زنجیر لگا دے۔

جب دروازہ دھڑام سپند ہو گیا تو اوپر منہ اٹھا کر اور آواز بدل کر میں نے پکارا آغا صاحب آغا صاحب میری آواز بلند ہوتے ہی بالا خانے کے برآمدے میں کھٹ پٹ ہونے لگی اور یہ دیکھا کہ وہ اس زاویے کے ساتھ چھجے پر کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر میں گولی ماروں تو انہیں لگ نہ سکے۔

میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا کہ کیا آپ آغا صاحب قبلہ ہیں یہ سنتے ہی وہ فوراً

پیچھے ہٹ گئے۔ اور اپنی باریک آواز میں پوچھا عبدالصمد خاں کیا آپ واقعی مجھ کو مار ڈالیں گے؟ میں نے جواب دیا بے شک۔ آپ ایک آفریدی پٹھان کی بے عزتی کر کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ دو استادوں کو جان سے مار چکا ہوں اب آپ کی باری ہے۔ یہ سنے ہی ان کے رندھے ہوئے گلے سے ایس ایس ایس کی صدا کچھ اس بے کسی کے ساتھ نکلی کہ میرا قہقہہ نکل گیا قہقہے سے اونچے پہچان گئے۔ جب میں انکے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی چارپائی پر دھڑام سے گر گئے۔ میں دوڑ کر ان سے چمٹ گیا اور وہ ابھی ابھی سانسیں لیکر کہنے لگے ذرا میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھ، دل کیسا دھڑ دھڑ ہو رہا ہے۔ تیرا مذاق ایک دن میری جان لے لے گا۔ اور تو دل تھام کے رہ جائے گا کہ ہائے میں نے کیوں ایسا مذاق کیا تھا آہ آہ آہ۔

ایک روز کوئی چار بجے ان کے وہاں پہنچا دیکھا کہ وہ رومال منہ سے ڈھانپے رو رہے ہیں میں نے کہا ارے وہی آٹھ پہر کا رونا دھونا یہ کیا ہو رہا ہے آپکو یہ پورا عالم کون و فساد ایک دیوار گریہ یہ۔ اپ اور فانی دو یہودی ہیں۔ جو اس دیوار کے سایے میں بیٹھے بڑے استقلال کے ساتھ مسلسل رویا کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ارض ایک دائمی یوم عاشور ہے جس میں آپ اور فانی بدایونی عالی الاتصال ماتم فرمایا کرتے ہیں۔ انہوں نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا میرے رونے کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ میرا شباب میں وہ عالم تھا کہ ہزاروں حسین عورتیں میرے چاروں طرف منڈلایا کرتی تھیں۔ اور ایک رات کو تو ایک عورت چھری لے کر آگئی تھی۔ اگر مجھ سے منہ چراؤ گے تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گی۔ اور پھر اسی چھری سے خودکشی کر لوں گی لیکن اب..... یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ میں نے تسلی دی لیکن وہ روتے ہی رہے اور پھر کہنے لگے جوانی میں جی بھر کے ہنسا تھا اب اس کا جرمانہ ادا کر رہا ہوں کیا خوب کہا ہے میرا نہیں نے روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہا رہیں۔

پھر انہوں نے مجھ کو قریب بلا کر نہایت دھیمی آواز میں کہا یہ ہمارے محلے کا گرجا تم



نے دیکھا ہے؟ اس گر جا گھر میں ایک ادھیڑ سیم صاحب ہستی ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ چور چوری سے گیا کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا؟ میں آتے جاتے اس امید پر کہ شاید واللہ کی کوئی صورت نکل آئے اور بڑھاپا مزے سے کٹ جائے ان کو گھورا کرتا تھا۔ اور وہ آنکھیں جھکالیا کرتی تھیں۔ لیکن آج آج یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ میں نے کہا پہلے بات ختم کر لیجیے پھر جی بھر کے رو لیجیے گا۔ انہوں نے آنسو پونچھ کر کہا آج جب میں نے گلی میں کھڑے ہو کر اس میم کی طرف آنکھ اٹھائی تو..... ان کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی میں نے کہا آغا صاحب بات پوری تو کیجیے انہوں نے کہا جب نکل پڑیں ان کی طرف آنکھ اٹھائی تو اس نے میری طرف دیکھ کر تھوک دیا۔ ہائے تھوک دیا۔ اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس بات پر ہنس پڑتا۔ لیکن مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میں نے سوچا قدرت کس قدر سفاک ہے ہم کو پھول سا چہرہ دے کر اسے پھر بٹوے کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ کوئی حد بھی ہے اس بے کراں شقاوت کی۔



## سردار روپ سنگھ

گورے چٹے بالابلند، کھرے ناک نقشے کے خوش چشم ہنس مکھ، لطیفہ سنج، سخن شناس، انجمن آراء، مہمان نواز یا رہا بش، دوست پرور اور خوباں نشین روپ سنگھ۔

سارنگیوں کی روؤں روؤں طبلے کی تھاپ مینا کی قلقل مجیرے کی گھن گھن گھنگھروؤں کی چھم چھم حسینوں کے چم و خم، راگنیوں کے زیر و بم اور یاروں کے ادھم کے رسیا اور اپنے دور کے کنھیا تھے۔

وہ میری نانہال دھول پور کے جاگیردار، مہاراجہ کے پرانے یار، لیکن آگے چل کر مہاراجہ کے معتبوب سردار شراب خانہ ساز کے پرستار اور خرابات کے اوتار تھے۔

آفتاب غروب ہوتے ہی ان کی انجمن میں صبح طالع ہو جاتی تھی۔ اور پیانوں سے کرنیں پھوٹنے لگتی تھیں اور ڈاکٹر سورج مل سردار تارا چرن رن بیر سنگھ محسن سردار پیا کول صاحب، خوش حال چند گم عرف بغغا اور تر پھائی عرف تیری پھائی وغیرہ کے قہقہے اور اختری مشتری سے اور چھوٹی کے زمزمے گونجتے تھے۔

ہر چند فرنگی کا لگایا ہوا ہندو مسلم منافرت کا پودا تناور ہو چکا تھا۔ لیکن روپ سنگھ پر اس منحوس درخت کی چھاؤں نہیں پڑی تھی۔ ان کے زیادہ تر دوست مسلمان تھے چھوت چھات سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور انہیں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔

---

ان کا سب سے بیشتر باب میں ذکر آچکا ہے۔ اس لیے اختصار سے کام لوں گا۔ ان کے پاس شراب کا ایسا نایاب نسخہ تھا کہ ان کی شراب کے آگے ولایتی شراب پانی بھرتی تھی۔ سہ طوائفیں۔

---

سردار جمیر سنگھ انسپٹر جنرل ان کے چھوٹے بھائی پوجاپاٹ کے اتنے پابند تھے کہ انہوں نے کوٹھی کے ایک کمرے کو بت خانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ روپ سنگھ اور میں دونوں ان کا مذاق اڑاتے اور یہ کہا کرتے تھے کہ وہ کون سی ایسی ٹھٹھ گھڑی آئے گی کہ تم

بت خانے سے نکل کر شراب خانے میں داخل ہو جاؤ گے۔

ہر صبح کو اجیر سنگھ اور ان میں کھانا پکوانے کا اس قدر زبردست ہنگامہ ہوا کرتا تھا کہ اللہ کی پناہ بلا ناغمہ اجیر سنگھ ان سے آکر پوچھا کرتے تھے کہ بھائی صاحب آج کیا کپکے گا اور انس پر دونوں بھائیوں میں درمیان آدھ گھنٹے تک مکالمت ہوا کرتی تھی۔ کہ بکری کا گوشت نہیں، تیتڑ کپکے گا، نہیں نہیں تیتڑ کے عوض آج بیٹر پکیں گے۔ ترکاریوں میں آلو نہیں نہیں آلو کے عوض گو بھی آئے گی ارے گو بھی بھی نہیں ٹماڑ۔ اور میں اس مکالمت سے تنگ آ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

ان کی صحبت میں ایک رات اب تک یاد دہیک جو بڈا کی دل کش تھی۔ اور قیامت کی بھیانک بھی۔ گلاباؤہ ہولی یا دوالی کے جشن کی رات تھی۔ دھول پول کی اختری مشتری اور چھوٹی کے علاوہ آگرے سے بھی چار پانچ حسین اور سریلی طوائفیں بلانی گئی تھیں۔ اور دو بجے رات تک گانے بجانے پینے پلانے کا سلسلہ قائم رہا تھا۔ اور طوائفوں کے ساتھ تمام بادہ خوران کرام نے بھی رقص فرمایا تھا اور ہر نوعیت کا لطف اٹھایا تھا۔

اس جشن میں گوالیار کے ایک دیو پیکر سردار نے بھی شریک تھے۔ جو صبح سات بجے سے آجانے رات کے بعد بھی مسلسل پی رہے تھے اور دو بجے رات کے قریب ابھی ابھی سانسیں لے رہے تھے۔ ابھی محفل جمی ہوئی تھی۔ کہ وہ گوالیار کے سردار صاحب اٹھے غسل خانے کی طرف دو قدم لڑکھڑاتے چلے اور دھڑام سے فرش پر گر گئے۔ اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ اللہ اکبر ان کے دم توڑتے ہی وحشن جو ابھی ابھی نغموں کے دریا میں یں رہا تھا اس قدر بھیانک ہو گیا کہ میں نے رئیس احمد سے کہا آؤ اب یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں ہم دونوں بھائی روپ سنگھ کے باڑے سے اپنے نانا کے بارے کی طرف جانے کے لیے جو وہاں سے فقط چند قدم کے فاصلے پر تھا باہر نکلے باہر آتے ہی جب ہوا لگی اور سڑک کے ہر بلب میں دو دو بلب نظر آنے لگے۔ تو میں سمجھ گیا کہ آج نشہ سجد تیز ہو گیا ہے۔ اور رئیس کو دیکھا وہ بھی بری طرح لڑکھڑا رہا

تھا۔ میں نے رئیس سے کہا آج بڑا ہاتی پچھاڑ نشہ ہے آؤ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلیں۔ لیکن نشہ اس قدر شدید تھا کہ بار بار ہم بری طرح لڑکھڑاتے اور بار بار ہمارے ہاتھ چھوٹ چھوٹ جاتے تھے رئیس داہنی طرف اور میں سڑک کے بائیں طرف پہنچ جاتا تھا۔ دو تین منٹ کا راستہ دس بارہ منٹ میں طے کر کے جب میں نے حویلی میں قدم رکھا تو میں نے کہا دیکھو رئیس نشہ اس وقت گھٹا ٹوپ اور گھنگھور ہے کہ ہم تم زینے پر چاروں ہاتھ پاؤں سے گھوڑے بن کر چڑھیں گے۔ ورنہ ہمارے سر پاش پاش ہو جائیں گے۔

میری زندگی کا وہ پہلا اور آخری مردانگ نشہ تھا۔ صبح کو جب پہاڑ ساسر اورالاؤ کی طرح بھڑکتا ہوا سینا لے کر بیدار ہوا کلیاں اور غرارے کر کے لیموں کا ایک پورا گلاس پیا اور قسم کھالی کہ جب تک جیوں گا چار پیگ سے زیادہ نہیں پیوں گا۔ اور اس قسم پر آج تک قائم ہوں۔ اور مرتے دم تک قائم رہوں گا۔

ایک بار برابر دھول پورا آئے اور روپ سنگھ کی صحبت میں شریک ہوئے اس وقت تک انہوں نے پی کر گالیاں دینا شروع نہیں کیا تھا۔ لیکن بگڑنے لگے تھے۔

جب محفل برخواست ہوئی تو میں اور رئیس دونوں روپ سنگھ کی خواب گاہ میں لیٹ گئے اور برابر سے کہا گیا کہ وہ زنا نے مکان کے دروازے کے سامنے کی کوٹھی میں جا کر سو رہیں۔

ابھی ہم لوگ کروٹیں بدل ہی رہے تھے کہ ابرار کی انتہائی نشہ میں ڈوبی ہوئی آواز گونج اٹھی کہ ہر شخص اپنا ایڈوانسمنٹ خوب جانتا ہے۔ روپ سنگھ نے کان کھڑا کر کے مجھ سے پوچھا۔ آدھی رات کو ایڈوانسمنٹ کی کیا بات ہو رہی ہے۔ ابھی میں اس کا جواب بھی دینے نہیں پایا تھا کہ روپ سنگھ کا پرانا خادم انتا ہانپتا آیا اور کہنے لگا سردار صاحب بڑا غضب ہو گیا اور ہم سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ روپ سنگھ نے پوچھا ارے کیا غضب ہو گیا انتا نے کہا کہ دلاری زانی ڈیوڑھی میں جا رہی تھی کہ ابرار خاں (ابرار خاں) نے



دوڑ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ ورجب وہ کلائی چھڑا کر بھاگی تو بارخان اس کے پیچھے دوڑے اس نے جب بھاگ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تو بارخان نے پکار کر کہا ہائے جانی مار ڈالو۔ اور جب میں نے سمجھایا تو انگریزی بولنے لگے۔ یہ سنتے ہی روپ سنگھ نے ماتھا پیٹ کر پوچھا انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا؟ اب میں گھر میں کیسے منہ دکھاؤں گا۔ انا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا۔ اس انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا۔ پر میرا قہقہہ نکل گیا۔

۱۔ موقع سو دمندی

میں نے کہا بات تو واقعی بہت بری ہوئی جس کا مجھ کو بے حد افسوس ہے۔ لیکن اس انتا ہمارے سر کی قسم کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کا اضافہ۔ ارے اس پر کون ہنسی ضبط کر سکے۔ روپ سنگھ ہر چند بہت پریشان ہو چکے تھے پھر بھی میری بات پر بے ساختہ ہنسنے لگے۔

اور اب میں نے ان کی یہ چڑ بنالی۔ جب کوئی ایسی ویسی بات پیش آتی تھی میں اپنا ماتھا ٹھوک ٹھونک کر کہتا تھا کہ انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا۔

روپ سنگھ تم مجھ سے پہلے چلے گئے۔ یہ بڑی دغا کی تم نے میرے ساتھ۔ تمہارے بعد ایک بار میں دھول پور گیا تھا۔ تمہارے اداس پھانک کی طرف میں نے کیوں کر نظر اٹھائی تھی۔ یہ میرا ہی جی جانتا ہے میرے روپ بدمزہ ہو کر رہ گیا جینا تمہارے بعد ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں!!

۲۔ نوجوان ملازمہ



## وصل بلگرامی

انگریزوں کی طرح گورے بلند پیشانی، متوسط القامت، نورانی چہرے اور گھنی لال ڈاڑھی کے فرشتہ صورت اور نیولین سیرت انسان تھے۔

میری اتنی عمر گزر چکی ہے لیکن میں نے ان کا سا اہنی عزل و شیر دل انسان آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب کسی بات پر کمر باندھ لیتے تھے تو وہ تمام امور جو دنیا بھر کے لیے ناممکن ہیں انہیں پل بھر میں ممکن بنا دیا کرتے تھے۔

اگر وہ اس عہد میں پیدا ہوتے جب کہ ایک فرد کی حوصلہ مندی ملکوں کے نقشے بدل دیا کرتی تھی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک عظیم سلطنت کی بنیاد ڈال کر سکندر اعظم سے ٹکر لے سکتے تھے۔

حافظہ بے حد کمزور ہو چکا ہے۔ ان کے صرف چند کارنامے یاد رہ گئے ہیں ان کو پڑھ کر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا تھے۔ اس دور میں جب کہ فرنگی حکومت کا رعب ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ اور اس کا غرور زمین پر پاؤں نہیں رکھتا تھا۔ ہم دونوں غالباً بمبئی کے ایک بہت شاندار ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اور بڑی بڑی موچھوں کا ایک دھم دھومر جغادر سیا نگریز ہمارے سامنے کی میز پر شراب پی رہا تھا۔ میں نے وصل صاحب سے کہا جب جانیں کہ آپ اس گڈ امیر انگریز کو پان کھلا دیں وہ گلوری چنگی میں دبائے اس کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ آپ کی صورت دیکھ کر مجھ کو اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ لیکن دنیا آپ کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے میں مسلمانوں کا ہڈ پوپ ہوں۔ چاہتا ہوں کہ آپ سر بلند ہو جائیں۔ آپ منہ کھول دیں اس انگریز پر ان کی صورت اور ان کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ بے سوچے سمجھے اس نے اپنا منہ کھول دیا اور انہوں نے اس کے منہ میں گلوری رکھ دی اس کی پیچھے کو تھپتھپایا اور خدا آپ کا بھلا کرے کہتے ہوئے میرے پاس آگئے وہ سٹپٹایا ہوا انگریز ان کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا سر کر جنبش دے کر تھینک یو کہا اور غسل

خانے کی طرف چلا گیا۔

وہ راجہ صاحب کٹھوارا کی قیصر باغ والی کوٹھی کی پچلی منزل میں رہتے تھے اور میں ان کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک روز چھپٹے کا وقت تھا کہ میری نظر پری ایک مرمے کے تھیلے کیسی بوڑھی میم صاحب پر جو سامنے کی سڑک سے زیادہ آہستہ خرامی کے ساتھ بارہری کی طرف چلی جا رہی تھیں۔

میں نے کہا وصل صاحب کیا آپ میں اتنی طاقت ہے کہ آپ ان تھیلا جان کی سست گامی کو برق خرامی میں تبدیل کر دیں؟

انہوں نے کہا بے شک۔ یہ کہہ کر وہاں کمرے کے سامنے کے کنویں کی جگہ پر جو گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ جا کر کھڑے ہو گئے۔ اور میم صاحب کا انتظار کرنے لگے جب وہ رنگش رنگش کرتی گھنے درختوں کے نیچے گزرنے لگیں تو انہوں نے بڑے زور سے لا اللہ کا نعرہ لگا کر اور اپنے مصنوعی دانتوں کو ذرا سا آگے نکال کر اس طرح کٹ کٹ کٹ کٹ بجانا شروع کر دیا کہ وہ میم صاحب اوہ مائی گاڈ کہتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی سرپٹ اور سڑک لے لوٹے تھقبے مار مار کرتا لیاں بجانے لگے۔

ایک روز شام کو وہ بلیح آباد آئے اور کہا دیانراؤن گم نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ کو صبح کی گاڑی سے کان پور لے جاؤں۔ کل رات کو ان کے وہاں آپ کی دعوت ہے۔ جس میں آپ کے دوست جگت موہن لال رواں تیج بہادر سپرد اور جسٹس شاہ سلیمان بھی موجود ہوں گے۔ میں نے بیوی سے اجازت طلب کی مگر وہ بگڑ گئیں اور کہنے لگیں ابھی پرسوں ہی لکھنؤ سے آئے ہو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں تم کو اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی میں نے وصل سے اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔ اور کہا گم صاحب سے معذرت کر دیجی گا۔ انہوں نے کہا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کو میرے ساتھ کل جانا پڑے گا۔ میں نے کہا آپ میری بیوی کے مزاج اور ان کی بٹ سے

واقف نہیں ہیں۔ وہ مجھے کسی طرح جانے نہیں دیں گی انہوں نے سینہ ٹھونک کر کہا اجازت میں دلاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ کوٹھی سے باہر نکل گئے۔ میں نے کہا کدھر انہوں نے کہا پتھر وہ باہر جا کر ایک بہت بڑا نکلیا پتھر اٹھالائے اور زینے کی آخری بالائی سیڑھی پر کھڑے ہو کر انہوں نے آواز دی میری چھوٹی بھانجی ذرا آپ دروازے کے پٹ کی آڑ سے دیکھ لیں کہ میں کس طرح دم توڑتا ہوں۔ بیوی نے پٹ کی آڑ سے کہا کیا بات ہے وصل صاحب انہوں نے بڑا سا نکلیا پتھر ہاتھ میں بلند کر کے کہا دیکھیے میں اپنا سر پھوڑ کے مری جاؤں گا۔ آپ کو معلوم ہے میں سید ہوں۔ سنتا ہوں پٹھان سادات کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ نے جوش کو میرے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دی تو میں پتھر اپنے سر پر مار کر خودکشی کر لوں گا۔ اور آل رسول کا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے ماتھے کے عین سامنے پتھر کو لے آئے اور رو رو کر کہنے لگے آپ اجازت دیتی ہیں یا نہیں۔ میں ایک دو تین گنوں کا اگر تین سنتے ہی آپ اجازت نہیں دیں گی تو میں سر پھوڑ کر آپ کے زینے پر ابھی ابھی شہید ہو جاؤں گا۔ دیکھیے ایک دیکھیے دو اور دو کہتے ہی وہ جیسے پتھر اٹھا کر اپنے ماتھے پر مارنے والے تھے بیوی نے کہا کہ بہت اچھا آپ ان کو اپنے ساتھ لے جائیں مگر کل ہی واپس بھیج دیں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے پتھر پھینک دیا سیڑھی پر سجدہ شکر ادا کیا اور مجھے آنکھ مارتے ہوئے نیچے اتر گئے۔

ایک بار ہم لوگ ریل میں سفر کر رہے تھے کہ کسی جنکشن پر ایک دولہا اپنی دلہن اور مٹھائی کے ٹوکڑے کے ساتھ ہمارے درجے میں آ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

شوکت تھانوی نے مٹھائی لکی طرف اشارہ کیا وصل نے جلدی سے آنکھیں بند کر کے وعدہ کیا اتنے میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ دولہا نے دلہن سے چہل بازی شروع کر دی انکو موقع مل گیا۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھے دولہا سے جا کر کہا تو شریف گھرانے کا بچہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میں تیرے دادا کے برابر ہوں اور تو میرے



سامنے اپنی دلہن سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ اس کا شانہ پکڑ کر انہوں نے دلہن سے جدا کر کے بٹھا دیا۔ وہ نوجوان ادب سے بیٹھ گیا۔ اب انہوں نے مٹھائی کے ٹوکڑے میں ہات ڈال کر دو لڈو نکالے اور دو لہاسی کہا بیٹا اسی بات پر لے ایک لڈو تو کھالے اور ایک میری بہو کو کھلا دے اور میں باقی لڈو تیری اور تیری دلہن کی طرف سے تیرے ہم سفر میں بانٹے دے رہا ہوں۔ وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ انہوں نے ایک دو لہا دلہن کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اور یہ کہہ کر انہوں نے سارا ٹوکرا ہم سب کو کھلا دیا کرٹم دھم۔

وہ تمام شعراء لکھنؤ کی دوا اماں تھے۔ جب کہیں کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا تھا بانیان مشاعرہ ان کے پاس شعرا کی فہرست اور ان کا کرایہ بھیج دیتے تھے اور وہ سب کے گھروں پر جا کر انہیں مدعو کرتے تھے۔ ایک مرکز پر سب کو جمع کرتے تھے۔ اپنے ساتھ سٹیشن لیجاتے اور ٹکٹ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا کرتے تھے۔

ایک بار وہ اس قدر تاخیر کے ساتھ سٹیشن پہنچے کہ گاڑی چھوٹ رہی تھی انہوں نے سارے شعراء کو بے ٹکٹ ہی ریل میں سوار کر دیا۔ اور کہا آگے چل کر کسی بڑے اسٹیشن پر گاڑی کو آگاہ کر دیں گے۔ دو چار سٹیشنوں کی بعد ایک نوجوان ٹکٹ چیکر نے ہمارے درجے میں داخل ہو کر ہم سے ٹکٹ طلب کے ہم سب نے دور بیٹھے ہوئے وصل صاحب کی جانب جو ٹکٹ چیکر کو دیکھتے ہی تسبیح پڑھنے لگے تھے اشارہ کر دیا۔ اور سوچنے لگے کہ دیکھیں اب کیا گل کھلے گا۔ ٹکٹ چیکر کو کن انکھیوں سے اپنی طرف آتا دیکھ کر انہوں نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا۔ صورت ان کی خاصا خدا کی سی تھی۔ وہ ان کے سامنے آ کر کھڑا تو ہو گیا لیکن ٹکٹ مانگنے کی جرات نہیں کر سکا۔

اتنے میں پٹری بلد نے سے گاڑی کو جھٹکا لگا۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور جب رے اثراتی انداز میں انہوں نے ٹکٹ چیکر کی طرف نگاہ اٹھائی اور اس نے کہا ٹکٹ تو انہوں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور پوچھا پہلے اپنے باپ کی خیریت بتا پھر اپنے چچا سے ٹکٹ مانگ میرا نام ہے وصل بلگرامی ٹکٹ چیکر نے بڑی غمناک آواز میں

کہا کوئی ایک مہینہ ہوا کہ وہ انتقال فرما چکے ہیں یہ سنتے ہی وصل صاحب رونے لگے۔  
اور اس کو گلے سے لگایا اور وہ بھی رونے لگا۔

اب ٹکٹ چیکر کی کیا مجال تھی کہ ٹکٹ مانگتا الہ آباد سٹیشن پر اس نے ہم سب کو چائے  
پلائی اور اپنے ساتھ لے جا کر ہم کو باہر پہنچا دیا۔

جنگ عظیم کے خطرناک دور میں ہم لوگ وصل صاحب کی سرکردگی میں گوالیار سے  
لکھنوجارہے تھے۔ اور ہم سہیلے ہوئے فرسٹ کلاس کے ریزرو درجے میں ایک بڑا لانا  
ٹرانگا ادھیڑانگریز فوجی بھی اسی گاڑی سے سفر کر رہا تھا۔ اور اس کی یہ شان تھی کہ ہر بڑے  
سٹیشن پر چار پانچ گورے اس کے درجے کے سامنے کھڑے ہو کر پہرہ دینے لگتے تھے۔  
اس فوجی افسر کے ساتھ اس کی نہایت ہی پری پیکر لڑکی بھی سفر کر رہی تھی۔ ہم نے اس کو اس  
فوجی افسر کی لڑکی اس لیے سمجھا کہ وہ اس سے ڈیڑی کہہ کہہ کر باتیں کر رہی تھی۔

جب کسی جنکشن پر گاڑی رکی تو وہ لڑکی اتری اور وہیلر بک اسٹال پر کتابیں دیکھنے  
لگی نیاز فتح پوری نے کہا آج ہم آپ کو سورا تسلیم کر لیں گے۔ اگر آپ اس لڑکی کا  
بوسہ لے لیں۔

وصل نے کہا شرط بدلو اور جب پچاس روپے شرط بدلی گئی۔ تو وہ نیچے اترے  
اور وہیلر کی دکان پر جا کر اسے گھورنے لگے۔ اور جب اس ماہ جبین نے تیور بدل کر کہا  
کہ تم کون گستاخ بوڑھے ہو تو انہوں نے آؤدیکھنا تاؤ اس کو گلے لگا کر چٹ سے اس  
کا بوسہ لے لیا۔ لڑکی نے چیخ ماری اور اس کا باپ بھرا ہوا پستول لے کر جھپٹ پڑا۔  
پہرہ دینے والے گوروں نے بھی بڑھ کر انہیں حلقے میں لے لیا۔ اور وصل صاحب نے  
رورو کر کہنا شروع کیا کہ ہائے میری بیٹی ہائے میری جواناں مرگ بیٹی کا چہرہ بالکل اس  
بچی کا سا تھا۔ ہائے میری بیٹی ہائے وہ بالکل ایسی ہی بالکل ایسی ہی تھی۔ یہ سن کر اس  
فوجی کا دل پسیج گیا۔ انہیں اپنے درجے میں لے گیا۔ کیک کھلائے چائے پلائی اور اپنی  
بیٹی کو ان کے پہلو میں بٹھا دیا اور جب تک وہ جیا ان کی دوستی کا دم بھرتا رہا۔

## ڈاکٹر کرنل اشرف الحق

متوسط القامت نہ دبلے نہ پتلے نہ موٹے سر اور مونچھوں کے بال بھورے کبھی گورے ہوں گے۔ اب جل کر رنگ مٹیالا سا ہو گیا ہے۔ گول کندھے حیدر آباد کن کے سرکاری فوجی اسپتال کے انچارج۔ دہلی کے باشندے مولوی عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے، مولوی نذیر احمد مفسر قرآن کے نواسے۔ اور اس کے باوجود بادہ خوار فحش نگار اور پھکو بازی میں یگانہ روزگار۔

ان کا سا آٹھوں گانٹھ کمیت آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ کسی خانے میں بھی بند نہیں تھے۔ وہ فحشیات کے شاعر تھے۔ اور تخلص تھا عریاں دیوان عریاں کے نام سے ان کا کلام چھپ چکا ہے۔

وہ سونے کا وقت نکال کر ہر وقت آدھے آدھے پیگ کے حساب سے پیتے رہتے تھے۔ رات کو گیارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک وہ سوتے۔ اور گھسل گھسل کر بڑی سی انگنائی بیٹھے طے کر کے بیت الخلا جاتے اور وہاں سے آکر پینا شروع کر دیا کرتے تھے۔ لیکن بادہ خوری کے اس تواتر کے باوجود کیا مجال کہ وہ بہک جائیں یا لڑکھڑانے لگیں۔

ہر چند اسپتال کے دروازے کے سامنے ہی تھا لیکن وہ ہفتے میں دو ایک دن کے علاوہ کبھی وہاں جاتے ہی نہ تھے انہوں نے اسٹنٹ ڈاکٹر پر تمام کاروبار چھوڑ رکھا تھا۔

اور جب بھی ان کا اسٹنٹ ڈاکٹر ان کے مکان پر آکر کسی مریض کا حال بیان کر کے ان سے اسکی دوا پوچھتا تو وہ ہمیشہ اے ڈی ٹی بتا دیا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ ہر مرض کی دوا درود شریف قسم کی کون سی دوا ہے تو انہوں نے قہقہہ مار کر کاہ میاں اس کے معنی ہیں Any Dam Thing یعنی جو چیز بھی لغو چاہو دے دو۔

وحید الدین صاحب سلیم عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے سید احمد خاں کے سابق سیکرٹری اور بے حد پھلکو آدمی تھے ایک دن انہوں نے کہا چلیے سلیم صاحب کے وہاں بڑا فقرہ باز بنتا ہے آج اس کو پیدل کامات دوں گا۔

سلیم صاحب کے وہاں پہنچتے ہی وہ ان کی طرف تھرتے دوڑے فوراً ان کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں اور ان کو اس طرح ہلا ہلا کر جیسے کسی درخت کو جڑ سے اکھاڑا جاتا ہے بڑے زور سے کہنے لگ کہ ہائے میرا نیچری! سائنڈ..... جوش یہ نیچری سائنڈ سر سید کے مرتے ہی رسیاں تڑا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا برسوں بعد آج اسے پکڑ پایا ہوں اب نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کہتے ہی انہوں نے سلیم کا بوسہ لے لیا اور پھر وہی رٹ لگا دی ہائے میرا دم کٹا نیچری سائنڈ۔ اور سلیم صاحب اس قدر حواس باختہ ہو گئے کہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

ایک بار ایک نوجوان غالباً پھول کلمہ میر میرے دفتر میں بیٹھا مجھ سے باتیں کر رہا تھا کہ وہ آگئے۔ میں نے تعارف کرایا اور انہوں نے بات ملاتے ہوئے اس کی ہتھیلی میں انگلی چھو دی۔ ان کی اس حرکت پر وہ نوجوان بھر گیا اور آمادہ نبرد ہو کر پوچھا کیا آپ نے مجھ کو آوارہ لونڈا سمجھ رکھا ہے۔ اور انہوں نے مسکرا کر کہا جانی اگر یہ نہ سمجھتے تو یہ بات کرتے ہی کیوں۔

وہ نوجوان لڑنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے شانہ دبا کر اسے بٹھا دیا اور اشارے سے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب پیے ہوئے ہیں۔

---

۱۔ سید احمد خاں اور ان کے رفقا کو ان کے دور میں ”نیچری“ یعنی خدا کے منکر اور نیچر کے ماننے والے کہا جاتا تھا۔

---

میرے دفتر دارالترجمہ کے ایک رکن مولوی فدا علی صاحب ان کے بڑے دوستوں میں سے تھے ایک دن وہ میرے پاس آئے تو فدا علی صاحب کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کر حسب رسم قدیم انہوں نے فدا علی خاں صاحب کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔ جوش صاحب یہ کون جان ور ہے؟ فدا علی صاحب اس وقت بڑے موڈ میں



تھے انہوں نے چھوٹے ہی کہا میرا نام ہے ڈپٹی نذیر احمد انہوں نے کسی بڑے نکتے کو پا جانے کے انداز میں کہا اچھا آپ میرے نانا ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے انگلیوں کی مثلث بنا کر کہا تو اس کے معنی ہیں یہ خاکسار آپ ہی کی صاحبزادی کی اس چیز سے برآمد ہوا ہے۔ اور مولوی فدا علی صاحب کارنگ اڑ گیا اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ایک بار مودودی صاحب کو ساتھ لے کر میں ان کے وہاں گیا۔ وہ چارپائی اور ان کی بڑی لڑکی پٹی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا جوش صاحب اس لڑکی کو لندن بھیج رہا ہوں تعلیم کے واسطے مودودی نہیں چاہتے تھے کہ وہ حیدرآباد سے جائے اس لیے انہوں نے کہا ڈاکٹر صاحب جو ان بیٹی کو تنہا بھیجنا مناسب نہیں ہے۔ یہ سنے ہی انہوں نے اپنے داسنے ہاتھ کی انگلی کو اپنے بائیں ہاتھ کی ڈھیلی مٹھی میں بار بار داخل و خارج کر کے کہا کیوں مولانا مودودی صاحب زیادہ سے زیادہ یہ ہو جائے گا۔ ہو جانے دیجیے لڑکی جھینپ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور مودودی صاحب کے پسینے پسینے ہو کر رہ گئے۔

ایک دن شام کے وقت ایک لائبریری کے ڈھیل مولانا صاحب ان سے ملنے کے لیے آئے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے مصافحہ کر کے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کر بڑی عقیدت سے چوم لیے اور کہا میں بھی اجڑی دہلی کا رہنے والا ہوں تفریحاً یہاں آیا ہوا تھا کل جا رہا ہوں میرے دل نے نہیں مانا کہ مولانا عبدالحق محدث کے پوتے، اور مولوی نذیر احمد صاحب کے نواسے کی زیارت کیے بغیر چلا جاؤں، یہ کہہ کر وہ نہایت ادب سے بیٹھ گئے ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہوں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ کے ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا جوش صاحب بتادیں؟ میں نے کہا یہ بھی کوئی سرکاری راز ہے اب انہوں نے اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو جوڑ کر ایک حلقہ بنا کر کہا اک تو یہ ہے اور پھر مثلث بنا کر کہا جناب والا اور وہ یہ ہیں۔ مولانا پر بکلی سی گر گئی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ السلام علیکم کہہ کر فوراً چلے گئے۔

## کنور مہندر سنگھ بیدی

ساؤنلے، سلونے، دراز قامت، وسیع القلب، متناسب الاعضاء، شگفتہ جہیں وضع دار، خوش فکر، بلند حوصلہ، شعراء پرورد، دوست پرست، دشمن نواز، لہجے کے کھانچوں کے باوصف خوش گفتار، اور داڑھی کے باوجود خوبصورت انسان۔

ان کے جد اعلیٰ تھے حضرت بابا گورو نانک جنہوں نے سکھ مت کیاس نیت سے طرح ڈالی تھی کہ ہندو اور مسلم کی دوئی کو مٹا کر ان میں وحدت پیدا کر دیں، اور دو کو ایک بنا دیں لیکن تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ دو کو ایک نہیں بنا سکے۔ اور ان کے تمنا کے علی الرغم سکھوں کے اضافے کے بعد دو کے تین ہو گئے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

لیکن ان کی وہ تمنا ان کے بچے مہندر سنگھ نے پوری کر دی۔ جن کی ذات میں ہندو مسلم اور سکھ یہ تینوں گروہ مدغم ہو کر یک اکائی کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل وہ پنجاب کے بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اور اب صرف ایک معمولی سے قطعہ زمین کے مالک ہیں۔ لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہاتھی لاکھ لٹے پھر بھی سوا لاکھ کا ٹکے کا۔ ان کے چشمہ فیض سے ہزاروں انسان بالعموم اور سینکڑوں ادبا و شعراء بالخصوص آج بھی فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔

میرے قیام دہلی کے ابتدائی دور میں وہ مجھ سے اس قدر قریب رہتے تھے کہ میری موٹر انہیں کے بنگلے میں رہا کرتی تھی۔ اور جب میں صبح کو ان کے مکان جاتا تو یہ دیکھتا کہ سینکڑوں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کے ان کے گرد ٹھٹ لگے ہوئے ہیں اور وہ سب کے کشو و کاریں سرگرم ہیں۔

بیوی ان کو بھی قیامت کی نک چڑھی اور کڑوی ملی تھی۔ اور ہر بھلے آدمی کے واسطے شاید یہ امر مقدر ہو چکا ہے کہ ان کی بیویاں زندگی بھر بھنبھوڑتی ہیں۔

میں نے ان کو کبھی تھکتے نہیں دیکھا۔ دوپچاسوں میل موٹر سے سفر کر کے مشاعرے

جاتے تھے اور تین چار بجے مشاعرے سے فراغت پا کر پھر اسی وقت موٹر چلائے دہلی آتے اور نہادھو کر مجسٹریٹی کرنے عدالت پہنچ جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے اعصاب گوشت پوست کے نہیں فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔ انکی وضع داری کا استحکام کیا بیان کروں میں جن دنوں ہندوستان جاتا ہوں وہ میرے گرد پروانے کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔ اور اس بار جب سنہ ۶۷ء میں دہلی جا کر میں نے آگرہ ہوٹل میں قیام کیا تو ہر چند میں چنخار ہا کہ کنور صاحب میرے پاس کافی روپیہ ہے لیکن وہ کسی طرح نہیں مانے اور میرے کمرے کا کرایہ چودہ سو روپے انہوں نے اپنی جیب سے ادا کر دیا۔ اور موتی محل ہوٹل سے جو میرا کھانا آیا کرتا تھا۔ اس کا حساب بھی زبردستی بے باق کر دیا۔ اس دور میں ایسا در نہستانی بستم می رسد کا برتاؤ کون کرتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ ایک بہت اچھے غزل گو شاعر ہیں بلکہ انکی پوری زندگی غزل ہے اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح غزل مختلف و متضاد و اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے اسی طرح کنور صاحب کی ذات بھی مختلف و متضاد و اشغال کا مجموعہ ہے یعنی مشاعروں کی صدارت کے فرائض، فلم سٹاروں کی نمائش کا کام، کلبوں کا انتظام، کرکٹ میچوں کا انصرام، رقص و سرود کا اہتمام، الیکشنوں کی دوڑ دھوپ، مرغیوں، تیتروں، اور بیڑوں کی پالیوں کا بندوبست اور رنگوں کا نظم و نسق یہ تمام مشاغل ان کی ایک ذات میں مجتمع ہو گئے ہیں۔ ہے کوئی ایسا جامع ضد و تضاد شخص اس دنیا میں؟؟

اگر حافظ شیرازی کا یہ قول کہ

برایں رواق زبرد نوشتہ اند بزر

کر جز نکوئی اہل کرم نہ خواہد ماند

صحیح ہے تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مہندر سنگھ چوں کہ ان غیر معمولی انسانوں میں سے ہیں جو لوگوں کے ساتھ نیکی کیے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے اس لیے ان کا نام قیامت تک باقی رہے گا۔

## پنڈت جواہر لال نہرو

وہ اپنی موہنی سی صورت کی جاذبیت اپنے رنگ کی طلاقت اپنی آنکھوں کی مروت  
اپنے لہجے کی غدوبت، اپنے تکلم کی موسیقیت اپنے تبسم کی حلاوت اپنے خاندان کی  
وجاہت اپنے دل کی آفاق درآغوش وسعت، اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت اور اپنے  
کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایک ایسے انسان تھے جو اس کرہ خاکی پر  
صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور جو یہ آواز بلند کر سکتے ہیں کہ

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں  
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں  
ان کا وجود ہندوستان کا افتخار ایشیا کا وقار اور عالم انسانیت کا اعتبار تھا۔ اور وہ اس عالم  
اجسام کے ایک ایسے ذی حیات تاج محل تھے کہ جس کو شام اودھ کی ملاحیت اور صبح بنارس  
کی صباحت نے الہ آباد کے معنی خیز سنگم پر گنگا جمنی چھینیوں سے تراش کر تعمیر کیا تھا۔  
اس سے پیش تر دو تین مواقع پر ان کا تذکرہ کر چکا ہوں، اس لیے ان کے متعلق جو  
باتیں بیان کرنے سے رہ گئی ہیں فقط وہی بیان کروں گا۔

ایک باریہ سن کر کہ وہ کبھ میلے میں شریک ہونے کو الہ آباد گئے تھے میرے تن بدن  
میں آگ لگ گئی میں غصے سے بھرا ان کے پاس گیا اور کہا تو بروٹس؟!

۱۔ شیکسپیر نے اپنے ڈرامے جولیوس سیزر میں لکھا ہے کہ جب یہ دیکھا کہ اس کا  
سب سے بڑا جانثار دوست بروٹس بھی اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کی صف میں  
کھڑا ہوا ہے۔ تو زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ اور فرط حیرت سے اس  
نے اتو بروٹس (یعنی تم بھی اے بروٹس) کا نعرہ لگا کر اپنی تلوار پھینک دی۔ اور یہ خیال  
کر کے کہ جب میرا ایسا جگری دوست اور اس قدر مدبر انسان بھی میرے خلاف ہو گیا  
ہے تو اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ مجھ میں کوئی نہ کوئی ایسا زبردست عیب  
ضرور موجود ہے جس سے میری قوم اور میرے ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہے اپنی گردن



جھکالی اور اپنے قتل ہو جانے کے واسطے پیش کر دیا۔

انہوں نے پوچھا کیوں صاحب میں نے کون سی ایسی خلاف توقع بات کی ہے کہ آپ مجھ کو اتورٹس کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا پنڈت جی آپ تو بہت بڑھ چڑھ کر یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ دنیا کے کسی مذہب سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس کے باوجود سنتا ہوں آپ کبھی میلے میں وہم کے شعلے کو ہوا دینے کی خاطر الہ آباد شریف لے گئے تھے۔ انہوں نے کہا اگر میں وہاں پجاری کی حیثیت سے جاتا تو آپ کو حق تھا کہ مجھ پر اعتراض کرتے۔ لیکن میں تو وہاں پبلک ماسنڈ (مزانج عوام) کے مطالعے کے واسطے گیا تھا۔ میں نے کہا جی نہیں آپ وہاں گئے تھے اپنے ووٹوں کی خاطر رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے ابھی وہ جواب دینے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دے ہی رہے تھے ک ڈاکٹر کانجو آ گئے۔ پنڈت جی نے ان سے کہا مسٹر کانجو مجھ پر جوش صاحب اعتراض کر رہے ہیں کہ میں کبھی میلے میں کیوں گیا تھا کانجو نے کہا یہ تو خیر میلے کی بات ہے ایک دن مجھے پوجا کرتے دیکھ کر جوش صاحب نے مجھ سے یہاں تلکھا تھا کہ کانجو صاحب آپ بالغ ہو جانے کے باوجود پوجا کرتے ہیں اور جب میں نے انہیں پوچھا تھا کہ پوجا کرنا کوئی بری بات ہے؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ ایسی بری بات ہے کہ اسے دیکھ کر بھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک صاحب فکر آدمی کے دل پر ایسی کاری ضرب لگ جائے کہ وہ فوراً ٹپ کر مر جائے یہ سن کر پنڈت جی نے قہقہہ مار کر کہا جہاں تک پوجا کا تعلق ہے میں بھی جوش صاحب کا ہم خیال ہوں اور اس پر کانجو کا منہ لٹک گیا تھا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد سردار ٹیل نے اس وقت کے دہلی کے مسلمان چیف کمشنر کو جو علی گڑھ کے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے فرزند تھے معطل تو نہیں کیا تھا مگر زبانی احکام کے ذریعے سے ان کے تمام اختیارات سلب کر کے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رن دھواوالہ کے سپرد کر دیے تھے اور بری دھوم دھام کے ساتھ مسلمان لوٹے اور قتل کیے جا رہے تھے۔ اس بھیانک دور میں اگر جواہر لال نہرو کھل کر میدان میں نہ آ

جاتے اور خوفناک گلیوں میں گھس گھس کر اور ہندوؤں کے منہ پر تھپڑ مار مار کر وہ اس آگ کو نہ بچھا دیتے تو دہلی میں ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہتا۔

اسی زمانہ کا ای واقعہ ہے کہ دہلی کے محلہ سوئی دالان میں ہندو جب ایک مسجد کے دروازے سے باجا بجاتے گزر رہے تھے تو مسلمانوں نے ان کو مار بھگا دیا تھا۔ تو شہر کے ہندو کو تو ال نے چوراہے پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کو ماں بہن کی سنگی گالیاں دیں تھیں۔ اور جب مجھے اس بات کی خبر دی گئی تھی تو میں نے ایک محضر پر لوگوں کے دست خط لے لیے اور ان سے جا کر کہا تھا کہ پنڈت جی اس خطار پر کہ مسلمانوں نے قانون شکنی کی تھی ان پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے اور ان کی گرفتاریاں بھی عمل میں لائی جاسکتی ہیں مگر کو تو ال شہر کو اس بات کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ تمام مسلمانوں کو چوراہے میں کھڑے ہو کر ماں بہن کی گالیاں دیتا۔

انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے میں نے کہا میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں آپ اس محضر کو ملاحظہ کریں جس پر ہندوؤں کے بھی دستخط ہیں۔  
محضر پڑھ کر وہ غصے میں کانپنے لگے اور انسپکٹر جنرل پولیس کو اسی وقت فون پر ہدایت کی کہ کو تو ال کو فوراً معطل کر کے اس کی تحقیقات کرو اور مجھے اطلاع دو۔

ان کو اردو زبان سے بھی بڑی محبت تھی۔ انہوں نے مجھ سے ایک دن کہا تھا کہ اردو کے بارے میں میرے ذاتی رائے اور ہے اور میری گورنمنٹ کی رائے اور ہے۔ لیکن میں گورنمنٹ پر اپنی رائے تھرست کرنا (ٹھونسنا) نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ یہ عمل ڈیما کریسی (جمہوریت) کے خلاف ہے۔

ایک روز لکھنؤ اسٹیشن پر انہوں نے ریلوے حکام کو بلا کر بہت بری طرح پھٹکار کر کہا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھ کو نرا جاہل بنا کر رکھ دیا ہے ہر طرف ہندی کے بورڈ لگے ہوئے ہیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کھانے کا کمرہ ہے یا بواٹری ہے۔

اے وہ ادب کے بڑے قدردان ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ رن بھی ہیں اور دھاوا

ایک بار جب پاکستان سے رخصت لے کر جب میں دہلی میں ان سے ملا تو انہوں نے بڑے طنز کیساتھ مجھ سے کہا تھا کہ جوش صاحب پاکستان کو اسلام اسلامی کلچر اور اسلامی زبان یعنی اردو کے تحفظ کے واسطے بنایا گیا تھا۔ لیکن ابھی کچھ دن ہوئے کہ میں پاکستان گیا اور وہاں یہ دیکھا کہ میں تو شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے ہوں لیکن وہاں کی گورنمنٹ کے تمام افسر انگریزوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے انگریزی بولی جا رہی ہے اور انتہا یہ ہے کہ مجھے انگریزی میں ایڈریس بھی دیا جا رہا ہے۔ مجھے اس صورت حال سے بے حد صدمہ ہوا اور میں سمجھ گیا کہ اردو اردو کے جو نعرے ہندوستان میں لگائے گئے تھے وہ سارے اوپری دل سے اور کھوکھلے تھے۔ اور ایڈریس کے بعد جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا اردو میں جواب دے کر سب کو حیران کر دیا۔ اور یہ بات ثابت کر دی کہ مجھ کو اردو سے ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ محبت ہے۔ اور جوش صاحب معاف کیجیے آپ نے جس اردو کے واسطے اپنے وطن کو تہج کر دیا ہے اس اردو کو پاکستان میں کوئی منہ نہیں لگاتا۔ اور جائے پاکستان میں نے سرم سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ ان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ان کی باتیں سن کر مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے پاکستان کے ایک بڑے شاندار منسٹر صاحب کو اردو میں خط لکھا تھا اور ان صاحب بہادر نے انگریزی میں جواب مرحمت فرمایا تو جواب الجواب میں یہ لکھا کہ جناب والا میں نے تو آپ کی اپنی مادری زبان میں خط لکھا تھا لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اب چند واقعات ان کی ادب نوازی ان کی غیر معمولی شرافت اور ان کے بے نظیر ناز برداری کے بھی سن لیجیے۔

جب سینئرل حکومت کے محکمہ اطلاعات میں میرا تقرر سرکاری رسالے آج کل

میں ہو گیا تو میں نے ان کو خط لکھا کہ میرے پرچے کے واسطے اپنا پیغام جلد بھیج دیجیے۔ اگر آپ تساہل سے کام لیں گے تو میری آپ کی زبردست جنگ ہو جائے گی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ان کا پیغام آ گیا (جسکو آج کل فائل میں دیکھا جاسکتا ہے) اپنے پیام کے آخر میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں جلدی میں پیام اس لیے بھیج رہا ہوں کہ جوش صاحب نے مجھ کو دھمکی دی ہے کہ اگر دیر ہو گئی تو وہ مجھ سے لڑ پڑیں گے۔ اور جب میں نے ان کے پیغام کے شکریے میں انکو خط لکھا تو دبی زبان سے یہ شکایت بھی کر دی کہ آپ نے میرے خط کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھنے کے عوض سیکرٹری سے لکھوایا ہے۔ میرے ساتھ آپ کو یہ برتاؤ نہ کرنا چاہیے تھا۔

اور ان کی شرافت دیکھیے کہ میری اس شکایت پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے مجھ کو یہ لکھا کہ مشاغل کے اس ہجوم کی بنا پر میں سیکرٹری سے خط لکھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ آپ میری اس غلطی کو معاف کر دیں۔

ایک بار میں ان کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ دروازہ پر کھڑے قدوائی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور جیسے ہی میں نے برآمدے میں قدم رکھا اور ان سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ ایک سیکنڈ کے اندر روپوش ہو گئے۔

میں نے قدوائی صاحب سے کہا میں تو اب یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ آپ پنڈت جی سے کہہ دیجیے گا کہ لیڈری اور پرائم منسٹری کو لیڈری اور پرائم منسٹری تک محدود رکھیں۔ اور اس کو اس قدر نہ بڑھائیں کہ وہ ماتر کی بادشاہی سے ٹکر لینے لگے۔ قدوائی صاحب نے مسکرا کر پوچھا کس بات پر آپ اس قدر بگڑ گئے ہیں میں نے کہا ارے آپ ابھی تو خود دیکھ چکے ہیں کہ میرے آتے ہی وہ روپوش ہو گئے ہیں اور مزاح پرست تو بڑی چیز ہ۔ انہوں نے مجھ سے صاحب سلامت تک نہیں کی۔ اتنے میں جواہر لال نہرو آ گئے۔

میں منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا جوش صاحب کیا معاملہ ہے۔ قدوائی صاحب نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ میرے قریب آئے اور مجھ سے کان میں کہا کہ مجھے اس



قدر زور کا پیشاب آگیا تھا کہ اگر ایک منٹ بھی تاخیر ہو جاتی تو پائے جا مے میں ہی نکل جاتا۔ اور یہ عذر سن کر میں نے انہیں گلے سے لگالیا۔

ایک مرتبہ کنور مہندر سنگھ بیدی نے مجھ سے کہا میرے وزیر شری سچر نے دہلی میں میرا تبادلہ کر دیا ہے میں نے کہا یہ شری سچر ہیں یا مسٹر خچروہ ہنسنے لگے۔ کہا کیا خوب قافیہ ملایا ہے۔ ہاں تو میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ اور آپ کی بیگم پٹودی دونوں مل کر پنڈت جی کے پاس جائیں اور میرا تبادلہ رکوادیں۔

دوسرے ہی دن ہم دونوں پرائم مسٹر ہاؤس پہنچے اپنے آنے کی اطلاع کی بیگم پٹودی کو تو فوراً بلا لیا گیا۔ اور میں منہ دیکھتا رہ گیا جواہر لال کی اس بدوضی پر مجھے تاؤ آ گیا۔ اور یہ سوچ کر کہ میں اسی وقت وہاں سے چلا جاؤں کہ ان سے پھر کبھی نہ ملوں میں اٹھا ہی تھا کہ ان کے سیکرٹری صاحب غالباً پیارے لال صاحب گئے اس کے بعد ان کے محکمے کے وزیر سچر بوزن خچر نے بہت زور مارا۔ لیکن پنڈت جی اپنی ضد پر قائم رہے۔

ایک مرتبہ میں گرمی کی تعطیل منانے کے لیے شملے گیا ہوا تھا۔ تین چار روز بعد معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال بھی آگئے ہیں میں نے ان کی جائے قیام پر فون کیا بد قسمتی سے رسیور اٹھایا ان کے ایک ایسے نووارد سیکرٹری نے جو لہجے ہی سے مدد راسی معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنا نام بتا کر کہا میں پنڈت جی سے ملنا چاہتا ہوں اور آپ ان سے وقت مقرر کر کے مجھے اطلاع کر دیں اس گنوار نے کبھی میرا نام سنا ہی نہیں تھا۔ اس نے بار بار میرا نام پوچھا میں نے کہا جوش ملیح آبادی لیکن اس کو کچھ سمجھ نہ آیا آخر کار میں نے جھلا کر کہا جے او اس ایچ۔ اس نے کہا مسٹر جاش آپ کے پارٹیکلز (خصوصیات) کیا ہیں۔ میں نے کہا جو شخص میرے پارٹیکلز نہیں جانتا اس کو یہ حق نہیں کہ وہ ہندوستان میں رہے۔ یہ سن کر اس نے کہا اوہ ایسے بولے گا میں نے کہا اس سے زیادہ بولے گا۔ اس نے کہا آپ ہولڈ کیے رہیں میں پنڈت جیسے پوچھ کر بتائے گا۔

اور دو منٹ کے بعد اس نے کہا پنڈت جی اب بولتا ہے کہ ہم یہاں بچے  
(مزے) کرنے آیا ہے آپ ڈلی میں ملو۔

یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ام الشعراء سے کہا وزیر  
اعظم بنجانے کے بعد پنڈت جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے میں ابھی ان کو ایسا خط لکھوں  
گا کہ وہ تگنی کا ناچ ناچنے لگیں گے۔ بیوی نے کہا ہمارے سر کی قسم ابھی خط نہ لکھو۔ اس  
وقت غصے میں بھرے ہوئے ہو۔ نہ جانے کیا کیا لکھ مارو گیل۔

پانی پی کر تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پانی پی کر لیت تو گیا مگر دل کی  
آگ بھڑکتی رہی۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لیٹ سکا بستر پر انگارے دہکنے لگے۔ میں  
اٹھ کر بیٹھا اور ایسا خط لکھا کہ اگر اس قسم کا خط کسی تھانے دار تک کو لکھ دیتا تو وہ بھی تمام عمر  
مجھے معاف نہ کرتا۔

خط روانہ کر دینے کے دوسرے دن اندرا گاندھی جی کا فون آیا کہ آپ آج تین  
بجے سہ پہر کی چائے میرے ساتھ پیجئے۔ میں نے کہا بیٹی وہاں تمہارے والد موجود ہو  
ں گے میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے کہا میں پتا جی کو اپنے کمرے میں بلاؤں  
گی ہی نہیں۔ میں تیار ہو گیا۔

شام کو جب برآمدے میں پہنچا تو ایک چپر اسی نے اندرا کے کمرے کی طرف اشارہ  
کر دیا اور جب میں ان کے کمرے کی طرف بڑھا تو پیچھے سے آکر پنڈت جی نے میرا  
ہات پکڑ کر کہا آئیے مرے کمرے میں۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے میرا ہات  
کھینچا اور مروت کے دباؤ میں آکر میں ان کے ساتھ ہولیا۔

ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ میرے بزرگوں کے ملنے والے سر مہاراج  
سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں پنڈت جی نے کہا مہاراج سنگھ یہ وہی جوش صاحب ہیں  
جنہوں نے مجھے ایسا گرم خط لکھا کہ شملے کی ٹھنڈک میں پسینہ آ گیا۔ مہاراج نے کہا  
غنیمت سمجھیے کہ یہیں تک نوبت آئی ان کے بزرگوں سے آپ واقف نہیں۔ وہ جس

پر گرم ہو جاتے تھے اسے ٹھنڈا کر دیا کرتے تھے۔ پنڈت جی ہنسنے لگے گھنٹی بجائی اسی  
مدر اسی سیکرٹری کو بلایا اور جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا وہ اس پر برس پڑے کہ تم  
نے مجھے پوچھے بغیر جوش صاحب کو ایسا جواب کیوں دیا۔ میں ابھی تمہارا ٹرانسفر کیے  
دے رہا ہوں کہ تم منسٹری آف کامرس چلے جانا۔

ان کا یہ برتاؤ دیکھ کر میں پانی پانی ہو گیا۔ اور ان کے بے مثال رواداری و شرافت  
پر نگاہ کر کے میں ان کو گلے لگا کر رونے لگا۔

اب ان کی آخری شرافت و قدر شناسی کا ایک واقعہ اور سن لیجیے۔

ان کے انتقال سے چند ماہ پیش تر میں ہندوستان گیا اور ان سے درخواست کی تھی  
کہ آپ کسی دن میری جائے قیام پر آ کر میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ ہر چند میں ان کا  
دل توڑ کر پاکستان آ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میری دعوت قبول کر کے وہ میری  
قیام گاہ پر آئے کھانا کھایا اور دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھے رہے۔ اس دعوت میں ان کی آواز  
کے ضعف اور ان کے تبسم کے پھیکے پن سے یہ اندازہ کر کے میرا دل بیٹھنے لگا کہ اب وہ  
انہی زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہی ہوا اور میرے پاکستان واپس  
جانے کے تین ماہ بعد وہ آسمان شرافت کا آفتاب ڈوب گیا۔ اور ہندوستان ہی میں  
نہیں سارے ایشیاء میں تیرگی پھیل گئی۔

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

انگلستان کے شاہ شطرنج کو چھوڑ کر اس وقت کرہ ارض پر جس قدر بھی منسٹر  
پریسیڈنٹ ڈکٹیٹر اور بادشاہ سلامت ہیں وہ سب اپنے اپنے ملکوں میں اس قدر  
مغضوب و مبغوض ہیں کہ عامۃ الناس کے روبرو جب ان کا نام لیا جاتا ہے تو وہ اس خوف  
سے ادھر ادھر دیکھ کر کہ کہیں حکومت کا کوئی پٹھو تو قرب و جوار میں نہیں ہے ان کے نام  
پر بے تحاشہ صلواتیں بھیجنے لگتے ہیں۔ اور یہ ارباب اقتدار جب اپنے ملک سے  
باہر جاتے ہیں یا باہر سے اپنے ملک آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے خوشامد خورے

ایڈروں کی دھمکیوں اور بے ضمیر پولیس کے ڈنڈوں کی ضربوں سے لوگوں کو لاریوں میں زبردستی بھر بھر کر ریلوے سٹیشنوں کے پلیٹ فارموں اور ہوائی جہازوں کے میدانوں میں لیے جمع کر دیا جاتا ہے۔ کہ وہ ان ارباب اقتدار پر انگارے برسائے کی تمنائی باتوں سے جھوٹے پھول برسائے اور درپردہ انہیں کوسنے دینے والی زبانوں سے ان کے حق میں زندہ باد کے کھوکھلے نعرے لگائیں۔ اور مٹھائی کے وعدے سے ایک پھسلا ہوا بچہ ان کی گردن میں ہار ڈال دے۔ اور فروخت شدہ اخباروں میں ان کے شاندار استقبال کی بڑی بڑی تصویریں شائع فرمادی جائیں۔

اور ان میں سب کوئی معزول ہو جاتا ہے یا مرجاتا ہے تو لوگ اس کی معزولی و موت پر مٹھائی بانٹتے اور شکرانے کے سجدے ادا کرتے ہیں۔ اور پھر دو روز کے بعد اس کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں گویا اس کی ماں نے اسے کبھی جنا ہی نہیں تھا۔ لیکن جواہر لال کا معاملہ اس سے قطعی برعکس تھا۔ چند جن سنگھی اندھے ایڈروں کو چھوڑ کر ہندوستان کا بچہ بچہ ان کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد بھی دلوں پر ان کی محبوبیت کا اس قدر سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ جس جگہ وہ جلائے گئے تھے وہاں میں نے خود ان کی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ صبح دوپہر اور شام کے وقت ہر عمر اور ہر طبقے کے زائرین کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ سڑک رک جایا کرتی تھی۔ اور لوگوں کی آہ و بکا سے فضا کانپتی رہتی تھی۔ اسے کہتے ہیں حقیقی محبوبیت اور اسے کہتے ہیں سچی ایڈری۔ نہرو میں خود کامی و کمینگی نہیں تھی۔ وہ بڑے آدمی بن ہی نہیں سکتے تھے اور اسی خطا پر کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاستدان نہیں تھے۔

بات یہ ہے کہ دراصل سیاست پیغمبری کا ایک دوسرا نام ہے اور حقیقی سیاست وہ ہوتی ہے کہ جو نوع انسان کو پھولوں کی بیج پر لٹانے کے لیے خود غار اشکاف کانٹوں پر چلتی ہے۔ اور اللہ کے بندوں کا پیٹ بھرنے کے واسطے خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرتی ہے۔ لیکن آج کی سیاست اس قدر مسخ ہو چکی ہے۔ کہ وہ نوع انسانی کو کانٹوں میں



چلا کر خود پھولوں کی سیج پر لیٹتی ہے۔ اور اللہ کے بندوں کے پیٹوں پر پتھر بندھوا کر فقط اپنا اور اپنے چہیتوں کا پیٹ بھرتی ہے اور نہرو کی سیاست چوں کہ موجودہ سیاست کے قطعی برعکس تھی اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاست داں نہیں تھے میں اسکی تائید کرتا ہوں اس لیے کہ آج کے اچھے سیاستدان کے واسطے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ اصول خدمت و انسانیت کے اعتبار سے وہ ناقابل برداشت حد تک برا آدمی ہو (اے لافانی جواہر لال روح انسانیت کا سجدہ قبول کر)!!



## سروجنی نائیڈو

بادہ شاعری سے سرشار گروہ شعرا کی غم گسار آزادی کی شیدائی، محبت کی شہنائی،  
لہجے میں ارغنون، باتوں میں افسوں، میدان جنگ میں جھانسی کی رانی، ایوان امن میں  
قرۃ العین ثانی، تقریر میں نغمہ آب حیواں آواز میں جمال ماہ کنعاں رشتہ صوت ریشمی  
تاگے کا سامہیں نوائے حرف و حکایت گوکل بن کر گویا دھڑبن چشمہ لولو و مرجان بلبل  
ہندوستان اگر یہ دور مردوں میں جواہر لال اور عورتوں میں سروجنی کی ہستیاں نہ پیدا  
کرتا تو پورا ہندوستان نابینا ہو کر رہ جاتا۔

میں نے ان کو سب سے پہلے سنہ ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ حیدرآباد میں دیکھا تھا۔  
اور ان کی شخصیت کی مقناطیسیت نے میرے دل کو ہمیشہ کے واسطے موہ لیا تھا۔  
ان کے گلے میں رگیں نہیں سارنگی کے کھنکتے ہوئے تارتھے۔ ان کے لہجے میں اس  
قیامت کا زیر و بم تھا کہ اس کے سامنے راگنیاں سرمہ درگلو ہو کر رہ جاتی تھیں۔ اور ان  
کے دل و دماغ کے ایوان شاعری کا ہر مزمرہ پرور تموج تھا کہ ان کے روبرو چاندنی  
راتوں کا نغمہ بحر پانی پانی ہو کر رہ جاتا تھا۔

ہر چند اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ لیکن حیدرآباد کی اردو آب و ہوا نے ان کو  
اردو اور فارسی کے مذاق میں ڈھال دیا تھا۔ کہ فقط یہی نہیں کہ وہ بڑی روانی کے ساتھ  
اردو بولتیں بلکہ بڑی آسانی کے ساتھ اردو شاعری کو سمجھ لیتیں اور الفاظ پکڑ کر اس طرح  
داد دیتی تھیں کہ ان کو شعر سنا کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ آج تک یاد ہے کہ مجھ کو وہ رات  
جب میں ان کو نظم انگلیٹھی سنائی تھی تو وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھیں۔

انہوں نے میں اس نظم اور اسی کے ساتھ میری بھی تئیں چالیس نظموں کا انگریزی  
میں نہایت اچھا ترجمہ کیا تھا۔ افسوس کہ اس یادگار سرمائے کو میرے لاابالی پن نے گم  
کر دیا۔

ان کی یوپی کی گورنری کے زمانے میں ایک بار میں لکھنؤ گیا، اور صبح کے وقت گورنمنٹ

ہاؤس میں جب میں نے فون کیا کہ میں مسز مائیڈو سے بات کرنا چاہتا ہوں تو ان کے سیکرٹری نے مجھ سے کہا کہ آپ پیغام دے دیں۔ میں پہنچا دوں گا۔ وہ خود بات نہیں کر سکتیں۔ میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ میرے اور ان کے درمیان یہ رسم نہیں ہے۔ میں رسیور اٹھائے ہوئے ہوں آپ ان سے جا کر یہ کہہ دیں کہ وہ مجھ سے بات کر لیں سیکرٹری نے کہا آپ اپنا فون نمبر دے دیں تھوڑی دیر میں آپ کو رنگ کروں گا۔

دس منٹ بعد گھنٹی بجی سروجنی کی آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی انہوں نے پوچھا آپ کب آئے ہیں نے جواب دیا ابھی آیا اور سب سے پہلے آپ کو فون کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا سب سے پہلے آپ مجھ سے ملنے یہاں آجائیے میں باتھ روم جا رہی ہوں اگر آپ میرے اتھ روم سے نکلنے سے پیشتر یہاں آجائیں تو دو چار منٹ تک انتظار کریں ایسا نہ ہو کہ منہ ہلا کر چلے جائیں۔

یہ تھا سروجنی کا اخلاق اب ان کی شرافتوں کو خوردبین لگا لگا کر ڈھونڈتا پھرتا ہوں لیکن کہیں پتا نہیں چلتا۔ ہائے کدھر چلے گئے وہ لوگ۔

زندگی کے آخری دور میں وہ بار بار بیمار پڑنے لگی تھیں۔ اور میں بار بار یہ سوچتا تھا کہ اس بار بار بیمار پڑ جانے کی علت کیا ہے وہ ہر بار مختلف اسباب بتا کر ٹال دیا کرتی تھیں۔ لیکن جب ایک مرتبہ میں نے زور دے کر بار بار بیمار پڑ جانے کی پھر علت پوچھی تو وہ اداس ہو کر کہنے لگیں جوش صاحب آپ نہیں مانتے تو مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس کا سبب ہے میرا بڑھاپا عورت کے منہ سے اعتراف شیب سن کر میرا دل غم گین ہو گیا انہوں نے میری افسردگی کو بھانپ کر کہا آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ میرے بال تو سفید ہو رہے ہیں مگر آپ یقین رکھیں کہ میرا دل ابھی تک سیاہ ہے اور جب تک دل سیاہ ہے جوانی باقی ہے۔

اس سے قبل اس باب میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لیے اختصار سے کام لوں گا۔

## میاں محمد صادق

دراز قامت، ژوف نگاہ، شب رنگ صبح طینت لاہور کے باشندے دور فرنگی کے پولیس افسر عقیدے کے لحاظ سے قادیانی، نوابی سے بیزار، اوامر کے پابند نماز پنج گانہ کے بغیر سانس لینے کو گناہ سمجھنے والا، سنہ سنہ شاعر نواز اخلاص شعار مردم شناس عہدے کے اعتبار سے شب یلدا اور پاکیزگی طبع و شرافت نفس کے نقطہ نظر سے صبح صادق۔

یہ غالباً سنہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ جب میں دہلی سے کلیم نکال رہا تھا۔ اس وقت وہ دہلی خفیہ پولیس کے سینیئر سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ہر چند ہمارے مابین بڑا تضاد تھا وہ شدت کے ساتھ دیں دار تھے میں پابندی کے ساتھ بادہ خوار تھا (اور خدا کے فضل سے اب بھی ہوں) وہ حسینوں کی جانب نگاہ اٹھانے کو گناہ سمجھتے تھے میں ان کی طرف نگاہ اٹھانے کو عبادت سمجھتا تھا۔ وہ کانگریس کے دشمن تھے میں کانگریس کا دوست تھا۔ وہ حکومت برطانیہ کے وفادار تھے میں اس کا زبردست باغی تھا۔ اور اس تضاد کے باوصف ہم میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے دوست اور جاں نثار دوست تھے۔

اس محبت و مودت کی علت یہ تھی کہ میاں صاحب شاعری کے اس قدر شیدائی تھے کہ میری تمام خطاؤں سے چشم پوشی کر کے مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ان کے اخلاص کا اس قدر پرستار تھا کہ ان کے تمام قصور معاف کر کے ان کا دم بھرتا تھا۔ اور وہ لے یہاں تک بڑھ چکی تھیں کہ جب وہ دینی اعمال میں غرق ہوتے تھے میں ان کو بنانا نہیں تھا۔ اور جب میں ان کو باغیانہ کلام سناتا تھا تو وہ بگڑتے نہیں تھے۔ بلکہ داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

میاں صاحب اس فکر میں رہتے تھے کہ مجھ کو وہ بنا دیں جس کو ابو الاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں مرد صالح کہا جاتا ہے اور یہاں یہ عالم تھا اور اب تک ہے کہ

مرد صالح کے تصور سے ہنسی آتی ہے

اور اسی جذبہ اصطلاح کے تحت وہ میری ٹوہ میں رہا کرتے تھے اور میری بیوی تک



میری بد اعمالیوں کی خبریں پکچوایا کرتے تھے۔

ایک بار میری غیر موجودگی میں وہ میرے گھر آگئے ل سخاوت نے کہا کہ میاں صاحب نواب صاحب سے ملنے رام پور گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا آزاد صاحب کہاں ہیں اس نے کہا وہ بھی ساتھ گئے ہیں یہ سن کر انہوں نے میری تلاش میں خفیہ پولیس والوں کو لگا دیا۔ اور میرے جواڑے ان کو معلوم تھے۔ ان کا پتا بتا کر ہدایت کر دی کہ وہ خاص طور پر مجھ کو وہاں تلاش کریں۔ اور جب اپنے گروگوں کی معرفت ان کو پتا چل گیا کہ میں رام پور میں نہیں گیا بلکہ دہلی کے فلاں محلے میں اپنی محبوبہ کے وہاں جشن کر رہا ہوں تو انہوں نے میری بیوی کو خبر کر دی اور ان کی وہ بری کے واسطے خفیہ پولیس کے آدمی کو ان کے ساتھ کر دیا۔

وہ تو کہیے خدا نے بری خیر کی میری بیوی کو میری قیام گاہ کی اس وقت خبر ہوئی جب میں وہاں سے رخصت ہو چکا تھا اور اپنے مکان کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ ابھی میرے تانگے نے آدھی مسافت سے کچھ کم طے کی تھیکہ آزاد صاحب انصاری نے بے حد گھبرا کر کہا جوش صاحب آپ کی بیگم موٹر میں آرہی ہیں بیوی کو دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو گیا۔ آزاد نے مجھ سے کہا یہ جو داہنے ہاتھ پر تالاب ہے مجھے اس میں پھینک دیجیے اتنے میں بیوی کی موٹر تانگے کے سامنے آگئی۔

اور ہم دونوں ان کو اس طرح پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے جیسے چوہے دان میں پھنسا چوہا باہر کے تماشا نیوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن اللہ نے ہم پر بڑا فضل کیا کہ بیوی نے ہم کو نہایت قہر کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر سر کو بڑی نفرت کے ساتھ جنبش دی اور شو فر کو حکم دیا کہ گاڑی موڑ کر گھر لے چلو اور جب ان کی موٹر اوجھل ہو گئی تو ہم دونوں نے اپنے کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا کہ ہم زندہ ہیں یا انتقال فرما چکے ہیں۔ اگر وہ موٹر روک کر اس وقت پوچھ گچھ کرنے لگتیں تو ہم سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ اور ہم بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مر جاتے۔

اواخر سنہ ۱۹۶۷ء میں جب ہندوستان کے سفر سے پلٹا تو دو چار روز کے واسطے لاہور میں ٹھہرا تھا۔ اسی اثنا میں ایک روز ان کو ملنے گیا اور خدا جانے کیوں ان کی گلی کے نکر پر ہی ٹیکسی رکوا دی اور اپنے رفیق سفر عیش ٹونکی سے کہا اس گلی میں چلے جائے واسنے ہاتھ پر چوتھا یا پانچواں مکان میاں صاحب کا ہے دریافت کیجیے وہ مکان میں ہیں کہ نہیں عیش کو بھیج کر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میرا دل کیوں دھڑکنے لگا ہے۔ اور انہوں نے واپس آ کر جب ان کے انتقال کی خبر سنائی تو درود یوار مجھ کو گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔

میاں صاحب! آپ اکیلے چلے گئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تو کیا بگڑ جاتا تھا۔



## علامہ حیرت

الگنی پر لیٹے ہوئے مغل کی طرح دبے پتلے اور غزل کے س بیمار غم کی مانند نحیف و نزار جو ہر آن کراہتا رہتا ہے۔ کہ اجل سمجھتی ہے مجھ کو غبار بستر کا۔

گورے چٹے اور بڑھاپے کے باوجود ایسا بھبھوکار رنگ رکھنے والے کہ عمر اور ریش دونوں ہی درازی اس کو بچھانہ سکی۔ اور چہرے کا وہ عالم ہے کہ حضرت مسیح کے حواری معلوم ہوتے ہیں۔

مزاج میں اس قدر ظرافت اور شوخی ہے کہ روتوں کو ہنسا دیں۔ اور مدرسوں کے لڑکے ان کے روبرو اپنی چھلیل بھول جائیں۔ ہر چند قدیم شاعری سے وابستہ ہیں پھر بھی نہایت آب دار شعر کہتے ہیں۔ رہنے والے ہیں بدایوں کے جہاں کے لہ مشہور ہیں مگر حیدر آباد دکن میں رہتے جگ بیت چکا ہے۔ پھر بھی زبان کی شستگی وہی ہے جو پہلے تھی اور جب دکنی اردو بولنے پر اتر آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہیں کے قدیم باشندے ہیں۔

کئی برس کی بات ہے کہ میں حیدر آباد گیا تھا۔ انہوں نے میری نہاری کی دعوت کی تھی رانی جانی بھی میرے ہمراہ ان کیہاں گئے تھے۔ نہاری کے واسطے جب تڑکے ان کے وہاں پہنچے تو ان کے ملاقات کے کمرے میں قدم رکھا تو اندر سے علامہ کی آواز آئی کیا لائی ہو بیوی؟ بیوی نے کہا وضو کے لیے گرم پانی۔ انہوں نے بڑے مزے سے کہا ایک زمانہ تھا کہ جب مجھ پر غسل واجب ہو جاتا تھا تم میرے لیے نہانے کے لیے پانی گرم کر دیا کرتی تھیں۔ کہ آؤ پانی تیار ہے۔ اور اب یہ دور آچکا ہے کہ وضو کا پانی سامنے لیے کھڑی ہو۔ یہ سن کر میرا قہقہہ نکل گیا اور ان کی بیوی کی آواز آئی بھاڑ میں جائیں ایسی بے غیرتی کی باتیں میرا قہقہہ سکروہ ہنستے ہوئے باہر آگئے اور زمانے کے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا بیوی شرمانا نہیں ہماری تمہاری باتیں جوش صاحب کے کانوں میں نہیں پہنچی ہیں۔

نہاری کے بعد میں نے کہا سنو علامہ صاحب آپ کے گھر آتے آٹے موڑ میں  
ایک قصیدہ ہو گیا ہے آپ کی شان میں جس کے چند مصرعے مانی کے اور باقی اشعار  
ازیں خاک سار ہیں۔ جس کے قوافی یہاں وہاں ہیں اور ردیف ہے ہیں علامہ حیرت  
بدایونی انہوں نے کہا اللہ اکبر ایسی شیطان کی آنت سی لامی ردیف اس قدر دراز  
قامت ردیف نے اچھے شعر تو کہنے نہیں دیے ہوں گے خیر سنائیے میں نے کہا سنیے۔

مکان ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی  
زماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی  
انہوں نے کہا واللہ کمال کر دیا۔ میری ایک ذات میں زمان و مکان دونوں کو یک  
جا کر دیا ہے میں نے کہا اب شعر سنیے

نہایت نیک طینت ہیں، مگر حد سے سوا کچھ بد  
گماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی  
وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے اور کہنے لگے بدگماں کے دو ٹکڑے کر کے پہلے مصرع  
میں بد اور دوسرے میں گماں لانا انتہائی مشاقی کی بات ہے میں نے کہا اور سنیے اور سر  
دھنیے۔

بڑے سنگین ہیں لیکن قمر چہروں کے جھرمٹ میں  
کناں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی  
سبک روحی میں ہیں یکتا مگر میزان محشر میں  
گراں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی  
مجسم داد رہے ہیں رات بھر اور صبح کو یک سر  
افاں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی  
خضاب و خندہ و خوش لہجگی کے فیض سے اب تک  
جواں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی



جو مسجد میں پکارا مے کدے سے یہ صدا آئی  
یہاں ہیں ' حضرت علامہ حیرت بدایونی  
جھکے سجدے میں اور کعبے میں پہنچے لوگ چیخ اٹھے  
کہاں ہیں ' حضرت علامہ حیرت بدایونی  
پوچھیے نہیں علامہ کا کیا عالم ہوا۔ یہ اشعار سن کر قہقہے مار کر میرے سینے سے چمٹ  
گئے اور کہنے لگے خدا کی قسم دنیا میں کوئی اس ردیف کے ساتھ ایسے شعر نہیں کہہ سکتا۔  
اس قدر مزا آیا کہ غسل واجب ہو گیا۔ بیوی نہانے کے لیے پانی گرم کر دو۔  
ہم ہنسنے ہوئے شاید اب کبھی نہیں مل سکیں گے۔ اور ایک دوسرے کو دیکھے بغیر  
کوچ کر جائیں گے۔  
کھڑکیاں چھوپی گئیں روزن در بند ہوئے ہم نظر بند ہوئے!!



## سردان دیوان سنگھ مفتون

سیر چشم کوتاہ قامت بلند حوصلہ مہمان نواز شیر دل دوست پروردشمن قاتل سلطان  
شکار گدا نواز بدترین دشمن اور بہترین دوست

جب وہ ریاست نکالتے تھے ہر محسبی کے قلعوں اور رہبانوں کے ایوانوں میں  
زلزلے ڈالتے تھے۔ والیان ریاست کی نیندیں حرام کر دی تھیں ان کے قلم نے بڑے  
بڑے فرمانروا کا نپتے تھے ان کے نام سے۔

دہلی کا واقعہ ہے کہ ایک روز سرشام ایک ریاست کے وزیر اعظم میرے پاس بیٹھے  
ہوئے تھے کہ دیوان سنگھ آگئے۔ انہیں دیکھتے ہی وزیر اعظم صاحب کارنگ فق ہو گیا۔  
اور جب گلاس بھر کر میں نے ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے دیوان سنگھ کی جانب  
اشارہ کر کے کہا کہ میں ان کے سامنے نہیں پیوں گا۔ دیوان سنگھ نے ان کو اشارہ کرتے  
دیکھ کر مجھ سے کہا جوش صاحب پر ائم منسٹر سے کہہ دیجیے کہ وہ شوق سے پیئیں۔ میں ان  
کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ یہ وائی ملک نہیں ہیں۔ میں تو فقط والیان ملک پر  
حملہ آور ہوتا ہوں جس کے یہ معنی ہیں کہ میں انسان کا نہیں سور کا شکار کھیلتا ہوں۔

ان کی سلطان شکاری کے واقعات سے تو ہندوستان اب تک گونج رہا ہے اب ان  
کی گدا نوازی کا بھی ایک واقعہ سن لیجیے جو ان کے ایک دوست نے مجھے سنایا تھا۔  
انہوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ کسی واولی ریاست کے متعلق ایک ایسی دست آویز  
ان کے ہاتھ لگ گئی کہ جس میں ان کے حرامی ہونے کا ثبوت موجود تھا۔ اس دستاویز  
کے زور پر وہ اس والی ریاست سے غالباً ساٹھ ستر ہزار روپیہ حاصل کر کے گھر آئے اور  
نوٹوں کے بنڈل بڑی بے پروائی کے ساتھ میز کی درز میں ٹھونس کر وہ مجھ سے باتیں کر  
رہے تھے کہ ان کے شکستہ حال دوست آگئے اور کھڑے کھڑے کہا سردار صاحب  
میں آپ سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے آیا ہوں مجھ سے گلے مل لیجیے۔ وہ  
کھڑے ہو کر ان سے گلے ملے اور انہیں زبردستی بٹھا کر کہا میر صاحب یہ ہمیشہ کے

واسطے رخصت ہونے کے کیا معنی ہیں۔ میر صاحب نے کہا میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ بس اتنا کہوں گا کہ کربلائے معلیٰ جا رہا ہوں۔ اور اب جیتے جی واپس نہیں آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ یہ کہہ کر میر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور جیسے ہی زینے کی طرف جانے لگے۔ دیوان سنگھ نے برہ کران کو روک لیا اور کہا جب تک آپ وجہ نہیں بتائیں گے بھگوان کی قسم میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ یہ سن کر میر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور کہا سردار صاحب۔ یہ نہ پوچھیے اور مجھے جانے دیجیے دیوان سنگھ ان کو کھینچ کر کمرے میں لے آئے اور کہا جب تک آپ وجہ نہیں بتائیں گے میں قسم کھا چکا ہوں کہ آپ کو یہاں آنے نہیں دوں گا۔ میر صاحب نے کہا سردار صاحب میں اس قدر مقروض ہو گیا ہوں کہ اب یہ بات ناممکن ہو گئی ہے کہ میں قرضہ ادا کر سکوں اس لیے جا رہا ہوں کہ کربلائے معلیٰ میں زندگی کے باقی دن گزار دوں اچھا اب جانے دیجیے۔ وقت کم ہے یہ کہہ کر میر صاحب پھر اٹھ کھڑے ہوئے دیوان سنگھ نے ان کا دامن پکڑ کر پوچھا آپ کس پر قدر قرضہ ہے۔ میر صاحب نے کہا پندرہ ہزار روپے۔

دیوان سنگھ نے کہا بس ایک منٹ اور یہ کہہ کر انہوں نے بیس ہزار روپے گن کر میر صاحب کی جیب میں زبردستی ٹھونس دیے میر صاحب کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ اور دیوان سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے سر جھکا لیا۔ ہے کوئی اس دور میں ایسا دوست پرور اور کیا آج کا کوئی ارب پتی بھی اس دریا دلی کی جرات کر سکتا ہے؟ ریاست کے دور میں انہوں نے بے حد کمایا۔ لیکن کبھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھا۔ کھلایا پیا اور کھلا پلا دیا۔

اس لیے ان پر تو نگری اور مفلسی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ لیکن اگر مفلسی میں کوئی دوست یا مہمان آجاتا تھا تو وہ خفیہ طور پر اپنے گھر کی چیزیں فروخت کر کے اس کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی انکی مفلسی کو بھانپ کر ان کو دعوت کرنے سے روکتا تھا تو وہ لڑ پڑتے تھے۔

مجاز نے آکر ایک دن مجھ سے کہا کہ کل تو سردار صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ میں شام کو ان کے ہاں پہنچا انہوں نے ملازم سیکھا کہ بارہ درجن سوڈے کی بوتلیں لے آ محلے میں ان کا بڑا بھرم تھا۔ تھوڑی دیر میں بارہ درجن بوتلیں آگئیں۔ انہوں نے ایک درجن بوتلیں رکھ کر نوکر کو حکم دیا کہ فلاں دکان پر جا کر ان کو فروخت کر دے۔ اور ان کو فروخت کر کے جو روپیہ ہات آئے اسکی ایک وہسکی کی بوتل لے آنا اور کچھ کھان کا سامان لے آئے۔ یہ تھی ان کی مہمان نوازی کی شان۔

یہ غالباً ۱۹۳۷ء کی بات ہے جب میں دہلی سے کلیم نکال رہا تھا۔ اور معاش اور معاشقے کے اعتبار سے وہ میرا بے حد پراگندہ حالی اور پریشانی خیالی کا دور تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ میری بیٹی کی شادی سر پر آچکی تھی۔ کہ وہ ایک روز شام کے وقت میرے گھر آئے برانڈی کی بوتل ساتھ لائے (وہ برانڈی کو وسکی پر ترجیح دیتے تھے)۔

جب دور ختم ہوا تو انہوں نے کہا میں بھابی سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں میں نے سخاوت سے کہا کہ سردار صاحب کو اوپر لے جاؤ میری بیوی اس وقت تک پردے کی پابند تھیں لیکن ان سے کانا پر دکھرتی تھیں۔ جب وہ میری بیوی سے باتیں کر کے نیچے آئے دو منٹ کے اندر رخصت ہو گئے اور جب میں اوپر گیا تو میری بیوی نے مجھ سے کہا سردار صاحب یہ نوٹوں کا بنڈل دے گئے ہیں وہ کہتے تھے یہ رقم انہوں نے اپنے دوست نواب بھاپور سے خط لکھ کر منگوائی ہے دیکھی آپ نے دیوان سنگھ کی شرافت اور دوستی!

ایک زمانے میں جب کہ وہ رفیع احمد قدوائی کے خلاف بڑے سخت مضامین لکھ رہے تھے اس وقت انکی مالی حالت بے حد خراب تھی۔ میں ان کے افلاس کا اندازہ کر کے سید اھ قدوائی صاحب کے پاس گیا اور ان سے کہا قدوائی صاحب آپ منسٹر ہیں حاتم رواں ہیں آپ کی دوست نوازی کے تو ڈنکے پٹے ہوئے ہیں۔ لیکن دوست نوازی کوئی بڑا وصف نہیں ہلا کو چنگیز اور یزید بھی اپنے دوستوں کو نوازتے تھے۔ البتہ



دشمن نوازی کرنا ایسا وصف ہے جو انسان کو نبوت کی سطح پر لے جاتا ہے۔ آپ ہلاکو وغیرہ کی سطح پر قانع رہیں گے یا پیمبری کی سطح تک پہنچنا چاہیں گے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا پہیلیاں کیوں بھجوار ہے ہو آپ جو مدعا ہوا سے کھل کر کہیے۔ میں نے کہا دیوان سنگھ آج کل سخت پریشان ہیں۔

انہوں نے یہ سنتے ہی گھنٹی بجائی سیکرٹری آیا اس کے کان میں انہوں نے کچھ کہا اور چلا گیا اور چار پانچ منٹ بعد وہ چیک لایا چیک پر قدوائی صاحب نے دست خط ثبت کیے اور مہا کہ یہ چیک جا کر دیوان سنگھ کو دے آئیے۔ وہ دس ہزار کا چیک لے کر میں ان کے پاس گیا انہوں نے کہا چلیے ابھی کیش کرا لیں چیک کیش ہو گئی تو وہ اس پر اصرار کرنے لگے کہ آدھی رقم آپ لے لیں۔ اور جب میں نے انکار کیا تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ وہ بدترین دشمن بھی ہیں اس کا بھی واقعہ سن لیجیے میں پاکستان سے دہلی گیا اور ان کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک صبح کو جب باہر جانے لگا تو انہوں نے پوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا ساغر سے ملنے کے لیے۔

ساغر کا نام سنتے ہی وہ اچھل پڑے دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگے آپ کو ایک ایسے منافق کے پاس جانے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ جس کو آپ نے پنڈت جی سے کہہ کر ریڈیو میں نوکر رکھوایا تھا اور اس کا بدلہ اس نے یہ دیا ہے کہ جب سے آپ پاکستان چلے گئے ہیں وہ آپ کے خلاف زہرا لگتا پھر رہا ہے۔ میں نے کہا سردار صاحب میں نے ساغر کو نہیں رکھایا ساغر نے خود پنڈت جی سے اپنی ملازمت کا وعدہ لے لیا تھا۔ انہوں نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن جب کیسلر نے پنڈت کو دھوکہ دے کر اس کا پتا کاٹ دینا چاہا تھا۔ اس وقت تو وہ آپ ہی تھے جس نے کیسلر کے فریب کا پردہ چاک کر کے اس کو نوکری دلوائی تھی میں نے کہا سردار صاحب ساغر برا آدمی نہیں ہے۔ اگر اس نے میری پاکستان جانے کے بعد میرے خلاف آواز بلند کی تھی تو اس کا

مقصد یہ تھا کہ وہ بے چارہ حکومت ہند پر اپنی وفاداری کا سکہ جمارہا تھا اور یہ کوئی ایسی  
بری بات نہیں کہ میں اتنے پرانے دوست سے قطع تعلق کر لوں یہ سن کر دیوان سنگھ نے  
مارے غصے کے کانپتے ہوئے کہا آپ آدمی نہیں دیوتا ہیں لفظ دیوتا کو اس قدر دانت  
پیس کر ادا کیا تھا کہ گویا وہ کوئی موٹی سی گالی دے رہے ہیں۔ اور جب میں خاموش ہو  
گیا تو انہوں نے کہا جوش صاحب میں تو جب تک دشمن کا خون چوس نہ لوں مجھ کو چین  
نہیں آتا میرے نزدیک دشمن کا مار ڈالنا ہی سب سے بڑا دھرم ہے۔

ہزار حیف ہندوستان کی ناقدر شناسی پر کہ وہ اب اپنا رسالہ بند کر کے دہرہ دودن  
چلے گئے ہیں۔ اور دوسور پلی پنشن پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔  
جب ان کی اداسی پر نگاہ دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں ہائے دیوان سنگھ کا سا  
بے نظیر انسان اور اس قدر پریشان۔ وائے برکووئی ہندوستان!



## مولانا عبدالسلام

وہ مشرقی علوم کے حرف آخر انسان اور شہنشاہ تھے قرآن حدیث منطق، حکمت، تصوف، عروض، معنی و بیان، علم الکلام، تاریخ تفسیر لغت لسانی قواعد، ادب اور شاعری کے امام تھے۔ جید عالم ہونے کے باوجود علما نے سوء کے تشابہ سے بچنے کے لیے انہوں نے داڑھی مونچھ کا صفایا کر دیا تھا۔ وہ تصوف و حسن پرستی کے متوالے تھے۔ اور اپنے عہد شباب میں تمام اولیائے ہند کے مزارات کے چکر لگاتے اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

لیکن زندگی کے آخری ایام میں وہ اس قدر سختی کے ساتھ خلوت پسند اور خود نشین ہو گئے تھے کہ تقریباً بائیس برس کی مدت میں وہ اپنے دلی کے ترکمان دروازے کی پتلی سی گلی کے بالا خانے سے کبھی ایک بار بھی نیچے نہیں اترے تھے۔

میں اکثر ان کی خدمت میں جاتا اور گھنٹوں ان سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ وہ اس قدر کم آمیز ہو چکے تھے کہ انہوں نے مجھ سے حکم دے رکھا تھا کہ جوش میاں جب تک کوئی شخص حسین یا علم نہ ہو اس کو میرے پاس ہرگز نہ لانا۔ ایک روز میں ساغر کو ان کے پاس لے گیا وہ خوش ہو کر کہنے لگے کہ اچھی چیز لائے ہو۔ باؤں باؤں میں جبر و قدر کا مسئلہ چھڑ گیا۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ ساغر بھی اس مسئلے پر لب کشائی کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا صاحب زادے آپ خاموش رہیں اچھی صورت کے یہ معنی تو نہیں کہ آدمی خوب رو ہو کر ایسے دقیق مسائل سے بھی آگاہ ہو جائے آپ پر تو وہی ضرب المثل صادق آتی ہے کہ موت کی دھار نہ سونجھے میرا ہریالا بنا۔

دہلی کی ٹکسالی اردو بولنے والوں میں سے اب صرف وہی باقی رہ گئے تھے۔ وہ جب باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اور جی چاہتا تھا کہ وہ پہروں یونہی بولتے رہیں۔ اور جب اپنی باتوں میں وہ فحش کی آمیزش کر دیتے تو خدا کی قسم مزا آ جاتا تھا۔

ایک روز ایک مولانا صاحب کی کج بخشی سے تنگ آ کر انہوں نے کس مزے کیساتھ یہ کہا تھا مولانا حضرت حق نے مجھ کو وہ طاقت بخشی ہے کہ اگر میں آپ کے حلقہ زیریں پر اپنا عمود لکھی وارد کروں تو خون کے فوارے جاری ہو جائیں۔

میں ایک روز ان کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ زینے کے دروازے پر دیکھا ایک دڑھیل کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جیسے ہی ان پر مولوی عبدالسلام کی نگاہ پڑی انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اور اپنا اٹھا ہاتھ ہلا کر کہا آپ کی ریش مبارک ناقابل برداشت ہے جلدی گاڑی بڑھائیے اور وہ اپنا سامنہ لے کر اتر گئے۔ میں نے کہا مولانا آپ کا یہ عمل اخلاق رسول کے خلاف تھا۔ انہوں نے فوراً جواب دیا لیکن اس قول خدا کے مطابق تھا کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ریل میں اتمیر شریف جا رہا تھا میرے ساتھ میری بے پوری محبوبہ اور اس کی ماں بھی تھی کہ کسی سٹیشن پر گاڑی رکی تو میرے ایک صوفی دوست بھی میرے حجرے میں آ گئے اور میری محبوبہ کو دیکھ کر انہوں نے جل جلالہ کا نعرہ بلند کر دیا اور میں نے میری محبوبہ کی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جناب ام نوالہ بھی تو ارشاد فرمائیے وہ جھینپ کر رہ گئے۔

ان کی آمدنی صرف تیس روپے ماہانہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس قدر خود دار و قانع تھے کہ

---

یعنی بوڑھے تو اس قدر ہیں کہ پیشاب کرتے وقت ضعف بصارت کی بنا پر خود اپنے پیشاب کی دھارتک نظر نہیں آتی۔ پھر بھی دولہا بننے کے تمنائی ہیں۔ دولہا جب دلہن کے گھر میں قدم رکھتا ہے تو ڈونیاں گانے لگتی ہیں میرا ہریالا بنا کھے معنی ہیں ہرا بھرا روتا زہ اور بنا دولہا کو کہتے ہیں۔

---



ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک وردی پوش نوجوان نے آکر کہا نیچے ہزہائی نس..... کھڑے ہوئے ہیں آپ اجازت دیں تو حاضر کروں۔ انہوں نے کہا اگر وہ میرے سامنے آکر یہ کہہ دیں کہ میرے اج سے عبدالسلام کی جوتی اونچی ہے تو شوق سے آئیں ورنہ گاڑی بڑھا دیں۔ ہزہائیس کی عقیدت دیکھیے کہ وہ اوپر آئے انہوں نے وہ الفاظ بڑے خلوص سے ادا کیے اور روزانوہو کر بیٹھ گئے۔

ایک بار خواجہ حسن نظامی نے ان کے پاس آکر کہا مولانا آزاد آپ کے دیدار کے مشتاق ہیں زحمت نہ ہو تو کل میرے ساتھ ان کے وہاں تشریف لے چلیے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے بگڑ کر کہا خوجہی صاحب اگر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا یہ بات کہتا تو میں فوراً اس کو موٹی سی گالی دیتا جائیے اور ابوالکلام سے کہہ دیجیے کہ وہ یہاں نومن تیل لے کر آئیں اور میرا..... دو گھنٹے تک مسلسل سہلائیں اور اس کے بعد مجھے اپنے وہاں بلائیں یہ سکر خواجہ صاحب کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ صرف دو منٹ بیٹھے اور چلے گئے۔

ایک دن ان کے پاس پہنچا تو میریدوست نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیمات حیدرآباد دکن ان کے کوٹھے سے اترتے ملے۔ صاحب سلامت اور معافتے کے بعد میں نے پوچھا خدا نخواستہ کیا مزاج سازگار ہے۔ انہوں نے کہا آپ میرے پاس آئیں گے تو بتاؤں گا مجھے افسوس ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے مجھ کو مولوی عبدالسلام کے پاس بھیج کر ذلیل کرایا۔ میں اوپر گیا تو دیکھا کہ مولوی عبدالسلام غصے بے بھرے بیٹھے ہیں میں نے کہا مولانا کیا بات ہے انہوں نے کہا ابھی حیدرآباد دکن کے ایک وزیر صاحب جن کا خطاب ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر میرے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ میں ان کو مسئلہ وحدۃ الوجود سمجھا دوں میں نے ان سے کہا کہ دنیا کے تمام علوم میں جو علم آپ کو سب سے زیادہ مستحضر ہو اس کا نام بتائے میں اس علم کے مستحطلات میں آپ کو یہ مسئلہ سمجھا دوں گا۔ انہوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا علم معنی و بیان۔ سو جوش میاں اللہ آپ کا بھلا کرے میں نے علم معنی و بیان ہی کے

مصطلحات میں وہ مسئلہ حضرت حق کے فضل و کرم سے ان کو سمجھا دیا۔

وہ اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے جھک کر میرے ہاتھ چوم لیے اور کہنے لگے آپ میرے ساتھ حیدرآباد شریف لے چلیں۔ میں نے کہا اب تو کوٹھے سے نیچے بھی نہیں اترتا ہوں اتنا بڑا سفر کیسے طے کروں گا..... اس پر انہوں نے جب مجھ سے کہا کہ مولانا کو میں وہاں لے جا کر آپ کو حضور نظام دکن سے ملاؤں گا، وہ آپ کا اس قدر وظیفہ مقرر کر دیں گے کہ یہ کمرہ چھوڑ کر آپ دہلی میں ایک کوٹھی تعمیر فرما کے اس میں رہنے لگیں گے۔

تو میرا جوش میرا ناریل (سر) چٹخ گیا۔ میں نے کہا آپ کے نزدیک کیا یہ بات ممکن ہے کہ میں اس جاہل نظام کے سامنے اپنی وجاہت علمی کی کمر میں ذلت کی پیٹی باندھ کر جاؤں اس مسخرے کو خداوند نعمت اور اپنے کو فدوی کہوں۔ نواب مہدی یار آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ میرے موئے زیریں بمراحل بہتر ہیں۔ نظام کی مونچھوں کے بالوں سے۔ اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ میرے موئے زیریں کی پرورش میں خون علم صرف ہوتا ہے اور نظام کی مونچھوں کے بالوں کو خون جہل بڑھاتا ہے جائے گاڑی بڑھائے۔

غلام نرگس مست تو تاج دار آنند



## مولانا عبداللہ عمادی

قد بونا ساء، دماغ باؤن گزکا، چہرہ کتابی، داڑھی گھنی، عربی و فارسی کے ہفت قلم دار  
الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ناظر امور مذہبی، فحش پسند و غیر متقی، بردباری کے ساتھ  
ظریف، منہ پر، لوگوں کے علم کی تعریف کرنے میں بلند آہنگ، ان کے پیٹ پیچھے ان  
کے جہل کا اعلان کرنے میں بیباک، مزاح کے موقع پر، بے ساختہ قہقہے مارنے پر  
مجبور، عقل معاش سے بہرہ مند، نظام دکن کے تصور سے بھی لرزاں و ترساں، اور عمل پر  
اکسانے والے شاعر، ایک بار مودودی اور میں نے سازش کی کہ انہیں طوائف کے  
کوٹھے پر لے جایا جائے ہم نے جھٹ سے ایک جھوٹا دعوت نامہ لکھا جس میں  
(مولانا) عبدالقدیر بدایونی نے ان کو دن کے دو بجے گیارہویں شریف میں شریک  
ہونے کے لئے بلایا تھا وہ ہمارے چکے میں آگئے ہم ان کو موٹر میں بٹھا کر ”محبوب کی  
مہندی“ لے گئے جو طوائفوں کا محلہ تھا۔

ابھی موٹر سے اتر کر، ہم طوائف کے کوٹھے کی طرف چند قدم چلے ہی تھے کہ مولانا  
عمادی کے ایک دربار رس دشمن، کامل صاحب نے موٹر سے گزرتے ہوئے ہم کو دیکھ لیا  
کامل صاحب نے موٹر سے سر نکال کر مولانا عمادی کو بڑے غور سے دیکھا اور بڑے  
معنی خیز انداز سے اپنے سر کو بار بار جنبش دیتے ہوئے گزر گئے۔

مولانا عمادی اپنے دشمن کی نگاہ، اور اس کے سر کی معنی خیز جنبش پیہم کو دیکھ کر سمجھ گئے  
کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے اور مجھے یہ لوگ کسی غیر مستحسن جگہ لئے جا رہے ہیں۔  
انہوں نے مجھے اور مودودی کو بڑے غور سے دیکھا ہم لوگ بے حد سنجیدہ بنے رہے  
انہوں نے پوچھا یہ آپ لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں، مودودی نے کہا ارے آپ  
اس قدر جلد بھول گئے ہم لوگوں کو مولانا عبدالقدیر صاحب نے گیارہویں شریف کی  
شرکت کے لئے مدعو فرمایا ہے۔ اب ہم لوگ میٹھیوں پر چڑھنے لگے آگے آگے وہ ان  
کے پیچھے میں اور میرے پیچھے مودودی اور مودودی کے پیچھے جہاں تک مجھے یاد پڑتا

ہے ان کے چھوٹے بھائی سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے۔

یہ سوچ کر مولانا عمادی، دن دھاڑے، رنڈی کے کوٹھے پر چڑھ رہے ہیں مجھے بڑے زور کی ہنسی آگئی عمادی صاحب نے گھبرا کر پوچھا یہ آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں میں نے کہا مودودی نے گدگدایا ہے۔ اتنے میں ایک بڑھیا کوٹھے سے اترتی نظر آئی عمادی صاحب سنک تو چکے ہی تھے انہوں نے پوچھا مائی یہ کس کا مکان ہے۔ اس بڑھانے کہا پتريا (طوائف) کا ”پتريا“ سنتے ہی مولانا اچھل پڑے ان کی داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے انہوں نے ہمیں بڑی قہر کی نگاہ سے دیکھا وہ اپنے بڑے بڑے پانچے ہلاتے اور ہم لوگوں کو دھکا دیتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ موٹر میں بیٹھے نہیں بلکہ گر پڑے اور گر کر ہانپنے لگے اور جب موٹر کے قریب آ کر ہم نے قہقہے مارے تو وہ زخمی شیر کے مانند پھر کر کہنے لگے آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو دشمنی کی ہے میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا آپ کو معلوم ہے کہ میرے پاس جو علم ہے، اس کی ہندوستان بھر میں کہیں قدر نہیں اس لئے میں نے دکن میں آ کر پناہ لی ہے اگر کامل نے سرکار تک یہ خبر پہنچا دی تو میں یہاں سے نکال دیا جاؤں گا ہندوستان کی کسی مسجد کے حجرے میں مجھ کو جگہ دی جائے گی، اور جمعرات جمعرات گوشت اور وہ بھی گائے کا گوشت ملے گا یہ بھی کوئی مذاق ہے کہ کسی کے پیٹ پر لات مار دی جائے ہم نے کہا۔

مولانا آپ مزاح المومنین پر اس قدر بگڑ رہے ہیں انہوں نے کہا آپ مزاح الکافرین کو مزاح المومنین کا خطاب دے رہے ہیں اس واقعہ کے بعد انہوں نے ہم سے ملنا ترک کر دیا اور ہماری دفتری زندگی بے حد بے لطف ہو کر رہ گئی۔

جب ان کے غصے اور ترک تعلق پر کچھ اوپر ایک مہینہ گزر گیا تو مودودی نے مجھ سے کہا پہلے آپ مولانا کے پاس جائیں اور منانے کی سعی کریں وہ نرم ہو جائیں تو مجھے بھی بلا لیجئے گا۔

میں جی کڑا کر کے ان کے کمرے میں داخل ہوا اور دیکھا کہ وہ اپنے کمرے سے



اتر کر ایک نشیبی حلقے کی نالی پر بیٹھے پیشاب کر رہے ہیں میرے ذہن میں فوراً ایک تیر بہدف تدبیر آگئی میں جوتا اتار کر دو بے پاؤں ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر ان کو پیشاب کرتے دیکھنے لگا میرا سایہ پڑے ہی انہوں نے گھبراہٹ سے مڑ کر دیکھا فوراً کمر بند باندھ کر، کھڑے ہو گئے مجھ سے بگڑ کر کہا یہ کیا حرکت تھی آپ ستر بنی کا بھی ذوق رکھتے ہیں میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا مولانا گستاخی تو ضرور ہوئی مگر اللہ اکبر یہ تماشا تو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا انہوں نے منہ جھٹک کر کہا تماشا کیا؟ میں نے کہا مولانا قصور معاف آپ کا پیشاب کرنے والا عضو آپ کے روئے مبارک سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے گویا دو چار مہینے کے مسلسل بخار کے بعد آپ کا منہ بالکل سست ہو کر نیچے لٹک پڑا ہے۔ یہ سنتے ہی ہنسی کے مارے ان کے دونوں شانے ہلنے لگے اور ان کا سینہ اچھلنے لگا اور مجھے کہا بڑا نا در خیال سوچا ہے آپ کو اگر اس مضمون بکر کو آپ انظم کر دیں تو میں آپ کے تمام ذنوب معاف کر دوں گا۔

دوسرے ہی دن، اسی مضمون کا ایک دس بارہ بند کا مسدس کہہ کر میں ان کے گھر پہنچا، دیکھا کہ وہ لیٹے ہوئے ہیں انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کسی قدر بخار ہے معاف کیجئے گا اٹھ نہیں سکتا میں نے کہا آپ آرام فرمائیں میں ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا میں نے امتثال امر میں ایک مسدس کہا ہے ”تشابہ تام“ کے نام سے انہوں نے کہا فوراً سنائے اور دوسرے ہی بند پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور جھوم جھوم کر داد دینے لگے اور داد دینے میں اس قدر بار بار ہنسنے کہ پسینہ آ گیا، کہنے لگے لیجئے بخار اتر گیا اللہ آپ کو جزائے خیر دے وہ مسدس اس قدر مردانہ، یعنی فحش ہے، جسے میری دیہاتی کنیاؤں کی سی شرمیلی قوم برداشت نہیں کر سکتی صرف اس کا ایک بند اور ایک بیت بڑی حد تک معتدل ہے وہ سن لیجئے:

مشکل ہے، فرق اسفل و اعلیٰ، خدا کی شان  
کھسار کا ہے، کاہ میں جلو، خدا کی شان

پہاں میں، تاب چہرہ پیدا، خدا کی شان  
 صورت ہے جیسی، ویسا ہی۔۔۔ خدا کی شان  
 دنیائے فتنہ ساز کے، کروت دیکھئے  
 لٹکا ہوا ہے، چاہ میں، ہاروت دیکھئے  
 اور بیت ملاحظہ ہو:

میانی میں علم و فن کی گرہ کھولتا ہوا  
 پہنے ہوئے عبا، عربی بولتا ہوا!  
 میں ان کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ وہ مزاح کے مواقع پر، بے ساختہ قہقہے مارنے لگتے  
 اور نظام دکن سے لرزاں وتر ساں رہتے تھے اس کا بھی ایک واقعہ سننے کے قابل ہے۔  
 ایک روز نظام کے وہاں ڈنر تھا ابھی نظام برآمد نہیں ہوئے اور مولانا مجھ سے باتیں کر  
 رہے تھے کہ ایک بہت بڑے اور بوڑھے جاگیر دار آئے جن کی گردن میں رعشہ اور چہرے  
 پر سفید گل مجھے تھے، مولانا نے بڑے ادب کے ساتھ لپک کر ان سے مصافحہ کیا وہ مصافحہ کر  
 کے، دو قدم پیچھے ہٹے تو میں نے ان کے کان میں کہا آپ دیکھ رہے ہیں جاگیر دار صاحب  
 کو یہ تو بالے میاں کی چھڑ اور ”پیسے میں“ آپ ہی آپ ہیں یہ سنتے ہی وہ ہنسی کے مارے  
 بے قابو ہو گئے پھیں پھیں کرتے کھبے کے پیچھے چلے گئے، اور پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے اور یہ  
 خیال کر کے کہ میں کہیں نظام کے سامنے ان کو ہنسا دوں، وہ کھبے کے پیچھے سے غائب ہو کر  
 مہمانوں کے غول میں مل گئے اور میں ہاتھ مل کر رہ گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

اتنے میں نظام برآمد ہو گئے دربار جم گیا اور قوالوں نے برتو ایں مسند شاہانہ مبارک  
 باشد گانا شروع کر دیا قوالی ختم ہوئی تو نذریں پیش کر نیوالے تمام غلامان زریں کمر،  
 آقائے میں کرو گار کی جناب میں نذر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کو قطار

1 لکھنویں لکچے تار پر قائم کر کے، ایک روٹی کے گالے کا گڈا بنایا جاتا تھا، جس  
 کا سر برابر ہلتا رہتا تھا اور بنانے والا، پیسے میں آپ ہی آپ، یعنی خود کار خود متحرک کی

صدالگا لگا کر اسے ایک پیسے میں بیچا کرتا تھا۔

باندھ کر صف بستہ ہو گئے اور

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ تو سن ڈالے  
صید جب خود ہی چلے آتے ہیں گردن ڈالے  
کاتما شاہو نے لگا میں عمادی صاحب کے شکار کے لئے ایک گوشے میں، دیک کر  
کھڑا ہو گیا اور نذروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب آدھی سے زیادہ نذریں پیش ہو چکیں، میں نے دیکھا کہ مولانا، چاروں  
طرف نظریں دوڑاتے چلے آ رہے ہیں میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا، اور مولانا، یہ  
خیال کر کے کہ میں غالباً آگے کی صف میں ہونگا۔ ایک صاحب کے پیچھے جا کر کھڑے  
ہو گئے اور میں دبے پاؤں جا کر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور جب انہوں نے یہ دیکھا  
کہ اب میری نذر کی باری آ رہی ہے انہوں نے ایک اثر فی اور چار روپے جیب سے  
نکال کر رومال میں لپیٹ لئے اور اپنی پشت پر ہاتھ باندھ لئے میں نے ان کا رومال  
اچک لیا انہوں نے اچھل کر مجھے دیکھا بڑی بے کسی سے کہنے لگے برائے خدا اس  
وقت مزاح نہ فرمائیے ورنہ مجھ کو ہنسی آ جائے گی، اور بھرے دربار سے نکال دیا جاؤں گا  
اتنے میں ان کی باری آ گئی میں نے ان کا رومال ان کو دے دیا لیکن وہ میرے اس  
مذاق سے اس قدر بوکھلا چکے تھے کہ نظام کی خدمت میں نذر گزارنے کے بدلے، وہ  
شہزادیوں کے سامنے جا کر جھک گئے اور نظام نے گرج کر کہا ارے ادھر آؤ مولانا  
قاموس اللغات، اتنے بڑے بڑے ہنڈاں (ہانڈے) جل رہے ہیں اور تمہاری نظر  
مجھ پر نہیں پڑ رہی ہے مولانا جھپٹ کر نظام کے روبرو چلے گئے اور نذر پیش کر دی اٹھے  
قدموں پلٹے اور ستون سے ٹکرا کر گر پڑے نظام نے قہقہہ مارا اور میں نے ستون کی آڑ  
سے کہا آداب عرض ہے مولانا۔

☆☆☆

## فراق گورکھپوری

مجموعہ اضداد، آمیزہ بلور، و فولاد۔۔۔ گاہ، نسیم بوستاں، گاہ، صرصر بیاباں گاہے،  
خضر درگاہ گاہے گم کردہ راہ گاہ شب نم برگ تاک گاہ شعلہ جوالہ دبے باک گاہ، یزداں،  
باغوش، گاہ، اہرمن بردوش۔

رند قدح خوار، گوہر شاہ دار، آسمان خوش لہجگی کے بدر، انجمن آگہی کے صدر۔  
اولیائے ذہانت کے قافلہ سالار، اقلیم ژرف نگاہی کے تاج دار، جودت پناہ، نقاد  
نگاہ، مہبط جبریل، شاعر بزرگ و جلیل۔

اپنے فراق کو میں قرونوں سے جانتا، اور ان کی اخلاقی کالوہا مانتا ہوں مسائل علم و  
ادب پر جب وہ زبان کھولتے ہیں تو لفظ و معنی کے لاکھوں موتی رولتے ہیں اور اس  
افراط سے کہ سامعین کو اپنی کم سواد کی احساس ہونے لگتا ہے۔

وہ بلا کے حسن پرست اور قیامت کے شاہد باز ہیں۔ اور یہ وہ ذکاوت مخصوص ہے،  
جو دنیا کے تمام عظیم فن کاروں میں پائی جاتی ہے کج نہاد صالحین پر آوازے کستے ہیں،  
اور وہ ان بے توفیقوں کے کھوکھلے پن پر دل ہی دل میں ہنستے ہیں لیکن ان کی راتوں  
سے ہوشیار، پینے سے پیش تر وہ یا غم گسار ہوتے ہیں اور پینے کے بعد دشمن خوں خوار  
بن جایا کرتے ہیں اور نہایت استعجاب آمیز قلقل کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا اپنی  
رفیقہ حیات سے جو برتاؤ ہے وہ سینہ انسانیت کا ایک ہولناک گھاؤ ہے اور ان کے  
شدائد سے تنگ آ کر ان کا بیٹا خود کشی کر چکا ہے۔

وہ ایک دہری شخصیت کے انسان ہیں کبھی مسیح دوراں ہیں اور کبھی موسیٰ عمراں کبھی  
مہکتے گلزار کبھی اپنی تلوار، دہلی کے دوران قیام میں، ایک بار وہ مجھ سے بھی بہت ہی  
بری طرح الجھ پڑے تھے اس وقت اگر میں اپنی ٹھنولی کا گلانہ گھونٹ دیتا، تو بڑا خون  
خراہ ہو جاتا اس وقت کی صبح کو میں نے ان پر ایک نظم کہی تھی جس کا صرف ایک شعر یاد  
ہے۔



نہ عطا کر، مگر مجھے معبود  
بھول کر بھی شب وصال فراق

پی کر لڑنا اور محفل کو درہم برہم کر دینا اب ان کی گزک بن چکا ہے اس لئے ان کو برا  
نہ کہتے ان پر ترس کھائے اور ان کی راتوں سے دامن بچائے۔

ایک بار کشمیر کے ہاؤس بوٹ میں وہ اور ساغر میرے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے فضا  
نہایت خوشگوار اور جھیل کی موجیں نغمہ بارتھیں دور چلنے لگا اور دو جام خالی کر کے انہوں  
نے ساغر کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا یہ سامنے کون بیٹھا ہوا ہے میرا ماتھا ٹھنک  
گیا میں نے کہا دیکھو فراق، ہم کو اپنی گزک نہ بنانا وہ چپ ہو گئے لیکن چہرے کے بے  
پناہ کرب سے پتا چلنے لگا کہ رنگ پر آنے کے واسطے ان کا نشہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور  
اب ان سے رہا نہیں گیا انہوں نے کہا جوش تم خواہ بتاؤ یا نہ بتاؤ، میں دیکھ رہا ہوں کہ  
میرے سامنے ساغر بیٹھا ہوا ہے، میں نے کہا پھر تم سے کیا غرض انہوں نے اپنی گول  
گول آنکھوں کو گردش دے کر کہا اس لونڈے سغرو (ساغر کی تصغیر) کو بھی، خدا کی  
شان یہ دعویٰ ہے کہ میں شاعر ہوں حالانکہ خدا کی قسم میرا بٹلر اس سے کہیں اچھے شعر کہتا  
ہے اب کیا تھا ان کی آرزو پوری ہو گئی، ساغر یہ سنتے ہی جامے سے باہر ہو گئے اور  
دونوں میں گتھم گتھا ہو گئی۔

ایک بار علی سردار جعفری کسی مشاعرے میں شریک ہونے الہ آباد گئے اور ان کے  
وہاں قیام کیا، انہوں نے جی کھول کر ان کی تواضع کی، اور خوب کھلایا پلایا اور جب موٹر  
میں بیٹھ کر دونوں مشاعرے کی طرف روانہ ہوئے تو مشاعرے کے پھانک پر کھڑے  
ہو کر فراق کا جی چاہا تھوڑی سی گزک کر لیں، یہ خیال آتے ہی بانی مشاعرہ سے انہوں  
نے کہا سن لیجئے جناب، یا تو فراق مشاعرے میں شرکت کرے گا، یا علی سردار ڈالہ بانی  
مشاعرے نے لاکھ لاکھ سمجھایا، اور علی سردار نے کہا فراق صاحب میں تو آپ کا مہمان  
ہوں لیکن وہ نہیں مانے پھانک پر یہ تماشا نیوں کے ٹھٹ لگ گئے اور وہ علی سردار کو برا

بھلا کہتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے اور صبح کے ۳ وقت اسی رات کے سرد روا کی گردن میں بانہیں ڈال کر مسکرانے لگے۔

لیکن اب کی جب میں دہلی گیا تو ان کے مزاج کا تغیر دیکھ کر دنگ ہو گیا وہ دہلی میں کسی مشاعرے کی شرکت کے لئے آئے اور اپنے شاگرد گرگ کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے، میں پہنچا تو، دوڑ کر انہوں نے گلے لگالیا اور ہر چند رات کے بارہ ایک بجے تک وہ میرے ساتھ پیتے رہے لیکن آخر تک وہ قطعی بگڑے نہیں بلکہ لڑائی کا گوشہ نکالنے کے عوض انہوں نے اتنے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ان میں سے ایک لطیفہ آپ بھی سن لیجئے۔

انہوں نے کہا پرسوں ہم سب کو ہمارے ایک ماہر آثار قدیم دوست نے بہت تڑکے اپنے گھر بلایا اور کہا کہ وہ دہلی کی ایک تاریخی اینٹ سے ہمیں آگاہ کر دیں گے چونکہ یہ جاڑے کا موسم ہے ہم نے خیال کیا کہ انہوں نے صبح کے وقت بلایا ہے اس لئے ناشتے کا انتظام انہیں کے گھر پر ہو گا چنانچہ ہم لوگ تین موٹروں میں بیٹھ کر ان کے وہاں پہنچ گئے اور جب یہ دیکھا کہ وہاں ناشتے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور وہ قطب جانے کی جلدی کر رہے ہیں تو ہم سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ وہاں جا کر ناشتہ کرائیں گے لیکن جب وہاں بھی ناشتہ کا کوئی بندوبست نہیں دیکھا تو ہم پریشان ہو گئے اور وہ ہم کو ایک جگہ سے دوسری، اور دوسری سے تیسری جگہ لئے پھرتے رہے یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزرنے لگا اور بھوک سے ہم سب کا برا حال ہو گیا اس وقت مجھ کو شرارت سو جھمی اشارے سے میزبان کو ایک گوشے میں لے جا کر میں نے کہا جناب والا

1 سردار کی تحقیر و تصغیر

اب تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ میرے ساتھ۔۔۔۔۔ کر دیں ماہر آثار دوست نے بڑی حیرت سے مجھ کو دیکھا اور کہا فراق صاحب آپ اس قدر سنجیدہ

آدمی ہو کر مجھ سے ایسی فحش بات کی فرمائش کر رہے ہیں، میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا جناب بھوک اس قدر لگی ہے کہ میں سوچنے لگا ہوں کہ آخر کار کچھ تو پیٹ میں جائے۔

میں نے قہقہہ مار کر کہا ارے مر جائے اس ”کچھ تو پیٹ میں جائے“ کی بلاغت کا کوئی ٹھکانہ نہیں، اور تمام لوگ پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔

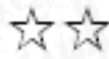
لگے ہاتھوں ایک واقعہ اور بھی سن لیجئے ہم لوگ احمد آباد بمبئی کے کسی مشاعرے کی شرکت کے واسطے گئے اور ایک بالا خانے کے بڑے وسیع و تاب ناک ہال میں فرش پر بیٹھے شغل کر رہے تھے کہ ایک اجنبی نوجوان نے آ کر کہا کہ میں حضرت فراق گورکھ پوری سے ملنے آیا ہوں وصل نے کہا یہ ہیں فراق صاحب اس نوجوان نے لپک کر ان کے ہاتھ چوم لئے اور دوزانو ہو کر بڑے ادب سے بیٹھ گیا فراق نے کہا آپ کا نام؟ اس نے اپنا نام بتانے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا میں آپ کو کل کا ایک واقعہ سنانے آیا ہوں اجازت ہو تو عرض کروں فراق نے کہا ضرور کہئے آپ تو بڑے نستعلیق نوجوان معلوم ہوتے ہیں اس نوجوان نے کہا پرسوں میں بازار سے گزر رہا تھا دیکھا کہ برات کا ایک بہت بڑا جلوس چورہاے پر رکا ہوا دم بخو دکھڑا ہے میں نے پوچھا یہ ماجرا کیا ہے ایک صاحب نے بتایا کہ دولہا جس ہاتھی پر سوار ہے وہ ہاتھی زمین پکڑ کر، کھڑا ہو گیا ہے لاکھ لاکھ آنکس مارے جا رہے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا ہے اور چونکہ دولہا کی سواری کا راستے میں رک جانا فال بد خیال کیا جاتا ہے اس لئے دولہا کے باپ کے حواس اڑے ہوئے ہیں ابھی وہ آدمی مجھ سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا دوڑا ہوا آیا اور نے دولہا کے باپ سے کہا ہاتھی کو اگر ابھی ابھی چلا دوں تو کیا آپ مجھے پچاس روپے دے دیں گے؟ دولہا کے باپ نے کہا ارے پچاس نہیں سو روپے دوں گا یہ سن کر اس لڑکے نے اچک کر ہاتھی کے کان میں ایک بات ایسی کہی کہ وہ بے ساختہ دم دبا کر بھاگنے لگا فراق نے پوچھا، اس لڑکے نے کیا کہا تھا اس نوجوان نے بڑی متانت سے کہا کہ اس لڑکے نے اس کے کان میں کہا

تھا کہ اے سالے تیرے پیچھے فراق آ کر کھڑے ہو گئے ہیں یہ سنتے ہی ہم سب کے  
خارا شگاف قہقہوں سے ہال کی محراب گونجنے لگی اور وہ نوجوان فوراً بھاگ کھڑا ہوا اور  
فراق کی آنکھوں کے دونوں ڈھیلے پہیوں کے مانند گھومنے لگے۔

آخر میں نہایت افسوس کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان نے ابھی تک فراق  
کی عظمت کو پہچانا نہیں ہے سرکار ہند کو چاہئے کہ وہ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دے اور ان کو  
بہمہ وجوہ مطمئن کر کے اپنے دامن کو مزید پھولوں سے بھر لے اور نمک حرامی کے داغ  
سے اپنی پیشانی کو بچالے۔

جو شخص یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فراق کی عظیم شخصیت، ہندوستان کے ماتھے کا ٹیکا، اردو  
زبان کی آب رو، اور شاعری کی مانگ کا صندل ہے، وہ خدا کی قسم کو ر مادر زاد ہے۔

زندہ باد فراق ----- پائندہ باد فراق





## وحید الدین سلیم

پانی پت کے باشندے، حالی کے ذی علم ہم وطن حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر سید احمد خاں کے سابق سیکرٹری اردو زبان کے مزاج دان و قوام ”وضع اصطلاحات کے مصنف غیر معمولی ادراک و ذہین بے حد بذلہ سنچ نیچریوں کے استاد مبلغ الحاد بڑے جان دار متشاعر، اور کنجوسی میں قارون کے قبلہ والد گرامی لیکن جسم اس قدر بھدا اور صورت ایسی ناقابل برداشت کہ الامان والحفیظ ان کے چہرے کا رنگ اس قدر کٹھا اور لبدھڑ تھا، گویا بہت پرانا، چکٹا ہوا کڑوا تیل جما ہوا ہے اور ان کے رخساروں پر ایسی بے آبرو کردینے والی داڑھی لٹکی ہوئی تھی کہ جب نگاہ اس کی جانب اٹھتی تھی تو ہزاروں گددیکھنے والوں کے پوٹوں پر آکر بیٹھ جاتے اور بیٹ کرنے لگتے تھے اور ان کے وزن سے آنکھیں جھک جاتی تھیں مگر دماغ اس قدر اخاذ و جان دار تھا کہ بڑھاپے میں بھی جب کہ دماغ نئے نئے خیالات قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے وہ ہر بہتر جدید خیال کو باسانی قبول کر لیتے تھے اور گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کی طرح ان کا دماغ ہمیشہ چلتا اور کھٹ کھٹ کرتا رہتا تھا۔“

ہر چند اس پرانے زمانے میں ان کی تنخواہ ایک ہزار تھی جو آج کے دس ہزار کے برابر ہے لیکن انہوں نے کبھی باورچی یا خدمت گار نہیں رکھا وہ دوستوں سے تقاضے کر کے اپنی دعوتیں کرایا کرتے تھے اور جس روز دعوت نہیں ہوتی تھی کسی گھٹیا سے ہوٹل میں جا کر دو آنے میں شکم سیر ہو کر آجایا کرتے تھے ان کو پان کا بے حد شوق تھا مگر دوستوں کے سامنے جب پان دان کھولتے تھے تو کتھے چونے کی مکھیوں میں انگلیاں ڈال ڈال کر چاٹنے لگتے تھے تا کہ گھن کھا کر کوئی ان سے پان نہ طلب کر لے۔

وہ گھر میں بڑے پانچوں کا ڈھیلا ڈھالا پانجامہ پہنتے تھے تا کہ اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے میں مسک نہ سکے اور آدھے دھڑ سے ننگے رہتے تھے ایک روز انہوں نے پانی سے بھرا ایک بڑا سا مٹکا اٹھایا جس سے اس کی توند دب گئی اور پائے جامہ گھٹنوں پر آگیا ان کو

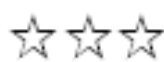
بالکل ننگا دیکھ کر میں نے آنکھیں جھکا لیں اور انہوں نے قہقہہ مار کر کہا ارے جی بھر کے مجھے ننگا دیکھ لو ایسے مواقع روز روز نہیں آیا کرتے۔

ایک دن صبح چار بجے ایک نعت کا میرے دماغ پر نزول ہوا اور اس قوت کے ساتھ کہ مسلسل تین روز تک وہ مجھ پر نازل ہوتی رہی اور میں کمرے میں بند اور شراب سے مجب ہو کر اسے ٹائپ رائٹر کے مانند لکھتا رہا چوتھے روز جب وہ مکمل ہو گئی میں سیدھا وحید الدین صاحب کے پاس پہنچا اور بڑے ولولے کے ساتھ انہیں وہ لغت سنانے لگا اور وہ مجھے پانبرنجیر ہنسی کے ساتھ داد دینے لگے مجھ کو چاہئے تھا کہ میں ان کی دبی ہوئی ہنسی میں جھلوتی ہوئی داد کو دیکھ کر مزید اشعار سنانے سے انکار کر دیتا مگر اس وقت مجھ پر نعت خوانی کا اس قدر شدید جذبہ طاری تھا کہ میں اس کو محسوس نہیں کر سکا اور شعر سناتا چلا گیا لیکن جب ایک شعر پر ان کے منہ سے ایک خارا شگاف قہقہہ نکل گیا اور پیک سے ان کا سفید سوٹر لال ہو گیا تو میں اپنی کاپی کو بند کر کے حیرت سے ان کا منہ تکتے لگا اور میری سر اسیمگی کا اندازہ لگا کر جب دوبارہ قہقہہ مارتے مارتے انہوں نے یہ کہا صاحبزادے یہ کیی الوہیت اور کیسی نبوت، کس چکر میں پڑے ہوئے ہو تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور اپنا سامنہ لئے میں وہاں سے اٹھ گیا آج تک یاد ہے مجھ کو وہ پشیمانی۔

زرا زمانے کی یہ ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیے کہ ان بے چارے نے زبردستی کی دعوتوں اور گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں تمام عمر کھانا کھایا زندگی بھر باورچی نہیں رکھا ان کے مکان کا چولہا کبھی گرم نہیں ہوا اور کوڑی کوڑی کر کے جب تیس چالیس ہزار روپے جمع کر لئے تو ان کو موت آ گئی وہ تمام دولت ان کی اکلوتی بیٹی کو ملی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وہ تمام روپیہ ان کا مولوی داماد، نمازیں پڑھ پڑھ کر ہضم کر گیا، اور ڈکار تک نہ لی۔

دکھ جھیلیں بی فاختہ، اور کوئے انڈے کھائیں۔ ملحد ڈھول بنائے اور اسے ملا بجائے

واہ ری دنیا۔



## سید جالب دھلوی

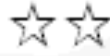
میں اپنے ذہن کو مبالغے سے پاک کر کے بلا خوف ابطال ڈنکے کی چوٹ پر یہ دعوے کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص معلومات عامہ حاصل کرنے کی دھن میں کامل ساٹھ برس تک اس روئے زمین کے تمام عظیم کتب خانوں کو چاٹ کھنگال چکنے کے بعد فقط ساٹھ منٹ کے واسطے ان کی ہم نشینی کی سعادت سے دو چار ہو جاتا تو اس کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ وہ ایسا ایک اونٹ ہے جو پہاڑ کے نیچے آ کر بلبلا نا بھول چکا ہے۔

ایک روز وہ کسی حلوائی کی دکان پر کھڑے ہوئے تھے کہ شوکت تھانوی پہنچ گئے انہوں نے پوچھا سید صاحب کیا خرید رہے ہیں انہوں نے کہا حلوہ سوہن اور وہ یہ کہہ کر وہ گنگٹا نے لگے حلوؤں کے اقسام انہوں نے حلوؤں کے اتنے اقسام بتائے کہ حلوائی دنگ ہو کر ان کا منہت کئے لگا اور لکھنؤ کے بے فکرے ان کے گرد جمع ہو گئے اور جب وہ اقسام گنا چکے تو یہ بتایا کہ حلواہ سوہن کی ایجاد اس مقصد سے ہوئی تھی کہ اس کے جو فوں میں خالص گھی بھر کر امراء کی ضیافت طبع کی جائے اس کے بعد انہوں نے حلوا سوہن کے موجد اور اس کے باپ دادا کے نام بتانا شروع کر دیئے اور جب حلوہ سوہن کی پوری تاریخ بتا چکے تو بچپن سے لے کر آج تک کے تمام حلوہ سوہن بنانے والوں کے نام اور ان کی دکانوں کا محل وقوع بتا دیا حلوائی دکان سے اتر پڑا اور ان کے ہاتھ چومے، اور کہا یہ حلوا سوہن حضور کی نذر ہے میں دام نہیں لوں گا اور گرد و پیش کے لوگ اس طرح داد دینے لگے کہ معلوم ہوا مشاعرہ ہو رہا ہے۔

ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک بلی گزری اب کیا تھا انہوں نے بلی نامہ شروع کر دیا تمام دنیا کی بلیوں کے نام، اقسام اور ان کے مزاج و علاج بتائے دنیا میں سب سے پہلے کس نے بلی پالی تھی اور اس کا نام بتایا، اور بیان کرتے کرتے بات حضرت ابو ہریرہ تک آن پہنچی۔

وہ لکھنؤ کے روزنامہ ”ہم دم“ کے مدیر تھے افیون اور مرد پرستی کے خوگر تھے ایک

روز شام کے وقت وہ افیون گھول رہے تھے، اور ان کی چارپائی کے چاروں پایوں پر چار امر دبٹھے ہوئے تھے کہ حسرت موہانی آگئے انہوں نے پوچھا سید صاحب یہ لونڈی کیسے بیٹھے ہوئے ہیں انہوں نے بڑی متانت سے جواب دیا حسرت صاحب کو مقامی خبروں کے لئے لگا رکھا ہے ”مقامی خبروں“ کی بلاغت، الامان والحفیظ۔





## روشن علی بھیم جی

وہ غالباً 1941ء کا دور تھا جب کہ ہم دونوں نے عرس البلاذ بھیم جی میں ایک دوسرے سے رشتہ محبت و اخوت قائم کیا تھا ہماری وہ دوستی آج تک شاداب اور ہمارے خیالات کی وہ ہم آہنگی جس نے ہم کو متحد کر دیا تھا آج کے دن تک قائم ہے نہ وہ بدلے ہیں نہ میں۔

ہر چند کراچی آ کر وہ ایک سب سے بڑی بیمہ کمپنی کے سب سے زیادہ صاحب اقتدار فرد بن چکے ہیں لیکن اس حادثے کے باوجود ان کے خون میں وہ زہر سرایت نہیں کر سکا ہے جس کو منحوس دولت کی فراوانی پیدا کر دیتی ہے اور جس کے اثر سے انسان کے منہ میں خنزیر کے نیش نکل آیا کرتے ہیں۔

ذرا غور تو فرمائیے کہ بھیم جی دو چار برس سے نہیں انیس برس سے کراچی کی زہریلی ہوا میں سانس لے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی انسان دوستی شرافت اور خوئے دنازی میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی ہے اور ان کی یہ استواری سیرت ایک ایسی چیز ہے جس کو معجزے سے کم کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔ میں اس صورت حال کو اس بناء پر معجزہ کہہ رہا ہوں کہ جناب والا یہ کراچی۔۔۔ سیاست و سرمایہ داری ہوس ناکانہ درندگی و ہیمانہ زر بندگی، اور فریب کوشی و احباب فراموشی کی عفونت انگیز غلاظت میں ڈوبا ہوا ایک ایسا نامراد شہر ہے جس کی ہوا کھا کر، اور جس کا پانی پی کر۔۔۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ برس کے اندر اندر اولیاء لفقے ملائک شیطان اور دیوتا راکشش بن جایا کرتے ہیں۔

غور فرمائیے اس ہو نکتے ہوئے طوفانی دور پر جب میرے چند کلمات حق کو سن کر حکومت پاکستان کے ماتھے پر شکن پڑ گئی تھی اور اس وقت کے صدر ”فیلڈ مارشل ایوب خان بہادر“ کی خسروانہ حرمتی ان کے کفش بردار الطاف گوہر کی غلامانہ دراز دستی اور الطاف گوہر کے پرستار شان الحق کی سفیانہ باطل پرستی مجھے اور میرے تمام خاندان کو در ماندگی کے بھر ذخار میں دھکیل کر بڑی بے حیائی کے ساتھ مونچھوں پر تاؤ دے رہی تھی اگر اس وقت بھیم جی نوح کی کشتی بن کر مجھے اس طوفانی سمندر سے باہر نہ لے آتے تو میرا کیا حشر ہوتا۔

## آغا حسن عابدی

یونائیٹڈ بینک کے صدر میرے آسمان لکھنو کے بدر اور میرے محسن ذی قدر ہیں۔۔۔ جس وقت حکومت کے عتاب نے مجھ کو سمندر میں گرا دیا تھا، آغا صاحب بھی بھیم جی کے دوش بدوش کشتی لے کر آگئے تھے انہوں نے بھیم جی کے ساتھ ساتھ مجھ کو غرق ہونے سے بچایا تھا آغا صاحب نے اپنے بینک کو فروغ دینے کے واسطے ایک جا، رہتے نہیں عاشق ناکام کہیں دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ اندرون و بیرون ملک دوروں پر دورے کیا کرتے ہیں دوروز کراچی میں رہتے ہیں اور انتیس دن باہر اس لئے میں ان سے فقط تین بار مل سکا ہوں۔

ان کو جب میری آنکھوں نے دیکھا نہیں تھا اس وقت ان کے باب میں میرے کانوں نے یہ سنا تھا کہ آغا صاحب ایک بے فیض و بے وفا انسان ہیں اور اس قدر کہ انسان کے آڑے وقت کام آنے کو ایک لایعنی فعل سمجھتے ہیں لیکن جب میں ان سے ملا اور میری نفاذ آنکھیں ان کی طرف اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کے خال و خد، اور ان کی آنکھوں کے رنگ میں ایک ایسا انسان جھلک رہا ہے جو خیر مجسم کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور جب میرے کانوں نے ان کے دھیمے لہجے کو گرفت میں لیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جھٹپٹے کے وقت میٹھے پانی کی نہر بہہ رہی ہے۔۔۔۔۔ لگے ہاتھوں ایک بات اور بھی کہہ دوں، بعض مسائل پر جب میں نے ان سے تبادلہ خیال کیا تو پتا چلا کہ وہ ایک ذی علم و صاحب فکر انسان بھی ہیں اور اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ ہر چند وہ دنیوی اعتبار سے ایک نہایت کامیاب شخص ہیں لیکن قدرت نے ان کو اس اورنگ علم سے محروم کر کے جس کے وہ مستحق تھے ان کو سونے کی سولی پر چڑھا کر ان پر بہت بڑا ظلم کیا ہے اور وہ اس صورت حال کی افسوس ناک مثال ہیں جس کو عربی میں ”ظلم“ اور انگریزی میں مس پلیس منٹ (Mis Placement) کہا جاتا ہے۔

## مصطفیٰ زیدی

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا  
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

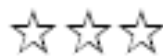
اس ماہ رخسار، نادرہ گفتار، بلند کردار، اخلاص شعار، سعادت مدار اور پرہیزگار،  
نوجوان بچے کے۔۔۔۔۔ پیدائشی، سکونتی اور جاودانی۔۔۔۔۔ تین وطن ہیں الہ آباد  
پاکستان اور میرادل (اللہ اکبر میرادل، فرش پر عرش کا حامل)

یہ ایک انوکھی نوک پلک کا ہونہار شاعر ہے ہرچند قدیم روش کو ترک کر کے یہ جدید  
دھڑے پر آگیا ہے لیکن اس کے کلام میں آئمہ ادب کی سی شان پائی جاتی ہے اس کی  
شاعری، اس قدر بلند تخیل اور اس درجہ نرالی طرز بیان کی حامل ہے کہ بسا اوقات سر  
دھننے اور اس کا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ تمنا پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش  
میں بھی ایسا کہہ سکتا اللہ نظر بد سے بچائے جب وہ لندن چلا گیا تھا میں کہہ رہا تھا۔

سرو سیمینا،                      صحر ا                      می                      روی

سخت                      بے                      مہری                      کہ                      بے                      مامی                      روی

اس بچے کے حالات نا مساعد ہو چکے ہیں یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب اقربا و  
احباب منہ پھیر لیا کرتے ہیں مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ جوش اس کے واسطے جان  
تک دینے کو تیار ہے مصطفیٰ زیدی اپنا دل نہ ٹوٹنے دو۔ تم ایک دولت بیدار ہو تم کو اپنی  
قدر اور حفاظت کرنا ہے۔



محجاز

صد حیف کہ میں یہ لکھنے کو زندہ ہوں کہ مجاز مر گیا۔

یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ مجاز کیا تھا اور کیا ہو سکتا تھا۔۔۔ مرتے وقت تک اس کا فقط ایک ربع دماغ کھانے پایا تھا اور اس کا یہ سارا کلام اس ایک ربع کھلاوٹ کا کرشمہ ہے اگر وہ بڑھا پے کی عمر تک آتا تو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہوتا۔

مگر افسوس کہ پینا، اس کو کھا گیا۔

میں اس جوانان مرگ کو مخاطب کر کے ایک ”پندنامہ“ کہا تھا وہ میری اظہم سن کر رو دیا تھا کہ آپ کو مجھ سے کس قدر محبت ہے مگر اس پر عمل نہیں کر سکا اور عمل کرتا بھی تو کیسے؟

بارہا کہہ چکا ہوں کہ یوں تو دنیا کے ہر کام میں اعتدال برتنا بے حد مشکل ہے لیکن شراب میں اعتدال کا قائم رکھنا تقریباً محال ہے۔

مجاز اعتدال برت نہ سکا اور جوانی ہی میں یہ کہتا گزر گیا۔

ہم مے کدے کی راہ سے ہو کر گزر گئے  
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا  
ایک روز کسی اللہ کے بندے نے اس کو سمجھایا تھا کہ دیکھو جوش صاحب کی طرح  
شراب کی ایک معینہ مقدار کو گھڑی سامنے رکھ کر ایک معین وقت میں پیا کرو تو اس نے  
جواب دیا تھا کہ جوش صاحب تو گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں میرا بس چلے تو میں گھڑا  
سامنے رکھ کر پیا کروں میں اس کو بار بار سمجھایا کرتا کہ تو نے علم سے رشتہ منقطع کر لیا ہے  
یہاں تک کہ اخبار تک نہیں دیکھتا ہے اپنے علم اور مطالعے کو بڑھا، لیکن وہ نہیں مانا۔

یہ بمبئی کا ذکر ہے میں ایک سمندر کے سامنے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا مجاز و ساغر بھی میرے ہم پیالہ تھے آسمان پر شفق تھی زمین پر سمندر اور میز پر شیشہ و ساغر اور ہوا کم بخت ایسی ملائم چل رہی تھی کہ جی چاہتا تھا ناخن لگو جب ہمارا کیف خوب گھ گھ گیا تو مجاز



نے اٹھ کر ساغر کے گلے میں باہیں ڈال دیں ساغر بھی اس سے چٹ گئے مجاز نے کہا میرا ”سفر وا 1“ ارے میرا ”سفر وا“ ساغر بھی اس کا ماتھا چوم کر ”ارے میرا مجز وا، میرا مجز وا“ کہنے لگے ابھی یہ اختلاط ہو ہی رہا تھا کہ مجاز نے ساغر کا چٹ سے بوسہ لے لیا اور منک منک کر کہنے لگا۔

”مگر ایک بات ہے مگر ایک بات ہے مگر ایک بات ہے“ ساغر نے کہا کیا بات ہے مجاز نے کہا مگر یہ بات ہے کہ پیارے تو شاعر بالکل نہیں ہے ہنستے ہوئے ساغر نے رونا شروع کر دیا مجاز پھر ان کے گلے لگ گئے پیارے میں تجھ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں تیرا کوئی جواب نہیں ساغر نے رونا بند کر دیا۔

مجاز نے کہا تجھ سے اس قدر محبت کے بعد بھی خدا کی قسم میں تجھ کو شاعر تسلیم کر ہی نہیں سکتا، مگر ایک بات ہے مگر ایک بات ہے اور ساغر پھر رونے لگے۔

جب میں نے دیکھا کہ بار بار مجاز، ساغر کو گلے لگا لگا کر ”مگر ایک بات ہے“ سے رلا رہا ہے تو میں نے کہا مجاز ختم کر اس تکرار کو بیٹھ جا خاموش صوفے پر اور مجاز جب بیٹھ گیا تو ساغر نے بسور کر مجھ سے کہا یہ مجاز بھی عجیب آدمی ہے مجھ سے محبت بھی کرتا ہے اور میرا دل بھی توڑتا ہے یہ سنتے ہی مجاز پھر کھڑا ہو کر ساغر کی بلائیں لے لے کر کہنے لگا پیارے مجھ کو معاف کرو میں تم سے بیحد محبت کرتا ہوں خدا کے لئے ہنسنے لگو نہیں تو میرا دل پاش پاش ہو جائیگا ساغر ہنسنے اور تھرکنے لگے اور عین اسی عالم میں مجاز نے کہا ”مگر ایک بات ہے“ ساگر نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ہائے رے ان راتوں کو کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں۔

ایک دن وہ میرے پاس آیا اور آتے ہی تخت پر گر کر ہنسنے اور لوٹنے لگا، میں نے پوچھا تو اس نے بتایا ابھی ایک نیا تماشہ دیکھ کر آ رہا ہوں میں خان صاحب کے وہاں بیٹھا تھا کہ ان کے نوکر نے آ کر باورچی نے یہ کہا بھیجا ہے کہ ہماری تنخواہ بڑھا دیجئے ورنہ ہم نوکری چھوڑ دیں گے۔

خان صاحب نے بگڑ کر کہا بالالاف باورچی کے بچے کو  
 باورچی آیا تو انہوں نے ڈپٹ کر پوچھا کیا کھلوا بھیجا تھا تو نے مجھ سے اس نے کہا  
 میں نے کھلوا بھیجا تھا کہ ہماری تنخواہ بڑھا دیں ورنہ۔  
 خاں صاحب نے اس کی زبان سے ”ورنہ“ سنتے ہی ڈنڈا تان لیا اور کہا ہاں کہو  
 ورنہ“ کے بعد کیا کرو گے؟ اور باورچی نے سر جھکا کر جواب دیا ”ورنہ اسی تنخواہ میں  
 نوکری کرتے رہیں گے۔“

میں نے ایک دن پوچھا مجاز تمہارے والدین تو بے حد پابند صوم و صلوة ہیں پھر  
 تمہاری بادہ خواری کو وہ کیوں کر برداشت کرتے ہیں اس پر اس نے بے ساختہ کہا جو  
 ش صاحب بعض والدین اس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کی اولاد نہایت  
 سعادت مند ہوتی ہے اور میں ایک ایسا خوش قسمت بیٹا ہوں جس کے والدین بے حد  
 سعادت مند واقع ہوئے ہیں میں اس کے اس جواب سے پھڑک گیا۔

ایک بار دہلی میں وہ مجھ سے بے حد ناخوش ہو گیا تھا وہ تازہ تازہ دماغی ہسپتال سے  
 بظاہر تندرست ہو کر آیا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ ہر چند اس کو افاقہ ہو چکا ہے لیکن مرض کا  
 ازالہ نہیں ہوا ہے۔

ایک روز اس نے دہلی کے چیف کمشنر کو فون کیا کہ مجھے سو روپے بھیج دیجئے میں  
 نے اس بات پر بہت پھٹکارا اور کہا تو نے اپنی اور پوری شاعروں کی قوم کی عزت  
 خاک میں ملا کر رکھ دی ہے اس نے میرے منہ پر تو کچھ نہیں کہا لیکن یہ شعر لکھ کر  
 میرے پاس بھیج دیا۔

جو گزرنی ہے قلب شاعر پر  
 شاعر انقلاب کیا جانیں

حیف دنیا کے کارخانے پر یہاں جو راتیں پل بھر ہنساتی ہیں وہ مرتے دم تک

رلاتی ہیں۔

تار جاں، رشتہ سوزاں ہے یہ معلوم نہ تھا  
موت کی لرزش مرثاں ہے، یہ معلوم نہ تھا  
مہلت مختصر صحت یاران شباب  
مستقل ماتم یاروں ہے یہ معلوم نہ تھا  
گنبد نشہ بالیدہ و محراب سرور  
سایہ ابر گریزاں ہے، یہ معلوم نہ تھا  
برگ سبز، ورق نسترن و تختہ گل  
چادر قبر بہاراں ہے، یہ معلوم نہ تھا  
آب خم خانہ ہستی و شراب ہستی  
شب نم گور غریباں ہے، یہ معلوم نہ تھا

☆☆☆☆☆☆

## میرے دور کی چند عجیب ہستیاں

### میر سخاوت حسین

اوہ اودھ کے کسی قصبے کے سادات میں سے ایک نہایت دبلے پتلے پڑھے لکھے ادب دوست، موسیقی پرست اور نہایت مہذب انسان اور میرے یہاں نشی کی حیثیت سے ملازم تھے لیکن کھانسی ان کی چڑھ تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کے سامنے کوئی کھانسی، اور وہ چھوٹے ہی اس کو گالی نہ دیں۔

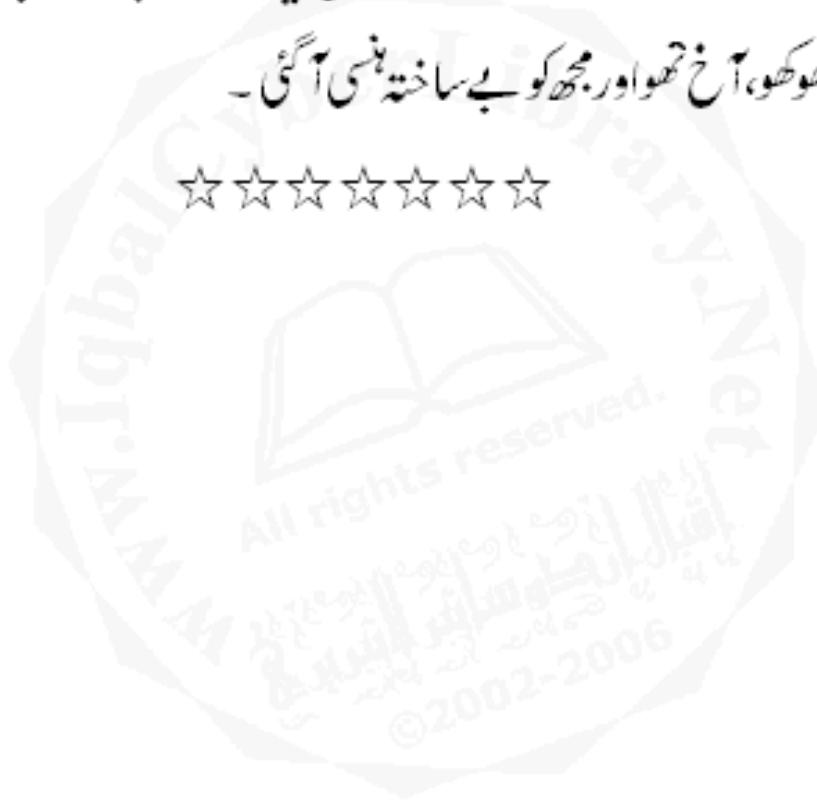
اگر مجھ کو ان کی اس نرالی عادت کا علم ہوتا تو انہیں ملازم نہ رکھتا یا کم سے کم اپنی صحبت میں نہ بیٹھنے دیتا۔۔۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میرے پاس لکھنؤ کے چند اکابر علم و ادب بیٹھے ہوئے تھے کہ ان میں کسی کو کھانسی آگئی اور میر صاحب جامے سے باہر ہو کر ان کو گالیاں دینے لگے میں نے اپنے خدمت گار جگنو سے کہا گدی میں ہاتھ دے کر انہیں محفل سے نکال دو۔۔۔ وہ روتے ہوئے چلے گئے۔

جب محفل بھیانک ہو کر درخواست ہو گئی اور میں نے ہزاروں معافیوں کے ساتھ سب کو رخصت کر دیا تو میر صاحب کو بلا کر میں نے بے حد ڈانٹا ڈپٹا۔۔۔ میر صاحب بے چارے کاچنے لگے اور کان پکڑ کر قسم کھائی کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے لیکن اس کے دوسرے ہی روز جب میں زینے سے اتر کر ملاقات کے کمرے کی طرف جا رہا تھا میں نے ملاقات کے کمرے سے اپنے ایک دوست محمود علی خاں کے کھانسنے اور اسی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کی ”دھت تیرے کی، تیری ماں کی۔۔۔۔۔“ آواز سنی غصے میں بھرا میں ان کے کمرے میں گیا اور ڈانٹ کر کہا ”کیوں میر صاحب۔۔۔۔۔ پھر وہی گالم گلوچ“ مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل پڑے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ان کا یہ عالم دیکھ کر میرا دل پیسج گیا بڑی نرمی سے میں نے کہا آپ تو قسم کھا چکے تھے انہوں نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا خاں صاحب میری ایک بات سن لیجئے میں نے کہا آپ کو لکھنؤ کی تہذیب نے کاڑھا ہے کیا آپ گالی کا کوئی



جواز پیش کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا حضور یہ سچ ہے کہ لکھنؤ نے مجھ کو خرا د پر چڑھایا ہے لیکن آپ اس امر پر کیوں غور نہیں فرماتے کہ مجھ کو موسیقی سے بڑی شیفنگی ہے میں نے کہا موسیقی اور گالی میں کیا چولی دامن کا ساتھ ہے انہوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا حضور ہے اور سو فیصد ہے یعنی یہ ایک امر لازمی ہے کہ جب بھی کوئی کھانے تو سر اور تال میں کھانے آواز کو راگ میں ڈھال کر کھانے لیکن یہ سارے تو بالکل بے سرے کھانتے ہیں، کھوکھو، کھوکھو، آخ تھو اور مجھ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆



## ناظم الدین حسن

مضافات لکھنؤ کے رہنے والے اور لکھنؤ میں بیرسٹری کرتے تھے لاٹوش روڈ پر ان کی پہلی کوٹھی موکلوں سے گھری رہتی تھی وہ بھوپال میں صدر المہام اور حیدر آباد دکن میں چیف جسٹس بھی ہو گئے تھے ان کی ہر سانس خود ساختہ انمول میں جکڑی ہوئی تھی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اصول پرستی کے فیل پائیں بتلاتے تھے ان کے مکان کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں ایک بڑے سے رجسٹر میں لگی ہوئی تھیں اور ہر چیز طاق، مچان یا میز پر ایک خاص زاویے کے ساتھ رکھی اور جب اٹھائی جاتی تو بالکل اسی زاویے پر دوبارہ رکھ دی جاتی تھی۔

ایک بار انہوں نے ملازم کو دیا سلائی اٹھالانے کا حکم دیا دیا سلائی سے کام لے کر انہوں نے ڈبیا ملازم کے حوالے کر دی اس نے میز کے پیچوں بیچ رکھ دی انہوں نے اس پر دو روپے جرمانہ کر دیئے کہ دیا سلائی پہلے میز کے مشرقی گوشے میں رکھی ہوئی تھی اس نے وسط میں کیوں رکھ دی ایک بار لکھنؤ کے چند نو جوانوں نے اپنے ”مسلم کلب“ کے افتتاح کی ان سے درخواست کی وہ پہنچے اور بورڈ پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے افتتاح کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لفظ ”کلب“ سے ذہن منتقل ہوتا ہے ”کلب“ کی جانب اور عربی میں ”کلب“ کے معنی ہیں ”کتا“ جب آپ لوگ اس بورڈ پر ”مسلم کلب“ درج کرائیں گے تو میں بخوشی افتتاح کروں گا۔

ایک مرتبہ وہ امین آباد پارک میں اپنی گاڑی سے اترے، اترتے ہی فوراً چھتری نکالی اور پھل خریدنے لگے اتنے میں ان کے ایک بے تکلف دوست ادھر آ نکلے۔۔۔ انہوں نے کہا، سبحان اللہ یہ گرمیوں کی رات اور پھر رات کا وقت اور اس پر آپ کی یہ چھتری جواب نہیں آپ کا انہوں نے کہا اگر عقل موٹی ہو تو آپ کی سی میرے کپڑے نمازی ہیں اگر کسی بد تمیز چیل نے بیٹ کر دی تو کیا ہوگا۔

ان کا معمول تھا کہ وہ رات کے گیارہ بجے تک لکھتے پڑھتے تھے ان کا ملازم خاص،

ٹھیک گیارہ بجے ان کے کمرے میں داخل ہو جاتا اور اگر ان کو لکھنے پڑھنے میں مشغول پاتا تھا تو ان کے حسب حکم وہ ان کو زبردستی کرسی سے اٹھاتا انہیں گھسیٹ کر چارپائی پر گراتا اور صبح کو اس اصول پرستی کا انعام پاتا تھا۔

جب انہوں نے اپنے بیٹے ناظر الدین حسن کو تعلیم دلوانے کے واسطے لندن بھیجا تو ایک مولوی صاحب کو بھی ساتھ کر دیا تھا کہ وہ ان کی نگرانی کریں اور ہر ہفتے ان کے تمام اعمال کا کچا چٹھا لکھتے رہیں۔

کوئی چارپانچ مہینے کے بعد انہوں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ ناظر کے تمام حالات تو لکھتے ہیں مگر یہ کبھی نہیں لکھتے کہ اس اثناء میں اس کو کتنے بار بد خوابی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ آئندہ سے پوچھ کر بد خوابی کا حال ضرور لکھنے اس لئے کہ اگر بد خوابی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو مجھے پتا چل جائے گا کہ ناظر نے بد چلنی شروع کر دی ہے۔

اسی طرح وہ اپنی بہو بیٹیوں کی ”خاموشیوں“ (ایام کی گدیوں) کو بھی اپنی تحویل میں رکھتے تھے تا کہ انہیں ان کی صحت کے اعتدال کا پتا چلتا رہے۔

اپنے دکن کے قیام میں وہ ہر صبح کو باغ عامہ ٹہلنے جایا کرتے اور ایک وقت معین پر گھر واپس آ جاتے تھے ایک روز وہ حسب معمول ٹہل رہے تھے کہ نظام دکن کی سواری آ گئی تمام باغ رعب شاہی سے کاٹنے لگا انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور ٹہلتے رہے نظام نے اپنے مصاحبوں سے پوچھا یہ کون اول جلول آدمی ہے انہوں نے کہا سرکار یہ چیف جسٹس ناظم الدین حسن ہیں جب سے یہ آئے ہیں ہائی کورٹ میں نا انصافی اور رشوت ستانی کا دروازہ بند ہو گیا ہے نظام نے کہا انہیں بلاؤ وہ جب نظام کے سامنے گئے تو انہوں نے شاہی آداب کے مطابق جھک کر سلام نہیں کیا اور السلام علیکم کہہ کر سیدھے کھڑے ہو گئے مصاحب تھرا گئے کہ دیکھیں اس گستاخی کا نتیجہ کیا ہو گا نظام اچھے موڈ میں تھے، مسکرا کر پوچھا آپ یہاں روز ٹہلنے آتے ہیں انہوں نے کہا جی ہاں اس کے بعد نظام نے ایک اور سوال کیا تو انہوں نے اپنے گھڑی دیکھ کر کہا اب ٹہلنے کا

وقت ختم ہو گیا ہے اچھا السلام علیکم، اور جواب دیئے بغیر فوراً اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک بار جب وہ بھوپال میں تھے بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی کہ فلاں ” کاغذات“ لے کر فوراً آجائیے وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے جب گاڑی پہاڑی کا آدھا راستہ طے کر چکی انہوں نے کوچ بان سے گھبرا کر کہا گاڑی روک دو گاڑی رکتے ہی وہ اتر پڑے اور اپنے مکان کی طرف پیدل چلنے لگے کوچ بان نے کہا حضور گاڑی میں بیٹھ جائیے انہوں نے کہا نہیں میں پیدل جاؤں گا تم یہیں کھڑے رہو اور جب کوچ بان نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے کہا میں ”کاغذات“ گھر میں بھول آیا ہوں بھول جانا میری خطا ہے خطا کروں میں اور سزا بھگتیں گھوڑے یہ کون سا انصاف ہے۔

ایک بار انہوں نے چند را کا بر لکھنو کو کھانے پر مدعو کیا لوگ دیر میں پہنچے وہ تمام مہمانوں کو احاطے کے ایک گوشے میں لے گئے اور کھدی ہوئی زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ حضرات دیر کر کے آئیں ہیں دیکھئے آپ کا کھانا یہاں دفن کر دیا گیا ہے السلام علیکم۔

ان کے ایک قرابت دار، ہر جمعے کو ٹھیک چار بجے ان کے پاس آیا کرتے تھے، اور یہ معمول تھا کہ دوسکٹ اور ایک چائے کی پیالی ان کی خدمت میں ہمیشہ پیش کی جاتی تھی۔

ایک بار وہ ان کی غیبت میں پہنچے، ملازم نے دوسکٹ اور ایک چائے کی پیالی پیش کر دی، چائے پی کر وہ ایک رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگے، اور ایک صفحے پر انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے نام کے نیچے ”ہر جمعے کو دوسکٹ اور ایک چائے کی پیالی بد خیرات“ لکھی ہوئی ہے تو انہوں نے ان کے وہاں آنا جانا ترک کر دیا اور انہوں نے اس صفحے پر لکھ دیا ”خیرات بند“



ایک بار وہ انٹرویو لینے بیٹھے اور ساٹھ درخواست گزاروں میں ایک بھی منتخب نہیں کیا گیا اس لئے کہ سو سے لے کر ایک تک کوئی ایسی گنتی نہیں گن سکا۔

جب وہ بھوپال میں صدر المہام تھے، ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تمام اکابر شہر تعزیت کے لئے ٹوٹ پڑے، اور جب چپراسی ایک تھال میں صدہا کارڈ لے کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے پوچھا یہ اس قدر آدمی آج کیوں آئے ہیں چپراسی نے کہا سرکار کی والدہ کی تعزیت کے لئے آئے ہوئے ہیں، انہوں نے چپراسی سے باوازی بلند کہا ان لوگوں سے پوچھا ہماری والدہ سے ان کا کیا تعلق تھا کہ وہ تعزیت کے لئے آئے ہیں برآمدے تک ان کی یہ آواز پہنچی تو تمام آنے والے افتاں و خیزاں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

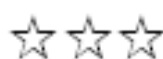
☆☆☆☆☆☆

## علی گڑھ کے ایک گمنام پٹھان شاعر

وہ اپنے مکان کے چبوترے پر ڈھکی لگائے بیٹھے رہتے تھے کہ کوئی شاعر ادھر سے گزرے اور وہ اس کو اپنا کلام سنائیں اور جب کوئی شاعر ان کے ہتے چڑھ جاتا تھا وہ اس کو اپنے کمرے میں لے آتے، بڑی مہارت کرتے، اور اپنا کلام سنانے لگتے تھے۔ یہاں تک تو کوئی عجیب بات نہیں تھی ہزاروں شاعروں کو ہوکا ہوتا ہے اپنا کلام سنانے کا مگر ان میں یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ کسی شاعر کو پھانس کر اپنے کمرے میں لے آتے تھے تو ان کا سدھا ہوا ملازم تینوں دروازوں میں باہر سے زنجیر لگا دیا کرتا تھا کہ پھنسا ہوا شاعر بھاگ نہ سکے۔ جب باہر سے دروازے بند ہو جاتے تھے تو وہ الماری کھول کر اپنا دیوان نکال لاتے، اور غزلیں سنانا شروع کر دیا کرتے تھے اور سننے والا جب ان کو داد دیتا تھا تو ہر داد پر بڑے تحکمانہ انداز سے وہ حکم دیتے تھے کھڑے ہو جائیے، اور جب وہ حیرت زدہ ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا تو اس کو اس طرح بھیج کر گلے لگاتے تھے کہ ان کی پسلیاں بولنے لگتی تھیں۔

ذرا تصور کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھئے کہ گمنام پٹھان شاعر صاحب، اپنا کلام سنا رہے ہیں اور سننے والا واہ واہ سبحان اللہ کہہ رہا ہے اور اس بیچارے داد دینے والے کو بار بار یہ حکم دیا جا رہا ہے ”کھڑے ہو جائیے کھڑے ہو جائیے اور جب وہ تھکا ماندہ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کو بڑے زور سے گلے لگایا جا رہا ہے العظمتہ للہ کوئی حد بھی اس عذاب مسلسل کی۔“

اور ایک صاحب تو یہاں تک بیان کیا تھا کہ جب بار بار کھڑے ہونے اور ہر بار گلے ملنے سے تھک کر انہوں نے یہ کہا تھا کہ اب مجھ میں بار بار کھڑے ہونے کا دم باقی نہیں رہا تو ان پٹھان شاعر صاحب نے اپنے تنبیہ الغافلین ڈنڈے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا، اٹھئے نہیں تو اس سے آپ کا سر توڑ دوں گا۔



## نبی شیر خاں

ملیح آباد کے محلہ 1 صدر پور کے زمین دار تھے کڑوے اتنے کہ خدا کی پناہ تمام عمر مقدمہ بازیوں اور فوج داریوں میں گزار دی ان کی داڑھی چڑھی اور مونچھیں کھڑی رہتی تھیں اور ان کے نام کا جزو لانیفک ”شیر“ تھا اس لئے وہ ہر آن حملے پر آمادہ رہتے تھے اور میرے باپ کے جان نثاروں میں ان کا درجہ بہت بلند تھا وہ ایک روز میرے باپ کے انتقال کے بعد آئے اور کہا کہ اللہ بخشے خاں صاحب نے میری مصیبت کے وقت مجھ کو دس ہزار روپے دیئے تھے پر وہ نوٹ لکھائے بغیر اب میں وہ روپے واپس کرنے آپ کے پاس آیا ہوں یہ کہہ کر انہوں نے دس ہزار کے نوٹ میری میز پر رکھ دیئے۔

میں نے کہا نبی شیر خاں میرے خیال میں میرے باپ نے یہ روپیہ ایک دوستانہ پیش کش کی صورت سے آپ کو دیا تھا اگر یہ قرض کا معاملہ ہوتا تو وہ آپ سے پر نوٹ ضرور لکھا لیتے اس لئے یہ رقم قبول نہیں کر سکتا۔ میرے انکار سے وہ آزرده ہو گئے، اور چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں نے ان کے سر کے ایک بڑے بار کو اترنے نہیں دیا اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔

ایک بار، برکھارت تھی اور وہ اپنے آموں کے باغ میں بیٹھے موسم کا لطف اٹھا رہے تھے کہ بھنگوں نے ان کی ایک آنکھ پر حملہ شروع کر دیا انہوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر بار بار بھنگوں کو بھگایا لیکن ٹھہر ٹھہر کر وہ بار بار حملے کرتے رہے اور جب وہ تنگ آ گئے تو انہوں نے جھلا کر اپنی آنکھ پر اس قدر زور سے گھونسا مارا کہ ڈھیلا نکل آیا اور انہوں نے ایک موٹی سی گالی دے کر بھنگوں سے کہا لو سالو اب کس چیز پر حملہ کرو گے آنکھ گئی پیر گئی

یک جا ہے، تمام آفرین و توجیح  
دل داری ناہید و جفائے مرتج  
آنکھوں میں ہیں یاد این و آں کے آنسو  
قطرے، طوفان کی لکھ رہے ہیں تاریخ

1 آم کی فصل میں بھنگے آدمی کی آنکھ میں گھس جانے کی سعی کیا کرتے ہیں۔

گنوار زبان ہے یعنی اے جلال خاں ہو کہ نہیں، یا اے طلال خاں اگر ہو تو بولو۔

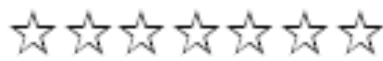
## محمد شیر خاں

”کنول ہار“ محلہ ملیح آباد کے پٹھان، میرے باپ کی ڈیوڑھی کے سپاہی، زبردست ڈڑھیل کام میں بڑے مریل، اعضاء کے اعتبار سے قوی ہیکل عقلی نقطہ نظر سے گٹھل، اور اعتراف قصور کے معاملے میں رشک جبل آدمی تھے، وہ آئے دن غلطیاں کرتے لیکن اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے کو سور کا گوشت سمجھتے تھے اور اس وضع میں ان کو اس قدر رسوخ حاصل تھا کہ اگر پیسے پر رکھ کر ان کی ایک ایک بوٹی کاٹی جاتی پھر بھی وہ اعتراف قصور کا ننگ برداشت نہیں کرتے۔

میرے باپ کی یہ سنت جاریہ تھی کہ وہ آموں کی فصل میں اپنے تمام احباب کو آموں کے ٹوکڑے بھیجا کرتے، اور حریف و رقیب کے زمانے میں اپنے لکھنؤ کے احباب کے پاس غلہ رسادل، ترکاریاں اور گھی روانہ کیا کرتے تھے ایک بار یہ خدمت محمد شیر خاں کے سپرد ہوئی کہ وہ لکھنؤ جا کر حضرت جلال کی خدمت میں گھی کا پیپا دے آئیں صبح کو وہ لکھنؤ گئے اور دوپہر کو منہ پھلائے اور گھی کا پیپا اٹھائے ملیح آباد آگئے آتے ہی میرے باپ کو جھک کر سلام کیا اور کہنے لگے میں حضور کے حق نمک سے ادا ہو گیا اگر حضور کے حق نمک کا پس نہ ہوتا تو جلال خاں کو اٹھا کر دے مارتا، میرے باپ نے ڈپٹ کر فرمایا محمد شیر زبان بند کرو، اور یہ بتاؤ کہ ہوا کیا؟ انہوں نے کہا جلال خاں نے گھی کا پیپا واپس کر دیا، مجھ کو ڈانٹا، پھٹکارا، گنوار کہا بس حضور کے خیال سے میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا نہیں تو۔۔۔۔۔ میرے باپ نے بات کاٹ کر کہا حضرت جلال بہت شائستہ آدمی ہیں تم نے ضرور کوئی ایسی بات کی ہوگی کہ ان کو غصہ آ گیا بتاؤ تم نے کیا کیا تھا؟ انہوں نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں نے تو کوئی بات نہیں کی وہ بے کار خوخیانے لگے میرے باپ نے کہا محمد شیر تم اور اپنی خطا مانو یہ ہو ہی نہیں سکتا دوسرے دن میرے باپ محمد شیر خاں کو ساتھ لے کر جلال کے وہاں پہنچے میں بھی ساتھ تھا حضرت جلال، محمد شیر خاں کو دیکھتے ہی جامے سے باہر ہو گئے اور کہنے لگے خاں



صاحب اس جانگوش کو میرے سامنے سے ہٹا دیجئے، میرے باپ نے ان کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور جب وہ مارے غصے کے داڑھی کو اپنے منہ میں چباتے ہوئے باہر چلے گئے تو جلال نے میرے باپ سے کہا خاں صاحب میں کل زنا نے میں بیٹھا تھا آپ کے اس سپاہی نے اپنے لٹھ کے گولے سے میرا دروازہ اس قدر زور سے کھٹکھٹایا کہ میری بیگم اچھل پڑیں، اور کہنے لگیں ہے ہے اب لکھنؤ میں یہ بھی ہونے لگا ہے یہ تو قیامت کے آثار معلوم ہوتے ہیں ابھی میری بیگم نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا، یعنی باہر سے آواز آئی جلال خاں<sup>1</sup> ہوت میری بیوی نے کانوں میں انگلیاں دے لیں نادعلی پڑھنے لگیں میں غصے کے مارے کانپنے لگا دروازہ کھول کر دیکھا کہ ایک جنادر واڑھا پھٹکارے اور ایک پیپا کاندھے پر اٹھائے منہ کھولے کھڑا ہے میں نے کہا تم آدمی ہو یا جناور؟ اس نے آپ کا نام لے کر کہا آپ نے گھی بھیجا ہے میرے حواس ٹھکانے نہیں تھے میں نے کہا چلے جاؤ میرے سامنے سے خاں صاحب اس شخص نے مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ اہل محلہ کو منہ دکھاسکوں۔



## کنجواں

وہ بھی گنول ہار کے رہنے والے، اور ہماری ڈیوڑھی پر، سپاہیوں کے زمرے میں شامل تھے وہ اس قدر سرخ و سفید اور گورے چٹے تھے، آنکھیں اس قدر کنجی تھیں اور داڑھی اس غضب کی بھوری تھی کہ ہو بہو انگریز پادری معلوم ہوتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی داڑھی اس بلا کی جھاڑ جھنکار ہاتھی پچھاڑ اور سرد کے درختوں کی طرح سیدھے بالوں کی تھی اور ان کی مونچھوں کے پو لے، اس قدر گھنے اور ریش پیوستہ تھے کہ ان کا منہ غور سے دیکھنے کے بعد بھی نظر نہیں آتا تھا۔

ایک روز وہ کسی گاؤں کی طرف سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ گاؤں کے حاشے کے کنویں پر گاؤں کی چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں انہوں نے ان لڑکیوں سے پانی مانگا، ان میں سے ایک شوخ لڑکی نے ٹھٹھول کی راہ سے پوچھا ”کہاں 1 صاحب تمرے منہ کہاں ہے کہ پانی مانگت ہو؟“ یہ سنتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی داڑھی اور مونچھوں کو جدا کر کے کہا، اور یہ منہ نہیں تو کیا تمہارے لہنگے کے اندر کی چہر ہے؟ اور یہ فحش جواب سن کر، ساری لڑکیاں بھاگ کھڑی ہوئیں۔

ایک مرتبہ انہوں نے اپنے کھیت کے قریب ایک موٹے تازے ہرن کو دیکھا کہ وہ گھٹنوں گھٹنوں دلدل میں پھنسا کھڑا نکلنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن نکل نہیں سکتا انہوں نے خوشی سے اچھل کر کہا سالے روز ہمارا کھیت چر جایا کرتے تھے آج پھنسے ہو۔

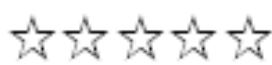
1 خاں صاحب تمہارا منہ کہاں ہے کہ پانی مانگ رہے ہو۔

اب تمہارے کباب کھائے جائیں گے یہ کہہ کر انہوں نے اپنی لنگی کے ایک گوشے کو اس کی گردن میں ڈال کر خوب مضبوط گرہ لگا دی اور پورا زور لگا کر اس کو دلدل سے نکال لیا دلدل سے نکلتے ہی ہرن نے زور سے ایک جھٹکا دیا ان کی لنگی کھل گئی وہ لنگی سمیت بھاگ کھڑا ہوا وہ ننگے ہو گئے اور اس پاس کے کھیتوں کے لونڈوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں انہوں نے دوڑ کر ایک لونڈے کو پکڑ لیا اس کی لنگی چھین کر

باندھ لی وہ ننگا ہو کر رونے لگا انہوں نے کہا اے اورتالیاں بجائنگے کنجو خاں پر اسی وقت وہ سیدھے خلیل خاں کے پاس گئے خلیل خاں بڑے دھواوت شکاری تھے ان کی گولی سے جب ایک دن انہوں نے اس ہرن کو ہلاک کروا دیا تو اسے گاڑی میں لدوا کر قصبے میں لے آئے اور اس کی دونوں ٹانگیں چیر چیر کر لوگوں سے کہا اس حرام زادے نے کنجو خاں کو ننگا کر دیا تھا اب دیکھ لو بھائیوں اس سالے کو بالکل ننگا۔

ایک دن وہ اپنی آموں کی بغیا بچارہ تھے کہ بڑے زور کی کالی آندھی اٹھی، وہ بلبلہ کر اپنی جھونپڑی سے نکل آئے اپنی پگڑی آسمان کی طرف بلند کر کے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگنے لگے کہ اے اللہ، میں بے حد غریب آدمی ہوں میری بغیا کا ایک آم بھی نہ تھا گرنے پائے، نہیں تو سال بھر فاقے ہوں گے اور بیٹی کی شادی بھی نہیں کر سکوں گا اے اللہ میرے منہ میں روزہ ہے کہتے ہیں تو روزہ داروں کی دعا سن لیتا ہے میرے باغ کو بچالے اللہ نے ان کی دعا نہیں سنی اور آندھی نے ان کی تمام کسیریاں زمین پر بچھا دیں اور کئی درخت بھی توڑ ڈالے۔

اب کنجو خاں کو اللہ میاں پر غصہ آگیا انہوں نے اپنی جھونپڑی کو آگ لگا دی کھٹیا کو، ڈنڈے میں پھنسا کر پیٹھ پر لا دیا منگے میں آپ خورہ بھر کر ہاتھ میں لے لیا آسمان کی طرف بگڑ کر آنکھیں اٹھائیں اور کہا جناب ہم نے دانت نکال نکال کر آپ سے دعا کی کہ ہماری بغیا کا ایک آم بھی نہ گرنے پائے آپ نے ہماری دعا قبول نہیں کی یہ کہہ کر آپ خورہ منہ سے لگا لیا پورا آب خورہ پی گئے اور کہا یہ لیجئے ہم نے روزہ توڑ ڈالا اب آپ بڑے پٹھان ہیں تو کل سے روزہ رکھا لیجئے گا (اور پھر مرتے مرتے لیکن کنجو خاں نے کبھی روزہ نہیں رکھا)



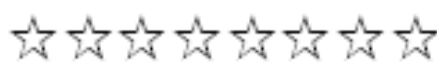
## امیر احمد خاں

اچھے خاصے، بافراغت، زمیں دار میرے دادا کے مختلف البطن بھائی کے بیٹے تھے۔ نہایت پاک نفس، بڑے فیاض، افیون کے زبردست رسیا اور بے حد گاہندے تھے بندھی ٹکی معروف گالیوں سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا، وہ نئی نئی گالیاں ایجاد کیا کرتے تھے اگر میرے قارئین کی اکثریت شرمیلی نہ ہوتی تو میں ان کی تمام نرالی گالیاں درج کر کے یہ دکھا دیتا کہ ان میں خلاقی کا جوہر کس قدر تھا۔

ان کے ایک خاص مصاحب تھے محمد اکبر خاں، ایک دن انہوں نے لہر میں آکر انہیں بالکل نئی تراش کی گالیاں دیں اکبر خاں روٹھ گئے آنا جانا ترک کر دیا۔

کوئی ایک ہفتے کے بعد وہ انہیں منانے ان کے گھر پہنچے اکبر خاں نے کہا خاں صاحب آپ بہت گالیاں دیتے ہیں انہوں نے کہا تم سالے ہو ہی اس قابل کہ تمہیں روز گالیاں دی جائیں اکبر خاں نے کہا میاں اگر ہم اتنے ہی برے ہیں تو آپ ہم کو منانے کیوں آئے ہیں انہوں نے کہا کیا کریں یہ کم بخت چودھویں صدی ایسی ہے کہ اکبر خاں اب تم سے حرامی بھی کہیں ڈھونڈے نہیں ملتے ہیں اس پر اکبر خاں ہنس پڑے اور من گئے۔

ان کے انتقال کا واقعہ بھی سن لیجئے ایسی وضع داری کے ساتھ مرنا کس کے بس کی بات ہے ان پر جب کرب نزع طاری ہوا انہوں نے اپنی بیوی سے کہا خدا کے لئے مجھ کو جلدی اٹھا کر بٹھا دو بیوی نے کہا ارے غضب خدا کا، یہ وقت بیٹھنے کا ہے انہوں نے کہا ارے بیوی جلدی کرو، میری اطاعت تم پر فرض ہو میرا دل چاہتا ہے کہ اس حرام زادی موت کو ایک گالی دے کر تو مرے بیوی نے رو کر کہہ کرے کلمہ پڑھو، انہوں نے ہاتھ جوڑے کہ مجھے بٹھا دو اور جب بیوی نے بٹھا دیا تو انہوں نے مٹھی بند کر کے بایاں ہاتھ بلایا اور کہا ”لے حرامن موت یہ موٹا سا ڈاپوٹا“ اور سدھار گئے۔





## ہدایت 1 اللہ خاں

میں نے جب انہیں دیکھا ان کی عمر ستر سے متجاوز ہو چکی تھی، تھے تو کمزور، مگر ذرا ذرا سی بات میں لٹھ پونگے پر آمادہ ہو جاتے اور قوی سے قوی نو جوانوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے وہ میرے چچا کے وہاں ملازم تھے اور گھنٹہ بجانے کے سوا ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

ایک روز بیڑے کے سپاہیوں نے ان سے کہا ہدایت اللہ خاں تمہیں کچھ خبر بھی ہے، تمہاری مونچھوں پر تو چنگاریاں اڑتی ہیں، اور تمہارے پوتے کو خلیل خاں باغوں باغوں لئے پھرتے ہیں یہ سنتے ہی وہ غصے کے مارے جل کھا گئے داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے اور کہا اچھا آنے دو کھلیل کھاں کو، ڈیوڑھی پر۔

دوسرے دن وہ دو پہر کا گھنٹہ بجا رہے تھے ابھی پورے بارہ بجائے نہیں پائے تھے کہ خلیل خاں آ گئے۔

انہوں نے گھنٹے کی موگری فوراً پھینک دی، کھڑے ہو گئے، کمر باندھ کر، اور کہا کھلیل کھاں ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ تمہیں ہمارے کالے پوتے میں کامجا آوت ہے کہ تم اس سرے کو باگن باگن لئے پھرا کرت ہو۔

(خلیل خاں ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تمہیں ہمارے کالے پوتے میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اس بد معاش کو باغوں باغوں لئے پھرتے ہو)

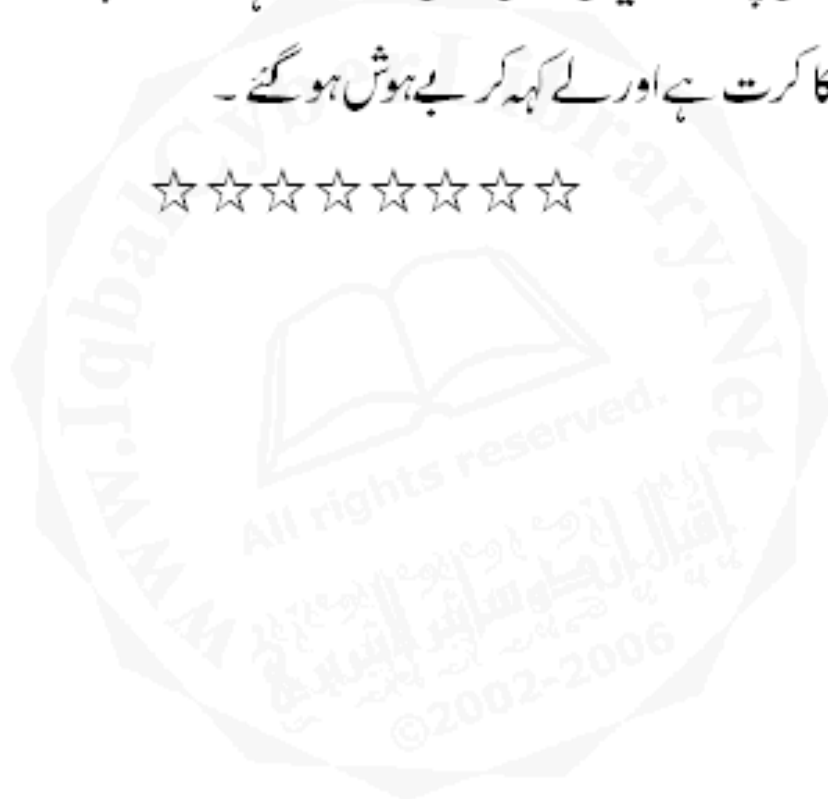
---

1 وہ قوم کے ٹھا کر تھے اسلام لے آنے کے بعد ان کا نام ہدایت اللہ خاں رکھ دیا گیا تھا۔

آؤ، آج دو دو ہاتھ ہو جائیں خلیل خاں بڑے ظریف تھے انہوں نے کہا ہدایت اللہ خاں یہاں تو لوگ بیچ بچاؤ کر دیں گے، بڑے باغ چلو اور وہاں جا کر اپنا حوصلہ نکال لو خلیل خاں اکڑتے اور ہدایت اللہ خاں ہانپتے کانپتے باغ پہنچ گئے خلیل خاں نے کہا ہدایت اللہ خاں تم بوڑھے آدمی ہو تم پہلے وار کرو انہوں نے کہا اچھا اور لاٹھی اٹھا

کران پر حملہ کر دیا خلیل خاں نے ان کی لائھی اپنی لائھی پر روک کر کہا ’فش‘ ہدایت خاں ”پھس پھس کا کرت ہے، اور لے (فش فش کیا کر رہا ہے اور لے) کہ کر دوسری لائھی ماری اس لائھی کو بھی اپنی لائھی پر روک کر خلیل خاں نے کہا ’فش‘ ہدایت اللہ خاں نے ”پھس پھس کا کرت ہے اور لے کہہ کر پھر لائھی مار دی الغرض ہدایت اللہ خاں نے ان کے دس پندرہ لائھیاں پھس پھس کا کرت ہے اور لے کہہ کر ماریں اور آخر کار پھس پھس کا کرت ہے اور لے کہہ کر بے ہوش ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆



## محبوب شاہ مجذوب

ذرا سی دھوتی باندھے ننگ دھڑنگ آدمی تھے کبھی کبھی ملیح آباد آتے اور میرے پھپھا نواب احمد خاں کی ڈیوڑھی میں ٹھہرا کرتے اور ایک رومی کاغذ لئے گلیوں میں پھرتے اور لوگوں سے کہا کرتے تھے بھیا اس پر ”دس کت“ (دستخط) کرو ہماری ہماری سادی (شادی) ٹھہری ہے۔

ان کو روپے پے یا کھانے پینے سے کوئی سروکار نہیں تھا جب کوئی ان کو روپیہ دیتا تھا تو وہ ”ارے کو یا ٹھیکرا دیوت ہو“ (ارے یہ کیا ٹھیکرا دیتے ہو) کہہ کر اسے پھینک دیا کرتے تھے البتہ پھپھا جب ان کے رو برو کھانا رکھ دیتے تو ذرا سا چکھ کر سر کے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

لوگ جب ان سے اپنے بارے میں کوئی بات پوچھتے تھے تو وہ سیدھا جواب نہیں دیتے اور

”ارے گنے کے کھیت لاگے لگے ہیں کھوب خوب گنے کھاؤ کھجانے خزانے بھرے ہوئے ہیں کھوب بچے مزے اڑاؤ“ کہہ کر نال دیا کرتے تھے۔

میں ایک زمانے میں ایک لڑکی پر جس کی منگنی ہو چکی تھی بہت بری طرح عاشق ہو گیا تھا پہل اس لڑکی نے کی تھی اس لئے میرا عشق، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا کہ محبوب شاہ ملیح آباد آگئے میں ان کو اپنی نو تعمیر کوٹھی ”قصر سحر“ میں لے گیا میری بیوی مایکے گئی ہوئی تھیں میں نے محبوب شاہ سے کہا آؤ میرے لحاف میں لیٹ جاؤ وہ لیٹ گئے میں نے ان سے دیکھو میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اگر گنے کے کھیتوں اور خزانوں کا نام لو گے تو یہ تمہاری کچھو داڑھی ونچ کر رکھ دوں گا وہ مسکرائے اور کہا یو کا مر ہی باتن کرت ہو (یہ کیا بیہودہ باتیں کرتے ہو) ہم پرانی مہر یا کو تمہیں کیسے دلانی دیں۔ (ہم دوسرے کی بیوی کو تمہیں کیوں کر دلادیں) یہ بات سن کر مجھے حیرت ہو گئی کہ انہیں میرے دل کی بات کا پتا کیسے چل گیا۔

ایک روز میں نے ان کو اپنے کمرے سے ملے ہوئے کمرے میں سلایا، صبح چار بجے ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ جوگدا اور لحاف میں نے ان کو دیا تھا وہ پائنتی لپٹا رکھا ہے، اور آدھے دھڑ سے ننگے چار پائی سے پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں میں نے کہا محبوب شاہ ارے اتنی سخت سردی میں اور ننگے بیٹھے ہو۔

انہوں نے کہا ”بھیا سوتے بن نہیں پڑتے ہے، ندیا کنارے ڈگن لگائے بیٹھیں ہیں نہ جانے کب کھٹکا ہو جاوے“ بھیا سوتے بن نہیں پڑ رہا ہے ندی کے کنارے مچھلی پکڑنے کی چھڑ لگائے بیٹھے ہیں نہ جانے کب مچھلی کے کاٹا نکل جانے کی کھٹکار ہو جائے۔

میں نے کہا یہ سب بیوقوفی کی باتیں ہیں وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے ابھی تو ان باتن کو بے وقوفی کہت ہو جب ہم تم کا مکے مدینے اڑائی کے لے جلیہا تب تم کا پتا چلے گا ابھی تو کھوب مجھے کرو کھوب کوٹھن پر چڑھو کھوب گئے کھاؤ ابھی تو ان باتوں کو بے وقوفی کہہ رہے ہو جب ہم تم کو مکے مدینے اڑا کر لے جائیں گے اس وقت تم کو پتا چلے گا ابھی تو خوب مزے کرو خوب کوٹھوں پر چڑھو۔ خوب گئے کھاؤ۔

حیدر آباد جانے سے کوئی ایک سال پہلے جب کہ حیدر آباد جانے کا تصور بھی میرے دماغ میں نہیں تھا وہ میرے پاس آئے اور چھوٹے ہی کہنے لگے ہم نے تمرے نام لکھ دینا ہے اکبر پور وہاں کھوب مجھے کرنا ہم نے تمہارے نام اکبر پور لکھ دیا ہے وہاں خوب مزے کرنا میں نے کہا اکبر پور تو میری بیوی کے نانا کے گاؤں کا نام ہے انہوں نے کہا تمرا اکبر پور 1 دھن ماں ہے (تمہارا اکبر پور دکن میں ہے)

اس کے ایک سال کے بعد میں حیدر آباد روانہ ہو گیا اور جب دو چار برس کے بعد

1 چونکہ حیدر آباد سب سے بڑی ریاست تھی شاید اسی بناء پر اسے اکبر پور کہا تھا

رخصت لے کر وطن آیا تو دیو سے کے عرس میں چلا گیا صبح کا وقت تھا دیکھا کہ محبوب شاہ چلے آ رہے ہیں انہوں نے جھپٹ کر مجھے گلے لگالیا میں نے کہا یہاں کیسے



انا ہوا کہنے لگے دعا سلامن کے لئے میں نے کہا لو محبوب شاہ انگور کھاؤ انہوں نے دو ایک انگور کھا کر مجھے غور سے دیکھا اور ایک شہر کا نام لے کر کہا بھیا وہاں قدم نہ رکھیو نہیں تو کانچی ہوز میں بند کر دیئے جئو ”بھیا وہاں قدم نہ رکھنا ورنہ کانچی ہوز یعنی مجلس موسیان آوارہ، میں بند کر دیئے 1 جاؤ گے۔“

1 دو چار روز کے اندر یہ خبر مجھ تک پہنچ گئی کہ میں اپنی جس معشوقہ سے ملنے جانے والا تھا اس کے شوہر نے میرا خط پکڑ لیا تھا اور میرے پھانس لینے کے انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے۔

اب جب اس بات پر غور کرتا ہوں کہ بعض افراد مستقبل کے واقعات سے کیوں کرا گاہ ہو جاتے ہیں تو اس کے سوا کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض لوگوں کے پاس ایک چھٹا خاصہ ہوتا ہے جو مستقبل کو اپنے آنکڑے میں پکڑ لیتا ہے وہ چھٹا ماسہ کلن کیمیاوی تغیرات کا نتیجہ ہوتا ہے ابھی تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے الاماں، یہ کائنات اور یہ انسانی دماغ دونوں ایسے قلمز ہیں کہ ابھی تک کسی کو ان کی تھاہ نہیں مل سکی ہے۔

پیانش قلمز یہ وہ کیا قادر ہو

قطرے کی جسے تھاہ نہیں ملتی ہے

صبر کراے انسان کے ذوق تجسس کہ ابھی تیری آسودگی کا وقت نہیں آیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

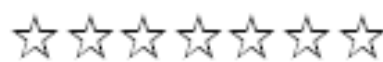
## الویرو

اس اٹلی کے باشندے سے حیدر آباد دکن میں ملاقات ہوئی تھی چہرہ خوانی میں اسے اس قدر بصیرت حاصل تھی کہ وہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی اس کے خیالات معلوم کر لیتا اور پوچھے بغیر اس کے سوالات کے جواب لکھ کر دے دیا کرتا تھا۔

ایک بار سید امین الحسن صاحب بٹل اور نواب اصغریا ر جنگ کے ساتھ میں ان سے ملنے جا رہا تھا تو میں نے ان سے موٹر میں یہ کہا کہ میں الویرو سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں فرنگی راج کب ختم ہوگا، میرے دونوں دوستوں نے کہا یہ سوال غلط ہے، ہم لوگ نظام سے وابستہ ہیں اس لئے ہم کو سیاسی جھگڑوں میں نہ پڑنا چاہئے۔

جب ہم اس کے وہاں پہنچے تو ہم لوگوں کے سوالات کے جوابات قلم بند کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ ”آپ نے موٹر میں جو سوال ڈراپ (نظر انداز) کر دیا ہے، میں اس سے واقف ہوں لیکن میرا یہ اصول ہے کہ میں سیاسی سوالات کا جواب نہیں دیا کرتا ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ سیاسی حیثیت سے آپ بڑے خطرناک قسم کے باغی ہیں اور زیادہ مدت تک یہاں نہیں رہ سکیں گے لیکن آپ کا مستقبل بہت شاندار ہے۔“

ایک بار مہاراجہ کشن پرشاد کی مجلس میں انہوں نے اکبر حیدری سے کہا سر اکبر حیدری اس وقت آپ کے دل میں جو بات ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں بتا دوں! اکبر حیدری یہ سن کر اچھل پڑے اور کہا ”آپ برسر عام میرے دل کی بات نہ بتائیں ورنہ بڑا غضب ہو جائے گا“ اس نے ایک پرچے پر وہ بات لکھ دی اکبر حیدری دنگ ہو کر رہ گئے اس کے کمال کا اعتراف کیا اور پرچہ کو چاک کر کے جیب میں رکھ لیا۔



## مشیر احمد خاں رامپوری

ان کے بزرگ رام پور سے آ کر لیخ آباد میں رہنے لگے تھے وہ پستہ قامت گورے چٹے اور ”کچواڑھی رکھتے تھے ان کے مزاج میں اس قدر ظرافت تھی کہ خدا کی پناہ روتوں کو ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔“

میرے باپ کے بڑے مخلص و رفیق اور نہایت بے تکلف دوست، تصوف کے شیدائی عرسوں کی شرکت کے رسیا، درویشوں، صوفیوں سدا سہاگونوں کے مستقبل میزبان، میرے بچپن کے یار مختار احمد خاں کے باپ، اور میرے چچا نواب محمد علی خان کے بھینچ داماد تھے۔

ان کے وہاں ہمیشہ دس بیس درویش ٹھہرے رہا کرتے، انگنائی میں دیکھیں چڑھی رہتیں اور ہندوستان کے ہر عرس میں وہ دس بارہ آدمیوں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔

ان کی جائیداد تنگ اور حوصلے بے حد وسیع تھے آخر کار چھوٹی جائیداد بڑے حوصلوں کا ساتھ نہیں دے سکی اور وہ دانے دانے کو محتاج ہو کر رہ گئے اور میرے باپ کے سہارے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

ابھی افلاس کو بمشکل ایک سال ہوا تھا کہ ان کی صاحب جائیداد لا ولد بہن کا انتقال ہو گیا اور ان کی جائیداد انہیں مل گئی۔

جائیداد ملتے ہی ان کے وہاں درویشوں کا میلہ پھر لگ گیا پھر دیکھیں چڑھ گئیں پھر قوالیاں ہونے لگیں اور پھر جم غفیر کے ساتھ وہ عرسوں میں شریک ہونے لگے کچھ روز کے بعد وہ جائیداد بھی ختم ہو گئی اور پھر مفلسی کا دور آ گیا دیکھیں ٹھنڈی ہو گئیں اور مہمانوں کی چہل پہل سے گھر خالی ہو گیا اور میرے باپ کو ہر ہاتھ بٹانا پڑا۔

کوئی چھ سات مہینے اس تنگی سے گزرے تھے کہ ان کے کسی لا ولد قرابت دار کا انتقال ہو گیا ان کی جائیداد ان کو مل گئی اور پھر وہی اللے تلے شروع ہو گئے۔

وہ جائیداد بھی جب مہمانوں اور عرسوں کی نذر ہو گئی تو ایک اور لاؤلد قرابت دار  
سدھار گئے اور ان کی جائیداد بھی انہیں مل گئی اور پھر وہی رنگ رلیاں ہونے لگیں  
میرے باپ کا اس آتش میں انتقال ہو گیا وہ جائیداد بھی برباد ہو گئی ان کے پاس کچھ  
نہیں رہا اور وہ اسی عالم افلاس میں بیمار پڑ گئے، اور جب ان کی حالت خراب ہو گئی تو  
ان کے ایک رئیس دوست مرزا عابد علی بیگ نے چاہا کہ ان کا علاج کرا دیں انہوں  
نے کہا مرزا اب میرا علاج بے کار ہے اب کوئی قرابت دار ایسا نہیں رہا کہ اس کی  
جائیداد مجھے مل جائے اس لئے مجھے اب چین سے مر جانے دو بس ہو چکا جینا۔

اور اس کے چوتھے روز اس مرد بے پروا کا انتقال ہو گیا۔

ایسے مست مولیٰ اب کبھی پیدا نہیں ہوں گے

آفریں باد، بر ایں ہمت مردانہ تو!

☆☆☆☆☆☆☆☆



## مولوی احمد حسین

میں نے زندگی میں دو ایک کے علاوہ ان کا سا پر اسرار و صاحب کردار انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔

ان کی دنیوی حیثیت تو بس اس قدر تھی کہ وہ سرکار نظام میں غالباً تیس روپے ماہانہ کے ایک معمولی کلرک تھے لیکن ان کی انسانی حیثیت اس قدر ارفع تھی کہ ایک میرا سا بیگانہ یقین و بے عقیدہ شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کروڑوں انسانوں میں سے کہیں دو ایک کو اس قدر بلندی حاصل ہوتی ہے عربی، فارسی، علم کلام اور فلسفے پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی لیکن افتاد مزاج کی بناء پر وہ تصوف کی طرف جھکے ہوئے تھے پھر بھی وہ کبھی کائنات کے حقائق اور وحدت انفس و آفاق کے مسائل پر اس قدر ژرف نگاہی کے ساتھ روشنی ڈال کر تے تھے کہ ان کی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ کر تخت طاؤس نگاہوں سے گر جاتا تھا۔

میں سب سے پہلے ان کی اعلائے کلمۃ الحق کی جرأت بیباک کا ایک عجیب واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ واقعہ ہوا تھا کس ماحول میں جب تک آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا اس وقت تک آپ اس واقعہ کی اہمیت نہیں سمجھ سکیں گے۔

اس لئے اس امر کا بتا دینا ضروری ہے کہ اس واقعہ کا تعلق تھا ہر اکزل فڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر نظام دکن کی ذات سے۔

یوں تو ہندوستان کی دیسی ریاستوں کا ہر مطلق العنان فرمانروا علم بریدگی جہالت پروردگی گرم و سرد نہ چشیدگی ہمہ وقت آرامیدگی، خوشامد گزیدگی ذہن ژولیدگی اور آمریت پیونگی کے باعث اس قدر متکبر ہوتا تھا کہ فراعنہ کا تختہ، اور ہامان و شیطان کا غروران کو دیکھ کر لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا۔۔۔ لیکن نظام اللہ اکبر جس طرح ان کی ریاست ہندوستان کی تمام ریاستوں سے بڑی تھی اسی طرح وہ تمام والیان ریاست سے عجب و غرور میں بھی سب سے زیادہ قد آور انسان تھے اور انسان نہیں خدا معلوم

ہوتے تھے اور ان کے روبرو بڑے بڑے ہمالیہ کوہ انسانوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتیں اور بڑے بڑے سورماؤں کے زہرے آب ہو جایا کرتے تھے۔

اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نظام کا طنطنہ اور دبدبہ کس قدر شرانگن تھا، اب سنئے تیس رپلی ماہانہ کے ایک معمولی سے کلرک مولوی احمد حسین کا واقعہ۔۔۔۔۔

حیدرآباد کی ایک درگاہ میں جس کا نام ”خواجه کا چلا“ بڑے دھوم دھڑکے سے ہر سال قوالی ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی نظام بھی آیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار وہاں پہلی صف میں نظام اور دوسری صف میں عین نظام کے پیچھے مولوی احمد حسین بیٹھے ہوئے تھے کہ حسب دستور قوالی سے پیشتر قرأت ہونے لگی اور خوش گلو قاری نے سورہ رحمن جو قرآن کی جان ہے اس طرح پڑھنا شروع کر دی کہ تمام محفل جھومنے لگی:

ابھی تمام ارباب درگاہ، قرأت کے جھولے میں جھول رہے تھے کہ نظام مہاراجہ کشن پرشاد سے کچھ سرگوشی کرنے لگے رعب شاہی سے قاری کے رشتہ آواز میں جھنگلی پیدا ہو گئی اور قرأت ہکلا نے لگی۔

کس کی مجال تھی کہ نظام کو ٹوک دیتا مگر واہ ری جرأت مردانہ کہ احمد حسین کے سے مسکین آدمی نے جھک کر نظام سے کہا کہ اثنائے قرأت میں باتیں کرنا سوادب ہے آپ خاموش ہو جائیں نظام نے مڑ کر ان کو دیکھا۔۔۔۔۔ ونکھارا ماریڈی کو تو ال شہر جو پولیس کے دستے کے ساتھ نظام کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑا تھا ان کی طرف گرفتار کرنے کے واسطے جھپٹا لیکن نظام نے ”نکوٹکو“ (نہیں نہیں) کہہ کر اس کو روک دیا۔

قاری کی رندھی آواز کھل گئی قرأت پھر پیگ لینے لگی اور لوگ جھومنے لگی لیکن ایک مختصر سے وقفے کے بعد نظام نے مہاراجہ کشن پرشاد سے پھر سرگوشی کا آغاز کر دیا یہ دیکھ کر وہ پھر گئے پہلے تو انہوں نے سوءادب ہی کہا تھا اس بار انہوں نے با آواز بلند کہا ”اثنائے قرأت میں باتیں کرنا بدتمیزی ہے خاموش ہو جائیے اور مزید بدتمیزی نہ کیجئے“

ان کی یہ آواز سن کر حاضرین تھڑا اٹھے قاری کی آواز گلے میں دفن ہو گئی، کو تو ال

پھر جھپٹا نظام نگو نکو انہیں گرفتار نہ کرو ان کا نام اور پتہ لکھ کر ابھی کنگ کوٹھی آ جاؤ کہ کر کھڑے ہو گئے اور مہاراجہ کشن پرشاد کو ساتھ لے کر درگاہ سے چلے گئے۔

”تمام حاضرین محفل اس دبلے پتلے مسکین مولوی احمد حسین کو دیکھنے کے لئے جس کی بوسیدہ شیروانی کی آستیوں سے اس کی کہنیاں جھانک رہی تھیں اس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت میں ڈوبی ہوئی تعریف کرنے لگے۔“

لوگوں کی مدح سرائی کے جواب میں انہوں نے یہ کہا کہ آپ حضرات نے یہ قول سنا ہے کہ بڑوں کی موت نے مجھ کو بڑا بنا دیا ہے؟ میاں پہلے سارے مسلمان ایسے ہی تھے اب چونکہ وہ لوگ باقی نہیں رہے اس لئے میں ایک نمایاں فرد معلوم ہونے لگا ہوں اور کوتوال جب ان کا نام اور پتہ پوچھنے آیا تو انہوں نے اپنا نام اور پتہ بتانے کے بعد اس سے یہ کہا کہ بہتر تو یہ ہے کہ مجھے گرفتار کر لو، اور پھانسی کے تختے پر لٹکا دو کہ سچ بولنے والے کا ہمیشہ یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ کوتوال ان کو حیرت سے دیکھنے لگا، اور اس کا کوتوالی کا گٹھا ہوا دبدبہ پلپلا ہوا کر اس کے کھلے ہوئے منہ پر لٹکنے لگا۔

ابھی درگاہ سے آ کر وہ گھر میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک وردی پوش نے آ کر کہا مہاراجہ کشن پرشاد بہادر تشریف لائے ہیں انہوں نے کہا بلا لو۔۔۔ مہاراجہ نے ان کے سامنے ایک ایک ہزار کے دس توڑے رکھ کر کہا مولوی صاحب یہ دس ہزار روپے سرکار والا تبار نے آپ کی جرأت ایمانی سے خوش ہو کر آپ کی خدمت میں بھیجے انہیں قبول فرما لیجئے۔

انہوں نے بڑی مسکنت سے کہا سرکار تک میرا شکریہ پہنچا دیجئے میں ان کا ایک ادنیٰ سانس خوار ہوں یہ ان کی شرافت کی بڑی دلیل ہے کہ سزا کے عوض وہ مجھ جو جزا دے رہے ہیں لیکن مہاراجہ سرکار کی خدمت میں جا کر عرض کر دیجئے کہ کلمہ حق فروختی نہیں ہوا کرتا اس لئے میں یہ روپیہ قبول نہیں کر سکتا مہاراجہ نے ان کو بڑی حیرت سے دیکھا فرط جذبات سے کچھ بول نہیں سکے ان کے ہاتھ چوم لئے اور سر جھکا کر رخصت ہو گئے۔

اس کے بعد شاہی فرمان نکلا کہ مولوی احمد حسین کو نوکری سے سبک دوش کر کے گھر بیٹھے تین سو روپے تا حیات دیئے جائیں اس کو بھی انہوں نے قبول نہیں کیا اور یہ لکھ بھیجا کہ میری نوکری بحال رکھی جائے میں تیس روپے ماہانہ میں اچھی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں مجھ کو تین سو روپے کی ضرورت نہیں۔

دیکھا آپ نے اس ہڈیوں کے مالے کا آہنی کردار؟ اس صدی میں اگر ان کا کوئی ہمسر گزرا ہو تو خدا را مجھے اس کے نام سے آگاہ کیا جائے۔

وہ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں اپنے سے کہا کرتا تھا۔

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ

کیا جانے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

ہمارے مابین بظاہر کوئی وجہ اشتراک نہیں تھی وہ تھے مناجاتی اور میں تھاندا خراباتی

خدا جانے وہ میری کون سی ادا تھی جس نے ان کا دل موہ لیا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ آپ

کا تمام کلام الہامی ہے اور آپ کی شراب نوشی مراقبہ ہے۔

حالانکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میری شاعری الہام ہے نہ میری شراب نوشی مراقبہ

ہے اب ان کا ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے جس کی نوعیت پہلے واقع سے بالکل مختلف

ہے اور جس کو میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں۔

مجھ پر خدا کے فضل و کرم سے جب شاہی عتاب بجلی کی طرح گرا تو وہ ایک دن

میرے پاس آئے اور پوچھا آپ کے اخراج مبارک میں اب کتنے دن باقی ہیں میں

نے کہا صرف آٹھ دس دن انہوں نے کہا تو پھر ایسا کیجئے کہ اس اثناء میں آپ میرے

پاس ہر شام کو دو گھنٹے کے لیے آجایا کیجئے اس لئے کہ مجھے آپ کے کانوں تک چند ایسے

نکات پہنچانا ہیں جو فقط آپ تک پہنچا دینے کے واسطے مجھے ودیعت فرمائے گئے ہیں

میں نے کہا مولوی صاحب جھٹپٹے کے سانولے رنگ کی چھاؤں میں تو میں کالا 1 پانی پیا

کرتا ہوں انہوں نے کہا کوئی پروا نہیں آپ میرے سامنے بیٹھ کر پی سکتے ہیں آپ میری



باتیں سن سن کر جس قدر بھی کالا پانی پیئیں گے اسی قدر گورے ہوتے چلے جائیں گے۔  
چنانچہ اسی دن شام ہوتے ہی میں ہینڈ بیگ میں بوتل، پیانہ، گلاس، گھڑی اور اگر  
بتیاں ڈال کر ان کے وہاں پہنچ گیا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور کہا آئیے میرے ساتھ میں نے آپ سے  
باتیں کرنے کے لئے دس دن کے واسطے یہیں پڑوس میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا  
ہے میں نے کہا شاید اس لئے کہ آپ کے گھر میں بادہ نوشی نہ کی جائے انہوں نے کہا  
نہیں یہ بات نہیں ہے میں جو باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ باتیں آپ  
کے سوا اگر کسی اور کے کان میں پڑ گئیں تو وہ گم راہ ہو کر رہ جائے گا آپ کو معلوم ہے کہ  
عرق گل جسے گلاب کہا جاتا ہے بیمار کے جسم میں داخل ہو کر بلغم اور تندرست کے جسم  
میں حیات آفریں ہو جاتا ہے یہی حال بعض خیالات کا ہے کہ وہ نادان کے لئے زہر  
اور دانا کے لئے تریاق بن جاتے ہیں۔

### 1 شراب

الغرض آٹھ دس دن تک برابر انہوں نے بڑے ٹھوس مسائل مجھ کو سمجھائے یہ بھی  
بتایا کہ عبادات مقصود بالذات نہیں بلکہ ذریعہ مقاصد ہیں اور اسی لپیٹ میں الفاظ کے  
داخلی و خارجی معانی و مفہیم عوام و خواص کے جداگانہ احکام تنزیہی و تشبیہی نکات اور  
محرم اول کے مجازی و حقیقی تخیل پر بھی روشنی ڈالی اور اسی کے ساتھ ساتھ تکوین و تخلیق  
ارتقاء و بقائے اصلح مادہ و روح طریقت و شریعت، جزا و سزا، جہنم و جنت، روح و مادہ،  
جبر و قدر، امر و نواہی، معاش و معاد، حیات و موت، قضاء و قدر، واجب و ممکن اور  
ذات و صفات کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا کہ ان پر کھ ملاؤں کی بارگاہ  
سے با آسانی کفر کا فتویٰ صادر کیا جاسکتا ہے سب سے زیادہ انہوں نے زور دیا انفس و  
آفاق کی وحدت پر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہم خدا کے تصور سے دست بردار بھی ہو  
جائیں پھر بھی موجودات کی وحدت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تمام کائنات عینیت کی

زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے غیریت کا کہیں وجود ہی نہیں ہے اسماء و اشکال کے حجابات ہم کو دھوکا دیتے ہیں اور ان حجابات کو ہٹا دیں تو معلوم ہو جائے گا کہ تمام کائنات کی تکوینی ماہیت ایک ہے خواہ ہم روحانی نقطہ نظر سے دیکھیں خواہ مادی ہم کو وحدت الوجود کا قائل ہونا پڑے گا اس لئے کہ کونین ایک حقیقت واحدہ کثیر الاسماء والا اشکال ہے۔

اسی کے دوش بدوش انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسلام نے جو تو حید پر اس قدر زور دیا ہے اس کا منشاء بھی صرف اس قدر ہے کہ لوگ اپنے کو ایک باپ کے بیٹے اور ایک دوسرے کو حقیقی بھائی اور بہن سمجھیں اور اگر خدا میں تعدد ہو جائے گا تو لوگ سکے بھائی بہن نہیں رہیں گے جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی وحدت درحقیقت انسان و آفاق کی وحدت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

ان راتوں کی آخری رات بڑی عجیب ہو گئی تھی وہ یکا یک خاموش ہو گئے اور پھر ہاتھ ہلا ہلا کر ارے تو بہ ارے تو بہ کے نعرے لگانے لگے میں ان سے بے تکلف ہو چکا تھا میں نے کہا ارے یہ مجازیب کے سے شندے آپ کیا کر رہے ہیں انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھ سے کہا میرا عثمان علی خان کا مال دیکھ رہا ہوں تو بہ تو بہ، یہ خون خرابے، یہ ذلتیں یہ بے چارگیاں میں نے کہا، جناب والا میں ان شعبدوں کا قائل نہیں، انہوں نے کہا میرے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا۔۔۔ یہ کہا اور وہ سر جھکا کر پھر خاموشی کے سمندر میں ڈوب گئے، میں حیران ہو گیا کہ یہ آج انہیں ہو کیا گیا ہے ابھی میں نے اپنا آخری جام ختم کیا تھا کہ انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے گھورنا شروع کر دیا میں نے کہا حضرت یہ آج آپ کو ہو کیا گیا ہے انہیں یہ سن کر جھرجھری آئی میں ہنسنے لگا وہ سنجیدہ رہے اور مجھ سے پوچھا احادیث کے باب میں آپ کا کیا خیال ہے میں نے جواب دیا کہ عہد بنو امیہ میں تسلیک احادیث کی ایسی زبردست دارالضرب کھول دی گئی تھی اور ایسی ایسی جھوٹی حدیثیں وضع کی گئی تھیں کہ اب جھوٹی سچی حدیثوں

میں فرق کرنا بے حد مشکل ہو چکا ہے احادیث کی اب یہ صورت ہو گئی ہے جیسے پلاؤ کی دیگ تو دوں سے اتار کر زمین پر رکھ دی گئی ایک کتے نے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر دیا پیشاب کیت طرے هوا سے اڑ کر دیگ میں پہنچ گئے یہ صحیح ہے کہ ہر چانول ناپاک نہیں ہوا لیکن ہر چانول مشتبہ ضرور ہو کر رہ گیا انہوں نے پوچھا پھر صحت احادیث کا معیار آپ کے نزدیک کیا ہے میں نے کہا لے دے کے صرف یہی ایک معیار ہے کہ جو احادیث قرآن کے آیات و مزاج کے مطابق ہیں ان کو صحیح اور اس صورت حال کے برعکس احادیث کو غلط سمجھا جائے۔

انہوں نے کہا بے شک یہ معیار بہت اچھا ہے لیکن اس سے بھی اچھا معیار آپ کو بتاؤں؟ میں نے کہا ضرور بتائیے انہوں نے کہا اس کا کبھی خطا نہ کرنے والا معیار ہے ذات رسول میں نے کہا ان کی وفات کے بعد اس معیار سے کام لیا ہی نہیں جاسکتا انہوں نے جواب دیا کہ ظاہری وفات سے کچھ نہیں ہوتا رسول آج بھی اسی طرح زندہ ہیں جیسے کل تھے میں نے کہا یہ آپ کیسی باتیں کرنے پر اتر آئے ہیں خیریت تو ہے مزاج کیسا ہے وہ مسکرائے اور کہنے لگے میاں جوش یہ دو باتیں آپ کے واسطے مقدر ہو چکی ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آپ اپنی عمر کے دور آخر میں داخل ہو جائیں گے قدرت آپ سے ابلاغ توحید کا کام لے گی آپ انفس و آفاق کی وحدت کا آواز بلند کریں گے اور وہ آواز وحدت الہی تک جائے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ کو کسی حدیث کی صحت میں شک ہوگا آپ براہ راست خود رسولؐ سے جا کر پوچھ لیں گے۔

یہ سن کر میں نے بہت زور سے قہقہہ مارا، اور کہا مولانا یہ آخری رات دیوانگی کی رات ہے نوراتوں تک تو آپ معقول رہے اور آج مجذوبوں کی سی بڑ مار رہے ہیں آپ کا وائی قدرت اور مجھ سے کام لے اور رسولؐ کو زندہ فرما کر مجھے ان کی سرکار تک پہنچائے آپ کو میرے تشکک کا بخوبی علم ہے اب رہے میرے اعمال، سو آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ کے سامنے بیٹھا شراب پی رہا ہوں یعنی اسلامی نقطہ نظر سے

میرے افکار اور میرا کردار ایسا ہے کہ آپ کا خدا مجھ کو پسند ہی نہیں کر سکتا اور اس حالت میں آپ کی یہ پیش گوئی قطعی طور پر غلط ہے۔

میری یہ بات سن کر وہ اچھل پڑے کہنے لگے تشکک مزدبان معرفت ہے، جو آپ کو بام یقین تک ایک روز پہنچا دے گا اب رہی آپ کی بادہ خواری سو میں کہہ چکا ہوں کہ یہ آپ کا مراقبہ ہے اپنی شراب کو آپ گناہ سمجھ رہے ہیں، ایسا بولنا گناہ ہے۔

میں نے پھر قہقہہ مار کر کہا، آج کی رات تو بڑے مزے کی رات ہے پی میں رہا ہوں اور بہک آپ رہے ہیں وہ ہنسنے لگے اور کہا آپ کے قہقہے قضا و قدر کے دھارے کو نہیں موڑ سکتے، جو کچھ پیش آنے والا ہے آپ خود دیکھ لیں گے میں نے کہا اب میں اجازت چاہتا ہوں آئیے گلے مل لیں، پھر دیکھئے کبھی ملاقات ہوتی ہے کہ نہیں انہوں نے بڑی گرمجوشی سے گلے لگا کر کہا میں ایک مہینے تک خواب میں آپ کے پاس آتا رہوں گا اور جب آپ مطمئن ہو جائیں گے خواب میں آنا ترک کر دوں گا اور ہاں یہ بھی سن لیجئے کہ اپنے انتقال سے پورے چھ مہینے پیشتر آپ جہاں کہیں بھی ہوں گے آپ سے ملنے آؤں گا۔

چنانچہ انہوں نے جو کہا تھا وہی کیا ایک ماہ برابر وہ میرے خواب میں آتے اور ہدایتیں کرتے رہے اور انتقال سے چھ مہینے پیشتر دہلی میں آ کر مجھ سے مل بھی لئے یہ کیا ظلم تھا، میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا ہے یا تو یہ میرے ذہن کی طاقت تھی جو برابر مجھے خواب دکھاتی رہی یا ان کا تصرف تھا کوئی فیصلہ کرے لیکن موت سے ٹھیک چھ مہینے قبل آنا یہ تو ایسی بات ہے جس کو میں اپنے ذہن کی کارکردگی سے قطعاً منسوب نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا جہل مجھ کو ہلاک کر کے چھوڑے گا۔



## نواب زادہ مصطفیٰ علی خاں

میرے چچا نواب محمد علی خاں، تعلقہ دار ”سہلामو“ کے فرزند یعنی میرے چچا زاد بھائی لیکن بھائی کم اور دوست بہت زیادہ ہیں اگر وہ فقط بھائی ہوتے تو ان سے ڈر لگتا اس لئے کہ میرے خاندان کے بھائی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

وہ جوانی میں نہایت خوب رو تھے چچا نے ان کو بڑے ناز و نعم سے پالا اور مسوری کے انگلش اسکول میں داخل کر کے یہ چاہا تھا کہ وہ علم حاصل کر لیں لیکن بد شوق تھے اسکول سے گھبرا کر گھر آ گئے اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔

چچا جان ان کو بہت چاہتے تھے لیکن خلف اکبر نہ ہونے کی بناء پر ان کو تعلقہ دار نہیں بنا سکے تعلقہ داری ان کے بڑے بھائی حامد علی خان کو سونپی، لیکن ان کے ناماس قدر زمینیں، باغ اور گز ارہ لکھ دیا کہ اگر وہ جائیداد باقی رہ جاتی تو کئی پشتوں تک چلتی۔۔۔۔۔ لیکن صد حیف کہ میرے بھائی کی افتاد طبع نے وہ تمام جائیداد برباد کر ڈالی۔ اور اب وہ لکھنؤ میں راجہ صاحب سلیم پور کی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بڑی اداسی کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔

آسمان را حق بود، گر خوں ببارد بر زمیں!

اب ان کی داستان بربادی بھی سن لیجئے اور اس امر پر بھی غور کیجئے کہ جذبات کا طوفان انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے خدا بخشے ان کے باپ چونکہ بے حد حسن پرست تھے، حسین عورتوں اور طوائفوں سے ان کا گھر بھرا رہتا تھا اور چونکہ مصطفیٰ علی کا لڑکپن ان حسینوں کی زلفوں کی چھاؤں میں بسر ہوا تھا اس لئے بچپن ہی سے وہ تماش بینی کے سانچے میں ڈھل چکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باپ کے مرتے ہی وہ ایسے کھل کھیلے کہ گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

سب سے پہلے وہ سندیلے کی ایک طوائف پر اب تو ہر سانس مری آپ کا افسانہ ہے کی حد تک رتجھ گئے جب وہ مر گئی کچھ روز اس کا سوگ منانے کے بعد پھر تو انہوں

نے سینکڑوں طوائفوں پر یکے بعد دیگرے مرنا شروع کر دیا اور جائیداد دھڑا دھڑا بکنے لگی۔

خبر کرو، مرے خرمین کے خوشہ چینوں کو!

ان کو بربادی کی شاہراہ پر سرپٹ دوڑتے دیکھ کر ان کے قرابت داروں اور بھئی خواہوں نے لاکھ سمجھایا کہ دیکھو بھائی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ عیاشی کرو، مگر بجٹ بنا کر اپنے حدود میں رہو لیکن وہ نہیں مانے اور سمجھانے والوں سے جھڑک جھڑک کر کہا کہ خاں صاحب فضول خرچی ہماری عادت میں داخل ہے آئندہ نہ سمجھائیے گا ورنہ قطع تعلق کر لوں گا۔

وہ جب اپنی زمین کا کوئی ٹکڑا فروخت کرتے، اور روپیہ ان کی جیب میں آتا تو دس منٹ ضائع کئے بغیر وہ ریل ٹیکسی بس تانگے یا کے میں بیٹھ کر ”گولڈن نائٹ“ (شب زریں) منانے کے واسطے لکھنؤ چلے جایا کرتے تھے تاکہ ان کی جیب کے سکوں اور ”گولڈن نائٹ“ کے لمحوں کے مابین کوئی فصل پیدا نہ ہونے پائے۔

اور جب ان کے پاس پانچ سات روپے باقی رہ جاتے تھے تو اعلیٰ سگریٹ کے بدلے بیٹری پیتے ہوئے ملیح آباد آ جاتے اور تقریباً فاقے کرنے لگتے اور اس عالم میں اپنے بچوں کے اترے چہرے دیکھ کر روتے، اور اسراف سے توبہ کیا کرتے تھے لیکن جیسے ہی باغ یا زمین کے کسی دوسرے حصے کے فروخت کر دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو اپنے فاقوں میں اپنے بچوں کے اترے چہروں کو فراموش کر کے وہ بڑی گھبراہٹ کے ساتھ پھر گولڈن نائٹ منانے کے واسطے لکھنؤ چلے جاتے تھے۔

ایک بار وہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے جائیداد کے خریداروں نے یہ سوچ کر کہ وہ ہر حالت میں جائیداد بیچ ڈالنے پر بری طرح تلے ہوئے ہیں خریداری سے انکار کر دیا تھا تا کہ وہ دس ہزار کی زمین دو ہزار میں فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں اس زمانے کے چائے کے سیٹ اور چاندی سونے کے برتن بیچ بیچ کر انہوں نے اپنا اور

اپنے تینوں بچوں کا پیٹ پالا اور ہر آن رو یا کرتے اور قسمیں کھاتے تھے کہ اب روپیہ  
برباد نہیں کروں گا۔

لیکن ایک روز لکھنؤ کے چوک کی اس قدر یاد آئی کہ انہوں نے اپنی تمام جائیداد  
اونے پونے مولی گا جر کی طرح بیچ ڈالی اور روپیہ ہاتھ آتے ہی گولڈن مائٹ منانے  
کے واسطے فوراً لکھنؤ چلے گئے اور جب پانی پانی خرچ ہو گئی تو منہ لٹکائے ہوئے ملیح آباد  
گئے تینوں بچوں کو گلے لگا لگا کر اس قدر روئے کہ پڑوسیوں کے مکان گونجنے لگے اور  
دل دہلنے لگے۔

جائیداد تو ختم ہو گئی تھی اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کھائیں گے کیا معلوم نہیں انہوں  
نے وہ مصیبت کا دور کیوں کر گزارا اور کھانا کیوں کر کھایا۔۔۔۔۔ اس اثناء میں جب  
برکھارت آگئی پانی رم جھم برسنے لگا کونکلیں کو کٹنے اور پیسے بولنے لگے تو ان کو انگریزوں  
پر انگریزیاں آنے لگیں انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کئی لاکھ روپے کے محل کو جو باپ  
نے ان کو عطا فرمایا تھا اور جس کی صرف دو منزلہ ڈیوڑھی کی قیمت دس ہزار تھی صرف  
تین ہزار رپلیوں میں بیچ ڈالا اور روپیہ جیب میں آتے ہی بلاتا خیر گولڈن مائٹ  
منانے کے واسطے لکھنؤ روانہ ہو گئے کڑم کڑم کڑم دھم

آواز دو کہ جنس دو عالم کو جوش نے  
قربان یک تبسم جانا نہ کر دیا

☆☆☆☆☆☆☆☆

## زابد علی خاں

وہ بھی ہمارے ملیح آباد کے کاہ جسم، کوہ عزم، آہن کردار، آفتاب کوب، خوف نا آشنا، بات کے پکے، دھن کے پورے، ضد کے سچے، طبعاً شب نم خو، غضباً شعلہ مزاج، جھک کر ملو تو شاخ سایہ دارا کڑو تو اپنی تلوار، بانکے ہر چھے، ٹیلے اور بڑے جیوٹ اور بے حد جھلاہٹ کے پٹھان تھے۔

انہیں اپنے بھائی غالب علی خان سے جو بقید حیات ہیں، بڑی محبت تھی، لیکن باپ کے مرنے کے بعد انہوں نے اپنے اس چہیتے بھائی کو جائیداد سے محروم کر کے اس کے شرعی و قانونی حصے پر قبضہ کر لیا تھا وہ بے ایمان اور بدنیت انسان نہیں تھے پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا، اس کی علت بھی سن لیجئے۔

باپ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نے ان سے کہا بھیجا کہ بھائی صاحب جائیداد کا بٹوارہ کر کے میرا حصہ مجھے دے دیجئے یہ پیام سن کر وہ جامے سے باہر ہو گئے انہوں نے کہا میں تو باپ کے بعد اس کو اپنا بھائی نہیں بیٹا سمجھتا تھا اور ارادہ کر چکا تھا کہ اس کو آدھے سے زیادہ حصہ دوں گا لیکن اب چونکہ اس نے غیریت برت کر بٹوارے کا پیغام بھیج دیا ہے اس لئے جب تک میں زندہ رہوں گا بٹوارہ نہیں ہونے دوں گا غلبوا (غالب کی تصغیر) سے کہ وہ جو چاہے کر کے دیکھ لے میں اس کے حصے کے باغوں اور زمینوں پر عمر بھر قابض رہوں گا اب اس کی جائیداد ”جائے داد پدر“ نہیں ”جائیداد دگر“ ہو چکی ہے۔

غالب علی خان نے یہ جواب سن کر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا مقدمے میں کوئی پیچیدگی تو تھی ہی نہیں دو چار پیشیوں کے بعد فیصلہ ہو گیا۔ اور جس وقت جج نے یہ حکم سنایا کہ آدھی جائیداد غالب علی خان کے نام کر دی جائے تو انہوں نے کہا جج صاحب آپ کا یہ فیصلہ آپ کے کاغذات تک محدود رہے گا۔ اس سے جائیداد پر، ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑ سکے گانج نے کہا خان صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں انہوں نے کہا میں یہ



کہہ رہا ہوں کہ جس دن آپ کی طرف سے جائیداد کا ہٹا رہا ہو کر، خندقیں کھودیں جائیں گی اور حد بندی کے پتھر نصب کر دیئے جائیں گے اس کے دوسرے ہی دن زاہد علی خان تمام خندقوں کو بھروا کر اور حد بندی کے تمام پتھروں کو دور پھینک کر پھر پوری جائیداد پر قبضہ کر لیں گے اور آپ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

جج نے کہا خان صاحب آپ عدالت کی توہین کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا آپ کو معلوم ہے؟

انہوں نے انتہائی بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر کہا مجھ کو سب معلوم ہے، لیکن اس سے کچھ ہو گا نہیں غلبو کو جائیداد نہیں مل سکے گی قبضہ تو زندگی بھر زاہد علی خان ہی کا رہے گا۔

جج نہایت شریف آدمی اور پٹھانوں کا مزاج شناس و ہمدرد تھا اس نے کہا خان صاحب آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔۔۔۔۔ انہوں نے کہا یہ کام زخموں کا ہے اور جب مجبور ہو کر، اس نے ان کو تین مہینے کی سزا کا حکم سنا دیا تو انہوں نے کہا بہت اچھا منظور، لیکن اس میرے خدمت گار ”چنوا“ کو بھی جو میرے پیچھے کھڑا ہے تین مہینے کی سزا دے دیجئے ورنہ وہاں میرا حقہ کون بھرے گا جج کو ہنسی آگئی اس نے کہا جو شخص جرم نہ کرے اس کیوں سزا دی جاسکتی ہے، انہوں نے یہ کہہ کر جج صاحب بھلا جرم میں دیر ہی کیا لگتی ہے خدمت گار کو حکم دیا ابے چنوا کھول دے پاؤں مجامہ اور کر دے پیشاب۔

چنوا نے فوراً دھل دھل پیشاب کر دیا اس کو بھی تین مہینے کی سزا ہو گئی اور وہ اس کو ساتھ لئے جیل چلے گئے صبح کو جب رول کال کے وقت جیلر نے آواز لگاری، زاہد علی حاضر ہے؟ تو انہوں نے کہا ابے گیدی خر، زاہد علی خان تشریف رکھتے ہیں کہہ کر پکار، ہم کوئی چوری چکاری کر کے تو جیل میں نہیں آئے ہیں، ہم کو تو یہاں انتظاماً بھیجا گیا ہے، جیلر کوئی بھلا آدمی تھا، ان کی پھٹکار سنی، اور پی گیا۔

جیل کاٹ کر جب باہر آئے سیدھے لیچ آباد پہنچے پہنچتے ہی ہٹا رہے کے تمام آثار

مٹا کر پھر پوری جائیداد پر قابض ہو گئے پھر مقدمہ چلا پھر سزا ہوئی پھر چنوا کو اسی طرح  
ساتھ لیا اور سزا کاٹ کر جب پھر آئے تو پھر بھائی کی جائیداد پر قبضہ کر لیا اور جب تک  
وہ مر نہیں گئے ہوا رہ ہو ہی نہیں سکا۔

میرے نزدیک ”بالک ہٹ راج ہٹ“ اور ”تریا ہٹ“ میں اگر پٹھان ہٹ کو بھی  
شامل کر لیا جائے تو یہ اضافہ نہایت مناسب رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆



## میر باریق لکھنوی

لکھنؤ کی وضع داری کے مکمل نمونے پچاسی برس کی عمر میں بھی خوبصورت چلتے پھرتے دو چار میل روز ٹہلتے، اوسط درجے کے شاعر، اعلیٰ درجے کے انسان، اور چنداں کہ خدا غسیت، مہتاجیم کی حد تک نادار اور اس پر بھی صاحب کردار۔

ایک بار میرے باپ نے تھکنے میں ان سے پوچھا میر صاحب یہ کیا بات ہے کہ آپ میرے پاس روز تشریف لاتے لیکن ایک بار بھی میرے ساتھ کھانا تناول نہیں فرماتے ہیں پہلے تو انہوں نے احترام افلاس کے باعث ٹالنے کی سعی کی لیکن جب میرے باپ نے اصرار کیا تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر جواب دیا کہ خاں صاحب آپ کے دسترخوان پر آپ کے جو احباب دونوں وقت کھانا کھاتے ہیں میرا معاملہ ان سے مختلف ہے میرے باپ نے کہا میں آپ کی بات نہیں سمجھتا تفصیل فرمائیے: انہوں نے کہا شرم کی بات ہے، میں کہنا نہیں چاہتا، میرے باپ نے اپنے سر کی قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے سر جھکا کر کہا خاں صاحب اصولی بات یہ ہے کہ اگر میں آپ کے پاس دس بار کھانا کھاؤں تو مجھ پر لازم ہے کہ کم از کم ایک بار تو آپ کو بھی مدعو کروں، لیکن میں اس قدر مفلس ہوں کہ کھانا تو درکنار، آپ کو چائے بھی پلا نہیں سکتا، اس لئے کیا منہ لے کر، آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں؟

ان کی یہ بات سن کر میرے باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہا میر صاحب آپ نے مجھ سے غیریت برت کر اب تک مجھ سے یہ بات پوشیدہ رکھی، اس کے جواب میں انہوں نے ایک رباعی سنائی۔

اں کس کہ کباب می خورد، می گزرد  
اں کس کہ شراب می خورد، می گزرد  
سرد کہ بکاسہ گدائی، ناں را  
تر کردہ باب می خورد، می گزرد

یہ سن کر میرے باپ نے میرے کان میں کہا جاؤ اپنی ماں سے پچیس اشرفیاں لے آؤ لیکن رومال میں لپیٹ کر لانا جب میں اشرفیاں لے آیا میرے باپ نے مجھ سے فرمایا باہر چلے جاؤ میں باہر جا کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا، میں نے دیکھا کہ میرے باپ کھڑے ہو گئے اور وہ اشرفیاں، رومال پر رکھ کر، اس طرح ان کے سامنے پیش کیں، جیسے کسی بادشاہ کو نذر دی جاتی ہے۔ میرے باپ کی اس پیش کش کو دیکھ کر وہ تلملا کر کھڑے ہو گئے اور بھرائی آواز میں کہنے لگے خاں صاحب ہم سادات پر صدقہ حرام ہے، میرے باپ نے کہا میر صاحب آپ برادرانہ پیش کش کو صدقہ کا نام دیتے ہیں خون حسین کا واسطہ اس کو قبول فرما کر مجھ کو عزت بخشیے یہ سن کر وہ رونے لگے اور کہا خون حسین کی قسم میں اسے قبول نہیں کروں گا اور آپ نے اصرار کیا تو آپ کی خدمت میں آنا جانا ترک کر دوں گا۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد وہ میرے باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ خدمت گار مٹھائی کا تھال لئے آئے تھال احباب میں گردش کرنے لگے، اور جب ان کے سامنے تھال آیا تو چونکہ ان کی وضع میں یہ بات داخل تھی کہ وہ کسی کے وہاں کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے اس لئے انہوں نے خدمت گار کو دوسری طرف تھال لے جانے کا اشارہ کیا، میرے باپ نے کہا میر صاحب آپ کو معلوم ہے کہ آج محرم کی ساتویں تاریخ ہے، کیا آپ حضرت امام حسینؑ کی نذر سے بھی انکار فرما دیں گے۔

یہ سن کر انہوں نے برنی کی ایک ڈلی اٹھالی برنی ابھی ان کے ہاتھ میں ہی تھی کہ حامد علی خان بیرسٹر آگئے اور خلاف وضع ان کے ہاتھ میں برنی کی ڈلی دیکھ کر انہوں نے مزاحیہ انداز میں پکار کر کہا میر باریق صاحب دیکھ لیا یہ سنتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور برنی کی ڈلی فوراً تھال میں رکھ دی یہ دیکھ کر حامد علی خان کے ہوش اڑ گئے، دوڑ کر، انہوں نے ان کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا میر صاحب یہ تو مزاح المومنین کے زمرے کی بات تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ آزرده ہو جائیں گے، حضرت



عباس کی قسم معاف فرما دیجئے انہوں نے کہا بیرسٹر صاحب آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ  
آپ کی یہ آواز، کوٹھے سے گری تھالی کی مانند، مڑک تک پہنچ جائے گی، اور سننے والے  
یہ سوچنے لگیں گے کہ خدا جانے بارق کون ایسا فعل شیع کر رہا تھا، کہ بیرسٹر صاحب یہ  
کہنے پر مجبور ہو گئے کہ بارق صاحب دیکھ لیا اب جب تک جھپٹا نہیں ہو جائے گا میں  
نیچے نہیں اتروں گا یہ تھی لکھنوالوں کی تہذیب اور یہ تھا ان کی عزت نفس کا معیار!!

☆☆☆☆☆☆☆☆



## منشی واحد علی ابرقذوائی

نہایت وجیہہ اور نہایت کلمے ٹھلے کے انسان تھے، چہرہ شاداب تھا، سر پر گنجان پٹے تھے، منہ پر گھنی داڑھی تھی، ریسانہ ٹھاٹھاٹ تھا، ہر کار رام پور میں میر منشی تھے شان دار انگرکھا اور بانکی ٹوپی ان کی خاص دھج تھی۔

ایک بار جب میں رام پور گیا تو چونکہ وہ میرے باپ کے دوست تھے ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا بڑی محبت سے پیش آئے کہا میں اس وقت ایک نہایت ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں لیکن میاں کل میرے ساتھ کھانا کھانا۔۔۔۔۔ دوسرے دن چھوٹے دادا کو لے کر وہاں پہنچا۔۔۔۔۔ انہوں نے شاہی کھانا کھلایا کھانے کے بعد وہ ہم کو دوسرے کمرے میں لے گئے وہاں یہ دیکھا کہ ہر کرسی کے پاس ایک چھوٹی سی میز، اور ہر میز پر سوڈے کی دو بوتلیں، اور چورن کی ایک ایک شیشی رکھی ہوئی ہے اور سامنے تختوں کا چوکا لگا ہوا ہے۔۔۔۔۔

جب ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو وہ تخت پر متمکن ہو کر، مختلف صندوقوں سے غزلوں کے پرچے نکال نکال کر، تاروں میں لٹکانے لگے۔۔۔۔۔ ابھی ان کا وہ عمل جاری تھا کہ ان کے چھوٹے بھائی منشی احمد علی شوق ایک بڑی لمبی سی بیاض لئے آ گئے اور چھوٹے بھائی کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر اپنا کلام سنانے لگے اور خدا جھوٹ نہ بلائے، ایک سانس میں ساٹھ ستر غز لیں سنا ڈالیں۔ وہ اور بھی سناتے مگر یہ دیکھ کر کہ چھوٹے بھائی کی غزلوں کے پرچے، چھ سات جھاڑوں کی مانند، تاروں میں لٹک چکے ہیں، اور ان کے ہونٹ فیر کرنے کے لئے بار بار کھل رہے ہیں، انہوں نے بادل نحواستہ اپنی بیاض بند کر دی۔ اور اس کے فوراً بعد ابر صاحب نے جسم کے تین تین جھٹکوں، اور آواز کے چار چار کھٹکوں کے ساتھ گرجنا، برسنہ، شروع کر دیا اور ہماری داد کی آوازوں سے چھت گونجنے لگی۔

ہر غزل سنانے سے پیشتر وہ یہ کہتے تھے کہ جوش میاں، یہ دیکھئے میرے رنگ میں

غزل کہی ہے اور یہ غالب، ناسخ، آتش، مومن اور مصحفی کے رنگ کی غزل ہے اور میں  
بار بار دل میں کہتا تھا کہ یہ کیسے شاعر ہیں جو ہمیشہ دوسرے شعراء کے رنگ میں کہتے  
ہیں اور ان کا ذاتی رنگ ہے ہی نہیں۔

جب رات کے بارہ بج گئے تو چھوٹے دادا کی قوت برداشت نے جواب دے دیا  
وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں اب تو ہمارا دم نکلا جا  
رہا ہے، السلام علیکم یہ کہہ کر انہوں نے چک اٹھائی اور باہر نکل گئے۔۔۔۔۔ ان کی اس  
حرکت سے مجھ پر گھڑوں پانی پھر گیا میں نے کہا ابر صاحب قبلہ چھوٹے دادا بڑے اجڑ  
پٹھان ہیں، معاف کیجئے کہ میں ان کو ساتھ لے کر یہاں آ گیا انہوں نے جھپٹی  
مسکراہٹ سے کہا مجھ کو حیرت ہے پٹھانوں میں آپ اور آپ کے والد گرامی کیسے پیدا  
ہو گئے آپ اس کا خیال نہ کریں سوڈے کی بوتلیں اور چورن کھالیں تاکہ غذا ہضم ہو  
جائے۔

اب مجھ کو معلوم ہوا کہ چونکہ ہم کو دیر تک جگانا تھا اس لئے سوڈا اور چورن رکھ دیا  
گیا تھا میں نے چورن کھا کر ابھی سوڈا پیا ہی تھا کہ انہوں نے پھر کلام سنانا شروع کر  
دیا۔

اب رات کے تین بج گئے، میرے اور حاضرین کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے  
لگیں دادا کی آوازوں میں ضعف آ گیا اور ہمارے گلوں سے بقرعید کے ترساں  
بکروں کی سی بھائیں بھائیں نکلنے لگی لیکن وہ غزلیں پڑھتے رہے آخر کار جب پو پھٹنے  
اور اذان کی آوازیں گونجنے لگیں تب انہوں نے ہمارے دادا سے چھلے ہوئے گلوں کی  
چمر آوازوں اور شب بیداری کے روندے ہوئے چہروں کا اندازہ لگا کر ارشاد فرمایا  
شاید آپ لوگوں کو نیند آرہی ہے اچھا خدا حافظ، لیکن یاد رکھئے کل بھی آپ یہیں کھانا  
کھائیں گے۔

ہم کھد بداتی کھوپڑیوں اور سنسناتے اعصاب کے ساتھ کمرے سے نکل کر جب

سواری کی طرف جانے لگے تو شوق صاحب نے کہا آپ سب حضرات میرے کمرے میں تشریف لے آئیں یہیں منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ فرمائیں پھر جا کر سو رہیں یہ دعوت سن کر ہماری پنڈلیاں کانپنے لگیں لیکن اودھ کی وضع داری ہمارے کان پکڑ کر، ہم کو ان کے کمرے میں لے کر چلی گئی وہاں پہنچ کر ہم نے حوائج ضروری سے فراغت کی اور منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا ناشتہ ختم کر کے ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ شوق صاحب نے اپنی بیاض کھول دی اور ہم کو غزلوں پر دھریا میرا عالم یہ ہو گیا کہ مجھے اس کا پتہ نہیں رہا کہ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر، اور یہ قدوائی صاحب کلام سنار ہے ہیں یا اونٹ بول رہا ہے۔

اس کے بعد میں نے یہ بات دل میں ٹھان لی کہ مر جاؤں گا لیکن ان دونوں بھائیوں کے پاس بھی نہیں پھنکوں گا اب دو دو واقعات اور سن لیجئے میں قاضی خورشید احمد، ابرار حسن خاں، رفیع احمد خاں، مانی اور فانی کو لے کر علی گڑھ جوہلی میں شریک ہونے گیا ہوا تھا۔۔۔ ایک روز ڈاننگ ہال میں ہم لوگ پہنچے تو یہ دیکھ کر دم نکل گیا کہ وہاں ابر صاحب بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں ہم نے چاہا اٹے پاؤں نکل جائیں اتنے میں انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہم سب نے انہیں سلام کی انہوں نے ہمیں گلے لگایا اور اپنے پہلو میں بٹھالیا مانی صاحب نے میرے کان میں کہا ہم لوگ بہت آہستہ آہستہ کھائیں گے وہ پہلے سے کھا رہے ہیں ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہم سے پہلے اٹھ جائیں۔

ابر صاحب نے مجھے چکھی دینے کے واسطے کہا میاں جوش اب ہم بھی تمہاری طرح چڑیوں اور کھیتوں پر نظمیں کہنے لگے ہیں میں نے کہا کسی وقت حاضر ہو کر سنوں گا انہوں نے کہا ارے کسی وقت کی بات نہیں، اسی وقت آپ سب کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا میں نے کہا بہت اچھا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا ہم لوگوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکالنے اتنے میں وہ کھانے سے فارغ ہو کر ہمارے انتظار میں



پھانک پر جا کر کھڑے ہو گئے مانی نے کہا گھبرائیے نہیں ادھر اوٹ کے پیچھے ہاتھ دھونے چلئے تدبیر سمجھ میں آ گئی ہے۔

اوٹ کے پیچھے جا کر مانی نے چاکو سے قنات میں بڑا سا شگاف کر دیا اور ہم لوگ چوروں کی طرح اس شگاف سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بھاگے تو عین پھانک کے سامنے سے ابر نے ہم کو بھاگتے دیکھا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی اور چلا چلا کر انہوں نے کہا ارے میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں مہذب شعراء گیدڑوں کی طرح بھاگے چلے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ ارے ارے۔۔۔۔۔

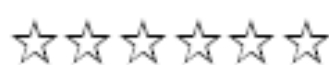
اب دوسرا واقعہ بھی سماعت فرمائیے۔۔۔۔۔ لکھنوکا ذکر ہے ایک بار ہم لوگ یعنی مولانا صفی، حضرت عزیز، نواب بن صاحب بلخ، منے مرزا صاحب شرر، محمد صاحب بہار، اور حکیم منے آغا صاحب فاضل ایک چھوٹے سے میدان کوٹ کر حامد علی خان بیرسٹر کی عیادت کو جا رہے تھے کہ دیکھا ابر صاحب گھوڑا گاڑی پر اسی طرف چلے آ رہے ہیں مولانا صفی نے ہم سب سے ارشاد فرمایا کہ اے مسیح کی بھیڑوں، اس اہلی کے تنے کے پیچھے دبک جاؤ، ورنہ یہ آنے والا بھیڑیا سب کو کھا جائے گا ہم سب تنے کی آڑ میں ایک دوسرے سے خوب مل کر کھڑے ہو گئے اور جب ان کی سواری درخت سے قریب ہو کر گزرنے لگی اتنے آدمیوں کو ایک درخت کیا چھپا سکتا تھا انہوں نے ہمیں دیکھ لیا گاڑی رکوا دی ہماری طرف آنے لگی ہمارے منہ تھپا کے سے ہو گئے۔

اور جب وہ قریب آ گئے تو ہم لوگ بڑے مدہانت آمیز تبسم کے ساتھ ان کے مقدم کے واسطے بڑے انہوں نے مسکرا کر پوچھا یہ اہلی کے نیچے کیا ہو رہا تھا؟ صفی صاحب نے کہا ذرا دم لینے کھڑے ہو گئے تھے اب یہاں سے حامد علی کی عیادت کے واسطے جائیں گے ابر صاحب نے کہا اس اہلی کی چھانوں کے نیچے میری ایک تازہ غزل تو سن لیجئے یہ سنتے ہی ہم سب بدحواس ہو گئے اور انہوں نے غزل شروع کر دی اور ہم

واہ واہ سبحان اللہ پر مجبور ہو گئے لکھنوکا معاملہ تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک بھیڑ سی لگ گئی اور بھیڑ والے بھی داد دینے لگے اور جب انہوں نے تیسری غزل شروع کر دی اور مجمع سے ایک آواز آئی ”ارے ابلی کے نیچے آم بک رہے ہیں“ تو مولانا صفی نے کہا راستے میں کلام سنانا لکھنوکا تہذیب اور آپ کی شان کے خلاف ہے ہم سب در دولت پر حاضر ہو جائیں گے اور خوب جی بھر کر آپ کے کلام سے فیض یاب ہوں گے بد مزہ ہو کر، جیب میں غزل رکھتے ہوئے ابر صاحب نے کہا تو پھر آپ تمام حضرات کل غریب خانے ہی پر افطار کریں اور خاصہ بھی تناول فرمائیں بات پکی ہو گئی نا؟ مولانا صفی نے کہا بالکل پکی بات اور ابر صاحب یہ کہہ کر دیکھئے میں آپ کو مولائے کائنات کی قسم دیتا ہوں کہ کل آپ حضرات ضرور تشریف لائیں رخصت ہو گئے۔

جب وہ ہم سے وعدہ لے کر چلے گئے تو صفی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جب ہم کو حسب وعدہ ابر صاحب کے وہاں جانا اور اس ماہ رمضان میں سولی پر چڑھنا ہی ہے تو یہ کیجئے کہ کل چار سو اچار بجے آپ سب غریب خانے پر آجائیے ابر صاحب میرے مکان کے قریب ہی گونگے نواب کی کوٹھی میں رہتے ہیں اور ہم سب: عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے کی صورت سے ایک ٹولی بنا کر چلیں گے۔

دوسرے دن حسب قرار وہم سب مولانا صفی کے وہاں پہنچے انہوں نے کہا آئیے ہم سب آپس میں گئے مل لیں خدا جانے پھر کبھی ملاقات ہوگی بھی کہ نہیں اور جب ہم لوگ گئے مل چکے تو انہوں نے زنا نے دروازے کی طرف منہ کر کے بڑے دردناک لہجہ میں کہا ”بیگم ہمارا کہا سنا معاف کرنا“ اور جب اندر سے آواز آئی، ہے ہے، کیا بات ہے، ارے جلدی کہئے، یا مولیٰ مشکل کشا دو تو مولانا صفی نے کہا ”ہم سب منشی واحد علی صاحب ابر کا کلام سننے جا رہے ہیں ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔۔۔۔۔۔ اور ہنستے ہنستے ہم سب کا برا حال ہو گیا۔۔۔“



## حکیم دانش لکھنوی

جسمانی حیثیت سے بے حد کمزور، اور شعری نقطہ نظر سے بڑے تگڑے تھے پہلے ان کے دو شعر سن لیجئے۔

رونے والے رو چکے اور ہنسنے والے ہنس چکے  
اک پرانا واقعہ ہے خانہ ویرانی مری

اپنی رفعت پر بہت عرش بریں کو ناز تھا  
مل گئی، سنگ در جاناں کو پیشانی مری  
مجھ کو آج تک ان کا آخری مشاعرہ یاد ہے اس مشاعرے سے کوئی ایک مہینہ پیشتر  
وہ ناپینا ہو چکے تھے اور ان کے اس شعر پر

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو، نہ مے خانے کو  
آخری دور ہے، بھر دے کوئی پیانے کو  
تمام حاضرین رونے لگے تھے اور مشاعرہ مجلس عزائیں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا  
وہ لکھنوی تہذیب کے مکمل اور آخری نمونے تھے ایک روز وہ حضرت عزیز کے  
وہاں بیٹھے تھے کہ ظریف صاحب آگئے اور آتے آتے انہوں نے کہا میری جیب کٹ  
گئی، اور مٹی بیگ غائب ہو گیا۔

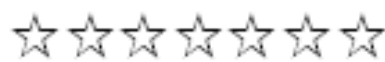
یہ سنتے ہی دانش صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، زبان سے ایک حرف بھی نہیں کہا  
جوتے پہنے، جریب اٹھائی اور اٹھ کر جانے لگے حضرت عزیز نے حیران ہو کر پوچھا  
حضرت (حضرت) خیریت تو ہے انہوں نے کہا عزیز صاحب خیریت ہوتی تو یہاں  
سے جاتا کیوں عزیز صاحب اور تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور پوچھا اللہ کچھ بتائیے کہ  
ماجر کیا ہے؟

انہوں نے کہا عزیز صاحب، لکھنؤ کا سا شہر، اور پھر آپ کی محفل ادب اور وہاں

فحاشی ہونے لگی۔

ظریف نے کہا قبلہ و کعبہ یہ آپ فرما کیا رہے ہیں، انہوں نے ظریف صاحب کی طرف نظر اٹھا کر پوچھا آپ نے یہاں آتے ہی کیا ارشاد فرمایا تھا؟ ظریف نے کہا میں نے آکر یہ سانحہ بیان کیا تھا کہ میری جیب کٹ گئی اور منی بیگ غائب ہو گیا، یہ سنتے ہی انہوں نے نعوذ باللہ، نعوذ باللہ عزیز صاحب اس نکتے کو پا گئے انہوں نے کہا حکیم صاحب انگریزی میں روپے کو ”منی“ کہتے ہیں، انہوں نے بات کاٹ کر کہا، حضت انگریزی سے ہمیں کیا غرض، ہماری زبان میں تو یہ لفظ فحش ہے لکھنؤ میں اور فحاشی، استغفر اللہ، استغفر اللہ، کہتے ہوئے صاحب سلامت لئے بغیر وہ فوراً چلے گئے ظریف اپنا سامنہ لے کر رہ گئے اور حضرت عزیز ان کی طہارت زبان پر سر دھننے لگے۔

ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھا صاحبزادے آپ کہاں رہتے ہیں میں نے کہا لاٹوش روڈ کی گلی میں انہوں نے لاٹوش روڈ سن کر منہ پیٹ لیا کہنے لگے میاں آپ کا سا شیریں مقال اور رہے ان ثقیل حروف کے اندر جہاں خیر سے ”ٹ“ بھی ہے ”ڑ“ بھی ہے اور ”ڈ“ بھی لاٹھونس روڈ جب تک آپ ان حروف ثقیل کے اندر رہیں گے میں آپ کے پاس ہرگز ہرگز نہیں آؤں گا لاٹھونس روڈ معاذ اللہ لاٹھونس روڈ تو بہ تو بہ استغفر اللہ!





## نواب رستم علی خاں مہر

وہ میری ماں کے بڑے بھائی اور میرے ماموں<sup>1</sup> تھے جب میں نے چاہا کہ ان پر قلم اٹھاؤں، تو میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا آپ ان کے حالات شوق سے لکھیں مگر ان کا نام تحریر نہ کریں، صرف ایک نواب صاحب لکھیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ آپ کے ماموں تھے ورنہ دونوں کی بے عزتی ہو جائے گی۔

لیکن یہ سوچ کر میں نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا کہ ماموں کے عیب سے بھانجا متاثر نہیں ہو سکتا اور ماموں کا عیب تو ایک قطعی نفسیاتی بیماری کا نتیجہ تھا، اور نفسیاتی بیماری کو عیب میں شمار نہیں کیا جاسکتا اس لئے میں نے ان کا نام اور اپنا رشتہ بیان کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا۔

وہ ریاست دھول پور کے سب سے بڑے جاگیردار تھے ان کی شادی نواب صاحب رامپور کے خاندان کی دلبری بیگم سے ہوئی تھی جو شادی کے کچھ روز کے بعد ماموں سے روٹھ کر رام پور چلی گئی تھیں اور پھر کبھی پلٹ کر نہ آئیں۔

ماموں جان شاعری میں میرنفس اور درسیات میں مفتی میر محمد عباس کے شاگرد تھے رئیسوں کو بالعموم علم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، مگر وہ علم کے پرستاروں میں

---

<sup>1</sup> میرے تین سوتیلے ماموں نواب محمد اکرم علی خان اور نواب محمد احسن علی خان تھے افسوس کہ ان سب کا انتقال ہو چکا ہے ان میں سے میرے بڑے ماموں اکرم علی خان کی شادی ایک ہزہائی نس کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی وہ ممانی بھی اب دنیا سے سدھار چکی ہیں۔

---

سے تھے، فارسی، عربی، ہیئت، منطق، حکمت، موسیقی، تاریخ، تفسیر، احادیث، علم کلام، اسماء الرجال، طب اور کیمیا پر ان کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ بڑے بڑے علماء و صوفیاء ان سے فیض حاصل کیا کرتے تھے اسی کے دوش بدوش وہ اس قدر متقی بھی تھے کہ کبھی ان کی ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی تھی، اور سحری کے بغیر ہمیشہ تیسوں

روزے رکھا کرتے تھے۔

ان کے سر پر پٹے اور منہ پر گھنی داڑھی تھے جسے کبھی ایک بار بھی نہیں منڈایا تھا۔ وہ سنی سے شیعہ ہو گئے تھے تعز یہ داری، مرثیہ گوئی اور عزاداری میں ان کو سجد غلو تھا عمر کے آخری حصے میں وہ صوفی ہو گئے تھے اور ہندوستان بھر کے عرسوں میں بڑے خشوع و خلوص کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے لیکن علم کی اس جامعیت اور تقشف کی اس شدت کے باوجود ان کو سجد شوق تھا دروغ گفتاری کا آغاز تاریخ سے لے کر اس عالم کون و فساد میں جس قدر بھی دروغ گو انسان ہو چکے ہیں وہ ان سب سے قطعی طور پر مختلف تھے ان کی دروغ گوئی کسی مادی فائدے کے حصول کا ذریعہ نہیں، بلکہ مقصود بالذات تھی، یعنی دروغ ان کا ایک ایسا عجیب گھوڑا تھا جس پر وہ قطع مسافرت کے لئے نہیں بلکہ فقط جلب مسرت کے واسطے سوار ہوتے اور سود کے بجائے زیاں حاصل فرمایا کرتے تھے اور اسی جذبے کے تحت وہ ہر سال بجٹ بناتے اور اس میں مبلغ شش ہزار سالانہ ”برائے پرورش کذب“ کی بھی ایک مدد ہوا کرتی تھی، اب میں آپ کو ان کے چند واقعے سناتا ہوں جس سے ”برائے پرورش کذب“ کی بات سمجھ میں آجائے گی۔

ایک بار وہ ملیح آباد شریف لائے میں نے اپنے ایک دوست مختار احمد خان کی پریشانی کا حال ان سے کہا۔ انہوں نے فرمایا مختار کو بلاؤ مختار آئے تو انہوں نے بگڑ کر کہا تو سجد نالائق ہے تو نے آج تک مجھ سے اپنی پریشانی کا حال نہیں کہا تیرا باپ میرا دوست ہے میری زندگی میں اور تو مصیبت اٹھائے یہ ہو نہیں سکتا میں اب میر شریف سے ہوتا ہوا دبیر کی ستر ہوئیں کو دھول پور پہنچ جاؤں گا، تو اٹھارویں کو دھول پور آ جانا، میں تجھ کو آٹھ دن کے اندر مہاراجہ دھول پور کی سرکاری نوکری دلا دوں گا، مختار نے ان کی اس بے حد شفقت سے متاثر ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا اور یہ وعدہ کر کے کہ میں اٹھارویں کو دھول پور پہنچ جاؤں گا چلے گئے ان کے جاتے ہی انہوں نے مجھے حکم دیا کہ مختار کو دوبارہ بلا بھیجو مختار سامنے آئے تو انہوں نے کہا پہلی نالائقی تو تو نے یہ کی کہ

مجھ سے اپنا حال نہیں بتایا، اور تیری دوسری نالائقی یہ ہے کہ تو نے مجھ سے کرایہ طلب نہیں کیا یہ کہہ کر انہوں نے اپنے خادم خاص محمد کو آواز دی اور اس سے کہا میاں مختار کو دوسرو پے لا دو ان کی اس بے کراں سرپرستی سے مختار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور جب مختار اٹھنے لگے تو انہوں نے بطور تاکید کہا دیکھ بیٹا ستر ہو یں کو ضرور دھول پور پہنچ جانا یہ کہتے ہی انہوں نے اپنا منہ پیٹ لیا اور تو بہ تو بہ کر کے فرمایا، میں نے جلدی میں ستر ہو یں کہہ دیا یہ بات منہ سے غلط نکل گئی اللہ اس غیر ارادی جھوٹ کو معاف فرمائے دیکھ ستر ہو یں کو نہیں اٹھا رہو یں کو دھول پور پہنچ جانا سمجھ گیا؟ ستر ہو یں کو نہیں اٹھا رہو یں<sup>1</sup> کو آ جانا اور اس یقین کے ساتھ آنا کہ آٹھویں دن تو ضرور نو کر ہو جائے گا۔

مختار ٹھیک اٹھا رہو یں دسمبر کو دھول پور پہنچ گئے کوٹھی کے ایک آراستہ کمرے میں ان کو ٹھہرا دیا گیا دو خدمت گاران کے واسطے مختص کر دیئے گئے نہایت اعلیٰ درجہ کا کھانا اور ناشتہ آنے لگا اور ایک سواری مختص کر دی گئی ان کی سیر کے واسطے،۔۔۔۔۔ اب کیا تھا مختار ریمسانہ زندگی بسر کرنے لگے اور نواب صاحب نے اس بات کا مزہ لیٹا شروع کر دیا کہ مختار کو یقین ہے کہ میں اس کو آٹھ دن کے اندر ملازمت دلا دوں گا، حالانکہ میں اس کو نوکری دلاؤں گا ہی نہیں۔

جب مختار کو دھول پور آئے ہوئے آٹھواں دن ہو گیا تو وہ صبح ہوتے ہی تیار

<sup>1</sup> یہ شدت اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ یہ بات مختار کے دل میں ترازو ہو جائے کہ وہ کس قدر شدت کے ساتھ راست گفتار آدمی ہیں

ہو کر بیٹھ گئے کہ آج نواب صاحب ضرور نوکری دلا دیں گے لیکن جب شام ہو گئی تو انہیں معلوم ہوا کہ نواب صاحب آگرے تشریف لے گئے ہیں۔

اور جب اس متواتر شش و پنج میں چار مہینے گزر گئے تو مختار نے جی کڑا کر کے نواب صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا، نواب صاحب نے کہا کیا کروں استخارہ نہیں آ رہا

ہے، جس دن استخارہ آجائے گا اس دن تم نوکر ہو جاؤ گے، مختار نے کہا میں تو آپ کے سائے میں بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں لیکن میرے اہل و عیال۔۔۔۔۔ یہ سنتے ہی نواب صاحب نے چھاتی پیٹ لی، کہا مجھ سے بڑی چوک ہو گئی، یہ کہتے ہی محمد کو حکم دیا کہ جب تک میاں مختار کی نوکری نہیں لگتی دو سو روپے ماہانہ ان کی بیوی کے نام منی آرڈر کرتے رہو۔

مختار کے سر سے بڑا بار اتر گیا، اور نواب صاحب ہر رات کو تکیے پر سر رکھ کر اس بات کا مزہ لوٹنے لگے کہ مختار کو اس کا یقین کامل ہے کہ میں استخارہ آتے ہی اس کو نوکر رکھا دوں گا، حالانکہ میں اس کو کبھی نوکر رکھاؤں گا ہی نہیں۔

الغرض آٹھ آٹھ دن کے وعدوں اور استخارے کی امیدوں پر انہوں نے کچھ اوپر دو برس تک مختار کو اپنے گھر مہمان رکھا اور ہر ماہ ان کے گھر منی آرڈر بھی جاتا رہا۔

اور آخر کار ان کو اس نیم کے نیچے لے جا کر جس کو آخری جھوٹ سینچا کرتا تھا<sup>1</sup> انہوں نے مختار کو ایک ہزار روپے دے کر کہا تم کچھ روز کے لئے اپنے بال بچوں سے مل آؤ، استخارہ آتے ہی میں تم کو ڈبل تار دے کر بلا بھیجوں گا اور نوکری دلا دوں گا۔

اور جب مختار چلے گئے تو وہ تکیہ پر سر رکھ کر اس بات کا مزہ لینے لگے کہ مختار کو یقین ہے کہ میں استخارہ آتے ہی اس کو ڈبل تار دے کر بلا بھیجوں گا اور نوکری دلا دوں گا حالانکہ یہ ایک امر طے شدہ ہے کہ میں اس کو نوکری دلاؤں گا ہی نہیں صرف مختار ہی نہیں سینکڑوں آدمی اس طرح ان کے گھر مہمان رہے، اور بعض تو آٹھ

<sup>1</sup> ان کے بعد وہ نیم خشک ہو کر رہ گئی۔

آٹھ دن کے وعدوں پر آٹھ آٹھ برس تک امیدواری کر کے اور ایک ایک ہزار روپیہ لے کر رخصت ہو گئے اور وہ ”حالاں کہ“ کا مزہ لوٹتے رہے۔

ایک بار وہ ملیح آباد شریف لائے اور شام کو لکھنؤ جاتے وقت یہ فرما گئے کہ کل رات کو پلٹ آؤں گا میرے لئے گوبھی پکوا رکھنا، میں ان کا مزاج شناس ہو چکا تھا، میں



نے گوبھی نہیں پکوائی اور اسٹیشن پر سواری بھی نہیں بھیجی میں سمجھ گیا کہ ماموں لکھنؤ میں لیئے اس بات کا مزالے رہے ہوں گے کہ بھانجے نے سواری بھیجی اور گوبھی پکوائی ہو گی ”حالانکہ“ میں ملیح آباد جاؤں گا ہی نہیں۔

ایک بار انہوں نے لوہے کی نو سلاخوں پر سونا چڑھوا دیا، اور ایک سلاخ ٹھوس سونے کی بنوائی ان سلاخوں کو لے کر وہ اپنے لکھنؤ کے ایک نواب دوست کے وہاں پہنچے اور فرمایا کہ میں کربلائے معلیٰ کی زیارت کے لئے جا رہا ہوں یہ سونے کی دس سلاخیں اپنے توشہ خانے میں رکھا لیجئے واپسی پر لے لوں گا لیکن اپنے سنار پر مجھے اعتبار نہیں ہے اس لئے کسی معتبر سنار کے پاس بھیج کر چھو لیجئے کہ ان میں کھوٹ تو نہیں ہے اور جب لکھنؤی دوست اس پر آمادہ ہو گئے تو انہوں نے سونے کی ٹھوس سلاخ ان کے آدمی کے حوالے کر دی اور سنار نے جانچ کر تصدیق کر دی کہ وہ خالص ٹھوس سونے کی ہے۔

اور جب تین ماہ کے بعد وہ کربلا سے پلٹے اور ان دوست سے ملنے گئے تو انہوں نے توشہ خانے سے وہ سلاخیں منگائیں اور کہا نواب صاحب چونکہ آپ نے چھو کر یہ سلاخیں رکھی تھیں، مجھے اپنے ملازموں پر اعتبار نہیں اس لئے ایک سلاخ دے دیجئے تاکہ میں اس کو سنار کے وہاں بھیج کر چھو لوں نواب صاحب نے لوہے کی پاش شدہ سلاخ ان کے حوالے کر دی اور جب سنار نے یہ کہلا بھیجا کہ یہ لوہے کی سلاخ ہے جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے تو ان کے لکھنؤی دوست کے ماتھے سے عرق انفعال ٹپکنے لگا، اور وہ اس بات کا مزالوٹنے لگے کہ نواب صاحب سمجھ رہے ہیں کہ میں کربلا گیا تھا ”حالانکہ“ میں کربلا گیا ہی نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دوست کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ان کینو کروں نے میری دس ٹھوس سونے کی سلاخیں اڑا کر ان کی جگہ لوہے کی سلاخوں پر سونا پھروا کر رکھ دیا ہے ”حالانکہ ایک کے علاوہ کوئی سلاخ سونے کی تھی ہی نہیں۔“

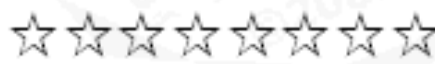
لکھنو کا ذکر ہے ایک بار میں سید نجم الحسن صاحب قبلہ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک منی آرڈر آیا پانچ سو روپے کا روپے گن کر قبلہ و کعبہ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ منی آرڈر آپ کے ماموں صاحب نے بھیجا ہے کوئی پندرہ روز ہوئے کہ وہ لکھنو تشریف لائے تھے اور مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کی جیب کٹ گئی ہے میں ان کو دو سو روپے بطور قرض دے دوں چنانچہ یہ منی آرڈر اسی سلسلہ میں آیا ہے لیکن دو سو روپے کے عوض انہوں نے پانچ سو بھیج دیئے ہیں میں یہ روپیہ واپس کر دوں گا میں نے کہا آج رات کو میں دھول پور جا رہا ہوں، انہوں نے ماموں کے نام خط لکھ کر وہ تین سو روپے میرے حوالے کر دیئے۔۔۔ میں دھول پور پہنچا ماموں جان مانا کے پاس بیٹھے تھے میں نے قبلہ و کعبہ کا خط اور یہ کہہ کر وہ تین سو روپے ان کے حوالے کر دیئے کہ آپ نے قبلہ و کعبہ صرف دو سو قرض لئے تھے لیکن پانچ سو روپے کا منی آرڈر بھیج دیا اس لئے انہوں نے یہ زائد رقم واپس کر دی ہے مانا جان نے جھڑک کر کہا، کیوں رستم علی تو قرض مانگتا اور مجھے بدنام کرتا پھر ت ا ہے انہوں نے کہا میری جیب کٹ گئی تھی اس لئے قرض مانگنا پڑا لیکن میں نے دو سو نہیں ایک سو ننانوے قرض لئے تھے اور یہ کہہ کر وہ دل ہی دل میں اس بات کا مزہ لینے لگے کہ حالانکہ میری جیب نہیں کٹی تھی مگر میں نے قبلہ و کعبہ اور والد گرامی دونوں کو جیب کٹنے کا یقین دلایا اور حالانکہ میں نے پورے دو سو لئے تھے مگر بقدر یک روپیہ دھوکہ دیکر ایک سو ننانوے کا یقین دلادیا۔

ایک بار عرس میں شریک ہونے کے واسطے وہ اتمیر شریف لے گئے وہاں ایک جوان اور گد بدی طوائف حشمت جہاں سے ان کی مڈ بھیڑ ہو گئی اور اپنے چشم و ابرو سے انہوں نے حشمت جہاں کو یقین دلایا کہ میں تجھ پر بری طرح عاشق ہو گیا ہوں اور انہیں اپنا عاشق صادق سمجھ کر جب وہ معشوقہ ادا کیں دکھانے لگی تو وہ اس بات کا مزہ لوٹنے لگے کہ یہ بیوقوف مجھ کو اپنا عاشق سمجھ رہی ہے حالانکہ میں اس کا عاشق ہوں ہی نہیں اور پھر اس حالانکہ کا مزید لطف اٹھانے کے لئے انہوں نے اس سے فرضی نکاح

بھی کر لیا اور اس کو اس کے بیٹے بھانجی بھانجی سمیت لے کر دھول پور لے آئے اس کو اپنے گھر کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا لیکن چونکہ وہ شریعت کے سختی کے ساتھ پابند تھے انہوں نے اسے کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔

وہ طوائف تا دم مرگ کوئی پچیس تیس برس تک ان کے گھر بھر پر مسلط اور ان کے مال و متاع پر قابض رہی اور وہ اس پچیس تیس برس کی طویل مدت تک اس کا مزالیتے رہے کہ اس طوائف کا بیٹا مجھ کو ابا جان کہہ رہا ہے اور وہ طوائف مجھ کو اپنا شوہر سمجھ رہی ہے حالانکہ میں اس کے لڑکے کا ابا جان ہوں نہ اس طوائف کا شوہر۔

کیا یہ کرہ ارض، اور یہ عالم کون و فساد اپنی تمام حیرت ناکیوں کے باوجود اس نوعیت کے کذب کی کوئی نظیر پیش کر سکتا ہے؟ اور کیا تمام نوع انسانی میں سے ایک فرد بھی آج تک ایسا گزرا ہے جس نے علم و فضل اور تقشف و طہارت کے باوجود، دروغ بانی سے اس قدر لطف اٹھایا ہے؟ شوم خدائے دروغے کہ راست مانداست!



## چھدو خاں

ملیخ آباد کے بڑے زمینداروں میں سے تھے، زندگی بھر ریل میں نہیں بیٹھے، جب کبھی مقدمات کی پیروی کے لئے لکھنویا اپنے موضع کی تحصیل وصول کے واسطے شاہجہاں پور جاتے تو ادھے 1 پر سفر کیا کرتے تھے، آگے آگے ان کا ادھا ہوتا تھا، اس کے پیچھے تین ادھے اور ہوتے تھے، جن پر کھانے کا سامان، بکرے، اور سپاہی لدے ہوا کرتے تھے۔۔۔۔۔ لاکھ لاکھ لوگوں نے سمجھایا کہ ریل پر سفر کیا کیجئے مگر انہوں نے کبھی کسی کی بات نہیں مانی اور ہمیشہ یہ کہا کہ خاں صاحب! جو سواری ہمارے اشاروں پر نہیں چل سکتی اس پر بیٹھنا بیکار ہے۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جو شخص ان کے غصے، جھڑکی یا گالی کا فوراً جواب نہیں دیتا تھا اس کو وہ پٹھانوں کے زمرے سے خارج کر کے اس سے قطع تعلق کر لیا کرتے تھے۔ اور تیسری خصوصیت یہ تھی کہ جو ملازم ان کے پکارتے ہی دو سیکنڈ کے اندر اندر حاضر نہ ہو جائے وہ اسے چھڑا دیا کرتے تھے اور اسی بناء پر ”نادر شاہی“ حکم کی طرح ”چھدو خانی“ حکم دور دور تک مشہور تھا۔

### 1 چھوٹی بیل گاڑی

ان کا یہ ایک بندھا کا اصول تھا کہ جب کوئی پٹھان ان کے پاس، نوکری کیلئے آتا تھا وہ مسکرا کر اس سے پوچھتے تھے کہ آپ خدمت گاروں کے زمرے میں آسکیں گے؟ اور جب وہ جواب دیتا کہ ہم پٹھان ہیں، خدمت گاری سے تو ہمارے باپ دادا بھی نہیں واقف تو وہ خوش ہو جاتے اس کے متعلقین کے باب میں دریافت کرتے کہ وہ سب کس قدر ہیں اور جب معلوم ہو جاتا تو اس کے بال بچوں کی تعداد پر نگاہ کر کے وہ اس کو اسی قدر تنخواہ مقرر کر دیا کرتے اور چونکہ ”خشک 1“، تنخواہ کے وہ قائل نہیں تھے اس لئے وہ پوچھتے تھے کہ خاں صاحب آپ کتنی روٹیاں، کتنی دال اور کس قدر گوشت کھائیں گے اور کتنا دودھ پیئیں گے؟ اور جب وہ جواب دیتا کہ میں آٹھ روٹیاں اور



پاؤ بھر گوشت کھاؤں گا، اور آدھ سیر دودھ میں میرا کام چل جائے گا تو وہ اپنے منشی قمر الدین خاں کو حکم دیا کرتے تھے ”قمری دارو“ یعنی اے قمر الدین خاں اس کا نام فہرست ملازمان میں درج کر لومع خوراک۔

ایک بار ان کی بیوی نے کہا کہ جس سپاہی کی روزانہ آٹھ روٹیاں مقرر کی گئی تھیں، اس کے دسترخوان سے آج ایک روٹی بچ کر آگئی ہے۔۔۔۔۔ وہ یہ سن کر باہر آئے اس سپاہی کو بلایا اور کہا خاں صاحب آج آپ نے ایک روٹی کم کھائی ہے یہ بات ہمارے آپ کے معاہدے کے خلاف ہے سپاہی نے کہا حضور آج میری طبیعت خراب تھی انہوں نے کہا نہیں کھا سکتے تھے تو اپنی بچی روٹی گھر لے جاتے یہ کہہ کر انہوں نے اپنے منشی قمر الدین خاں کو پکارا اور ان سے کہا ”قمری، یہ خاں صاحب نہ دارو“ (یعنی درخواست کر دیے گئے) سپاہی نے بڑی لجاجت سے کہا حضور مجھے ”نہ دارو“ نہ کریں انہوں نے کہا خاں صاحب آپ نے معاہدہ تو رڈالا آپ پورے ایک ماہ تک ”نہ دارو“ رہیں گے ایک ماہ بعد پھر ”دارو“ ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ انہوں نے خدمت گار کو پکارا خدمت گار دو تین منٹ کے بعد آیا انہوں نے پوچھا دیر کیوں کی اس نے کہا پانی بھر رہا تھا، انہوں نے کہا میرے پکارتے ہی تم پر یہ بات لازم ہو گئی تھی کہ رسی کو فوراً ہاتھ سے چھوڑ کر دوڑ پڑتے۔ اتنا کہہ کر انہوں نے حکم دیا، قمری یہ خدمت گار نہ دارو

1 تنخواہ بے خوراک 2 وہ دارو اور نہ دارو کے الف کو پورا کھینچ کر زبان چراتے

تھے ”دارو“ اور ”نہ دارو“

وہ سال میں تین مرتبہ غریبوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے ایک بار انہوں نے تمسخر کے طور پر کسی غریب آدمی سے پوچھا کبھی ایسا کھانا تمہارے باپ نے بھی کھایا تھا؟ اس نے کہا۔۔۔۔۔ میرا باپ جو کھانا کھاتا تھا وہ آپ کے باپ نے بھی نہیں کھایا ہوگا، انہوں نے پوچھا تمہارے باپ کیا کھاتے تھے؟ اس نے کہا جوار کی سوکھی روٹی اور چٹنی وہ ہنس پڑے

اور کہا تم سچ کہتے ہو اگر تم مجھ کو پلٹ کر جواب نہ دے دیتے، میں تم کو ابھی ابھی نکلوا دیتا۔

ایک مرتبہ ان کے ایک خدمت گار نے آکر ان سے کہا کہ حضور آپ کے رحیم الدین خاں سپاہی آج یہ کہہ رہے تھے کہ چھ دو خاں کی نادر شاہی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، اب کی تنخواہ مل جائے تو میں ان کی نوکری چھوڑ دوں گا، اور نہ چھوڑوں تو میرے نطفے میں فرق ہے۔۔۔۔۔ یہ سن کر انہوں نے رحیم الدین خاں کو بلایا اور کہا خاں صاحب! آپ کی مستعدی سے ہم بہت خوش ہیں آج سے آپ کی تنخواہ دگنی کر دی ہے مزے سے رہئے اور پکار کر کہا ”قمری یہ خاں صاحب آج سے دگنے دارو“ سپاہی خوش ہو گیا اور بے حد جی لگا کر کام کرنے لگا اور جب وہ ایک مہینہ کام کر چکا انہوں نے اسے بلا کر دو فی تنخواہ دے دی اور قمر الدین خاں سے کہا ”قمری رحیم الدین خاں آج سے نہ دارو“ رحیم الدین خاں نے پوچھا حضور میری کیا خطا ہے تو انہوں نے کہا آپ نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ اب چھ دو خاں کی نوکری کروں تو میرے نطفے میں فرق ہے لیکن جب میں نے تنخواہ دو فی کر دی تو آپ نے لالچ میں آ کر اپنے پرگالی چڑھالی، بس اب آپ جائیں ”قمری“ نطفے کا فرق ”نہ دارو“

ایک بار ان کے سپاہی نے شکایت کی کہ حضور پرسوں سے میرا دودھ نہیں آرہا ہے، وہ غصے میں بھرے گھر پہنچے اور اپنی بیوی سے گرجتی آواز میں کہا اشرف! کی ماں تم نے حیدر خاں کا دودھ بند کر دیا ہے؟ ان کی بیوی نے کہا کیا کروں، تین بھینسوں نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے، صرف ایک بھینس دودھ دے رہی ہے اس کا دودھ کثرت کے بعد اشرف پی لیتا ہے انہوں نے کہا اشرف خاں دودھ پیئیں اور دارو کو دودھ نہ ملے، اچھا ابھی چھٹی کا دودھ یا دولاے دیتا ہوں باہر آ کر انہوں نے للکار کر کہا قمری چاروں بھینس نہ دارو قمر الدین خاں حیرت سے ان کا امنہ تکتے لگے انہوں نے کہا میرا امنہ کیوں تک رہے ہوں قمر الدین خاں نے کہا بھینسوں کا نہ دارو میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے انہوں نے کہا اس کے یہ معنی ہیں کہ فوراً قصائیوں کو بلاؤں اور چاروں بھینسوں کو

ذبح کراڈا قمر الدین خاں ان کے بڑے پرانے خیر خواہ تھے انہوں نے کہا بھینسوں کو کس خطا میں ذبح کر ڈالا جائے گا انہوں نے کہا اشرف کی ماں نے ہمارے دارو کا دودھ نہ دارو کر دیا ہے اس لئے ساری حرام زادی بھینسیں نہ دارو قمر الدین خاں لاکھ لاکھ چیتے رہے مگر انہوں نے چاروں بھینسیں ذبح کرا کے ان کا گوشت غریبوں میں کھڑے کھڑے تقسیم کرا دیا۔

ایک دن وہ اپنے باغ میں بیٹھے قمر الدین خاں سے باتیں کر رہے تھے کہ ان کے بیٹے اشرف خاں نے آکر سلام کیا انہوں نے پوچھا لکھنؤ ہو آئے بیٹے نے کہا جی ہاں ابھی ابھی لکھنؤ سے آیا ہوں اور آپ کو سلام کر کے گھر جاؤں گا اتنے میں ان کی نظر بیٹے کی جوتی پر پڑ گئی جامے سے باہر ہو کر پوچھا اس جوتے کا نام کیا ہے بیٹے نے کہا بابا اس کا نام ہے ”ڈاسن“ انہوں نے کہا پٹھان کا پوت اور یہ زنجی جوتی، اس جوتی کی ماں کی۔۔۔۔۔ قمری نکال چا کو اور ٹکڑے ٹکڑے کر دے اس چھٹال جوتی کے یہ ڈاسن کی جوتی اشرف کی ٹھنولی کو ڈس لے گی اور جوتی کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر جب اشرف خاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو انہوں نے کہا اے زنجی جو رو کے۔۔۔۔۔ دور ہو جا میری نظروں سے اور جب اشرف خاں سر جھکا کر اندر چلے گئے تو انہوں نے کہا ”قمری اشرف نہ دارو“ قمر الدین اچھل پڑے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا پوچھا خاں صاحب بہادر بیٹا اور ”نہ دارو“ یہ ہو کیونکر سکتا ہے، انہوں نے کہا وہ نہ دارو ہو سکتا ہے عاق ہو جانے کے بعد، قمر الدین نے کہا اتنی ذرا سی بات پر انہوں نے کہا یہ ذرا سی بات ہے؟ میں نے اسے گالی دی اس نے پلٹ کر جواب نہیں دیا قمر الدین خاں ان کی ضد سے واقف تھے دوڑے ڈیوڑھی پر گئے اور لونڈی سے کہا بڑا غضب ہو گیا خاں صاحب بہادر اشرف خاں کو عاق کر دینے پر تل گئے ہیں جلدی بی بی کے پاس جا کروہ انہیں گھر بلا کر سمجھا دیں۔۔۔۔۔ گھر میں کہرام مچ گیا لونڈی نے ڈیوڑھی سے پکار کر کہا میاں آپ کو بیوی بلارہی ہیں وہ اندر گئے تو بیوی نے سر پیٹ کر کہا ہے یہ

کیا اندھیر ہے ایک نگوڑی جوتی پر بچے کو عاق کئے دے رہو انہوں نے کہا یہ نگوڑی جوتی کی بات نہیں میں نے اس کو گالی دی وہ پی گیا پلٹ کر مجھ کو گالی نہیں دی اگر وہ اصلی پٹھان ہوتا تو فوراً مجھے بھی گالی دیتا۔۔۔۔۔ ان کی بیوی نے کہا ارے یہ تو سوچو، بیٹا باپ کو گالی کیسے دے سکتا ہے انہوں نے کہا یہی تو تمہاری بھول ہے پٹھان، باپ تو باپ، اللہ کی گالی کو بھی برداشت نہیں کر سکتا اشرف سے کہو مجھے پلٹ کر گالی دے نہیں تو ان کی بیوی نے منہ پیٹ کر بیٹے سے کہا ارے تو بھی گالی دے دے جب بیٹے نے پس و پیش کیا تو انہوں نے کہا دیکھ ایک دو تین کہتا ہوں اگر تین پر گالی نہیں دے گا تو اپنی سات پشتوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کھڑے کھڑے عاق کروں گا یہ کہہ کر انگلی اٹھائی اور کہا ایک بیٹا چپ رہا پھر انہوں نے کہا دو ان کی بیوی نے بیٹے کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا دے دے گالی، نہیں تو دودھ نہیں بخشوں گی اور جب انہوں نے بڑے عزم کے ساتھ انگلیاں سر اٹھا کر کہا تین تو اشرف نے کہا ”اے زنجے جو رو کے۔۔۔۔۔۔۔“ تو انہوں نے دوڑ کر بیٹے کو گلے لگالیا منہ چوما اور پیٹ ٹھونک کر کہا تو پٹھان، تیرا باپ پٹھان، تیرا دادا پٹھان۔۔۔۔۔ اور گھر سے نکل کر بڑی گرجتی آواز میں کہا ”قمری اشرف دارو“

### 1۔ بیٹے کا نام

گویند، ذکر خیرش، در خیل عشق بازاں  
 ہر جا کہ نام حافظ، در انجمن در آید!  
 دردا۔۔۔ کہ راز پنہاں، خواہد شد آشکارا!  
 طالع شہرت رسوائی مجنوں، بیش است  
 ورنہ، طشت مسن داؤ۔۔۔۔۔ ہر دو زیک بام افتاد!  
 درد عشقے، کشیدہ ام۔۔۔۔۔ کہ مپرس  
 زہرے ہجرے چشیدہ ام۔۔۔۔۔ کہ مپرس



میرے معاشقے

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں رند ازلی بسم اللہ کے گنبد میں پالا گیا تھا اور میرے باپ نے مجھ کو اس بے پایاں احتیاط کے ساتھ پروان چڑھایا تھا کہ آج کل اس احتیاط کے ساتھ لڑکیوں کی بھی پرورش نہیں کی جاتی ہے۔

اور اسی بناء پر مجھ میں کنواری لڑکیوں کی سی جھجک پیدا ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ اور کسی مردانہ جرأت کا تو ذکر ہی کیا مجھ میں اس قدر شرمیلا پن پیدا ہو گیا تھا کہ جب اپنے باپ کی بھری محفل یا کسی مشاعرے میں جاتا تو دل دھڑکنے اور پنڈلیاں کانپنے لگتی تھیں۔۔۔۔۔ اور

گوری۔۔۔۔۔ دھیرے چلو، لگیا چھلک نہ جاوے  
کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا

میرے انتہائی شرمیلے پن کے سینکڑوں واقعات ہیں سے فقط ایک واقعہ سن لیجئے  
اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ میں نام خدا کس حد تک شرمیلا تھا۔

لکھنوکا ذکر ہے، میرے باپ کہیں باہر تشریف لے جا چکے تھے کہ ایک روز شام کے وقت میرے باپ کی ڈیوڑھی کے ایک رنگین مزاج تماشا بین قسم کے سپاہی سبحان علی خاں، عرف بجن نے مجھ سے کہا بچھلے بھیا چلئے آج آپ کو چوک گھملائیں۔

[illegible]



جس طرح ایک چاول کو دیکھ کر پوری دیگ کا پتا چلا لیا جاتا ہے، اسی طرح۔۔۔۔۔  
مندرجہ بالا ایک واقعے سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ میری اٹھان کیسی تھی۔  
جی ہاں، میرے باپ نے کوئی کسرا اٹھا نہیں رکھی تھی مجھ کو وہ بنا دینے میں جس کو  
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں ”جوان صالح“ اور اہل نظر کی زبان میں ”  
محنت“ کہا جاتا ہے۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے میرے باپ کی یہ تمنا پوری  
نہیں ہوئی اور قدرت کی حکمت وغیرت نے یہ بات کسی طرح بھی گوارا نہیں فرمائی کہ  
میں شاعر کے بجائے مولانا بخش اللہ بن کر رہ جاؤں۔۔۔۔۔ مطرب کو چھوڑ کر موزن  
سے دل لگاؤں مکھڑوں کے تلوں سے نظر پھیر کر تسبیحوں کے دانے گھماؤں، صہبا کے  
شیشوں سے قرابت کا رشتہ کاٹ کا استنحوں کے ڈھیلوں سے اپنا شجرہ نسب ملاؤں  
شراب کے پیالوں میں تیرنے کے بدلے وضو کے بدھنوں میں غوطے کھاؤں اور کالی  
زلفوں کی گھنیری چھاؤں سے بھاگ کر سفید داڑھیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جا کر بیٹھ  
جاؤں کس قدر صادق آتا ہے یہ شعر مجھ پر

کوئی کمی نہ کی تھی، دل بے قرار نے  
مجھ کو بچا لیا، مرے پروردگار نے  
اب سنئے میر گھٹن کیوں کر دور ہوئی اور قوت و حیات کی بے پایاں شفقت نے  
اندک اندک عشق درکار آورد بیگانہ را کے طور پر مجھے کس حکیمانہ توقف و مدرتج کے  
ساتھ فردوس ادب کی جانب موڑا۔

سب سے پہلے میرے ذوق جمال کو مرتب و مہذب بنانے کی نیت سے اس نے  
افق کا گریبان پھاڑ کر نازل کر دیا مجھ پر طلوع صبح کا قرآن۔۔۔۔۔ اب کیا تھا، مشرق  
کی زریں دھاریوں سے اترنے لگے تیرے ذہن پر آیات۔۔۔۔۔ پھولوں کے  
امواج رنگ و بو سے اڑنے لگے میرے سر پر جبریل۔۔۔۔۔ مرغان سحر کے

چچھوں سے گو نجنے لگے میری محراب وجود میں نعمات داؤد۔۔۔۔ اور آنے لگی ہر طرف سے یہ آواز کہ

ادب سے دیکھ چمن میں بہار پھولوں کی  
جھلک رہی ہیں پیشانیاں رسولوں کی  
اسی کے دوش بدوش اس نے سپیوں، قنقموں جھاڑ کے قلموں حریر و پرنیاں کے  
تھانوں، انگلیٹھیوں کے انگاروں، چاندی کی ریز گاریوں، سونے کی اشرفیوں اور  
تتلیوں کے پروں کی دھاریوں پر جمادیں میری نگاہیں۔

پھر وہ لے آئی میرے سامنے چاندنی راتیں دکتے ستارے، جھلکتے چاند بھری  
برساتیں، کالی گھٹائیں کو کو پی ہو کی صدائیں اور رم جھم رم جھم کی بھیگی ہوائیں۔

جب خیر سے بھیگ گئیں میری مسیں تو اس معلمہ نے موڑ دینے میری جانب کا کل  
ور خسار کے گنگا جمنی دھارے۔۔۔۔۔ گڑ کا دی میرے سر پر نو خواستہ جوانیوں کی  
زریں کمائیں۔۔۔۔ اور چلانے لگی میرے دل پر شام اودھ اور صبح بنارس میں ڈھلے  
ہوئے نکیلے مکھڑوں کے بان

اور پھر

حسن جنید زخواب و مژہ برہم زد  
فتنہ برپا شدو نشتر برگ آدم زد  
کے بعد میری عملی تربیت کا آغاز کر دیا گیا۔

سب سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ ہمارے گھر کی کسی تقریب میں ایک پٹا خاصی کم  
سن اور بلور اندام طوائف مجرے کے لئے آئی اس کے گالوں کی جلد بنارس ساری کے  
مانند باریک تھی ناک کی نتھ بتا رہی تھی کہ ابھی تک اس کا پنڈا کو ارا ہے اور اس کے  
شلو کے میں ہا کا سا جھول پڑنا شروع ہو گیا تھا معاذ اللہ!

جب اس کی نشلی انکڑیوں میں کھلا نرت کا باب، میرے اتار وجود پر مچنے لگی



مضرب۔۔۔۔ اور جب ناچتے ناچتے وہ بالکل میرے قریب آئی اور انعام کے لئے بیٹھ گئی تو اس کی شرتی پیش واز کا ملائم سرا میرے ہاتھ کی پشت سے مس ہو کر اس طرح سرسرایا کہ میری پور پور میں شیرینی کی لہر دوڑ گئی۔۔۔۔۔ اٹھنے لگی ایک بھاپ سی میرے مسامات سے، ہوا سنکنے اور پوسی پھٹنے لگی میرے جسم کے اندر۔

اک دامن حریر کے لمس خفیف سے  
لودے اٹھا ہے خون رگ جان کبھی کبھی  
یہ تھا میرا پہلا آپریشن جو برگ یا سمین کی دھار سے کیا گی اتھا اب سننے دوسرا واقعہ۔۔۔۔۔ لڑکپن سے لے کر جوانی تک مجھ پر دوسر کا دورہ پڑا کرتا تھا، ایک دن جب دوسر کا دورہ پڑا تو رجیا میرا سر دبائے لگی وہ کھڑی بیل کی سرو قامت، شہابی رنگ والی چودہ برس کی رجیا ہمارے گھر کے چوکیدار بدلو گدی کی بیٹی تھی۔

سر دبائے میں وہ بار بار جو میرے منہ کی طرف جھکی تو اس کی سانوں کی کچی خوشبو میرے دل میں چھپنے لگی اور اس کی ملائم ملائم ہتھیلیوں کی میٹھی گرمی ایک ایسے جزیرے میں لے گئی مجھ کو جہاں کچے اناروں پر بھونرے منڈا رہے تھے۔۔۔۔۔ اور سینکڑوں قوس قزح کی سی بانہیں میری گردن میں پڑی چلی جا رہی تھیں اور اس کا یہ اثر ہوا کہ میرا درد، میرے سر سے منتقل ہو کر دوڑنے لگا میری پور پور میں۔۔۔۔۔ میں نے رجیا کی طرف نظر اٹھائی اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ابھی اس کی آنکھوں کے ڈوروں کی زبان کھلی ہی تھی کہ میری ماں کی مغلانی عباسی خانم آگئیں اور وہ طلسم پل بھر میں ٹوٹ کر رہ گیا جناب والا یہ طلوع صبح کی جگمگاہٹوں سے لے کر رجیا کی ہتھیلیوں کی گرماہٹوں کے تمام واقعات تو ایسے تھے جیسے ڈھیلے ہاتھوں کی مار۔۔۔۔۔ اب سنئے گھن کا ماجرا۔

ایک دن، جب گلابی جاڑے کی نویلی صبح اپنے بستر پر بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی میرا تمام گھر، حسب دستور محو خواب، اور میں حسب عادت بیدار ہو کر اپنی انگنائی کی ہری

بھری نیم کے نیچے کھڑا جھوم رہا تھا کہ نیم کے قریب کی کوٹھری میں رہنے والی جوٹی لونڈی ظہورن، میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور مجھے گھورنے لگی اور جب میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک ناقابل فہم رنگین سی ملگجاہٹ ہے۔۔۔۔ اس کے ہونٹوں کے ابھار میں ایک نامعلوم سا تقاضی ہے اور اس کا ٹھڈی تک ابھرا سینہ، گہری سانسوں کے گرداب میں اوپر نیچے ہو رہا ہے۔۔۔۔ تو میں نے پوچھا ”ظہورن کیا بات ہے“ اس نے کہا ”اے جرنیلی ٹوپی کے منخلے بھیا میری کوٹھری میں ذری چلے چلو تو بات بتاؤ۔۔۔۔ میری کوٹھری بڑی گرم گرم 1 ہے۔“

مروت کے مارے انکار نہیں کر سکا وہ آگے آگے چلی اور میں اس کی گرم گرم سانسوں میں لپٹا ہوا کوٹھری میں داخل ہو گیا۔

کوٹھری میں قدم رکھتے ہی کڑوے تیل کی خوشبو سے میری سانس بوجھل ہو گئی چراغ کی بامروت روشنی نے میرے کان میں ایک ایسی بات کہی جسے میں سمجھ نہیں سکا۔

ظہورن نے بڑے چاؤ اور بلا کے سبھاؤ کے ساتھ کہا منخلے بھیا ذری لیٹ جاؤ، میں تمہارے پاؤں داب دوں۔۔۔۔ میں بڑی معصومیت کے ساتھ لیٹ گیا اس نے مجھ پر رضائی ڈال دی اور رضائی کے اندر ہاتھ ڈال کر بڑے چچے تلے انداز سے میرے پاؤں دابنے لگی۔۔۔۔ تھوڑی دیر پاؤں دابتی رہی اور اس کے بعد۔۔۔۔ میں نے تڑپ کر کہا ارے یہ کیا ظہورن اس نے اپنے سیدھے ہاتھ سے میرا منہ بند کر دیا اور ارے اللہ، ارے اللہ، ارے اللہ، کے نعرے لگانے لگی۔

من خدائے بت شوخ کہ بسنگام وصال  
بمن آموخت، خود آئین ہم آغوشی را

(مولانا شبلی)

اس گھن یا یوں کہتے کہ اس آپریشن کے بعد میری بے جا حیا کا مادہ فاسد

کلیۃً نہ ہی لیکن بڑی حد تک میرے جسم سے نکل گیا اور پھر موڑ دی قدرت نے  
میری باگ جادہ عشق بازی کی جانب

دوش وقت سحر، از غصہ 1 نہاتم داند

بندہ پرور ایک بار نہیں میں اٹھارہ بار عشق کر چکا ہوں  
لوگ کہتے ہیں قیامت آئے گی تو کوئی زندہ نہیں رہے گا لیکن مجھے دیکھئے کہ اٹھارہ  
قیامتیں میرے سر سے گزر چکی ہیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں اور شاخ حیات پر اونگھا  
نہیں بیٹھا بلکہ جی بھر کے آج بھی چہچہا رہا ہوں۔

آفریں باد، برائیں ہمت مردانہ !!

اپنے معاشقوں کے ذکر سے پہلے، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسی اہم  
باتوں پر روشنی ڈال دوں کہ غلط فہمیوں کا امکان باقی نہ رہے۔

1 سب سے پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لیجئے کہ جہاں تک کہ محبوبوں کے دل موہ  
لینے کا تعلق ہے، میرا ایک معاشقہ بھی ناکام نہیں رہا۔۔۔۔ اور یہ بات صرف یہیں  
تک نہیں رہی بلکہ یہاں تک بھی ہوا کہ حسین عورتوں نے خود مجھ سے عشق کیا اور بعض  
نے تو یہاں تک مجھ کو چاہا کہ مجھ میں ناز معشوقانہ پیدا کر دیا آپ میرے ان مندرجہ  
ذیل اشعار کو دیکھیں (جو میرے مجموعوں میں طبع ہو چکے ہیں) تو میرے قول کی  
تصدیق ہو جائے گی۔

1920ء

میری	پریش	اور	تیری	بزم	ناز
آفریں	اے	شاہد	عاشق	نواز	
اک	مرے	دل	کی	تسلی	کے
زلزلے	میں	آئے،	اور	حمکین	ناز

تیری طبع ناز، اور اشتہنگی  
تیرا پہلو، اور در جاں گداز

1 کلورنگی

یہ ترا رخ، اور گرد خستگی  
یہ ترے لب اور حرف سوز و ساز  
آہ سوزاں اور تیرے لعل لب  
اشک خونیں اور تیری چشم ناز  
جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر  
وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز

1930ء

ہو زیاد ہے وہ رنگ اضطراب ترا  
بھرا تھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا  
وہ ابتدائے محبت کی تند راتوں میں  
بساط غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا  
وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں چشم نم تیری  
وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرش خواب ترا  
وہ بات بات میں چھالا سا اک چہک اٹھتا  
نظر جھکا کے وہ لہجہ دم خطاب ترا  
وہ تیری زلف کے خم سے، مری پریشانی  
وہ اپنی سانس کی خوشبو سے اضطراب ترا  
مرہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال  
وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا



دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھ کو  
یاد ہے وہ خلش عہد تمنا تجھ کو  
ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے  
ہر نفس، میری جدائی کا تھا دھڑکا تجھ کو  
راستے سے کوئی آواز جب آ جاتی تھی  
میری آواز کا ہو جاتا تھا دھوکا تجھ کو  
قہر ڈھاتا تھا، مرا درس تحمل تجھ پر  
زہر لگتا تھا مرا وعدہ فردا تجھ کو

☆☆☆☆☆☆

2 دوسری بات یہ کہنا ہے کہ میرے ناقدین میری عاشقانہ شاعری کے باب میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں میر تقی میر اور فانی بدایونی کا سا غم نہیں پایا جاتا۔

اگر ناقدین غور سے میری عاشقانہ شاعری پر نگاہ ڈالیں تو انہیں پتا چل جائے گا کہ عنصر غم کی اس میں کمی نہیں لیکن مرے اور حضرت میر وغیرہ کے غم میں فرق یہ ہے کہ ان کا غم شکستگی دل پر اور میر غم معشوقوں کی مفارقت پر مبنی تھا میرے کلام میں ہجر کی ہچکیاں تو ضرور گونجی ہوئی ہیں مگر شکست دل کی جھنکار موجود نہیں ہے آپ خود ہی انصاف کریں جس کا دل کبھی توڑا ہی نہیں گیا ہو وہ شکست دل کا رونا کیوں کر رو سکتا ہے۔

جناب عالی، روتے دھوتے تو وہ ہیں جنہیں معشوق منہ نہیں لگاتے، دربانوں سے ان کو ذلیل کراتے، ان کی آنکھوں کے سامنے غیروں کو چھاتی سے لگاتے، اور بڑی بے حیائی کے ساتھ عاشق کی زبان سے کہلاتے ہیں۔

لے، شب وصل غیر بھی کائی  
تو مجھے آزمائے گا کب تک

اگر نصیب دشمنان میں جوانی میں ایسے شرمناک حادثے کا شکار ہو جاتا تو خدا کی قسم بے حیا معشوق اور سارے رقیب، دونوں کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا۔

2 دوسری بات یہ کہنا ہے کہ میں اس نکتے سے بخوبی واقف ہوں کہ عاشقی پر سان چڑھتی ہے ایک تو معشوق کی بے اتنائی و کج ادائی دوسرے اس کی جدائی سے۔  
آئیے پہلے اس کی بے اعتنائی و کج ادائی پر نگاہ ڈالیں، اور دیکھیں کہ عاشق پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔

الف: اس سے عاشق احساس کمتری کا صید زبوں ہو کر رہ جاتا ہے اور اس قدر شدت کے ساتھ کہ جب وہ آئینہ دیکھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی خار شینا ٹپنی کتا اس کے رو برو کھڑا دم ہلا رہا ہے

ب: احساس کمتری کے گھن سے شیشہ اناء کے چکنا چور ہو جانے کے بعد اس کا دل اس قدر بچھ جاتا ہے کہ وہ قرابت داروں اور یاریوں کو منہ دکھانے سے جھجکنے اور شرمانے لگتا، اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔

ج: جب اس کی غم اور ذلت میں ڈوبی ہوئی گوشہ نشینی پر ایک مدت گزر جاتی ہے تو اس کے دل میں اقرباء و احباب کی جانب سے یہ گمان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھی میرے معشوق کی مانند سراسر نامہربان اور سراپا ناقابل اعتماد ہیں اور بعض اوقات تو فانی بدایونی کی طرح وہ تمام عالم کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ معاشرے کے واسطے ایک زہریلا انسان بن جاتا ہے۔

د: اس تمام صورت حال کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر اس کے عشق میں جان کم ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کے عشق پر اوس پڑ جاتی ہے اور گاہ گاہ کی ایک آہ سرد کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہتا لیکن اگر عشق قوی اور حوصلہ ضعیف ہوتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ گھل گھل کر مر جاتا ہے اور حوصلہ بھی عشق کے مانند قوی ہو تو خود کشی کر لیتا ہے یا خود معشوق کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا ہے۔

3 آئیے اب دوسری شق یعنی سازگار و غم گسار معشوق کی جدائی کے اثرات پر نگاہ

ڈالیں

جدائی دو قسم کی ہوتی ہے ایک طویل، ایک مختصر

طویل جدائی میں شعلہ بارو پائیدار جذبات رکھنے والا عاشق یا تو کڑھ کڑھ کر مر جاتا ہے یا خودکشی کر لیتا ہے یا عاشق میں اگر زیادہ عدت نہ ہو تو کچھ روز تر پتے رہنے کے بعد اس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے اور بالآخر صبر آ جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ بر طول فرقت سے بہت بے تائیاں کم ہو گئیں اور پھر اب وہ اگلی سی درازی شب بھراں میں نہیں کا عالم طاری ہو جاتا ہے لیکن گاہ گاہ کی جدائی اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے وہ عشق کو فاقوں سے مارتی نہیں اسے غذا دیتی ہے وقت کو ٹھہرا، اور زندگی کو ٹھہرا دینے والی یک رنگی سے بچاتی ہے اور تو اتر عیش و تسلسل قرب محبوب کے تیخ کدے سے بار بار باہر نکل کر شعلہ عشق کو ہوا دیتی رہتی ہے۔

قدرت کو چونکہ مجھے زندہ اور بشاش رکھنا، اور مجھ سے کام لینا تھا اس لئے اس نے بڑی توسط آمیز دیدہ وری کے ساتھ مجھ کو معشوقوں کی جان لیوا بے اعتنائی اور ولولہ سوز طویل جدائی کے تہلکوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا اور اسی کے ساتھ سات میری ذہنی پرورش و تربیت کی خاطر یہ انتظام بھی کر دیا کہ مجھ کو بار بار مفارقت سے ڈسوا یا، لیکن کسی مفارقت کو اس قدر طویل نہیں ہونے دیا کہ سارا کھیل ہی بگڑ کر رہ جائے۔

اور اس مشفقانہ و مدبرانہ صورت حال نے ایک حکیمانہ توازن قائم کر کے مجھ کو زمزمہ و شیون، کرب و کیف، اور نیش و نوش کے بین بین رکھا اس طرح عشرت و ریدگی و حزن گزیدگی دونوں سے بچا لیا۔

طغیان ناز ہیں کہ جگر گوشہ غلیل

آرو بزیر تیغ و شہید ش نہ می گند!

اب رہی یہ بات کہ میں نے قیس و فرہاد کے مانند، ایک لیلیٰ اور ایک شیریں سے

عشق کرنے کے بدلے اٹھارہ معشوقوں سے عشق کیوں کیا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عمر بھر کے واسطے کسی ایک کو اپنا کر رکھنا اور کسی ایک کا ہو کر رہ جانا، میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک، یہ صورت حال معشوقیت کو زوجیت کے سیلے تہ خانے میں قید کر دینے کی بد مذاقی بہتے پانی کو بند کر دینے کی عفونت انگیزی جذبات نو بنو کا اعتبار، قانون تغیرات کی خلاف ورزی ذوق تنوع کی بے حوصلگی تصور کی تہی دستی اور تخیل کا افلاس ہے۔

اس لئے میری طبع رواں نے یہ جمود اختیار نہیں کیا اور بہتا دریا، جوگی چلتا چھا کے جاوے پر ہمیشہ گام زن رہا۔ پروانہ کبھی نہیں بنا کہ

پھر نہ کچھ دیکھا بجز یک شعلہ پر پتچ و تاب  
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا  
کی سی کھوکھلی داستان عبرت بن کر رہ جاتا۔ اس کے برعکس میں نے بھونرے کی  
زندگی کو اپنایا، ہر گلی نو و میدہ پر منڈ لایا، اس کا گن گایا، اس کی خوش بو پی کا رنگ چکھا،  
اس پر کالی گھٹاؤں کے سائے میں گایا، گونجا، اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا:

در چچ مقام نہ گز ارو بدرنگے  
از بوئے، بوئے برد، از رنگ برنگے  
مجھ پر جمال نے بار بار جمال پھینکے، میں بار بار گرفتار ہوا، اور ہر بار یہ کہتا ہوا جمال  
سے نکل گیا کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں  
جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے  
اگر قیس و فرہاد کا کوئی جانشین یہ ارشاد فرمائے کہ جوش صاحب معاف کیجئے اس  
صورت حال کو عشق نہیں عیاشی کہتے ہیں تو میں یہ جواب دوں گا کہ بھئی تجھ کو میرے اس  
اہتمام کی مطلق خبر نہیں کہ میں نے عشق و عیاشی کو ہمیشہ ایک بہت بڑے احترام آمیز



فاصلے پر رکھا ہے اور ان قلبی و جسمانی دھاروں کے مابین میں نے ایک ایسا پردہ ہمیشہ  
حائل رکھا کہ وہ کبھی اور کسی عالم میں بھی ایک دوسرے سے ہم آغوش نہیں ہونے  
پائے۔

جی ہاں میں نے جی بھر کے عیاشی کی ہے لیکن اس طرح کہ رات ہوتے ہی اس کی  
شمع جلائی اور صبح ہوتے ہی بجھا دی۔

میں نے کبھی اپنے دل کو عیاشی کا وطن نہیں دیا، بلکہ اسے ایک رات کا مسافر خانہ  
بنائے رکھا، اور ایسا مسافر خانہ جس پر صبح کی پہلی کرن کبھی نہیں پھوٹتی۔

میں نے کسی آوارہ یا بازاری عورت سے کبھی ایک بار بھی عشق نہیں کیا اور زندگی  
میں ایک بار بھی ان کے انتظار میں چشم بر راہ نہ گوش بر آواز بن کر نہیں بیٹھا۔

البتہ عشق کو میں نے کلیجے سے لگایا، ہر آنکھوں پر بٹھایا، راتیں جلائیں، چچاڑوں  
پر چچاڑیں کھائیں۔ ہچکیوں سے دل کو ڈسایا، تڑپا، تلملایا، تنکے بھگوائے، پلکوں میں  
آنسو پروئے۔ تارے گنے، اور تلواروں کی دھاروں پر کروٹیں بدلیں جان لیوا  
خطروں کو ٹھوکر لگاتی، موت کے سامنے آنکھیں نہیں جھپکائیں اور ایک دن تو یہاں تک  
ہوا کہ عین مان سون کے ہیجانی موسم میں اس امر کے باوجود کہ میں تیرنا نہیں جانتا الا  
اللہ کہ کر ہو نکتے سمندر میں جھم سے کود پڑا۔ بندہ نواز اپنے کو اگر ایسے ہولناک تہلکے  
میں ڈال دینا عیاشی ہے تو خدا کے واسطے بتائیے کہ پھر عشق نام ہے کس چڑیا کا؟

جی ہاں میں نے عیاشی کی ہے، جی بھر کر لیکن عشق بازی کی ہے جی سے گزر کر  
عیاشی نے، میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں  
عیاشی نے لذات حواس سے دو چار کیا عاشقی نے نشاط شعور سے سرشاد کیا۔ عیاشی نے،  
گردن کو نفرتی بانہوں سے اجالا، عاشقی نے گردن میں قوس قزح کا زریں ہار ڈالا۔

عیاشی نے، موج ہائے رنگارنگ میں ترایا، عاشقی نے گرداب خون جگر میں  
گھملیا۔ عیاشی نے فقط مکھڑوں کی چاندنی دکھائی عاشقی نے میرے سامنے نفس و آفاق

کی نقاب اٹھائی۔

عیاشی نے میرے حیوان کو تھپتھپایا۔ عاشقی نے میرے انسان کو جگایا اور قلب  
گداختہ کی دولت بیدار مرحمت فرما کر مجھ کو شاعری اور حب نوع انسانی کا راستہ دکھایا  
میرا جسم بھی متمول ہے میری روح بھی مالا مال ہے اب کمی کس چیز کی ہے۔

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے  
اب اور چاہتے کیا ہو پیہری مل جائے؟  
اس قدر طویل لیکن ضروری دیباچہ پڑھ چکنے کے بعد آئیے میرے صحیفہ عاشقی کی  
سعادت قرأت حاصل فرمائیے۔

لیکن یہ بھی سن لیجئے کہ اب میرا حافظہ اس قدر گھٹا ٹوپ ہو چکا ہے کہ اپنے پہاڑ  
سے اٹھارہ معاشقوں کو بیان نہیں کر سکتا۔ بہت سے واقعات قطعی بھول چکا ہوں اور جو  
یاد بھی ہیں وہ بھی آدھے کجلا چکے ہیں اس لئے نیم حافظہ نشیں معاشقوں ہی پر روشنی  
ڈال سکوں گا۔

دہرائی جا سکے گی نہ اب داستان عشق

کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں، کہیں سے ہم 1

اے حافظے، ہر قدم پر ساتھ نہ چھوڑنا، اور ہر موڑ پر منہ نہ موڑنا اور اے نظام جبر،  
اے عظیم و کارفرما، آفاقی توانائی، اور اے شہرہ آفاق و نامعلوم شہر یا رے گلوں کو رنگ و  
بو، بلبلوں کو ہاؤ ہو، گھٹاؤں کو امنگ بھونروں کو ترنگ، برہمنوں کو نیاز، بتوں کو ناز، اور  
شاعروں کو ولولہ نگاہ اور حسینوں کو جمال مہر وہ عطا فرمانے والے تو نے میری جوانی کو  
عاشقی پر مامور فرمایا تھا، تیرے حکم سے مجال نہ تھی مجھ کو سرتابی کی۔

اور اب جب کہ میں تیری فرماں برداری کر کے بوڑھا ہو چکا ہوں ارباب منبر و  
محراب مجھ سے کہتے ہیں اے روسیہ، تو نے عبادت کے عوض ساری جوانی گنوا دی کا  
فرز زلفوں کے سائے میں بول اے سیاہ کار کیا جواب دے گا، قیامت کے روز تیار ہو جا

دہکتی آگ کے واسطے۔

میں دراز ریش بچوں سے کیا الجھوں صرف اس قدر کہوں گا کہ اگر مجھ کو دوزخ میں  
جھونکا گیا تو میں اس کے پھاٹک کی محراب پر، آتشیں حروف میں یہ عبارت کندہ کر  
دوں گا کہ زمین ہی کی طرح، آسمان پر بھی عدل و انصاف کا کوئی پتا نہیں پایا جاتا۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد، کجا ماند مسلمانی!

چور سے کہو، چوری کر، شاہ سے کہو تا کتا رہ قربان اس معدلت گستری کے

الا، یا ایہا قتی، اور کاسا و نادلہا

کہ عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکہا

1۔ سہیلی سعیدہ ٹوکی و غم کی، مرد و والدہ

ہائے میں اپنی داستان محبت کیوں کر لکھوں۔ حافظے کے ایوان میں بڑی تاریکی  
ہے خدارا، واپس آ جاؤ اے میری جوانی کے گونجتے، گرجتے، گھٹکتے گنگناتے، چہچہاتے  
اور بھاؤ بتاتے، رنگین و شاداب لمحو۔۔۔۔ ٹپک پڑو، میرے برگ حیات سے اے  
شبِ نم کے قطر و برس پڑو، میرے دیدہ خشک سے اے آنسوؤں کی بوندو۔۔۔۔ ابل  
پڑو، اے میری ترنگوں کے خشک چشمو۔۔۔۔ گرج اٹھو میرے سفید سر پر، اے میری  
برکھا کی کالی گھٹاؤ۔۔۔۔ لودینے لگو، اے میرے شبستانوں کی بجھی شمعو۔۔۔۔  
پھوٹ جاؤ اے میرے گلابی جاڑوں کی کرنوں جھڑی لگا دو اے میری کھوئی ہوئی، بھری  
برساتو۔۔۔۔ دمک اٹھو اے میری خوابیدہ چاندنی راتو۔ کوک اٹھو اے میری امریوں  
کی خاموش کوکلو نصب ہو جاؤ دوبارہ، اے میرا رمش و رنگ کے خاک آسودہ  
خیمو۔۔۔۔ جھنک اٹھو اے میرے ساز شکستہ کے تارو۔۔۔۔ اور جگمگا اٹھو اے مجھ پر  
صحیفہ انسانیت نازل کرنے والے، نکیلے اور صبح مکھڑو۔

ہائے ماہ و سال کی دبیز تاریکیوں کے الجھے ہوئے لچھے ان لچھوں کے پیچ و خم میں  
اس طرح جھلمل ہو رہے ہیں کچھ واقعات اور چند چہرے جیسے دور کے جنگل کے جگنو

جیسے کھرے میں بھاگتے آہو جس طرح دل سے آنکھوں کی طرف جاتے ہوئے آنسو اور جیسے خواب کے بن میں کوئل کی کوکو سامنے ایک رنگ ربو کا میلہ سا لگا ہوا ہے گویا تاریک جنگل میں دیئے ٹٹمارہے ہیں۔ کوئی لمحہ، اور کوئی مکھڑا نقاب الٹ کر سامنے نہیں آ رہا ہے۔

اچھا اب میں اس میلے، اور دور کی اس لپٹا ہٹوں کی ریلے کی جانب خود بڑھوں شاید کچھ نظر آ سکے لیجئے میں پچاس قدم آگے بڑھ گیا۔ ہاں اب تو کچھ واقعات اجاگر ہو رہے ہیں کچھ مکھڑوں<sup>1</sup> سے نقابیں ہٹ رہی ہیں دور بین نے بڑی مدد کی ارے یہ صف اول میں کون کھڑا مسکرا رہا ہے؟ ہائیں یہ تو ”س ح“ کا مکھڑا ہے ذرا اور قریب آؤ میرے نکھڑے محبوب کہ تم پر قلم اٹھا سکوں بڑی مہربانی کی تم نے کہ میرے پاس آ گئے۔

اب آپ ”س ح“ کے حالات سنیں، بسم اللہ۔

1۔ ان مکھڑوں کے نام س ح + ع ج + الف الف خ + م ج + ت د + ش، د + الف، ن، ک، د، ع، ج + الف، خ + ر، ب، مس میری + مس گلینی + م، ب + ر، ک + ط، ج + ج، ب + اور ع، خ =

☆☆☆☆☆☆☆☆



## س، ح

یہ نام خدا ان جوانی کی راتوں، مرادوں کے دن کا واقعہ ہے، جب کہ میری عمر نے کھیل کود کے میدان سے نکل کر میری بھیگی مسوں کے ساحل پر ابھی قدم ہی رکھا تھا کہ ایک روز چراغ جلے ایک بھبھوکا سا یوروشین لڑکا میرے چچا کے ہاتھی پر سوار میرے گھر کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے آیا تھا۔

وہ گلابی جاڑے کی ٹھنڈی سہانی شام وہ جلسے کی دھوم دھام اور وہ امر و گل فام وہ پھاٹک پر بجتی شہنائی، اور ہاتھی پر وہ اس طفل پری زاد کی رعنائی، دھرتی بولے رام دہائی۔

اگر میر تقی میر، اسے دیکھ لیتے تو ”اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں“ کی رسم ترک فرما دیتے اور انشاء اللہ خاں انشا ارے رے رے، ارے رے رے رے، کہ کہ زمین پر بیٹھ جاتے۔  
ارے ہاتھی کے اوپر اس کا جھل جھلا تا براں چہرہ:

”نیرے پر آنی دمک رہی تھی گویا“

میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے، مانی صاحب جانی سے (جواب میرے ٹیوٹر کم اور بے تکلف دوست زیادہ ہو چکے تھے) کہا خدا کے واسطے اس کو میرے پہلو میں لا کر بٹھا دیجئے۔

مانی صاحب جو پہلے ہی سے اس کو دل دے چکے تھے بڑی عجلت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو بڑے ہی چاؤ سے لا کر میرے پہلو میں بٹھا دی اور اس کے بیٹھتے ہی میرے بائیں پہلو میں گرمی محسوس ہونے لگی اور مانی اس کو اس حسرت کے ساتھ دیکھنے لگے کہ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔

اتنے میں ناچ گانا ہونے لگا اور طوائف، ہر چند خوب رو اور کم سن تھی، مگر ”س، ح“ کے مقابل کو بچہ چہرے کے سامنے، ایسی نظر آنے لگی گویا گیس کے سنسناتے ہنڈے

کے سامنے ریوڑی والے کا دیا ٹمٹما رہا ہے۔

میرے کان مطربہ کی ٹھمریوں کے جھولے میں جھول رہے تھے اور میری آنکھیں اس کے گلابی چہرے سے اٹھتی ہوئی لووؤں پر قفس کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا عرب کی ”ہزار راتیں“ اس ایک رات میں سمٹ کر آگئی ہیں۔

میں نے اس پر اس طرح نظریں جمادیں کہ اس کے رخسار کی جلد میں سویوں کی طرح چھپنے لگیں اس نے مڑ کر مجھے دیکھا ایک ہی نظر میں جان گیا میرے دل کا عالم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ یوں مسکرایا کہ میرے سر پر بنارس کی صبح طالع ہو گئی اور تم ہمارے ہم تمہارے ہو گئے کا غیر ملفوظ بیان ہو گیا اور ہمارے چہروں کے رنگ میں اپنی تلواروں کی دھار مچلنے لگی اور دونوں پر ایسی ربودگی طاری ہو گئی کہ زبانوں سے ایک حرف بھی نہیں نکل سکا۔

اور جب پچھلے پہر، محفل درخواست ہونے لگی اس نے بڑے لوچ کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی خیمہ بھائیں بھائیں کرنے لگا ہر گوشے سے ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں اور بجھی ہوئی مشعلوں کا دھواں میری آنکھوں میں لگنے لگا۔

جب مانی بھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گئے محل سرا میں آکر میں بستر پر دراز ہو گیا بستر کی شکنوں میں دھار پیدا ہو گئی لاکھ لاکھ کروٹیں بدلیں نیند نہیں آئی میری زندگی میں وہ پہلی عشق کی رات تھی۔

اتنے میں گھڑیاں نے چار بجے کا کجر بجایا ٹھن ٹھن ٹھن اور چلنے لگا میرے دل پر گھن۔

یہ سوچ کر کہ اب نیند نہیں آنے کی بستر سے اٹھا پڑھنے کے کمرے میں گیا اور کتاب اٹھالی کہ اس سے جی بہلاؤں۔

کتاب کے ورق پر خیمہ نصب ہو گیا مجرا ہونے لگا حروف کا پے، پھیلے شیشے کی

محراب بن گئے اور اس محراب میں ”س ح“ کا چہرہ دکنے لگا۔

آپ بھی وہ شعر سن لیں کہ میری عاشقانہ شاعری کی انہیں سے ابتدا ہوئی ہے۔

آئیں اسکول کے احباب سنیں درد مرا  
گرم کر دے گا لہو، ہر نفس سرد مرا  
ایک تنکا بھی اگر آنکھ میں پڑ جاتا ہے  
آدمی ہے کوئی ایسا جسے چین آتا ہے؟  
چین لینے دیں بھلا کیا مجھے ایسی آنکھیں  
جن کے پردوں میں سائی ہوں کسی کی آنکھیں  
اپنی آنکھوں کی افیت کو بھلا دیتا ہوں  
میز سے بڑھ کے کتاب ایک اٹھا لیتا ہوں  
روبرو آنکھ کے جس وقت کتاب آتی ہے  
اک جھلک، صفحہ قرطاس پہ پڑ جاتی ہے  
دیر تک کچھ نظر آتا نہیں بجلی کے سوا  
دفعۃً ہوتی ہے ہر سطر میں جنبش پیدا  
حرف دب جاتے ہیں کچھ دیر میں رفتہ رفتہ  
صاف کھنچ جاتا ہے ہر لفظ پہ چہرہ ان کا

صبح ہوتے ہی مانی صاحب کے وہاں پہنچا وہ دادامیاں کی بارہ دری کے پھانک  
کے اوپر والے کمرے میں رہتے تھے میں نے زینہ طے کر کے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے  
روہانسی آواز آئی ”کون؟“ میں نے اپنا نام بتایا دروازہ کھل گیا وہ میرے گلے لگ کر  
رونے لگے میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا کیا بات ہے انہوں نے کہا کیا پوچھتے  
ہو، رات کو اس نے میری طرف نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا پرتی رہیں وہ آنکھیں  
پلکوں کے سائے سائے۔

ان کا دل رکھنے کی خاطر میں نے کہا مانی صاحب یہ بات نہیں ہے اس نے آپ کی طرف کئی بار نگاہ اٹھائی آپ ایسے منہ لٹکائے بیٹھے تھے کہ دیکھ نہیں سکے۔

یہ سن کر ان کا چہرہ ہنساں ہو گیا اور کہا ”تری آواز کے اور مدینے“

انہوں نے پوچھا تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں میں نے کہا پرسوں انہوں نے کہا تو میں ”س، ح“ کو ترسوں تمہارے پاس لے کر آؤں گا لکھنؤ میں

اس کے تیسرے روز میں لکھنؤ پہنچ گیا اور میرے پہنچنے کے دوسرے ہی دن مانی صاحب آگئے آتے ہی انہوں نے بڑے اہتمام سے خط بنایا، دیر تک غسل کیا، اور ناشتہ کر کے جب باہر جانے لگے تو کہا آج شام کو میں اسے لے کر تمہارے پاس آؤں گا ان کے جاتے ہی میں اپنے مکان کی صفائی و آرائش میں مشغول ہو گیا، ہر گوشے میں جھاڑو دلائی میزیں کرسیاں بچھوائیں گملوں میں پانی ڈلوایا چھت گیری درست کرائی، چھت میں لٹکے ہوئے قمقموں کو دھلویا، لیمپ صاف کرائے، ایک اور نیا لیمپ خرید لایا جس میں جھاڑوں کے سے رنگین قلم لٹکے ہوئے تھے ایک موتیوں کی جھلکتی چمک خریدی، اسے زینے کے بالائی دروازے پر لٹکا دیا۔

آرائشوں سے فارغ ہو کر، کوئی تین بجے لیٹ گیا تاکہ آرام کرنے سے چہرے پر تازگی آجائے پانچ بجے بستر سے اٹھا کٹی کورا صابون سے خوب مل مل کر نہایا، چالیس ہزار مارکہ کی چھالٹین کا پانچ جامہ، اور بنارسی ریشم کا کرتہ پہنا، کرتے میں حنا کا عطر ملا اور ہمہ تن انتظار ہو کر بیٹھ گیا۔

غلغلہ	ہے	جو	ان	کے	آنے	کا
رنگ	دیکھو	غریب	خانے	کا		
روح	کو	آئینہ	دکھاتے	ہیں		
در	و	دیوار	مسکراتے	ہیں		
آج	گھر	گھر	بنا	ہے	پہلی	بار



دل میں ہے خوش سلیقگی کی بیدار  
 جمع سماں ہے عیش و عشرت کا  
 خوف، دل میں فریب قسمت کا  
 سوز قلب کلیم، آنکھوں میں  
 اشک امید و بیم آنکھوں میں  
 چشم بر راہ شوق کے مارے  
 چاند کے انتظار میں تارے

جب دن ڈوب گیا، سائے بھاری اور ملگجے سے ہو گئے ٹھنڈی ہوا دے پاؤں چلنے  
 لگی، وقت کے منہ پر سانولا پن دوڑ گیا مدھ ماتی شام اودھ کی لیں رومانی فضا کے  
 ماتھے پر مچلنے لگیں اور لیمپوں کی روشنی ہمکنے لگی تو خدا خدا کر کے نازک قدموں کی آہٹ  
 سے زینہ بجنے لگا میں چھلانگ لگا کر زینے کے دروازے پر پہنچ گیا اور دیکھا کہ نام خدا  
 ”س، ح“ چلا آ رہا ہے اور مانی ایک مرید یا مصاحب کے مانند اس کے پیچھے پیچھے آ  
 رہے ہیں۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا سیڑھیوں سے اوپر آتے ہوئے، اس کا چہرہ ایسا  
 معلوم ہوا گویا آفتاب ابھر رہا ہے اور یوسف کی پیشانی کنویں کی جگت سے طلوع ہو  
 رہی ہے اوپر آ کر جب اس نے مجھ سے مسکرا کر ہاتھ ملایا تو میرے وجود کے منارے  
 پر شہنائی سی بجنے لگی۔

مانی صاحب نے شکریہ طلب آنکھوں سے مجھے دیکھا میری پلکوں کی جھپک نے  
 ان کا شکریہ ادا کیا۔

اب ہم جگمگ جگمگ کمرے میں آ گئے ”س، ح“ میرے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گیا  
 اور مانی باورچی خانے چلے گئے اور مجھ پر

یوں ہم اس شوخ کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں  
 کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ بچے بیٹھے ہیں

کا عالم طاری ہو گیا۔

اتنے میں مانی آگئے علی شیر خاں سپاہی اور نور روز باورچی نے میز پر مٹھائیوں  
میوؤں، پھلوں کی بھری پلیٹیں بالائی کی قابیں اور چائے کا سامان چن دیا۔

جب کھانا پینا ہو چکا تو کمرے پر ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

میں نے لاکھ لاکھ کوشش کی مگر بولا نہیں گیا الفاظ کو زبان پر کھینچ کر لاتا تھا تو وہ  
راستے ہی میں گر پڑتے تھے یعنی

کل ان کے آگے شرح تمنا کی آرزو  
اتنی بڑھی کہ نطق کو بے کار کر دیا  
میں نے گھبرا کر اسے دیکھا اس نے میری جانب نگاہ اٹھائی اور جھپکتی پلکیں باتیں  
کرنے لگیں۔

اس جمود کو توڑنے کی نیت سے مانی صاحب نے کہا اب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی  
نہ کہا جاتا ہم دونوں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں  
پھر مانی صاحب نے کہا شبیر اپنی وہ نظم تو سناؤ

دفعۃً ہوتی ہے ہر سطر میں جنہش پیدا  
میں نے جی کڑا کر کے وہ نظم سنائی ہر چند وہ تھا یوروشمین مگر لکھنؤ کی ماں کی گود میں پلا  
ہوا تھا اس نے جی کھول کر مجھے داد دی اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی  
کہ میرے اشعار اس کی آنکھوں کے پردوں میں چبھ رہے ہیں مانی سے رہا نہیں گیا  
اپنے اظہار عشق کی خاطر انہوں نے کہا میری ایک تازہ غزل بھی سن لیجئے میں نے کہا  
ارشاد

اور انہوں نے ایسی در د بھری چبھتی ٹھہر ٹھہر کر بہتی اور چھالے کی طرح تپکتی آواز  
میں اپنی غزل سنائی گویا ایک کلیجہ ہے جو ململ کے دامن کی طرح برابر پھلتا ہی چلا جا رہا  
ہے اس کے بعد جی کڑا کر کے میں نے ”س، ح“ سے پوچھا کیسا مزاج ہے اس نے

ڈراسا مسکرا کر کہا اچھا ہوں ہائے اس اچھا ہوں کی مٹھاس۔

اب اس نے کہا اجازت ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دوں میں نے گھبرا کر کہا اچھا کیا جائے گا اس نے بڑی نرمی سے کہا اگر آپ اجازت دیں گے تو میں نے بڑی بے کسی کے ساتھ سر جھکا کر کہا بہت اچھا۔

اور جب وہ گلے لگ کر چلا گیا تو مانی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے میں نے کہا کہنے کیسا مزاج ہے، انہوں نے غصے میں سر اٹھا کر کہا میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا ارے ڈوب مرنے کی بات ہے کہ معشوق جانے کی اجازت طلب کرے، اور عاشق صاحب بہادر اکھڑ پن سے ارشاد فرمائیں اچھا کیا جائے گا اس اچھا کیا جائے گا کی ایسی تیزی پٹھان لاکھ لکھنویں پروان چڑھے مگر لٹھ ہی رہتا ہے لٹھ نرالٹھ۔

عاقبت،	گرگ	زادہ،	گرگ	شود
گرچہ	بادی،	بزرگ		شود

ان کی اس ڈانٹ پھٹکار سے میں کٹ گیا اور دل ہی دل میں لعنت بھیجنے لگا اپنے

اجڈ پن پر۔

اور اس بڑھاپے میں بھی ”اچھا کیا جائے گا“ کا لٹھ پن جب یاد آجاتا ہے تو اپنے پرنفرین کرنے لگتا ہوں اچھا کیا جائے گا پر شیطان کی پھٹکار ایک نہیں ہزار بار

☆☆☆☆☆☆

## ع، ج

سیتا پور براچ اسکول میں ہم دونوں ہم جماعت تھے پورا کلاس، ایک محمل تھا اور اس کی ذات لیلیٰ ہر لڑکا چاہتا تھا کہ اس کا دوست بن جائے اس کا غرور حسن کسی کو منہ نہیں لگاتا تھا۔

صرف لڑکوں ہی کی نہیں، اساتذہ کی نظریں بھی اس کی طرف بار بار اٹھتی تھیں لیکن وہ بملتب می رود، طفل پری زاد مبارک باد، مرگ نو باستاد کسی کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا تھا۔ غرور حسن کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے خاندان کی وجاہت اور اپنے باپ کے سرکاری عہدے کی جلالت پر بھی بڑا مانا تھا۔ اس کی طرف میری آنکھیں اٹھتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ میرے تصور جمال کے سانچے میں ڈھالا گیا اور میری آنکھوں کے مشورے سے اس کے خدو خال تراشے گئے ہیں۔

ہر چند وہ میری آنکھوں کی دعائے مستجاب تھا لیکن اس کے تختہ پر نگاہ کر کے میں اس سے بات نہیں کرتا تھا۔

کئی مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے میں اس کے قریب جانے سے بھاگتا لیکن در پردہ اس کی جانب دوڑتا رہا۔

بڑھتا چلا گیا ہوں، اسی کی طرف کچھ اور یوں بھی ہوا ہوں اس سے گریزاں کبھی کبھی ایک دن اسکول جاتے ہوئے میری اس سے مڈ بھیڑ ہو گئی میں نے خود داری طلب گاری کی ملی جلی کیفیت سے اس کی جانب نگاہ اٹھائی تو اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بھتی ہوئی آواز سے پوچھا تمہارا نام شبیر ہے؟

میں نے کہا ہاں میرا نام یہی ہے اس نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو میں نے



جواب دیا لیج آبا دکا اس نے بٹاش ہو کر کہا ارے وہ تو ہمارے لکھنوکا ہی ایک محلہ ہے تم شیعہ ہو کہ سنی؟ میں نے کہا آدھے سے زیادہ شیعہ اس نے کہا پورے شیعہ بن جاؤ، تو میرے تمہارے پیٹنگ بڑھ جائیں میں نے کہا پہلے مجھ سے پیٹنگ بڑھاؤ، پھر پورا شیعہ بناؤ یہ سن کر اس کی سونے کے ورق کی سی چہرے کی باریک جلد کے نیچے ایک رنگ دوڑنے لگا وہ میری طرف دو قدم بڑھا اور میرے قریب آ کر اپنے ماتھے سے میرے ماتھے پر زور سے ٹکرا دی اس کے ٹکرا رتے ہی میرے بدن میں لہو تیزی سے دوڑنے لگا ٹکرا ہر چند زبردست لیکن بلا کی میٹھی تھی ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا نے لگے اور اس نے بڑے تحکم کے ساتھ اپنی بلوریں انگلی اٹھا کر مجھ سے کہا آج اسکول کے بعد میرے گھر چلنا ہو گا میری باچھیں کھل گئیں اور کہا ضرور چلوں گا۔

کہتے ہیں ”شکر خورے کو شکر اور موزی کو ٹکرا“ لیکن یہ کہاوت اس موقع پر بالکل الٹی ہو کر رہ گئی۔

اس ٹکراؤ کے بعد میں اس کے گھر جانے لگا محبت دن دوئی رات چو گئی بڑھنے لگی اور اس میں اس قدر غلو پیدا ہو گیا کہ جس دن کسی مجبوری کی بناء پر اس کے گھر نہیں جاتا تھا تو منہ کا مزہ اچھیکا پھیکا سا محسوس ہوتا تھا۔

میں اس کے جمال کی شرح کیوں کر کروں الفاظ پر جب اس کے حسن کا بار ڈالتا ہوں تو ان کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں میرے نزدیک رب جمال نے بڑی کیاوی دیدہ وری کے ساتھ سب سے پہلے تو وادی کشمیر کی روپہلی چاندنی، اور صبح کو ہسار کی سنہری کرنوں کو ہلکی سی بنولے کی آنچ پر رکھ کر پگھلایا، پھر تخت الماس میں نچوڑ دیا پھر چنبیلی اور موتے کے پتوں کو خوب حل کر کے اس میں گھول دیا اور پھر اوپر سے پگھلا ہوا سونا ٹپکا دیا اس کے بعد کھل میں کٹے ہوئے موتیوں کا باریک سفوف اس پر چھڑک دیا اور اس کے بعد اس نیم سیال مرکب کو نسیم شمال کی راہ گزار میں رکھ دیا، اور جب وہ جم گیا تو اس سے اس کی موہنی صورت تراش لی۔

ایک روز بڑے دن کی چھٹی منانے کے واسطے ہم دونوں سیتا پور سے لکھنوکا کی طرف

روانہ ہوئے خوش قسمتی سے ہمارا ڈبا خالی تھا ہم نے بڑے بے تکلفی کے ساتھ سفر کیا۔  
 ہماری گاڑی جب کسی اسٹیشن پر ٹھہرتی میرا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا کہ کہیں  
 کوئی مسافر نہ آدھمکے اور ہمارے طلسم کو توڑ ڈالے مگر اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ آخر تک کوئی  
 مسافر نہیں آیا اور ہم موج کرتے رہے سچ کہا ہے کسی نے السفر وسیلۃ الطفر رات  
 ہوتے ہی وہ میرے زانو پر سر رکھ سو گیا ارچو دھویں کی چاندنی اس کے سنہری گالوں  
 میں جذب ہونے لگی اس وقت اس کے چہرے سے جواثر میں نے قبول کیا تھا آج  
 تک دل پر نقش ہے ہائے وہ جھلکتی چاندنی اور ہائے وہ اس کا دمکتا چہرہ۔

ایک روز لکھنؤ میں اس نے کہا شبیر کل آنا تو دو اشرفیاں لیتے آنا اور جب میں اپنی  
 ماں سے دو اشرفیاں لے کر اس کے پاس گیا اور ریشمی رومال میں رکھ کر میں نے وہ  
 اشرفیاں پیش کیں اس نے کہا اپنے پاس رکھو میں تو تمہیں آزما رہا تھا میں نے غصہ میں  
 آکر وہ اشرفیاں کوٹھے سے نیچے پھینک دیں اس نے گھبرا کر کہا ارے یہ تم نے کیا کیا  
 میں نے کہا تم دو کوڑی کی دو اشرفیوں سے میری محبت کا امتحان لے رہے تھے یہ دیکھو  
 میری محبت یہ کہتے ہی میں نے میز سے چھری اٹھائی اور اپنے سینے میں مار لی دھل دھل  
 خون بہنے لگا اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اس نے جلدی سے اپنی قمیض کا دامن پھاڑ کر  
 اسے پانی میں تر کیا اور زخم پر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا۔

اتنے میں اس کا گردے کی سی داڑھی والا، منہ بوالا ”چچا“ آگیا وہ ہم دونوں کی  
 یک جائی سے خار کھاتا تھا اس نے مجھ کو لوہا ہان اور ”ع، ح“ کو زار و قطار روتے دیکھا  
 تو کم بخت لال پیلا ہو کر پوچھنے لگا سچ بتاؤ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے ”ع، ح“ نے بڑی  
 لجاجت کے ساتھ کہا شبیر چھری لے کر سیبوں کے ٹوکڑے کی طرف بڑھے ٹھوکر لگ گئی  
 گر پڑے، اور چھری سینے میں لگ گئی۔

اس خبیث نے، کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا یہاں تو سیبوں کا کوئی  
 ٹوکرا نظر نہیں آ رہا ہے ”ع، ح“ نے کہا چچا وہ ٹوکرا بھی ابھی کوئی اٹھا کر اندر لے گیا

ہے اس نے کہا کون اٹھا کر لے گیا ہے اس کا نام بتاؤ اس نے کہا جب وہ ٹوکرا اٹھا کر کمرے سے نکل رہا تھا میں نے فقط اس کی گدی دیکھی تھی نام کیا بتاؤں چچا نے دانت پیس کر کہا کل کا چھو کرا، اور مجھے الو بنا رہا ہے ابھی تیرے باپ سے جا کر شکایت کرتا ہوں یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گئے اور ہم دونوں ہراساں ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

”ع، ح“ نے مجھ سے کہا اگر باتیں بلائیں اور پوچھیں تو کیا جواب دو گے میں نے کہا میں کیا جواب دوں گا یہ فیصلہ کر چکا ہوں اس نے کہا وہ میرے باپ ہیں تم بھی ان کو اپنا باپ سمجھ کر جواب دینا۔ ٹھنولی پر نہ اتر آنا کہ اتنے میں داڑھی والا مردود چچا آگیا اور کہا تم دونوں کو مرزا صاحب (یعنی ”ع، ح“ کے والد ماجد نے بلایا ہے)

ہم دونوں ان کی خدمت میں پہنچے انہوں نے بکمال شفقت نظر اٹھائی اور فرمایا شبیر تم کو نہیں معلوم ہمارے تمہارے خاندان کے کتنے پرانے تعلقات ہیں تمہارے پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا اور میرے دادا۔۔۔۔۔ کے مابین برادرانہ تعلقات تھے، مجھے یقین ہے کہ تم پٹھان، اور عالی خاندان ہو جھوٹ نہیں بولو گے اور جو واقعہ ہو گا سچ سچ بتا دو گے۔

میں نے کہا چچا جس طرح میرے پردادا اور آپ کے دادا کے درمیان برادرانہ تعلقات تھے ویسے ہی میرے اور ”ع، ح“ کے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں انہوں نے میری برادرانہ شفقت کو آزمانے کے لئے مجھ سے کہا کل دو اشرفیاں لیتے آنا، میں سمجھا انہیں ضرورت ہے میں لے آیا اور جب میں ان کو وہ اشرفیاں دینے لگا انہوں نے کہا مجھ کو ضرورت نہیں میں تو فقط تمہیں آزما رہا تھا یہ سن کر مجھے غصہ آگیا میں نے اشرفیاں نیچے پھینک دیں، اور اپنے سینے پر چھری مار لی۔

مرزا صاحب نے ”ع، ح“ سے کہا آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا آج انہوں نے اپنے چھری مار لی ہے کل تمہیں چھری مار دیں گے پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیاء گھڑی میں بھوت۔

اور بیٹے کو سمجھانے کے بعد مرزا صاحب نے اس مردود، چغل خورے ”چچا“ سے

کہا۔۔۔۔۔ خان یہ تو ایک طفلانہ کھیل تھا ایسے واقعات کو بڑھا چڑھا کر اور برارنگ دے کر پیش کرنا حماقت ہے اور ہم دونوں ”چچا“ کو طعن آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے بالا خانے پر آگئے ”ع، ح“ نے فرط خوشی سے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں بڑے دن کی چھٹیاں منانے کے بعد اب ہم پھر سیتاپور آگئے اور زندگی مزے سے گزرنے لگی۔

”ع، ح“ کے ایک اسی پچاس برس کے معلم اس کے گھر میں رہتے تھے انہوں نے ع، ح کے ایماء پر مجھ پر شیعیت کا گہرا رنگ چڑھانا شروع کر دیا اور جب میں پکا شیعہ بن گیا تو اس نے بڑی دھوم دھام سے میری دعوت کی اور کہا اب میں ہمیشہ کے لئے تمہارا ہو گیا اور میری ہڈیوں کے گودے تک اس کی محبت اتر گئی۔

اسی اثناء میں یہ ایک بہت بڑا المناک سانحہ پیش آیا کہ میرے باپ نے مجھ کو تحریر فرمایا کہ میں سیتاپور برانچ اسکول سے نام کٹا کر فلاں تارخ کو لکھنو پہنچ جاؤں، وہ مجھے حسین آباد ہائی اسکول میں داخل کرادیں گے اور مرزا حبیب حسین صاحب ہیڈ ماسٹر کی نگرانی میں رکھیں گے۔

جب یہ خط پہنچا زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی دل اس زور سے دھڑکا، گویا منہ سے نکل جائے گا اور جب میں نے وہ خط ”ع، ح“ کو دکھایا وہ چارپائی پر گر گیا آنکھوں سے آنسوؤں کا دجلہ بہنے لگا پھول سا چہرہ دھلے کپڑے کی طرح سفید ہو گیا میں نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ کیجے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جاتا ہے آسمان لئے کوچے سے یار کے  
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر  
اور آخر کار اس کے چوتھے دن بصدنا لہ و فغاں سیتاپور سے رخصت ہو گیا۔

بنو میدی، حزیں، از کوئے اوبار سفر بستم  
خدا، صبرے کند روزی، دل امید و ارم دا

☆☆☆☆☆☆☆☆



## مس میری رومالڈ

یہ اس دور کا ذکر ہے، جب میں لکھنؤ چرچ مشن ہائی اسکول میں زیر تعلیم اور لائٹس روڈ کی گلی کے ایک دو منزلہ مکان میں رئیس احمد اور ابرار کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ایک وسیع اور دو منزلہ مکان تھا اس مکان کے ایک حصے میں مس میری رومالڈ اپنی سوتیلی جوان بیوہ ماں مسز روبی رومالڈ کے ساتھ رہتی تھیں زینہ ہم دونوں کا مشترک تھا اور آتے جاتے ہم دونوں کی مڈ بھیڑ ہو جایا کرتی تھی اور ہم ایک دوسرے کو مقناطیسی نظروں سے دیکھا کرتے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ ہماری خواب گاہوں کے درمیان پتلا سا زینہ تھا اور جب ہم اپنے بستروں پر لیٹے تھے تو فریقین دیر تک ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنا کرتے تھے۔

ایک روز سر شام ہم دونوں زینے پر چڑھ رہے تھے وہ آگے تھی میں پیچھے اس کے لونڈر کی خوشبو میرے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھی کہ یکا یک اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ”اوگاڈ“ (ہائے اللہ) کہہ کر زینے پر بیٹھ گئی اور بڑے کرب کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑ لیا میں نے انگریزی میں پوچھا آپ کو کیا تکلیف ہے اس نے کہا میرے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا ہے آپ مجھ کو سہارا دے کر میری خواب گاہ تک پہنچا دیا اومانی گاڈ، اومانی گاڈ میں نے لپک کر اس کی چھلای کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور سہارا دے کر اسے اس کی خواب گاہ میں پہنچا دیا وہ بستر پر لیٹ کر ترپنے لگی میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں اس نے کہا نہیں پہلے آپ میرا پیٹ سہلا دیں اگر اس سے افاقہ نہ ہو تو پھر ڈاکٹر کو بلا لائیں۔ میں بڑے اسہاک کے ساتھ اس کا پیٹ سہلانے لگا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے درد میں تخفیف ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں مجھے بڑے تشکر سے دیکھا اور کہا اگر تکلیف نہ ہو تو یہ سامنے سوڈے کی بوتل کھول کر مجھے پلا دیجئے۔

میں نے بوتل کھول کر گلاس میں سوڈا بھرا اور پیش کر دیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کہا آپ پہلے اسے ذرا سا چکھ لیں میں نے ایک گھونٹ پی کر گلاس اس کو دے دیا وہ میری طرف

نگاہیں اٹھا کر اس طرح پینے لگی گویا سوڈے کے ساتھ وہ مجھے بھی پی رہی ہے۔  
مجھے اور سوڈے کو پی کر اس نے پھر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے کہا میری ماں باہر  
گئی ہوئی ہیں اکیلے جی گھبرائے گا تھوڑی دیر اور بیٹھ جائے میں کرسی پر بیٹھ گیا اس نے  
کہا نہیں میرے بستر پر بیٹھ جائے۔

میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اس نے حضرت مسیح کی بڑی تصویر پر جو اس کے  
سرہانے آویزاں تھی چادر ڈال دی۔

اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے اور برابر اس کی  
سوتیلی ماں پر ریت بچے گئے اور دونوں میں گاڑی چھنے لگی۔

ایک روز ہم لوگ حضرت گنج کے ایک شاندار ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ دو  
گورے جو نشے میں دھت تھے وہاں آ گئے میری اور اس کی ماں کو برا بھلا کہنے لگے کہ  
تم یورپین ہو کرنیو آدمیوں کے حلقے میں بیٹھی ہوئی ہو میں نے ان کو ڈانٹا کہ بدتمیزی نہ  
کرو ہمارا ہی نمک کھاتے اور ہمیں پرغراتے ہو ایک گورے نے میری بات ان سنی کر  
کے مس میری کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کے سر پر ڈنڈا مار دیا دوسرا گورا بڑھا  
تو برابر نے اس کے سر پر اچار کی بھری بوتل مار دی اچار آنکھوں میں پہنچا تو وہ بلبلا گیا  
اور دونوں گورے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک روز اس کی کتیا دو منزلے سے انگنائی میں گر کر دم توڑنے لگی میری نے چیخ کر مجھ  
سے کہا ارے وہ سامنے برانڈی کی بوتل رکھی ہوئی ہے جلدی لے آئے میں نے کہا میں  
برانڈی کی بوتل نہیں چھو سکتا اس نے مجھے قہر سے دیکھا دوڑ کر بوتل اٹھائی اور نیچے اتر کر دم  
توڑتی کتیا کے جڑے چیر کر کوئی آدھی بوتل اس کے منہ میں انڈیل دی اور یہ دیکھ کر مجھے  
حیرت ہو گئی کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کتیا کی حالت بہتر ہو گئی اور کلیلیں کرنے لگی۔

اس نے مجھ سے کہا تم نے برانڈی کا معجزہ دیکھا جو چیز مردوں کو جلا سکتی ہے تم اس  
کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے شرم، شرم، شرم

ایک شام کو اس نے مجھ سے کہا تم سہ پہر کو ٹہلنے چلے جاتے ہو تو روز ایک حبشی نوجوان آتا اور میرے کمرے کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر کچھ گاتا اور پھر چلا جاتا ہے کل تم ٹہلنے نہ جانا اور یہیں بیٹھنا اور اس کالے حبشی کا دماغ صحیح کر دینا دوسرے دن میں ٹہلنے نہیں گیا اور ٹھیک پانچ بجے سڑک سے آواز آنے لگی۔

”مارے ہیں جواں لاکھوں اے رشک چمن تو نے اے رشک چمن تو نے، اے رشک چمن تو نے بن بن کے دلہن تو نے“

میں نے جھانک کر دیکھا وہی حبشی نوجوان تھا ڈنڈا لے کر میں نے اس کی ایسی ٹھنکائی کر دی کہ پھر اس نے کبھی اس گلی کا رخ بھی نہیں کیا۔ مس میری نے مسکرا کر کہا تم تو بہت بڑے ”نائب“ ہو جو گوروں کو بھی پیٹتا ہے اور کالوں کو بھی۔

اڑتے اڑتے میرے معاشقے کی خبر میرے باپ تک پہنچی وہ نہایت دانش مند انسان تھے ابرار کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ وہ فرنگی لڑخی اگر مسلمان ہو جائے اور پردہ نشینی اختیار کر لے تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں کہ شبیر سے اس کا عقد کر دوں جب میں نے میری کے سامنے اپنے باپ کی یہ دونوں شرطیں پیش کیں تو اس نے کہا ڈارلنگ میں تمہاری خاطر پردہ نشینی کی گھٹن تو برداشت کر لوں گی لیکن اسلام کبھی قبول نہیں کروں گی اس لئے کہ یہ گندوں کا دین ہے۔

یہ سنتے ہی مجھ کو تاؤ آگیا عشق کو جذبہ اسلام نے دیوچ لیا میں نے آؤدیکھانہ تاؤ سامنے رکھا ہوا ایک بھاری اسٹول اس کو کھینچ کر مار دیا وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اسٹول ایک لکڑی کی الماری پر لگا اس کا پٹ چور چور ہو گیا اور میں اسے اور عیسائی مذہب کو برا بھلا کہتا اس کے گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد میں اس کے وہاں پھر کبھی نہیں گیا اور لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہو گیا اس واقعہ کے کوئی سال بھر کے بعد جب چھٹیوں میں لکھنؤ آیا تو نہ جانے اسے کیوں کر پتا چل گیا وہ عین دوپہر کے وقت

میرے پاس آئی اور جب میں نے اس کی جانب نظر اٹھائی تو یہ دیکھ کر میرے دل کو بڑا زبردست دھکا لگا کہ صرف ایک سال کی مدت میں اس کا آدھا حسن برباد ہو چکا ہے اور وہ شام کے مرجھائے پھول کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوڑ کر مجھ سے چٹ گنیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور آواز گلے میں پھنسنے لگی اس نے مجھ سے کہا ڈارلنگ تمہاری محبت مجھ کو کھا گئی مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں چلے گئے ہو، ورنہ وہیں پہنچتی تمہاری جدائی کے ہاتھوں ڈارلنگ مجھ کو دق کا مرض ہو چکا ہے میری سانس سے دور ہٹ کر بیٹھو میں اس وقت تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ آج سے ایک سال قبل میں نے جو اسلام کی توہین کی تھی تم اسے معاف کر دو اب میں اس دنیا سے جا رہی ہوں جانے والے کا یہ حق پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے دل سے معاف کر دیا جائے ڈارلنگ جو اسٹول تم نے کھینچ کر مارا تھا کاش وہ میرے لگ جاتا میں اسی وقت مر جاتی لیکن یہ دن نہ دیکھتی۔

میں نے اسے بڑی گرم جوشی کے ساتھ چمٹا لیا میری آنکھیں پھر برسنے لگیں میں نے کہا پیاری میری میں تمہیں دل سے معاف کر رہا ہوں اور میں تم کو مرنے نہیں دوں گا میرے پاس جو کچھ ہے سب تمہارے علاج پر نثار کر دوں گا تم گھبراؤ نہیں اس نے کہا شبیر تم میرا علاج نہ کراؤ اب میں بچوں گی نہیں اور ہاں یہ بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے سے پیشتر میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ تمہارے چلے جانے کے بعد میرے پیٹ سے تمہاری لڑکی پیدا ہوئی تھی ہو بہو تمہارا نقشہ تھا اور تمہارے سیدھے پاؤں کی انگلی میں جو تل ہے وہ بھی اس نے وراثت میں پایا تھا ہائے وہ مر گئی یہ کہہ کر اس کی آواز رندھ گئی اس کے گورے گورے گالوں پر ملگجا پن سا دوڑنے لگا میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور سہ بارہ آنسو بہنے لگے۔

میں نے اس کے علاج پر اپنی ماں سے لے لے کر ہزاروں روپے صرف کر دیئے ڈاکٹروں پر ڈاکٹر بدلے ان کے بورڈ بٹھائے بڑے بڑے نامی طبیبوں کو بلایا لیکن



ہائے وہ بچ نہیں سکی اور مجھے دغا دے کر وہاں چلی گئی جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا۔  
اس کا پھول سا چہرہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے اور مجھ سخت جان کی پیری اب تک  
اس زمین پر سانس لے رہی ہے یہ کتنی عبرت انگیز اور شرمناک بات ہے۔

پس از معشوق جینا، عشق کو بدنام کرنا ہے  
خدا مجنوں کو بخشے، مر گیا اور ہم کو مرنا ہے  
ہائے اے میری مس میری صرف ڈھائی یا تین سال کی قلیل مدت کے لئے تیرے  
گلستان جمال نے مجھ پر پھول برسائے اور اب تیری موت پچاس سال سے مجھ پر  
انگارے برسا رہی ہے مسرت کی عمر کس قدر قلیل اور غم کی عمر کس قدر طویل ہوتی ہے۔  
ہم کو صرف ایک بوند بھر تبسم کی لہروں میں تیرا کرا آنسوؤں کے بے شمار گردابوں میں  
ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا جاتا ہے ارے کیسا یہ کارنامہ ہے؟ اے تازہ داروان بساط  
ہوائے گل مجھ سے عبرت حاصل کرو اور خوشی کے حصول سے ہاتھ اٹھا لو، مگر تم ایسا نہیں  
کر سکتے، سفاک قدرت تمہاری جوانی کو تازیانے مار مار کر حصول مسرت کے  
میدانوں کی جانب ایک ظالم چرواہے کی طرح ہنکائے گی اور پھر مسرور ہونے کے جرم  
میں تم کو مرتے دم تک دلائے گی ہائے۔

انہیں سے کھائی ہیں خاروں کی لاکھوں برچھیاں میں نے  
وہ دو سانسیں، جو لی تھیں، بوئے گل کے درمیاں میں نے  
گھمایا جا رہا ہوں اس خطا پر دشت عبرت میں  
کیا تھا کیوں طواف جملہ ہائے دل براں میں نے  
در قصر کشائش کیوں نہ مجھ پر بند ہو جاتا  
کہ کھولے تھے کبھی، بند قبائے مہ و شاں میں نے  
جھکایا جا رہا ہوں، اس لئے پائے گدائی پر  
کہ پہنا تھا علی الرغم قضا تاج شہاں میں نے

غبارِ وقت کی چادر پڑی ہے فرق سیمیں پر  
 کہ بخشی تھی جوانی کو قبائے کھکشاں میں نے  
 ٹپکتی ہیں دل سد پارہ سے اب خون کی بوندیں  
 پئے تھے ہائے کیوں رنگیں لبوں سے گلستاں میں نے  
 گرایا ہے مجھے قدرت نے خوش چشموں کی نظروں سے  
 کہ اپنی سمت پھیری تھیں ہزاروں اکھڑیاں میں نے  
 مرے ہونٹوں پہ قفل، اس جرم میں دنیا نے ڈالا ہے  
 کہ گوئی ادھ کھلی آنکھوں کو بخشی تھی زباں میں نے  
 کہوں کس سے کہ بالآخر بچر قسمت راش  
 بنی ہے راگ کے ڈوروں سے پوشاک فغاں میں نے  
 وہاں بیٹھے ہوئے ہیں سسکیوں کے ہر طرف پہرے  
 جہاں آباد کی تھیں، مریکوں کی بستیاں میں نے  
 نظر آتے ہیں کافور و کفن کے اب وہاں ڈیرے  
 جہاں کھولا تھا، باز احریر و پریناں میں نے  
 وہاں، قبروں کی لوحوں کے پڑے ہیں دور تک پتھر  
 سجائی تھی، جس انگنائی میں، شیشے کی دکان میں نے

☆☆☆☆☆☆

اطراف و جہات کو مرتب کر لے  
 رو داد حیات کو مرتب کر لے  
 اس سے پہلے کہ بھول جائے سب کچھ  
 یادوں کی برات کو مرتب کر لے

☆☆☆☆☆☆

## مس کلینسی

لکھنؤ کے ایک ہسپتال کی خوب رو، خوش چشم، اور کم سن لیڈی ڈاکٹر تھی۔  
جب میرے نکاح کی تنہیخ کا مقدمہ چل رہا تھا اس وقت میرے باپ نے اس کو  
ملج آباد بھیجا تھا کہ وہ میری منکوحہ کا معائنہ کر کے اس کے بلوغ کا سرٹیفکیٹ دے  
دے۔

جب وہ ملج آباد سے معائنہ کر کے آگئی تو میرے باپ نے مجھے اس کے پاس بھیجا  
کہ میں اس سے اپنی منکوحہ کے بلوغ کی سند لے آؤں۔  
میرے باپ کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ میرے اور کلینسی کے درمیان معاشقہ ہو جائے  
گا تو وہ کبھی مجھ کو اس کے پاس نہ بھیجتے

میں اس کے وہاں پہنچا ابھی برآمدہ طے کر رہا تھا کہ دیکھا ایک نہایت خوب رو اور  
کم عمر عورت غسل خانے سے نکل کر اپنی خواب گاہ میں کھڑی اپنی بھوری زلفیں نچوڑ  
رہی ہے اور چونکہ میں نے اس کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اس لئے اسے پہچان نہیں  
سکا اتنے میں اس کی نظر میری طرف اٹھ گئی اس نے کھڑکی کا پٹ کھول کا انگریزی میں  
پوچھا آپ کون ہیں؟ میں نے کہا جوش اس نے بڑی جھانولی کے ساتھ کہا اور  
Ebullition, aritation heat (یعنی ولولہ، ہلچل، حرارت) اس کے اس  
انداز سے میں نے بھانپ لیا کہ تیرنشانے پر بیٹھ گیا ہے میں نے مسکرا کر پوچھا اور آپ  
کون ہیں اس نے سر کو جنبش دے کر کہا مس کلینسی میں نے کہا صرف ایک Glance  
(اچھتی نظر کے واسطے آیا ہوں) وہ آنکھیں جھکا کر تبسم ہوئی اور پوچھا اور کوئی کام؟ میں  
نے کہا آپ میری منکوحہ کے معائنہ کی خاطر ملج آباد گئی تھیں میں اس کی رپورٹ لینے  
آیا ہوں اس نے کہا میری خواب گاہ میں آجائے۔

وہ میرے بالکل سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے  
ہوئے تھے اور غسل صبحی کی تازگی، و بالیدگی اس کے روئے گل گوں پر چل رہی تھی

اس نے پوچھا آپ نے اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں، اس نے کہا آپ بڑے خوش قسمت ہیں، آپ کی بیوی کا رنگ بالکل ہم لوگوں کا سا ہے وہ بے حد خوبصورت ہے میں نے کہا بالکل آپ کی طرح؟ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا۔

اتنے میں اس کا ملازم تھالی میں ایک کارڈ لے آیا اس نے کارڈ پڑھ کر میز پر رکھ دیا کہا ٹھہرو، اور میری بیوی کے بلوغ کی سند میرے حوالے کر کے کہا آپ غسل خانے کے دروازے سے باہر چلے جائیں جب میں جانے لگا اس نے کہا اب کب آئیے گا میں نے کہا کل صبح کو اس نے کہا صبح کو نہیں شام کو آئیے گا ٹھیک سات بجے۔

جب میں نے جا کر اپنے باپ کو سٹر فلیٹ دیا وہ نہایت دادا تھے انہوں نے میرے چہرے کی طرف نگاہ اٹھا کر فرمایا یہ تمہارا چہرہ اس وقت کیسا ہو رہا ہے؟

دل میں چور تھا باپ کی اس دیدہ وری سے گھبرا گیا، اور آنکھیں جھک گئیں میری اس حالت سے میرے باپ معاملے کی تہ تک پہنچ گئے کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا میں نے تمہیں اس ڈاکٹرنی کے پاس بھیج کر بڑی غلطی کی دیکھو خبردار اب اس کے پاس نہ جانا، ہرگز نہ جانا، میں نے بڑی معصومیت آمیز سعادت سے کہا بہت اچھا اور دل ہی دل میں کہا خدا کی قسم جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔

بابا تو جلوہ رخ جاناں نہ دیدہ!

دوسرے دن ٹھیک سات بجے میں اس کے وہاں پہنچ گیا، وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔۔۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ گلاب کی کلی کی طرح چمک گیا بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا ہاتھ کیا تھا دھنکی ہوئی روئی کا کالا اور اس لہجے میں میرا مزاج پوچھا جیسے انگیٹھی میں فرط حرارت سے کونلمہ چمک جاتا ہے، تڑاق سے۔

مجھ کو وہ بڑے تپاک سے ڈرائنگ روم میں لے آئی بوائے خادم کو بلا کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں حکم دیا کہ تم برآمدے میں بیٹھ جاؤ اگر کوئی آئے تو کہہ دو مس صاحب گھر پر نہیں



ہیں یہ کہہ کر اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا مجھے خواب گاہ میں لے گئی کھڑکیوں کے پردے گرادیے اور صوفے پر میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی پوچھا وہ کی پیو گے یا بر آئی یا بیسز؟ میں نے کہا میں پیتا نہیں ہوں، آپ شوق کریں اور میں آپ کی آنکھوں سے پیوں گا وہ بیسز کی بوتل اٹھا لائی اور پینے لگی جب دوسری بوتل آدھی ختم ہو گئی اس کے چہرے پر طلوع صبح کی سی دھاریاں مچلنے لگیں اور آنکھوں کے ڈورے ابھر آئے۔

اب اس نے صوفے کی ٹیک پر اپنا سیدھا ہاتھ اس طرح پھیلا کر رکھ دیا کہ وہ میری گردن سے مل گیا مجھ کو جھرجھری سی آگئی میں نے بھی اپنا ہاتھ اسی طرح پھیلا دیا اور ہمارے پہلوؤں کے درمیان اب ہاتھوں کا وجود باقی نہیں رہا دوسری طرف بوتل ختم کر کے وہ آہستہ سے میری طرف کھسک آئی میرے پہلو میں انگلیٹھی سی جلنے لگی اور اعصاب کے اندر دھمال سا ہونے لگا۔

اس کے بعد وہ اٹھی روشنی بند کر دی پھر میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی تاریکی میں اس کا مکھڑا اور بھی دکنے لگا۔

اب اس نے اپنا گال میری طرف بڑھا دیا۔۔۔ میں نے اس کے گالوں کا رنگ اور اس کی جلد کی خوشی ڈنڈنا کر پی لی۔۔۔۔۔ اور پھر ہم دونوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔

اس کے بعد ایک دھیمسا سالب اس نے جلا دیا اور اس کے چہرے پر طوفانی رات کا پچھلا پھر مچلتا نظر آنے لگا۔۔۔۔۔ ارے جمال کی دوشیزگی ابھر آئی!

میں نے دیکھا گھڑی پونے نو بج رہی ہے میں اپنے باپ سے حضرت گنج کی سیر کا بہانہ کر کے آیا تھا اور عرض کر دیا تھا نو بجے تک آ جاؤں گا اس لئے میں نے اجازت طلب کی اس کا منہ اتر گیا ”نہیں تمہیں صبح 5 بجے تک یہاں ٹھہرنا ہے“ اس نے بڑے تحکم سے کہا عشق اس قدر جلد گل مل جاتا ہے گویا برسوں کے پرانے تعلقات ہیں

یہاں ماہ و سال کی گزشتیں ایک لمحے کے اندر گھومنے لگتی ہیں۔

میں نے بڑی نرمی سے کہا میرے باپ بہت سخت آدمی ہیں میں ان سے نوبے تک واپس آنے کا وعدہ کر کے آیا ہوں۔۔۔۔۔ وقت پر نہیں پہنچا تو بڑا غضب ہو جائے گا اس نے کہا اچھا کھانا تو کھا لو میرے ساتھ، میں نے کہا کھانا کھا لوں گا تو باپ پوچھیں گے یہ کھانا کہاں سے کھا کر آیا ہے۔

اس رات کے بعد میرے اس کے پیٹک یہاں تک بڑھ گئے کہ ہم دونوں دوسرے تیسرے دن ملنے لگے، اور ہر بار ایک تشنگی سی لے کر جدا ہوئے۔

اس نے بے حد کوشش کی مجھے شراب پلانے کی مگر میں اس قدر کڑا اور احمق تھا کہ ہر بار بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔

ایک بار رات کے وقت ہم لوگ تانگے میں ٹھنڈی سڑک سے گزر رہے تھے وہ میرے پہلو میں تھی اور علی شیر خان سپاہی موٹا سا لٹھ کاندھے سے لگائے کوچبان کے پاس بیٹھا تھا کہ چھتر منزل کلب سے ایک کار تیزی کے ساتھ نکلی اس کی روشنی مس گلینسی کے چہرے پر پڑی اس انگریز نے اپنی موٹر آڑی کر کے سڑک پر ٹھہرا دی اور ڈارٹنگ کہہ کر پکارنے لگا اس کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی تانگے والے نے کہا صاحب بہادر راستہ دیجئے اس نے تانگے والے کو گالی دی میں نے کہا علی شیر خان اس بندر کا دماغ درست کر دو۔

علی شیر خان نے اس کی کھڑی موٹر کے پاس جا کر کہا آپ ہمارا راستہ روکے ہوئے کیوں کھڑے ہیں اس نے گلینسی کی طرف اشارہ کیا کہ اسے بھیج دو۔ شیر علی خان نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا وہ موٹر سے اتر کر ہاتھ پائی کرنے لگا میں تانگے سے کود پڑا اور کوچ بان کا ہنٹر اس پر برسائے لگا اتنے میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور وہ انگریز موٹر اسٹارٹ کر کے بھاگ کھڑا ہوا گلینسی نے میری پیٹ ٹھونکی اور کہا مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں تمہارے سے بہادر آدمی کے پہلو میں بیٹھی ہوں۔

جب تا نگہ آگے بڑھا کھانچوں نے برا حال کر دیا اور وہ کہنے لگی آج ہی تمہاری موٹر کو خراب ہونا تھا یہ بھی کوئی سواری ہے ’’ٹھیک، ٹھیک، ٹھیک‘‘  
(لر زندگی، لر زندگی، لر زندگی) اس نے ’’ٹھیک‘‘ کو اس طرح ادا کیا کہ میرے تمام بدن میں سنسنی پیدا ہو گئی۔

ایک رات کو جب میں گلینسی کی خواب گاہ میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ میرے زانو پر بیٹھی بیڑ پی رہی تھی کہ اس کی خواب گاہ کا دروازہ یکا یک دھڑام سے کھل گیا اور ایک لمبا ترنگا، ادھیڑ عمر کا انگریز جو اس کا چچا یا ماموں تھا ہاتھ میں پستول لئے لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا گلینسی اور میں دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دھڑام سے مجھ پر گولی چلا دی گلینسی نے سقف شکاف چیخ ماری اور لڑکھڑا کر فریادیں کر پڑی نشانہ خطا ہو گیا تھا میں نے جست کر کے اس کی کلائی پکڑ لی اور پستول چھیننے لگا اسی کشمکش میں اس نے دوسری گولی چلا دی جو چھت میں جا کر لگی اور میں نے جھٹکا دے کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اتنے میں اس کے نوکر چا کر اور پڑوس کے بنگلوں کے دس بیس آدمی خواب گاہ میں آگئے انہوں نے اس انگریز کو پکڑ لیا اس کے بعد جھوڑی دیر میں پولیس آگئی اور ہمارے بیانات قلمبند کرنے کے بعد اس انگریز کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔

اس تھانے کا انچارج میرے باپ سے واقف تھا اس نے صبح ہوتے ہی یہ خبر میرے باپ تک پہنچا دی۔۔۔۔۔ میرے باپ نے مجھ کو طلب کیا میں کانپتا ہوا ان کے سامنے گیا انہوں نے بڑی بھاری آواز میں ارشاد فرمایا میں نے منع کر دیا تھا کہ اس ڈاکٹر نی کے وہاں ہرگز نہ جانا لیکن تم نے میری بات نہ مانی یہ کہہ کر میرے منہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ میں چکرا کر گر گیا میری ماں ہانپتی کانپتی آئیں اور پوچھا یہ کیا قصہ ہے میرے باپ نے سارا ماجرا بیان فرما دیا، میری ماں نے اپنے زانو پر میرا سر رکھ کر کہا اگر سو سو سمندر پار شیطان کے کان بہرے تیرے گولی لگ جاتی ننھے تو ہائے

میں کیا کرتی میں تو زندہ درگور ہو کر رہ جاتی ہائے ماں اللہ آمین سے پالے اور بچہ اپنے کو آفت میں ڈالے۔

اس کے بعد میں ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر دیا گیا اور درو دیوار کے سنائے سے گلینسی گلینسی کی آوازیں آنے لگیں۔

میرے باپ نے پولیس کی منہ بھرائی کر کے مقدمے کو تو ختم کر دیا لیکن مجھ کو قید سے باہر نہیں نکالا۔

ایک روز شام کے وقت جب کہ میں اپنے زنداں میں اداس بیٹھا ہوا تھا، ایک بڑی مانوس آواز میرے کان میں آئی دل نے کہا ہونہ ہو یہ تو گلینسی کی آواز ہے میں سلاخوں دار کھڑکی کے پاس گیا اور دیکھا کہ گلینسی میری ماں کے قدموں پر سر رکھے یہ درخواست کر رہی ہے کہ خدا را شبیر کو ایک نظر دکھا دیجئے اور میری رفیق القلب ماں ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ میاں میرے باپ باہر گئے ہوئے ہیں ان کی واپسی تک ٹھہر جاؤ اور گلینسی قدموں سے سراٹھا کر بڑی بے کسی کے ساتھ میری ماں کو دیکھ رہی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا خاندانی آداب کا پاس اور غیرت کا احساس اگر میرے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو میں ایسی چیخ مارتا کہ میرے زنداں کی چھت گر پڑتی۔

میں نے بڑے زور سے اپنے سینے کو دبایا دانتوں پر دانت جما کر اپنی آہوں کو روکا اور دل پر اس قدر دھکا لگا کہ میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا، گرتے ہوئے میز پر پاؤں لگا اور میز پر رکھی ہوئی اچاری پتھر کے فرش پر گر کر رت ااق سے ٹوٹ گئی میری ماں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں جھپٹ کر میرے زنداں کا دروازہ کھلوا اور ہائے میرے بچے کہہ کر زمین پر بیٹھ گئیں اور میرے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر زار و قطار رونے لگیں۔

گلینسی کو موقع مل گیا وہ میرے کمرے کی طرف جھپٹی ابھی دہلیز تک پہنچی تھی کہ میرے باپ آگئے انہوں نے یہ خلاف توقع سماں دیکھا تو دنگ ہو کر رہ گئے اور ڈانٹ



کر فرمایا ڈاکٹر نی ابھی میرے باپ کچھ اور نہیں کہنے پائے تھے کہ وہ ”پاپا“ کہہ کر ان کے قدموں سے لپٹ گئی میرے باپ لاکھ تند خو پٹھان سی مگر شاعر تھے ان کا دل پیچ گیا اسے میرے زنداں میں لے کر آگئے اور وہ میرا اتر اہوا منہ دیکھ کر رونے لگی۔

میں نے باپ کی موجودگی کے باعث اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی، اور اپنی رسوائی سے میرا تمام بدن ٹھنڈا ہو گیا۔

میرے باپ نے کہا ڈاکٹر نی اگر تو مسلمان ہونے اور پردہ نشینی اختیار کرنے پر تیار ہے تو میں شبیر سے تیرا نکاح کر دوں گا میں دلوں کو توڑنے کا گناہ نہیں کر سکتا۔

گلینسی میرے باپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی سوالیہ انداز میں اس نے میرے باپ کی طرف نگاہ اٹھائی۔

میرے باپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا شبیر اس کو میری بات انگریزی میں سمجھا دے میں شرم کے مارے بول نہیں سکا تو میرے باپ نے کہا میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ انگریزی میں اس ڈاکٹر نی کو میری بات سمجھا دے۔

میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر انگریزی میں اس کو بات سمجھا دی اس نے کہا پاپا سے کہہ دو مجھ کو یہ دونوں شرطیں منظور ہیں۔

میرے باپ نے فرمایا اس سے کہہ دو جمعرات کے روز وہ یہاں آجائے فرنگی محل چل کر مولانا عبدالباری کے سامنے مشرف باسلام ہو جائے اور نوکری سے استغاثہ دے دے میں جمعہ کے دن اس کا نکاح پڑھوا دوں گا۔

میں نے گلینسی کو یہ بات سمجھا دی اور اس نے خوشی کے ساتھ منظور کر لی بدھ کے دن سرشام اس کے وہاں پہنچا تو اس کے بنگلے پر کچھ اس طرح کی سوگواری دیکھی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ خدا نخواستہ میں کسی نہایت الم ناک سانچے سے دو چار ہونے والا ہوں۔

جب ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو ایک شخص نے یہ کہہ کر مجھے اس کی خواب گاہ میں

جانے سے روک دیا کہ مس کلینسی پر دل کا بے حد شدید دورہ پڑا ہے ان کو گیس دی جا رہی ہے یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی گر پڑی دل زور زور سے دھڑکنے لگا ٹھنڈا پسینہ آنے لگا تمام بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔

اتنے میں وہ آدمی اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے مجھ سے کہا آپ باہر چلے جائیں میں ڈرائنگ روم میں آ گیا اور بو جھل قدموں کے ساتھ اس کونے سے اس کونے کے درمیان ایک ایسے عالم میں ٹہلنے لگا جو الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔

اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد، جو میری نظروں میں ہزار ہا صدیوں کے برابر تھا ڈاکٹر نے باہر آ کر کہا افسوس کہ وہ مر گئی میں اسے بچا نہیں سکا میں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

جب رات گئے ہوش آیا پہلے تو دیر تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں اور یہ میری حالت کیا ہے جب تھوڑی دی ریں حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ میں ہسپتال کے سیشنل وارڈ میں ہوں اور میرے باپ روبرو ننگے سر کھڑے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

میرے آنکھ کھولتے میرے باپ میری طرف جھکے اور بڑی مسرت آمیز نرمی سے پوچھا بیٹا طبیعت کیسی ہے میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا میاں میں اچھا ہوں میرے باپ سجدہ شکرانہ میں گر گئے میرے سر سے صدقہ اتارا گیا اور تمام ہسپتال میں مٹھانی تقسیم کی گئی۔

کلینسی کی موت نے مجھ کو ادھ موا کر دیا زندگی میری نظر میں بے معنی اور سپاٹ ہو کر رہ گئی مجھ کو ہر روز دو بجے دن کے بعد خفیف بخار آنے لگا اور چہرہ اس قدر تر گیا کہ میرے باپ کو سخت تشویش پیدا ہو گئی وہ مجھ کو نمینی تال لے گئے ابراہار اور مختار کو میرا

جی بہلانے کے لئے ساتھ لے لیا، میرے باپ میرے ساتھ نہیں ٹھہرے ایک دوسری کوٹھی میں قیام کیا اور صبح و شام ڈاکٹر کو لے کر آتے رہے۔

جب کوئی چار مہینے کے بعد سہ پہر کے خفیف بخار سے مجھ کو نجات حاصل ہو گئی اور میرا رنگ ٹھہرنے لگا تو بیچ آباد لے آئے اور ایک سال تک لکھنؤ جانے نہیں دیا۔

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا امر ہم ہے یہ بات سچ ہے لیکن سو فیصد صحیح نہیں ہر چند وہ اگلی سی اداسی باقی نہیں رہی لیکن بار بار دل میں برسوں کسک ہوتی رہی اور اب بھی جب اس عمر میں بھی گلینسی کی موت یاد آ جاتی ہے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہوں۔

ہائے وہ اپنا دین بدل رہی تھی، پردہ نشینی کی گھٹن پر آمادہ ہو گئی تھی مرنے سے ایک روز پیشتر استعفیٰ بھی دے چکی تھی اور جمعے کو دلہن بننے والی تھی بدھ کو ہمیشہ کے واسطے سو گئی۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدا را  
در دا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا  
کشتہ شکستگانم اے باد شرط بر خیز  
باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را

☆☆☆☆☆☆

## مہنگم

یہ ایک دیسی ریاست کا ذکر ہے میں ایک نواب صاحب کی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا چھوٹے دادا اور ابراہیم میرے ساتھ تھے۔

اس حویلی کے ایک گوشے میں ایک دوسری حویلی تھی جس میں نواب صاحب کے فرزند رہتے تھے ایک دن میری غیر موجودگی میں ابراہیم اپنا سامان اٹھا کر چھوٹی حویلی میں منتقل ہو گئے اور رہنے لگے اس کے بالا خانے پر میں نے ابراہیم سے اس انتقال مکانی کا سبب دریافت کیا تو وہ بغلیں جھانکنے لگے مجھ کو یقین ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

میں شام ہوتے ہی ان کے پاس پہنچ گیا مجھ کو دیکھ کر ان کے منہ پر کلوچ سی دوڑ گئی میں نے پوچھا ابراہیم کیا بات ہے انہوں نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا کیا بتاؤں میری پیٹ میں لو لگ گئی ہے میں نے کہا یہ پیٹ میں لو لگنا کیا ہوتا ہے لو تو پورے جسم کو جھلکا دیتی ہے اور تمہارا بدن چھوڑ کر صرف تمہاری پیٹ پر لو کا اثر ہوا ہے کیا گھانس کھا گئے ہو؟ یا مجھے چند ہلار ہے ہو۔

ابراہیم نے کہا شبیر حسن خان قرآن مجید کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ کہ اتنے میں سامنے کے دروازے کا۔۔۔ آدھا پیٹ کھلا اور اس سے جھانکا مہنگم 1

1 وہ حسینہ چھوٹے نواب صاحب کے منہ بولے بیٹے کی منکوحہ تھی جو نہایت بد شکل اور مادرزاد نامراد بھی تھا

نے۔۔۔۔۔ اللہ اکبر وہ اس کی اٹھتی جوانی، وہ شہابی رنگ وہ دھانی دوپٹہ اور وہ کتابی مکھڑا بس ایک ہی نظر میں اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا اور جب ایک پل کے بعد اس نے پٹ بند کر لیا تو میں نے کہا جناب ابراہیم حسن خان صاحب اثر ملیح آبادی:

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں



مجھ سے بھی وہ اڑیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں  
وہ جو آپ کی پشت مبارک میں لو لگ گئی ہے اس کو میں نے دیکھ لیا ہے اور اس کو  
دیکھ کر میرے سینے میں بھی لو لگ گئی ہے کہنے کیا ارشاد عالی ہے؟

ابرار نے کہا شبیر حسن خان قرآن مجید کی قسم یہ بات نہیں میں تو اس لڑکی سے واحد  
شہاد ہی نہیں، قرآن مجید کی قسم آج پہلی بار اس کو دیکھا ہے۔

میں نے کہا خاں صاحب اگر آپ کا بیان صحیح ہے تو مجھ کو یہ سوچ کر بڑا اطمینان  
محسوس ہو رہا ہے کہ میرے آپ کے مابین رقابت کا قدم نہیں آنے پائے گا جگنو سے  
کہنے میرا بستر یہیں لے آئے ابرار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں انہوں نے کہا  
شبیر حسن خاں یہ کمرہ بڑا خطرناک ہے یہاں رات کو بچھو نکلتے ہیں اور ایک دن تو ایک  
کالا سانپ بھی رینگ کر اس سامنے والی نالی میں داخل ہو گیا تھا۔

میں نے کہا ابرار حسن 1 خان پھر آپ اس خطرناک جگہ کیوں قیام فرما ہیں  
انہوں نے کہا میری جان، قرآن مجید کی قسم آپ کی جان کی سی قیمتی نہیں ہے میں  
نے کہا بجا ارشاد فرمایا آپ نے جس کی خاطر آپ اپنی جان کو اس قدر خطرے میں  
ڈالے ہوئے ہیں میں بھی اسی کی خاطر اس خطرے کو اپنے سر لے رہا ہوں بلائیے جگنو  
اور منگائیے میرا بستر ابرار کا منہ ذرا سائیکل آیا وہ بوڑھوں کی طرح جھکے جھکے اٹھے جگنو کو  
دھڑکتے دل سے آواز دی جگنو۔

---

1 کبھی کبھی میں ان کو اس نام سے بھی پکارا کرتا تھا

---

موجود نہیں تھا، اسے تلاش کرنے کے لئے، زینے سے اتر کر، بڑی حویلی چلے گئے  
اتنے میں دوبارہ پٹ کھلا اور اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا۔

میں نے اس نچوڑی کی طرف نگاہ اٹھائی دل حسن کی شفق میں ڈوب گیا اس نے  
کن آنکھوں سے مجھے دیکھا اس کی نظروں نے بات کی میری نگاہوں نے جواب دیا  
آنکھوں کی زبان اس قدر سلجھی صاف اور دو ٹوک ہوتی ہے کہ غلط فہمی کا امکان ہی نہیں

رہتا آنکھوں کی بات چیت ہو میں نہیں تیرتی، خون کی لہروں میں ڈوب جاتی ہے ایک  
دل کہتا ہے، دوسرا دل سمجھ لیتا ہے۔

نگاہ ہے معنی وارد کہ در گفتن نمی آید  
اور ہم دونوں کے مابین ایک معاہدہ ہو گیا۔

اتنے میں ابرار آگئے انہوں نے پٹ بند ہوتے اور میرے چہرے پر غم راز و نیاز  
کھلتے دیکھ لیا سن سے ہو کر رہ گئے ان کے چہرے کی بشارت کا خیمہ گر گیا وہ میرے  
سامنے اپنی ذہانت اور طاقت کھو کر خاموش ہو کے بیٹھ گئے اور میرے بچھے ہوئے بستر  
کو اس طرح دیکھنے لگے گویا ان کی قبر کھود دی گئی ہے۔

میں نے کہا ابرار تم کہو تو اپنا بوریاد دھنا اٹھا کر بڑی حویلی میں چلا جاؤں۔ تھوڑی  
دیر کچھ سوچ کر انہوں نے جواب دیا آئیے، ہمارے آپ کے درمیان ایک شریفانہ  
معاہدہ ہو جائے آپ یہیں رہیں لیکن ہم دونوں اپنے اپنے دربان لیں ایک در کے  
نیچے انگنائی میں گائے بندھی ہوئی ہے ایک در کے نیچے گھروچی رکھی ہوئی ہے آپ جو  
در چاہیں پسند کر لیں میں نے کہا گھروچی والا در مجھے دے دو گائے والا اور تم لے لو  
میرے در کا تعلق ہو گا پانی سے اور تمہارے در کا دودھ سے ابرار نے یہ تقسیم منظور کر لی  
اور اب ہم دونوں اپنے اپنے دروں میں اس پری زاد کی چلت پھرت دیکھنے کے لئے  
اس طرح دن دن بھر بیٹھنے لگے جیسے ماہی گیر دریا میں جال ڈال کر ساحل پر بیٹھے نظر  
آتے ہیں ارے میں یہ کہنا بھول گیا کہ جب ہمارے مابین دروں کی تقسیم ہوئی تھی تو  
ابرار نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ دیکھئے ہم دونوں بڑی ایمانداری کا کھیل کھیلیں گے اگر وہ  
میرے در کے سامنے زیادہ آپ کے در کے سامنے زیادہ آئے گی یا آئے گی ہی نہیں تو  
آپ اس کے عشق سے دستبردار ہو جائیں گے اور معاملہ اس کے برعکس ہو تو میں  
دستبردار ہو جاؤں گا۔

جب ہم ڈھکی لگا کر دروں میں بیٹھنے لگے تو اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اس پری زاد نے اد

بدا کر میرے در کے نیچے کی انگنائی میں آنا اور اوپر آنکھیں اٹھانا شروع کر دیا اور ابرار بے چارے کا درسونا ہو کر رہ گیا۔

میں کیا بتاؤں اس کے آنکھیں اٹھانے کے انداز قاعدہ ہے بجلی اوپر سے نیچے گرتی ہے لیکن جب وہ انگنائی سے میرے در کی طرف آنکھیں اٹھاتی تھی تو نیچے سے اوپر بجلی گرنے لگتی تھی۔

اس کی متواتر بے اعتنائی سے ابرار کا دل ڈوبنے لگا مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی میں نے کہا ابرار اب میں کل ہی بڑی حویلی اٹھ جاؤں گا ابرار نے کہا اب آپ کا یہاں سے اٹھ جانا بے کار ہے اس کا دل آپ پر آ گیا ہے میں اس کی نظروں سے گر چکا ہوں قرآن مجید کی قسم ایسی بے وفا عورت پر میں لعنت بھیجتا ہوں اب آپ یہاں رہیں میں بڑی حویلی میں اٹھ جاؤں گا میں نے ابرار کو گلے لگایا اور کہا نہیں تم بڑے حویلی میں ہرگز منتقل نہیں ہو سکتے تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔

ان باتوں میں رات کے نو بج گئے اور ہم دونوں کھانا کھا کر سو گئے۔

غالباً آدھی رات گزر چکی ہوگی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی نہایت ملائم چیز میرے تلوؤں سے مس ہو رہی ہے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔۔۔ اور یہ دیکھ کر دنگ ہو گیا کہ وہ آفت روزگار، میرے تلوؤں سے اپنے گال لگائے بیٹھی ہے، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

میں نے اسے کھینچ کر کلیجے سے لگایا، اس نے ابرار کی چارپائی کی طرف اشارہ کیا میں اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

پچھلے پہر جب وہ سینے پر دوپٹہ ڈال کر اور موباف باندھ کر رخصت ہونے لگی تو اس نے کہا میرے ابا میری اس شادی سے خوش نہیں ہیں وہ کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے طلاق دے کر گوالیار لے جائیں اور میری دوسری شادی کر دیں اب میں آپ کے سوا کسی دوسرے مرد کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی کل آپ جا رہے ہیں میں آپ کو مجبور نہیں

کر سکتی اس لئے کہ آپ کی اماں جان نے تار دے کر آپ کو بلایا ہے لیکن میرے سر کی قسم سات دن کے اندر آجائے گا اگر آپ نہیں آئیں گے تو ابا مجھ کو گوالیار لے کر چلے جائیں گے مجھے مجبور کریں گے دوسری شادی پر اور میں زہر کھا کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں گی۔

میں نے اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا سات دن تو بہت ہوتے ہیں میں چوتھے یا پانچویں دن ہی آجاؤں گا اور تم کو آگرے لے جا کر اپنے ایک قرابت دار کے گھر میں رکھوں گا اور وہاں سے ہم دونوں پھر لکھنؤ چلے جائیں گے دیکھو بالکل نہ گھبرانا میرا وعدہ پکا ہے وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر رونے لگی اور میرے آنسو بھی بہنے لگے۔

دوسرے دن جب میں گاڑی میں بیٹھ کر اسٹیشن جانے لگا اس نے بالا خانے کے غرفے سے مجھ کو جھانک کر دیکھا اس کی موتیوں کی سی آب دار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور برستی آنکھیں چیخ رہی تھیں کہ وقت پر آ جانا۔

ملیح آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابرار نے میری ماں کو میرا سارا کچا چٹھا لکھ بھیجا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں اس ریاست میں رہا تو میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

ماں سے میں نے شرم کے مارے ابرار کے خط کا کچھ نہیں پوچھا لیکن جب تیسرے دن میں نے اس ریاست کے سفر کی اجازت طلب کی تو انہوں نے فرمایا اگر تو وہاں گیا تو دودھ نہیں بخشوں گی میرے سر کی قسم وہاں قدم نہ رکھنا۔

ماں کی اس شدید تاکید کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ابرار کے خط والی بات صحیح ہے ایک طرف تو ماں کا احترام اور ایک طرف اپنے وعدہ محکم کا پاس میں عجب کش مکش میں پڑ گیا اور دل پر کچھ ایسا دھکا لگا کہ بلبلا کر مجھ پر بخار چڑھ آیا اور ایک سو پانچ ڈگری تک پہنچ گیا گھر بھر میں کہرام مچ گیا دن میں چار چار پانچ پانچ بار ڈاکٹر عبدالکریم صاحب آنے لگے بار بار میرے سر پر برف رکھی گئی دودھ گھنٹے کے بعد پاؤں میں جھانویں کئے گئے تین تین گھنٹہ میں دوائیں پلائی گئیں ملتیں مانی گئیں ہر صبح کو قرآن کی ہوائیں دی



گئیں پھر بھی بیس روز سے پہلے بخار نہیں اتر اور میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔  
ابھی میں پورا تندرست ہونے نہیں پایا تھا کہ میرے پاس اس ریاست سے  
میرے ایک محرم راز کا خط آیا کہ ”م۔ بیگم“ کو اس کا باپ گوالیار لے کر چلا گیا وہاں اس  
کی شادی ٹھہرائی اور عین اس وقت جب کہ گھر میں شادی کے ڈھول بج رہے تھے اس  
نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔

خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، جوڑی آگئی جوڑی کے بعد بخار آ گیا اور ایک دم  
سے ایک سوتین ڈگری ہو گیا۔

کہاں تک بیان کروں اپنی دردمندی جسم کو بخار جلا رہا تھا اور دل میں اس نامراد کی  
خودکشی کے شعلے بھڑک رہے تھے اور لہر بن مو سے ہائے ہائے کی آوازیں آرہی تھیں  
اللہ دشمن کو بھی وہ دن نہ دکھائے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ میں کم بخت مر کیوں نہیں گیا۔

اللہ اکبر یہ تیغ دردست و کفن بردوش قاتل زندگی

جہاں بسمل گہ درد است، آسائش کہ دید ایں جا؟  
بقدر سخت جانی، ہر کسے، برخود طپید ایں جا!  
صاحب ”زہر عشق“ نے عشق کے باب میں کتنی سچی بات کہی ہے:

بس	میں	ڈالے	نہ	کبریا	اس	کے
رحم	دل	میں	نہیں	ذرا	اس	کے
مار	ڈالا	تماش	بینوں	کو		
زہر	کھلوا	دیا	حسینوں	کو		

☆☆☆☆☆☆☆☆

زندگی، خواب پریشاں ہے کوئی کیا جانے

موت کی لرزش مرگاہاں هے كوئى كىا جانے  
رامش و رنگ كے اىوان ميں ليائے حياث  
صرف اك راث كى مہماں هے كوئى كىا جانے  
گلشن زيسث كے هر پھول كى رنگينى ميں  
وجلہ خون رگ جاں هے كوئى كىا جانے  
رنگ و آہنگ سے بچتى ہوئى يادوں كى براث  
ره رو جادہ نساں هے كوئى كىا جانے

☆☆☆☆☆☆

## ر۔ کماری

ایک بار مختار احمد خان ملیح آبادی سے ملنے اور سیر کرنے کلکتے جا رہا تھا چھوٹے دادا جگنو اور علی حسین خدمت گارہم سفر تھے۔

میرے ڈبے میں ایک سیٹ پر ایک بوڑھا انگریز لیٹا ہوا تھا اور ایک سیٹ پر ایک دراز قامت گل چہرہ چھری لڑکی آدھی لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی میں درمیانی سیٹ پر بیٹھ گیا اس کے نکیلے چہرے کی موج ہائے رنگا رنگ سے نکل نکل کر ایک سنہرا آنکڑا بار بار میری طرف آتا اور میری نظروں کو اپنی گرفت میں لے لے کر اس کے گالوں کی طرف لے جاتا تھا یہ مشغلہ تا دیر جاری رہا لیکن وہ مطالعے میں اس قدر مستغرق تھی کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ میں کب ڈبے میں داخل ہوا اور کیسی ترسی نظروں سے اس کو دیکھ رہا ہوں۔

میں نے اس کی کتاب پر نظر جمائی تو دیکھا کہ وہ شیکسپیر کوڈراما ”رومیو جولیٹ“ کا مطالعہ کر رہی ہے میرے دل نے کہا آثار اچھے ہیں نتیجہ بھی اچھا ہی نکلے گا انشاء اللہ۔  
تھوڑی دیر میں ہوا بہت ہی تند ہو گیا وروہ اپنے شیشے والی کھڑکی بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

جب میں نے یہ دیکھا کہ اس نازک بدن سے کھڑکی نہیں سنبھل رہی ہے اور اس کی گوری گوری کلائیاں لچکی جا رہی ہیں میں اس قدرت کے عطا کردہ زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کے واسطے جلدی سے اس کے قریب گیا اور شیشہ چڑھا دیا اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی ایسا معلوم ہوا گویا اس نے کوئی چیز جلدی سے نکل لی مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا ہاتھ سے کتاب رکھ دی اور ماتھے سے لٹیں ہٹانے لگی اور میں نے دل ہی دل میں کہا مبارک ہو میاں جوش۔

سرشام گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تو وہ بوڑھا ہم سفر انگریز اتر گیا اور میں دعائیں مانگنے لگا کہ اب کوئی دوسرا مسافر آخر تک نہ آئے۔

جب گاڑی وہاں سے چلی اور کوئی مسافر ہمارے درجے میں نہیں آیا میرا دل باغ باغ ہو گیا اور یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ اس لڑکی کے چہرے پر اس صورت حال سے بحالی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

اب ہماری نگاہوں کے جلد جلد مبادلے ہونے لگے لیکن ایک دوسرے سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔۔۔ اور میں سوچنے لگا کہ بچپن کی تربیت انسان کو کس قدر اثر میلا بنا دیتی ہے۔

اب آفتاب ڈوب گیا، اور میں اپنے طلوع کی تیاری کرنے لگا۔۔۔ بوتل کھولی کاک بولا کھٹاک کھچ سے دیا سلائی سلاگانی اگر بتی جلائی گلاس بھرا تچھے سے سوڈے کو گردش دی جھاگ اٹھے چمچہ گلاس سے نکالا گیس کی پتلی سی کمر لچکنے لگی ایک گھونٹ زیر لب بسم اللہ کہہ کر پیا تین منٹ کے اندر طبیعت اجاگر اور امنگ بیدار ہو گئی۔

جب دوسرا جام بھرا اس نے آہستہ سے کہا رام رام میں نے پوچھا کیا بات ہے اس نے کہا اگر کی لپٹیں ہر دے میں اترتی چلی جا رہی ہیں میں نے کہا بچھا دوں؟ اس نے کہا نہیں ایک بتی اور جلا دیجئے میں نے دوستی بتی جلا کر پوچھا آپ کہاں جا رہی ہیں اس نے کہا بنارس، اس نے دریافت کیا اور آپ؟ میں نے کہا کلکتے اس کے چہرے پر دھواں سا دوڑ گیا۔

اس نے پوچھا آپ کا نام میں نے کہا جوش میں نے پوچھا آپ کا نام؟ اس نے کہا ”ر۔ کماری“ اس نے کچھ ایسی لٹک سے اپنا نام بتایا جیسے کوئی کسی مفلس کو خزانے کا پتا بتاتا ہے۔

میں نے دریافت کیا آپ کرتی کیا ہیں اس نے کہا فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہوں تیسرے جام کا ایک گھونٹ پینے کے بعد میں اپنا بستر درست کرنے کے بہانے سے بالقصد لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور یہ ظاہر کیا کہ میرے جسم کا توازن بگڑ گیا ہے اور جب تکیے سیدھے کرنے کو جھکا تو ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی طرف اس طرح جھک گیا کہ



میرے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جا کر ٹک گئے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی  
میں معافی طلب کرتا سیدھا ہونے لگا تو اس نے اپنے ملائم ہاتھوں سے میری دونوں  
کلائیوں پکڑ لیں اور کہا جلدی سے بیٹھ جائیں نہیں تو گر پڑیں گے گاہ کہتے ہی اس نے  
اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اس نے کہا ڈرنک بری چیز ہے  
یہ آدمی کو گرا دیتی ہے میں نے کہا آپ کو کیا معلوم اس نے کہا ابھی ابھی تو آپ ہی کو  
گرتے ہوئے دیکھا ہے، اور میرے پتاجی بھی ڈرنک کرتے اور ڈمگنا لگتے ہیں۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے بال کھول دیئے سداری اتار دی گھڑی کلائی سے نکال کر  
سر ہانے رکھ لی میرے پہلو سے پہلو ملا دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کور  
کھٹکنے لگی اور میں اس کے چھلکتے ساغر جمال میں ڈوب گیا۔۔۔۔۔

صبح آنکھ کھلی ایک عجیب شیریں تبسم کا تبادلہ ہوا اور ایسا لگا جیسے ہم ایک ہزار برس  
سے ایک دوسرے کے آشنا ہیں اور آپ سے گزر کر تم کی نوبت آگئی۔

محبت کتنے برسوں کے فاصلے ایک چھلانگ میں طے کر لیتی ہے

وہ ایک جادو کے جزیرے کی پری کی مانند بستر سے اٹھی الجھے بال سلجھائے اور  
میری سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ایک شہزادی کی مانند کہا تم اب کلکتے نہیں جاؤ گے بنارس  
میں اترو گے میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا جو حکم ہو دیوی جی کا۔

پھر اس نے کاہ اب تم جوش نہیں جوشی ہوا اپنا پرانا نام بھول جاؤ میں نے کہا بہت  
اچھا سرکار۔

اتنے میں ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی اس کا بوڑھا خادم آگیا غسل کا سامان غسل  
خانے میں رکھ دیا اور جب وہ نہا کر نکلی فضا پر صبح بنارس طلوع ہو گئی۔

اس نے اپنے کالج اور سڑک کا نام بتایا کہا کہ میرے کالج کے سامنے ایک نہایت  
عمدہ ہوٹل ہے تم اس میں ٹھہر جانا میں انٹرول میں ملنے آؤں گی۔۔۔۔ اور دیکھو بنارس  
اسٹیشن پر بالکل اجنبی بن جانا۔

میں دوسرے اسٹیشن پر چھوٹے دادا کے کمپارٹ منٹ گیا ان سے کہا اب میں بنارس اتروں گا اس کے بعد کلکتے جاؤں گا چھوٹے دادا نے منہ بنا کر حسب دستور کہا ہم تو پہلے ہی کہتے تھے آخر بنارس میں کیا کام نکل آیا ہے بھائی شبیر حسن خان یہ اس لڑکی نے شاید نیا گل کھلایا ہے جو آپ کے ڈبے میں سفر کر رہی ہے دیکھئے ہندو مسلم نفرت کا آغاز ہو چکا ہے۔

میں نے کہا چھوٹے دادا آپ اطمینان رکھیں  
 جو دل چھین لینے کا ڈھب جانتے ہیں  
 وہ ترکیب و ترکیب سب جانتے ہیں  
 چھوٹے دادا نے ملازموں کو خبر کر دی اور جب بنارس کا اسٹیشن آیا میں نے اس لڑکی سے بیگانگی اختیار کر لی سو کھے منہ سے اترا، اور اس کے بتائے ہوئے ہوٹل میں جوشی کے نام سے ایک کمرہ لے کر ٹھہر گیا۔

کمرے میں پہنچ کر چھوٹے دادا نے کہا بھائی شبیر حسن خان ہم کو آپ کی یہ باتیں پسند نہیں بنارس میں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے میں نے بنارس اسٹیشن سے پہلے ہی تینوں لوٹے چمڑے کے تھیلے میں بند کر دیئے تھے کہ کوئی یہ نہ بھانپ سکے کہ ہم مسلمان ہیں آپ کہتے ہیں وہ یہاں دوپہر کو آئے گی اگر کسی کو اس کا پتہ چل گیا اور پتہ چلنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے تو ہم سب یہیں قتل کر ڈالے جائیں گے دیکھئے ہم سب پہلے ہی سے کہے دیتے ہیں میں نے کہا چھوٹے دادا پٹھان ہو کر آپ ایسی ڈر جانے والی باتیں کر رہے ہیں انہوں نے کہا پٹھان ہونے سے کیا ہوتا ہے ایک کی دو دو دو کی دو چار ایک آدمی ایک غول کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے کہ اتنے میں دروازہ کھلا وہ ایک مزدور کو ساتھ لئے کمرے میں در آئی مزدور سے کہا سامان یہاں رکھ دو مزدور نے سامان رکھ دیا اور اجرت لے کر چلا گیا چھوٹے دادا اور دونوں خدمت گار بھی کمرے سے نکل کر برآمدے میں چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔۔۔ اس نے ڈبے کھول کھول کر میز پر مٹھائی اور

پھلوں کا انبار لگا دی اپنی جیب سے نہایت خوبصورت سونے کی گھڑی نکال کر اپنے دست ناز سے میری کلائی پر باندھ دی ایک بنڈل کھول کر دو دھوتیاں اور دو شرتی کرتے میرے سامنے رکھ کر اس نے کہا کل بہت تڑکے گنگا جی کے گھاٹ پر یہ دھوتی باندھ کر اور یہ کرتہ پہن کر آ جانا اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو جانا میں تم کو۔۔۔۔ مندر لے چلوں گی۔

یہ کہہ کر اس نے ایک لیٹا ہوا زنا نکالا اور کہا اسے گلے میں ڈال لینا اس کے بعد ایک ڈبیا سے چند نکل کر کہا اسے چلتے وقت ماتھے پر لگا لینا۔  
میں نے اس کی گردن میں بانٹیں ڈال کر کہا۔۔۔۔۔ کماری چائے پیو گی، یا آئس کریم کھاؤ گی۔

اس نے بڑے مزے سے کہا تمہارا درشن چائے ہے اور تمہاری باتیں آئس کریم اور میں نے اسے بھیج کر سینے سے لگالیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد چھوٹے دادا غضب و خوف کو اپنی مونچھوں اور گالوں پر بٹھائے کمرے میں آئے اور میں نے سارا ماجرا ان سے بیان کر دیا ان کے ہوش اڑ گئے، کہا ارے غضب خدا کا بنا رس کے مندر میں ہندو بن کر جاؤ گے اگر خدا نخواستہ کسی نے تم کو پہچان کر شور مچا دیا تو کیا کرو گے یہ کلکتے کا سفر تو بڑا خطرناک ثابت ہوا ہم تو پہلے ہی کہتے تھے میں نے کہا چھوڑیئے بھی ان باتوں کو یہ مٹھائی اور پھل کھائیے اور وہ تمام خطروں کو یکسر بھول کر کھانے پر ٹوٹ پڑے اور خود ان کے بقول کھاتے کھاتے ٹکڑے اڑا دیئے۔

میں صبح جب گنگا کی طرف پورا ہندو بن کر چلنے لگا تو چھوٹے دادا کاپنے لگے مجھ کو بہت سمجھایا میں نے ان کی بات نہیں مانی پھر جگنو سامنے آ کر کھڑا ہو گیا منجھلے بھیا اگر جانے ہی کی ٹھان لی ہے تو مجھے اور علی حسین کو ساتھ لے لیجئے ہمارے ہاتھوں میں ڈنڈے ہیں اور جیب میں چاکو، میں نے کہا جگنو کوئی خطرے کی بات نہیں تمہارا

میرے ساتھ جانا مناسب نہیں۔

یہ کہہ کر میں روانہ ہو گیا اور جب راستے میں مڑ کر دیکھا تو جگنو اور علی حسین نظر آئے  
میں نے اشارے سے کہا مجھ سے دور رہو انہوں نے اپنی چال سست کر دی۔

گھاٹ پر پہنچا تو صبح طلوع ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ ہائے وہ دھندلکے کا جادو بھرا  
گھاٹ، وہ گنگامانی کا گنگنا تا پاٹ۔۔۔۔۔ وہ لہڑیوں کے قدم اٹھانے کا ڈھنگ،  
جیسے چلتے پھرتے رنگ گوری نکس چلو مورے سنگ۔

وہ بہکی بہکی جوانیاں وہ حسن کی دھندلی دھندلی گل فشائیاں۔۔۔۔۔ وہ متوالی  
ڈبکیاں، وہ نند اسی اٹھڑیاں۔۔۔۔۔ وہ دھندلکے میں لہڑکنیاؤں کا ریلا گویا خواب  
میں پریوں کا میلا وہ بھیگی لمل کی ساریوں کی عریاں سامانی گویا کھرے میں برستا پانی  
سنگ مرمر کے قبوں کی تابانی وہ پلکوں کی جھپکوں میں بجتی شہنائیاں وہ لہروں میں ڈوبی  
گدرائیاں وہ اشنان کا نکھار وہ مکھڑوں کی چہکار وہ نسیم صبح کی سرسراہٹیں وہ گلابی  
مسکراہٹیں وہ کمروں کے لچکاؤ وہ بے ناچ کے بھاؤ وہ دھلے دھلے گال وہ چٹکے چٹکے  
خدو خال لہروں میں وہ ہلکی ہلکی سارنگیاں اور وہ دوپٹوں میں بھیگی بھیگی نارنگیاں۔

خورشید	طلوع	ہو	رہا	ہے
افسانہ،	شروع	ہو	رہا	ہے

اسی جادو بھری سہانی فضا میں میرے من مندر کی وہ دیوی میرے سامنے آئی گویا  
گوکل بن میں صبح مسکرائی۔۔۔۔۔ اور

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی  
جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی  
پھر اس نے مجھے آواز دی جوشی بھیا میرے پیچھے پیچھے آؤ اور میں جوشی بھیا کے  
مزے میں ڈوبا ہوا گردن ڈال کر اس کے ساتھ ہولیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد جمال و جلال میں ڈوبا ہوا مندر نظر آیا اس نے اشارہ کیا



اور میں خدا کا نام لے کر بت خانے میں داخل ہو گیا اور بھجن سننے لگا اور بھجوں، گھنٹیوں اور لپٹوں میں ڈوب کر جاری ہو گیا میرے دل کی زبان پر ’لاموجود الہ اللہ‘

اس عالم استغراق میں ایک جانب میری نگاہ اٹھی دیکھا کہ ایک صاحب مجھ کو عجیب کش مکش کے عالم میں گھور رہے ہیں میرا دل سن سے ہو گیا اس خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہا گر مجھ کو پہچان کر انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ بھائیو ہمارے اس مندر میں ایک لچھ مشلا بیٹھا ہوا ہے تو میں پل بھر میں دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا جاؤں گا چھوٹے دادا نے سچ کہا تھا کہ تم بڑا خطرناک کام کر رہے ہیں۔

دل سے آواز آئی، عشق بازی کرو اور پھر بھی مرنے سے ڈرو، مرنا تو ایک نہ ایک دن ہے ہی بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ معشوق کے قدموں میں جان دے دو اور با آواز بلند کہو:

بجرم عشق مر امی کشند و غوغائیت  
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا نیست  
ارے تیغ و خنجر ----- برپا پوش قلندر!

یہ سوچ کر میں نے اپنی طرف گھورنے والے کی جانب پھر نظر اٹھائی، اس نے سر کی جنبش سے مجھے سلام کیا میں نے بھی اسی طرح سلام کا جواب دیا، اور اس یقین کے ساتھ کہ مجھ کو پہچان لیا گیا ہے قتل پر آمادہ ہو کر بیٹھ گیا۔

اتنے میں بھجن ختم ہو گئے مجمع درخواست ہونے لگا وہ بھی کھڑی ہو گئی باہر چلنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے مندر کے باہر آ گیا۔

ابھی ہم دونوں چند قدم ہی چلے تھے کہ پشت سے آواز آئی جوش صاحب آداب عرض ہے میں نے مڑ کر جواب دیا دیکھا کہ یہ وہی صاحب ہیں جو مجھے گھور رہے تھے انہوں نے قریب آ کر کہا بندے کا نام بدری پرشاد بدر ہے میں نے آپ کو الہ آباد کے مشاعرے میں دیکھا تھا میں نے کہا آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں آپ

کی ادب نوازی اور شرافت کا قائل ہو گیا کہ آپ نے مجھ کو مندر میں دیکھا اور خاموش رہے، انہوں نے کہا بندہ پرور میں کاستھ ہوں ہمارا اور مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے آپ شاعر کی حیثیت سے مندر مسجد اور گرجا سب جگہ جانے کا حق رکھتے ہیں آپ کا قیام کہاں ہے میں جی بھر کے آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

وہ آدمی بہت شریف اور بے خطر تھے لیکن اس خوف سے کہ وہ ہوٹل میں آئیں اور ان سے اس کی مڈ بھیڑ ہو جائے میں نے کہا میں آج سہ پہر ہی کو کلکتہ چلا جاؤں گا۔ انہوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور یہ شعر سنا کر چلے گئے۔

میان کعبہ وبت خانہ فرق یک گامست  
میان شیخ و برہمن، ہزار ہا فرسنگ

جب میرے اور بدر صاحب کے مابین بات چیت ہو رہی وہ تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی سن رہی تھی اس کے چہرے کا عجیب عالم تھا اور اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ چہرے پر ایک رنگ آ رہا، اور ایک جا رہا تھا راستے بھر وہ کچھ نہیں بولی اور ہوٹل پہنچتے ہی وہ دھڑام سے بستر پر گر پڑی مجھ سے کہا جلدی پانی لاؤ پانی پی کر وہ اٹھ بیٹھی اور کہنے لگی جب وہ آدمی تم سے بات چیت کر رہا تھا میری چھاتی دھک دھک ہو رہی تھی کہ ہے رام اب کیا ہو گائیں نے کہا پیاری تمہارے پریم میں مرجانا سو زندگیوں سے بہتر ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آنکھیں پوچھتی کالج چلی گئی۔

اتنے میں چھوٹے دادا کمرے میں داخل ہوئے اور منہ پھلا کر کہنے لگے بھائی شبیر حسن خان اس خطرے میں کب تک پڑے رہو گے میں نے کہا بس دو چار دن اور رہوں گا۔

لیکن رکاری نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں کچھ اوپر ایک مہینہ تک مجھے روکے دکھا کیا بتاؤں ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات ایک دن وہ انٹرول میں بے حد گھبرائی ہوئی آئی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں

اس نے جلدی جلدی سانس لے کر کہا تیرے پتا جی کو میرے پریم کا پتہ چل گیا ہے یہ  
خبر اس ہوٹل کے کسی آدمی نے ان تک پہنچا دیا ہے پتا جی کے تیور بہت برے ہیں میں  
تو سب کچھ بھگت لوں گی لیکن تم آج ہی بلکہ ابھی ابھی یہاں سے چلے جاؤ میں کرسمس  
کی چھٹی میں اپنی چاچی سے ملنے لکھنؤ آؤں گی اپنا پتہ لکھ دو میں نے اپنا پتہ لکھ دیا اس  
نے کہا اچھا رام رام یہ کہہ کر وہ رک گئی اور چیخ مار کر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر زارو  
قطار رونے لگی میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور ہم دیر تک چمٹے ہوئے روتے رہے اور  
اس کے بعد وہ مجھ کو مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی رخصت ہو گئی اور میرے دل پر بجلی گر پڑی اور  
میں اسی وقت بنارس سے رخصت ہو گیا۔

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے  
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

☆☆☆☆☆☆☆☆

## ط،ج

ایک بار میرا قیام تھا ایک بہت بڑے شہر میں اور میرے پڑوسی تھے ایک چالیس سال کے نواب صاحب وہ شعر تو معمولی کہتے تھے لیکن سخن منجی میں ان کو بڑی دست گاہ حاصل تھی۔

میں گاہ گاہ ان کے محل میں جایا کرتا تھا اور شاعری کے ساتھ ساتھ گانے بجانے کی صحبتیں بھی گرم ہوا کرتی تھیں۔

ایک روز کوئی دس بجے میں ان کے وہاں پہنچا دیکھا کہ احاطہ پذیرائی ڈرائنگ روم خالی پڑا ہوا تھا میں سوچنے لگا کہ یہ وقت تو ان کے موجود ہونے کا ہے آخر وہ کہاں چلے گئے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ بغلی کمرے سے۔۔۔ ہوا ایک مٹھلی تھیلی اٹھائے میری طرف بڑھیں میں ٹھٹک گیا بوانے مجھے سلام کر کے تھیلی میری طرف بڑھا دی میں نے کہا اس میں کیا ہے انہوں نے کہا لالچیاں میں نے پوچھا کس نے بھیجی ہیں بوانے کہا بی بی 1 جان نے بھیجی ہیں میں نے پوچھا یہ بی بی جان کون ہیں انہوں نے اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹکا کر کہا اے میں قربان جاؤں نواب صاحب بہادر کی منجھلی صاحبزادی ہیں میں نے بھونچکا ہو کر کہا بوا میں نے تو آج تک انہیں دیکھا ہی نہیں ہے انہوں نے کہا آپ دیکھتے کیسے وہ تو جم جم پرے

1 جان کو گھروالے بی بی جان کہتے ہیں

میں رہتی ہیں البتہ وہ آپ کو اس اوپر کے کمرے سے بار بار دیکھ چکی ہیں میاں کہنے کی بات نہیں کیا کہوں یہ ٹانگ کھولوں تو لاج وہ ٹانگ کھولوں تو لاج۔

میں نے کہا ایسی بھیر کا ی بات ہے کہ کچھ تو بتاؤ بوا انہوں نے اپنا سفید چونڈا کھجلا کر کہا میاں بات یہ ہے کہ انہوں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے بس آپ ہی کا دم بھرتی رہتی ہیں کونوں کھتروں میں بیٹھ بیٹھ کر آپ کے لئے روتی ہیں میں نے بی بی



جان کو ایک عمل بتا دیا ہے وہ ہر جمعرات کو آدھی رات کے وقت پاؤں کنویں میں لٹکا کر آپ سے ملنے کے لئے وہ عمل پڑھا کرتی ہیں یہ بات آپ تک رہے، اگر بی بی جان نے سن لیا تو میرے سر پر ایک بال بھی نہیں رہے گا۔

میں نے پوچھا نواب صاحب کہاں ہیں انہوں نے بتایا کہ وہ شیر کے شکار کے لئے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور بیگم صاحب اپنی امی جان سے ملنے کے لئے میکے تشریف لے گئی ہیں۔

میں نے وہ لچکے پٹھے کی مٹھی تھیلی بوا کے ہاتھ سے لے لی اور پوچھا بی بی جان کو دیکھوں کیسے کہ اتنے میں بالا خانے کے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی بوانے کہا نگاہ رو برو میں نے آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا کہ ایک بچی ہے جو ادھ کھلے پٹ میں لپٹا رہی ہے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور پٹ بند کر لیا ایک تیر تھا کہ میرے دل میں ترازو ہو کر رہ گیا اور ہال پر اندھیرا چھا گیا۔

بوانے کہا اوپر چلے میں قریب سے بی بی جان کا جھمکھڑا دکھا دوں اور جب میں بوا کے پیچھے پیچھے اوپر گیا اور دو قدم اس کی طرف بڑھائے تو وہ ہائے اللہ کہتی بھاگ گئی۔

رک گئی نبض عاشق جاں باز  
اف رے تیرا فرار کا انداز

بوانے کہا ابھی اللہ رکھے بچی ہیں آپ کو دیکھ کر شرما گئیں میں نے پوچھا اب کیا ہو گا انہوں نے چھاتی ٹھونک کر کہا میں آپ کو ملا کر دم لوں گی۔

دوسرے دن بوا میرے پاس آئیں اور کہا میں نے آپ کا انتظام کر دیا ہے میرا خاوند نواب صاحب کی ڈیوڑھی کا چوکیدار ہے آپ رات کے دو بجے آئیں میں ہال کا دروازہ اندر سے کھلا رکھوں گی میرا خاوند آپ کو زنا نے مکان کے دروازے تک پہنچا دے گا وہاں میں کھڑی ملوں گی اور آپ کو بی بی جان کے کمرے میں پہنچا دوں گی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے پائے گی۔

میرا تمام دن اس خوشی میں گزر گیا کہ آج رات کو دو بجے بی بی جان کے پاس جانا ہے دل بار بار قلقاریاں مارتا رہا بار بار آسمان کی طرف دیکھتا رہا کہ یہ خبیث آفتاب کب ڈوبے گا دوپہر کا کھانا بھی خوشی میں نہیں کھایا گیا قیلوٹ کے واسطے لیٹا نواب صاحب کا محل، بوا کا چہرہ، اور بی بی جان کا جلوہ آنکھوں کے نیچے پھرنے لگا خیال آیا کہ اگر میرے پہنچتے ہی جگا ہر ہوگئی تو شاید میری جان چلی جائے اپنی جان کی پروا نہیں لیکن اگر اس نازنین کی رسوائی ہوگئی تو ساری زندگی اس کی بیکار ہو کر رہ جائے گی میں بوڑھوں کی طرح سوچنے لگا پھر یہ خیال آیا کہ نہ جاؤں بیوی گھر میں موجود ہے میں اس سے شادی تو کر نہیں سکوں گا کیوں اس کے پاس جاؤں۔

میں اسی ادھیڑ پن میں تھا کہ میری سوئی ہوئی جوانی بیدار ہوگئی اس نے میرے منہ پر طمانچہ اور دل پر گھونسا مارا بی بی جان کے تصور کو میرے دماغ میں ابھارا اور کہا کہ تو نہیں گیا تو بی بی جان کا ننھا سا دل ٹوٹ جائے گا میں دیوانی جوانی کے بہکانے میں آ گیا اور رات کے دو بجے جانے کے خیال میں ڈوب گیا۔

خدا خدا کر کے دن ڈوبا میں نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ خط بنا کر حمام کیا اچھے اچھے کپڑے پہنے کپڑوں میں عطر لگایا سامنے چنبیلی کے پھولوں کی ٹوکری رکھی ہوئی تھی اس کو منہ کے قریب لا کر بڑی بڑی گہری سانسوں کے ساتھ سونگھا اور بار بار سونگھاتا کہ دماغ میں تازگی اور چہرے پر شگفتگی آجائے اور جب پونے دو کا وقت ہو گیا کٹی کرا صابون سے پھر منہ دھویا پھول پھر سونگھے آئینے میں اپنی صورت دیکھی لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی کرتے کی جیب میں پستول رکھا ہاتھ میں ڈنڈا لیا اور گھر سے دبے پاؤں نکل گیا ویران گلی پر نگاہ ڈالی رونگٹے کھڑے ہو گئے سچ ہے چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔

کوٹھی کے پھانک پر پہنچا بوا کے شوہر نے جھک کر سلام کیا ہال میں سے ہو کر زنا نے مکان کے دروازے پر گیا بوا نے میری بلائیں لیں اور مجھے بی بی جان کی

خواب گاہ میں پہنچا دیا۔

خواب گاہ کی سجاوٹ، اور خوشبوؤں کی لپیٹ کیا بیان کروں جنت کا تصور اجاگر ہو گیا بی بی جان سر سے لے کر پاؤں تک رضائی اوڑھے لیٹی ہوئی تھی میں نے پٹی کے پاس کھڑے ہو کر اس کے اعضاء کے پیچ و خم دیکھے خون موجیں مارنے لگا آہستہ سے اس کی مسہری پر بیٹھا چپکے سے رضائی کھینچی اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا میں نے اس کی گوری گوری کلاں پکڑ کر منہ سے ہاتھ ہٹانا چاہا اس نے زور لگایا میں نے اس سے زیادہ زور لگا کر ہاتھ ہٹا دیئے اور چاند سا مکھڑا جگمگانے لگا اور آرسی مصحف کا مزا آ گیا۔

وہ داہنی پٹی کی طرف ذرا سی سرک گئی اور میں اس کے معطر پہلو میں لیٹ گیا میں نے کہا میری بی بی جان اس نے آنکھیں بند کر لیں میں نے کہا کیا بالکل بولو ہی گی نہیں؟ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں تبسم کی لہریں گلابی ہونٹوں پر دوڑ گئیں میں نے بھیج کر اس کو سینے سے لگایا اس کا دھڑکتا دل میرے دل پر ضربیں مارنے لگا ہر چند گلابی جاڑے کی رات تھی لیکن میں پسینے میں ڈوب گیا صبح ساڑھے چار بجے جب میں رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک ایسے انداز سے میری طرف نگاہ اٹھائی کہ۔

بسیا رشیدہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

میں نے کہا بی بی جان چلتے وقت تو کچھ بات کر لو اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت نمودار ہوئی اور بڑی آہستگی سے کہا آگ لگے اس دل کو اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مرجاتی میں نے کہا بی بی جان رخصت کے وقت تو ایسی باتیں نہ کرو تم سلامت رہو ہزار برس اتنے میں بوا آگئیں انہوں نے روانگی کا اشارہ کیا اور میں اس پر نظر ڈالتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

اب یہ میرا معلوم ہو گیا تھا کہ ہر تیسرے چوتھے اس پریوش کے پاس رات کے دو بجے جاتا اور صبح کے چار ساڑھے چار بجے گھر پلٹ آتا تھا۔

اے کہ در کوئے خرابات مقامے داری  
جسم وقت خودی، اردست بجامے داری  
اے کہ بازلف و رخ یار گزاری شب دروز  
فرضت باد کہ خوش صبحی و شامے داری

اب ایک رات کا حال سنئے جو بڑی قیامت کی رات تھی اور داد دیجئے اس جرأت  
رندانہ، اور ہمت مردانہ کی جو عاشقوں کے دل کے علاوہ اور کہیں پائی نہیں جاسکتی ایک  
روز حسب معمول میں دو بجے رات کو وہاں پہنچا دیکھا کہ خلاف عادت دربان پڑا سو  
رہا ہے میں نے آہستہ سے اس کو جگایا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا میں نے پوچھا یہ آج تم سو  
کیسے رہے ہو اس نے کہا آج مانگے کی رات ہے میری گھر والی اپنی خالہ کے وہاں گئی  
ہوئی ہے وہ کہہ گئی تھی کہ آپ آج نہ آئیں میں نے کہا تم کو چائے تھا کہ مجھ کو آ کر خبر کر  
جاتے اس نے کہا سرکار کے پاس گیا تھا آپ کو ٹھہی پر نہیں تھے میں آپ کے خدمت گار  
جگنو سے کہہ آیا تھا کہ وہ آپ سے کہہ دے۔

میں نے کہا جگنو نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا اس نے کہا حضور اس میں میرا کیا قصور  
ہے میں نے کہا اب تو میں آگیا ہوں اندر جائے بغیر مانوں گا نہیں اس نے حیران ہو کر  
کہا جائیے گا کیسے اندر سے دروازہ کون کھولے گا اس کی یہ بات سن کر میں سوچنے لگا  
اور بالآخر ایک تدبیر میری سمجھ میں آگئی میں نے اس سے کہا پائیں باغ جاؤ اور پراہی  
کی رسی لے آؤ اس نے بھونچکا ہو کر کہا خاں صاحب بہادر آپ نے کیا کہا ”رسی؟“  
میں نے کہا ہاں رسی اس نے پوچھا رسی کیا کیجئے گائیں نے کہا لے آؤں تو بتاؤں گا

جب وہ رسی لے آیا تو میں نے کہا اس کو ٹھہی کے پیچھے جو ایک گرے ہوئے محل کی  
اینٹوں وغیرہ کی پہاڑی سی بنی ہوئی ہے ادھر چلو ہم اس پہاڑی کے ذریعے سے اس  
کوٹھی کی چھت پر چڑھ جائیں گے وہاں پہنچ کر تم میری کمر میں رسی باندھ کر مجھے اس  
طرح انگنائی میں اتارنا جیسے کنویں میں ڈول ڈالا جاتا ہے میری اس خطرناک تجویز کو



سن کروہ بے حد خوف زدہ ہو گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور بار بار اپنا سر کھجانے لگا اور ہاتھ جوڑ کر اس نے کہا سرکاری کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا آپ بڑے آدمی ہیں آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا میں غریب مارڈالا جاؤں گا۔

میں نے کہا میں تمہاری جان کا محافظ ہوں تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہو گا یہ دیکھو میری جیب میں پستول ہے اگر نواب صاحب نے تم کو چھڑا دیا میں اس سے دگنی تنخواہ پر تم کو ملازم رکھ لوں گا اور کل صبح کو تم کو دو سو روپے بھی دوں گا بالکل خوف نہ کھاؤ اور میرے ساتھ ساتھ آؤ۔

اس نے کہا بہت اچھا سرکاری کام ہے بڑا جان لیوا میں نے کہا بہت آسان ہے پروا نہ کرو۔

ہم دونوں اس گھرے ہوئے مکان کے انبار پر گھوڑے بن کر چڑھے اور گھٹنوں کے بل منڈیر کی طرف ریٹنے لگے۔

بڑی مصیبت یہ تھی کہ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اس کوٹھی کے دائیں جانب کے مکان میں ایک دمے کا مریض برابر کھانس رہا تھا اور داہنے طرف کے مکان میں ایک عابد شب زندہ دار اور اد پڑھ رہا تھا دونوں طرف جگا ہر ہو رہی تھی لیکن میں ہمت نہیں ہارا اور جب ریٹتا ریٹتا منڈیر کے قریب پہنچ گیا تو ایک کالا سانپ عین میرے منہ کے سامنے کھڑا ہو کر پھنکاریں مارنے لگا العظمتہ اللہ وہ خوف ناک سماں وہ موت کا سامنا۔

میں اس کو کیوں کر مارتا اس لئے کہ اگر اس پر ڈنڈا چلاتا تو سارا گھر جاگ اٹھتا اس لئے میں نے آنکھیں بند کر لیں دربان دو رہٹ کر بیٹھ گیا اور سانپ کی پھنکاریوں کی ہوا میرا ماتھا چھونے لگی اور موت بھیا نک موت میرے دل پر دستک دینے لگی میں نے دل میں کہا شوق سے ڈس لیجئے سانپ صاحب۔

میں اسی طرح دو تین منٹ تک یقینی موت کے سامنے بیٹھا رہا اتنے میں پھنکاری

آواز بند ہو گئی میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر جان میں جان آ گئی کہ ناگ دیوتا رخصت ہو چکے ہیں۔

دربان کو مڑ کر دیکھا تو وہ کانپتے ہاتھوں سے اشارہ کر رہا تھا کہ اتر چلئے میں نے بڑے تحکمانہ اشارے سے ہدایت کی کہ وہ میری کمر میں رسی باندھ دے اس نے کانپتے ہاتھوں سے میری کمر میں رسی باندھ دی اور دو زانو ہو کر مجھ کو نیچے اتارنے لگا نیچے پہنچتے ہی میں نے رسی کمر سے کھول دی دربان نے اوپر کھینچ لی اور میں بی بی جان کی کو اب گاہ میں پہنچ گیا۔

لیکن جب میں نے یہ سماں دیکھا کہ اس کی مسہری کی پانچٹی والی چارپائی پر ایک مرمے کے تھیلے کی سی بڑی بی بستر پر لیٹی خراٹے لے رہی ہیں تو زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اور اس قدر بدحواس ہو گیا کہ بی بی جان کی مسہری کے نیچے لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ کون سا جتن کروں کہ اس فتنہ خواہیدہ کی آنکھ کھل جائے اور وہ ان بڑی بی کو وہاں سے چلتا کر دے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا ایک بڑی گھونس میری طرف آرہی ہے جیسے ہی وہ میرے قریب آئی میں نے اس کی طرف زور سے ہاتھ جھٹک دیا وہ گھبرا کر بھاگی تو میز سے ٹکرا گئی اور میز پر رکھی ہوئی صراحی دھڑ سے زمین پر گر پڑی صراحی کے دھڑ اکے سے بڑی بی کی آنکھ کھل گئی اور وہ چور چور کہتی باہر نکل گئیں ان کے جانتے ہی میں اس کے بستر پر آ گیا پہلے تو وہ گھبرا گئی پھر اس نے بستر پر اپنے دونوں پاؤں کھڑے کر کے مجھ کو ان کے جوف میں لے لیا اور اوپر سے رضائی اوڑھ لی۔

بڑی بی کی صدا سن کر بی بی جان کے چچا کمرے میں داخل ہوئے پوچھا بیٹی کیا بات ہے اس نے کہا چچا جان میرا پاؤں لگنے سے صراحی نیچے گر پڑی اور اچھو خانم نے چور چور کا نفل مچا دیا چچا نے ہنس کر کہا اچھو خانم تو ہولا جیلا ہے ہی بی بی جان نے کہا چچا اب اس کو میرے کمرے میں نہ بھیجے گا کم بخت اس زور سے خراٹے لیتی ہے کہ ٹکڑی

نیند اچٹ جاتی ہے۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ جب اس کے چچا اس سے باتیں کر رہے تھے ان کا گھٹنا میرے گھٹنے سے مس ہو رہا تھا اور ڈرنے کے عوض مجھ کو ہنسی آرہی تھی۔

چچا کے جاتے ہی اس نے اندر سے کمرہ بند کر لیا اور جب میں نے اس سے پورا سانحہ بیان کیا کہ میں کن کن خطروں سے گزر کر اس تک آیا ہوں وہ دنگ ہو کر رہ گئی کہنے لگی اگر تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو جاتا تو میں زہر کھا کر سو رہتی یہ کہتے ہی اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اتنے میں چار بجے کا کجر بجنے لگا وہ مجھ کو گوپھے میں لے کر باہر نکلی اور دبے پاؤں مجھ کو گلے لگا کر رخصت کر دیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اس کے بعد نواب صاحب شکار کے اتنے دھتیا تھے کہ پورے خاندان کو لے کر اودھ فارسٹ چلے گئے اور میں ویران ہو کر رہ گیا میری زندگی کے گلستاں میں خاک اڑنے لگی حیات کے منہ کا ذائقہ بدل گیا یاروں کے جملگھے اور راتوں کے جلسے کھوکھلے اور سپاٹ ہو کر رہ گئے شائیں ہی نہیں سجھیں تک اداس ہو گئیں اور طلوع کی رنگینیاں دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں مرتد ہو چکا ہوں اور اپنے رسول کے سامنے جھینپا جھینپا کھڑا ہوا ہوں

اس کی مفارقت نے مجھ کو وہ بچہ بنا دیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے اور ہڑک ہڑک کر اس کا منہ تنہیا کا سا ہو جاتا ہے۔

اب مجھ سے نہیں رہا گیا میں نے رخت سفر باندھا اور اودھ فارسٹ جانے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو گیا راستے میں کم بخت موٹر خراب ہو گئی اسٹیشن پہنچا تو ریل چھوٹ چکی تھی میں سن سے ہو کر رہ گیا۔ میں نے قلی سے کہا اگر کوئی مال گاڑی ادھر جا رہی ہو تو میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ 1 لے کر اس میں روانہ ہو جاؤں قلی نے کہا ایک مال گاڑی شاید آدھے گھنٹے میں اسی طرف جانے والی ہے میں بنگ آفس گیا بنگ بابو نے کہا وہ مال گاڑی نہیں فوجی گاڑی ہے اس میں آپ سفر نہیں کر سکتے میں نے باہر آ کر قلی سے کہا

مجھے اس فوجی گاڑی تک پہنچا دے وہ مجھے یارڈ لے گیا دور سے گاڑی بتادی ہینڈ بیگ میرے حوالے کیا اور اجرت سے دگنا معاوضہ لے کر چلا گیا اور میں گلے میں بیگ ڈال کر گاڑی چھوٹنے کے انتظار میں زمین پر بیٹھ گیا۔

چونکہ وہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور فوجی گاڑیوں تک کسی کو جانے نہیں دیا جاتا تھا اس لئے میں بڑے شش و پنج کے عالم میں یہ سوچتا ہوا بیٹھا رہا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو جاسوسی کے جرم میں کھڑے کھڑے گولی مار دی جائے گی یا گرفتار کر لیا جاؤں گا خدا خدا کر کے شاید گیارہ بجے انجن نے سیٹی دی اور میں لپک کر گارڈ کے ڈبے کے پیچھے بمپر پر بیٹھ گیا گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو میرے جسم کا توازن بگڑنے لگا میں کچکا کر دونوں ہاتھوں سے بمپر کو پکڑ لیا کہ اتنے میں یورپین گارڈ نے پیچھے کی کھڑکی کھول دی مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ اچھل پڑا پستول جیب سے نکال کر تان لیا اور ڈپٹ کر پوچھا تم کون ہو میں نے بڑی مردانہ آواز میں کہا (خاموش یہ معاملہ عشق ہے میں اپنی معشوق کے وہاں جا رہا ہوں)

گارڈ اگر ہندوستانی ہوتا تو ٹھائیں سے گولی مار دیتا مگر وہ انگریز فوجی منچلا انگریز تھا میرا یہ مردانہ جواب سن کر اس نے کہا بریو، بریو (شباباش بہادر) اور دونوں ہاتھوں سے مجھ کو اندر کھینچ لیا اس نے لالٹین اٹھا کر غور سے میرا

---

1 ریلوے کا یہ قاعدہ ہے کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر مال گاڑی میں گارڈ کے ڈبے میں سفر کیا جاسکتا ہے۔

---

منہ دیکھا اور مسکرا کر کہا (ارے بالکل عاشق کا چہرہ) اور پھر بڑی نرمی کے ساتھ اس نے کہا

(بیٹھ جائیے مسٹر عاشق، میں بھی عاشق ہوں)

میں بیٹھ گیا تو اس نیک مرد نے مجھ کو بیئر پلائی بھنا ہوا گوشت کھلایا، اور جب میرا اسٹیشن آ گیا تو میرے ساتھ آ کر مجھ کو گیٹ سے باہر نکال دیا۔



سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالب  
خدا سے کیا ستم و جورنا خدا کہنے

اس کے بعد جب ہم نواب صاحب کے ساتھ ان کے وطن آگئے تو دو تین مہینے کے بعد یہ سننے میں آیا کہ بی بی جان کی شادی ٹھہر چکی ہے یہ خبر توپ کے گولے کی طرح میرے دل پر لگی اور جب حسب دستور رات کے دو بجے اس سے ملاقات ہوئی تو اس خیال سے کہ اس کی شادی ہونے والی ہے وہ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہر چند وہ میرا جوانی کا دور تھا لیکن مجھ پر اس وقت پیرانہ ماں اندیشی طاری ہو گئی میں نے سوچا کہ اس سے میرا عقد تو ہونے میں سکتا اور وہ ہمیشہ بن بیاہی رہے اس کا بھی امکان نہیں اس کی شادی جس سے ٹھہری ہے وہ صحت و شباب کے اعتبار سے ایک کمزور و کم خواندہ رئیس زادہ ہے اس کی صورت میں بھی کوئی دل کشی نہیں عقل کے اعتبار سے بھی نہایت کمزور ہے اس کی اور میری پرانی ملاقات بھی ہے اگر اس کمزور اور کمزور شخص سے اس کی شادی ہو جائے گی تو وہ کسی طرح بھی بی بی جان کے دل کو موہ نہیں سکے گا اور اسی کے ساتھ ساتھ شادی کے بعد پردے پردے کی یہ سختی بھی باقی نہیں رہے گی میں جب چاہوں گا اس سے با آسانی مل سکوں گا ان تمام باتوں پر غور کر کے میں نے بی بی جان کے دل میں یہ بات اتار دی کہ وہ اپنی شادی سے پریشان نہ ہوں عورت منطقی نہیں جذباتی ہوتی ہے اس لئے لوہے لگ گئے اس کو سمجھانے میں ایک ہفتے تک میں بڑے بڑے لیکچر دیتا رہا تب جا کر اس نے خود کشی کا ارادہ ترک کیا اور اس شدید اصرار سے بھی دست بردار ہو گئی کہ میں اسے لے کر کسی دوسرے شہر میں بھاگ جاؤں۔

لیکن جب شادی کا دن آیا اور صبح کو اس کی کوٹھی سے نوبت بجنے کی آواز آنے لگی تو میرا دم لبوں پر آ گیا ساری منطق بھول گیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا۔

میری اس کیفیت کا کسی قدر اندازہ مندرجہ ذیل نظم 1 سے لگایا جاسکتا ہے  
 کدھر ہے اے موت؟ آ کہ غم سے لبوں پر اب جاں آ رہی ہے  
 وہ شمع، جو یادگار شب تھی اسے بھی آندھی بجھا رہی ہے  
 دہائی حسن خجہ خوکی کہ رسم عالم کی فتنہ خیزی  
 چھٹے ہوؤں کو ملا رہی ہے ملے ہوؤں کو چھڑا رہی ہے  
 ادھر نفیری کی مست لہریں لئے ہوئے ہیں پیام شادی  
 ادھر نسیم سحر کی جنبش ترانہ غم سنا رہی ہے  
 ادھر، عروسی لباس زریں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا  
 ادھر کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفنی پہنا 2 رہی ہے  
 قدیم پیغام بر تھی میری، صبا کو یہ آج کیا ہوا ہے  
 ادھر بجھاتی چلی ہے شمعیں، ادھر شگوفے کھلا رہی ہے  
 ادھر کلیجے میں تھرتھراتا ہے شعلہ مرگ ناگہانی  
 ادھر شبستان رنگ و بو میں حیات نو مسکرا رہی ہے  
 ادھر عرق ہے مری جبیں پر ادھر جھمکتی ہے جوش افشاں  
 ادھر لبوں پر ہیں سرد آہیں ادھر صبا گنگنا رہی ہے

1 مطبوعہ ”نقش و نگار“ ایسے بے کراں شدید جذبہ غم میں یہ نظم کہی گئی تھی جب

شعر کہنا امکان سے خارج تھا۔

2 صحیح لفظ ”پہنا“ ہے مجھ سے شدت غم کی بدحواسی میں غلطی ہو گئی۔

اور اسی سلسلے کی ایک دوسری نظم بھی سن لیجئے:

کیا وہ بتائیے کیا کیا عشوہ روزگار نے  
 مارا ہو جس غریب کو حسن وفا شعار نے  
 اب وہ شہید التفات، دل کی گرہ کسے دکھائے

بند کیا در طرب جس پہ کشود کار نے  
سمجھے گا کون نکتہ رس اس کی حدیث خونچکاں  
جس کا لہو بہا دیا، تیغ وفائے یار نے  
کون یقین لائے گا کس سے کہوں یہ ماجرا  
لوٹ لیا مرا چمن، عربدہ بہار نے  
مصحف انبساط نے، آسیہ حزن پیش کی  
فتح سے دور کر دیا، نصرت کردگار نے  
مجھ کو در نشاط نے، اشک الم عطا کئے  
شام شکست نذر کی، صبح ظفر شکار نے  
حسن کے جذب عشق نے، دل کو تباہ کر دیا  
پھول کی روح کھینچ لی، شب نم اشک بار نے  
بھیس میں آ کے عشق کے جوش تجھے مٹاؤں گا  
مجھ سے، قسم یہ کھائی تھی، حسن ستم شعار نے

☆☆☆☆☆☆☆☆

## ج ب، ع خ

ایک بار 1 دفتر سے گھر پہنچا تو یہ دیکھا کہ میری بیوی تخت پر متمکن ہیں اور صوفے پر ایک بیس اکیس برس کی نہایت قبول صورت خاتون بیٹھی ہوئی ہیں میں یہ سمجھ کر کہ کوئی پردہ نشین میری بیوی سے ملنے آئی ہوئی ہیں جب اٹے پاؤں باہر جانے لگا تو میری بیوی نے رکتی سی آواز میں کہا تم سے ملنے کو مدراس سے آئی ہیں۔

میں پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بیوی کی طرف بڑے معصومانہ انداز میں دیکھنے لگا کہ وہ اس خاتون کا مجھ سے تعارف کرا دیں۔

جب بیوی کچھ نہیں بولیں اور منہ پھلائے گم سم بیٹھی رہیں تو میں ایک عجیب کش مکش میں پڑ گیا بیوی کی موجودگی میں یہ ہمت تو پڑی نہیں کہ اس آنے والی سے براہ راست بات کروں۔۔۔ آخر کار تنگ آ کر میں نے بیوی سے پوچھا آپ کون ہیں؟ بیوی نے کہا تم خود پوچھ لو، میں کیا کروں گی بول کے۔

اس آنے والی نے عجیب شش و پنج کے عالم میں نظر اٹھائی اور کہا میں آپ سے ملنے مدراس سے آئی ہوں میرا نام ہے ج ب رہنے والی یوپی کی ہوں مگر قیام ہے مدراس میں۔۔۔۔۔ میرے دل میں تین شخصیتوں یعنی ابوالکلام آزاد، انور پاشا اور آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی انور پاشا کا انتقال ہو گیا مولانا ابوالکلام آزاد سے مل چکی اور آج آپ سے ملنے آئی ہوں مجھے شاعری سے بے حد شوق ہے آپ کی کتاب ”روح ادب“ شروع سے آخر تک مجھے یاد ہے میں آپ کی بے حد عقیدت مند ہوں

---

1 یہ غالباً 1928ء کا واقعہ ہے جب کہ میں حیدرآباد دکن میں تھا

---

میں نے آج سے کئی برس پہلے آپ کی ایک نظم جنگل کی شہزادی کا یہ آخری شعر

جب پڑھا تھا:

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی  
پڑی چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی



تو میں رونے لگی تھی، اور ابھی میں رو رہی رہی تھی کہ نانی جان آ گئیں انہوں نے مجھ سے پوچھا اری کیوں رو رہی ہے میں نے کہا جوش صاحب کو آپ جانتی ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں جانتی ہوں میں نے کہا تو جوش صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے، جنگل میں گاڑی رکھی، وہ ریل سے اتر کر جنگل کی سیر کرنے لگے اور اس قدر محو ہو گئے کہ گاڑی چھوٹ گئی، اور وہ جنگل میں رہ گئے نانی جان اللہ سے دعا کیجئے کہ ان کی جان بچ جائے میری نانی جان نے قہقہہ مار کر کہا، اری دیوانی تو شاعروں کی بات پر نہ جا، یہ روز مرتے اور روز جیتے ہیں۔

چاہئے تو مجھے یہ تھا کہ یہ ماجرا سن کر، میں اس سے گل مل کر باتیں کرتا، مگر بیوی سامنے بیٹھی ہوئی تھیں اس لئے میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کے بے وقوف آدمی کی طرح، اس کی طرف دیکھ کر گدی کھجانی لگا۔

اس نے مجھ کو غور سے دیکھا معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی اور ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے اس نے کہا آپ کا مکان شہر سے دور ہے یہاں کوئی ٹیکسی نہیں مل سکے گی میں جس ٹیکسی پر آئی تھی اسے رخصت کر دیا ہے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھ کو میری سہیلی کے مکان تک پہنچا دیجئے، جس کے پاس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔

میں ایک عجیب ادھیڑ بن میں پڑ گیا، جاتا ہوں تو بیوی کو ناگوار گزرے گا نہیں گیا تو اس کو رنج ہو گیا کیا کروں، کیا نہ کروں۔

آخر یہ فیصلہ کر کے کہ اسے اس کی جائے قیام تک پہنچاؤں، میں اٹھا بیوی کی جانب نگاہ نہیں اٹھائی، اس سے کہا چلئے میں پہنچاؤں۔

وہ مجھ سے چھ سات میل کے فاصلے پر ٹھہری ہوئی تھی جب میری گاڑی ایک بہت بڑے بند کی سڑک سے گزرنے لگی اس نے مجھ سے کہا جوش صاحب بڑی پیاری شفق پھولی ہوئی ہے پل بھر گاڑی روک لیجئے کہ یہ منظر دیکھ لوں۔

جب گاڑی رک گئی اس نے بڑی لگاؤ سے مجھے دیکھا اور اپنی بھری بھری انگلیا

سے ایک پرچہ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔

پرچہ پڑھا تو اسے اظہار عشق سے لبریز پایا میرے ہاتھ کا پھنسنے لگے طبع کی مفارقت کا گھاؤ ابھی مندل نہیں ہوا تھا اور اس وقت تک میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں میں نے جیب سے قلم نکالا اور اس پرچے کی پشت پر یہ لکھ کر کہ میں آج کل بری طرح زخمی ہوں کسی نئے زخم کی تاب نہیں لاسکتا ایک نہایت طویل بیداری کے بعد اب کوشش کر رہا ہوں کہ سو جاؤں، مجھ جو جگائے نہیں۔

میرے جواب کو پڑھ کر، اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، آنکھوں میں نمی آگئی اس نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا تو پھر مجھے یہیں اتار دیجئے میری سہیلی کا مکان قریب آگیا ہے میں پیدل چلی جاؤں گی۔

یہ سن کر میں کانپ گیا اس کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا کر کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو یہیں اتار دوں آپ کو میرے دل کا حال نہیں معلوم آپ کی طرف میرا دل کھینچ رہا ہے مگر۔۔۔۔۔ اس نے اس ٹوٹ جانے کے بعد اس بندھ جانے کی نظر سے مجھ دیکھا، اور کہا آپ کا شکریہ۔

راستے بھر وہ خاموش رہی اس خاموشی میں ہزاروں باتیں تھیں جنہیں کانوں نے نہیں دل نے سن لیا۔

میں نے دل میں کہا میاں جوش خدا را پھر کسی نئے تہلکے میں نہ پڑ جانا، سنبھالے رہو اپنے کو اب عشق کیا تو مر کر رہ جاؤ گے خاں صاحب۔

اتنے میں اس کی سہیلی کا مکان آگیا میں نے موٹر سے اتر کر دروازہ کھولا وہ اتری پوچھا تھوڑی دیر بیٹھے گا بھی نہیں؟ میں نے کہا خود میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ بیٹھ جاؤں، اور پہروں بیٹھوں مگر۔۔۔۔۔ میں پھر کسی وقت آؤں گا۔ اس نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھا میں نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا حسن مغموم میرے دل کو زخمی نہ کر دے فوراً آنکھیں جھکا لیں، اور جلدی سے روانہ ہو گیا۔

گھر آیا بیوی کو آگ بگولا پایا مجھے دیکھتے ہی برس پڑی اور کہا اور تو اور، اب تو میری آنکھوں کے سامنے تم عشق بازی کرنے لگے ہو، میں نے کہا اشرف جہاں اللہ اللہ کرو، تم میری ایک شرافت اور مروت کی بات کو عشق بازی کہہ رہی ہو میں اور عشق، الہی تیری پناہ یہ سن کر انہوں نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے چرے سے پھاڑ ڈالا اور کہا جوتیوں سمیت آنکھوں میں نہ گھسو، میں نے کہا خدا کے واسطے بات سمجھنے کی کوشش کرو، اور یہ سوچو کہ کوئی اتنا بڑا سفر طے کر کے میرے گھر آئے اور گھگھیا کر کہے کہ مجھے میری جائے قیام تک پہنچا دو، اور میں اس کو ٹکا سا جواب دے دوں۔ یہ بات شرافت کے خلاف ہے ارے تم شرافت کو بھی عشق بازی سمجھتی ہو، یہ تو بڑا اندھیر ہے۔

بیوی نے کہا، اچھا قسم کھا کر بتاؤ اس پختنیدی کے ساتھ، اس کے گھر جا کر بیٹھے تھے کہ نہیں، میں نے کہا، بیٹھنا کیسا، میں نے تو اس کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھا۔

بیوی نے کہا تم سر پر قرآن رکھ کر قسم کھا سکتے ہو؟ سانچ کو آنچ نہیں، لے آؤ قرآن، وہ قرآن لے آئیں، میں نے سر پر قرآن رکھ کر قسم کھالی ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا کہنے لگیں ناحق میں نے تمہارا گریبان پھاڑ ڈالا اسی دوں۔

اس واقعے کے دو تین دن بعد میں دفتر میں بیٹھا تھا، چپرا سی نے آکر کہا، کوئی بیگم صاحب آپ سے ملنے آئی ہیں اور ٹیکسی میں بیٹھی انتظار کر رہی ہیں نیچے اتراتو دیکھا وہی ہے، صاحب سلامت کے بعد، اس نے کہا موٹر میں آجائیے، میں بیٹھ گیا تو اس نے کہا کہ آپ آنے کا وعدہ کر کے گئے تھے لیکن آئے نہیں۔

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے شو فر سے کہا باغ۔۔۔۔۔ لے  
چلو۔ باغ میں موٹر ٹھہری اس نے کہا آئیے اس کنج میں چھوڑی دیر بیٹھ جائیں۔ کنج میں  
بیٹھتے ہی اس نے کہا جوش صاحب آپ کا کلام پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آپ کا  
دل موم کی طرح نرم ہے، لیکن دیکھا تو وہ پتھر نکلا، سچ بتائیے شعر آپ خود کہتے ہیں یا  
کوئی اور آپ کو لکھ کر دے دیتا ہے؟

میں نے کہا میں آپ کے پاس کل آنے والا تھا، آتا اور ضرور آتا، آپ اس قدر بد گمانی سے کام نہ لیں طبیعت کی ناسازگاری کی بناء پر کل پرسوں نہیں آسکا۔ اس نے مسکرا کر کہا، جس کی طبیعت ناساز ہوتی ہے اس کا چہرہ کیا ایسا ہوتا ہے؟ اب میں آپ کو چھوڑنے والی نہیں، اسی وقت میرے ساتھ۔۔۔۔۔ نہر کے کنارے چلے یہ کہتے ہی وہ اٹھ بیٹھی موٹر میں آتے ہی اس نے شو فر سے کہا پہلے مجھ کو جہاں سے لائے ہو وہاں لے چلو اور جب گاڑی اس کی قیام گاہ پر آ کر رکی اس نے کہا جوش صاحب اندر آئیے میں۔۔۔۔۔ نہر پر اپنی سہیلی کو بھی لے چلوں گی۔

گھر پہنچے ہی اس نے اپنی سہیلی کو آواز دی کہ ادھر آؤ جوش صاحب کے ساتھ۔۔۔۔۔ نہر پر چلنا ہے۔

تھوڑی دیر میں اس کی سہیلی آگئی سرمئی دلائی اوڑھے اور اس کا سر امنہ پر ڈالے ہوئے میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تو ایسا معلوم ہوا گویا افق کے گریبان سے آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور جب اس نے اپنی گوری ہتھیلیوں پر رکھ کر مجھے پان دیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر، مہندی کا ہلال ہوا ہے اور اس ہلال کے اندر مہندی ہی سے لکھا ہوا ہے ”جوش“ میں نے اپنے کو حد سے زیادہ سنبھالنے کی کوشش کی، پھر بھی میرے تمام بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔۔۔۔۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگر  
الغرض کھانے پینے کا سامان لے کر ہم تینوں۔۔۔۔۔ نہر کی طرف روانہ ہو گئے۔  
راستے میں مجھے خیال آیا کہ بیوی پریشان ہوں گی، اور بدگمان بھی، میں نے ایک موٹر پر گاڑی رکوا دی، اور اپنے ایک دوست سے بیوی کو ٹیلی فون کرا دیا کہ آج میرے گھر جلسہ ہو رہا ہے، اس لئے جوش صاحب کو میں نے روک لیا ہے وہ کل دوپہر تک گھر پہنچ جائیں گے۔

۔۔۔۔۔ نہر کے کنارے پہنچ کر ہم ریٹ ہاؤس میں ٹھہر گئے، میں نے کہا



ہم تھوڑی دیر آرام کر لیں یہ کہہ کر میں لیٹ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے آدھ یا پون گھنٹہ ہوا ہو گا کہ ”ج۔ب“ نے آ کر میرے پاؤں دبانا شروع کر دیئے اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ بھی آ کر میرے پاؤں دبانے لگے سہیلی نے کہا باجی میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے لیکن جب اس نے اسے ڈانٹا تو وہ بھی آ کر پاؤں دبانے لگی۔

میں نے کہا ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں برائے خدا ایسا نہ کیجئے میں شرم کے مارے کٹا جا رہا ہوں۔

لیکن وہ نہیں مانیں، اور میں دس پندرہ منٹ کے بعد شرم کی تاب نہ لا کر اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے چلا گیا، میرے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی ”ج۔ب“ بھی آگئی اور ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی سہیلی کو بھی وہیں بلا لیا۔

مجھ سے ان دونوں کی موجودگی کے باعث اچھی طرح منہ نہیں دھویا گیا، اور جب الٹا سیدھا منہ دھو کر، میں تو لیا کی طرف بڑھا تو ”ج۔ب“ نے کہا نہیں، تو لیہ نہیں میں اپنے دوپٹے سے آپ کا منہ پونچھوں گی میں کیا کرتا اس نے اپنے دوپٹے سے میرا منہ پونچھا پھر اس نے مجھ سے کہا آپ کرسی پر بیٹھ جائیں اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ جگ سے میرے پاؤں دھلا دے اس نے تعمیل کی اور جب میرے پاؤں دھل گئے تو دوپٹے کے عوض اس کی سہیلی نے اپنی زلفیں کھول کر میرے پاؤں پونچھنا شروع کر دیئے میں اس کی وضع سے گھبرا گیا پاؤں کھینچ لئے اور شرم کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔

اب شام ہو گئی، ریٹ ہاؤس کے بوائے کے تھیلے میں گلاس، سوڈے اور بوتل رکھوا کر ہم نہر کے ایک ایسے کنارے پر جا کر بیٹھ گئے جدھر کوئی آتا جاتا نہیں ہائے وہ رنگین شام، وہ سامنے وہ گل فام، وہ چھلکتا جام، وہ آنکھوں آنکھوں میں کلام۔۔۔۔۔۔ وہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، وہ آسمان پر ابر کے ہلکے ہلکے وہ لہروں میں ڈوبتے سورج کا سونا، وہ چار، مدھ بھری آنکھریوں میں جادو ٹونا۔

جب میں نے اس حلقہ جمال میں دوپگ ختم کر کے تیسرا پیگ بنا کر سامنے رکھ لیا تو ”ج۔ب“ نے مجھ سے پوچھا وہ ”جنگل کی شہزادی“ سچ مچ تھی یا خیالی تو میں نے کہا میں نے آج تک کوئی خیالی اور ہوائی نظم نہیں کہی ہے اس نے کہا آپ نے اپنی اس نظم میں اس جنگل کی لڑکی کا جو حسن و جمال بیان کیا ہے اس میں کوئی مبالغہ تو نہیں اور جب میں نے کہا قطعی کوئی مبالغہ نہیں ہے تو اس نے کہا جب آپ اس کو بھول گئے تو ہمیں بھی بھول جائیں گے میں نے کہا ایسا نہیں ہوگا، میرا دل ایک مرقع ہے جس میں اس کی تصویر اب تک لگی ہوئی ہے، اسی طرح آپ کی تصویر بھی لگی رہے گی اس نے کہا آنکھیں بند کر لیجئے اور میرے سر کی قسم، جب تک میں نہ کہوں میچے ہی رہئے

جب میں نے آنکھیں بند کر لیں، اس نے میری آنکھ کا بوسہ لے لیا مجھ پر ایک ناقابل شرح کیفیت طاری ہو گئی، پھر اس نے سہیلی سے کہا تو دوسری آنکھ کا بوسہ لے لے اس نے کہا باجی میرا ہیاؤ نہیں پڑ رہا ہے میری طرف سے آپ ہی بوسہ لے لیں اس نے چٹ سے میری دوسری آنکھ کا بھی بوسہ لے لیا اور میرا سر ہوا میں اڑنے لگا اس نے کہا اب آنکھیں کھول دیجئے اور مجھے دنیا بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔

چوتھا پیگ ختم کر کے میں نے کہا اب اندھیرا ہو گیا ہے آئیے ریٹ ہاؤس چلیں۔

ناہم وار ساحل سے جب موٹر کی طرف چلا، ایک بہت نکملا پتھر میرے گئے میں چھ گیا اور خون نکلنے لگا ”ج۔ب“ نے اپنا پلو پھاڑ کر سوڈے میں تر کیا، اور میرے گئے پر باندھ لیا۔

اب ہم آکر موٹر میں بیٹھ گئے، میرے بائیں طرف ”ج۔ب“ اور دائیں طرف اس کی البیلی سہیلی ”ع۔خ“ بیٹھ گئی۔

موٹر نے ابھی بمشکل آدھا فرلانگ ہی طے کیا ہوگا کہ اس کی سہیلی نے مجھ سے کہا ذرا اپنا گٹا دکھا دیجئے میں نے گٹا اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے اپنی کلائی میرے

گئے پر چسپاں کر دی۔

ج۔ ب نے پوچھا کیا کر رہی ہے اس نے کہا باجی میں نے اپنی کلانی کو دانتوں سے لہو لہان کر کے اس کو جوش صاحب کے گئے پر اس لئے چسپاں کر دیا ہے کہ جوش صاحب کے خون سے میرا خون مل جائے۔

یہ سنتے ہی ”ج۔ ب“ سہیلی سے بگڑ گئی اور کہنے لگی میں تو یہاں تجھے تفریح کرانے لائی تھی تو تو جوش صاحب سے عشق لڑانے لگی۔

سہیلی نے روہانسی آواز میں کہا باجی آپ انسانی ہمدردی کو عشق لڑانا کہہ رہی ہیں مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی اتنا کہہ کر اس نے پلو سے منہ چھپالیا اور رونے لگی۔

اب ہم ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے میں نے دیکھا ”ج۔ ب“ کی آنکھوں میں رقابت کی سرخی اور ”ع۔ خ“ کی آنکھڑیوں میں گھٹن کی ملگجاہٹ پائی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بات بھی بھانپ لی کہ ”ج۔ ب“ کے مزاج میں نیولین کی سی سختی اور ”ع۔ خ“ کے مزاج میں حضرت مسیح کی سی نرمی کا فرما ہے۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی اس نے ”ع۔ خ“ کو حکم دیا کہ تم اس سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ تمہارا کھانا وہیں بھیج دیا جائے گا وہ اداس ہو کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اس کے اس طرح چلے جانے سے میرے دل کو بڑا دھکا لگا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکا۔

وہ ریسٹ ہاؤس کی رات عجیب رات تھی جس میں شیرینی بھی تھی، تلخی بھی کیف بھی تھا، کرب بھی ”ج۔ ب“ کی موجودگی کا نوش بھی تھا اور ”ع۔ خ“ کی غیر موجودگی کا نیش بھی۔

میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو میں یہ کہوں کہ ہر چند ”ج۔ ب“ کی بھرپور جوانی، اور اس کے رخساروں کی گل فشانی بے حد نظر فریب تھی، لیکن ہائے اس کی سہیلی ”ع۔ خ“ کا مکھڑا اور اس مکھڑے پر اس کی مسکینی کا جمال، میرا دل ٹوٹ کر اس پر آچکا

تھا۔

اب سننے اللہ کا کرنا کیا ہوا، اس واقعے کے دو ماہ بعد جب میں ”ج، ب“ کا تارپا کر مد راس گیا اور اس کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا اس کے پانچویں دن ”ع۔خ“ بھی اپنے بھائی کے ساتھ وہاں 1 پہنچ گئی۔

اس کو دیکھتے ہی میرا دل باغ باغ ہو گیا وہ دوڑ کر ”ج۔ب“ سے لپٹ گئی ”ج، ب“ نے اپنے چہرے کی تلخی پر جھٹ سے نقاب ڈال کر، اس کا ماتھام چوم لیا۔  
”ع، خ“ نے اس کے یعنی ”ج، ب“ کے چہرے کی تلخی محسوس کر لی تھی اس لئے

1 اس کے بھائی کو کسی ضروری کام سے مد راس جانا تھا، اس نے یہ سوچ کر کہ میں وہاں موجود ہوں اپنے بھائی سے استدعا کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو، سمندر کی ہوا سے میری صحت درست ہو جائے گی۔

اس کو اپنے ماتھے کے چوم لئے جانے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، اور اس کی جھکی ہوئی پلکوں کی چھاؤں میں مومن کا یہ شعر سر پیتا نظر آیا۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل  
میں، کوچہ رقیب میں بھی، سر کے بل گیا  
”ج، ب“ نے ہم دونوں کی طرف بار بار نظر اٹھائی، اور بڑی تلخی کے ساتھ میرے کان میں کہا آگ، دونوں طرف لگ چکی ہے اور میں بیچ میں کھڑی جل رہی ہوں۔  
اس کو دوسرے کمرے میں لے جا کر میں نے کہا تمہارا یہ خیال غلط ہے، مجھ کو محبت تم سے ہے اور ترس اس پہ آتا ہے کہ اس بیچاری کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے۔

”ج، ب“ نے کہا اچھا قسم کھا کر کہو تم میرے ہو یا اس کے؟ میں قسم کھا کر کہا میں تمہارا اور صرف تمہارا ہوں اس نے کہا عورت سے زیادہ کوئی محبت کی نظر کو پہچان نہیں سکتا، تمہاری نظریں بتا رہی ہیں کہ تم اس ہڈیوں کے مالے پر دل جان سے فدا ہو چکے



بات تو اس نے سچی کہی تھی، لیکن میں نے دھاندلی اور بے ایمانی سے کام لے کر اس سے کہا تم دھوکا کھا رہی ہو، کہہ چکا ہوں کہ اس کی صحت کی خرابی پر مجھ کو بڑا ترس آتا ہے تم ترس کھانے والی نظر کو محبت کی نظر سمجھ بیٹھی ہو یہ تمہاری بڑی نادانی ہے ارے کہاں تم اور کہاں وہ

چہ نسبت خاک را، با عالم پاک  
اس کے چہرے پر بحالی آگئی اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں صرف اسی کو چاہتا ہوں اس نے ”ع، خ“ کو جو باہر بیٹھی ہوئی تھی بڑے پیار سے آواز دی کہ وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو یہاں چلی آؤ، وہ کبک دری کی طرح قدم اٹھاتی خوش خوش آئی اور میرے سامنے کے صوفے 1 پر بیٹھ گئی۔

1 معاف کیجئے ایک بڑی ان بے بی جور بات لکھ رہا ہوں یعنی  
آج 13 نومبر 1967 کو پونے تین بجے

میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ”ع، خ“ کی جانب نگاہ نہیں اٹھاؤں گا اس لئے کہ ایسا کیا تو پکڑا جاؤں گا میں سخی سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ لیکن اسے کیا کرتا کہ میرا چہرہ پھر پھرانے اور الف ہونے لگا۔۔۔۔۔ اتنے میں ”ج، ب“ کوئی چیز لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی، میں نے بے حد عجات کے ساتھ ”ع، خ“ کی طرف نگاہ اٹھائی اس نے میری جانب دیکھا نظروں میں دو دو باتیں ہو گئیں اور اس نے اپنے سینے پر گھونسہ مار لیا۔

”ج، ب“ نے پٹ کی آڑ سے یہ ماجرا دیکھ لیا وہ کمرے میں آئی ”ع، خ“ سے کہا آؤ میں تمہارا کمرہ تمہیں دکھا دوں، اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور میرا دل دھڑکنے لگا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

”ع، خ“ کو اس کے کمرے میں بٹھا کر وہ میرے پاس آئی، اس کا منہ پھولا اور

چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔۔۔۔۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر اس نے کہا کیوں صاحب یہ نظروں کا ملاؤ اور چھاتی کا کٹاؤ کیسا تھا۔

میں نے کہا تمہارے جاتے ہی دروازہ کھٹ سے بولا میری نظر اٹھ گئی، اتنے

سہ پہر کے وقت جب کہ میں اس سطر کو تمام کر کے آگے بڑھنے والا تھا میری وفادار بیوی یخنی کا پیالہ ہاتھ میں لئے آئیں اور کہا جلدی سے کلی کر کے اسے پی لو اور لگے ہاتھوں وہ سنگھاڑے اور بتا سے بھی کھالو، جو میں نے تمہارے واسطے منگائے ہیں اور کھاپی کر تھوڑی دیر کے واسطے آرام کر لو، صبح چار بجے سے لگاتار لکھ رہے ہو اب تین بجے کا عمل ہے بس لکھنا بند کر دو۔

میں نے دل میں سوچا اگر ان کو یہ پتہ چل جائے کہ میں اپنے حالات عشق لکھ رہا ہوں تو پیالہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور مجھ پر برس پڑیں کہ آج بھی میرے دل میں جوانی کی یادیں مچلتی رہتی ہیں۔

پھر میں نے سوچا کہ ہر چند میں ان کی سرکار جمال کا نمک حرام ہوں، پھر بھی ان کی محبت میں کمی نہیں آئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی میرے دل میں آیا کہ جو زریں پروں کی چڑیاں، میری جوانی کے موتی چکنے کے لئے مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں میری جوانی کے ختم ہوتے ہی وہ بھرا مار کر اڑ چکی ہیں اور ہزاروں دلی شکنیوں کے با وصف میری بیوی آج تک میری محبت کا دم بھر رہی ہیں۔

اللہ کرے میری محراب پیری کی یہ شمع تاباں کم سے کم اس وقت تک روشن رہے جب تک کہ میرا چراغ حیات گل نہ ہو جائے۔

عشق و محبت میں یہ بنیادی فرق ہے کہ عشق کا نشہ، جوانی کے بعد اتر جاتا ہے اور محبت کا نشہ، جوانی کے بعد اور بھی چڑھ جاتا اور ہر آن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

میں تمہاری سہیلی کو کھانسی آگئی، فطرط کرب سے اس نے اپنے سینے پر گھونسا مار لیا، یہ دونوں عمل فطری تھے، اس میں بدگمانی کی کیا بات۔

اس نے بگڑ کر کہا میں ان باتوں میں نہیں آنے کی کان کھول کر سن لیجئے صاحب میں آپ کو اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دوں گی اب مجھے آپ اور اس پر سختی کرنا پڑے گی، میں نے کہا تم شوق سے سختی کرو سر تسلیم خم ہے لیکن وہ سختی ایک بدگمان دل کی بے جا سختی ہوگی۔

اتنے میں ایک نو عمر بے حد گھبرایا ہوا آیا اس نے ”ج، ب“ سے کہا خالہ جان سلام میری ماں پر دل کا دورہ پڑ گیا ہے، جلدی میرے ساتھ چلے ”ج، ب“ بدحواس ہو گئی، مجھ سے کہا میری بڑی بہن کے دل پر دورہ پڑا ہے میں ان کی تیمارداری کے واسطے جا رہی ہوں الہ خیر کرے میں رات گئے آ جاؤں گی لیکن نہ آؤں تو آپ پریشان نہ ہو جائیں گے۔ یہ کہتے ہی وہ دیوانہ وار اٹھی اور تیزی کے ساتھ زینہ طے کر کے مکان سے چلی گئی اور میں زینے کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ دے پاؤں ”ع، خ“ آ گئی پوچھا باجی کہاں گئی ہیں؟ میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا اور اس کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھیں میری طرف اٹھائیں اور کہا میں یہاں ناحق آئی باجی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے پردہ شروع کر دوں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میں نے اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا تم ان کی سختی کی پروا نہ کرو، وہ میرے دل پر حکومت نہیں کر سکتیں ان کی مجال نہیں کہ تمہاری محبت کو میرے دل سے نکال دیں اس نے پوچھا آپ میرے ہیں؟ میں نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا تمہارا نہیں تو اور کس کا ہو سکتا ہوں اس کے لبوں پر تبسم آ گیا اور میں نے اس کو آغوش میں لے لیا۔۔۔۔

صبح ہوتے ہی ”ج۔ ب“ آ گئی اس کے چہرے پر شب بیداری کے آثار تھے میں نے پوچھا خیریت تو ہے اس نے کہا خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری بہن کی جان بچ گئی لیکن یہ تمہارا چہرہ کیسا ہو رہا ہے کیا رات بھر جاگتے رہے ہو میں نے کہا تمہاری مفارقت نے سونے نہیں دیا۔ جھپکیاں لے لے کر رات گزاری ہے، اور پھر اس خیال

سے بھی پریشان رہا کہ تمہاری بہن پر دل کا دورہ پڑا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے اس نے پوچھا ”ع، خ“ تو اس طرف نہیں آئی تھی میں نے کہا تمہارے جاتے ہی میں نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا کوئی نوبے تمہارا ملازم کھانا لے کر آیا بس اتنی دیر کے لئے دروازہ کھولا کھانا کھایا نہیں گیا، تمہاری جدائی میں درو دیوار سے رونے کی صدائیں آ رہی تھیں دو چار لٹے سیدھے لقمے نکل کر نوکر کو رخصت کر دی اور بستر پر لیٹ کر کروٹیں لینے لگا۔ اللہ نے صبح ہوتے ہی تمہاری چاندی صورت دکھائی تو جان میں جان آئی۔

میری اس مکمل ایکٹنگ کا اس پر بڑا اثر پڑا مجھے بڑھ کر سینے سے لگالیا، اور کہا آؤ، ہم دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں دو گھڑی پڑ کر سو جائیں۔  
ہم دونوں کوئی دس بجے سو کر اٹھے نہائے دھوئے ناشتہ کیا اور نوکر سے کہا ”ع، خ“ کے کمرے میں ناشتہ پہنچا آؤ۔

ان مراحل کے بعد اس نے کہا آج سرشام سمندر کے ساحل پر چلیں گے، اور شام ہوتے ہی جب ہم روانہ ہونے لگے ”ع، خ“ کا لابرقع اوڑھے آئی اور کہا باجی ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے باجی یہ سن کر چند سیکنڈ کے واسطے خاموش ہو گئیں اور پھر کہا اچھا تم بھی چلی چلو۔

”ج، ب“ نے مجھ کو موٹر کے دروازے کے پاس بٹھایا بیچ میں خود بیٹھی اور ”ع، خ“ کو اپنے پہلو میں بٹھا دیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی، ساحل کی طرف۔

”ع، خ“ نے ”ج، ب“ کی آنکھ بچا کر اور اپنے ہاتھ کو اس کے پیچھے دراز کر کے میرے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا جس کو میں نے جلدی سے شيروانی کی جیب میں رکھ لیا۔

”ج، ب“ سنک گئی اس نے موٹر کوادی مجھ سے کہا فٹ پاتھ پر آئیے، اور وہاں پہنچ کر اس نے کہا۔۔۔۔۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ مرد، مرغیوں کی طرح کئی کئی مرغیوں پر حکومت کریں آپ صاف صاف بتادیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں



یا ”ع، خ“ سے میں نے کہا اللہ ری بدگمانی، پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس نے قلم اور کاغذ دے کر مجھ سے کہا یہ بات اس کاغذ پر لکھ دیجئے میں نے بادل ناخواستہ وہ بات لکھ دی اس نے کہا یہ پرچہ اپنے ہاتھ سے ”ع، خ“ کو دے دیجئے میرا ہاتھ کانپنے لگا اس نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر ”ع، خ“ کے ہاتھ میں دے دیا اس نے پرچہ پڑھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

اب ہم ساحل پر آگئے لہریں بجلی کی روشنی میں جگمگ جگمگ چمک رہی تھیں مون سون کا زمانہ تھا سمندر اچھل اچھل کر ہونک رہا تھا اور اس کے سیاہ بخارات لچھوں کی صورت میں پرواز کر رہے تھے۔

”ع، خ“ عین سمندر کے کنارے جا کر کھڑی ہو گئی اس کے اس طرح ہٹ کر کھڑا ہو جانے سے میرے دل پر بڑی چوٹ لگی مگر منہ سے اف تک نہیں کی۔

اتنے میں پاور ہاؤس کی کسی خرابی کی بناء پر روشنیاں گل ہو گئیں ”ج، ب“ نے مجھ سے کہا منظر بھیا نک ہو چکا ہے آئیے گھر چلیں یہ کہتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر میڑھیاں طے کرنا شروع کر دیں میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا، ”ع، خ“ کہیں نظر نہیں آئی میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دیوانہ وار اس کا نام لے لے کر اسے پکارنے لگا اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اتنے میں بجلی چمکی اور مجھ بد بخت نے یہ دیکھا کہ وہ سمندر کی بھری موجوں میں ہچکولے کھا رہی ہے۔

ہر چند مجھے تیرنا نہیں آتا اور گہرے ٹب میں بھی ڈوب سکتا ہوں لیکن میں نے پروا نہیں کی اور چھم سے سمندر میں کود پڑا۔

سمندر کی موجیں ساحل کی طرف آ آ کر اسے میری طرف دھکیل رہی تھیں میرا ایک ہاتھ ساحل کے چبوترے پر ٹکا ہوا اور دوسرا ہاتھ اسے پکڑ لینے کے واسطے بڑھا ہوا تھا کہ اتنے میں کسی اللہ کے بندے نے مجھ سے کہا یہ چھتری لیجئے اور اس کی موٹھ اس کے برقعے میں پھنسا کر اسے کھینچ لیجئے۔

اتنے میں سمندر کی موجیں زیادہ تیزی کے ساتھ میری طرف آنے لگیں، میں نے حواس درست رکھتے ہوئے چھتری کے ہینڈل کو اس کے برقعے میں پھنسا کر اسے کھینچنا شروع کر دیا اور دل میں ارادہ کر لیا کہ اگر اسے اوپر نہ لاسکا تو چبوترے پر سے ہاتھ ہٹا کر خود کو سمندر کے حوالے کر دوں گا لیکن قسمت نے میری مدد کی میں نے اس کے برقعے سے الجھے ہینڈل کو زور سے کھینچنا شروع کر دیا اور جب وہ قریب آگئی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور ساحل کی سیڑھیوں کی طرف اسے کھینچنے لگا اس نے چیخ مار کر کہا مجھ کو اب زندگی کی طرف واپس نہ لے جاؤ، یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئی اور میں اس کو کھینچ کر ساحل کی طرف لے آیا اور چبوترے پر لٹا دیا ہزاروں تماشاخیوں نے مجھ کو حلقے میں لے لیا ”ج، ب“ نے کہا اب کیا کرو گے میں نے کہا ہسپتال لے جاؤں گا۔

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوڑ کر ٹیکسی لے آیا لوگوں نے میری مدد کی اور پھر اسے ٹیکسی میں ڈال کر ایک یورپین ہسپتال میں لے گیا۔۔۔۔ اور ایک ادھیڑ انگریز نرس کی سرکردگی میں تین چار ہندوستانی نرسیں اس کی تیمارداری میں سرگرم ہو گئیں۔

”ج، ب“ اس کی پٹی کے پاس کھڑی ہو گئی اور میں پاگلوں کی طرح برآمدے میں ٹہلنے لگا اور ہسپتال کا عملہ مجھ کو غور سے دیکھنے لگا۔۔۔ ایک جوان یورپین نرس نے مجھ سے کہا آپ گھبرا ئیں نہیں وہ جلد ہوش میں آجائے گی۔ آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیں کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ کو چکر پہ چکر آنا شروع ہو گئے، وہ جوان نرس دوڑی ہوئی کمرے میں گئی اور دوا کا ایک گلاس دے کر کہا اسے فوراً پی لیجئے میں نے دوا پی لی سر کا چکر، تھوڑی دیر میں کم ہو گیا۔

کوئی سوا گھنٹے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو اس کی نحیف آواز سنائی دی ”جوش، جوش، جوش“

میں دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑا اور اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں کے کونوں سے آنسو ابلنے لگے۔

ادھیڑ نرس نے اشارے سے کہا کہ میں اس کے ساتھ برآمدے میں چلا چلوں۔  
برآمدے میں پہنچ کر اس نے انگریزی میں پوچھا آپ کا نام میں نے بتایا جوش اس  
نے کہا یہ جوان عورت جو کمرے میں کھڑی ہوئی ہیں یہ اس مریضہ کی کون ہیں میں نے  
کہا بڑی پرانی سہیلی اس نے پوچھا آپ مریضہ کے قرابت دار ہیں؟ میں نے کہا نہیں  
پھر اس نے سوال کیا کہ آپ مریضہ کو کب سے جانتے ہیں؟ میں نے کہا دو تین مہینے  
سے میں تو اس کمرے میں کھڑی ہوئی خاتون کا ملنے والا ہوں۔

پھر اس نے سوال کیا کہ اس پر نای سہیلی پر تو کوئی اثر نہیں تھا، آپ تو مریضہ کو فقط دو  
ماہ سے جانتے ہیں، آپ اس قدر بے تاب کیوں تھے؟ میں نے جواب دیا کہ میں  
شاعر ہوں شاعروں کے دل نرم ہوا کرتے ہیں پھر اس نے دریافت کیا کہ مریضہ نے  
ہوش میں آتے ہی اپنی پرانی سہیلی کے بدلے آپ ایک نئے آدمی کو کیوں پکارا؟ میں  
نے جواب دیا اس عظیم سانحے کے باعث اس کے حواس میں پراگندگی آگئی ہے۔

نرس نے میرے چہرے کو بغور دیکھا اندر چلی گئی اور فون کرنے لگی میرا ماتھا ٹھنک  
گیا ہونہ ہو یہ پولیس کو بلا رہی ہے اور اس کو یہ شبہ ہو گیا کہ یہ عاشقانہ خودکشی کا واقعہ  
ہے۔

اس وقت مجھ وہ پرچہ یاد آ گیا جو ”ع، خ“ نے مجھے موٹر میں دیا تھا اس لئے اسے  
دیکھنے کے لئے میں غسل خانے چلا گیا پرچہ نکالا وہ بھیگ کر خراب ہو چکا تھا صرف پہلی  
سطر پڑھ سکا جس میں اس نے یہ لکھا تھا کہ میری زندگی باجی اور آپ کی بیوی کے  
واسطے ایک عذاب بن چکی ہے، اس لئے۔۔۔۔۔ اس کے آگے پڑھا نہیں گیا، میں  
نے پرچہ پھاڑ کر نالی میں بہا دیا اور سیدھا ”ع، خ“ کے پاس جا کر کان میں کہا پولیس  
اگر بیان لینے آئے تو میرے سر کی قسم تم یہ کہنا کہ میرا پاؤں پھسل گیا تھا اس کے علاوہ  
اور کچھ نہ کہنا۔

اتنے میں پولیس آگئی اور ایک سارجنٹ نے اس سے پوچھا آپ سمندر میں کیسے





حسن اتفاق سے وہ نوجوان لیڈی ڈاکٹر جس نے مجھے برآمدے کی کرسی پر بٹھا کر دوپلائی تھی برآمدے سے گزر کر جب کسی کمرے کی طرف مڑنے لگی مجھ پر اس کی نظر پڑ گئی اس نے ادھر ادھر دیکھا اور دبے پاؤں میرے پاس آ کر پوچھا کیا آپ تمام رات اس لان پر گزار دیں گے میں نے کہا جی ہاں اس نے کہا آپ کو بڑی تکلیف ہو گی میں نے جواب دیا کہ میں جھیل لوں گا اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا آپ میرے کمرے میں چل کر آرام کریں۔۔۔۔ میں ساتھ ہو لیا۔۔۔۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر، اس نے جلدی جلدی کھڑکیوں کے تمام پردے گرا دیے دروازہ بند کر لیا بڑی مہربانی کے ساتھ مجھے صوفے پر بٹھایا الماری کھولی برانڈی اور بیئر کی بوتل نکالی سامنے کی میز سے دو گلاس اور سوڈے کی بوتلیں اٹھا لائی برانڈی میرے سامنے رکھ دی اور خود بیئر پینے لگی۔

جب ہم دونوں پی چکے وہ تلے انڈے اور توست لے آئی، اور ایک گدے لگی بید کی بنچ پر تکیے لگا کر مجھے لٹا دیا کمرے کی لائٹ گل کر دی غسل خانے کا دھیمابلب جلا دیا، اور مسہری پر جا کر لیٹ گئی۔

میں نے لاکھ لاکھ چاہا کہ سو جاؤں، مگر نیند نہیں آئی، کروٹوں پر کروٹیں بدلنے لگا، اور دیکھا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر بھی کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی ہے۔

ابھی میں اسی کرب کے عالم میں تھا کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی مسہری سے اٹھی آہستہ آہستہ میری طرف آئی اور جھک کر میرا منہ دیکھنے لگی اور جب میں نے اس کی طرف آنکھیں اٹھائیں اس نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا کیا نیند نہیں آرہی ہے؟ میں نے بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا بالکل نہیں اس نے میری کلائی پکڑ کر کہا چلئے میرے بستر پر وہاں نیند آجائے گی میں اٹھا اور اس کی مسہری پر جا کر لیٹ گیا اور اس نے اپنا ہاتھ تکیے کے طور پر میرے سر کے نیچے رکھ دیا اور میری نیند اور بھی اچٹ گئی۔

صبح جاگتے ہی ہم دونوں نے تبسم کا تبادلہ کیا تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا بل بتا

دیتے تھے تاکہ میں اپنی قیام گاہ پر جا کر روپیہ لے آؤں۔۔۔۔۔ اس نے آنکھیں جھکا کر کہا، بل میں ادا کر دوں گی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ میرے پاس آتے جاتے رہیں گے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا وہ مجھ سے بغل گیر ہو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور ہفتے کی شام کو ملنے کا وعدہ کر کے میں ہسپتال سے باہر آ گیا اور گیٹ پر کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ بل تو خیر وہ ادا کر دے گی لیکن نرسوں وغیرہ کو انعام کہاں سے دوں گا اور ”ع، خ“ کو ٹیکسی پر لے جاؤں گا تو کیا ”ج، ب“ سے کرایہ دلاؤں گا اور فرض کیجئے کہ یہ بھی ہو گیا تو میں اس عالم افلاس میں یہاں رہوں گا کیوں کر؟ پھر خیال آیا کہ تار دے کر گھر سے روپیہ منگا لوں، لیکن سوال یہ ہے کہ تار کیسے دوں؟

میرا سر چکرانے لگا اور کبیر کا یہ دوہا یاد آ گیا ”اک دن آن پھنسو گے پیارے جیسے بن کر ہرنا“

اس ادھیڑ بن میں جب گھنٹہ سوا گھنٹہ گزر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ریاست دتیا کے دیوان، قاضی سر عزیز الدین صاحب موٹر سے گزر رہے ہیں جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں قاضی صاحب نے موٹر رکوالی، دوڑ کر میرے گلے مل گئے اور کہا ارے یہ دولت غیر مترقبہ اور مدد اس میں آپ کب آئے اور یہاں اس طرح اداس کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟

میں نے کہا اللہ کالا کھلا کھلا شکر کہ اس نے آپ کو اس وقت میرے پاس بھیج دیا اگر آپ کے سے بے تکلف دوست کے بدلے کوئی اور آتا، تو میں اس سے اپنا عالم کیوں کر بیان کر سکتا تھا۔

قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا جلدی کہنے بات کیا ہے میں نے کہا جیب کٹ گئی ہے اور پورے تین ہزار غائب ہو چکے ہیں قاضی صاحب نے کہا کوئی اپنی پوری پونجی بٹوے میں رکھ کر باہر نکلتا ہے آئے میرے ساتھ وہ مجھے اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور

پانچ ہزار کے نوٹ، ایک پرس میں بھر کر میرے حوالے کر دیئے میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا میں گھر جا کر یہ رقم واپس کر دوں گا انہوں نے میرا گریبان پکڑ کر کہا مجھ سے اور اس قدر غیریت کی باتیں اب ناشتہ کر کے جائیے گا اور کل رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھائیے گا۔

میں غسل اور ناشتہ کر کے جانے لگا، انہوں نے کہا آپ میری گاڑی پر جائیں تاکہ میرا شو فر آپ کا گھر دیکھ لے اور کل آپ کو یہاں لے کر آجائے۔

میں ان کی موٹر پر ہسپتال پہنچا ”ع، خ“ کو بحال پایا، دل کی کلیاں کھل گئیں اس نے پوچھا باجی ساتھ نہیں آئیں میں نے کہا وہ تو رات ہی کو چلی گئی تھیں اس نے پوچھا آپ کہاں رہے ہیں میں نے کہا اسی ہسپتال میں اس کی آنکھوں میں کامیابی اور تشکر کے آنسو آ گئے۔

جب اسے لے کر ”ج، ب“ کے وہاں پہنچا تو اس نے چھوٹے ہی کہا اگر تم ڈوب جاتیں تو ہم لوگ پولیس میں کھنچے کھنچے پھرتے میں نے سوچا اللہ اکبر، رقابت بھی بڑی بد بلا ہوتی ہے اس نے یہ نہیں کہا کہ اگر تم خدا نخواستہ ڈوب جاتیں تو میرا دل شق ہو جاتا یعنی اس کے نہ ڈوبنے کی اس کو صرف اس لئے خوشی ہوئی کہ وہ پولیس میں کھنچے کھنچے پھرنے کے عذاب سے بچ گئی۔

اللہ رقابت کی ڈاہ سے بچائے

وہ دونوں سہیلیاں ابھی تک خدا کے فضل و کرم سے بقید حیات ہیں ایک کلمتہ میں رہتی ہے ایک مدراس میں

میں جب ہندوستان جاتا ہوں تو فرض کر کے ان دونوں سے ملتا ہوں اور جب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری ہر نظر سینکڑوں افسانے کہنے لگتی ہے تمام مناظر اور تمام واقعات ہمارے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں اور ہمارے مابین کے تمام رنگین مکالمے، گوہرے لگتے ہیں ہمارے کانوں میں۔





☆☆☆☆

پہلے تو ہوا غروب میرا چہرہ  
پھر، یار قمر جہیں کا اترا چہرہ  
شاید مرے چہرے کو منانے کے لئے  
اس شوخ نے بھیجا ہے خود اپنا چہرہ

☆☆☆☆☆☆

اک گونج سی تن بدن میں لہراتی ہے  
اک تان سی زندگی پہ بل کھاتی ہے  
پازیب اتارے انہیں جگ بیت چکا  
جھنکار ہے لیکن کہ نہیں جاتی ہے

☆☆☆☆☆☆

---

بے کسی کے عالم میں فریقین کی خوگر جالی آنکھیں جب ایک دوسرے کا اتر اہوا  
منہ دیکھتی ہیں، تو وہ لمحہ اس قدر جاں کا ہوتا ہے کہ صرف زمین و آسمان ہی نہیں خود سنگ  
دل موت کراہنے پر مجبور ہو جاتی ہے جوانی کے تلخ و شیریں عشق پر تو ہزاروں دیوان  
موجود ہیں لیکن وقت گزیدہ عشق و حسن پر غالباً اب تک کسی شاعر نے قلم نہیں اٹھایا ہے  
شاید میں پہل کر رہا ہوں لیکن اس شرمندگی کے ساتھ کہ میرے دل پر جو بیت چکی اور  
بیت رہی ہے اس کا کردار حصہ بھی سپرد قلم نہیں کر سکا ہوں۔

---

انجام کے آغاز کو دیکھا میں نے  
ماضی کے ہر انداز کو دیکھا میں نے  
کل نام ترا لیا، جو بوئے گل نے  
تا دیر اس آواز کو دیکھا میں نے

☆☆☆☆

بے مانگی نیاز و افلاس گداز  
ناداری عشوہ و تہی دہی ناز  
کوتاہ نگاہوں کو بتاؤں کیوں کر  
کیا حادثہ عظیم ہے عمر دراز

☆☆☆☆☆☆

آنسو آنکھوں میں کس لئے ہیں، اے جان  
جھوٹا ہے یہ آنینہ مری بات کو مان  
میری آنکھوں میں دیکھ اپنا مکھڑا  
تو کیوں ہے اداس اداس تیرے قربان

☆☆☆☆☆☆

پانی کی جھڑی، ملہار گاتی تھی کبھی  
بدلی ہر آن گھر گھڑاتی تھی کبھی  
میری نگری سے اے گزرنے والے  
برکھا اس دیس میں بھی آتی تھی کبھی

☆☆☆☆☆☆

چہرے ہیں اداس اداس گم سم طرفین  
اچھا ہے کہ اندھی ہی رہے پیت کی رین  
لہجوں ہی سے دیکھیں گے ہم اک دوسرے کو  
آئے نہ چراغ اب ہمارے مابین

☆☆☆☆

کاش، اہل چمن، یہ باغ باں کو سمجھائیں  
جھونکوں کو یہ حکم دے کر کہ دھوئیں نہ مچائیں

تا۔۔۔۔۔ صبح کو غنچوں کے چٹکنے کی صدا  
مرجھائے ہوئے پھول نہ سننے پائیں

☆☆☆☆☆☆

تیری زلفوں میں ہے کہانی میری  
تیری پلکوں میں پر فشانہ میری  
یہ جو تری آنکھوں میں ہیں غلطاں ڈورے  
گزری تھی یہیں سے کل جوانی میری

☆☆☆☆☆☆☆☆

All rights reserved.

©2002-2006

## اضافہ شدہ حصہ

”یادوں کی برات“ کی طباعت سے لے کر اب تک میری زندگی کس نہج سے گزری میرا کاروان حیات کن کن، شعلہ چکاں و شب نم فشاں وادیوں کی جانب مڑا اور میرا وقت کن کن سرد و گرم ہواؤں میں اڑا۔۔۔۔۔ یہ داستان بھی سن لیجئے۔

داستان گو، خاموش ہو جائے گا۔۔۔۔۔ داستان بولتی رہے گی سو، بندہ پرور یادوں کی برات کی اشاعت کے بعد بھی ایوب خاں اور ان کے سیاہ پروردہ الطاف گوہر کے مظالم کا سلسلہ قائم رہا۔۔۔۔۔ اور ایسی بلائیں نازل رہیں کہ سانس لینا دشوار ہو گیا اور ہر ذرہ پکار پکار کر کہنے لگا اور آپا کستان اے مردود چکھ لیا مزا پا کستان آنے کا؟ اور اے گھامڑ، دیکھ لی چارہ سازی و ادب نوازی، ان مسلمانوں کی؟

ارے میں، اس ملک کے ناقدروں کا رونا کیا روؤں۔۔۔۔۔ خود میرا آبائی وطن بھی کون سا شریف ملک ہے وہ تو ایک اصطلبل ہے، جہاں صدیوں سے لیتاؤ ہو رہا اور جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔۔۔۔۔ اور خصوصیت کے ساتھ دہلی و لکھنؤ کے ارباب ادب تو اس قدر بے ادب خود سراسر اور اس بنا پر اس قدر تنگ دل تنگ نظر، تنگ ظرف اور پورس کے ہاتھیوں کے مانند ہیں کہ ہمیشہ اپنوں ہی کو روندتے رہتے ہیں اور ان کو اس بات کا خوف ہے کہ اگر ہم کسی کو بڑھائیں گے تو خود گھٹ جائیں گے۔

اس وجہ سے یہ ماننا پڑے گا کہ ارباب پاکستان اہل ہندوستان کے مقابلے میں اس قدر تو ضرور شریف ہیں کہ اپنوں کی برائی کبھی نہیں کرتے (یہ اور بات ہے اپنے صوبوں کی لومڑیوں تک کو شیر اور دوسرے صوبوں کے شیروں کو بھی لومڑیاں ثابت کیا کرتے ہیں) بہر حال وہ اپنوں کو سر پر چڑھاتے، ان کے حوصلے بڑھاتے، ہاتھیوں پر بٹھا کر ان کے جلوس نکالتے، اور نقیبوں کی طرح یہ نعرے لگاتے ہیں کہ ہوشیارو



خبردار نگاہ رو برو آرہی ہے سواری سلطان اشعراء اور شہنشاہِ قمر طاس و قلم کی۔  
 فرنگیوں کے خطاب یافتہ خادمِ حفیظ جالندھری نے کس قدر سچی بات کہی ہے کہ  
 بڑے زوروں سے منوا گیا ہوں  
 یہ ہے شرافتِ پنجاب کی کہ اپنے بوفوں کو ”بڑے زوروں“ سے منوا کر باون گز کر  
 بنا دیتا ہے۔

میرے آبائی ملک اور خصوصاً میرے صوبے کا اس کے برعکس یہ عالم ہے کہ وہ  
 اپنے ادیبوں اور شاعروں کو گدھوں پر بٹھاتا، ان کا منہ کالا کرتا، انہیں گلی گلی پھراتا، اور  
 ان کو لولو بنا کر، ان کے پیچھے تالیاں بجاتا رہتا ہے، ذرا غور تو فرمائیے کہ بیس برس ہو  
 چکے ہیں مجھے ہندوستان چھوڑے مگر اہل ہند کے دلوں میں اب تک میرے خلاف وہ  
 آگ بھری ہوئی ہے کہ ابھی کچھ دن ہوئے کہ امرت سر کے ٹی وی اسٹیشن میں سوتیلیوں  
 نے ایک رت جگا منایا تھا جس میں ناچنے اور ڈھولک بجانے کے واسطے میرے مرحوم  
 دوست حضرت سیماب اکبر آبادی کے برخود غلط محبوب، اور ایک نامعروف عورت، اور  
 ایک بے اجازت پرانی کتابوں کو چھاپنے والے مجرم کو بھی تال دینے کی غرض سے مدعو  
 کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ ان چھوڑوں نے بھی بھر کر میرے خلاف گیت گائے تھے۔

من، از بیگا نگاں ہر گز تنالم  
 کہ بامن، ہر چہ کرد، آشنا کرد  
 جب اپنے ہی صوبے کے لوگ اس قدر سفیہ، اور اس غضب کے گھٹیا ہیں تو میں  
 یہاں کے ایک دو کوڑی کے چیتھرے اخبار ”نوائے وقت“ کی شکایت کیا کروں  
 دوستوں سے ہم نے وہ صدمے اٹھائے جان پر  
 دل سے، دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا  
 گواہ رہنا، اے روح کائنات کہ میں ان لفنگوں، ان نفروں، ان بھانڈ بھگتیوں  
 اور ان چپڑ قاتلیوں کے زرخے میں زندہ رہنے کا عذاب جھیل رہا ہوں۔

شاہد رہو، تو اے شب غم  
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی نے

ہائے کس سے فریاد کروں جا کر کہ

جوش ان سو قیوں کے حلقے میں  
زندہ رہنے سے شرم آتی ہیں

ہاں تو میں رونا رو رہا تھا ایوب کے دور عیوب کا اور خرف باری الطاف گوہر کا۔

اس دور عذاب میں جب سورج ڈوبنے لگتا، اور درختوں کے سائے دراز ہو جاتے تھے تو جاگ اٹھتی تھی یا ران ہند کی یاد۔۔۔۔۔ اور میں دل کو تھام کر چیخا کرتا تھا کہ ارے تاریکیو اے دشمنوں کی پرچھائیاں دکھانے والی تاریکیو، ارے کہاں ہے میرا عرشِ ملسیانی، کہاں ہے میرا جگن ناتھ آزاد، کہاں ہے تلوک چند محروم، کہاں ہے میرا پنڈت ہاکسر، کہاں ہے میرا فرقو (فراق گورکھپوری) کہاں ہے میرا آنند نرائن ملا کہاں ہے میرا اختر علی تلہری کہاں ہے میرا علی عباس حسینی، کہاں ہے میرا فرنگی محلی رضا، کہاں ہے میرا حکیم شمس الدین، کہاں ہے میرا بسل سعیدی، کہاں ہے میرا گوپی ناتھ امن، کہاں ہے میرا شیشور پرشاد منور، کہاں ہے میرا پریم نرائن، کہاں ہے میرا رفیع احمد قدوائی، کہاں ہے میرا گل زاد، کہاں ہے میرا عبدالسلام، کہاں ہے میرا سمیع اللہ، کہاں ہے میرا دیوان سنگھ مفتون، کہاں ہے میرا جواہر لال نہرو، کہاں ہے میرا شنکر پرشاد، کہاں ہے میرا ودیا شنکر، کہاں ہے میرا ابوالکلام آزاد، کہاں ہے میرا جمل خاں، کہاں ہے میرا کنور مہندر سنگھ بیدی، کہاں ہے میری سروجی نانڈواور کہاں ہے میرا فلسفی سری کرشن سکسینہ؟

دنیا میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی  
اللہ رے سنا، آواز نہیں آتی

میری دل کی بات اگر پوچھیں تو میں یہ بھی بتا دوں کہ ان تمام احباب کے ساتھ

ساتھ سفر وادساغریما بھی اکثراً داتا رہتا ہے حالانکہ ساغر کا یاد آنا، انسانی حافظے کی توہین ہے اور بشری ذہن کی فحاشی

میں ابھی تڑپ ہی رہا تھا کہ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ مخالفت عامہ نے ایوب خاں کی حکومت کا جنازہ نکال دیا اور الطاف گوہر کے اقتدار کے جھوٹے موتیوں کو بھی چور چور کر ڈالا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دید؟ کہ خون، ناحق پروانہ۔۔۔۔۔ شمع را  
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

ایوب خاں کے غروب ہوتے ہی نام خدا کیجی خاں طلوع ہو گئے ایک خان گیا اور دوسرا خان مسلط ہو گیا کیجی خان کے برسرار اقتدار آتے ہی یہاں کے بے ضمیر اخباروں نے ان کے ڈنکے پیٹنا شروع کر دیئے، اور چڑھتے سورج کے خوشامد خور سے پجاری، جوق در جوق دوڑ پڑے ان کی طرف اور خدا کے فضل و کرم سے مارشل لا، علامۃ الناس کو مار مار کر پھرشل کرنے لگا مارشل لا قائم ہوتے ہی تمام کرنیلوں جرنیلوں نے مونچھیں کھڑی کر لیں، غرور کے تاج پیشانیوں پر کج فرمالیے جس سے ناخوش ہو گئے اس کو جیل میں ٹھنسوا دیا، جس نے جھک کر سلام نہیں کیا اس کو الٹا لٹکوا دیا کوڑوں سے اس کی کھال کھینچ لی جس شریف کی بہو بیٹی پسند آ گئی اسے پکڑ بلایا اور لہو لہان کر دیا اور پولیس کا محکمہ قطعی مفلوج ہو کر رہ گیا۔۔۔ اور پاکستان کے معرض وجود میں لانے کی علت سمجھ میں آ گئی جہاں تک کہ میری ذات کا تعلق ہے، میں بے حد شکر گزار ہوں کیجی خاں کا کہ انہوں نے میرا ضبط شدہ پاسپورٹ واپس کر دیا، میرے لڑکے کی چھنی ہوئی سیمنٹ ایجنسی کو بحال کر دیا اور مجھ سے وعدہ کر لیا کہ میراقرر دوبارہ کر دیا جائے

گا۔

لیکن، جہاں تک کہ مفاد عامہ کا تعلق ہے ان کا دور نہایت منحوس ثابت ہوا وہ بادر  
عنبر چکاں اور انفاس گل رخاں میں اس قدر ڈوب گئے کہ پاکستان کا بیڑا غرق ہو کر رہ  
گیا اور بنگال ہاتھ سے نکل گیا اگر میری یہ بات سن کر کوئی صاحب یہ ارشاد فرمائیں کہ  
جوش صاحب قبلہ، آپ کس منہ سے یچی خاں پر اعتراض فرما رہے ہیں جب کہ آپ  
خود بادہ غیر چکاں و انفاس گل رخاں کے ہمیشہ سے رسیا ہے اور نام خدا آج کے دن  
تک ہیں

توبہ فرمایاں، چرا خود توبہ کم تری کنند؟  
تو میں ان کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ حضرت بادہ خواری اور حسن پرستاری  
کا حق پہنچتا ہے صرف ان خاصان خدا کو، جو اقطاب حکمت و اولیائے ادب ہیں اور جو  
عالم ہر شادی میں یہ نعرہ لگا سکتے ہیں کہ:

گدائے مے کدہ ام لیک وقت مستی ہیں  
کہ ناز، بر فلک و حکم، برستارہ سختم  
لیکن یہ چیز عوام کے لئے حرام اور مطلق حرام ہے، اور فقط حلالیوں کے واسطے  
حلال ہے

من، در پیالہ عکس رخ یار، دیدہ ام  
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما  
اگر ہر ایرے غیرے، نتھو خیرے کے ہاتھ میں بلوریں جام، اور زلف مشک آشام  
دے دی جائے گی معاشرے کا نظم درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اور اگر خدا نخواستہ حکام  
اس کے خوگر ہو جائیں گے تو پورا ملک تباہی کے کھڈ میں گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارو  
ہاں تو سقوط بنگال، ایک ایسا کوہ شکن و مردانگن سانحہ تھا کہ ہر گھر میں صف ماتم بچھ



گئی اور ہر دل سے دھواں اٹھنے لگا۔

چنانچہ اس پاکستان گیر دو رشیون و ماتم میں لوگوں کو ڈھارس ہے اور ان کی ہمت بڑھانے کے واسطے میں نے مندرجہ ذیل نظم کہی تھی۔

کہاں تک آتش سوز جگر کی بات کریں  
اب آؤ، آب خم و جام زر کی بات کریں  
بھڑکتی آگ، کڑکتی کمان کی زد پر  
بہکتی چال، لچکتی کمر کی بات کریں  
محل کرب میں چھیڑیں رباب کیف و نشاط  
جمود برف میں رقص شرر کی بات کریں  
بھلائیں دغدغہ ظلمت و نہیب غروب  
فروغ شمس و طلوع سحر کی بات کریں  
ہوائے بستہ کج قفس کے حلقے میں  
فضا دریدگی بال و پر کی بات کریں  
بجائے شکوہ بے سود اختصار حیات  
حصول دوت عمر خضر کی بات کریں  
حدیث طینت خشت و خرف سے کیا حاصل  
سرشت لعل ز مزاج گہر کی بات کریں

### ایک عجیب آواز:

سقوط بنگال سے کوئی آٹھ دس برس پیشتر کی بات ہے کہ میں ہوائی جہاز سے  
ڈھاکے گیا تھا اور آسمان سے اتر کر جیسے ہی وہاں کی زمین پر قدم رکھا تھا تو وہاں کے  
ذرے ذرے سے آواز آرہی تھی ”توڑ دو، توڑ دو، ہماری زنجیر غلامی توڑ دو، اب ہم  
پاکستان کے ساتھ نہیں رہیں گے“ یہ صدائیں سن کر میں کانپ اٹھا تھا اور جب میں

نے ڈھا کے کے ایک دوست سے یہ بات کہی تھی کہ بنگال پاکستان سے قطع کرے گا تو ان کو یقین نہیں آیا تھا۔

ابھی زخم بھرنے بھی نہیں پایا کہ بنگال کا انکیشن کا ہنگامہ برپا ہو گیا اقتدار کے پجاری لنٹر لنگوٹ کس کس کر کو دپڑے اکھاڑوں میں ہر پارٹی اپنے اپنے علم اٹھائے نکل پڑی گھروں سے اور شور کرنے لگی شاہراہوں پر طبل ہائے مسابقت پر دمام ضربیں پڑنے لگیں اور فلک شگاف نعروں سے ہوا کے پر نچے اڑ گئے۔

اور خصوصیت کے ساتھ جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی کے مابین ہاؤں ہاؤں کی آوازوں کے ساتھ زبردست رسہ کشی کا آغاز ہو گیا جماعت اسلامی نے پیپلز پارٹی کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کر کے، ان کو جھنڈوں پر چڑھایا اور ”شوکت اسلامی“ کے نام سے ایک زبردست جلوس نکالنے کی خاطر، شہر بھر کے تمام بہروپیوں بلوائیوں، بھالوؤں، بھونگڑوں، بنارسی، ٹھگلوں، بازار یوں، بونوں، بھکاریوں، بوبکوں، بدھوؤں، بوکڑوں اور بھڑبھڑیوں کو یک جا کر کے ان سب کو اونٹوں، گھوڑوں، ٹھیلوں اور ٹرکوں پر لاد، اور ایک چیختا، چلاتا، ہونکتا، الالاتا، گونجتا، گرجتا اور کڑکتا جلوس نکالا کہ دھرتی ماتا کاٹنے لگی، آکاش تھرتھرا اٹھا اور موت کا فرشتہ، فضا پر جبر اکھولنے اور دانت نکالنے لگا۔ اور جب یہ اٹنگے پانچاموں، گھنے داڑھوں، قصاب چہروں اور قاتل تیوروں کا ہیبت ناک جلوس، نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، تو سڑکوں پر جس قدر بھی تماشائی تھے وہ اپنے اپنے جسموں کو ٹٹول ٹٹول کر اس امر کا اندازہ لگانے لگے کہ ہم ابھی تک بقید حیات ہیں کہ مر چکے ہیں۔

اس جلوس کے سردار، داڑھے پھٹکار پھٹکار کر یہ اعلان کر رہے تھے کہ اے مسلمانو، اگر ہم کو ووٹ دو گے تو اللہ اور اللہ کا رسول، دونوں، تم پر نعمتوں کے بادل برسا دیں گے اور تم سب کو فردا فردا حور، قصور، کھجور، انگور اور طہور کی لذتوں سے ہمکنار فرما دیں گے۔

اور اس طرف پیپلز پارٹی کا یہ بیان تھا کہ اگر تم ہم کو برسرِ اقتدار لے آؤ گے تو ہم تمہارے واسطے روٹی، کپڑے اور مکان کا بندوبست کر دیں گے۔

ادھر تھے حور، انگوڑ اور غلمان ادھر تھا روٹی، کپڑا اور مکان، گمان غالب یہ تھا کہ مسلمان چونکہ دنیا بے زار اور عقی پرستار ہے، اور صدیوں سے

ما، مقیمان کوئے دل داریم  
رو بدنیائے دوں، نہ می آریم  
کانعرہ لگا رہا ہے، اس لئے ٹوٹ پڑے گا ہر فرد، سوئے کوثر و تسنیم و غلمان، اور ٹھکرا  
دے گا روٹی، کپڑا اور مکان۔

لیکن ووٹوں کا جب شمار کیا گیا، تو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گئی کہ ایماں بدوش جماعت اسلامی کو شکست کے کھڈیں گرا دیا گیا ہے اور ”کافر“ پیپلز پارٹی کو منارہ فتح پر جگہ دی گئی ہے۔

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اب مسلمان، نرا جذباتی اور وہم پرست نہیں رہا ہے، اور اس کی کھوپڑی میں عقل کی روشنی پہنچ گئی ہے۔۔۔۔ اور وہ ”علمائے کرام“ کے چوہے دان سے باہر نکل آیا ہے۔

اگر ”حامل کفر“ پیپلز پارٹی ہار اور ”محمل ایمان“ جماعت اسلامی جیت جاتی، تو آپ جانتے ہیں کہ بے چارے پاکستان پر کیا آفت ٹوٹ پڑتی؟

حضور والا، یہاں کہ تمام بینک بند کر دیئے جاتے، درآمد و برآمد کا نظام درہم و برہم ہو کر رہ جاتا، تسخیر ارض و سماوات اور تحقیق اسرار کائنات کے حوصلوں پر زندگی قیامت کی مہر لگ جاتی۔۔۔۔ فلسفے، منطق اور سائنس کے مکتب ڈھا دیئے جاتے، اقوال اوہام اور اساطیر کی یونیورسٹیاں کھول دی جاتیں۔۔۔۔ عقل کی ناک، جڑ سے کاٹ کر پھینک دی جاتی اور جنون کے ماتھے پر تاج زر کج کر دیا جاتا۔۔۔۔۔ قرآن کے مردود لفظ عشق کی تاج پوشی کے جشن منائے جاتے، اور قرآن کے محبوب لفظ فکر کی

کھال کھینچ دی جاتی۔۔۔۔۔ کچھ واڑھیوں کے لم ڈگے محتسب، ہر شام کو گلیوں کے چکر لگاتے اور ارباب دانش کے منہ سونگھتے پھرتے۔

اٹنگے پانچامے پہنوائے جاتے، شانوں پر چوخانے کے رومال، ڈلوائے جاتے اور چہروں پر واڑھیاں اگوا دی جاتیں۔

جو بد بخت کسی حسین چہرے کی طرف، جان بوجھ کر، دوسری بار نگاہ اٹھاتا، درد ناک عذاب میں گھر جاتا۔ اور اگر کوئی اٹھڑ، ناز و ادا سے کمر لچکاتی، اس پر لعنت کی کمانیں کڑکنے لگتیں۔۔۔۔۔ اور شاعری، موسیقی، مصوری مجسمہ سازی اور رقص کو حرام ٹھہرا دیا جاتا۔

دانش وروں نے، خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے فضل و کرم نے پاکستان کو ان مصائب سے بچا لیا۔۔۔۔۔ اور پیپلز پارٹی کو کام راں بنا کر، بھٹو صاحب کے صاحب کے ہاتھ میں عنان اقتدار دے دی۔

لیکن اس مسرت انگیز تبدیلی کا میری ذات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ دور دور تک چاندنی چھٹک گئی لیکن میری انگنائی میں اندھیرا ہی رہا۔ اس بے اعتنائی کو دیکھ کر میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

عمر تاں، بادا دراز، اے ساقیان بزم جم  
ساغرماء، گونہ شد، پرے، بدوران شما  
اس زمانے کی بات ہے کہ میں ایک روز شام کے ہنگام، اپنے مکان کی بالائی منزل کے چھبے پر بیٹھا، شغل کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے نواسے کے پیچھے پیچھے ایک سرو قامت و صبح طلعت نوجوان عورت چلی آرہی ہے۔ برآمدے میں آتے ہی اس نے کہا، آداب عرض، اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے پہلو کی آرام کرسی پر لچک کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی جوش صاحب میرا نام ہے کنیر فاطمہ، میرے باپ انجینئر ہیں ریلوے میں آپ کا کلام تیرہ برس کی عمر سے پڑھ رہی ہوں، جس کی بہت سی نظمیں از



برہیں، اس کے ساتھ ساتھ آپ کی ”یادوں کی برات“ بھی امی سے چھپا کر پڑھ چکی ہوں، یہ سب میں نے اس نے بتا دیا کہ آپ مجھ کو پہچان لیں، میں تو پیدا یہیں کراچی میں ہوئی ہوں، لیکن باپ دادا کا وطن ہے لکھنؤ، ٹوریا گنج میں ہمارا مکان تھا (لکھنؤ (اے) وکٹوریا گنج کو ٹوریا گنج کہتے تھے، اس حسینہ کی زبان سے ٹوریا گنج سنا، لکھنؤ کی یاد دل پر تیر چلانے لگی) میں نے کہا تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تم پیدا تو یہیں ہوئی ہو، مگر حیرت ہے کہ تمہاری زبان اور تمہارا لہجہ خالص لکھنؤ کا ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا یہ امی اور ابا جان کی جوتیوں کی برکت ہے وہ بے حد محتاط ہیں زبان کے معاملے میں، کسی سے ذرا سی بھی غلطی ہو سختی کے ساتھ اس کو ٹوک دیتے ہیں اب آپ آپ پوچھیں میں آپ کے پاس کیوں آئی ہوں میں نے کہا بتاؤ اس نے کہا چھوٹا منہ بڑی بات میں حاضر ہوئی ہوں آپ کو ایک مشورہ دینے کو میں نے کہا بیان کرو اس نے کہا مجھ کو آپ کی پریشانیوں کا علم ہے اس ایوب نے آپ کے ساتھ کیا کیا اس سے بھی واقف ہوں میری ناچیز رائے یہ ہے کہ آپ مولانا کوثر صاحب نیازی سے مل لیں، میں نے بات کاٹ کر کہا، تمہارے رائے سر آنکھوں پر، لیکن میرا ان کا کیا جوڑ، وہ ملا ہیں، میں رند، میں تو سمجھتا ہوں وہ مجھے برداشت نہیں کر سکیں گے، اس نے جلدی سے میری بات کاٹ کر کہا ارے ایسا نہیں ہے جوش صاحب نیازی صاحب ملا نہیں، ادیب و شاعر ہیں وہ ضرور آپ کی قدر کریں گے بس مل لینے کی دیر ہے آپ کی ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی میں نے کہا اچھا۔۔۔۔۔ اس نے اپنے بدن کو جھٹکا دے کر کہا اللہ اس بے دلی سے اچھا نہ کہئے مجھ ناچیز کا یہ مشورہ ہے آپ کو حضرت عباس کی قسم ان سے ملیے اور ضرور ملیے میں نے کہا تم نے قسم دی ہے تو ملوں، اور ضرور ملوں گا، یہ سن کر وہ خوش ہو گئی، میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی زلفوں کی مہک میرے حوالے کر کے چلی گئی۔

اس کے تیسرے یا چوتھے دن، میں برآمدے میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، میں نے فون اٹھا کر ”ہلو“ کہا اس طرف سے آواز آئی آداب عرض کرتی ہوں

جوش صاحب، میں کنیر فاطمہ بول رہی ہوں، میں نے کہا ”کہو کنیر فاطمہ کیسا مزاج ہے“ اس نے شکریہ ادا کر کے کہا جوش صاحب مولانا کوثر آج کل کراچی آئے ہوئے ہیں، ان کا قیام ہے ”قصر ناز“ میں اللہ، آپ ان سے آج ہی مل لیں، میں نے کہا تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے بتا دیا، میں ابھی فون کر کے، وقت مقرر کر لوں گا، جب میں نے فون رکھ دیا بیوی نے تیکھے تیوروں سے پوچھا یہ موئی کنیر فاطمہ کون ہے، کیا اپنے پیچھے پھر کوئی لسر کا لگایا ہے؟

میں نے کہا تو بہ کرو، اشرف جہاں، یہ کنیر فاطمہ تو ایک بوڑھی عورت ہیں، مانی دادی بھی بن چکی ہیں جس دن تم سجاد سے ملنے گئی تھیں، انہوں نے میرے پاس آ کر، یہ مشورہ دیا تھا کہ میں کوثر صاحب سے مل لوں، یہ سنا تو بیوی کے ماتھے کی شکنیں غائب ہو گئیں۔

دوسرے دن، کوثر صاحب سے ملا، وہ اس قدر تپاک اور شگفتگی سے ملے کہ جی خوش ہو گیا، اور میری ساری بدگمانیاں دور ہو گئیں۔

میں نے دل میں کہا اس چہرے اور اس مزاج کے آدمی کو لوگ ”مولانا“ کہہ کر پکارتے ہیں کوئی حد بھی ہے اس بد مذاقی کی۔

حضرت کوثر سے میں نے مختصر الفاظ میں اپنی روداد کہی، وہ بے حد متاثر ہوئے اور فرمایا آپ پنڈی تشریف لے آئیں، میں ایک ہفتے کے اندر، اپنے ہی محکمے میں آپ کا تقرر کر دوں گا۔

اور جب میں ان کا شکریہ ادا کر کے، رخصت ہونے لگا، تو وہ کچھ اس طرح مسکرائے کہ میرا دل موہ لیا۔

اور جب میں پنڈی پہنچا، تو انہوں نے حسب وعدہ میرا تقرر فرما دیا، وعدہ ہوتا ایسا اور ادب نوازی ہوتا ایسی۔

جزاک اللہ، فی الدارین خیر!

میرے تقرر کے وقت ممتاز صاحب علوی وزارت اطلاعات کے سیکرٹری تھے کس طرح گناؤں ممتاز صاحب کے محامد و محاسن اس شخص کے سینے میں شرافت سانس لیتی ہے، اور اس کے لہجے میں وہ زیرو بم ہے جو اعلیٰ درجے کے خاندانی افراد کے گلے میں پایا جاتا ہے لیکن صدحیف کہ وہ ”دولت مستعجل“ کی طرح سفیر بنا کر چین بھیج دیئے گئے اور میں سر پکڑ کر رہ گیا۔

ان کے بعد ان کی جگہ نسیم احمد صاحب سیکرٹری بنا دیئے گئے، اور دوسری ملاقات ہی میں برہم ہو گئے مجھ سے۔۔۔۔۔ یا یوں کہئے کہ میری ایک عادت فتنج، اور میری ایک سنت جاریہ نے ان کو برہم کر دیا مجھ سے۔

میں کیا کروں کہ میرے سامنے جب کوئی غلط زبان استعمال کرتا ہے، میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا، اور پھٹ سے ٹوک دیا کرتا ہوں اور یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو ٹوک رہا ہوں، وہ سلطان ہے یا گدا۔

میں پنڈت جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، اور آمر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں تک کو ٹوک چکا ہوں۔

چنانچہ نسیم احمد صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہ جب انہوں نے اثنائے گفتگو میں ”رہائش گاہ 1“ کہا تو میں نے پھٹ سے ٹوک دیا کہ لفظ غلط اور بدنسلا ہے اور میرے ٹوکتے ہی نسیم صاحب کے چہرے سے اس طرح پل بھر میں تبسم غائب ہو گیا۔ جس طرح بجلی کا رشتہ منقطع ہوتے ہی بلب کی روشنی اڑ جایا کرتی ہے۔

میری اس ”گستاخی“ سے چراغ پا ہو کر انہوں نے میرے خلاف، نہایت سخت الفاظ میں ایک نوٹ لکھا، اور اس پر ”ناپ سیکرٹ“ کا لیبل لگا کر، اس کو وزیراعظم بھٹو صاحب کے پاس بھیج دیا۔

وہ نوٹ تھا تو ایسا کہ مجھے فوراً برطرف کر دیا جاتا، لیکن بھٹو صاحب نے یہ شرافت برتی کہ مجھ کو برطرف تو نہیں کیا، مگر وزارت اطلاعات سے ہٹا کر تعلیمات کی وزارت

کو اشارہ کر دیا گیا کہ وہاں میرا تقرر کر دیا جائے۔ جب نسیم صاحب کے اس نوٹ، اور اپنے تبادلے کی خبر مجھ تک پہنچی، تو میں تعلیمات کے سیکرٹری، اور ملک کے نامور ادیب قدرت اللہ صاحب شہاب سے ملا۔

کیا بتاؤں کہ وہ کتنی بے نظیر سعادت مندی سے پیش آئے، اور اپنے چہرے کی دمیدگی سے انہوں نے میرے دل پر کس طرح اپنی شرافت و قدردانی کا سکہ بٹھا دیا۔

انہوں نے چھوٹے ہی مجھ سے کہا جوش صاحب آپ کا ہماری وزارت سے منسلک ہونا ہماری بڑی عزت افزائی کا باعث ہے آپ مطمئن رہیں کہ ایک ہفتے کے

1 یہ دراصل ہندی کے لفظ ”رہنے سے بنایا گیا ہے، اگر اسے مان لیا تو پھر“

کھانے“ سے ”کھلاش“ اور ”لینے“ سے ”لناش“ کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔“

اندر آپ کو مسئلہ طے ہو جائے گا، اور میں آپ کا تقرر نامہ لے کر خود آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو جاؤں گا۔

شہاب صاحب کی ادبیت کا تو میں ایک مدت سے مداح تھا، اور اس ملاقات کے بعد اب ان کی آدمیت پر بھی ایمان لے آیا۔

لیکن میں، چونکہ خدا کے فضل و کرم سے قلیل الاحباب و کثیر الاعداء ہوں اس بناء پر لوہے لگ گئے میرے تقرر میں۔

میری مسل، نام خدا جس کے بھی سامنے گئی، اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور اس پر اعتراضات وارد کر کے، اس کو پلٹا دیا گیا۔

کسی نے تو اس تعصب کی بناء پر میرے مسئلے کو الجھ ادیا کہ یہ کم بخت یوپی کا باشندہ ہے کسی نے اس بات پر نگاہ کر کے روڑے اٹکائے کہ یہ ناپاک رافضی ہے اور کسی نے

اس بنا پر مجھے نقصان پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ یہ روسیاء ملحد ہے۔

اس کے علاوہ میری ذات میں جو پانچ عدد عیوب ہیں، انہوں نے بھی لوگوں کو مجھ سے برا فروختہ کر رکھا ہے آپ میرے ان کالے عیبوں کو بھی سن لیں۔



1 میں، ابلہانہ مدنی ضوابط کو ٹھکراتا اور احمق پنچوں کو خاطر میں نہیں لاتا ہوں۔  
 2 میں اپنے معاشرے کے علی الرغم دروغ گفتاری اور ریا کاری پر عمل نہیں کرتا،  
 اور اپنے جلوت و خلوت کے تمام مشاغل کو ڈنکے کی چوٹ پر بیان کر دیتا ہوں۔  
 3 میں اوہام اقوال اور اساطیر کے روبرو سرخم نہیں کرتا اور برہان منطقی نہ صداقت  
 ریاضی کے بغیر ”بزرگان دین“ کی کسی بات کو تسلیم کر لینے پر، کسی شرط کے ساتھ بھی  
 آمادہ نہیں ہوتا۔

4 یاران طریقت اپنی بنیادی خامی کو نظروں سے چھپا دینے کی خاطر، ایک مدت  
 دراز سے عقل کی توہین اور جنوں کی تبلیغ فرما رہے ہیں، اور ہنکارہے ہیں انسانی ذہن کو  
 برہان کے کھلے میدان سے وجدان کے تنگ حجرے کی جانب، اور میں خانہ خراب،  
 نصف صدی سے عقل و فکر کے گن گاہ اور عشق و جنوں کو ٹھکرا رہا ہوں۔

5 لوگ، زبان، اوطان، ادیان اور الوان کے اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے  
 سے نفرت کرتے اور ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ اور میں اس دھرتی ماما پر  
 بسنے والے تمام انسانوں سے محبت کرتا، وحدت انسانی کی تبلیغ میں سرگرم رہتا اور رحمتہ  
 للعالمین سے رشتہ قائم کئے ہوئے ہوں۔

ذرا غور تو فرمائیے، صرف ایک عیب انسان کو نکو بنا دیتا ہے اور میں تو بفضلہ پنج عیبی  
 ہوں مجھ سے کون محبت کا ارتکاب کر سکتا ہے؟

سو، جناب والا، میرے ان عیوب پنجگانہ کی بناء پر میرے تقرر کے مسئلے کو پورے  
 چھ مہینے تک مسلسل گھملا جاتا رہا۔ اور چونکہ میں خدا کے بے نہایت فضل و کرم سے  
 دولت مند انسان نہیں ہوں چھ ماہ تک مشاہرہ نہ ملنے سے بلبلا اٹھا اور جب یہ دیکھا کہ  
 اب دروازے پر فاقے دستک دینے والے ہیں، میں نے گھبرا کر اپنے دو دوستوں کو  
 اپنی پریشانی سے خط لکھ کر آگاہ کیا۔

ان دوستوں میں سے ایک تو ہیں روشناس عالم پیر خانقاہ اور دوسرے ہیں سات

پردوں میں چھپے ہوئے ملحد عقل آگاہ۔

حضرت پیر خانقاہ، میرا خط پی گئے، اور میرا ملحد یار، لبیک کہتا ہوا دوڑ پڑا میری طرف۔۔۔۔۔ اللہ اللہ، انسانیت کا درو، اور ملحد کے سینے میں

در خرابات مغاں، نور خدایٰ بینم  
وہیں عجب ہیں کہ چہ نور سے زکامی بینم  
آخر کار جب خیر سے چھٹا مہینہ بھی گزرنے لگا تو آخر ”تنگ آمد بجنگ آمد“ پر عمل کر کے میں نے بھٹو صاحب کو ایک تلخ و ترش خط لکھ مارا خط کی نقل میرے پاس نہیں ہے لیکن اس قدر ضرور یاد ہے کہ میں نے اس خط میں لکھا تھا کہ بھٹو صاحب آپ کی حکومت، مجھ کو دیر اثر زہر (Slow Poison) کے ذریعے سے آہستہ آہستہ ہلاک کرنے میں سرگرم ہے اور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ایک ایسا ہولناک جرم ہے جس کو تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکے گی اور یہ کلنک کا ٹیکا، قیامت تک چھڑائے نہیں چھوٹے گا۔

میں کس زبان سے بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کروں کہ وہ میرے لہجے کی تلخی پی گئے اور وزیر تعلیم کے نام اسی وقت حکم جاری کر دیا میرے فوری تقرر اور میرے چھ مہینے کے چڑھے ہوئے مشاہرے کے فوراً ادا کر دیئے جانے کا۔

چنانچہ اس حکم کے دوسرے ہی روز میرا تقرر کر دیا گیا اور میری پوری چھ ماہ کی رقم بھی ادا کر دی گئی اور میرے تمام یاران ہوا خواہ کے منہ اتر کر رہ گئے۔

دشمن اگر قویست، نگہ ہاں قوی تراست  
تعلیمات کے محکمے میں آکر، ابھی اطمینان کی چند سانسیں ہی لینے پایا تھا کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا شہاب صاحب کے تبادلے کا، اور میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا اور جب ان کو لندن بھیج دیا گیا تو میں بڑے خوف سے یہ سوچنے لگا کہ دیکھئے اب کس سے سابقہ پڑنے والا ہے۔

میں اپنی طبع کی نازکی سے بے حد خائف رہتا ہوں میں سوچنے لگا کہ اگر ان کی جگہ کوئی آئی سی ایس قسم کا گڈامیر صاحب آگئے، تو میرا نباہ ناممکن ہو جائے گا۔

لیکن جب میں نئے سیکرٹری ڈاکٹر اجمل صاحب سے ملا، تو میرا وہ خوف باطل ہو گیا۔ اور یہ سمجھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ اجمل صاحب بھی علمیت، شرافت اور ادب نوازی کا ایسا مجموعہ ہیں کہ میرا ان سے باحسن الوجہ نباہ ہو جائے گا۔

لیکن بے شمار خوبیوں کے باوجود، ان کی یہ بات دل کو بہت کھٹکتی ہے کہ وہ خون سے خون ملنے کا وقت مقرر کرتے ہیں، اور خود ہی کہنا بھیجتے ہیں کہ ایک ناگہانی میٹنگ نکل آئی ہے، اس لئے کل تشریف لے آئے۔

### میری موجودہ زندگی:

ہرچند بھٹو صاحب نے، میری معاش کا معقول انتظام کر دیا ہے، لیکن میرا خرچ میری آمدنی سے زائد ہے، اس لئے زندگی آرام سے بسر نہیں ہوتی ہر ماہ بیمار بیٹے کو چار سو روپے اور بیوہ بیٹی کو تین سو روپے بھیجتا ہوں۔۔۔۔۔۔ گرائی، اور پھر بادہ ناب کی گرائی نے کمر توڑ رکھی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اس قدر معقول مشاہرہ ملتا ہے، پھر بھی آپ غیر مطمئن رہتے ہیں، انہیں کیا معلوم کہ افلاس و امارت کا انحصار، آمدنی کے سکوں کی عددیت پر نہیں، بلکہ ذاتی اور خاندانی معیار زندگی پر ہوتا ہے۔

اس لاشتم پشتم زندگی گزارنے کے باوجود، مضطرب کر دینے والے غم کو اپنے پاس ہر کئے بھی نہیں دیتا، جب دیو غم، کندے کھول اور خم ٹھونک کر، حملہ کرتا ہے، ایک ایسا خچا تلامکا مارتا ہوں اس کے منہ پر کہ اس کی نکسیر پھوٹ جاتی ہے۔

ہرچند گزر روزگار سے، میرے سر کو محفوظ کر دیا گیا ہے، لیکن ایک نگاہ نازکی ایسی برچھی مجھ پر مسلط فرمادی گئی، جو اس عمر میں بھی میری رگ جاں کو چھیڑتی رہتی ہے۔

میں، ہر آن، اپنے شہر حکمت کی طرف بھاگ جانا چاہتا ہوں، لیکن میرے گرد و

پیش رخ و گیسو کی ایسی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں کہ بھاگ نہیں سکتا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

در، نہ ستانی، بستم می رسد  
یہ ماجرا، آگے چل کر، بیان کروں گا۔

جی ہاں، اسلام آباد کی آب و ہوا، بے حد روح افزا ہے، لیکن تنہائی مارے ڈال رہی ہے مجھے۔

دن بھر تو اس تنہائی کا شکرا دا کرتا ہوں کہ کوئی آ کر میرے لکھنے پڑھنے میں خلل نہیں ڈالتا۔

لیکن آفتاب کے غروب ہو جانے کے بعد، جب میرے طلوع ہونے کا وقت آتا ہے، تو اس سبھ گھڑی میں، دل سے آواز آنے لگتی ہے، کاش اس وقت چند فلسفی یا شاعر، یا ادیب میرے ہم نشین ہوتے اور گل افشانی گفتار سے میرا شغل سہانا ہو جاتا۔ بار بار گھبرا گھبرا کر، ہر طرف دیکھتا ہوں اور جب کوئی ہم زبان و ہم سخن، دور دور تک نظر نہیں آتا، تو چیخ اٹھتا ہوں کہ اے میرے اللہ بھیج دے معقول آدمیوں کو۔۔۔ اگر تیرے خزانے میں کوئی معقول آدمی نہیں ہے تو بھیج دے کسی گنگوہ شریف کے مولانا عبدالقدوس ہی کو۔

اللہ اکبر، میری شاموں کی ڈائن تنہائی، اندھی، گونگی، لنگڑی، لولی اور بسورتی تنہائی۔

اس گاڑھی، دبیز، گھن گرج، گھنگور، گھپ اور گھورت تنہائی سے جب میری سانس رکے لگتی ہے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر چلاتا ہوں کہ:

میلہ لائے، ناحی ہی کو آج کوئی  
اکیلے، شب غم میں گھبرا رہے ہیں  
گاہ گاہ اس تنہائی کے مذاہب سے نجات دلانے کے لئے چند احباب و اقارب



ادھر نکل آتے ہیں اور میرے شغل میں جان پڑ جاتی ہے۔

ان رحمت کے فرشتوں کے نام اور ان کے مختصر خصوصیات آپ کو بھی سنائے دیتا

ہوں۔

### کلام خاں:

یہ میرا دوست نہیں بھانجا ہے، بڑا جواں مرد و جفاکش انسان ہے آڑے وقت میں میرے کئی بار کام اچکا ہے۔

پہلے ڈھاکے میں تھا وہاں کی آب و ہوا سے اس کو بہت پہلے سے بوے فساد آئی پشاور چلا گیا پشاور جا کر مکان بھی بنالیا حالات نے پلٹا کھلایا پشاور کوچ کر پنڈی آ گیا اپنی پرانی تمباکو کی تجارت سے دست بردار ہو کر یہاں اس نے ایک زراعتی اور ایک پلٹری فارم کھولا آج کل اس کا کام بگڑا ہوا ہے لیکن ہمت نہیں ہارتا ہر چند مرغی خانہ کھول کر گلی گلی بانگ دیتا پھرتا ہے، لیکن چہرے سے حزن کا اظہار نہیں ہونے دیتا۔

وہ بے حد گورا چٹا، اور خوب رو انسان ہے، خلوص کا تو بس پتلا ہے، اور جب ولولے میں آ کر باتیں کرتا ہے، تو ہکلانے لگتا ہے، اور اس کے ہکلانے پر مجھ کو پیار آنے لگتا ہے خدا اس کی عمر دراز کرے، اور اس کی معاشی تنگی دور فرما دے۔

### جمال خاں:

یہ بھی میرا بھانجا، اور کمال کا چھوٹا بھائی ہے ازراہ سعادت مندی کبھی کبھار ادھر آ نکلتا ہے پہلے یہ لندن میں رہتا تھا اب یہاں کسی دفتر میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ لندن میں ایک جرمن نژاد لڑکی سے آنکھ لڑ گئی تھی، عاشقی کے خوب پینگ بڑھے اور اس لڑکی نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔

مگر اب صاحبزادے نے عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اس لڑکی سے شادی اور ایک عدد بچی کے باپ بھی بن گئے۔

جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلے جو معشوقہ لیلیٰ کی طرح محمل میں جلوہ گر تھی، وہ زوجہ

بنا کر، ان کی انگنائی میں گائے کی طرح کھڑی جگالی کر رہی ہے سچ کہا ہے حضرت اکبر  
الہ آبادی نے کہا:

عاشقی، دام شریعت میں جب آ جاتی ہے  
جلوہ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

عزیز ہاشمی:

جس اسکول کے پہلے بانی تھے اب وہاں حکومت کے تصرف کے بعد ہیڈ ماسٹری  
کر رہے ہیں کبھی کبھی منہ کا مزاج بدلنے کے لئے شعر بھی کہہ لیتے ہیں میرے ساتھ  
نہایت خلوص سے پیش آتے اور کبھی کبھی اصلی شہد بھی کھلاتے ہیں حسن پرست بھی ہیں  
اور رنگین مزاج بھی لیکن اس راز کے افشا سے گھبراتے ہیں اللہ ان کو جرأت بخشے۔

سید عزا دار حسین کاظمی:

جب میں یہاں تازہ تازہ آیا تھا، وہ ریلوے کے محکمے میں افسر تھے، اور میرے  
مقدم میں انہوں نے ایک ایسا شان دار جلسہ کیا تھا جو ابھی تک یاد ہے۔  
اس جلسے میں انہوں نے مجھے چاندی کے فریم میں ایک سپاس نامہ دیا تھا اور دو  
نہایت آب دار کیس بھی بطور تحفہ عنایت فرمائے تھے۔

اس کے بعد پنڈی کو سونا کر کے، لاہور چلے گئے تھے لیکن اب، خدا کے فضل سے  
پھر ان کا یہیں تبادلہ ہو گیا ہے اور تیل کے محکمے کے افسر مقرر کر دیئے گئے ہیں بڑی  
دھیمی آواز اور بڑی شور انگیز محبت کے انسان ہیں۔

ملتے جلتے کم ہیں، مگر جب فون کر کے بلاتا ہوں، محبت کی زنجیر میں بندھے فوراً آ  
جاتے ہیں ہر چند نہایت سنجیدہ اور مذہبی آدمی ہیں مگر رندوں پر مہربانی فرماتے رہتے  
ہیں، اور چونکہ تیل کے محکمے سے ان کا تعلق ہے، اس لئے چہرے پر بڑی چکناہٹ پائی  
جاتی ہے، اللہ خوش رکھے۔

سید ارتضیٰ حسین زیدی:

یہ دوستوں میں نہیں میرے بچوں میں شامل ہے، میرے محبوب و مقتول مصطفیٰ زیدی کا چھوٹا بھائی ہے خاموش، باادب اور معصوم آدمی ہے میں جب اس کو گلے لگاتا ہوں اپنے بیٹے سجاد حیدر کا مزا آجاتا ہے کس قدر پیارا ہے یہ نوجوان۔

اس کا ماشاء اللہ ایک چھوٹا بچہ ہے جس کو میں ”دوست“ کہہ کر پکارتا ہوں خدا نظر بد سے بچائے، اس قدر ذہین ہے کہ حیرت ہوتی ہے وہ اس عمر میں میری ایک نظم آہا آہا برکھا آئی الا پتا رہتا ہے۔

مصطفیٰ کی بیوی بھی نہایت شائستہ اور تعلیم یافتہ ہے، میرے لکھنؤ شریف کی رہنے والی ہے اس لئے سخن سنج بھی ہے۔

اس کی بڑی بیٹی شعر کہتی ہے، اور اس نے ایک جاسوسی ناول بھی لکھا ہے جس کو پڑھ کر میں نے اسے رائے دی ہے کہ بیٹی جب تم پڑھ چکنا، تو خفیہ پولیس میں داخل ہو جانا۔

جب ارتضیٰ میاں اور ان کی والدہ معظمہ کو دیکھتا ہوں اپنے مصطفیٰ کی یاد میرے سینے کی ہار ہو جاتی ہے۔

ہائے کس قدر قابل ناز شاعر، مل گیا خاک میں ہائے کس آسمان کو کھا گئی یہ ڈائن زمین۔

ہائے میرے مصطفیٰ تم اکیلے چلے گئے، مجھے ساتھ نہیں لیا۔

### عون محمد رضوی:

یہ بھی میرے برخورداروں میں شامل ہے، بہت باادب اور نہایت مخلص نوجوان ہے ٹیلی ویژن کے محکمے سے وابستہ ہے اور بہت ہی پیارا لڑکا ہے لیکن وعدے کو کبھی ایفاء نہیں کرتا، اور اس کے ساتھ ساتھ اس قدر بھولا بھالا ہے کہ ایک بار اس نے فرمائش کر دی میاں احمد فراز کے سے نابالغ انسان سے کہ وہ ٹیلی ویژن پر میرے کلام کے باب میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔

اللہ اللہ غاروں کا نشیب، اور پیائش کرے کوہ ساروں کے فراز کی، ارے ذرا  
سانپولا اور میدان میں آئے، تلوار باندھ کر!

تفو، برتو، اے چرخ گرداں تفو!

### محمد رمضان:

حسن ابدال میں رہتے ہیں، نام تو ہے خشک رمضان، لیکن شخصیت ہے، عید کا  
شاداب گلستان اس شخص کا دل اس قدر گداختہ ہے کہ اس پر قربان ہو جانے کو دل چاہتا  
ہے۔

اختر و منظور کو دعوت میں جب آتے ہیں تو اس قدر لطیفے سناتے ہیں کہ پیٹ میں  
بل پڑ جاتے ہیں ایسے باغ و بہار آدمی ہیں کہ انہیں دیکھ کر دل کی کلی کھل جاتی ہے۔  
نام تو ہے رمضان، مگر ہیں رندوں کے سلطان۔۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے  
نام کے مہینے میں بے آب و گیاہ دشت بن جاتے ہیں سچ کہا ہے میر نے۔

دیر سے اٹھ کے، کعبے آیا میر  
جس کو چاہے، خدا خراب کرے

### ڈاکٹر صفدر حسین:

محکمہ تعلیمات میں ڈائریکٹر اور نہایت فاضل انسان ہیں اور بڑے نپے تیلے،  
چست گفتار اور سنجیدہ لہجے کے شاعر ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ مرثیے پر ان کو بڑی  
دست گاہ حاصل ہے، ہنستے کم ہیں، سنجیدہ زیادہ رہتے ہیں، وضع داری اور بردباری کے  
قابل تقلید نمونے ہیں۔

شعر بہت اچھے کہتے ہیں لیکن ان کو سناتے ہیں اس برے انداز سے کہ ان کا سارا  
مزا کر کر اہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ کبھی خوب روان انسان تھے مگر حد سے زیادہ کنایت شعاری کی پر چھائیوں نے ان  
کے حسن کو گھنا دیا ہے۔



صفدر صاحب بحیثیت مجموعی، اس قدر وضع دار، مہذب، شائستہ اور صاحب علم و فضل انسان ہیں کہ آدمی ان سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

### سیفی نوگانوی:

میرے نئے احباب میں سے ہیں ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی ملاقات ہے مگر خیالات کے اشتراک کی بناء پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کئی ہزار سال کی پرانی دوست ہے۔

یہ رہتے تو ہیں پاکستان میں، لیکن ان کا دماغ پاکستانی یا ایشیائی نہیں بلکہ یونانی ہے۔

آبائی عقائد کے بھی حصار کو توڑ کر باہر آ جانا، انسان کا نہیں دیو کا کام ہے، اور اسی وجہ سے میں ان کو دیو، اور نہایت قوی ہیکل دیو کا خطاب دوں گا۔

انہوں نے گرز فکر کے ضربات مسلسل سے اقوال، اوہام، افکار اور اساطیر کے وقت نوزائیدہ سنگین قلعے کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے اور اپنے سارے خاندان سے جدا ہو کر منطق و حکمت کی ہم نشینی میں، زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میں نے ان کے دو فکری و تحقیقی مسودوں کو غور سے پڑھا ہے اور ان کی اس سے زیادہ تعریف نہیں ہو سکتی کہ اگر یہ پختگی سے بھرے ہوئے مسودے، چھاپ دیئے جائیں تو نا پختہ ذہن رکھنے والے حضرات کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور تمام شہر کے جلا بے چھریاں لے لے کر ان پر جھپٹ پڑیں اور قتل کر کے ان کی لاش پر گھوڑے دوڑا دیں۔

گفتار صدق، مایہ آزار می شود  
چوں، حرف حق، بلند شود، داری شود

### ڈاکٹر سبط حسن:

یہاں کسی کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں، انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری

تہران سے حاصل کی ہے۔

یہ ٹھوس، گنبدیہ سنجیدہ اور سخن سنج انسان ہیں مگر مزاج میں اقوال پرستی کا عنصر غالب ہے گہری بات سن کر چونک پڑتے اور آنکھیں کھول کھول کر غور کرنے کی سعی فرماتے ہیں لیکن عین اس وقت، ان کے آباء آتے، اور ان پر لاٹھی چارج کرنے لگتے ہیں اور یہ بچارے گھبرا کر اس طرح آنکھیں میچ لیا کرتے ہیں، جیسے کسی ننگی تصویر پر نظر پڑتے ہی کوئی دوشیزہ اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔

بہر حال آدمی اس قدر ذی علم و صاحب اخلاص ہیں کہ ان سے محبت کی جائے اور جی بھر کے کی جائے یہ میرے پاس بہت ہی کم آتے ہیں، اور انہیں خبر نہیں کہ میں ان کو اکثر یاد کیا کرتا ہوں۔

### سید محمد واقف:

نام محمد واقف لیکن عظمت فکر محمد سے ناواقف ہیں اور ضمیر محمد تک رسائی کا شرف و مجد حاصل نہیں ہے وہ منسٹری آف ورکس میں ڈپٹی سیکرٹری، اور میری اقلیم دل کے شہزادے ہیں، ان کا وطن ہے کعبہ ہندوستان یعنی لکھنوباتیں کرتے ہیں تو منہ سے پھول جھرتے ہیں اور خال و خط سے نور برستا ہے شوخی مزاج میں اس قدر ہے کہ بعض اوقات، بھری محفل میں، اپنی بیگم پر بھی فقرے کس جاتے ہیں، اور وہ بچاری چہرہ کر رہ جاتی ہیں۔ میں ان کی بیگم کو بھی تعریف نہیں کر سکتا۔ سراپا مہر و اخلاص ہیں، اور بھولے پن کی یہ انتہا ہے کہ مجھ رند نامہ سیاہ کو چھپا ہوا درویش سمجھتی ہیں لیکن بہاری کباب کھلانے کا وعدہ کرتی، اور ہر بار بھول جاتی ہیں۔

واقف صاحب کے اعمال دینی دیکھ کر، جب میں ان کو چھیڑتا ہوں تو وہ اپنے چہرے پر عالمانہ سنجیدگی طاری کر کے ایسے غیر منطقی جواب دیے لگتی ہیں کہ ان کے منہ سے دودھ کی خوشبو آنے لگتی ہے اور بے ساختہ جی چاہنے لگتا ہے کہ ان کو گود میں اٹھا کر منہ چوم لوں۔

## نظم اکبر آبادی:

دبے پتلے ہنس مکھ آدمی ہیں، پہلے ریلوے میں تھے اب پنشن پاتے ہیں ان کی  
شاعرانہ حیثیت بلند ہے، غزل کہتے ہیں اور بہت اچھی کہتے ہیں اور پڑھنے کے انداز  
میں بھی بڑی کشش ہے۔

محبت کا یہ عالم ہے کہ جب کسی جلسے میں مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے، دوڑ کر گلے لگ جاتے  
ہیں لیکن اس محبت کے باوجود نمل اس قدر ہیں کہ مہینوں صورت نہیں دکھاتے ہیں  
کاش ان کو معلوم ہو جائے کہ میں ان کو اکثر یاد کیا کرتا ہوں۔

## سید اولاد باقر رضوی:

پہلے فوج میں دنگ کمانڈر تھے، پھر فوجی فاؤنڈیشن میں کام کرنے لگے، اور اب یہ  
غضب کیا کہ پنڈی کو ویران کر کے کراچی چلے گئے ان کا گھریلو نام ہے ”دلارے  
میاں“ اور، واقعی وہ دوستوں کی آنکھوں کے تارے اور یاروں کے دلارے ہیں بھی  
اور شعر بھی خوب کہتے ہیں ماشاء اللہ۔

ان کے گھر پر اکثر دعوتیں ہوا کرتیں تھیں اور یہ خصوصیت تھی ان کی دعوتوں کی کہ  
ان میں خاصان جام و سبوا و صاحبان سجادہ وضو دونوں کو مدعو کیا جاتا تھا اور مے کدے  
اور صومعے ایک ہی حلقے میں تعمیر کر دیئے جاتے تھے اور عرصہ رندی کے غازی اور گوشہ  
تقویٰ کے نمازی، دوش بدوش بیٹھ کر، اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔

اور جب آفتاب غروب ہو جاتا تھا تو ایک طرف تو مصلے دراز ہو جاتے، اور  
دوسری طرف بساط بادہ نوشی بچھا دی جاتی تھی اور اذانوں کی آوازوں کے سائے میں  
قلقل مینا تھرکنے لگتی تھی، اور پھر مصلوں پر نمازی غروب، اور بساط رنگ پر غازی طلوع  
ہو جایا کرتے تھے اور دلارے میاں کی طرف روزگار، انگلی اٹھا کر کہا کرتا تھا۔

آب و آتش، بہم آمیختہ از لب لعل  
چشم بد دور، عجب شعبہ باز آمدنی





آن جانماز پر بیٹھے رہنا کہ گھرتباہ ہو کر رہ جائے خود شریعت کی نظر میں بھی معیوب نہیں اس کو لاکھ لاکھ سمجھاتا ہوں کہ یہ روش خود اسلامی اعتدال کے خلاف ہے، لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ مجھ کو سپاٹ آنکھوں سے دیکھ کر سر جھکا لیتی ہے اس لئے میں نے اس کا نام ”حجت بوا“ رکھ دیا ہے اور یہی لیل و نہار رہے تو مجھے اس امر کا شدید خوف ہے کہ اس کا ذوق شعری ٹھہر کر رہ جائے گا اور وہ آخر کار ”نورنامے“ اور ”راہ نجات“ کی سی چندھی چڑی چڑی چڑوڑھی اور چوپٹ شاعری کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکے گی اللہ خیر کرے۔

### حفیظ الرحمن:

ان کی تعریف کے واسطے کہاں سے الفاظ لاؤں اخلاص ان کے سینے میں سانس لیتا ہے یہ پاکستانی معلوم ہی نہیں ہوتے اس لئے کہ پاکستانی ہوس زر میں اس قدر بوکھلا چکے ہیں کہ انہوں نے خلوص و وضع داری کو اپنے پر حرام کر لیا ہے۔

حد یہ ہے کہ ایک پاکستانی بزرگ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا روز چچا جان کے گھر کیوں جاتا ہے ارے کم بخت وہاں جا جہاں دو پیسے مل سکیں حیرت ہے کہ حفیظ صاحب پر اس ماحول کا کوئی اثر نہیں پڑا اور ان کی اودھی آن بان، اخلاص مندی اور وضع داری اپنی جگہ قائم رہی۔

حفیظ صاحب پندرہ میل کا سفر طے کر کے میرے پاس آتے ہیں حالانکہ ان کی کوئی غرض مجھ سے وابستہ نہیں ہے۔

قیامت ہے کہ سن، لیلیٰ کا آنا، دشت مجنوں میں  
کہا، حیرت سے اس نے یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں

### فیض احمد فیض:

کیا کہنا میاں فیض کا ڈنکے پٹے ہوئے ہیں پورے پاکستان میں اور کیوں نہ ڈنکے پٹیں کہ یہ اس کے ہمہ وجودہ مستحق ہیں میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب

کوئی انہیں جانتا ہی نہ تھا اور اس دور میں جب کبھی میرا ہونا ہوتا تھا، تو یہ شام کے وقت میرے پاس بلاناغہ آیا کرتے تھے اب میرے پاس کم آنے لگے ہیں اور میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ میاں فیض:

حریف بزم تو بودم، چو ماہ نو بودی  
کنوں کہ ماہ تمامی، نظر درلغ مدار  
فیض صرف اچھے شاعر ہی نہیں اچھے آدمی بھی ہیں اور میرے اس قول کے مصدق  
ہیں کہ حقیقی شاعر، کبھی برا آدمی ہو ہی نہیں سکتا۔

ہر چند نہایت آب و آتش شعر کہتے ہیں لیکن اس قدر بری طرح پڑھتے ہیں کہ سارا مزا  
کر کر اہو کر رہ جاتا ہے۔

حدیث متواتر کے طور پر سن رہا ہوں کہ جالندھر کے حفیظ صاحب، فیض کی شہرت و  
مقبولیت سے بے حد چراغ پا ہیں اور کہتے ہیں ارے یہ کل کا لونڈا اس قدر مقبول ہو گیا  
کہ لوگ مجھ ”ابوالاثر“ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

اس طفل یک شبہ، رہ صد سالہ می زند  
ارے یہ فیض پڑھتا نہیں گھانس کاٹتا ہے، اور میں گا گا کر، مرکیاں لے لے کر  
نرت کر کر کے اور انگشت شہادت کے سرے کو انگوٹھے کی نوک پر جما کر، گھومتے چھلے  
بناتا، بار بار گردن لچکا تا رہتا ہوں، پھر بھی لوگ اس قدر بد مذاق ہیں کہ مجھ کو ٹھینکا دکھا  
رہے ہیں ارے غضب خدا کا میں پکا مسلمان اور شاہ نامہ اسلام کا مصنف ہو کر فردوسی  
کو نیچا دکھا چکا ہوں اور اس کے برعکس فیض ملحد ہے خدا رو وطن ہے اور پھر بھی دنیا اس کی  
طرف ڈھلتی چلی جا رہی ہے۔

اور میں ان خیال گر شاعر صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ:

طمع چہ می بری، اے سست نظم، بر حافظ  
قبول خاطر و حسن سخن، خدا داد است

## فیضی:

یہ زبان اردو کے فیضی ہیں شیریں مقال و مداح اہل بیت ہیں اور ایسے کھٹکے سے  
شعر سناتے ہیں کہ لوگ جھومنے لگتے ہیں ان میں اخلاص و محبت کا جو ہر ایسا ہے جو  
اس دور میں کہیں نظر نہیں آتا ان کے چہرے پر نمک اور ایسا نمک ہے کہ اس کے  
دائرے میں سینکڑوں سانولی سلونیاں مسکراتی نظر آتی ہیں۔

اردو شاعروں میں بالعموم یہ گھٹیا پن پایا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر کچھڑا اچھالا  
کرتے ہیں اور میرے نزدیک یہ پہلے شاعر ہیں جو اپنے ہم عصروں کی جی بھر کر داد  
دیتے اور ان کی مدح میں رباعیاں کہہ کر بھری محفلوں میں سنایا کرتے ہیں ذرا اندازہ تو  
فرمائیے کہ اس شاعر کا سینہ کس قدر چوڑا ہے۔

## اعظمی:

یہ ریڈیو پاکستان سے وابستہ حضرت شبلی کے ہم وطن، قدردان سخن، نازک بدن  
اور چمن اندر چمن انسان ہیں جب آتے ہیں تو شمعیں جل اٹھتی ہیں طاق دل میں۔  
اس دور سیاست و ہوس دولت اور پرستاری جہالت میں ارباب نظر کا وہ قحط ہے کہ  
شعر خوانی کا ولولہ، اور عرض ہنر کا حوصلہ ہی باقی نہیں رہا ہے اور جب کوئی شعر سنانے کی  
استدعا کرتا ہے تو سن سے ہو کر رہا جاتا ہوں اور کسی صورت سے بھی شعر سنانے پر آمادہ  
نہیں ہوتا لیکن اعظمی صاحب آنکلتے ہیں تو وہ کہیں یہ نہ کہیں میں بے ساختہ شعر سنانے  
لگتا ہوں حیف بر جان سخن گز بنجد اں ترسد

اور وہ میرزا غالب کی طرح بجا طور سے کہہ سکتے ہیں کہ:

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا

## دانش:

کسی کانج میں پروفیسر تھے اب پنشن پار ہے ہیں دانش فقط تخلص ہی نہیں بلکہ دانش  
مند ہیں بھی

شائستگی، خوش فکری اور شیرینی کلام سے مالا مال ہیں ان کا کلام اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ کسی نظر کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ آج ملا بنے بیٹھے ہیں، کل کسی گلی کے چکر لگانے والے عاشق زار ہوں گے۔ (کہیں ان کی بیگم یہ عبارت نہ پڑھ لیں ورنہ او دھم مچا دیں گی۔) فیض صاحب کی مانند یہ بھی اپنے ہم عصر شعراء کی علی روس الاشہاد مدح سرائی فرماتے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کو بھی انشراح صدر کی دولت بے دار حاصل ہو چکی ہے۔

### آرزش:

ہائے مرگیا عین جوانی میں کیا کہوں وہ کس قدر نکتہ رس بلند ہیں۔ اور پختگی مائل شاعر تھا۔ اس جوان مرگ کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی مل جاتا، خوشی کے مارے کھل اٹھتا اور لذت فروتنی سے گردن جھکا لیا کرتا تھا۔

وہ جوانی میں جب اس قدر اچھے شعر کہتا تھا تو بوڑھا ہو کر نہ جانے کیا ہو جاتا۔ ہائے اس کا ایک مطلع سنئے، اور اس کی قبل از وقت دقیقہ منجی پر سر دھنیئے۔

تشبیہ، شاخ گل کو نہ دوں کیوں صلیب سے  
دیکھا ہے میں نے جشن بہاراں قریب سے

### محمد عظیم

انک آئل کمپنی میں چیف انجینئر ہیں۔ اور پھر بھی شاعری کے قدردان ہیں۔ وہ جب ہماری صحبتوں میں شرمائے شرمائے سے آتے ہیں اور دبک کر ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں تو ان کی یہ شرمیلی الھڑوں کی سی وضع دیکھ کر مجھ کو تو بہت ہی پیار آنے لگتا ہے ان پر۔ لیکن ان کہ دبکا ہٹ اور شرماہٹ پر نہ جائیے۔ بندہ نواز وہ بڑے سخن شناس اور نکتہ سنج انسان ہیں اور فکری مسائل پر بھی ان کو عبور حاصل ہے۔ اور اس قدر کہ وہ باسی معاشرے کے سیلے ہوئے تہہ خانے سے باہر نکل آئے اور فکر کے صحت بخش میدان میں سانس لے رہے ہیں۔



لیکن ان کی بیگم الامان والحفیظ۔ وہ تو اس قدر کٹر قسم کی ملانی ہیں کہ ہر آن اذان دیتا رہتا ہے۔ ان کا چہرہ اور ایسا لگتا ہے گویا مولانا عتیق الرحمان، واڑھی منڈا کر زانے لباس میں آگئے ہیں۔

سنتے ہیں اے محمد عظیم صاحب، اگر اپنے بچوں کو تباہی سے بچانا ہے تو اللہ ان کو ان کی اماں جان سے دور دور رکھیے۔ ورنہ وہ مرغوں کی طرح بانگیں دیتے پھریں گے گلی گلی میں۔

### یونس منصور

ٹیلی ویژن سے وابستہ ہیں۔ اگر زمانہ انہیں فرصت و فراغت دیتا تو وہ اس وقت ملک کے بہت بڑے فلسفی کی حیثیت سے میدان میں آچکے ہوتے۔ لیکن اس قدر بے پایاں اور نامطبوع مشغولیت کے باوجود، ان کا دماغ کام کرتا رہتا ہے۔ اور وہ جو بات بھی کہتے ہیں وہ باون تولے پاؤرتی سے کم کی نہیں ہوتی۔ شروع شروع میں بڑی گرم جوشی سے ملا کرتے تھے اور بار بار آتے تھے۔ اب نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ نہ آتے ہیں اور نہ فون پر ہی اپنی آواز سناتے ہیں۔ ہونہ ہو ”وہ یونس اندر دہان ماہی شد“ کے چکر میں آگئے ہیں۔ اللہ ان کو مچھلی کے پیٹ سے باہر لائے۔ اور بحر آشنائی میں شناوری کی دوبارہ توفیق عطا فرمائے۔

### علی اختر زیدی

پہلے حسن ابدال کے فوجی کالج میں پروفیسر تھے۔ اب کہیں باہر چلے گئے ہیں پرو فیسر بن کر۔ دبے پتلے نازک اندام انسان ہیں۔ لیکن ان کی محبت اس قدر قوی الجشہ ہے کہ آدمی کو جب پکڑ لیتی ہے تو وہ اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا۔ چنانچہ یہ خاکسار بھی ان کے دام میں گرفتار ہے۔ یہ ہر چند مطلق رند نہیں، پھر بھی رندوں اور رندی سے محبت کرتے ہیں۔

ان کے چلے جانے سے حسن ابدال کا منہ اتر گیا ہے۔ اور ہر ذرہ سے آواز آرہی

ہے، زیدی، زیدی، زیدی۔ جب وہاں جاتا ہوں ڈھونڈتی رہتی ہیں میری آنکھیں  
ان کے چہرے کو۔ جب سے باہر گئے ہیں، بڑی حیرت ہے کہ مجھ کو ایک سطر بھی نہیں  
لکھی ہے اور میں بے چارہ چیخ رہا ہوں کہ:

پھری ہیں کل سے نگاہیں وہ ہیل میل نہیں  
میں دیکھتا ہوں کہ اب ان تلوں میں تیل نہیں



## اظہارِ حمیدِ رزیدی

ہرچند ایک بہت بڑی کپڑے کی دکان کے مالک ہیں۔ پھر بھی ان کی زندگی تنگی  
بچی پھرا کرتی ہے۔ اور دولت مند ہونے کے باوجود نہ جانے کس عاقبت اندیشی کی بنا  
پر انہیں اس کا رونا روتے رہتے ہیں۔

یہ بھی علی اختر زیدی کی طرح مطلق رند نہیں۔ پھر بھی ہماری صحبتوں میں بڑے  
شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ اپنا حقہ گڑ گڑاتے رہتے ہیں۔ عقل ان کی رسا ہے۔  
لیکن دین کا انگر کھا پہنے ہوئے ہیں۔ آدمی اس قدر شگفتہ رواور شگفتہ مزاج ہیں کہ صحبت  
میں بیٹھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

## شیخ منظور الہی

جب میں کراچی میں تھا تو یہ حکومت سندھ کے چیف سیکرٹری تھے۔ یہ بڑے  
طمع‌مراق کا عہدہ ہے جو لوگوں کی گردن کے اعصاب کو اکڑا دیتا ہے۔ لیکن آفرین شیخ  
صاحب کی خاندانی شرافت پر کہ وہ ایسے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنی نرمی  
گفتار اور اپنی خوئے انکسار پر قائم رہے۔ اب وہ ریٹائر ہو کر خاموش، مطمئن اور  
بتاش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا بتاؤں کن خوبیوں کا سنگم ہے ان کی ذات۔ یہ اس بلا  
کے سخن سنج اور اس قیامت کے نکتہ رس انسان ہیں۔ کہ ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اور حافظہ  
اس قدر قوی ہے کہ میری بہت سی نظمیں ان کو یاد ہیں، اور اس فراموشی سے سنا تے ہیں  
کہ حیرت ہو جاتی ہے۔ ہر چند وہ دینی ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ پھر بھی رندوں  
پر مہربان اور دکھیا انسانیت پر کڑھنے والے انسان ہیں۔

جس ماحول میں وہ پلے بڑھے ہیں۔ اس کا کچا پن ان میں رسا بسا ہوا ہے۔ اور  
جب وہ کچی باتیں کرتے ہیں۔ میری پختگی تڑپ اٹھتی ہے۔ ان کو کلیجے سے لگا لینے  
کے واسطے۔ اور جب میں اس مجموعہ محاسن شیخ کی طرف نگاہیں اٹھاتا ہوں۔ میرا سر  
اس کی عظمت کے آگے جھک جاتا ہے۔ حالانکہ:

سرفن کار تو پیش خدا بھی خم نہیں ہوتا۔

### مختار مسعود

غالباً وزارت صحت میں اب سیکرٹری ہیں، کراچی میں ڈبلیو، پی، آئی، ڈی، سی  
کے چیئرمین تھے۔

سب سے پہلے میں ان کو دیکھتا تھا۔ اپنے محبوب و مقتول دوست مصطفیٰ زیدی کی  
کوٹھی پر۔ ہر چند وہ میرے مشغلے کا وقت تھا۔ ایسا وقت جب کہ در پر جبرائیل امین  
آتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر پلٹا دیے جاتے ہیں کہ:

اس وقت سب بات نہیں ہو سکتی



توہین خرابات نہیں ہو سکتی  
جبریل امین آئے ہیں مجرے کے لئے  
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

پھر بھی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری نگاہ ان کی جانب اٹھتی تو ان کے  
چہرے کی شعائیں دیکھ کر چونک سا اٹھتا کہ یہ کیسا چہرہ ہے۔ جو مجھ کو اس عالم سرور میں  
بھی اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

اور اس واقعہ کے کئی سال کے بعد جب ان کی کتاب ”آواز دوست“ میری نظر  
سے گزری۔ اور اس کے معنوی اور صوری جمال نے میرے سامنے جب نقاب الٹی، تو  
یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ زیدی کی صحبت میں مختار صاحب کے چہرے نے کیوں  
میری نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

میں نے اردو کے نثر نگاروں کو بھی بغور دیکھا ہے۔ اور ان کے محاسن کو پرکھا ہے۔  
اور حضرت حالی، محمد حسین آزاد، اور ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، سید  
احمد خاں اور عبدالماجد دریا آبادی کو پڑھنے کی طرح پڑھا ہے۔ اور اس بناء پر یہ کہہ سکتا  
ہوں کہ ”آواز دوست“ کی انشاء پر دازی کا رچاؤ، طرز، بیان کی شگفتگی، الفاظ کا جڑاؤ،  
فقروں کی استخواں بندی اور اس کے لہجے کی موسیقی کا یہ تقاضا ہے کہ مختار صاحب کو درجہ  
اول کے انشاء پردازوں میں ایک ممتاز مقام عطا کیا جائے۔ اور محمد حسین آزاد اور حالی  
کے دوش بدوش بٹھا دیا جائے۔

ہاں اتنی بات ضرور کھٹکتی ہے کہ ”آواز دوست“ میں اس کے مصنف کا تو سن قلم بار  
بار پھٹتا اور مڑتا ہے۔ میدان قدامت و جاہ روایت کی طرف، لیکن جب اس کے  
حسن بیان پر مجموعی نگاہ ڈالتا ہوں تو معاف کر دیتا ہوں اس کھنک کو اور کہنا پڑتا ہے کہ:

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اگر مختار مسعود صاحب کسی دانا و پینا ملک میں پیدا ہوئے ہوتے۔ تو آج آپ کو

اپنے عہدے کی اس آب رو یافتہ کلر کی سے مجروح نہ ہونا پڑتا۔

سید مہدی نواب: فوج میں جرنل یا کرنل ہیں۔ سائنس کے شعبے میں پتھریلے ماحول میں رہتے۔ لیکن بے حد ملائم اور ہنس مکھ انسان ہیں۔ سائنس سے تعلق رکھنے کے باوجود ادب کی نوک پلک سے واقف ہیں۔

یہ اس قدر شگفتہ مزاج ہیں کہ ایک بات کہتے ہیں اور دس بار قہقہے لگاتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں فکر کی صلاحیت بھی موجود ہیں۔ لیکن اس کو پروان چڑھانے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کے باوجود یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کہ وہ قدامت کی سینکڑوں زنجیروں کو توڑ کر عقل سے رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ ان کی نیگم بھی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ جن کا وطن تہذیب کا آخرہ گہوارہ حیدر آباد دکن ہے۔ اور بریانی تو اس مزے کی پکاتی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ڈھائی من کھا جاؤں۔

### راز مراد آبادی

ارے کس قدر پیارا آدمی ہے راز مراد آبادی۔ جب بھی وہ آجاتے ہیں۔ خون بڑھ جاتا ہے۔ اور دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ اس بلا کی محبوبیت ہے اس شخص کی ذات میں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جسمانی اعتبار سے تو یہ گبد، تو ندیل اور بھونپو قسم کا انسان ہے، لیکن مزاج کے اعتبار سے دھان پان ہے۔ چھمی جان ہیں۔ کیا بتاؤں کہ وہ دوستوں کو کس کھٹکے اور کس مزے کے ساتھ ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں، اور کس قدر محبت کی مٹھاس ہوتی ہے ان کی گالیوں میں کہ کوئی گالیاں کھا کر جزبہ نہیں ہوتا۔ شاید ان ہی کے متعلق غالب نے کہا تھا:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب

گالیاں کھا کے بد مزہ نہ ہوا۔

مگر ان کی نیگم اللہ اکبر، ان کی نیگم دس ہزار چنگیز و ہلا کو ایک طرف اور یہ تن تنہا ایک

طرف۔

بے چارے راز نے ایک ہزار سال بعد ایک نرس سے دل لگالیا، اور غزلوں میں  
 خون دل دوڑایا تھا کہ بد قسمتی سے ان کی چھری مار بیگم کو پتا چل گیا۔ پتا چلتے ہی آنکھوں  
 میں خون اتر آیا۔ اور انہوں نے اس بے چاری نرس کو اپنے گھر بلا کر اس قدر  
 دھمکایا، اس قدر دھمکایا کہ بے چاری کی پھونک نکل گئی، اور نبضیں چھوٹ کر رہ  
 گئیں۔ اور وہ اس قدر وحشت زدہ ہو گئی کہ اس نے میاں راز کی طرف آنکھ اٹھانا بھی  
 چھوڑ دیا۔ اور پھر نے لگے میاں راز لغلان لغلان اور بن گئے لنڈورے اور گدگدا کر  
 بھاگ کھڑے ہوئے۔ عاشقانہ غزل گوئی کے میدان سے اور ان کو گرا دیا دل کے  
 دورے نے، اور پڑ گئے جان کے لالے۔

بیوی کو اس سے کیا غرض کہ مرتا ہے شوہر مر جائے، مگر کسی اور کو پہلو میں بٹھانے نہ  
 پائے کیا بنیاد عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ پیڑھی اور پلنگ کی طرح ہم اپنے شوہروں کو بھی  
 اپنے باپ کے گھر سے جہیز کے ساتھ لائے ہیں!  
 اور کرو شادیاں اے آدم کے بھگوے بیٹو!

### اختر و منظور

ارے کیا بتاؤں کس قدر پیارے و شیریں ہیں۔ یہ دونوں سنو لیے۔ میں نے ان  
 کا علیحدہ علیحدہ ذکر اس لئے نہیں کیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ایسے  
 جڑواں بچے ہیں کہ ان کو آپریشن کر کے ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا۔ تو پل بھر میں  
 یہ دونوں تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔ یہ دونوں وہ ہیں کہ جن کو یک جان دو قالب کہا  
 جاتا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی پیشہ کرتے ہیں۔ ایک ہی روش پر چلتے ہیں۔ یہاں تک  
 کہ ان دونوں کی کوٹھیاں بھی ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔  
 جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ:

پارینہ حدیثیت، تسلیم یز، زد،  
 گویند کہ ریں پیش، وفا ہم اثرے داشت

وہ آئیں اور منظور و اختر کو دیکھ لیں کہ اس دور میں بھی عہد عتیق کی سی داستانیں ہو سکتی ہیں۔

اختر بلا کے ذہین اور نکتہ سنج انسان ہیں۔ اشارہ پاتے ہی بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن منظور بھولا بھالا ہے۔ بچوں کی طرح معصوم ہے۔ اللہ اس جوڑی کو قائم رکھے۔ اور ان دونوں کے دیدار سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا رہے۔

### میری زندگی کا سب سے زیادہ دردناک سانحہ

میری طلوع ہوتی ہوئی زندگی کا سب سے زیادہ دردناک سانحہ تھا۔ میرے باپ کا ناوقت انتقال اور میری غروب ہوتی ہوئی زندگی کا سب سے زیادہ دردناک سانحہ ہے میری بیوی کا دماغی اختلال۔

لوگ مر کر کچھڑ جاتے ہیں تو کچھ دن بعد روپیٹ کر صبر آ جاتا ہے۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ میری بیوی جیتے جی مجھ سے کچھڑ گئی ہے۔ اب صبر آئے تو کیوں کر۔

ہائے۔ جب میں نامرادان کے سامنے جا کر بیٹھ جاتا ہوں اور ان کی طرف نظر اٹھاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں دور بہت دور، کسی گھنے جنگل کے گھپ اندھیرے میں، ایک ویران سی کٹیا ہے۔ اور اس اجاڑ کٹیا میں دھندلا سا چراغ، ہوا کے جھونکوں میں جھاملا رہا ہے۔ الاماں قرب میں اور اس قدر فصل۔

اس حادثہ جائگاہ نے ایک طرف تو میرے دل کی دنیا اجاڑ دی۔ اور دوسری طرف میری خانگی زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔

بیوی کا سگھڑپن گھر کی مشین چلا رہا تھا۔ اور وہ پائی پائی کا حساب رکھتی تھیں۔ ناپ تول کر باورچی کو جنس دیتی تھی اور مجال نہ تھی کہ کوئی تنکا ادھر سے ادھر ہو جائے۔

اب یہ آسمان مجھ پھوہڑ کے سر پر ٹوٹ چکا ہے۔ جس کو خانہ داری تو بڑی چیز ہے۔ نئے پیسے تک گننا نہیں آتا۔ اور صرف دس روپلی کا حساب لیتا ہوں تو لوہے لگ جاتے ہیں، اور میزان ٹھیک نہیں بیٹھتی۔



روپیہ پیسہ میں اپنے پاس کبھی نہیں رکھتا تھا۔ اور اب بٹوے میں ڈالے ڈالے پھرا کرتا ہوں، بٹوانکال کر بار بار رقم گنتا ہوں اور پھر بھول جاتا ہوں۔

بٹو امیری جیب میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا شیطان کے گلے میں لعنت کا طوق پڑا ہو۔ یا گدھے کی دم میں نمدا بندھا ہو۔

ہائے میری بیوی کس چاؤ سے میں لایا تھا تمہارا ڈولا اپنے گھر۔ اور اب یہ عالم ہے کہ میں پکارتا ہوں اور تم جواب نہیں دیتیں۔ اور آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھتی رہتی ہو۔ ہائے وہ بھی ایک دور تھا کہ تم پل بھر میری جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھیں یعنی۔

میں کسی بات پر دم بھر بھی اگر غور کروں  
اتنی دوری بھی نہ ہوتی تھی گواراہ تم کو  
اور، جب میں کسی مسئلے پر غور کرنے لگتا تھا، میری وہ ذرا سی خاموشی تمہاری طبع  
نازک پر گراں گزرتی، اور تم پوچھ بیٹھا کرتی تھیں۔ کس کو یاد کر رہے ہو؟۔ اور میں فریاد  
کیا کرتا تھا کہ:

وہ مجھے سوچنے نہیں دیتیں  
کوئی حد بھی ہے بد گمانی کی  
بولو، بولو اے میری کھوئی ہوئی بیوی بولو۔

دل نے بخشا تھا، تقاضائے زلیخا تم کو  
یاد ہے وہ خلش عہد تمنا، تم کو  
اور حیف صد حیف کہ تم اپنی بیٹی کے ساتھ کراچی میں رہتی ہو اور میں تم سے کالے  
کوسوں دور اسلام آباد میں رہتا ہوں۔ اور کراچی جا کر جب میں تم سے ملتا ہوں، تم مجھ  
کو اس طرح دیکھتی ہو، جیسے یاد آ رہی کوئی کھوئی ہوئی چیز۔

نہ جانے کون سی کھوئی ہوئی شے یاد آتی ہے  
ہوا جب سرد چلتی ہے کلیجہ تھام لیتے ہیں

سنتا ہوں میری یاد کبھی کبھی تمہارے دل میں جاگ اٹھتی ہے۔ اور تم راتوں کو اٹھ اٹھ کر، سارے گھر میں مجھ کو ڈھونڈتی پھرتی ہو۔ اور تمہارا عالم یہ ہو جاتا ہے کہ:

خلوت کدے میں اپنے، کبھی کے جو ہم گئے

آنسو ٹپک پڑے در و دیوار دیکھ کر

ہائے میری اشرف جہان، میں قربان تمہاری اس اداسی پر۔ ہائے تمہاری یہ تصویر جو نواسے کی شادی پر کھینچی گئی تھی۔ میں نے دیکھی، خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں میرے دل سے۔

ہائے ہائے تم کیسی کھوئی کھوئی سی بیٹھی ہو، میری پیاری اشرف جہاں۔

ارے میری اشرف جہاں، تمہاری اس زبودگی کو دیکھ کر کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اے موت، اے موت، آ، اور مجھ کو اندھیری قبر میں سلا دے۔

### میری زندگی کا ناقابل یقین حد تک حیرت ناک واقعہ:

اگر یہ واقعہ خود مجھ پر نہ بیت چکا ہوتا، تو روئے زمین کے تمام اولیائے نلوکار اور اقطاب راست گفتار بھی، اگر اپنی اپنی آسمانی کتابوں کو، سروں پر رکھ رکھ کر، مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ اس عجیب دنیا میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی دوشیزہ، کسی عمر رسیدہ سے محبت کرنے لگے، پھر بھی مجھ کو یقین نہ آتا، ہرگز یقین نہ آتا۔ اور میں یہی کہتا رہتا کہ ہر چیز فطرت انسانی کے خلاف اور سر اسر خلاف ہے۔

لیکن اس خرق عادت قسم کے واقعے کے معرض تحریر میں لانے سے پیشتر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کا پس منظر بیان کر دوں تاکہ آپ کی سمجھ میں آجائے۔ کہ اس وقت میرا ذہن کس منزل کی طرف سفر کر رہا تھا اور کس غیر معمول حملے کی وساطت سے میری کایا پلٹ دی گئی ہے۔

سو، بندہ پرور، اس وقت میرا یہ عالم تھا کہ عشق سے توبہ کر کے میں سقراط کے مکتب میں داخل ہو چکا تھا، اور اپنے دیرینہ معاشقوں کو یاد کر کے ان پر قہقہے مارا کرتا تھا۔

میرے طاق وجود میں ذہنی تقویٰ کی شمع روشن ہو چکی تھی۔ اور میں عشق بیزار و حسن پرستار۔ زندگی بسر کر رہا تھا۔ علم اوڑھنا تھا اور تفکر بچھونا۔

وائے قسمت کہ میری شاعری دیوی نے جب میری یہ سنجیدگی اور میری یہ ٹھنڈک سیلک دیکھی تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اور مجھ کو فکر کے پانی میں تا کر دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

اف یہ شاعری یہ بلائے بے درماں شاعری۔ الامان والحفیظ۔ یہ اچھال چھکا، اودھ ماتی، بلبلا تی، یہ تلیوں کے پیچھے دوڑنے والی۔ یہ چندریوں اور مندریوں کی شیدائی۔ یہ چمپا کے ہاروں اور چنچل تاروں کی تمنائی، یہ نرم بانہوں اور گرم بوسوں پر جان چھڑکنے والی شاعری۔

اس چٹاخ، پٹاخ، چٹوری، چنچل، چلبلی، چت چور، چھلاوا، چھم چھماتی، چونچلے باز، چھتسی اور چر بانک چھو کری کو میری یہ خاموشی اور سنجیدگی ایک آنکھ بھی نہ بھائی اور ناک پر انگلی رکھ کر اس نے مجھ سے کہا۔ اٹھ بڑا گلڈمبر بنا بیٹھا ہے۔۔۔ افوہ۔۔۔ اوئی، اس طرح، آنکھیں بند کر کے چپ چاپ بیٹھنے سے شرم نہیں آتی؟۔۔۔ اے گم سم جوش، میری طرف دیکھ، تجھ کو نو برس کی عمر سے گود لے کر میں نے پالا، پوسا اور پروان چڑھایا، اور شہرت کی اس بلندی تک پہنچا دیا کہ آج دنیا کی آنکھیں پڑ رہی ہیں تجھ پر۔ لیکن تو نے میرے خدمات بھلا دیئے، اے نمک حرام کلموئی کتابوں سے رشتہ جوڑ لیا اور چاند سے مکھڑوں سے منہ موڑ لیا۔

تو سہی، بچا جی، اب ایسی ہنستی بولتی، مدھو ماتی گڑیا، اٹھا کر تیرے سر پر ماروں گی کہ بھیجا نکل کر رہ جائے گا تیرا۔ اور تگنی کا ناچ ناچتا پھرے گا گلی گلی۔ موہے گروا لگا لے۔

۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ تو عقل کا رسیا ہے۔ اور اس بات کو پیش نظر رکھ کر میں تجھ پر ایسی گڑیا نازل کر دوں گی، جو حسن کے ساتھ ساتھ مجسم عقل بھی ہوگی۔ مجھے معلوم ہے

کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اس کی پہلی نظر ہی تجھ کو کاٹ کر رکھ دے گی۔ دھڑام سے گر پڑے گا تیری عقل کا قلعہ۔ اور چھوٹ کر رہ جائیں گی نبضیں تیری دانش مندی کی۔

امیر اول گواہی دے رہا ہے۔ وہ دل جو جھوٹی گواہی کبھی نہیں دیتا کہ مدبرالص و آفاق نے (خواہ وہ کوئی بھی ہو، یا کچھ بھی ہو) مجھ کو اس عذاب جمیل میں اس نیت سے مبتلا کر دیا ہے کہ بیوی کے دماغی اختلال کا بے پایاں قلق، مجھ کو قبل از وقت موت کے گھاٹ نہ اتار سکے۔

اور کچھ مشق ستم کی ہے تمنا شاید  
ہم کو اے موت کی مشکل سے بچانے والے  
شاعری کی یہ دھمکی سن کر زمین نکل گئی میرے پاؤں کے نیچے سے۔ اور کچھ ایسا  
ہول سمایا کہ بھاگ کھڑا ہوا کوہ مری کی طرف اور اتنی موٹی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مری  
کوئی ایسا محفوظ اور کیلا ہوا قلعہ نہیں ہے۔ جہاں شاعری کی ناگن پہنچ نہیں سکتی ہے۔  
مری پہنچے ابھی تین چار دن ہی گزرے تھے کہ میرا تعاقب کرنے والی شعر دیوی  
اپنی گڑیا اٹھائے وہاں پہنچ گئی۔ اور میں تھرا کر چیخنے لگا کہ:

بدور گردی من۔ از غرور می خندد

حریف سخت کمانے۔ کہ در کمین دارم

اب سن لیجئے کہ یہ ہوا کیوں کر؟۔

میرے مری پہنچنے کے تیسرے روز چند ادب پرست نوجوان آئے اور کہا کہ ہم  
آپ کے ساتھ، ایک شام مع کلام و جام، منانا چاہتے ہیں۔ آپ ہماری درخواست  
قبول فرمائیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ قبول کر لی میں نے وہ درخواست اور دوسرے دن پہنچ  
گیا اس بزم سخن میں، وہ مختصر نشست (چالیس پچاس افراد پر مشتمل تھی۔) جس میں  
تین لڑکیاں بھی ایک گوشے میں دبکی بیٹھی تھیں۔ اور ان میں سے بیچ والی لڑکی الامان  
والحفیظ، خطرناک حد تک حسین تھی اور جمال کے ساتھ ساتھ اس کے خدو خال سے غیر



معمولی ذہانت کی شعائیں بھی پھوٹ رہی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں کہا، وہ مارا اور بیٹھ گیا تیرنشانے پر۔ اتنے میں میری عقل آنکھیں نکال کر میرے سامنے آگئی۔ اور کہنے لگی، جل تو جلال تو آئی بلا کوٹال تو۔ اے جوش اس خون خوار لڑکی سے ہوشیار۔ اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جا۔ اگر جان پیاری ہے تو اب دوبارہ اس کی جانب نظر نہ اٹھا۔ تو اب کوئی لونڈا لڈیا نہیں کہ حسن کے چٹوں بوں سے کھیلنے بیٹھ جائے۔ دیکھ اگر میری بات نہ مانی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

چنانچہ اس ڈاکو لونڈیا کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔ اور دل میں قسم کھالی کہ اب اسکی طرف نگاہ نہیں اٹھاؤں گا۔ مرجاؤں گا مگر اس کو دیکھنے کا ارتکاب نہیں کروں گا۔

ابھی شعر خوانی کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ کسی صاحب نے جبر و قدر کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اور گرم بحث ہونے لگی۔ اسی اثناء میں ایسا محسوس ہوا کہ میری پشت پر چاندی کی سی گھنٹی بجنے لگی، اور جب میں نے یکا یک مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی خطرناک لڑکی یہ کہہ رہی ہے کہ آپ لوگ جو کچھ چاہیں کہیں میں تو انسان کو بالکل مجبور سمجھتی ہوں، بالکل مجبور، کچھ ایسے جھٹکے اور کھٹکے سے کہا کہ اس کا لہجہ میرے سینے میں چبھ کر ٹوٹ گیا۔

ایک صاحب نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا، ہم قطعی مجبور نہیں بلکہ ہم کو اس قدر اختیار حاصل ہے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ یہ سن کر اس لڑکی نے کہا، میں بھی یہی کہتی ہوں کہ انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ چاہنا اس کے اختیار میں نہیں۔ وہ تو وہی چاہے گا جو اس کی فطرت کا حکم ہوگا۔ اور ہماری یہ مجال نہیں کہ ہم اپنی فطرت اور تانے بانے کے خلاف کوئی چیز چاہ سکیں۔

اس لونڈیا کی ذہانت دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے دل میں کہا، اس قدر کم سنی اور اتنی گہری نظر، اور معایاد آگئی شعر دیوی کی یہ بات کہ ”میں تجھ پر ایسی گڑیا نازل کروں گی کہ جو حسن کے ساتھ ساتھ جسم عقل بھی ہوگی۔ خوف کے مارے میرے بدن

کے تمام روٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نا تمام مباحثے کے بعد چائے آگئی۔ اور چائے کے بعد شعر خوانی کا آغاز ہو گیا۔ اور جب ایک ایک کر کے تمام شعراء پڑھ چکے تو میری باری آئی اور میری باری آتے ہی، وہ لڑکی جس کو اب میں ”فتنہ آخر الزمان“ کے نام سے یاد کروں گا، اپنی جگہ سے اٹھی اور عین میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اور میرے کان میں آواز آئی، اب کہاں بھاگ کر جاؤ گے حضرت جوش۔۔ اور میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر آنکھیں نجی کر لیں۔

ہر چند کہ میرے اشعار سن کر اس نے بلند آواز سے مجھ کو داد نہیں دی۔ لیکن وہ ایسی نرمی کے ساتھ جھومتی رہی کہ جیسے چھٹپٹے کے وقت ندی ٹھہر ٹھہر کر بہتی ہے۔ اور ساحل سے کسی کی آواز آتی ہے۔

”مورا، سیاں، اترے گا اس پار، ندیا دھیرے بہو“

اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرے اشعار اس کی آنکھوں میں جھکولے کھا رہے تھے۔ اور جب میں کلام سنا چکا تو وہ کھسک کر اور بھی میرے قریب آگئی۔ انار سے چھوٹنے لگے میرے خون میں اور اترنے لگی اس کی سانس کی برچھی میرے سینے میں۔ اور جب اس نے میرے ہوٹل اور میرے کمرے کا نمبر پوچھا تو میرے دماغ نے حکم دیا کہ اس سے کہہ دے کہ میں صبح چار بجے پنڈی جا رہا ہوں۔ اس لئے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتانا بے سود ہے۔ لیکن اس آن میرے دل نے چلا کر کہا، جھوٹ نہ بولنا۔ جھوٹے کا منہ کالا۔

میں نے دل کی بات مان لی، اور نام اور نمبر بتا دیا۔ نام اور نمبر سن کر وہ آداب کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ایک خوف ناک وبراں مہک عطا کرتی گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میرے دماغ نے بھنا کر میرے منہ پر تڑاق سے طمانچہ مار دیا۔ اور میرے دل نے مسکرا کر چٹاخ سے میرا منہ چوم لیا۔ اور میں ہوٹل پہنچ کر دھڑام سے بستر پر گر پڑا۔ اور شور انگیز آندھیاں چلنے لگیں، اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح

اڑنے لگے۔ جل تو جلال تو، آئی بلا کو نال تو۔ اس کے دوسرے دن قیلولہ کرنے کو لیٹا ہوا تھا۔ کہ کسی نے آہستگی کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹایا۔ جھن سے ہو کر رہ گئے میرے تمام روٹگئے، میں نے کہا آجائے اندر، اتنے میں چرے دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ وہی فتنہ آخر الزمان، بڑے بچے تلے قدموں کے ساتھ میری طرف بڑھتی چلی آرہی ہے۔ اور ایسے تیوروں سے کہ گویا محمود فتح سومنات پر تل کر آگیا ہے۔ اور کچھار میں پڑے بے کس شیر کی طرف شکاری بندوق چھتیا رہا ہے۔ آتے ہی اس نے کہا آداب عرض۔ (ہائے کلانی کالوچ لکھنویا دآ گیا) میں نے اشارہ کیا صوفے کی طرف، لیکن میرے اشارے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ آئی اور آ کر میرے پائینتی بیٹھ گئی اور جیسے ہی میں نے چاہا کہ پاؤں کھینچ لوں، اس نے اپنی ملائم اور گرم ہتھیلیوں سے میرے دونوں گھٹنے پکڑ کر کہا نہیں، نہیں، آپ آرام سے لیٹے رہیے۔ اور اسکی گرم ہتھیلیوں کا رس میرے خون میں کھدبدا نے لگا۔

اس نے بڑی شکایت کے لہجے میں کہا، اللہ جوش صاحب آپ کس قدر بے نیاز ہیں کہ اب تک مجھ سے میرا نام تک نہیں پوچھا۔ لیجیے میں بے غیرت بن کر بتاتی ہوں کہ میرا نام۔۔۔ اور میرے باپ کا نام۔۔۔ ہے۔ میرے ابا پشاور میں بیرسٹری کرتے ہیں، اور میری اماں جان اللہ اللہ کرتی رہتی ہیں۔ اپنی ایک سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے آپ کے پاس آئی ہوں۔ مجھے آپ کا سارا کلام یاد ہے۔ ”یادوں کی بارات“ بھی پڑھی ہے۔ تھرڈ ایر میں پڑھتی ہوں اور میرا مضمون ہے فلسفہ اور فارسی ادب۔ پیدا ہوئی ہوں ملتان میں، مگر آبائی وطن ہے لکھنؤ۔

اس نے یہ کہہ کر کہ لیجیے میں نے اپنا سارا حال، ایک سانس میں بیان کر دیا۔ میری طرف اس انداز سے آنکھیں اٹھائیں، جس طرح کوئی خریدار مال کو آنکھتا ہے۔ اور میں نے ڈر کر آنکھیں میچ لیں، میری اس ادائے تحمل کو دیکھ کر اس نے کہا۔ جوش صاحب آنکھیں اٹھائیے۔ میں نے آنکھیں اٹھائیں۔ اس نے غمگین ہو کر گردن جھکا

لی اور کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

میں نے ذرا ٹھہر کر کہا، صاحب زادی گردن جھکا کر چپ کیوں سادھ لی۔ سر سے کھیلو، منہ سے بولو۔ یہ سنا تو بڑے ہی غمگین و شکوہ آمیز لہجے میں اس نے کہا اللہ، اتنا فلسفی بھی ہو کر نہ رہ جائے کوئی، میں آپ کے پاس اس شوق سے آئی اور آپ نے شاعر کی نظر سے میری طرف نگاہ نہیں اٹھائی، کس کام کی ایسی رکھائی۔ حالانکہ مجھ کو آپ سے بہت۔۔۔ آپ سے بہت۔۔۔ سنا تو میں نے بے ساختہ اس کی بات کاٹ کر کہا، صاحب زادی کیا تم کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ میری اور تمہاری عمر میں فرق ہے زمین و آسمان کا۔ تم نام خدا طلوع ہو رہی ہو۔ اور میں غروب ہونے کے قریب ہوں۔ تم مجھ سے عقیدت تو رکھ سکتی ہو۔ مگر محبت نہیں کر سکتی۔ کیا تم میری بگڑی صورت اور گلے کی، بیل کی سی لٹکی ہوئی کھال نہیں دیکھ رہی ہو۔ اس نے پھریری لے کر کہا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کی صورت قطعی بگڑی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے چہرے پر کمال کا پیدا کردہ حسن دمک رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں محبت کے معاملے میں آنکھوں کو دخل نہیں دینے دیتی۔ میں حسین صورت کو نہیں، حسین ذہن کو پوجتی ہوں۔ اور آپ کے پاس وہ حسین ذہن ہے جس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔

اس کی مدلل باتیں سن کر میں چکرا گیا۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا، جوش صاحب ہوشیار، حملہ بے حد شدید ہے۔ دیکھ عقل کی ناک کہیں جڑ سے کٹ کر نہ رہ جائے۔ اور ذہنی تقویٰ کی یہ شمع گل ہو کر دھواں نہ دینے لگے۔ یہ سوچ کر میرا سر جھک گیا اور زمین میرے پاؤں کے نیچے سے سرکنے لگی۔ کہ اتنے میں ہچکیوں کی آواز نے مجھ کو چونکا دیا، بلکہ بوکھلا دیا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف نگاہ اٹھائی اور ایسی نگاہ جس میں دل دھڑک رہا تھا اور آنکھیں چارہ ہوتے ہی اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگی۔

تری طرح کوئی تیغ نظر کو تاب تو دے



یہ تلاطم دیکھ کر، میرا فلسفی مر گیا اور میرا شاعر جی اٹھا۔ میں نے پھر تو آنسو دیکھا نہ تاؤ  
اس کو خوب بھیج کر کیجے سے لگایا۔ اور دھل دھل بہنے لگے میرے آنسو بھی۔  
میرے آنسو دیکھے تو اس فتنہ آخر الزمان کے مکھڑے پر شادابی آ گئی۔ اور گونجنے  
لگیں شعر دیوی کے شادیاں کی صدائیں آسمانوں پر۔۔ اور اٹھ گیا میری حکمت کا  
جنازہ۔

بلند و بالا، ماہ رخنہ، ہر و ناز من  
کوتاہ کرد، قصہ زہد دراز من۔۔ انا  
ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

بندہ پرور، سن لی آپ نے میری پتا؟۔ اور دیکھ لیا انجام آپ نے میرے تفکر کا؟۔  
ایک مرد خرافات کی طرح مجھ پر قہقہے لگائیں یا ایک ماہر نفسیات کی مانند مجھ پر آنسو  
بھائیں۔ بہر حال جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ شاعری جیتی اور فکر ہار گئی۔

اب تو یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کاش میں دنیا کا خبیث ترین اور ملعون ترین آدمی  
ہوتا۔ مگر شاعر نہ ہوتا۔ میرے سوا کسی کو اس پورے کرہ ارض پر اس کا اندازہ ہو سکتا  
ہے۔ کہ عقل کی خوابیدگی، عشق کی بیداری، اضطراب کی خلعت پوشی، حمکین کی  
برہنگی، قلم کی نوحہ گری، تیشے کی نغمہ سرائی، دماغ کی شکست اور دل کی فتح مندی، کس قدر  
ہول ناک و عبرت انگیز سانحہ ہے۔ اقلیم تامل کا۔

ارے کس سے جا کر فریاد کروں میں سوختہ بخت کہ:

دل کا طوفان دماغ تک پہنچا  
گھپ اندھیرا چراغ تک پہنچا

ہاں اے فرشتو، اے دیوتاؤ، اور اے دھرتی کے داناؤ

دوڑو کہ سر جوش گلوں سار ہوا ہے  
نقاش جہاں نقش بدبودار ہوا ہے

فریاد کہ خورشید کا ممدوح گرامی  
 ذروں کی ملامت کا سزاوار ہوا ہے  
 افسوس کہ اک ناقد سیار وثوابت  
 خال وکد وافشاں میں گرفتار ہوا ہے  
 فریاد کہ خود وارث لقمان و مسیحا  
 اک نرگس شب رنگ کا بیمار ہوا ہے  
 ہیہات کہ اک مشتری سدرہ و طوبی  
 جنس قد و گیسو کا خریدار ہوا ہے  
 صد حیف کہ اک دین تفکر کا پیہر  
 آلودہ کفر لب و رخسار ہوا ہے  
 اے وائے کہ دل کے افق عید پر اے جوش  
 پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے  
 اور کچھ ادھر کا حال بھی سن لیجیے

حسن افسردہ و حیران ہے خدا خیر کرے  
 نوک مرگاں پہ چراغاں ہے خدا خیر کرے  
 سطح عارض کی، دھڑکتی ہوئی رنگینی سے  
 دل کی مہر ضرب نمایاں ہے خدا خیر کرے  
 خیمہ زمزمہ و جملہ عود و نئے میں  
 گریہ گوشہ نشیناں ہے خدا خیر کرے  
 بے نیازی سے میری ناز شباب نو خیز  
 بیعت عشوہ کا خواہاں ہے خدا خیر کرے  
 ایک گل طبع و گہر طینت و شب خم اندام

سرخ شعلوں پہ خراماں ہے خدا خیر کرے  
کل فقط دامن بلبل تھا، ہوا پر غلطاں  
آج گل چاک گریباں ہے خدا خیر کرے

اور میری اس نظم سے اندازہ لگائیے کہ کم بخت شاعر کی ناقابل اعتناء فطرت کا (اللہ  
آدمی کو لولو بنا کر گدھ پر چڑھائے، لیکن شاعر نہ بنائے۔)

اکیس	برس	کے	بعد	بارے
پلکوں	پہ	دمک	رہے	تارے
تخ	میں	ہے	تپ	فشانی
انیسویں	ہے	یہ	نوحہ	خوانی
غلطاں	ہے	جگر	میں	پھر
نیندیں	ہلکی	ہیں،	رات	بھاری
کل،	غرق	مائل	جہاں	تھا
گرم	تحقیق	اِس	وآں	تھا
اندیشہ	تھا	اوڑھنا		بچھونا
عورت	کا	وجود	تھا	کھلونا
منطق	کا	حصار	پیش	و پس
برہان	بدوش	ہر	نفس	تھا
تطہیر	قیاس	ہو	رہی	تھی
تہذیب	حواس	ہو	رہی	تھی
ہر	ذرہ	نکھر	ابھر	رہا
قرآن	شور	اتر	رہا	تھا
لرزاں	تھی	صفات	کی	عماری

زد پر تھا وجود ذات باری  
 اور آج شکستہ حال ہوں میں  
 دیوانہ خد و خال ہوں میں  
 دل کی ہے دماغ پر حکومت  
 ظلمت کی چراغ پر حکومت

اس سے پیشتر اٹھارہ معاشقے ہو چکے ہیں۔

مجھ سے یہ دماغ کہہ رہا ہے  
 حضرت کیوں چپ ہیں بات کیا ہے؟  
 دل کیوں ہے لہو لہان صاحب  
 کیا ہے مزاج خان صاحب  
 مولیٰ کس سے کہوں یہ دکھڑا  
 کس کا پیش نظر ہے مکھڑا  
 اک عمر کے بعد پھر جگر میں  
 کس نے اتار دی ہیں یہ آنکھیں  
 کس نے مجھ کو ڈبو دیا ہے  
 مکھڑا دل میں چھو دیا ہے  
 حکمت ششدر کھڑی ہوئی ہے  
 پتھر میں انی گڑی ہوئی ہے

سن لو اے داوران عالم  
 اے خیل مفکران اعظم  
 شاعر کتنا ہی منطقی ہو



کتنا ہی عظیم فلسفی ہو  
 جب بھی پرواہ چلے گی سن سن  
 اس کا پلٹ آئے گا لڑکپن  
 آمادہ صد فساد ہے یہ  
 ناقابل اعتماد ہے یہ  
 پاتا ہے جو حسن میں تغافل  
 جھکتا ہے یہ جانب تامل  
 پاتا نہیں جب یہ زلف کی چھاؤں  
 بڑھتا ہے سوئے خرد دے پاؤں  
 لیکن کوئی گل رخ و سمن، بر  
 کرتی ہے جب التفات اس پر  
 پھر توڑ کے فلسفے سے ناتا  
 پھرتا ہے یہ سیٹیاں بجاتا  
 رہتا ہے یہ عمر بھر کھنڈرا  
 اس کو پچتا نہیں بڑھاپا  
 شاعر ہے جمال کا پجاری  
 اے عقل غلط ہے اس سے یاری  
 کنج گیسو چمن ہے اس کا  
 روئے خواباں وطن ہے اس کا  
 جذبات کا ہے یہ گماشتہ  
 حکمت فقط اس کی داشتہ  
 اے عقل نہ خود کو خوار کرنا

شاعر      پہ      نہ      اعتبار      کرنا  
 جب      حسن      کرے      گا      عشوہ      کاری  
 اس      وقت      بصد      ہزار      خواری  
 تجھ      سے      اے      مادر      گرامی  
 کر      جائے      گا      یہ      نمک      حرامی

اب میں اپنی انوکھی نظم پیش کر رہا ہوں، جس کی دنیائے شاعری میں کوئی نظیر ہی نہیں ملتی اور میں دعوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ جب سے اس کرہ ارض پر شاعری کا آغاز ہوا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج کی تاریخ کی تاریخ تک کا ایک مصرع بھی دنیا کی کسبزیبان کی شاعری میں بھی نہیں کہا گیا تھا۔ یقین فرمائیے کہ میں اس دعویٰ کے پردے میں تمام شعراء عالم پر اپنی فوقیت اور افضلیت کا اظہار نہیں کر رہا ہوں۔ اور اس کے برخلاف میرا خیال ہے کہ اگر ان شعرائے کرام کو بھی میری ہی طرح اس پختگی عمر میں حسن کے ایسے شدید حملے سے دوچار ہونا پڑتا، تو وہ میری اس نظم سے بمراحل بلند تر نظمیں کہتے۔ اور اس نوعیت کی نظموں کے ہر طرف انبار لگے ہوتے۔

سنتا ہوں عظیم شاعر گوئے اسی برس کی عمر میں اس طوفان سے دوچار ہوا تھا۔ لیکن صد حیف کہ کوئی نظم نہ کہہ سکا۔ ہاں تو ملاحظہ فرمائیے۔

### نقائضائے سر دہری

مجھے آزاد کر کے، پر کشائی کیوں نہیں کرتیں  
 جو دل کو توڑ دے وہ کج ادائی کیوں نہیں کرتیں  
 بچھا دوں بویا پھر جا کے اپنے شہر حکمت میں  
 کبھی مجھ سے تم ایسی بے وفائی کیوں نہیں کرتیں  
 قلم ہو جائے سر ہیجان وصل وسعی قربت کا  
 رواں یوں خنجر طول جدائی کیوں نہیں کرتیں

مری رخصت کے حسرت کیز لمحوں کے تلاطم میں  
 جدا آنکھوں سے تم اپنی دلائی کیوں نہیں کرتیں  
 شکن جو ڈال دے میرے غرور فن کے ماتھے پر  
 کبھی اتنی اہانت سے رکھائی کیوں نہیں کرتیں  
 حسینوں سے بغاوت کا جو دل کو درس دیتی ہے  
 مری سرکار وہ بے اعتنائی کیوں نہیں کرتیں  
 جکڑ رکھا ہے مرا دل وفاؤں کے شکنجے میں  
 جفا کر کے میری مشکل کشائی کیوں نہیں کرتیں  
 مری دانائی ہے شرک محبت کی تمنائی  
 مری دانائی کی حاجت روائی کیوں نہیں کرتیں  
 برائی میں تمہاری جوش کے دل کی بھلائی ہے  
 بھلائی ترک فرما کر برائی کیوں نہیں کرتیں  
 اب لگے ہاتھوں چند رباعیاں، فتنہ آخر الزمان کے لب ہائے شیریں سے بھی سن  
 لیجیے۔

روتی ہوئی راتوں کو ہنساؤں کیوں کر  
 روٹھی ہوئی نیندوں کو مناؤں کیوں کر  
 کل کیا تھی، اور آج بن چکی ہوں کیسی  
 یہ گھاؤ کلیجے کا دکھاؤں کیوں کر

چھانی طعنوں سے پھر کلیجے ہوگا  
 منہ پھر میرا تھپڑوں سے نیلا ہوگا  
 اس پوچھنے پر ”اداس کیوں ہے بیٹی“

میری آنکھیں بھر آئیں اب کیا ہوگا

---

ہر بات نہ جانے کیوں بری لگتی ہے  
مخل کی بھی بیج کھردری لگتی ہے  
اب سانس بھی لیتی ہوں جو گہری سرشام  
تو کھچ سے کیجے پہ چھری لگتی ہے

---

کس کو سمجھاؤں روگ اپنے جی کا  
ماتھے کا بجھا پڑا ہے ٹیکا  
اب تو چھاتی سلگ رہی ہے ایسی  
پنڈا رہنے لگا ہے میرا پھیکا

---

ماں کہتی ہے کس غم میں گھلا کرتی ہے  
کس آگ میں دن رات تپا کرتی ہے  
یہ دن تو ہیں کھیل کود کے نام خدا  
اور تو ہے کہ گم سم سی رہا کرتی ہے

---

سارے گھر کی ہے مجھ نگوڑی پر نگاہ  
صبحیں ویران ہیں تو شائیں ہیں تباہ  
اف پیت مسافر کی بری ہوتی ہے  
گم سم نہ رہوں تو کیا کروں، اللہ

---



بے چین کو چاند رات بھا جائے کیسے  
روتی ہوئی رات گنگنائے کیسے  
کھدب کھدب جو پک رہی ہو چھاتی میں  
آنکھوں میں، گلوڑی نیند آئے کیسے

---

پھر دل کو مرے توڑ کر نکلے گی کراہ  
پانی تاروں میں ڈوب جائے گی نگاہ  
جس کے ڈر سے لگے تھے پچھے دل میں  
وہ کلموئی رات آگئی پھر سے، اللہ

---

کیا میں نے، ارے حرام خوری کی ہے؟  
ڈاکا ڈالا ہے، سینہ زوری کی ہے؟  
میں پوچھ رہا ہوں۔ دل دیا ہے اپنا  
یا، میں نے کسی کے گھر چوری کی ہے؟

---

اللہ، میں اب شعر کہوں تو، کیوں کر  
اتنی ہے گھٹن کہ زندگی ہے دو بھر  
چلتا ہے مرا قلم ہو اماں جانی  
کہتی ہیں علی کی تیغ ٹوٹے تجھ پر

---

ہر بات کو میری ناروا کہتی ہیں  
مجھ کو چر بانک “ برملا کہتی ہیں

اماں ہی پر یہ بات نہیں موقوف  
باجی بھی، اکیلے میں برا کہتی ہیں

---

مانو، ہاں، میری بے گناہی اماں  
کس سے دلوؤں میں گواہی اماں  
کیا پوچھتی ہو ”ارے یہ آنسو کیسے“  
انی تھی مجھے ابھی جمانی اماں

---

رم جھم، رم جھم سی ہو رہی ہے ہلکان  
پانی برکھا اڑا رہی ہے اوسان  
باجی اس بولتی گھٹا میں باجی  
لہ، الہنوں کی نہ کڑکاؤ کمان

---

سنتی ہوں میں ہر آن نئی صلواتیں  
گونگے دن ہیں تو مرے اندھی راتیں  
اماں کہتی ہیں۔ جوش صاحب کے حضور  
کرنے لگتی ہیں، تیری آنکھیں باتیں

---

اٹھے آنسو، ہوئے پوٹے بھاری  
کس نے چھاتی پر، اف چلا دی آری  
پروا میں، ارے یہ نام کس کا سنکا  
کس نے کلیجے پہ کٹاری ماری؟

بس ختم ہوئی مجھ بد بخت کی داستان۔ صد حیف کہ یہ تیسرا ایڈیشن بھی محبت کی داستان ہی پر ختم ہو رہا ہے۔ یہ دور تو ان باتوں کا نہیں تھا۔ پھر بھی کیا کیا جائے۔ کس کی مجال ہے کہ جبر قدرت کا مقابلہ کر سکے۔

اگر خدا نخواستہ، کچھ اور جیا تو مزید حالات سناؤں گا۔ ورنہ ہمیشہ کے واسطے خاموش ہو جاؤں گا۔ اور میری ابدی خاموشی سے ہزاروں داستان برستی رہیں گی۔

جوش

۲۰-۱۰-۷۴ء سہمہ پھر

اسلام آباد

اختتام ----- The End